سسپنس ڈائجسٹ
مدیرہ اعلیٰ: عذرا رسول

جلد 45 • شمارہ 11 نومبر 2015 • زرِسالانہ 800 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 60 روپے •

خط کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 215 کراچی 74200 • فون: 35895313(021) فیکس 35802551(021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com

پبلشر و پرنٹر: ذیشان رسول • مقامِ اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس، مین کورنگی روڈ کراچی 75500
ایڈیٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ھاکی اسٹیڈیم کراچی

انشائیہ

کسی طرح بھی

جون ایلیا

کیوں یہ میری پیٹھ سے لگا کیا سوچ رہا ہے؟ سامنے آ کے بیٹھ...... کہ جی ہی بہلے۔ جانے کیا ہو گیا ہے کہ جی نہیں لگ رہا۔ ہاں بھائی بڑی وحشت ہے، بڑی بیزاری ہے۔ ہم اپنے آپ میں بری طرح آن پھنسے ہیں۔ یہ اپنے آپ میں محبوس ہونے اور اپنے آپ سے تنگ آ جانے کا آزار بڑا ہی جان لیوا ہے۔ جی میں آتا ہے کہ اپنی ہڈیاں پسلیاں ایک کردوں، اپنا ٹینٹوا چبا جاؤں۔ اپنی ذات کے حبس میں سانس لینا تو ایسا ہے جیسے جانکنی میں زندہ رہنا۔ اور آزاری آخر تو کس سوچ میں ہے۔ تو بھی تو کچھ بول! یہی کہ اس طرح آخر کیسے گزرے گی؟ یہی تو میں بھی سوچتا ہوں، چاہے ہمارے اندر جنت کی ہوائیں ہی کیوں نہ چل رہی ہوتیں اور ہمارے وجود میں جنت کے چشمے ہی کیوں نہ بہہ رہے ہوتے پھر بھی اپنی ذات کی قید دوزخ سے کم نہ ہوتی جب کہ ہمارا اندرون تو خود سب سے بڑا دوزخ ہے۔ آخر وہ کیسے لوگ ہوتے ہیں جو اپنی ذات میں بند رہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمیں اپنے باہر سے بھلا کیا سروکار...... اور یہ بڑے جانے ہوئے اور مانے ہوئے لوگ ہوتے ہیں۔ ان سے زیادہ یہ بات جاننے والے کم ہی ہوں گے کہ نفس کی سب سے اچھی حالت کون سی ہے اور سب سے بری حالت کون سی ہے؟ یہ تو کیا بڑبڑانے لگا اور یہ تو نے کن بکواسیوں کی بات شروع کر دی جو اپنی ذات میں بند رہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بھلا ہمیں اپنے باہر سے کیا سروکار۔ بد ذات۔ یہ اپنے اندر ہوتے ہی کب ہیں جو باہر نکلیں۔ کھو کھلے۔ تو ان بے حسوں اور بے حیاؤں کی باتیں کر کے میرا جی نہ جلایا کر۔ خبردار جو اب ان بدروحوں کا نام لیا۔ یہ زندگی کے گورستانوں میں منڈلاتے پھرتے ہیں کہ بدی کی کوئی لاش کھود کے نکالیں اور اسے اپنے اوپر منڈھ کر بستیوں میں آئیں اور روگ پھیلائیں۔ یہ تو نے اچھی کہی کہ یہ لوگ اپنی ذات میں رہتے ہیں۔ کیا تو نہیں جانتا کہ بدذاتی...... بے ذات ہوتی ہے۔ ہاں یہ ہے کہ یہ باہر سے بھاگتے ہیں اور لاشوں میں اپنے لیے ٹھکانے ڈھونڈتے ہیں۔ ذات میں رہنا بھی کوئی مذاق تو نہیں ہے۔ کیا یہ کوئی آزمائش ہے؟ اس سے کڑی آزمائش اور کیا ہو سکتی ہے کہ آدمی اپنی پسلیوں میں پھنسا سسک رہا ہو۔ اگر انسانوں میں سے کچھ انسان اس آزمائش میں پڑ گئے ہوں تو کیا انہیں اس پر خوش ہونا چاہیے؟ جب تو یہ کہتا ہے کہ میں اپنی پسلیوں میں پھنسا ہوا ہوں یا اپنی اوجھڑی میں گٹھری بنا پڑا ہوں تو کیا اپنے آپ کو یا کسی اور کو کوئی خوش خبری سناتا ہے؟ کیا بہت دم گھٹ رہا ہے؟ بس یہی میرا بھی حال ہے۔ یہ کیسا ہوتا ہے، یہ تو بہت ہی عذاب ناک ہوتا ہے۔ نہ ہونے کا آرام شاید بہت بڑا آرام ہوتا ہوگا۔ ہاں شاید...... اتنا نشہ کہ ہوش ہی نہ رہے۔ خون کے گھونٹ پی اور جی۔ نہیں بھائی، نہیں۔ اب زبان اور محاورے کی چاشنی کچھ مزہ نہیں دیتی۔ بس چپکا ہی رہ۔ ہاں تو نے ٹھیک کہا۔ اب تو اپنی کوئی بات بھی اچھی نہیں لگتی۔ جب اپنا آپ ہی برا لگنے لگے تو پھر کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔ بھلا تو اپنے آپ کو کیسا لگتا ہے؟ میں اپنی صورت تک سے بیزار ہوں۔ میں اپنے اس گمان تک سے اکتا چکا ہوں کہ میں ہوں۔ جو نہ ہونے کی طرح ہے وہ آخر ہے بھی کیوں۔ تو نے میرا جی خوش کر دیا۔ اگر جاں کنی، جاں کنی کا جی خوش کر سکتی ہو۔ دمسازی اور غمگساری اسے کہتے ہیں۔ بس یہی کچھ میرا بھی عالم ہے۔ برے مارے گئے۔

باہر کی ہوا اب کیسی ہوگی؟ ویسی ہی ہوگی جیسی تھی۔ جیسی چھوڑ کر ہم اپنے اندر بھاگ آئے تھے۔ بھاگ آئے تھے یا کھدیڑے گئے تھے۔ ہاں یوں کہہ لے، ہوا بھی یہی تھا۔ پر ایک بات اور ہے اور وہ یہ ہے کہ باہر کی ہوا کا کیا کہنا۔ باہر کی فضا کا بھلا کیا کہنا۔ اندر تو رائگانی ہی رائگانی ہے۔ ندامت ہی ندامت ہے۔ ہم جو تھے، ہم میں سے بھلا کون کون رائگاں گیا ہوگا۔ جنہیں رائگاں نہ جانا چاہیے تھا، وہی بری طرح رائگاں گئے ہوں گے اور انہی کو اپنے رائگاں جانے کا دکھ بھی ہوگا۔ رائگانی کے ان شہروں میں کیسی کیسی امنگیں پچھتاووں کی بھینٹ چڑھ گئیں۔ ایک بات ہے۔ کیا بات؟ باہر کی ہوا تھی بھی کچھ ایسی کہ ایسا نہ ہوتا تو اور کیا ہوتا؟ باہر کی گھٹن بھی اندر کی گھٹن سے کچھ کم تو نہ تھی اور یہ کہ فضا میں قہر تھا اور ہوا میں زہر۔ ہوا کا وہ زہر اور فضا کا وہ قہر ضمیر کی ہلاکت اور ذہن کی ہزیمت تھا۔ ہم نے حکمت کو ہوس ناکی بنتے دیکھا اور دلیل کو دلال۔ قیادت نے قزاقی کا پیشہ اختیار کیا اور قانون نے نقب زنی شعار کی۔ پھر ہو کیا؟ کیا ہم اپنے اندر اسی طرح کراہتے رہیں؟ میں تو کہتا ہوں کہ اندر کی ہلاکت سے باہر کی ہلاکت ہزار گنا بہتر ہے۔ اندر کی زندگی بھی موت ہے اور باہر کی موت بھی زندگی۔ کسی بھی طرح اپنے آپ سے باہر نکلنا چاہیے، کسی بھی طرح۔

آپ کا خط
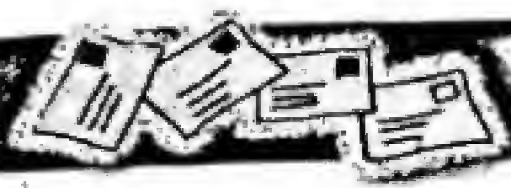
عزیزانِ من!
تسلیمات

لیجیے جناب نومبر 2015ء کا شمارہ پھر سے احساس دلانے آگیا ہے کہ ایک اور عیسوی سال اپنے اختتام کی جانب رواں ہے۔ آتے جاتے یہ موسم...... سورج کے طلوع اور غروب ہونے کے اس کھیل پر جو ذرا توجہ دی جائے تو ادراک و شعور کے کئی در وا ہوتے محسوس ہوتے ہیں مگر...... بشر ہے کہ مہد سے لحد تک کے اس دورانیے کا استعمال سلیقے سے کرنا سیکھ ہی نہیں پاتا۔ بس اچھے برے اعمال میں پیہم مصروف رہتا ہے حتیٰ کہ سورج غروب ہونے کا وقت آجاتا ہے۔ حادثات و واقعات اور چھوٹی بڑی آزمائشیں انسان کو انفرادی اور اجتماعی طور پر بہت کچھ سوچنے، سمجھنے اور سیکھنے کا موقع دیتی ہیں۔ پچھلے دنوں دورانِ حج امتِ مسلمہ پر دوبار غم کا پہاڑ ٹوٹا۔ پہلا کرین گرنے اور دوسرا منیٰ میں بھگدڑ کا دلخراش سانحہ...... شہدا، زخمی اور لاپتا افراد کا غم...... لواحقین کے ذہنوں میں ابھرتے سوالات کی اذیت...... سفارت خانے کی مایوس کن اہلیت اور پھر دورانِ حج تعمیراتی کام جاری رکھنے کا سبب...... منیٰ میں حجاج کا غلط سمت سے بڑھنے والا ریلا اور پولیس کی کارکردگی...... کسے الزام دیا جائے...... کون ہے جو دلوں کا بوجھ ہلکا کرسکے۔ کیا یہ سب ملکی اور بین الاقوامی سطح پر ہمارے انفرادی اور اجتماعی رویّوں میں سقم کا مظہر نہیں ہے......؟ کیا حج کے تمام ارکان جب انسان اپنے دل میں پہلی بار بیت اللہ جانے کا ارادہ باندھتا ہے اور وہ پہلا قدم جو اس سفر کے لیے گھر سے نکالتا ہے اور آخری مرحلے تک...... کیا وہ ہماری پوری زندگی کو ایک مکمل ضابطہ اور طریقہ نہیں سکھاتا...... مگر مٹی کے اس پتلے کو بھلا کہاں اتنی فرصت کہ ان باتوں پر غور کرے...... اگر ایسا ہوتا تو اقبال کے خواب کی یہ تعبیر ہرگز نہ ہوتی جس صورت میں ہمارے یہاں نظام رائج ہے۔ اندھیر نگری چوپٹ راج...... اگرچہ بہت معمولی سی بات ہے مگر ٹیکسز کے نام پر عوام سے جو رقم بٹوری جاتی ہے کیا وہ عوام کی فلاح پر خرچ ہوتی ہے...... تعلیمی معیار کو دیکھا جائے تو وہ طبقاتی کشمکش کا شکار نظر آتا ہے۔ کبھی تنخواہ نہ ملنے پر اساتذہ کا دھرنا اور کہیں اساتذہ دولت کمانے کی مشین، جبکہ طالب علم کے دل میں علم حاصل کرنے کے بجائے صرف ڈگری حاصل کرنے کی تمنا...... ایسے میں سائنس اور دیگر شعبہ جات میں کیسے ترقی ممکن ہوسکتی ہے۔ 9 نومبر شاعر مشرق علامہ اقبال کی یاد دلاتا رہے گا اور ہمیشہ یہ حوالہ پاکستان کی تاریخ کو ذہنوں میں زندہ کرنے کا سبب بنتا رہے گا...... اور جناب زندہ دلی کا مظہر تو ہماری یہ محفل بھی ہے جو ہر صورت ہمارے ساتھ رونق میں اضافے کا سبب بنتی ہے تو چلیے چلتے ہیں......

⊛ ظفر اللہ وڑائچ، وہاڑی سٹی سے تشریف لائے ہیں ”آپ لوگوں سے وابستہ تو کافی عرصے سے ہوں، رابطہ کرنے کی کوشش آج کر رہا ہوں۔ (خوش آمدید) سسپنس اور جاسوسی ڈائجسٹ پڑھنے کا شوق مجھے میرے والد مرحوم سے ورثے میں ملا۔ زندگی کے مسائل سے ذہن ہٹانا ہو تو میری جائے پناہ سسپنس ہی ہوتا ہے۔ دلفریب و منفرد ٹائٹل لیے سسپنس جلد مل گیا۔ آپ کا سچ بولتا اداریہ ملکی حالات پر آپ کی گہری نظر کا ثبوت ہوتا ہے۔ پاکستان کے لیے آپ کی دعاؤں کے جواب میں ہم بھی کہیں گے آمین ثمہ آمین...... پاکستان ہے تو ہم ہیں۔ انشائیہ میں جون ایلیا صاحب کی تعریف نہ کرنا، ناانصافی ہوگی کیونکہ یہ بے باک انسان ہمارے جذبات کی ترجمانی کرتا ہے اور ان کا مژدہ پڑھ کر کئی بار کہا، ہاں یہ سچ ہے حقیقت ہے، واقعی ایسا ہو جائے تو کیا بات ہے، ہم پاکستانی زندگی کی بنیادی سہولتوں، حقوق اور خوشیوں سے محروم ہوتے جارہے ہیں۔ جون ایلیا زندہ باد۔ اب چلتے ہیں اپنی محفل کی جانب کہ یہ پورے ڈائجسٹ کی جان ہے۔ میں شروع میں صرف تبصرے ہی پڑھتا تھا اور لطف اندوز ہوتا، کہانیاں پڑھنے کا شوق و چسکا مجھے میرے والد مرحوم سے پڑا۔ پھر تو یہ سب لازم و ملزوم بن گیا۔ پہلے کبھی تبصرہ لکھنے کا خیال نہیں آیا۔ پھر کچھ باتیں ایسی ہوئیں کہ آپ تک پہنچنا ضروری تھا۔ اس محفل میں اب زیادہ تر نئے لوگ ہیں، پرانے لوگوں کی کمی بہت محسوس ہوتی ہے کہ ہر ایک کا اپنا جداگانہ، دلکش انداز تھا۔ جس میں پیار و تکرار، بحث، غصہ، اپنائیت سب ہوتا تھا۔ پھر ایک دوسرے سے نوک جھونک سونے پہ سہاگا، بہت ہی اعلیٰ۔ جناب محمد صفدر معاویہ اور عبدالجبار انصاری صاحبان خوش قسمت انسان ہیں کہ سال 2015ء میں دو دو بار صدارت پر قبضہ جمایا، مبارکاں جی...... محمد خواجہ صاحب اور دوسرے تبصرہ نگاروں کے تبصرے خوب رہے۔ اب اپنے موسٹ فیورٹ تبصرہ نگاروں سے گزارش کروں گا کہ وہ اس محفل میں دوبارہ انٹری دیں۔ جن میں بابر عباس، تفسیر عباس، شکیل کاظمی، قیصر اقبال، سعدیہ بخاری، مہرین ناز، شبانہ حسن، الیلیٰ، اشوک کمار، ابن مقبول بھائی یہ سب احباب محفل کو رونق بخشیں۔ کہانیاں سدا کی طرح ہماری دلچسپی کا سامان لیے ہوئے تھیں۔ اپنی عادت کے مطابق کہانیاں پڑھنے کی ابتدا انتہا سے کی، مطلب گم گشتہ، ڈاکٹر ساجد امجد بالکل نیا انداز، نیا ماحول لاجواب اسٹوری، ایک ہی نشست میں ختم کرنے پر مجبور ہوگئے۔ خدنگ عثمانی الیاس سیتاپوری صاحب کی دوسری قسط پڑھی، واللہ از گولڈ کچھ داستانیں ایسی ہوتی ہیں کہ وقت کی گرد ان پر نہیں جمتی...... اگلے حصے کا انتظار ہے۔ اسما قادری اور شیش محل واللہ......

دل جیت لیا۔ اس کہانی نے سسپنس ڈائجسٹ میں دوبارہ جان ڈال دی۔ کہانی کی اٹھان، پلاٹ ہرزاویہ فٹ ہے۔ میں تو اسے پیسے وصول کا ٹائٹل دوں گا۔ جولیٹ، فاروق اور عارف کے کردار بیسٹ ہیں۔ ماروی اور نواب صاحب، بس اچھا ٹائم پاس کر دیتی ہیں۔ ضیا تسنیم بلگرامی کی جانِ جاناں کا خلیفہ، جزاک اللہ کثیرا...... انصاف طلب ملک صفدر حیات صاحب کا نام ہی کافی ہے۔ قانون کے ہاتھ لمبے ہونے کے ساتھ ساتھ، سوچ بھی دور تک جاتی ہے تو اصل مجرم تک پہنچ جاتے ہیں۔ یعقوب ترکھان کی بیوی نے اپنی اور اپنے شوہر کی عزت خراب کی، انجام برا ہوا۔ ابلیسی، کاشف زبیر صاحب کی عمدہ اور دلچسپ تحریر تھی۔ سسپنس سے بھرپور اچھی لگی۔ واکلا بے چاری اپنی جان سے گئی۔ سونا کو صحیح ٹائم پر پتا چل گیا کہ وہ کیسے لوگوں میں پھنس گئی ہے۔ لیکن شیطان اپنے مشن پر لگا رہتا ہے۔ محفل شعر و سخن ہمیشہ کی طرح لاجواب اشعار کا مجموعہ...... سارے شعر ایک سے بڑھ کر ایک ہوتے ہیں۔ اس محفل کے ممبر کافی اعلیٰ ذوق رکھتے ہیں۔ مراسلے کا معیار دن بہ دن خوب تر ہوتا جا رہا ہے۔ خاص طور پر رضوان سلطان تنولی اور حبیب الرحمان کے مراسلے بہت پسند آئے۔''

✠ فلک شیر ملک، رحیم یار خان سے تبصرہ کر رہے ہیں ''ماہ اکتوبر کا سسپنس پڑھ کر خوشی ہوئی۔ ٹائٹل پر چاند ستارے چمک رہے تھے جو کہ خوشیوں کی نوید سنانے کے ساتھ ساتھ ایک اشارہ بھی کرتے ہیں کہ وہ دن قریب ہے جب آسمان پھٹ جائے گا، شمس و قمر کی روشنی عارضی ہے۔ سورۂ رحمٰن کی اس آیت کا حوالہ دیا گیا ہے جون ایلیا کی روح کتنی خوش ہوگی اس بات سے کہ اے جن و انس جو وقت ملا ہے غنیمت جان اور فائدہ اٹھا۔ وقت بہت کم ہے اور اگلا سفر بڑا ہی دشوار اور طویل ہے۔ ہر گزرنے والا لمحہ اور پھر آنے والا کل ہماری زندگی کو کم کرتا جا رہا ہے۔ موت ہمیں کھینچ رہی ہے۔ (مٹی کے خمیر سے بنایا ہوا انسان مٹی میں ہی جائے گا) موت کا اچانک جھونکا آئے گا اور ہمیں لے جائے گا۔ ایک پتے کی بات بتاتا ہوں اگر برا نہ لگے۔ سچی توبہ کرنے کے بعد اللہ اور رسولؐ کی پیروی کامیاب زندگی کی ضمانت ہے۔ جھوٹ، فریب، غیبت، چغلی، حسد، کینہ، بغض، ناحق قتل، زنا، سودی کاروبار، رشوت لینا دینا سب سے بڑی بیماریاں ہیں۔ ہم چھوٹی سی بات پر بھی جھوٹ بول لیتے ہیں حالانکہ یہ گناہِ کبیرہ ہے۔ جو صرف توبہ سے ہی معاف ہوتا ہے شرک سے بچیں۔ حقوق العباد کو احسن طریقے سے نبھائیں۔ صلہ رحمی اور بھائی چارے کی فضا قائم کریں۔ مدیرِ اعلیٰ نے جو فرمایا وہ بجا ہے مگر کائنات کا نظام ۔۔۔ اللہ پاک چلا رہا ہے۔ جو وہ چاہتا ہے وہی ہوتا ہے۔ زمین کے نیچے کیڑوں کو روزی مل رہی ہے۔ جو کسی کے مقدر میں لکھ دیا گیا ہے اس سے کم زیادہ نہیں ملے گا۔ یہ تو آزمائشیں ہیں کہ کون حلال کی کوشش کرتا ہے اور کون حرام کی طرف جاتا ہے۔ جیسی قوم ویسی ہی حکومت ان پر مسلط ہوگی۔ یہ عارضی اختیارات دیے گئے ہیں۔ روزِ محشر بہت سختی سے پوچھ گچھ ہوگی۔ پچاس ہزار سال کا ایک دن حساب کتاب میں گزرے گا۔ تانبے کی زمین، سوا نیزے پر سورج، ہر جن و انس پسینے میں غرق، حساب کے لیے پکارا جائے گا۔ جو عمل کرنا ہے اچھا کریں۔ صفدر معاویہ صاحب ایک تو آپ کو جیل سے رہائی پر مبارک باد جو پہلے نہیں دے سکا۔ دوسری کرسیِ صدارت مبارک۔ تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ عبدالغفور ساغری خٹک کو میرا شعر پسند آیا۔ نوازش۔ قدرت اللہ نیازی، عبدالجبار رومی انصاری، ادریس احمد خان کے تبصرے زبردست تھے۔ سب تحریریں خوب صورت تھیں، خدنگِ ثانی سے کم گشتہ تک...... مگر منظر امام کی بہار سے پہلے اور ضیا تسنیم بلگرامی کی، جانِ جاناں کا خلیفہ بہت پسند آئیں۔ ابلیسی بھی اچھی تحریر تھی۔ محفل شعر و سخن میں گئے تو شعروں میں عبدالغفور ساغری خٹک، محترمہ شازیہ کراچی، صبا سحر کراچی، محمد قدرت اللہ نیازی اور محمد اشفاق سیال کے اشعار اچھے لگے۔''

✠ علی عمران، ملتان سے محفل میں شریک ہیں ''سپنس 2010ء سے پڑھنا شروع کیا تھا۔ پہلی بار محفلِ دوستاں کا حصہ بننے کی جسارت کر رہا ہوں۔ (خوش آمدید) سرورق بے حد پسند آیا۔ سوشل میڈیا پر اسما قادری کی تحریر شیش محل کی کافی تعریف سنی تھی سو سب سے پہلے اس کو پڑھنا شروع کیا۔ تقسیمِ ہند سے قبل کے زمانے کو سامنے رکھتے ہوئے لکھی گئی اسٹوری بہترین ثابت ہوئی۔ جولیٹ پر بے حد غصہ آیا جب اس نے فاروق کو جھڑک دیا۔ ویلڈن اسما قادری اس کے بعد ڈاکٹر ساجد امجد کی تحریر پڑھی۔ فلسطین کے پس منظر میں تحریر کردہ کہانی نے دل پر گہرا اثر چھوڑا۔ علاوہ ازیں ابلیسی، انصاف طلب اور جال ساز عمدہ تحریریں تھیں۔ منظر امام نے بھی بہترین لکھا۔ محفلِ دوستاں میں مدیرِ اعلیٰ .... کا اداریہ ملکی حالات کی عکاسی کرتا دکھائی دیا۔ وکٹری اسٹینڈ پر محمد صفدر معاویہ براجمان ہیں۔ مبارک ہو بھائی۔ باقی خطوط میں عبدالجبار رومی، طاہرہ گلزار، محمد قدرت اللہ نیازی، سید عبادت کاظمی اور رتابی بالو نے اچھا لکھا۔''

✠ محمد صفدر معاویہ، تحصیل و ضلع خانیوال سے چلے آ رہے ہیں ''سرورق کو بہت ہی پیارے اور دلکش انداز سے سجایا گیا۔ ماڈل اور چاند نے مل کر سرورق کو چار چاند لگا دیے۔ جون ایلیا محترم مژدہ کے ساتھ انسان کو اس کی اوقات بتا رہے تھے کہ مٹی کے انسان نے آخر مٹی میں رل جانا ہے، چاہے وہ نیک ہو یا بد۔ ساتھ میں حکومت کے بارے میں بھی کہ یہ ہر دفعہ عوام کو دلاسے دیتے ہیں کہ آپ کا ہر دکھ درد ہماری حکومت آتے ہی ختم ہو جائے گا لیکن بعد میں پوچھتا بھی کوئی نہیں۔ بہرحال کم از کم مجھے یہ یقین ہے کہ ہم نہ سہی ہماری نسل ہی دیکھے گی کہ سپیدۂ سحر نمودار ہوگی جو پاکستان کو بے مثال لازوال اور تابناک مستقبل کی طرف لے کر جائے گی۔ اب وہ وقت دور نہیں۔ آپ اداریہ میں [illegible] کو اور ملکوں کی مثال دے کر بتاتے نظر آئے کہ لوگ کیسے کیسے ترقی کرتے ہیں اور ایک ہم وہیں کے وہیں نظر آتے ہیں جہاں سے چلے

تے۔ بات یہ بھی ہے کہ وہاں کے عوام بھی باشعور ہیں اور وہ تعاون کرتے ہیں قانون کو ہاتھ میں نہیں لیتے اور ہمارے ہاں تو کوئی قانون نظر نہیں آتا۔ اگر ہم عوام ٹھیک ہو جائیں اور اسلام کے مطابق زندگی گزاریں تو کوئی وجہ نہیں حکمران ٹھیک نہ ہوں ورنہ یہ تو اکثر سنا ہوگا جیسی عوام ویسے حکمران۔ اپنی محفل میں پہنچے تو خود کو صدارتی کرسی پر براجمان دیکھ کر خوشی ہوئی۔ محمد خواجہ بھی بہت عمدہ اور بھرپور تبصرہ کرتے نظر آئے۔ رومی بھائی کا تبصرہ بھی جاندار رہا اور ہمیشہ ہوتا بھی ہے جاندار۔ محمد حنیف گبول بھی مختصر تبصرے کے ساتھ محفل کی رونق بڑھاتے ہوئے نظر آئے۔ میرے ہم شہر نیازی کا تبصرہ بھی بہت عمدہ رہا۔ قاسم رحمٰن کاظمی بھائی اور ساغری خٹک بھی اپنے تبصروں کے ساتھ محفلِ رونق۔ ریاض علی البغدادی کا بھی اچھا تبصرہ تھا۔ باقی تمام دوستوں کے تبصرے بھی عمدہ رہے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے شیش محل پڑھی۔ اب ہو گئے ایڈونچر شروع۔ گروپ کا آپس میں تصادم اور آخر جولیٹ کا اغوا۔ اب امید ہے کہ فاروق کا ہنر اور کھل کر سامنے آئے گا ابھی تو جیل میں پہنچ چکا۔ اگلی قسط کے منتظر ہیں۔ پھر ماروی پڑھی۔ اس دفعہ ماروی نے بہت زیادہ بور کیا۔ مکس ہوتے جا رہے ہیں کردار۔ ماروی نیک مقصد کے لیے جا رہی ہے اللہ اسے کامیاب کرے۔ خدنگِ عثمانی کا یہ حصہ بھی بہت عمدہ رہا۔ یہ جنگ وجدل اور ذکریا کے دل میں ناہید کے لیے محبت بہت اچھا لگا۔ ملک صفدر حیات انصاف طلب لے کر آئے جس میں ملک صاحب کو اتنی زیادہ محنت نہیں کرنا پڑی۔ اس دفعہ قاتل کو تلاش کرنے کے لیے طفیل کے جملے نے قاتلوں تک رسائی آسان بنا دی۔ یعقوب ترکھان کی بے بسی پر آنسو سے آ گئے۔ ڈاکٹر ساجد امجد کی گم گشتہ فلسطین کے پس منظر پر لکھی گئی بہت عمدہ تحریر رہی جہاں پر کچھ بڑوں نے ساز باز کر کے اسرائیلیوں کو رہنے کی جگہ دی اور پھر یہودیوں نے قبضہ کر لیا اور کچھ فلسطین کی نئی نسل کی عدم توجہ نے ملک کو تباہ کروانے کی کسر نہ چھوڑی۔ منظر امام بہار سے پہلے لے کر آئے جس میں شیریں کی کہانی دکھی کر گئی۔ ہمارے معاشرے میں اکثر ایسے واقعات ہوتے ہیں، بے حسی کی انتہا ہے۔ محفل شعروسخن بھی عمدہ رہی۔ رضوانہ ساجد جال ساز لے کر آئیں۔ فیصل نے کیا خوب لوٹا دونوں بہنوں کو۔ اب وہ مکان کے در پے تھا لیکن کیا خوب بدلہ لیا نادرہ نے۔ اگر وہ ایسا نہ کرتی تو ان کی زندگی عذاب بنی رہتی۔ باقی تمام کہانیاں بہت عمدہ رہیں۔ کترنیں بھی اچھی تھیں۔ کراچی میں یہ تو فائدہ ہوا ماہنامہ جلدی مل جاتا ہے اور تبصرہ جلدی پوسٹ کر دیتے ہیں۔ آج 17 کو میں تبصرہ پوسٹ کر رہا ہوں اور کل انشاء اللہ عید کے لیے گھر نکل جاؤں گا۔ ہمارے شہر میں آج شام کو یا کل صبح جا کر ملے گا سسپنس اور ہم ادھر تبصرہ کر رہے ہیں۔ کراچی زندہ باد۔"

⊠ **سید عبادت کاظمی**، ڈیرہ اسماعیل خان سے محفل میں شریک ہوئے ہیں "سرورق اس مرتبہ اچھوتا اور بہترین تھا۔ حسینہ کے ہونٹوں نے اٹریکٹ کیا لیکن اگر بند ہوتے تو اور اچھا ہوتا۔ یہ ہماری طرح کوئی جذبوں کے پجاری محبوبہ کی آنکھوں پر چاند سجانا چاہتے تھے۔ جون ایلیا کی کچھ کڑوی میٹھی باتیں مزہ دے گئیں۔ محفلِ دوستاں میں محمد صفدر معاویہ نے سب کو پیچھے چھوڑ کر کرسی صدارت پر قبضہ کیا۔ مبارک باد قبول کریں۔ اپنے عزیز قاسم بھائی کو یہاں دیکھ کر خوشی ہوئی۔ ویسے دوستوں سے شکوہ ہے ہمیں یہاں ویلکم نہیں کیا گیا۔ (ارے بھئی خوش آمدید) عبدالجبار رومی کا تبصرہ شاندار تھا۔ طاہرہ گلزار یہاں آپ کو دیکھ کر خوشی ہوئی۔ گزشتہ دنوں طبیعت ناساز رہی۔ محمد قدرت اللہ نیازی کا تبصرہ اچھا تھا۔ زویا اعجاز، عائشہ رانی، سید محی الدین اشفاق آپ لوگ جلد حاضری دیں۔ کہانیوں میں شیش محل سب سے پہلے پڑھی۔ وہی ہوا جس کا ڈر تھا جولیٹ اغوا ہو گئی۔ نیا کردار چاند بانو کا اضافہ اچھا لگا لیکن..... کوٹھے والیوں کے ہاں جو چاند ہوتے ہیں شاید وہ ادھورے ہوتے ہیں جن کی کوئی تکمیل نہیں کر پاتا۔ اسما قادری کے قلم کا جادو تیزی سے ہمیں جکڑ رہا ہے۔ ماروی پھر الٹی رفتار پر چل پڑی ہے، یہ مراد کو کیا ہو گیا ہے۔ جال ساز رضوانہ ساجد ایک اچھے موضوع کے ساتھ آئیں۔ رشتے نہ ہوں تو انسان کو احساس ہوتا ہے۔ گم گشتہ کچھ خاص متاثر نہیں کر پائی۔ ہمیشہ کی طرح ملک صفدر حیات چھا گئے۔ محفل شعروسخن میں اشفاق شاہین کا انتخاب دل کو چھو گیا۔ باقی رسالہ زیرِ مطالعہ ہے۔"

⊠ **عبدالجبار رومی انصاری**، چوہنگ لاہور سے محفل کی زینت بنے ہیں "خوب صورت کہانیوں کا مجموعہ سرورق کے خوب صورت رنگ لیے سسپنس کا شمارہ وقت پر ہی مل گیا تھا۔ دلکش حسینہ تو آنکھیں موندے کسی کے گہرے عشق میں ڈوبی ہوئی تھی۔ مجنوں نما شخص چاند کو پکڑے ہوئے تھا جس سے لگ رہا تھا شیش محل کے پری ضرور مل کے رہیں گے۔ سرورق میں صوفیانہ سبز رنگ بھی نمایاں تھا۔ جون ایلیا کا انشائیہ زبردست تھا۔ مٹھی بھر مٹی لے کر اتنی گہرائی سے مشاہدہ کیا کہ گزشتگان میں ہامان اور نمرود تک کا انجام دیکھ لیا اور مژدہ میں سمجھا دیا کہ آخر کار ہم سب نے بھی اسی میں فنا ہونا ہے۔ اداریے کی باتیں ہمیشہ ہی سپرہٹ ہوتی ہیں۔ ہمارے حکمرانوں کو حکمرانی کے پانچ سال تو ملتے ہیں جس میں وہ سیٹ ہوتے ہوتے ہی ٹائم گزار دیتے ہیں تو بھلا وہ ملکی حالات سنوارنے کے لیے مصمم ارادے کہاں سے لائیں؟ اپنی بارونق محفل..... عروج پر ہے جن دوستوں بہن بھائیوں نے مجھے مبارک باد دی اور خلوصِ دل سے یاد رکھا میں ان کا تہ دل سے مشکور ہوں۔ محمد صفدر معاویہ اس دفعہ صدرِ محفل ہیں، مبارک ہو بھائی آپ کو۔ محمد خواجہ بھائی ذہن کو آزاد ہی رکھنا چاہیے تاکہ زندگی کی مشکلات کو صبر و تحمل سے گزار لیا جائے۔ طاہرہ گلزار میں خفا نہیں ہوتا۔ ہاں کبھی کبھی بلیک لسٹ میں بھی گزارہ کرنا پڑتا ہے۔ تبصرہ شاندار ہے۔ واہ رے سید عبادت کاظمی آپ کو تو سرورق سے میٹھی کسک مل جاتی ہے، بہت اچھی بات ہے۔ ریاض علی بغدادی نے بھی باریک بینی سے لفظوں کو تبصرے میں ڈھالا ہے اچھا لگا۔ رمضان پاشا جی میرا نام تو عبدالجبار رومی انصاری ہے۔ عبدالستار تو نہیں۔ بہرحال یہ بھی اچھا لگا۔ باقی دوستوں میں محمد یوسف

سانول، بشیر احمد، قمر صائم، محمد حنیف، قدرت اللہ نیازی، عبدالغفور، فلک شیر، ادریس احمد، جاوید شبیر، تابی اور بالو، اشفاق شاہین اور مرزا طاہر الدین کے تبصرے بھی بہت اچھے تھے۔ احمد خان توحیدی کاش کالا باغ ڈیم بن سکے تو سیلابی پانی بھی کنٹرول ہو اور بجلی کا مسئلہ بھی حل ہو جائے۔ شیر جان جاناں کے خلیفہ شاہ غلام علی نے کیا خوب کہا کہ غیبت کرنے والا اور سننے والا برابر ہوتے ہیں۔ سو اس سے بچیں۔ اللہ کے ولیوں کی بھی کیا زندگی ہوتی ہے۔ روحانیت میں اس درجہ کمال کو پہنچے ہوتے ہیں کہ اپنے مرید کو راستہ دکھانے جنگل میں پہنچ جاتے ہیں۔ جانِ جاناں کا خلیفہ، شاہ غلام علی کے ایمان افروز واقعات پڑھ کے دل خوش ہو گیا۔ کنیز کو کسی قابل جانیے تو کسی روز شرف ملاقات عنایت کیجیے۔ دل و نظر ہر دم فرشِ راہ رہیں گے۔ واہ کیا کہنے چاند بانو کے۔ فاروق پر ہی مر مٹی۔ دوسری طرف بیچاری جولیٹ کو دلدار نے اغوا کر لیا اور فاروق ولیم کے لفڑے میں پڑ گیا ہے۔ وہاں سے نکلے گا تو امید ہے جولیٹ کو چھڑا لائے گا۔ اسما قادری کی شیش محل سپرہٹ جا رہی ہے۔ بہت مزے کی تحریر ہے۔ ایک مسلمان کی نظر دنیا پر نہیں آخرت پر ہوتی ہے اور آزاد فلسطین کے لیے ہمیشہ آواز بلند ہوتی رہے گی۔ احمد خلیل کی اسما کے ساتھ بچپن کی معصومانہ زندگی سے لے کر اخیر تک نہایت اثر انگیز تحریر تھی۔ ڈاکٹر ساجد امجد کی اس کم گشتہ نے بہت متاثر کیا۔ خس کم جہاں پاک ملک صفدر حیات نے جو پیش کیا مضبوط چالان، تو عائشہ کے قاتل رانا بہادر اور شونکا کے ہو گئے خطا اوسان، ویلڈن ملک صاحب! بہت اچھی لگی آپ کی انصاف طلب۔ تبھی تو معترف ہے آپ کا اک جہان۔ جہاں تک عشق کا تعلق ہے یہ کسی ہانڈی کے ابال جیسی شے کا نام ہے اور عورت اک سراب ہے۔ زندگی بھر دھوکے میں رکھتی ہے۔ سلطان اور استاد ارسلان، ذکریا کو عشق بازی اور عورت سے دور کرنا چاہتے ہیں لیکن اس کے تابعدارانہ عمل کے گرویدہ ہو جاتے ہیں اور دلی طور پر ناہید کو اس کے لیے ڈھونڈ لیتے ہیں لیکن ذکریا کے لیے ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں۔ خدنگ عثمانی اسٹوری بھی زبردست ہے...... ہے...... کیا تمہیں مدد کی ضرورت ہے۔ دھوکے باز لوگ ہر بار بڑی خوب صورتی سے سیدھے سادے لوگوں کو اپنے جال میں پھانس کر اپنے تجربات کی بھینٹ چڑھا لیتے ہیں۔ جیسے کاشف زبیر کی ایلیسی میں سونیا...... جیکل اور مارکس کے شیطانی چکر میں پھنستے پھنستے نکل آتی ہے۔ پراسرار کہانی اچھی تھی۔ کہانی ماروی کا نام ”مراد کے عشق“ ہونا چاہیے تھا۔ میڈونا سے رہائی ملی تو مرینہ سے نکاح ہونے لگا تو قاضی صاحب کو مراد میں اپنا بیٹا جان محمد نظر آ گیا۔ تو فی الحال مرینہ بھی دل تھام کے بیٹھ گئی۔ دوسری طرف قسمت کی ماری ماروی بھی مراد سے باغی ہو گئی ہے۔ دیکھو اب بابا اجمیری کی پیش گوئی کیا رنگ لاتی ہے اور انکل محی الدین نواب کی ماروی کہاں تک جاتی ہے۔ محفل شعر و سخن میں ہادیہ ایمان، ماہا ایمان، نبیلہ ملک جہلم اور محمد یوسف سانول کے شعر زبردست تھے۔ اپنے پیارے وطن کے لیے اور امتِ مسلمہ کے لیے ہمیشہ دعا گو رہیں“

✠ احمد خان توحیدی، پاکستان اسٹیل، کراچی سے تبصرہ کر رہے ہیں ”حسینہ ٹائٹل محو خواب بکھرے بال محبوب عید کا چاند پکڑے لفٹ کا منتظر ہے۔ سب ساتھیوں کو دوبارہ عید مبارک۔ معتبر ذرائع اور بائی فون اطلاع ملی کہ کرسیِ صدارت پر پرائم منسٹر بننے والوں نے بٹیر، کبوتر اور مرغی کی قربانیاں کی ہیں۔ میرا حصہ گوشت مجھے دے کر میرے چوزے کا گوشت لے جائیں۔ انشائیہ، جون ایلیا، مژدہ یعنی خوش خبری۔ مٹی کے خمیر سے بننے والے حضرت انسان محلوں اور جھگیوں میں موت واقعی برابر انصاف کرتی ہے۔ حضرت عمرؓ جیسے عادل، قائداعظم و لیاقت علی خان جیسے بااصول جن کی رتی بھر جاگیر نہ تھی۔ جو کہتے، کر کے دکھاتے۔ تب عوام کو حق ملے گا۔ اداریہ میں آپ نے ابوظہبی و کیلی فورنیا کا حوالہ دیا تو انہیں قوم کا مفاد اول، ہمارے لیڈران کو ذاتی مفاد عزیز۔ قدرتی وسائل سے مالا مال، عوام کو صرف یہ کر دیا جائے گا، وہ کر دیا جائے گا، کسی نے یہ کر دیا ہے، کی خوشخبری نہ دی۔ صفدر معاویہ، مبارک باد کے ساتھ غریب ساتھیوں سے عید وصول کرتے نظر آئے۔ تبصرہ شاندار ہے۔ بے بی گڑیا طاہرہ گلزار، سعدیہ بخاری، بشریٰ افضل، زویا اعجاز اینڈ سسٹرا لیکلی کا اللہ بیلی، آپ کے حق میں ووٹ دے کر ایک دوسرے کے بال نہ نوچنے اور سب ساتھیوں سے کسی کے نجی معاملات میں دخل نہ دینے کی اپیل کی ہے۔ پروفیسر و لیکچرار طاہرہ گلزار نے عید کے چاند کی طرح نقاب کشائی فرمائی۔ صرف مجھے جاہل بڈھا سمجھ کر ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا (یہ آپ کی غلط فہمی ہے) تبصرہ و یری گڈ۔ شیش محل کا ٹکٹ لیا۔ ربن دادا، مجو دادا کی دھینگا مشتی، ثریا اور چاند بانو کا دیدار فاروق شاید دوسرا مراد...... چاند بانو خود آ گئی۔ آخر جولیٹ کا اغوا تحریر میں وزن اور صفحات کم ہیں۔ ملک صاحب کی انصاف طلب، واقعی انصاف مل گیا۔ ملک صاحب اور بیگ صاحب کی اسٹوریاں بہت اچھی لیکن خوشاب کے کینو کھانے والے یوسف سانول و دیگر ساتھیوں کی طرح میں بھی اکتاہٹ محسوس کرتا ہوں۔ حسام بٹ میں بہت ٹیلنٹ و عظیم رائٹر ہیں۔ حنیف گبول، کاشف، شبانہ حسن، عمران خان کے اشعار اچھے ہیں۔ رضوانہ ساجد کی جال ساز، فیصل جیسے بے ضمیر کو بیگم نادرہ نے قتل کر کے اچھا کیا پھر ماروی کو روپوشی سے روکنے کے لیے نواب صاحب سے التجا کہ مراد کی تو کوئی مراد پوری نہیں ہوتی۔ بزرگوں نے تین نکیل ڈال کر 20 ووٹ کا سربراہ بنا دیا۔ چوتھی شرعی حد کی نکیل ڈال کر حسرت پوری کر دیں۔ مراد کو جان محمد بنا دیا میڈونا گم ہو گئی۔ نوری کے شکنجے میں مراد کو جکڑنے کی سعی۔ بہرحال برصغیر میں اسلام پھیلانے والے۔ حضرت اجمیریؒ، مجدد الف ثانی، حضرت داتا گنج بخشؒ جیسے عظیم بزرگوں اور کلام پاک کے سامنے دنیا کی کوئی کالی ماتا نہیں ٹھہر سکتی۔ منظر امام کی دلخراش، بہار سے پہلے، شیریں کی قاتل اس کی ماں ہے۔ آخری صفحات پر ڈاکٹر ساجد صاحب کی کم گشتہ اچھی طویل تحریر، اہل کتاب عورت سے اسماعیل کا نکاح تو جائز ہے لیکن بچوں کو اسلام سے روشناس نہ کرانا بڑی غفلت اور گناہِ کبیرہ ہے۔ خصوصاً ناپاک اسرائیل کے بارے میں بچوں کو آگاہ کرنا لازم تھا۔ قاسم رحمان، طاہرہ

گلزار کے تبصروں میں وزن ودلچسپی زیادہ ہے۔ غفور ساغری، ریاض البغدادی، جاوید شبیر، یوسف سانول، ادریس احمد خان، فلک شیر، قدرت اللہ نیازی، حنیف گبول، رومی انصاری، خواجہ کراچی، طاہر الدین بیگ کے اچھے تبصرے تھے۔ اکثر ساتھی غیر حاضر ہیں۔ بوجہ عید کی آڑ میں ملنے والے مہمان۔ مہمان کو اللہ کی رحمت سمجھ کر مصروفیت میں پڑھ نہ سکے۔''

✱ نادر سیال، کندیاں سے تشریف لائے ہیں ''اکتوبر کا شمارہ 22 ستمبر کو موصول ہوا۔ صبح کا وقت ہے اور ہلکی ہلکی بوندا باندی ہے۔ بڑا ہی خوش گوار موسم ہے لیکن میرے اندر کا موسم بڑا ہی دردناک ہے۔ اتنے ماہ غیر حاضر رہا۔ ایک وجہ تو سسپنس ہم تک بہت دیر سے پہنچتا ہے اور دوسری وجہ میرے محترم والد صاحب اس دنیا سے کوچ کر گئے۔ اسی صدمے میں رہا جب تھوڑا سا دکھ ہلکا ہوا تو حاضری دینے بیٹھ گئے۔ میری تمام قارئین سے التجا ہے کہ میرے محترم والد کے لیے دعائے مغفرت کریں (اللہ! آپ کے والد کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔ ہم سب آپ کے غم میں برابر کے شریک ہیں) پانچ ماہ سے سسپنس ہمارے علاقے میں بہت لیٹ آتا ہے۔ امید ہے میری اس درخواست پر ضرور توجہ دی جائے گی۔ بات کرتے ہیں ٹائٹل گرل کی۔ خوب صورت گرل تو مزے سے آنکھیں بند کیے ہوئے پتا نہیں کن خیالوں میں کھوئی ہوئی ہے۔ اس کو پتا بھی نہیں کہ بیچارہ عورت نما آدمی کب سے ہاتھ میں چاند پکڑے کھڑا ہے۔ محفل یاراں میں سب دوستوں کے تبصرے پڑھے۔ واقعی دوستو! آپ سب چڑھتے سورج کی پوجا کرنے والے لوگوں میں شامل ہو۔ کسی نے بھی میرا ذکر نہیں کیا کہ نادر سیال آپ کیوں محفل سے غیر حاضر ہو۔ محمد صفدر معاویہ مبارکاں اور عبدالجبار رومی، محمد خواجہ، طاہرہ گلزار، محمد حنیف گبول، سید عبادت کاظمی، قاسم رحمان اور رمضان پاشا ان سب کے تبصرے اچھے تھے۔ اب رخ کرتے ہیں سلسلہ وار کہانی جو میری پسندیدہ رائٹر اسما قادری کے قلم سے لکھی گئی ہے۔ شیش محل کہانی کی دوسری قسط پڑھی تو میرا ذہن بڑی تیزی سے بہت پیچھے چلا گیا۔ (جب ایک جیسا ماحول ڈسکس کیا جاتا ہے تو بہت مماثلت آجاتی ہے اس میں حیرانی کی بات نہیں) اس میں فاروق اور ربن دادا کا کردار مجھے پسند آیا۔ جولیٹ کو دلدار آغا نے اٹھوا لیا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کس طرح سے فاروق جولیٹ کو آغا کے چنگل سے چھڑواتا ہے۔ کچھ بات کرتے ہیں محی الدین نواب کی تحریر ماروی کی۔ بابا ہامراد کے ساتھ بھی عجیب تماشا ... ہو رہا ہے۔ دیکھتے ہیں مولوی صاحب سے کس طرح جان چھڑاتا ہے۔ مجھے تو کہانی میں بابا صلاح الدین اجمیری کی شخصیت بہت متاثر کر رہی ہے۔ واقعی اللہ کے پہنچے ہوئے بزرگ اب بھی دنیا میں موجود ہیں انہی کی دعاؤں سے اور انہی کی وجہ سے یہ دنیا قائم ودائم ہے۔ محفل شعروسخن میں مہتاب شیروانی، داؤد اشفاق اور ملائکہ حریم کے شعر دل کو لگے۔ ویری نائس۔''

✱ علی امجد، ضلع ساہیوال سے محفل میں شرکت کر رہے ہیں ''کہانیوں میں سب سے پہلے منظر امام کی خوب صورت تخلیق بہار سے پہلے پڑھی۔ اس تحریر نے رلا دیا۔ فکر و آگہی کے نئے دریچے وا کیے۔ منظر امام واقعی احساس کے لکھاری ہیں۔ مختصر تحریروں میں وہ بہت کچھ کہہ جاتے ہیں۔ شیریں ایسی جانے کتنی ہی حوا کی بیٹیاں ہیں جو جہنم کی تپش دنیا میں ہی پالیتی ہیں۔ بہت خوب صورت منظر امام صاحب! رضوانہ ساجد کی معاشرتی کہانی جال ساز پڑھی۔ خوب کہانی ہے۔ ساغر نے برسوں پہلے کہا تھا۔ فریب راہوں میں بیٹھ جاتا ہے، صورتِ اعتبار بن کر۔ جانے دنیا کی منزل کیا ہے۔ بس بے نام سی راہ گزاروں سے گزرتے جاتے ہیں۔ منزل کوئی نہیں۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی شاہکار تخلیق سودائے جنوں کے بعد ارضِ فلسطین پر ڈاکٹر ساجد امجد نے گم گشتہ کے ساتھ حاضری دی۔ پوری کہانی کو ایک ہی نشست میں پڑھا ہے۔ بہت اعلیٰ تحریر ہے۔ مصنف کو خاکسار کا سلام پہنچے۔ سسپنس کے لیے ایسے اہلِ قلم کا وجود غنیمت ہے۔ سب سے آخر میں ماروی پڑھی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ کہانی مایوس کر رہی ہے۔ بہت سے قارئین ادارے سے مطالبہ بلکہ عاجزانہ التماس کر رہے ہیں کہ مسافر کے لکھاری ناصر ملک سے کچھ لکھوایا جائے۔'' (آپ کی رائے مصنف تک پہنچ گئی ہے)

✱ محمد قدرت اللہ نیازی، حکیم ٹاؤن، خانیوال سے چلے آرہے ہیں ''اکتوبر کا شمارہ بروقت ملا۔ تاہم بڑی عید کی بڑی مصروفیات مطالعے کی راہ میں حائل رہیں۔ بہرحال محفلِ خطوط کے علاوہ چند تحاریر پڑھنے میں کامیاب ہو ہی گئے۔ خطوط کی محفل میں جن دوستوں نے تبصرے کی پسندیدگی کا اظہار کیا ان کا تہ دل سے مشکور ہوں کہ آپ دوستوں کی محبت اور پسندیدگی ہمارے لیے مہمیز کا کام کرتی ہے اور وقت نکال کر تبصرہ تحریر کیا جاتا ہے۔ تمام نئے دوستوں کو محفل میں خوش آمدید۔ سب سے پہلے تذکرہ ہو جائے نئے سلسلے شیش محل کا۔ شیش محل بلاشبہ ایسی تحریر ہے جس کا انتظار رہتا ہے۔ فاروق اور مجو کے گرگوں کی ''چاقووانہ لڑائی'' نے مزہ دیا۔ اس وقت محسوس ہوا کہ بہادری تو گنوں کی ایجاد سے پہلے کی بات ہے۔ اب تو بچے ہاتھوں میں کلاشنکوف لیے قتل کرتے پھرتے ہیں نہ کوئی مہارت چاہیے نہ کوئی جسمانی مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ ٹریگر دبائیں اور بات ختم۔ ''چاقو پوائنٹ'' پر انگریز افسر کی یرغمالی بھی خوب رہی۔ فاروق کی بہادری اور جرأت نے متاثر کیا۔ اس کے بعد خدنگِ عثمانی پڑھی۔ تاریخ کے اوراق پڑھ کر دل چاہا کہ کوئی ٹائم مشین ہوتی اور ہم اس دور کا اپنی آنکھوں سے نظارہ کر سکتے۔ ذکریا بے چارہ مشکل میں پھنسا ہوا ہے۔ استاد ارسلان کا خواب بجا محسوس ہوا کہ سلطان کی قربت میں ہر وقت موت کا خوف سوار رہتا ہے۔ ینی چری سپاہ کو ایک روبوٹ بنانے کی پوری کوشش کی جاتی تاہم فطرت پر بند کب باندھے جا سکتے ہیں۔ ذکریا اور پھر استاد ارسلان کے مکالمے ان کی ذہنی

وجذباتی کشمکش آشکار کرتے محسوس ہوئے۔ کترنیں مقدار و معیار میں بہتر نظر آئیں۔"

❀ مرزا طاہر الدین بیگ، میر پور خاص سے تشریف لائے ہیں "سسپنس اکتوبر کا محمد صفدر معاویہ، طاہرہ گلزار اور دیگر لکھنے والے اچھا لکھا گیا۔ تاریخ کے جھروکوں سے دوسری قسط ٹھیک ٹھاک، اب تیسری قسط کا انتظار۔ ملک صاحب کا ایک اور زبردست کارنامہ سچ کہا ہے جیسی کرنی ویسی ہی بھرنی۔ ملک صاحب نے زبردست چالان بنایا تاکہ دوسروں کو عبرت حاصل ہو۔ منظر امام صاحب بہار سے پہلے لے کر آئے اور سب کو رلا گئے۔ معصوم بچی کا کردار منظر صاحب ہی کا کارنامہ ہے۔ شعروشاعری نبیلہ ملک، شازیہ کراچی اور کمال انور لاجواب اشعار لے کر آئے۔ رضوانہ ساجد کا جال ساز خوب رہا۔ فیصل جیسے کردار انسانیت کا ناسور مگر ایسے ناسوروں کو اور فاخرہ جیسی لڑکیوں کو آپ کس خانے میں فٹ کریں گے۔ انگلش ادب سے اپنے ماحول میں لکھنا زبردست کام ہے اور یہ سسپنس میں بدیسی رنگ کو دیسی رنگ میں ملیں گی زبردست کہانیاں۔ ڈاکٹر ساجد امجد صاحب خوب لکھا۔ زبردست آئندہ اس سے بھی زبردست کی امید ہے۔"

❀ رضوان احمد، کورنگی، کراچی سے تبصرہ نگاری کر رہے ہیں "سسپنس کی سب سے اچھی بات یہ ہے کہ اچھے بچوں کی طرح وقت کی قدر کرتے ہوئے ہمیں مل جاتا ہے۔ دیگر شمارے اپنی جگہ لیکن سسپنس کی بات ہی کچھ اور ہے۔ اس کے پڑھنے والے بے شک محفل میں شامل نہ ہوں مگر اس سے دوستی ختم نہیں کر سکتے۔ اگرچہ نیٹ اور موبائل نے ریڈر شپ پر اثر ڈالا ہے۔ نئی نسل بھی کتابوں سے کچھ دور ہو گئی ہے۔ بہر حال مطالعے کے شوقین اپنا شوق کسی نہ کسی طرح وقت نکال کر پورا کر لیتے ہیں جیسا کہ ہم...... بہت معروف زندگی ہو گئی ہے، پرانی دوستی چھوڑی نہیں جاتی۔ اکتوبر کا شمارہ بروقت مل گیا اور حسبِ روایت اپنی شان برقرار رکھتے ہوئے بہت اچھی کہانیاں فہرست میں شامل تھیں۔ سب سے پہلے شیش محل پڑھی...... فاروق بھائی کا کردار دل میں ہلکے سے چٹکی لیتا ہے۔ خاموش محبت بھی کیا چیز ہوتی ہے۔ جولی کا کردار بھی مضبوط ہے۔ عورت کی وفا اور ہمت کا منہ بولتا ثبوت...... اب دیکھنا یہ ہے کہ آگے یہ کردار کس طرح اپنے تقاضے نبھاتا ہے۔ گریٹ اسما قادری! آپ کی ہر تحریر کا میں منتظر رہتا ہوں۔ ماروی نواب صاحب کے قلم کی روانی...... اگرچہ خیالات کی فراوانی بہت ہے مگر محبوب اور مراد کے کردار کو خوبی نبھا رہے ہیں۔ ماروی شش و پنج کا شکار نہ آگے بڑھنے کی ہمت نہ پیچھے ہٹنے کا حوصلہ...... لیکن دل ہے کہ مکمل اجارہ داری چاہتا ہے۔ محبت میں شرارت اور اپنی تذلیل کسی طور گوارا نہیں کرتا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ تھالی کا بینگن کس کے حصے میں جاتا ہے۔ آخری صفحات پر کافی عرصے بعد ڈاکٹر ساجد امجد کی حاضری ہوئی۔ گم گشتہ یہودی سازشوں پر مشتمل دلچسپ کہانی تھی۔ مسلمانوں کے لیے لمحۂ فکریہ ہے کہ یہ ظلم آخر کب تک نسل در نسل ہوتا رہے گا۔ بے شک امتِ مسلمہ ہمت و شجاعت سے ڈٹی ہوئی ہے مگر دعا ہے کہ اب امن و سکون اور فتح نصیب ہو جائے۔ خدنگِ عثمانی تاریخی لمحات کا احاطہ کرتی خوب صورت کہانی ثابت ہو رہی ہے۔ جانِ جاناں کا خلیفہ ضیا تسنیم بلگرامی کی دل کو چھو لینے والی کاوش۔ ایمان تازہ ہو گیا۔ اوہو رضوانہ ساجد بھی جال ساز لے کر حاضر ہیں۔ سچ ہے جو لوگ وقت پر خوش بختی کی قدر نہیں کرتے۔ وہ ایسے ہی زندگی کی فریب کاریوں میں الجھتے ہیں۔ جب اچھے رشتے تھے تو قدر نہ کی پھر ظاہر ہے اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔ ثمر عباس کا انتقام بھی دلچسپی کے تمام تر لوازمات کے ساتھ بہت اچھی تحریر تھی۔ محفل شعروسخن کا ہر شعر دل پر اثر کرتا ہے۔ بہت خوب صورت محفل بجی ہے یہ...... کترنیں بھی لاجواب ہیں۔ کاشف زبیر کی ابلیسی بہت ہٹ کے تھی۔ کاشف کی یہی انفرادیت ہے کہ چن چن کے خاص تحریریں لکھتے ہیں۔ انصاف طلب حسام بٹ کے قلم کا جادو اور ملک صفدر حیات کی کاوش بہت دلچسپ امتزاج بنتا ہے۔ ویلڈن...... تمام دوستوں کو سلام۔"

❀ زریان سلطان، اردو بازار، کراچی سے تشریف لائے ہیں "ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ اول تو ہم لکھ نہیں پاتے اور جو کبھی غلطی سے کوئی خط لکھ دیا تو بلیک لسٹ میں ڈال دیا گیا یا پھر نام بھی شائع نہ ہو سکا۔ بہر حال ایک بار پھر حاضر ہیں۔ محمد صفدر معاویہ صدارت مبارک ہو۔ کبھی شاید ہمارا یہ خواب بھی پورا ہو جائے نہ ہوا تو بھی کوئی شکوہ نہیں۔ اس بار عید الضحیٰ غم بھی لے کر آئی...... حج کے دوران مسلمانوں پر جو مصیبت آئی ہم سب اس غم میں برابر کے شریک ہیں۔ اللہ پاک ہم سب پر اپنا رحم کرے (آمین) تاریخ کے جھروکے سے خدنگ عثمانی الیاس سیتاپوری کے قلم سے رقم ہو رہی ہے۔ ذکریا نے جس طرح اپنی محبت کو چھوڑا مگر اس پر قائم نہ رہ سکا۔ یہ ثابت کرتا ہے کہ اگر عشق سچا ہو تو کسی پل چین نہیں ملتا۔ وہ بھی بے قرار رہا ناہید کے لیے۔ اگلے حصے کا انتظار رہے گا۔ گم گشتہ آخری صفحات پر ڈاکٹر ساجد امجد کا نیا انداز دیکھا...... صیہونی سازشوں کا پردہ چاک کرتی ایک تلخ حقیقت جسے پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے لیے ایمانی قوت کس قدر اہم ہے جس کے بغیر ہم شر کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اتحاد و یگانگت میں ہی ہماری بھلائی ہے۔ سلیم انور کی چرب زبان پڑھ کر ہنسی آ گئی۔ سچ بات ہے کچھ لوگ ہاتھوں سے محنت کرتے ہیں اور کچھ لوگ باتوں کی کھاتے ہیں۔ ابلیسی کاشف زبیر کی ایک زبردست تحریر تھی۔ علم کا غلط استعمال بھی غلط نتیجہ دیتا ہے۔ وہ جو دوسروں کو قید کرنے نکلے تھے خود موت کے زندان میں پھنس کر رہ گئے۔ جانِ جاناں کا خلیفہ ضیا تسنیم بلگرامی کی تحریر پڑھ کر علم میں اضافہ ہوا۔ شیش محل کا بے چینی سے انتظار ہونے لگا ہے جس نے پہلی قسط سے ہی ہمیں اپنے سحر میں گرفتار کر لیا ہے۔ ہر کردار نگینے کی طرح فٹ اور بھرپور نظر آتا ہے۔ ایک دو مزید اقساط میں کہانی کھل کر سامنے آئے گی۔ بہر حال ویلڈن

اسماجی۔ منظر امام نے تو اس بار رلا ہی دیا۔ بہار سے پہلے پڑھ کر دل ملول سا ہو گیا۔ بہت اچھی کہانی تھی۔ ملک صفدر حیات کی ڈائری کے اوراق میں اس بار انصاف طلب میں ایک اور بے بس کی روداد حاضر تھی۔ رضوانہ ساجد کی جال ساز بھی پڑھ کر مزہ آ گیا۔ جیسی کرنی ویسی بھرنی کی مثال ایک عبرت اثر تحریر تھی۔ سچ کا سامنا میں تنویر ریاض نے بہت اچھی منظر کشی کی۔ محفل شعر و سخن، تمام اشعار لاجواب تھے۔ خاص طور پر کاشف خان، راولپنڈی اور ایم الیاس، پشاور کے اشعار بے مثال تھے۔ خطوط کی محفل میں تمام دوستوں کے تبصرے بھی میں بہت شوق سے پڑھتا ہوں۔ یہی تو ایک ذریعہ ہے آپس میں رابطے رکھنے کا۔ آپ سب کو اللہ خوش رکھے۔''

* مہتاب احمد، حیدر آباد سے تشریف لائے ہیں۔ ''یہ سسپنس میں ہمارا پہلا خط ہے۔ گو کہ ہمیں سسپنس پڑھتے ہوئے کافی عرصہ نہیں گزرا ہے۔ تاہم لگتا ہے جیسے ہمارا اور سسپنس کا ساتھ بہت پرانا ہے۔ لگتا ہے ہم برسوں سے اس کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ سسپنس میں شائع ہونے والی کہانیوں کا معیار بہت عمدہ ہوتا ہے جو یقیناً تمام ارکان کی محنت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ امید کرتے ہیں ہمارے اس خط کو محفل میں جگہ ملے گی۔ یوں تو ہم اپنی زندگی کا پہلا خط لکھ رہے ہیں پتا نہیں الفاظ کا چناؤ ٹھیک ہے یا غلط۔ مگر انسان کو کوشش تو کرنی چاہیے جو ہم کر رہے ہیں۔ اکتوبر کا سسپنس ملا۔ ٹائٹل پر موجود صنفِ نازک کو دیکھا تو یوں لگا کہ اپنی پڑوسن کو دیکھ رہے ہیں۔ بہت ہی ملتے جلتے نقوش تھے، سوچا فوراً پڑوسن کے دروازے پر دستک دے کر انہیں آگاہ کریں کہ وہ سسپنس کے ٹائٹل پر جلوہ افروز ہو گئی ہیں مگر پھر خود کو اس اظہار سے روک لیا کہ اس میں نقصان کا بھی اندیشہ تھا۔ خیر ٹائٹل پر نظر مار کے آگے بڑھے اور سب سے پہلے اپنی فیورٹ کہانی ماروی کا دیدار کیا۔ کیا کہنے نواب صاحب کے۔ بہت عمدہ جا رہی ہے۔ مراد دوسرے نکاح کے لیے سر توڑ کوششیں کر رہا ہے مگر تمام کوششیں رائگاں جا رہی ہیں۔ ویسے اس کی ثابت قدمی دیکھ کر محسوس ہو رہا ہے کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے گا۔ ماروی بھی خود کو بدلنے کی تیاریوں میں مصروف ہے۔ دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔ خدنگِ عثمانی میں ذکریا فٹبال کی طرح ادھر ادھر لڑھک رہا ہے۔ ایک طرف سلطان کی خوشنودی کا حصول ہے تو دوسری طرف ناہید کی محبت۔ بے چارہ ذکریا پریشان ہے کہ کیا کرے کیا نہ کرے۔ ابلیسی کاشف زبیر کی بہترین کہانی تھی۔ ہم کہانی میں ایسے کھوئے کہ اختتام پہ جا کے ہوش آیا۔ کیا سسپنس تھا کہانی میں۔ بہت عمدہ تھی۔ اسما قادری کی شیش محل ابھی شروع ہوئی ہے۔ امید کرتے ہیں کہ کہانی کا بہاؤ ابھی اور تیز ہو گا۔ ویسے لگ رہا ہے کہ کہانی اچھی ہو گی۔ چھوٹی کہانیاں سچ کا سامنا، جال ساز، چرب زبان، انتقام، بہار سے پہلے، جال ساز ابھی پڑھی نہیں۔ ضیا تسنیم کی تحریر بہت اچھی لگی۔ ایمان افروز واقعات پڑھے۔ کترنیں بھی اچھی تھیں۔ ملک صفدر حیات کی انصاف طلب کچھ مزہ نہ دے سکی، ہمیں بورنگ لگی۔ (یہ ہمارا اپنا خیال ہے) انشاء اللہ اگلے ماہ بھرپور تبصرے کے ساتھ حاضر ہوں گے اس امید کے ساتھ کہ ہمیں محفل میں جگہ ملے گی۔ ہم دعا گو ہیں کہ آپ کا ادارہ مزید ترقی کرے (آمین)''

* اطہر حسین، کراچی سے لکھ رہے ہیں۔ ''ماہ اکتوبر کا سسپنس دیکھا، ٹائٹل پر ایک صاحب چاند ہاتھ میں تھامے اپنی کامیابی کے نشے میں چور نظر آ رہے تھے۔ ادھر حسینہ آنکھیں موندے جانے کس احساس تلے ٹھنڈی آہیں بھر رہی تھی۔ بہر حال اکتوبر کا ٹائٹل بس ٹھیک لگا۔ پھر فہرست پر سرسری نظر ڈال کے جون ایلیا کا مژدہ پڑھا۔ سب سے پہلے اسما قادری کی شیش محل سے آغاز کیا۔ کہانی میں ٹیمپو سلو ہے۔ بہت سست رفتاری سے آگے بڑھ رہی ہے۔ اس کے بعد تاریخی کہانی خدنگِ عثمانی پڑھی۔ ذکریا کے حالات و واقعات پڑھ کے اس پر ترس آیا۔ بے چارہ سلطان کے آگے مجبور ہے اور اپنی خواہشات کی تکمیل اور زندگی کو اپنے ڈھنگ سے گزارنے سے گریزاں ہے۔ ماروی میں تیزی آ گئی ہے۔ مراد دوسرے نکاح کے لیے بے تاب ہو رہا ہے۔ مگر بابا اجمیری کی پیش گوئی کے مطابق بات بنتے بنتے بگڑ جاتی ہے۔ ادھر ماروی بھی خود کو بدلنے اور گمنام ہونے کی تیاری کر رہی ہے۔ آگے دیکھیے کیا ہو گا۔ ڈاکٹر ساجد امجد کی گم گشتہ بہت ہی خوب صورت تحریر تھی۔ پڑھ کے مزہ آ گیا۔ ملک صفدر حیات کی انصاف طلب میں وہی قتل کا معاملہ کرتے دکھایا گیا۔ بہر حال ملک صاحب نے نہایت دانش مندی سے اس معمے کو حل کیا۔ منظر امام کی بہار سے پہلے ایک خودسر اور ضدی لڑکی کے گرد گھومتی کہانی تھی۔ مگر آخر میں اس لڑکی کے حالاتِ زندگی پڑھ کے دل نہایت غمگین ہو گیا اور پھر وہ لڑکی دارِ فانی سے کوچ کر گئی۔ معاشرے کی عکاسی کرتی بہت اچھی کہانی تھی۔ محفل شعر و سخن بھی اچھی رہی۔ جال ساز میں نادرہ بیگم نے اپنی بہن کو بچانے کے لیے برائی کو ہی جڑ سے مٹا دیا۔ بہر حال انہوں نے اپنی بہن کے لیے جو قربانیاں دیں، اس کی مثال نہیں ملتی۔ واقعی نادرہ بیگم اپنی بہن سے بہت محبت کرتی تھیں۔ ضیا تسنیم بلگرامی کی تحریر پڑھ کر ایمان تازہ ہو گیا۔ سلیم انور کی چرب زبان بہت عمدہ کہانی تھی۔ مختصر تھی مگر پڑھ کے مزہ آ گیا۔ کاشف زبیر کی ابلیسی بس ٹھیک رہی۔ ہار قلم سے ملتی جلتی تھی۔ اس کے علاوہ سچ کا سامنا، انتقام اور کترنیں بھی ٹھیک رہیں۔ مجموعی طور پر شمارہ بہتر تھا۔ آپ سے گزارش ہے کہ طاہر جاوید مغل کا کوئی سلسلہ شروع کریں یا پھر چھوٹی کہانیاں ہی شائع کریں۔ ان کا طرزِ تحریر ہی جدا ہے اور یقیناً یہی آواز بہت سے قارئین کی ہو گی کہ وہ سسپنس کے صفحات پر طاہر جاوید مغل صاحب کی کہانی پڑھیں۔''

✠ ثاقب کمال، کراچی سے شرکت کررہے ہیں ”یہ ہمارا سسپنس میں پہلا خط ہے۔ اس سے پہلے ہم نے چاہا کہ آپ کو خط لکھیں مگر جسارت نہ کر پائے کہ جانے ہمارا خط ردی کی نذر نہ ہوجائے مگر پھر ہم نے ٹھان ہی لی کہ ایک بار کوشش تو کرنی چاہیے۔ سب سے پہلے ہم نے فہرست پہ نگاہ ڈالی۔ عموماً لوگ ٹائٹل پر نظر ثانی کرتے ہیں مگر ہم نے روایت کو توڑتے ہوئے فہرست کو چنا۔ ماروی کو چھوڑا اور دوبارہ ریورس گیئر لگا کر جہاں سے چلے تھے، وہیں آن پہنچے۔ ایک بار پھر فہرست پر نگاہ جمائی اور اپنے فیورٹ رائٹر کاشف زبیر کی ابلیسی پڑھی۔ کیا کہنے کاشف صاحب آپ کے۔ دل خوش کردیا آپ نے۔ ایسا لگا کہ ہر منظر ہماری آنکھوں کے سامنے چل رہا ہے۔ جب شروعات اچھی ہو تو آگے کے تمام مراحل آسان ہوجاتے ہیں اسی لیے جب ہم نے دوبارہ ڈائجسٹ اٹھایا تو اس میں ایسے مگن ہوئے کہ کھانے کا ہوش رہا نہ پینے کا۔ مدہوشی سے ہوش تک کا سفر امی کی آواز پہ ٹوٹا۔ خیر یہ الگ کہانی ہے کہ امی نے ہمیں کیا کہا مگر یقین جانیے جتنی دیر ہم سسپنس سے دور رہے، ہماری بے قراری بڑھتی رہی۔ خیر دو گھنٹے بعد جب دوبارہ ملاقات کا شرف حاصل ہوا تو اک عجیب سی خوشی تھی جس کا لفظوں میں اظہار ممکن نہیں۔ دوبارہ جب مطالعے کے لیے کمر کسی تو الیاس سیتا پوری کی خدنگِ عثمانی ہمارے روبرو تھی۔ ذکریا کے حالات پڑھ کے ہم پر بھی ذکریا جیسی قنوطی کیفیت طاری ہوگئی۔ ذکریا بے چارہ سلطان کی جی حضوری کے چکر میں ناہید سے جدائی برداشت کررہا ہے اور سلطان ہے کہ اسے آزمائش میں ڈال رہا ہے۔ خیر دیکھیں آگے کیا ہوتا ہے۔ کہانی میں دلچسپی اینڈ تک برقرار رہی۔ یہی الیاس صاحب کی کہانیوں کا خاصا رہا ہے کہ قاری ان کی تحریر میں کھو جاتا ہے اس کے بعد ملک صفدر حیات کی انصاف طلب پڑھی۔ کہانی بہتر تھی۔ اس کے بعد ضیا تسنیم بلگرامی کی تحریر پڑھی۔ بہت اچھی تحریر تھی۔ چھوٹی کہانیوں میں ہمیں منظر امام کی بہار سے پہلے بہت پسند آئی۔ مختصر مگر بہترین کہانی تھی۔ جال ساز میں ایک بہن کی بہن سے محبت کو دکھایا گیا۔ نادرہ بیگم نے اپنی بہن کو ایک شیطان کے چنگل سے آزاد کرا ہی لیا۔ ماروی اور شیش محل کو ہم نے آخر کے لیے اٹھا چھوڑا تھا کیونکہ دونوں ہی سلسلے ہمیں ازحد پسند ہیں۔ باقی چھوٹی کہانیاں ہم نے جلدی جلدی پڑھیں، کچھ اچھی لگیں اور کچھ بورنگ سی لگیں۔ پھر جا پہنچے ماروی کی طرف۔ کہانی میں حالات و واقعات اتنی تیزی سے وقوع پذیر ہورہے ہیں کہ مزہ آگیا۔ کیا کہنے نواب صاحب کے۔ کہانی تیز رفتاری کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہے۔ اب دیکھنا ہے کہ مراد مرینہ سے نکاح کرپائے گا یا ایسے ہی ٹاک ٹوئیاں مارتا رہے گا۔ ادھر شیش محل بھی اپنے ڈگر پر رواں دواں ہے۔ فاروق کا اپنی محبت کے لیے پریشان ہونا اور پھر جولیٹ کا اغوا...... یقین جانیے کہانی میں ایسے گم ہوئے کہ پتا نہ چلا۔ ادھر چاند بانو کو بھی فاروق سے عشق ہو چلا ہے۔ نہ جانے یہ عشق کیا گل کھلائے۔ بہت اچھی تحریر ہے۔ اسما قادری کو مبارکباد۔ باقی تبصرہ اگلے ماہ۔“

✠ حنا عروج، کراچی سے محفل میں شریک ہیں ”اکتوبر کا شمارہ ہر اعتبار سے ابھار رہا۔ ٹائٹل گرل نے اس بار کافی متاثر کیا۔ اپنے دوستوں سے شکوہ ہے اتنے عرصے سے ہم محفل سے غیر حاضر رہے مگر کسی نے بھی ہمارا تذکرہ کرنا مناسب نہ سمجھا۔ چلیں جی کوئی بات نہیں۔ ہم خود ہی بتا دیں کہ ہم تقریباً آٹھ سال سے بہت بیمار ہیں۔ لیکن ہم نے سسپنس سے دوستی قائم رکھی ہوئی ہے۔ وقتاً فوقتاً حاضری بھی دیتے رہے ہیں مگر اب حالت زیادہ خراب ہوگئی ہے۔ اسی وجہ سے تھوڑی دوری ہوگئی ہے۔ ان سب کے باوجود ہم خاموش دوستی نبھاتے ہوئے سسپنس کے ساتھ ہیں۔ دعا کریں اللہ ہمیں جلد صحت یابی دے۔ اب چلتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ تاریخی صفحات کا اپنا ایک مزہ ہے۔ اس کی افادیت سے انکار ممکن نہیں۔ نیا سلسلہ شیش محل اسماء قادری نے بہت خوب شروع کیا ہے۔ ابھی تو آغاز ہے۔ دیکھیے آگے کیا رنگ نکلتا ہے اس کا۔ اگر ہم رہے تو مکمل سلسلہ پڑھ لیں گے۔ ماروی بھی اب دھیرے دھیرے اپنے جوبن پر آرہی ہے۔ بس کبھی کبھی پٹڑی سے اتر جاتی ہے۔ آخری صفحات پر ڈاکٹر ساجد امجد کا نیا انداز پڑھا۔ اچھا لگا۔ یہودیوں کی سازشیں ایسے ہی ناکام ہوتی رہیں گی۔ محفل شعر و سخن کا ہر شعر معیاری اور دل میں اتر جانے والا ہوتا ہے۔ منظر امام کی کہانی بہار سے پہلے پڑھ کر دل کو دکھ ہوا۔ بہت اچھی کہانی تحریر کی ہے۔ ویلڈن۔ تنویر ریاض ہمیشہ مغربی کہانیاں لے کر آتے ہیں۔ اس بار سچ کا سامنا میں بھائی کے ہاتھوں بہن کا قتل پڑھ کر سنسنی سی محسوس ہوئی۔ اچھی اسٹوری تھی۔ جون ایلیا کا ناصحانہ انداز ہمیشہ کوئی نہ کوئی سبق دے جاتا ہے۔ اداریے میں آپ کی کڑوی کسیلی باتیں تلخ حقائق پر مبنی ہوتی ہیں۔ ایک بات ضرور کہیں گے کہ کہانیوں کے بارے میں جو نوٹ لکھے جاتے ہیں، وہ مجھے بہت اچھے لگتے ہیں۔ اس بار محفل کے صدر محمد صفدر معاویہ تھے۔ مبارکاں جی...... باقی دوستوں کے تبصرے بھی اچھے رہے۔ ہمارے لیے دعا ضرور کیجیے گا۔“

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہوسکے۔

امتیاز خٹک، ضلع اٹک۔ جعفر صدیق، ساہیوال۔ نوشین ناز، ملتان۔ صبا نور، دادو۔ سلیم ایاز، گلشن اقبال۔ کامران قیوم، نارتھ کراچی۔ کلثوم ضیا، لاہور۔ منیر داور، بہاولپور۔ احمد رضا، لاہور۔ راشد حبیب تابش، پسب ضلع اٹک

خدنگ عثمانی

الیاس سیتاپوری

تیسرا حصہ

دنیا میں اللہ تعالیٰ نے عجیب مزاج کے لوگ پیدا کیے... جنہوں نے آگے چل کر کسی نہ کسی حوالے سے اپنی ذات کو ایک شناخت دی، جو فنا کے مرحلے سے گزرنے کے بعد بھی باقی رہ جاتی ہے... یہی حال اس کا بھی تھا جس کی زندگی میں عجیب و غریب موڑ آئے اور اس نے اپنے طریقے سے ان کا سامنا کیا... ماضی ایک ایسا قیدخانہ ہے جسے وہ اپنے حصار میں قید کرلے اس کا ذکر آنے والے دنوں میں کسی نہ کسی حوالے سے ضرور دہرایا جاتا ہے... تاریخ کا یہی اصول ہے، دن ہر دن تو گزرتے جاتے ہیں مگر ان داستانوں پر وقت کی گرد نہیں جمتی... وہ بھی کسی سرزمین کا بادشاہ نہ تھا اس کے باوجود اس کے حالات کا تغیر، واقعات کا تسلسل اور جذبات کا طوفان اس کی شخصیت کو ایک الگ ہی رنگ دے گیا۔ جسے بولنے کی جسارت نہ تھی، چلنے کا سلیقہ اور جینے کا حوصلہ نہ تھا... راتوں کی تنہائیوں میں ڈر جانے والی ذات جب ایک نئے ولولے سے زندگی کا ہنر سیکھ لے تو دنیا واقعی حیران رہ جاتی ہے... اور یہی کارنامہ اس نے بھی انجام دے کر کتنی ہی زبانوں کو گنگ کردیا... اور یہ سب مقدر کی مہربانیوں سے ہی ممکن ہوتا ہے کہ کوئی تاریخ کے ایک اہم کردار اور دلچسپ داستان میں ڈھل جائے۔

ماضی کا آئینہ... با اختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات

سلطان اماسیہ میں پورا موسم سرما گزارنا چاہتا تھا مگر اپنی فوج سے مطمئن نہیں تھا۔ اس نے اس فوج کو آرمینیا کی تسخیر پر لگا دیا اور کامیاب رہا۔ وہ اپنی فوج کے جوش اور جذبے کو زندہ اور برقرار رکھنا چاہتا تھا مگر وطن کی دوری نے سپاہیوں کو دل برداشتہ کر رکھا تھا۔ سنان پاشا، استاد ارسلان اور زکریا سلطان کے سب سے زیادہ پرستار اور فرمانبردار تھے لیکن یہ بھی کبھی کبھی سلطان کی ضد اور انا سے عاجز آجاتے۔ زکریا، ناہید کی وجہ سے سلطان کا بہت زیادہ مطیع اور مجاور ہورہا تھا۔ اب اس کی ہر وقت یہی کوشش رہتی تھی کہ وہ سلطان کے پاس زیادہ سے زیادہ وقت گزارے لیکن سلطان کی مرضی کے بغیر ایسا ممکن نہ تھا۔

وہ ناہید کے خیمے کے پاس جاتا اور اس کے آس پاس گھوم پھر کر واپس آجاتا۔ اس کو بہت افسوس تھا کہ ناہید کے خاندان پر جو بیتی تھی اور صفی الدین کو جس طرح قتل کیا گیا تھا، معلوم نہیں کس طرح ناہید اس سے اچھی طرح واقف ہوچکی تھی۔ وہ اپنی صفائی میں ناہید سے کچھ کہنا چاہتا تھا مگر

ایسا موقع ہاتھ نہ آتا تھا۔
رات کو خیموں میں ہزاروں شمعیں روشن ہو جاتی تھیں۔ زکریا اپنے خیمے سے ناہید کے خیمے میں روشن شمع کی جھلک دیکھتا رہتا اور اپنے دل میں ایک لذت آمیز کسک محسوس کرتا رہتا۔ سنان پاشا کی تیز نظریں زکریا کے سینے میں موجزن عشق بلاخیز کی کیفیات کو دیکھ اور محسوس کر رہی تھیں۔ استاد ارسلان بھی زکریا کی کیفیات کو اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ ان دونوں کو ایک ہی دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کہیں اس کی کوئی بات سلطان کو بری نہ لگ جائے۔
زکریا نے کوشش کی کہ وہ ناہید کے خیمے کی نگراں خاتون سے ساز باز کر کے ناہید سے ایک تفصیلی ملاقات کرے اور اس کے دل اور دماغ پر موجود نفرت کے گرد وغبار کو اپنی موثر اور پُر دلیل باتوں سے ضائع کر دے لیکن نگراں خاتون سلطان کے غصے اور عتاب سے ہر وقت لرزہ براندام رہتی تھی۔ اس کا دماغ غیر معمولی تھا۔ اس نے مفاہمت نہ ہوسکنے کے بعد زکریا کو ناہید کے خیمے کے آس پاس ٹہلتے دیکھا تو کانپ گئی۔ آہستہ سے زکریا کے پاس پہنچی اور سرزنش کرنے کے انداز میں پوچھا۔ ”نوجوان! تو یہاں کیا لینے آتا رہتا ہے؟“
زکریا نے بڑے معنی خیز انداز میں جواب دیا۔ ”خاتون! میرا خیال ہے اس سوال کا جواب آپ کے پاس بھی موجود ہے۔“
عورت نے پوچھا۔ ”وہ کس طرح؟“
زکریا نے جواب دیا۔ ”خاتون! آپ جس خیمے کی نگرانی فرما رہی ہیں، وہاں ناہید رہتی ہے۔ میری روح، میری کائنات اور میری تمنا۔ میں اس سے چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“
عورت نے اس کو جھڑک دیا۔ ”صاحبزادے! کیا تو اپنے ہوش وحواس میں نہیں ہے اس وقت؟ تو یہ کس لڑکی کی بات کر رہا ہے، ناہید سے تو واقف بھی ہے بھلا؟“
زکریا نے جواب دیا۔ ”خاتون! میں اس سے اتنا واقف ہوں کہ یہاں کوئی اور شخص اس سے، مجھ سے زیادہ واقف ہونے کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔“
عورت نے جلدی جلدی کہا۔ ”اچھا اب تو یہاں سے چلا جا، ورنہ اگر کسی نے تجھے اس وقت یہاں دیکھ لیا اور سلطان کو اس کی خبر کر دی تو ہم دونوں ہی کسی مصیبت کا شکار ہو جائیں گے۔“
زکریا نے جواب دیا۔ ”اچھا اگر آپ اس سے میری ملاقات نہیں کرا سکتیں تو اتنا تو کرسکتی ہیں کہ میری طرف سے اسے کہہ دیں کہ اس کے ساتھ جو کچھ بھی ہوا، اس میں میری کوئی خطا نہیں۔ میں بے قصور ہوں اور میں اپنے ناکردہ گناہ کی معافی چاہتا ہوں۔“
عورت نے زکریا کو دھمکی دی۔ ”نوجوان! تو فوراً چلا جا یہاں سے، ورنہ میں شور کر دوں گی۔ میں ناہید سے کسی کی بھی کوئی بات نہیں کہہ سکتی۔ ہوسکتا ہے کل میں یہ باتیں سلطان معظم کے گوش گزار کر دوں۔“
زکریا مایوس اور دل شکستہ وہاں سے واپس آیا۔ اس کا دل ڈوبا جا رہا تھا۔ بے بسی اور مجبوری کا احساس اس کا دم گھونٹے دے رہا تھا۔ اس نے اپنے خیمے کے در پر میخ سے بندھی ہوئی رسی کے پاس کسی کو بیٹھے ہوئے دیکھا جہاں روشنی نہ ہونے کی وجہ سے اس شخص کو پہچانا نہیں جاسکتا تھا۔ زکریا نے اس پر کوئی توجہ دیے بغیر ہی اپنے خیمے میں داخل ہو جانا چاہا مگر وہ شخص کھڑا ہو گیا اور کہا۔ ”نوجوان! تجھے استاد ارسلان یاد فرما رہے ہیں۔“
زکریا نے پوچھا۔ ”کیا ابھی؟ اسی وقت؟“
اس نے جواب دیا۔ ”ہاں، ابھی اور اسی وقت۔“
زکریا کا جی تو نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ استاد ارسلان کے پاس اس وقت چلا جائے لیکن وہ ناہید کی وجہ سے کسی کو بھی ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ کسی کو ناراض نہ کرنے سے کوئی شخص کسی وقت بھی اس کے کام آسکتا ہے۔
زکریا استاد ارسلان کے خیمے میں داخل ہوا تو وہ یہ دیکھ کر پریشان ہو گیا کہ استاد اپنی پشت پر ہاتھ رکھے ... بے چینی سے ٹہل رہا ہے۔ وہ زکریا کو اپنے سامنے دیکھتے ہی جہاں تھا وہیں کھڑا ہو گیا اور کچھ دیر ٹکٹکی باندھے زکریا کی صورت دیکھتا رہا پھر پوچھا۔ ”زکریا! تو کہاں گیا تھا؟“
زکریا سمجھ گیا کہ استاد ارسلان کو اس بات کا علم ہو چکا ہے کہ وہ ناہید کے خیمے کی نگراں خاتون سے کچھ نازیبا باتیں کر رہا تھا۔ اس نے صاف صاف کہہ دیا۔ ”استاد محترم! جب تک ناہید کا قرب میسر نہ آیا تھا، میں اس خوش فہمی میں مبتلا تھا کہ میں نے اپنے جذبۂ عشق پر بھی قابو پالیا ہے لیکن اب میں اپنے آپ کو سیلِ عشق میں ایک تنکے کی طرح پا رہا ہوں۔“
استاد ارسلان نے لعنت ملامت کی۔ ”زکریا! تو نے سلطان کے دل میں اعتماد پیدا کر لیا ہے۔ اس لیے احتیاط کر اور صبر وتحمل سے کام لے۔ تجھے اپنی زندگی میں بہت کچھ کرنا ہے اگر تیری زندگی میں ابھی سے بے اعتدالی اور افراط وتفریط نے جگہ بنالی تو، تو نہ صرف یہ کہ سلطان کے اعتماد سے

محروم ہو جائے گا بلکہ عملاً بھی ناکارہ ہو جائے گا۔ ناہید کا خیال اپنے دل سے نکال دے کیونکہ وہ شاہ صفوی کی بیوی ہے اور اس کو کسی بھی وقت شاہ کے پاس واپس بھیجا جاسکتا ہے۔''

زکریا کو اپنے استاد کی باتوں میں خلوص اور وزن محسوس ہوا۔ خجالت سے جواب دیا۔ ''استاد محترم! میں شرمندہ ہوں اور وعدہ کرتا ہوں کہ میں آئندہ احتیاط سے کام لوں گا اور ناہید کا خیال تک اپنے دل سے نکال دوں گا۔''

استاد ارسلان نے مزید تنبیہ کی۔ ''مجھے معلوم ہوا ہے کہ سلطان معظم ناہید کے سلسلے میں تجھ پر گہری نظریں رکھے ہوئے ہیں۔''

زکریا نے جواب دیا۔ ''اگر یہ بات ہے تو میں سلطان کے اعتماد کو بہر حال برقرار رکھنے کی کوشش کروں گا۔''

استاد ارسلان چار شاخوں والے شمع دان کے نیچے بیٹھ گیا اور اپنے سامنے زکریا کو کھڑا رکھا، بولا۔ ''زکریا! کیا تو اس چار شاخوں والے شمع دان کو دیکھ رہا ہے؟''

زکریا نے سادگی سے جواب دیا۔ ''جی استاد محترم! دیکھ رہا ہوں۔''

استاد نے پوچھا۔ ''اس کی روشنی کہاں کہاں پہنچ رہی ہے؟''

زکریا نے جواب دیا۔ ''شمع دان کے نچلے حصے کے علاوہ ہر جگہ پہنچ رہی ہے۔''

استاد کے چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہو کر غائب ہوگئی، بولا۔ ''زکریا! یہی حال ان سب کا ہے جو سلطان کے مقربین میں ہوتے ہیں۔ سلطان شمع کے مانند ہوتا ہے اور ہم سب اس کے زیر سایہ بلکہ اس شمع کے سایہ تلے۔ سلطان سے وہ لوگ تو فائدہ حاصل کر لیتے ہیں جو کبھی کبھی تقرب حاصل کر لیتے ہیں اور رہے ہم تم جیسے زیرِ نگیں لوگ، تو اکثر محروم ہی رہتے ہیں اس طرح جس طرح چراغ تلے اندھیرا رہتا ہے۔''

زکریا نے دل شکستہ لہجے میں کہا۔ ''استاد محترم! یہ بھی کوئی زندگی ہے۔ میں اپنے اندر ایک طوفان سا محسوس کر رہا ہوں جو ادھر ادھر پھیلنے اور بڑھنے کے لیے تلملا رہا ہے۔ یہ سرکشی پر مائل ہے لیکن سلطان کا خیال اس کو جوئے کم آب رکھنا چاہتا ہے۔ اگر یہ دباؤ اسی طرح برقرار رہا تو میں کسی وقت بھی اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھوں گا۔''

استاد ارسلان نے اسے جھڑک دیا۔ ''یہ ساری شاعرانہ باتیں ہیں۔ میرے پاس ان باتوں کا وقت نہیں ہے۔ میری باتوں کا لب لباب یہ ہے کہ ناہید یا کسی لڑکی یا عورت کو تیری زندگی میں داخل نہیں ہونا چاہیے۔ اگر ایسا ہو گیا تو یہ بھی سن لے کہ وہیں سے تیری زندگی میں ٹھہراؤ، جمود اور بزدلی پیدا ہو جائے گی جو کسی بھی مرد کے لیے حقارت اور ذلت کا نشان ہوتی ہے۔''

زکریا بھی ان باتوں سے تنگ آچکا تھا، بیزاری سے بولا۔ ''اے کاش میں ایک عام انسان ہوتا اور مجھے سلطان کا قرب نہ حاصل ہوا ہوتا۔ سلطانی قرب کے اعزاز نے ہم انسانوں کو اس کے سوا اور کیا دیا ہے کہ ہمیں یہ نہیں کرنا چاہیے، ہمیں وہ نہیں کرنا چاہیے، ہمیں اس سے پرہیز اور اس سے گریز کرنا چاہیے۔''

استاد ارسلان نے تند تیز نظروں سے زکریا کو گھورا۔ ''تو یقیناً جنسی دباؤ کا شکار ہے۔ اس وقت میں تجھ سے کوئی بات بھی نہ کروں گا، تو جاسکتا ہے۔ جانے سے پہلے یہ سنتا جا، اگر تو سلطان کی آزمائشوں سے گزر گیا تو ایک نہ ایک دن کوئی بہت بڑا منصب حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔''

زکریا کوئی جواب دیے بغیر ہی خیمے سے نکل گیا۔ وہ ہر قدم پر کھڑی قدغنوں سے اتنا عاجز اور دل برداشتہ تھا کہ اب وہ یہ سوچ رہا تھا کہ اسے اس ماحول میں رہنا بھی چاہیے یا نہیں۔ اسے جزیرۂ نیٹ کا آبائی مکان یاد آرہا تھا۔ چوبی مکانات کے سلسلے، مچھلیوں کی بو اور حدِ نظر تک پھیلا ہوا سمندر کا پانی۔ اس کو وہ گرجا بھی یاد آیا جس میں انسانوں کا ہجوم بڑی پابندی سے جایا کرتا تھا۔ گرجے کی گھنٹیاں جو ہر روز صبح و شام سنائی دیتی تھیں۔ گرجے کے خیال کے ساتھ ہی اس کو اپنا مسلمان ہونا یاد آگیا۔ مسجد میں، جس میں مسلمان پانچ وقت جمع ہو کر خدائے واحد کی عبادت کیا کرتے تھے، اس کو مسجدوں کے سامنے گرجوں کا وجود حقیر اور مضحکہ خیز سا محسوس ہوا۔ مسجدوں سے بلند ہونے والی پانچ وقت کی اذانیں اور گرجوں کی گھنٹیوں کا شور، اسلام نے اس کے دل و دماغ میں گھر کر لیا تھا اس لیے گرجوں میں واپس جانے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔

اس نے وہ ساری رات بڑے کرب اور اضطراب میں گزاری۔ رات کو خواب بھی اسی الجھن کے دکھائی دیتے رہے۔ وہ کئی بار چونک چونک پڑا لیکن طبیعت پر قابو رکھا۔ صبح ہوتے ہوتے وہ اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ اس کو جو کچھ کرنا ہے، اپنی قوتِ بازو اور بل بوتے پر کرنا ہے۔

وہ کئی دن تک اپنے خیمے سے نہیں نکلا۔ اس کو کچھ پتا نہ تھا کہ سنان پاشا اور استاد ارسلان اس کے بارے میں کس طرح سوچ رہے ہیں۔ سلطان نے اس کی بابت کیا

فیصلہ کیا ہے۔ طبیعت کی بیزاری نے اس کو عزلت نشینی پر مجبور کردیا تھا مگر دل کے کسی گوشے میں یہ اندیشہ چٹکیاں لے رہا تھا کہ استاد ارسلان، سنان پاشا اور سلطان کی نظروں سے ایک دم اوجھل ہو جانا کتنا خطرناک ثابت ہوسکتا ہے۔

ایک دن وہ اپنے خیمے کے در پر کھڑا حدِ نظر تک پھیلے ہوئے عساکر سلطانی کے خیموں کا مشاہدہ کررہا تھا۔ اس نے خیموں کے سامنے اماسیہ کی وہ شاہراہ دیکھی جو باہر سے آنے والے سلطانی عساکر تک آنے کے لیے استعمال کرتے تھے۔ اس شاہراہ پر دوسری حکومتوں کے قاصد اور سفیر اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار، انہیں دلکی چال سے دوڑاتے بھگاتے نظر آتے تھے۔ انہیں نہایت تکلف اور اہتمام سے سلطانی دارالضیافت تک پہنچا دیا جاتا۔ زکریا نے اس شاہراہ پر چند گھڑسواروں کو سلطان کے خیمے کی طرف جاتے ہوئے دیکھا۔ ان کے چہرے گردوغبار میں اٹے ہوئے تھے۔ زکریا نے ان کی شکل اور وضع قطع سے یہ اندازہ لگالیا کہ یہ مسافر ہیں جو کسی دور دراز مقام سے چلے آرہے ہیں۔ وہ انہیں دیکھ کر خیمے کے اندر چلا گیا۔

کچھ ہی دیر بعد اس نے سلطانی مناد کی آواز سنی جو اعلان کررہا تھا کہ جنہیں سلطان کا تقرب حاصل ہے، وہ اسی وقت سلطان کی خدمت میں حاضر ہوجائیں۔

زکریا نے سوچا کہ اسے سلطان کے پاس جانا چاہیے یا نہیں، وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اسے سلطان کا تقرب حاصل ہے اور اگر اس نے حاضری نہ دی تو اس کے نتائج بہت برے نکلیں گے۔ اس نے اپنے پورے وجود میں خوف کی ایک لہر سی دوڑتی ہوئی محسوس کی۔ دل نہ چاہنے کے باوجود وہ اٹھا اور سلطانی بارگاہ کے شایانِ شان لباس پہن کر سلطان کے خیمے کے در پر جا کھڑا ہوا۔ دربانوں نے اسے اندر جانے کا راستہ دے دیا۔ وہ اندر پہنچا تو وہاں کا منظر ہی کچھ عجیب تھا۔ تشویشناک اور فکر آمیز سنان پاشا اور استاد ارسلان سلطانی چوکی کے دائیں بائیں مستعد اور چوکنا کھڑے تھے۔ ان کے سامنے سلطانی عساکر کے نامور سردار اور علمبردار کھڑے تھے۔ ان کے شاندار عماموں کی نمائش ایسی نہ تھی جو دیکھنے والے کو متاثر کیے بغیر رکھتی۔ زکریا نے اس دربار میں اپنی جگہ تلاش کی تو وہ سب سے پیچھے ملی۔ وہ وہیں دبک کر کھڑا ہوگیا۔ سلطان ابھی تک نہیں آیا تھا۔

کچھ دیر بعد نقیب کے شور میں سلطان نمودار ہوا۔ نقیب بہ آواز بلند حاضرین کو سلطان کی آمد سے مطلع کررہا تھا۔ زکریا نے محسوس کیا کہ حاضرین میں سرکشی کے آثار موجود ہیں، وہ سلطان کو افسوس اور غصے کی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ سلطان کی نظریں زکریا پر پڑ گئیں۔ اس نے کسی کا نام لیے بغیر مخاطب کیا۔ ”میں حاضرین میں ایسے چہرے بھی دیکھ رہا ہوں جن کے سروں میں سرکشی اور دلوں میں بے اطمینانی نے گھر کرلیا ہے۔“

سنان پاشا نے عرض کیا۔ ”میں سلطانی احکام کی بجا آوری میں زمان ومکاں سے گزر جانے کو تیار ہوں۔“

استاد ارسلان کیوں پیچھے رہتا، بول اٹھا۔ ”دنیا کے کئی اولوالعزم اپنے دست وبازو کی کم ہمتی سے وہ نہیں کرسکے جو وہ کرنا چاہتے تھے لیکن میں سلطان کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر پورا زمانہ کنارہ کشی اختیار کرلے تو ارسلان سلطان کے پاس یکہ وتنہا ہی کھڑا نظر آئے گا۔ کیونکہ میں بے وفائی اور... کم ہمتی کے مفہوم سے بالکل ہی نابلد ہوں۔“

زکریا کے جی میں آئی کہ وہ بھی کچھ کہے لیکن زبان نے ساتھ نہیں دیا۔ پورے دربار میں بڑی بے چینی پائی جاتی تھی۔ ایسا لگتا تھا گویا سنان پاشا اور استاد ارسلان نے ان سب کو ذلیل وخوار کرکے رکھ دیا ہے۔ ان کے چہرے اور مضطرب نظریں کچھ کہنے کے لیے بے چین تھیں لیکن سلطانی رعب اور دبدبے نے انہیں ساکت کررکھا تھا۔

سلطان نے اعلان کیا۔ ”میں شاہ کا تعاقب کرنا چاہتا ہوں۔ میرے مخبروں نے مجھے خبر دی ہے کہ شاہ خراسان میں بیٹھا میری واپسی کا منتظر ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ مزید زحمتِ انتظار اٹھائے۔“

حاضرین یہ سمجھے کہ شاید سلطان واپسی کا اعلان کررہا ہے اس لیے ان کے چہروں سے خوشی اور احساسِ فتح مندی جھلکنے لگا۔

سلطان نے کہا۔ ”افسوس کہ میں کسی ایک جگہ نہیں رک سکتا، کیونکہ میں موج ہوں۔ موج کا کسی جگہ ٹھہر جانا موت کے مترادف ہوتا ہے۔ ہماری زندگی یہی ہے کہ ہم چین سے نہ بیٹھیں۔“

ایک سردار نے منہ ٹیڑھا کرلیا اور دلیری سے اعلان کردیا۔ ”سلطان معظم کو اس اعلان سے پہلے یہ ضرور سوچ لینا چاہیے تھا کہ موجیں بھی پتھروں کے جوف میں سوجایا کرتی ہیں تاکہ تازہ دم ہوکر دوسری موجوں کے ساتھ نئے عزم اور نئے حوصلے سے آگے بڑھیں۔“

سلطان نے طیش میں پوچھا۔ ”یہ کون بدبخت ہے جس کی موت اس کی باتوں میں رقص کررہی ہے۔“

کسی دوسرے سردار نے اعلان کیا۔ ''جنابِ والا! میں تو بس ایک معمولی سے لباس ہی کو اپنے لیے باعثِ عزو وقار سمجھوں گا کیونکہ جب میں سلطانی دربار میں آیا تھا تو اس وقت یہی معمولی لباس میرے جسم پر تھا لیکن جب سے میں نے سرداری لباس پہنا ہے، اپنے گھر اور اعزا سے دور، اپنی خواہش اور مرضی کے خلاف خوار وزبوں پھر رہا ہوں۔ میرا پرانا لباس درویش کے خرقے کی طرح ہے جس کو پہن کر میں دنیا اور اس کی حرص وطمع سے پیچھا چھڑا سکتا ہوں۔''

سلطان نے غضب ناک نظروں سے حاضرین کو گھورا اور پوچھا۔ ''اور کسی کو کچھ کہنا ہے؟''

کئی سردار بیک وقت بولے۔ ''ہم اپنے دونوں ساتھیوں کی تائید اور اتفاق رائے کا اعلان کرتے ہیں۔ ہم بھی اگر کچھ کہیں گے تو یہی کہیں گے۔''

سلطان نے اعلان کیا۔ ''لیکن تم سب میرا فیصلہ بھی سن لو۔ اگر تم سب نے آگے بڑھنے سے انکار کردیا تو میں سنان پاشا، ارسلان اور...... اور......'' اس کے ساتھ ہی سلطان نے زکریا کی طرف دیکھا اور بات مکمل کردی۔ ''تب پھر میں ان دونوں کو لے کر آگے بڑھ جاؤں گا کیونکہ میں سرکش طوفان ہوں جو آگے جاتا ہے، پیچھے نہیں ہٹتا۔''

کئی سرداروں نے جواب دیا۔ ''ہم سب پہلے تو اپنے گھر جائیں گے اس کے بعد کہیں اور۔ یہ ہمارا آخری فیصلہ ہے۔''

سلطان نے اعلان کیا۔ ''بزدل، کم حوصلہ اور بے وفا سرداروں کو میرا دربار چھوڑ دینا چاہیے۔ میں اپنے روبرو انہی کو دیکھنا چاہتا ہوں جو میری ہی طرح موج اور سرکش طوفان کے مانند ہیں۔''

سلطان کا تخمینہ بالکل غلط ثابت ہوا کیونکہ اس کا خیال تھا کہ اس کی آواز پر کچھ سردار تو ضرور ہی لبیک کہیں گے لیکن ان میں سے ہر شخص نے سلطان کا حکم نہیں مانا اور سامنے سے اٹھ کر باہر چلا گیا لیکن ان میں زکریا اپنی جگہ پر ہی کھڑا رہا۔ سلطان نے ایک بار پھر زکریا کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''کیا بات ہے؟ تو یہاں کیوں کھڑا رہ گیا، باہر کیوں نہیں چلا گیا؟''

زکریا نے جواب دیا۔ ''سلطان معظم! میں اس بھیڑ کے ساتھ کہاں جاؤں؟ میں یہیں سلطان معظم کے آس پاس ہی رہنا چاہتا ہوں۔''

سلطان چڑچڑا ہو رہا تھا۔ اس نے جھنجلاہٹ میں بڑبڑانا شروع کردیا۔ ''یہ سب پہلے اپنے گھر جائیں گے، اس کے بعد کہیں اور...... یہ ان کا آخری فیصلہ ہے۔ میں انہیں اجازت دیتا ہوں کہ جہاں چاہیں چلے جائیں۔ گھر جائیں، اس کے بعد جہنم میں چلے جائیں۔'' اس کے بعد سنان پاشا سے کہا۔ ''سنان پاشا! تجھ کو ایران اور شام کی سرحدوں پر ہی رہنا ہے کیونکہ تو یہاں سے شاہ صفوی اور مصر کے مملوک حکمران کی حرکات وسکنات پر اچھی طرح نظریں رکھ سکے گا۔ شاید وہ چوٹ کھائے ہوئے سانپ کی طرح کسی بھی طرف سے حملہ آور ہوسکتا ہے۔ اس کا بھی امکان ہے کہ وہ مصر کے مملوک حکمران کی حمایت حاصل کرلے اور ہمیں عباسی خلیفہ کے غلام حکمران سے مقابلہ کرنا پڑ جائے۔ تو بدستور ایشیائے کوچک کی افواج کا سپہ سالار رہے گا۔''

سنان پاشا نے دبی زبان میں پوچھا۔ ''سلطان معظم! اب کدھر کا رخ فرمائیں گے؟''

سلطان نے جواب دیا۔ ''میں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ بھگوڑوں کو ان کے گھروں کی طرف ہانک دیا جائے اور اپنی جاں نثار سپاہ سے اپنی نئی مہم جوئی کا آغاز کردیا جائے۔''

استاد ارسلان بے چین تھا کہ سلطان نے اس کی بابت کیا فیصلہ کیا ہے، آہستہ سے پوچھا۔ ''اور سلطانِ عالی شان میری بابت کیا فرماتے ہیں؟''

سلطان نے جواب دیا۔ ''تو میرے ساتھ رہے گا کیونکہ تو بھگوڑوں میں شامل نہیں ہے، تو اور تجھ جیسے دوسرے لوگ میرے لیے بسا غنیمت ہیں، میں تم پر بھروسا کرسکتا ہوں۔''

زکریا سلطان سے اپنی بابت سوال کرنا چاہتا تھا، لیکن خود میں حوصلہ نہیں پا رہا تھا۔ سلطان کی تیز نظریں اس کے اندر اتر گئیں اور اسے مخاطب کیا۔ ''زکریا تو یقیناً یہ جاننے کے لیے بے چین ہے کہ میں نے تیرے لیے کیا سوچا ہے؟ تو سن، میں نے تیرے لیے کچھ بھی نہیں سوچا، تو نیا نیا جوان ہوا ہے اور ایک ایسی خاتون کا عاشق ہے جو شادی شدہ ہے۔ مردوں جیسی تجھ میں کوئی بات نہیں، تجھے عورتیں بڑی آسانی سے فتح کرسکتی ہیں، پھر تو ہمارا کیا کام کرے گا۔''

زکریا کو اب بھی یہی امید تھی کہ شاید سلطان ناہید کو زکریا کے حوالے کردے گا، بولا۔ ''سلطانِ والاشان! آپ اس فلسفے سے تو واقف ہی ہوں گے کہ کسی نوجوان کی اہم ترین ضرورت کیا ہوسکتی ہے۔ اگر مجھ کو یہ اطمینان ہوجائے کہ میں اپنی اہم ترین شے سلطان کی نوازش سے حاصل کرلینے میں کامیاب ہوجاؤں گا تو میں اس امید میں اپنی جان تک قربان کرسکتا ہوں۔''

سلطان طیش میں آگے بڑھا اور زکریا کے منہ پر ایک مکا رسید کر دیا۔ ''تو اپنی بہادری اور جاں نثاری کو مشروط کر رہا ہے۔ تیری یہ جرأت کہ تو مجھ سے، اپنے آقا سے کسی شے کا مطالبہ کرے۔ میں یہ خرافات، یہ گستاخی برداشت نہیں کرسکتا۔ ابھی تو زیر تربیت ہے۔'' پھر استاد ارسلان سے کہا۔ ''ارے، یہ کیا تعلیم دی گئی ہے اس وحشی کو۔ اس کو تو بات کرنے کا بھی سلیقہ نہیں۔''

استاد ارسلان نے عرض کیا۔ ''حضور والا! اس کی ان باتوں سے میں خود بھی عاجز ہوں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ اس کو ہو کیا گیا ہے۔''

زکریا کے ہونٹ پھٹ گئے تھے اور ان سے خون جاری ہو گیا تھا۔ وہ سلطان سے اتنا خوفزدہ ہو چکا تھا کہ اپنے ہونٹوں سے رستے ہوئے خون کو پونچھ بھی نہ سکا۔ سلطان نے استاد ارسلان کو حکم دیا۔ ''زکریا کو قید کر دیا جائے۔''

استاد ارسلان نے اسی وقت زکریا کو سلطانی محافظین کی تحویل میں دے دیا اور اس کو زنداں خانے میں ڈال دیا گیا۔

سلطان نے ارسلان سے کہا۔ ''ارسلان! تو ہی بتا کہ میں نے زکریا کے ساتھ جو کچھ کیا، اس میں، میں کہاں تک حق بجانب ہوں؟''

استاد ارسلان نے جواب دیا۔ ''سلطان کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی مصلحت ضرور ہوتی ہے۔ اس میں بھی کوئی نہ کوئی مصلحت ضرور ہوگی۔''

سلطان نے کہا۔ ''ہاں، میرے ہر کام میں کوئی نہ کوئی مصلحت ضرور ہوتی ہے۔ اب میں نے زکریا کو قید خانے میں ڈلوا دیا ہے۔ کیا تو جانتا ہے کہ میں نے اتنا سخت قدم کیوں اٹھایا؟ میں زکریا کو قتل بھی کرسکتا تھا لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔ وہ وفادار بھی ہے اور جاں نثار بھی۔ افسوس کہ ایک عورت نے اس کے ناپختہ ذہن کو مسحور کر لیا ہے۔ ارسلان تو زکریا سے قید خانے میں ملاقاتیں کر اور اس کو سمجھا کہ وہ اس جنون کو اپنے دل و دماغ سے نکال باہر کرے۔ میں اس کو معاف کرسکتا ہوں لیکن اسی وقت جب وہ اپنے دل سے عشق کو نکال باہر کرے گا۔''

استاد ارسلان نے جواب دیا۔ ''میں کوشش کروں گا کہ زکریا کے دل و دماغ سے سودائے حماقت نکال دیا جائے۔''

سلطان بہت مضطرب ہو رہا تھا، وہ بڑی تیزی سے ٹہلنے لگا۔ سنان پاشا دم بخود کھڑا تھا، استاد ارسلان سلطان کے سامنے سے ہٹنے کی دعائیں مانگ رہا تھا۔ سلطان یکا یک پھر گیا۔ ''یہ لوگ... کتنی ہی سرکشی اختیار کریں، میں ان سب کو ان کے گھروں کو بھیج دوں گا جہاں سے وہ کبھی بھی واپس نہیں آئیں گے۔ ان کی جگہ انہیں دی جائے گی جو رزمگاہوں سے محبت کرتے ہیں۔ میں سرکش طوفان کی طرح ان بزدلوں اور بھگوڑوں کو خس و خاشاک کے مانند بہا لے جاؤں گا۔''

سنان پاشا نے سلطان کے غصے کو کم کرنے کی کوشش کی اور کہا۔ ''سلطان معظم کے اک ذرا سے اشارے کی دیر ہے، یہ خادم سرفروشوں کی بھیڑ لگا دے گا۔ حضور والا کو ان کم حوصلہ انسانوں کی پروا نہیں کرنا چاہیے۔''

سلطان نے عقابی نظروں سے سنان پاشا کو گھورا اور کچھ توقف کے بعد کہا۔ ''تو صحیح کہتا ہے۔ مجھے ان کی پروا نہیں کرنا چاہیے۔ جا اور ان بھگوڑوں کے شاندار متبادل فراہم کر کیونکہ میں ان بھیڑوں کی وجہ سے اپنی مہم کو ملتوی نہیں کرسکتا۔''

سنان پاشا اور استاد ارسلان اپنی اپنی جانیں بچا کر سلطان کے خیمے سے نکل آئے۔ راستے میں جدا ہونے سے پہلے استاد ارسلان نے کہا۔ ''بخدا جس خوبصورتی سے آپ نے سلطان سے اجازت حاصل کی ہے، میں اس کی داد دیتا ہوں۔''

سنان پاشا نے جواب دیا۔ ''اس کے علاوہ کوئی صورت ہی نہ تھی لیکن میں نے سلطان سے جو کچھ کہا ہے، اس کو پورا بھی کروں گا۔''

استاد ارسلان نے کہا۔ ''اور میں زکریا پر کام کروں گا کیونکہ اب یہ خدشہ پیدا ہو گیا ہے کہ یہ نوجوان اپنی جذباتیت اور ناتجربہ کاری میں سلطان کے ہاتھوں قتل ہو جائے گا۔''

استاد ارسلان اپنے خیمے میں کچھ دیر ٹھہرا، اس کے بعد زکریا کے پاس چلا گیا۔ وہ مسلح محافظوں کے گھیرے میں سر جھکائے بیٹھا تھا، وہ معلوم نہیں کس سوچ میں تھا کہ استاد ارسلان کی موجودگی کو کافی دیر تک محسوس ہی نہ کرسکا۔ ابھی وہ زکریا سے ہم کلام بھی نہ ہوا تھا کہ ایک محافظ گھبرایا ہوا اندر داخل ہوا اور ارسلان کو مخاطب کیا۔ ''جناب والا! ہم سب ایک بڑی مصیبت سے دوچار ہونے والے ہیں۔ براہ کرم آپ یہ اطلاع سلطان تک پہنچا دیں۔''

محافظ کی آواز نے زکریا کو سر اٹھا کر اپنے سامنے دیکھنے پر مجبور کر دیا۔ وہ بالکل اپنے پاس اور سامنے استاد ارسلان کو دیکھ کر کھڑا ہو گیا، خجالت سے بولا۔ ''آپ یہاں

کب تشریف لائے استادِ محترم؟‘‘
استاد ارسلان نے زکریا کو جواب دیا۔ ’’ابھی ابھی، بس چند لمحے گزرے ہیں، مجھے یہاں آئے ہوئے۔‘‘ اس کے بعد حواس باختہ محافظ سے پوچھا۔ ’’کیا بات ہے؟ کھل کر بتا۔‘‘
محافظ نے زکریا کی طرف دیکھتے ہوئے عرض کیا۔ ’’میں تخلیہ میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔‘‘
ارسلان نے زکریا سے کہا۔ ’’میرے نادان اور جذباتی بچے! میں پہلے اس کی سن لوں پھر تجھ سے بات کروں گا۔ لیکن یہ یاد رہے کہ میں تجھ سے کچھ امیدیں وابستہ کر کے آیا ہوں مجھے شرمندہ نہ کر دینا۔‘‘
زکریا نے سر جھکا کر جواب دیا۔ ’’پہلے آپ اس سے بات کرلیں لیکن آج میرے ساتھ جو سلوک کیا گیا ہے، وہ اچھا نہیں تھا۔‘‘ اس کے بعد وہ اپنے زخمی ہونٹ پر انگلیاں پھیرنے لگا۔
استاد ارسلان محافظ کے ساتھ قید خانے سے باہر چلا گیا اور سرگوشی میں پوچھا۔ ’’ہاں تو اب بتا کہ تو مجھ سے کس قسم کی باتیں کرنا چاہتا ہے؟‘‘
محافظ نے عرض کیا۔ ’’جناب والا! ابھی ابھی یہ اطلاع آئی ہے کہ سلطان نے جن لوگوں کو بھگوڑا کہا ہے، وہ سرکشی اور بغاوت پر مائل ہیں اور انہوں نے یہ منصوبہ بنالیا ہے کہ سلطان اس سلسلے میں جس جس کو قید خانے میں ڈالے گا، یہ سرکش اور باغی انہیں رہا کرانے کی کوشش کریں گے چنانچہ اس سلسلے میں زکریا کا نام بھی لیا جارہا ہے یعنی بلوائی اس کے محافظوں پر حملہ کر کے زکریا کو چھڑا لے جائیں گے۔ آپ ذرا سوچیے تو یہ کتنی نازیبا اور شرمناک بات ہوگی۔‘‘
استاد ارسلان نے جواب دیا۔ ’’کسی شخص کو سنان پاشا کے پاس بھیج دیا جائے اور اس کو اس نازک صورتِ حال سے مطلع کر دیا جائے۔ وہ اس کا توڑ نکال لے گا۔‘‘
محافظ خوفزدہ تھا، پوچھا۔ ’’کیا سنان پاشا ہماری کوئی مدد کرسکیں گے؟‘‘
استاد ارسلان نے جواب دیا۔ ’’وقت ضائع کرنے کی کوئی ضرورت نہیں...... وہی ہماری مدد کرسکتا ہے۔‘‘
محافظ چلا گیا اور استاد ارسلان زکریا کے سر پر جا کھڑا ہوا، بولا۔ ’’زکریا! آج تو نے اپنے استاد کو بے حد شرمندہ کیا۔ میں تجھ کو اتنا نادان نہیں سمجھتا تھا۔‘‘
استاد ارسلان نے محسوس کیا کہ زکریا اپنے کیے پر نادم ہے۔ وہ آہستہ آہستہ رو رہا تھا۔ اس کے دونوں ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ اس نے اشک آلود نظروں سے استاد کی

باتوں سے خوشبو آئے

☆ تم اگر یہ جاننا چاہتے ہو کہ تم سے پیار کرنے والے کو تم سے کتنا پیار ہے، تو اس سے بے رخی اختیار کر کے دیکھو۔ تمہیں خود بخود اندازہ ہو جائے گا۔

☆ اگر تم یہ جاننا چاہتے ہو کہ تمہارے والدین تم سے کتنی محبت کرتے ہیں تو زندگی کی کوئی خوشی مانگ کر دیکھو۔

☆ اگر تم یہ جاننا چاہتے ہو کہ تمہارا رب تم سے کتنی محبت کرتا ہے، اس کے قریب آ کر دیکھو، تمہیں اندازہ ہو جائے گا۔

☆ اعتدال بہترین راہ ہے کیونکہ پاؤں آگ کے الاؤ میں ہوں یا برف کی سل پر، دونوں صورتوں میں تپش ہمارا مقدر بنتی ہے۔

☆ اہمیت دکھ کی نہیں، دکھ دینے والے کی ہوتی ہے۔ ایسے دوستوں سے دور ہونا زیادہ اچھا ہے، جو کھیل کھیل میں زندگی سے کھیل جاتے ہیں۔

☆ اس درخت کی طرح بنو، جو چھاؤں بھی دیتا ہے اور پھل بھی۔ بقول شاعر

مثال اپنی تو ہے اس درخت کی کہ جسے
لگا جو سنگ تو بدلے میں پھل گرانے لگا

مرسلہ: اطہر حسین...... کراچی

عقیدہ

صاف ہی کیوں نہ کہہ دوں کہ جہاں تک اشیائے خورونوش کا تعلق ہے، میں تہذیب حواس کا قائل نہیں۔ میں یہ فوری فیصلہ ذہن کے بجائے زبان پر چھوڑنا پسند کرتا ہوں۔ پہلی نظر میں جو محبت ہو جاتی ہے، اس میں بالعموم نیت کا فتور کارفرما ہوتا ہے لیکن کھانے پینے کے معاملے میں میرا یہ نظریہ ہے کہ پہلا ہی لقمہ یا گھونٹ فیصلہ کن ہوتا ہے۔ بدذائقہ کھانے کی عادت کو ذوق میں تبدیل کرنے کے لیے بڑا پاپڑ مارنا پڑتا ہے مگر میں اس سلسلہ میں برسوں تلخی کام و دہن گوارا کرنے کا حامی نہیں، تاوقتیکہ اس میں بیوی کا اصرار یا گرہستی مجبوریاں شامل نہ ہوں۔ بنا بریں، میں ہر کافی پینے والے کو جنتی سمجھتا ہوں۔ میرا عقیدہ ہے کہ جو لوگ عمر بھر ہنسی خوشی یہ عذاب جھیلتے رہے، ان پر دوزخ اور جحیم حرام ہیں۔

مشتاق احمد یوسفی کی کتاب ’’چراغ تلے‘‘ سے اقتباس

طرف دیکھا اور عرض کیا۔ ''استاد محترم! میں اپنی غلطی پر شرمسار ہوں۔ اب میں سوچتا ہوں کہ میں اپنی اس غلطی پر قتل بھی ہو سکتا تھا۔''

استاد ارسلان نے کہا۔ ''کیا میں نے اپنے جملہ شاگردوں کو ہمیشہ یہ نہیں بتایا ہے کہ اعتماد بڑی مشکل اور محنت سے پیدا کیا جاتا ہے لیکن ختم بڑی آسانی اور نادانی سے ہو جاتا ہے۔ تیرے ساتھ یہی کچھ ہوا۔''

زکریا نے پوچھا۔ ''میری عدم موجودگی میں سلطان کیا کہہ رہے تھے؟''

استاد ارسلان نے جواب دیا۔ ''سلطان کو بہت افسوس ہے کہ تو نے ایک ایسی روش اختیار کی جس کی تجھ سے توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔''

زکریا نے بڑی بے چینی سے پوچھا۔ ''کیا میری یہ پہلی غلطی معاف کی جاسکتی ہے؟''

استاد ارسلان کو یہ امید نہیں تھی کہ بات اتنی جلدی اور آسانی سے بن جائے گی، بولا۔ ''میں کوشش کروں گا۔ ممکن ہے سلطان معاف کردیں لیکن اس کی کیا ضمانت کہ تو پھر ایسی غلطی نہیں کرے گا؟''

زکریا نے کہا۔ ''میں وعدہ کرتا ہوں، اب ایسی غلطی نہیں ہوگی۔''

استاد ارسلان نے کہا۔ ''اچھا، اگر یہ بات ہے تو میں کوشش کرتا ہوں لیکن تو بھی اپنے دل و دماغ سے وہ سب کچھ نکال دے جو تیری بربادی کا باعث بن سکتی ہیں۔''

استاد ارسلان جب زکریا کے پاس سے اٹھا اور باہر آیا تو اس نے دور سے ایک ہجوم کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا۔ یہ لوگ مشتعل اور غضب ناک نظر آتے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں برہنہ شمشیریں تھیں۔ اس نے اندازہ لگایا کہ یہ تقریباً دو ہزار ہوں گے۔ استاد ارسلان سمجھ گیا کہ یہ وہی لوگ ہیں جن کی محافظ پہلے ہی خبر دے چکا ہے۔

محافظوں نے اس ہجوم کو اپنی طرف شمشیر بکف آتے دیکھا تو مستعد اور چوکنا ہو کر کھڑے ہو گئے۔ استاد ارسلان اس ہجوم کی طرف بڑھ گیا اور اس کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن ان سب کا ایک ہی مطالبہ تھا کہ زکریا کو رہا کر کے ان کے حوالے کر دیا جائے۔

استاد ارسلان نے پوچھا۔ ''اگر تمہارا مطالبہ نہ مانا جائے تو؟''

ایک نے جواب دیا۔ ''تب پھر ہم خود ہی آزاد کرالیں گے زکریا کو۔''

استاد ارسلان نے کہا۔ ''تم لوگ سخت غلطی کر رہے ہو۔ زکریا کو اگر تم نے آزاد بھی کرالیا تو تم اس کی حفاظت نہیں کرسکو گے اور دوسرے یہ کہ وہ تم میں خوش نہیں رہے گا۔''

اس شخص نے کہا۔ ''میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ کون احمق ہے جو اپنی عزتِ نفس کو بالائے طاق رکھ کر سلطان کی فوج اور دبدبے سے ٹکرانے کی ہمت کر سکے گا۔''

استاد ارسلان نے بڑی ہوشیاری کا مظاہرہ کیا، کہا۔ ''تم تعداد میں زیادہ سے زیادہ دو ہزار ہو گے جبکہ سلطان کے ایک اشارے پر ہزاروں سپاہی سربکف تم سب کے روبرو کھڑے ہوں گے۔''

ہجوم میں سے ایک عمر رسیدہ شخص باہر نکلا اور استاد ارسلان کو دعوت دی۔ ''تو بھی ہمارے ساتھ آجا اور پھر ہم سب مل جل کر سلطان کو واپسی پر مجبور کردیں گے ہم اپنی تعداد بڑھانا چاہتے ہیں۔''

استاد ارسلان نے انہیں باتوں میں لگا لیا کیونکہ اسے خوب معلوم تھا کہ سنان پاشا عنقریب پہنچنے ہی والا ہے۔ بلوائی اس مغالطے میں رہے کہ وہ استاد ارسلان کو بھی اپنا... ہم خیال بنالیں گے اس طرح انہیں ایک ایسی بااثر شخصیت مل جائے گی جس کے طفیل مزید ہزاروں ہم خیال انہیں ہاتھ آجائیں گے۔

ابھی باتوں کا سلسلہ جاری تھا کہ سنان پاشا ہزاروں سپاہیوں کے ساتھ انہیں گھیرے میں لے کر کھڑا ہو گیا اور اعلان کیا۔ ''جملہ باغی اپنے اپنے ہتھیار زمین پر پھینک کر پیچھے ہٹ جائیں ورنہ انہیں چشم زدن میں قتل کر دیا جائے گا۔''

استاد ارسلان نے اعلان کیا۔ ''سنان پاشا کو معلوم ہونا چاہیے کہ سلطان کے منحرفین کے ساتھ غداروں اور باغیوں جیسا سلوک کسی حال میں بھی نہیں کیا جاسکتا۔ یہ ہمارے بھائی ہیں بس ذرا بھٹک گئے ہیں۔ آج نہیں تو کل انہیں اپنی راہ مل جائے گی اور وہ اپنی مذموم حرکتوں سے باز آجائیں گے۔ ہم اپنے بھائیوں کو پیار و محبت سے منائیں گے۔''

اس کی نرم مزاجی کا بلوائیوں پر اچھا اثر ہوا مگر ہتھیار کسی ایک نے بھی نہیں گرائے۔

سنان پاشا نے غداروں کو مخاطب کیا۔ ''جو سلطان ایران کے والی کو اس کے گھر میں داخل ہو کر شکست دے سکتا ہے، وہ اپنی ہی فوج کے چند باغی سپاہیوں اور سرداروں سے بھی اچھی طرح نمٹ سکتا ہے۔ میں ایک بار پھر تمہیں سمجھاؤں گا کہ سرکشی سے باز آجاؤ۔''

بلوائیوں میں سے چند نے اپنے ساتھیوں کو سمجھایا۔

''بھائیو! سنان پاشا صحیح کہتا ہے، سلطان کو اس کی مرضی کے خلاف جبر سے نہیں چلایا جاسکتا۔ ہمیں استاد ارسلان کے وعدے پر بھروسا کرنا چاہیے۔ یہ درست ہے کہ جس نے شاہ ایران کو اس کے اپنے گھر میں شکست دے دی ہو، دو چار ہزار بلوائی اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے۔''

بلوائیوں کا جوش و خروش سرد پڑ گیا، استاد ارسلان اور سنان پاشا کی معاملہ بین نظریں ان کے تذبذب اور خوف کو سمجھ گئیں۔ استاد ارسلان نے کہا۔ ''حضرات! میں آج ہی سلطان سے بات کرلوں گا اور مجھے امید ہے کہ وہ مسلسل مہمات کے دل برداشتہ لوگوں کو گھر واپس جانے کی اجازت ضرور دے دیں گے۔''

لیکن سنان پاشا نے بدستور سخت و سست لہجے میں کہا۔ ''استاد ارسلان کے وعدے اپنی جگہ لیکن میں کوئی وعدہ نہیں کر رہا ہوں کیونکہ میں سلطان کے مزاج سے بہت اچھی طرح واقف ہوں۔ میں نہیں سمجھتا کہ سلطان شورش پسندوں اور بلوائیوں کو معاف کردے۔ وہ طوفان ہے، جو بھی اس کے سامنے آئے گا، خس و خاشاک کی طرح بہہ جائے گا۔''

سنان پاشا کی دھمکی نے سبھی کے حوصلے پست کردیے۔ ان میں جو زیادہ مآل اندیش تھے، آہستہ آہستہ چل کر سنان پاشا اور استاد ارسلان کے پاس پہنچے اور ان دونوں سے درخواست کی۔ ''ہم اپنے دوستوں کی نادانی پر معذرت خواہ ہیں۔ ہم نے جو زیادتی کی ہے، اس کے نتائج سے واقف ہیں۔ کیا ہم آپ دونوں سے یہ امید کریں کہ ہمیں معاف کردیا جائے گا؟''

سنان پاشا نے جواب دیا۔ ''مجھے نہیں معلوم کہ استاد ارسلان اتنا بڑا کام کر بھی سکیں گے یا نہیں، لیکن میرے ذہن میں ایک ایسی تدبیر بھی ہے جس پر عمل کر کے تم سب کو معاف کرایا جاسکتا ہے۔''

بلوائیوں کے نمائندوں نے پوچھا۔ ''کون سی تدبیر ہے، آپ بتائیں تو سہی۔''

سنان پاشا نے جواب دیا۔ ''آپ سب مفاہمانہ روش اختیار کریں۔ اپنے اپنے ہتھیار جمع کرادیں تاکہ سلطان کو یہ یقین ہوجائے کہ آپ لوگ واقعی اپنے اپنے گھر جانا چاہتے ہیں۔''

بلوائیوں کی طرف سے اعلان ہوا۔ ''ہم سب آج ہی اپنے ہتھیار جمع کرادیں گے۔''

سنان پاشا نے جواب دیا۔ ''پھر میں بھی یہ وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں معاف کرادوں گا۔''

استاد ارسلان کے چہرے پر خوشی کی چمک پیدا ہوگئی، بولا۔ ''واللہ سنان پاشا..... تمہاری مفاہمانہ روش نے میری مشکل آسان کردی۔ اب میں پورے اعتماد اور یقین سے تم سب کی سفارش کرسکوں گا۔''

بلوائی واپس چلے گئے، سنان پاشا نے اپنی راہ لی اور استاد ارسلان ایک بار پھر زکریا کے پاس چلا گیا۔

☆☆☆

شام تک جملہ بلوائی خود ہی نہتے ہوگئے۔ ان کے ہتھیاروں پر قبضہ کرتے ہی سنان پاشا نے ان کے گرد پہرا بٹھادیا۔ بلوائی جز بز مگر خوفزدہ ہو کر ایک دوسرے کی شکل دیکھ رہے تھے۔ مغرب کے بعد ان محصورین کے قریب ہی ایک میدان میں بہت ساری مشعلیں روشن کردی گئیں اور کسی کو بتائے بغیر ہی سلطان خود وہاں پہنچ گیا۔ اس کا گھوڑا ہوا سے باتیں کر رہا تھا۔ محصور بلوائیوں نے اس شانِ بے نیازی سے سلطان کی طرف دیکھا کہ دیکھنے والے حیرت زدہ رہ گئے۔

سلطان نے ایک اونچی جگہ کھڑے ہو کر کہا۔ ''انتشار پسند اور غدار اپنے بارے میں کیا سمجھتے ہیں، وہ کن خوش فہمیوں میں گرفتار ہیں؟ وہ کچھ بھی سوچیں اور کچھ بھی کریں لیکن ان میں ایک بھی ایسا نہیں جو اپنے مسائل کا حل تلاش کرسکے۔ تم لوگ اپنے اپنے گھر جانا چاہتے ہو اور اس سلسلے میں اپنے ہم خیالوں کا اتحاد قائم کرلیا ہے۔'' اور پھر اچانک اس کا لہجہ بدل گیا اور تند و تیز لہجے میں کہنا شروع کیا۔ ''احمقو! اب تم سب حراست میں ہو اور میں تمہیں تمہارے حقیقی گھر بھیجنے کا حکم صادر کرنے والا ہوں۔ مجھ سے ارسلان اور سنان پاشا نے تمہاری سفارش کی ہے۔ میں نے ان کی سفارش مان لی ہے اور اب میں تم سب کو مستقلاً تمہارے ان گھروں کو روانہ کردوں گا کہ اگر تم واپس بھی آنا چاہو تو نہ آسکو۔ عدم آباد، جہاں تم پہلے تھے اور جہاں تمہیں ایک نہ ایک دن ضرور جانا پڑے گا۔''

بلوائیوں میں ہلکا سا شور اٹھا، وہ کہہ رہے تھے۔ ''دھوکا، فریب۔ سنان پاشا اور استاد ارسلان نے ہم سے فریب کیا ہے۔''

سلطان نے سختی سے جواب دیا۔ ''میں اپنے مشرقی، جنوبی اور شمالی شہروں اور ملکوں کی تسخیر کو نکلا تھا مگر تم نے مجھے دھوکا دیا ہے اور میرا ساتھ چھوڑ کر واپس چلے جانا چاہتے ہو۔ اسی طرح یونان کے نوجوان فاتح سکندر کو بھی اس کے نادان، سرکش، کم حوصلہ، عیش پسند اور احمق سپاہیوں اور فوجی

سرداروں نے واپسی پر مجبور کر دیا تھا۔ سکندر واپسی پر مجبور ہو گیا تھا لیکن میں نہ تو نوجوان ہوں کہ تمہاری سرکشی اور اتحاد کے آگے ہتھیار ڈال دوں اور نہ ہی میں سکندر ہوں کہ اپنی نوجوانی کے کاموں کو ادھیڑ عمری یا بڑھاپے پر اٹھا رکھوں۔ میں بڑھاپے کی دہلیز پر کھڑا ہوں، میرے پاس نوجوان سکندر جتنا وقت نہیں ہے۔ میں آج کا کام کل پر نہیں چھوڑ سکتا۔ میرے پاس اپنے ساتھیوں کے لیے ایک نعرہ ہے کہ آگے بڑھو یا راستہ چھوڑ دو۔ میں آگے بڑھوں گا اور جو میری راہ میں حائل یا مزاحم ہوں گے، انہیں میں بزور شمشیر اپنی راہ سے ہٹا دوں گا۔''

اس کے بعد سلطان نے سنان پاشا کو حکم دیا۔ ''بلوائیوں اور انتشار پسندوں کو سخت پہرے میں رکھا جائے۔ ان کی قسمتوں کا چند دنوں میں قطعی فیصلہ کر دیا جائے گا۔''

سلطان کو جو کچھ اور جس انداز میں کہنا تھا، کہہ چکا تھا۔ وہ نہایت برہم اپنے خیمے میں واپس چلا گیا۔ سنان پاشا اور استاد ارسلان اس کے ہم رکاب تھے۔ وہ سنان پاشا اور استاد ارسلان سے بھی ناخوش تھا۔ وہ ان دونوں سے کہہ رہا تھا۔ ''تمہیں ان کو دھوکے میں نہیں رکھنا چاہیے تھا۔ انہیں اسی وقت کچل دینا تھا، انتہائی سختی اور سفاکی سے۔''

سنان پاشا نے عرض کیا۔ ''سلطان معظم! میں نے ان سے ایک بار بھی نرم و ملائم لہجے میں بات نہیں کی۔ میں نے ان سے کوئی دھوکا نہیں کیا۔''

استاد ارسلان نے اپنی صفائی پیش کی۔ ''حضور والا! میں نے البتہ نرم اور مصلحت آمیز لہجے میں بات کی تھی۔ محض اس خیال سے کہ اگر ان چند ہزار کو سختی سے کچل دیا گیا تو اس کا بقیہ فوج پر بہت برا اثر پڑے گا۔ میں نے اپنی کوششوں سے اس سیلاب کے سامنے بند باندھ دیا تھا جو آخر کار کسی تباہ کن انتشار اور افتراق پر ختم ہوتا۔''

سلطان نے ہونٹ بھینچ لیے اور استاد ارسلان کو ڈانٹ دیا۔ ''تیرا کام بچوں کی تعلیم و تربیت ہے۔ میں فرماں روا ... ہوں، فوج کو کس طرح قابو میں رکھنا چاہیے اور ماتحتوں سے کب کس طرح کا سلوک کرنا چاہیے، یہ میں جانتا ہوں۔'' پھر پوچھا۔ ''کیا تو زکریا سے ملا تھا؟''

استاد ارسلان نے جواب دیا۔ ''جی سلطان والا شان۔''

سلطان نے پوچھا۔ ''وہ کیا کہہ رہا تھا؟''

استاد ارسلان نے جواب دیا۔ ''وہ اپنے کیے پر نادم ہے اور عفو و کرم کا طالب ہے۔''

سلطان نے کہا۔ ''تو نے یقیناً اس سے بھی کوئی خوشگوار اور پُرامید وعدہ کر لیا ہوگا، اسے بھی کوئی سبز باغ دکھا دیا ہوگا۔''

استاد ارسلان کو اپنی زندگی خطرے میں نظر آ رہی تھی، خوفزدہ لہجے میں کہا۔ ''حضورِ والا! میں نے اس سے کوئی وعدہ نہیں کیا، اس نے تو خود ہی یہ کہا تھا کہ معلوم نہیں کیوں اس سے ایسی غلطی سرزد ہو گئی ہے۔ وہ پشیمان ہے اور سلطان کے تقرب کا دل و جان سے خواہشمند ہے۔ اے بسا آرزو کہ خاک شدی۔''

سلطان نے دونوں کو حکم دیا۔ ''اب تم دونوں جا سکتے ہو اور سنان پاشا! تو نے کوئی سنگین جرم نہیں کیا تو قابلِ معافی ہے۔ آئندہ تو احتیاط کرے گا۔'' اس کے بعد استاد ارسلان سے کہا۔ ''اور تو...... بخدا تو تو مجھے زہریلا نظر آتا ہے۔ اے کاش میں تجھ کو قتل کر سکتا لیکن شاید ابھی تیری زندگی ہے۔ میں تجھے ہلاک کرنا چاہوں تو بھی ہلاک نہیں کر سکتا۔''

استاد ارسلان نے سر جھکا دیا۔ ''سلطان معظم! میں ہر وقت حاضر ہوں۔ آپ جب چاہیں میری گردن سے میرا سر جدا کر دیں۔''

سلطان نرم پڑ گیا۔ بولا۔ ''نہیں، اب مجھے اتنی جلدی بھی نہیں۔ جب تک میں ان چند ہزار سرکش اور باغی سپاہیوں کو کوئی سزا نہ دوں اس وقت تک تو آزاد ہے، مزے کر لے۔''

وہ دونوں باری باری سلطان کی طرف دیکھنے لگے لیکن جب تک ان کے درمیان سلطان موجود رہا، ان کی ہمت اور حوصلے پستی میں پڑے رہے اور جب دونوں اپنے اپنے خیموں میں جا کر اپنے ماضی کے بارے میں کچھ سوچنے لگے تو خدا کی وسیع و عریض دنیا سے امیدیں پیدا ہو گئیں۔

انہیں پوری رات نیند نہیں آئی۔ طرح طرح کے خیالات اور عجیب و غریب خواب نظر آتے رہے۔

صبح طلوعِ آفتاب کے فوراً بعد ان دونوں کے پاس سلطان کا آدمی پہنچ گیا اور انہیں مطلع کیا کہ سلطان نے انہیں فوراً ہی طلب کیا ہے۔ سنان پاشا فوراً ہی سلطان کی خدمت میں روانہ ہو گیا۔ اس کے پیچھے پیچھے خوفزدہ ارسلان یوں چلتا رہا، گویا اس نے شراب پی رکھی ہو۔ اس کو یقین ہو چلا تھا کہ سلطان نے اس کو گردن زدنی کے لیے طلب کیا ہوگا۔

اس وقت سلطان کے خیمے کے در پر کئی گھوڑے کھڑے تھے اور سلطان کے در پر محافظین اور خدام ادب کا غیر معمولی ہجوم تھا۔ استاد ارسلان نے ان میں کئی اپنے شاگردوں کو بھی دیکھا جو سلطان کی دربانی پر مامور تھے۔ اس کو فوراً ہی اندر جانے دیا گیا۔ اندر شاندار دربار لگا ہوا تھا۔

اس نے سلطان کے چوبی چبوترے کے پاس بالکل اور عین سلطان کے روبرو چند چہرے کھڑے دیکھے۔ وہ اپنے لباس اور وضع قطع سے عرب نظر آتے تھے۔ استاد ارسلان کو دربار میں جب کہیں بھی جگہ نہ ملی تو وہ سب سے پچھلی جگہ پر بیٹھ گیا اور سلطان کے حاجب کو اپنی آمد کی اطلاع دے دی۔

کچھ ہی دیر بعد دربار کے لوگ واپس چلے گئے اور وہاں سناٹا طاری ہوگیا۔ سلطان نے ارسلان اور سنان پاشا کو اپنے پاس بلالیا۔ استاد ارسلان کو بطورِ خاص اپنے پاس بلایا تھا۔ سلطان نے ان دونوں کو پلک نہ جھپکنے والے انداز میں گھورا اور شفقت آمیز لہجے میں کہا۔ ''ارسلان! کچھ یادیں ایسی بھی ہوتی ہیں جنہیں حافظے سے نکالا نہیں جاسکتا۔''

سنان پاشا نے پوچھا۔ ''مثلاً، کوئی مثال! اس ناچیز میں اتنی ہمت تو نہیں ہے کہ حضورِ والا سے سوال کرے لیکن چونکہ سلطانِ معظم خود ہی سوالات کرنے کی اجازت مرحمت فرمادیتے ہیں اس لیے ناچیز اپنے علم میں اضافے کی نیت سے سوالات کرلیتا ہے۔''

سلطان نے پوچھا۔ ''تو مجھ سے کیا پوچھنا چاہتا ہے؟''

سنان پاشا نے عرض کیا۔ ''یہ کہ کچھ یادیں ایسی بھی ہوتی ہیں جنہیں حافظے سے نکالا نہیں جاسکتا۔ حضورِ والا! ان یادوں کی وضاحت فرمادیں تو نوازش ہوگی۔''

سلطان نے جواب دیا۔ ''شاہ صفوی کی بیوی ناہید زکریا کا اب بھی دم بھرتی ہے حالانکہ وہ جانتی ہے کہ اس کے باپ کا قتل زکریا ہی کے ہاتھوں ہوا تھا اور وہ یہ بھی جانتی ہے کہ اس کے خاندان اور قبائل کی تباہی اور بربادی میں زکریا پوری طرح ملوث رہا ہے۔ یہ سب جاننے کے باوجود وہ زکریا ہی کا دم بھرتی ہے۔''

سنان پاشا نے عرض کیا۔ ''حضورِ والا! یہ شباب کی کارفرمائیاں ہیں، نوجوانی کے تماشے ہیں۔''

سلطان نے بڑی مایوسی سے کہا۔ ''افسوس کہ انسان کے ارادے اس کے تابع نہیں ہوتے۔ یہ سوچتا کچھ ہے اور ہوکچھ اور جاتا ہے۔ صاحبان! اب میں قسطنطنیہ واپس جانا چاہتا ہوں۔ اپنے گھر، اپنے عزیزوں رشتے داروں میں۔''

سنان پاشا اور استاد ارسلان کو ایک ہی شبہ ہوا کہ کہیں سلطان ان کو ٹٹول تو نہیں رہا۔

سنان پاشا نے عرض کیا۔ ''حضورِ والا نے واپسی کا ارادہ کیوں فرمایا؟ میں نہیں جانتا لیکن میں یہ ضرور عرض کروں گا کہ یہ فیصلہ حضور کے مزاج کے بالکل خلاف ہے۔ برعکس، سراسر مختلف اور متضاد ہے۔''

سلطان نے جواب دیا۔ ''ہاں، یہ بات تو میں بھی جانتا ہوں لیکن افسوس کہ واپسی کا ناگوار فرض میں خود انجام دینے والا ہوں۔''

سنان پاشا کو اب بھی سلطان کی بات پر اعتبار نہیں آرہا تھا، بے یقینی سے کہا۔ ''ممکن ہے آپ اس طرح سوچ رہے ہوں لیکن مجھے یقین نہیں آرہا۔''

سلطان نے دونوں کے سامنے وزیراعظم کا خط رکھ دیا، بولا۔ ''یہ پیری پاشا کا خط ہے۔ اس نے مجھے مطلع کیا ہے کہ میری عدم موجودگی میں میرے مخالف عناصر سر اٹھارہے ہیں اور سازشوں میں مشغول ہیں اس لیے مجھ کو جلد از جلد قسطنطنیہ پہنچنا ہے۔ اب میں یہ سوچنے پر مجبور ہوگیا ہوں کہ میری فوج کا وہ سرکش اور مخالف عنصر جو اپنے گھروں کو واپس جانا چاہتا ہے، میری بہبود میں بحکم ربی ایسا کررہا تھا۔ مجھے ان کا شکرگزار ہونا چاہیے۔''

ارسلان نے دبی دبی زبان میں پوچھا۔ ''تو کیا سلطان نے واپسی کا حتمی فیصلہ کرلیا ہے؟''

سلطان نے جواب دیا۔ ''بے شک، یہ میرا حتمی فیصلہ ہے۔'' پھر سنان پاشا سے کہا۔ ''بہرحال یہ بات کہ میں قسطنطنیہ کیوں واپس جارہا ہوں، اس راز سے میں خود واقف ہوں یا تم دونوں۔ کسی چوتھے کو اس کا علم نہیں ہے اس لیے سنان پاشا اگر تو چاہے تو فوج کو سرکشی اور واپسی پر مصر جمعیت کو یہ خوش خبری سنا سکتا ہے کہ میں نے ان کی درخواست منظور کرلی ہے اور یہ درخواست محض تیری سفارش پر منظور کی گئی ہے۔ تو چاہے تو ان پر احسان جتا سکتا ہے۔''

پھر استاد ارسلان سے اچانک مخاطب ہوگیا۔ ''اور ہاں تو بھی..... تو بھی اسی قسم کی باتیں کرسکتا ہے۔''

دونوں فکرمند اور خوفزدہ سلطان کی باتوں کو شک وشبہے سے سنتے رہے۔ اس وقت دونوں ہی بس ایک بات سوچ رہے تھے کہیں اس میں سلطان کی کوئی چال کارفرما نہ ہو۔ سلطان کو ان دونوں پر غصہ آرہا تھا جو اس کی باتوں پر یقین کرنے کو تیار نہ تھے۔ وہ دونوں کو سخت سست کہنے لگا۔ ''میں پوچھتا ہوں یہ تم دونوں کی عقلوں کو آخر کیا ہوگیا ہے۔ تم دونوں کی خود اعتمادی بالکل ہی رخصت ہوچکی ہے شاید۔''

استاد ارسلان نے عرض کیا۔ ''حضورِ والا! ہماری خود اعتمادی ہمارے پاس ہی ہے مگر سلطان کی واپسی کی بات ایک ایسی بات ہے جیسے یہ کہہ دیا جائے کہ سورج مغرب سے طلوع ہونے والا ہے۔''

سلطان نے کہا۔ ''فضول بات، میں انسان ہوں، سورج نہیں۔ میں ارادوں کا مالک ہوں، جب چاہوں بدل دوں اور جب چاہوں ان پر قائم رہوں۔ میں واپس جانے والا ہوں، اس پر تم دونوں یقین کرلو۔ اگر نہیں یقین کروگے تو جب تم دونوں میرے ساتھ قسطنطنیہ میں داخل ہوجاؤ گے تو خود بخود میری بات پر اعتبار آجائے گا۔''

جب کافی دیر تک سلطان اپنی بات پر قائم رہا تو ان دونوں کو یقین آگیا۔ ان دونوں نے باہر نکل کر یہ اعلان کردیا کہ سلطانِ معظم قسطنطنیہ واپس جارہے ہیں اور انہوں نے یہ فیصلہ استاد ارسلان اور سنان پاشا کی سفارش پر کیا ہے اس لیے باغی حضرات کو ان دونوں کا شکر گزار ہونا چاہیے۔

پورے عساکر سلطانی میں خوشی کی لہر دوڑ گئی اور ان کے تمتماتے چہروں سے ان کے دلوں کی خوشیوں کا اندازہ ہورہا تھا۔

روانگی سے پہلے سلطان نے ایران کی سمت دیکھا اور کہا۔ ''ایران! میں تیرے پاس پھر آؤں گا۔ تو فکر نہ کر، میں تیرے پاس آؤں گا اور تجھ کو حق و انصاف سے بھر دوں گا۔''

حدِ نظر تک پھیلے ہوئے عساکر اسلام نے جب ایشیائے کوچک کی مغربی سمتوں میں سفر شروع کیا تو زمین ہلنے لگی۔ ان کے جانور اگر تھک جاتے تھے تو انہیں وہیں راستے میں چھوڑ کر کہیں سے تازہ دم گھوڑے لے لیے جاتے تھے۔ شب و روز منزلیں مارتے ہوئے یہ لوگ ادا پزاری کے جنوب میں دریائے سقریہ کے کنارے خیمہ زن ہوگئے۔ یہاں سلطان نے ذرا دم لیا کیونکہ اب قسطنطنیہ زیادہ دور نہیں تھا۔ یہاں سلطان نے اپنے منصب داروں اور علم برداروں کو اپنے قریب کیا اور انہیں شرفِ ملاقات اور اعزازِ دیدار بخشا۔ زکریا اب بھی حراست میں تھا لیکن سلطان کا جوش اور غصہ سرد پڑ چکا تھا۔ سلطان چاہتا تھا کہ زکریا کو حراست سے نکال لیا جائے لیکن حکم دینے میں تساہل سے کام لے رہا تھا۔ دریائے سقریہ کے کنارے اس کو یہ احساس ہوا کہ قسطنطنیہ میں داخل ہونے سے پہلے ہی اپنی فوج کا دل مٹھی میں کرلینا چاہیے کیونکہ اگر فوج کا بددل اور دل برداشتہ عنصر قسطنطنیہ کے مخالف عناصر سے مل گیا تو سلطان کے خلاف کوئی خطرناک صورتِ حال پیدا ہوسکتی ہے۔ یہی سوچ کر اس نے اپنے عساکر کے سرداروں کو اپنے روبرو کرلیا اور ان سے بہت اچھی طرح پیش آیا۔ اس نے ان سب کی شاندار دعوت کی اور انہیں خود سے ہم کلام ہونے کی عزت بخشی۔ اس نے اپنے سرداروں سے کہہ دیا کہ وہ اپنے جاں نثاروں کی وفاداریاں اس شرط پر قبول کرنے کو تیار ہے کہ ان کی وفاداری بے لاگ اور اٹوٹ ہو۔ جو شخص انسان کا وفادار نہ ہو، وہ اللہ کا وفادار کس طرح ہوسکتا ہے اور جو اپنے رب کا وفادار نہ ہو، اس کو جینے کا کوئی حق نہیں۔ سلطان نے یہ بھی کہا۔ ''لوگوں کا اصرار تھا کہ انہیں ان کے گھروں کو جانے کی اجازت دی جائے۔ میں نے ان کی یہ درخواست اپنے لائق اور وفادار جانثاروں کی سفارش پر منظور کرلی اور اب ان کے ساتھ میں خود بھی قسطنطنیہ جارہا ہوں۔''

ایک وسیع و عریض سبزہ زار پر سلطان اپنے جاں نثاروں اور وفاداروں کے ساتھ اس طرح بیٹھا تھا کہ درمیانی فاصلہ بدستور برقرار رکھا۔ عام سپاہیوں یا معمولی عہدیداروں کو سلطان کے پاس جانے کی اجازت نہ تھی۔ ان میں ہزاروں کی تعداد میں وہ ہجوم بھی موجود تھا جس نے وطن واپس جانے پر اصرار کیا تھا اور آخر بغاوت کردی تھی۔ سلطان نے ان پر کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ انہیں مخاطب کیے بغیر سلطان نے اعلان کیا۔ ''میں اور میری فوج ایک عظیم الشان درخت کی طرح ہیں۔ اس کا حسن، طاقت اور فائدے اس بات میں مضمر ہیں کہ اس کی شاخیں، پتے اور اس سے متعلق دوسرے اجزا اس درخت سے وابستہ و پیوستہ رہیں۔ درخت کی جو شاخ یا جو پتے اس سے ٹوٹ کر جدا ہوجاتے ہیں، وہ درخت کو کوئی نقصان نہیں پہنچاتے کیونکہ ان کی جگہ دوسری شاخیں اور دوسرے پتے لے لیتے ہیں لیکن جو شاخیں یا پتے اپنے درخت سے جدا ہوجاتے ہیں وہ یا تو دوسروں کے لیے ایندھن بن جاتے ہیں یا لوگوں کے پاؤں تلے روندے جاتے ہیں۔ خواری اور ذلت ان کا مقدر بن جاتی ہے۔''

سلطان کی فوج کا باغی عنصر بہت شرمندہ تھا اور جنہوں نے اپنی بغاوت کا اظہار نہیں کیا تھا، وہ خوش تھے کہ ان کی عزت و آبرو رہ گئی ہے۔ سنان پاشا اور استاد ارسلان کی وفاداریاں پختہ تر ہوگئی تھیں۔

اب سلطان نے اپنے عزائم کا اظہار کیا۔ ''میں اپنی حدود سلطنت کو وسعت دینا چاہتا ہوں۔ میرے سامنے ایک ایسی دنیا ہے جو میرے بزرگوں کی تسخیر سے رہ گئی تھی، اگر میں کسی کاروباری کا بیٹا ہوتا تو بخدا اپنے باپ کے چھوڑے ہوئے ترکے اور ورثے میں اضافہ کیے بغیر ہرگز نہ رہتا لیکن میں خوش قسمتی سے سلطان ابن سلطان ابن سلطان ہوں اور یہ میرا فرض ہے کہ میں اپنے آبا و اجداد کی بخشی ہوئی زمینوں

اور اس کی وسعتوں میں اضافہ کروں۔ اگر میں اپنی سلطنت کی حدود میں اضافہ کروں گا تو اس سے انہیں بھی فائدہ پہنچے گا جو مجھ سے متعلق ہیں، جو مجھ سے وابستہ ہیں۔ مجھ میں اور میری فوج اور میرے متوسلین میں اگر کوئی مابہ الامتیاز شے ہے تو یہ کہ میں قناعت کو سختی سے ناپسند کرتا ہوں اور دوسرے قناعت پسند ہیں۔''

ہجوم میں ایک شخص کھڑا ہو گیا اور جذباتی آواز میں چیخ کر کہا۔ ''میں سلطان پر اپنی جان تک نچھاور کرنے کو تیار ہوں۔ خدا کے لیے مجھ کو قربِ سلطانی عطا فرمایا جائے۔''

سلطان نے سنان پاشا کو حکم دیا۔ ''اس شخص کو میرے پاس لایا جائے۔''

اس کو اسی وقت سلطان کے پاس پہنچا دیا گیا۔

سنان پاشا نے سلطان کو دبی آواز میں ہوشیار کیا۔ ''جس کو ہم جانتے نہ ہوں، اس پر ایک دم اعتبار کرنا چاہیے یا نہیں؟''

سلطان نے جواب دیا۔ ''میں انسان کی آواز اور لہجے میں موجود اس کے مکر اور خلوص کو جان لیتا ہوں۔ میں اعتبار اسی پر کرتا ہوں جو مخلص، جاں نثار اور وفادار ہوتا ہے۔ یہ چیزیں انسان کی آواز میں شامل ہو کر میرے کانوں کی راہ سے دل میں اتر جاتی ہیں۔''

سنان پاشا لاجواب ہو گیا۔ سلطان نے استاد ارسلان سے اچانک سوال کیا۔ ''زکریا کہاں ہے؟''

ارسلان نے جواب دیا۔ ''حراست میں۔''

سلطان نے کہا۔ ''لیکن اس کو اس وقت یہاں ہونا چاہیے تھا۔ اے کاش کہ میری باتیں اس نے بھی سن لی ہوتیں۔'' پھر حکم دیا۔ ''اس کو اسی وقت لایا جائے۔''

زکریا کو آنے میں دیر نہیں لگی۔ جب وہ سلطان کے روبرو کھڑا کیا گیا تو درباری کروفر نے اس کو بہت زیادہ مرعوب کر دیا۔ اس نے ایک نوجوان شخص کو سلطان کے بہت قریب کھڑے دیکھا اور جل گیا۔ کسی سے پوچھا۔ ''یہ کون نوجوان ہے؟''

اسے بتایا گیا۔ ''سلطان کا نیا جاں نثار، جس نے بھرے مجمع میں یہ وعدہ کر لیا کہ وہ سلطان پر ہر وقت جان نثار کرنے کو تیار ہے اور سلطانی قرب کا خواستگار ہے چنانچہ سلطان نے اس کو اپنے پاس ہی بلا لیا۔''

سلطان نے زکریا سے پوچھا۔ ''تیرا کیا حال ہے؟ تو اب بھی سوداوی ہے یا کچھ اثر کم ہوا؟''

زکریا سے بولا نہیں جا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔

سلطان نے کہا۔ ''میں نے سبھی کو معاف کر دیا۔ اس میں تو بھی شامل ہے لیکن وعدہ کر کہ تو آئندہ عورتوں اور لڑکیوں کے چکر میں نہیں پڑے گا جبکہ تجھے ابھی بہت سارے کام انجام دینا ہیں۔''

زکریا نے سلطان کی زبان سے شفقت آمیز کلمات سنے تو پھولا نہ سمایا، عاجزی سے عرض کیا۔ ''حضورِ والا! مجھ پر کبھی کبھی بے کیفی اور جنون کا دورہ پڑتا ہے اور اس میں، میں اپنے ہوش و حواس میں نہیں رہتا۔ ورنہ اگر کسی طرح میرے دل میں اتر کر دیکھا جائے تو اس میں سلطان کی اطاعت اور فرمانبرداری کے سوا کچھ بھی نہیں۔''

سلطان نے اپنے حاضر امراء سے پوچھا۔ ''کسی کو مجھ سے کچھ پوچھنا ہے؟''

کسی امیر نے عرض کیا۔ ''میں نے جو کچھ سنا، قبول کیا اور جاں نثاری کا عہد کر لیا۔''

کسی اور نے کہا۔ ''میرے پاس جو کچھ بھی ہے، حتیٰ کہ عزت آبرو اور جان تک، سلطان پر نچھاور کرنے کو تیار ہوں۔''

ایک نے دور سے عرض کیا۔ ''میں سلطان کے فیض بخش گھنے سائے میں جینا اور مرنا چاہتا ہوں۔''

سلطان نے ان سب کو ایک ہی جواب دیا۔ ''میں راعی ہوں اور تم سب رعایا۔ رعایا کا کام ہی یہ ہے کہ راعی کے حکم پر چلے۔''

اس کے بعد سلطان اپنے خیمے میں چلا گیا۔ سلطان کے جاتے ہی سرگوشی میں کی جانے والی باتیں زور زور سے ہونے لگیں۔ سلطان کے باغی سب سے زیادہ شرمندہ تھے اور ایک دوسرے کو موردِ الزام قرار دے رہے تھے۔

تھوڑی دیر بعد سلطان نے سنان پاشا، استاد ارسلان، زکریا اور اس شخص کو اپنے خیمے میں طلب کر لیا جس نے سلطان پر اپنی جان نچھاور کر دینے کا اعلان کر دیا تھا اور سلطانی قرب کا خواہش مند تھا۔

جب یہ لوگ خیمے میں داخل ہوئے تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ اتنے مختصر وقفے میں سلطان نے اپنا لباس تبدیل کر لیا تھا۔ اس وقت اس کے جسم پر جو لباس تھا، اس پر شیر کی دھاریاں اور چیتے کی چتیاں بنی ہوئی تھیں۔ سلطان نے ان سب کو ان کی حیثیتوں کے مطابق جگہیں دیں۔ سنان پاشا اور استاد ارسلان سلطان سے زیادہ قریب رہے۔ زکریا کے لیے یہ نوجوان مصیبت بنا ہوا تھا۔ وہ اس نوجوان کو سلطان کے قریب نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ اس نے نوجوان سے پوچھا۔

''کیا تو سلطان کے قرب کا مفہوم جانتا ہے؟''
نوجوان نے جواب دیا۔''ہاں، جانتا ہوں۔ سلطان ایک گھنے درخت کی طرح ہے۔ میں اس کے سائے میں رہنا چاہتا ہوں۔''
استاد ارسلان نے ان دونوں کے پاس جا کر مداخلت کی۔
''سلطان کی موجودگی میں سرگوشیاں کرنا گستاخی میں داخل ہے۔''
سلطان نے سنان پاشا سے کہا۔''زکریا سے پوچھ یہ کیا چاہتا ہے؟ کیا اس کو یہ بات پسند آئے گی کہ اسے دوبارہ سلطانی اقامتی درس گاہ میں داخل کر دیا جائے؟''
جب یہ سوال سنان پاشا نے زکریا کے سامنے دہرایا تو وہ پریشان ہو گیا اور جواب دیا۔''اب میں دنیا کی وسیع وعریض درس گاہ میں داخل ہو چکا ہوں۔ سلطان معظم مجھے قید کا حکم نہ دیں تو نوازش ہو گی۔''
سلطان نے کہا۔''سنان پاشا! اس کو صاف صاف بتا دے کہ جب تک کسی کو اپنے نفس اور اپنی ذات پر اعتماد اور قابو حاصل نہ ہو، دنیا کی کھلی درس گاہ میں کامیاب نہیں رہتا، وہاں تو ہر ہر قدم پر ترغیب اور تحریص کے پھندے بچھے ہوتے ہیں۔ یہ توان کا بہ آسانی شکار ہو جائے گا۔''
سنان پاشا زکریا کے پاس چلا گیا، آہستہ آہستہ سمجھانے لگا۔''زکریا! کیا تو ترغیب اور تحریص کا مطلب سمجھا؟ شاید نہیں سمجھا۔ سلطان کا خیال ہے کہ اگر تجھے باہر چھوڑ دیا گیا تو تو غزالان شہری اور مہوشانِ مدنی کی خمار آگیں آنکھوں اور دل ربا ناز و انداز کا بہ آسانی شکار ہوتا رہے گا۔ تو نے ناہید کی وجہ سے خاصا غیر معتبر کر لیا ہے اپنے آپ کو۔''
زکریا کے پاس اگر اجنبی نوجوان نہ کھڑا ہوتا تو شاید وہ ایک بار پھر سرکشی اور تذبذب سے کام لیتا لیکن رشک وحسد کے ملے جلے جذبے نے اس کو بالکل بے بس اور مجبور کر دیا تھا۔ اس نے سنان پاشا سے کہا۔''محترم پاشا! پہلے سلطان معظم مجھ سے براہِ راست مخاطب ہوا کرتے تھے۔ افسوس کہ اب میں اس اعزاز سے محروم ہو چکا ہوں۔ آپ سلطان سے فرما دیجیے کہ میں اپنا پچھلا اعتماد بہر قیمت بحال کرنا چاہتا ہوں۔''
زکریا کی یقین دہانیوں کے جواب میں سلطان کی طرف سے سنان پاشا نے زکریا سے کہا۔''زکریا! ابھی کچھ دیر پہلے سلطان نے اپنے باغی عنصر کو سمجھاتے ہوئے فرمایا تھا کہ سلطان اور اس کی فوج ایک درخت کی طرح ہوتے ہیں۔ اگر درخت کی چند شاخیں اور پتے درخت سے جدائی اختیار کر لیں تو یہ درخت کے بجائے جدا ہونے والی شاخوں اور پتوں کے حق میں برا ہوتا ہے۔ درخت میں شاخوں اور پتوں کی خالی جگہ کو دوسری شاخیں اور پتے پُر کر دیتے ہیں اور درخت سے جدا ہو جانے والی شاخیں لوگوں کے ایندھن کے کام آتی ہیں اور پتے پاؤں تلے روندے جاتے ہیں۔ ذلت اور خواری ان کا مقدر بن جاتی ہے۔''
زکریا نے تقریباً روہانسی آواز میں کہا۔''میں سلطانِ معظم کا سابقہ اعتماد حاصل کرنا چاہتا ہوں۔''
سنان پاشا نے جواب دیا۔''میرا کام ختم ہوا۔ تجھے سلطان سے جو کچھ بھی کہنا ہے، اپنے استاد ارسلان کے توسط سے کہہ۔''
اس کے بعد سنان پاشا زکریا کے پاس سے چلا گیا اور زکریا کے جواب سلطان کے گوش گزار کر دیے۔ سلطان نے استاد ارسلان سے کہا۔''ارسلان! تو اس کو سمجھا دے کہ اگر یہ میرا اعتماد حاصل کرنا چاہتا ہے تو آئندہ اس کو شام وعراق کے شہروں میں کچھ خدمت انجام دینا ہو گی۔ اگر اس میں یہ کامیاب ہو گیا تو اسے میری طرف سے وہ کچھ عطا ہو گا، جس کا یہ خواب وخیال میں بھی گمان نہیں کر سکتا۔''
زکریا نے دل میں سوچا کہ شاید سلطان میری کامیابی کے بعد ناہید کو میرے حوالے کر دے گا۔ اس نے اور زیادہ فرمانبرداری کا مظاہرہ کیا۔
اب سلطان نے اجنبی نوجوان کو مخاطب کیا۔''ہاں تو نوجوان...... تیرا نام کیا ہے؟''
سلطان اس نوجوان سے براہِ راست مخاطب ہوا تھا۔ اس بات نے زکریا کے دل پر آرے سے چلا دیے۔
نوجوان نے جواب دیا۔''سلطان معظم! ناچیز کو جعفر چلپی کہتے ہیں اور میں حضور کی فوج میں ایک معمولی سپاہی کی حیثیت سے ملازم ہوں۔''
سلطان نے کہا۔''اب تو براہِ راست سنان پاشا یا ارسلان کی خدمت میں رہے گا اور اس طرح تجھے میرا قرب بھی حاصل رہے گا۔''
زکریا کے دماغ کی شریانیں پھٹی جا رہی تھیں، وہ کچھ بولنا چاہتا تھا لیکن سلطانی رعب اور دبدبے نے اسے گونگا کر دیا تھا۔
سلطان نے اپنے خدمت گاروں کو حکم دیا۔''شاہ کی بیوی ناہید کو حاضر کیا جائے۔''
ناہید کے ذکر نے زکریا کو چونکا دیا اور وہ خوشی سے نیم پاگل سا ہو گیا۔ کچھ دیر بعد ناہید کو سلطان کی خدمت میں

پیش کر دیا گیا۔ سلطان نے اس شعلہ جوالہ کو دیکھا تو بس دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ کبھی تو ناہید کی طرف دیکھتا اور کبھی زکریا کو دیکھنا چاہتا لیکن وضع احتیاط سے نظریں چرا جاتا۔ سلطان نے اچانک استاد ارسلان کو مخاطب کیا۔ ''ارسلان! ذرا تو زکریا سے یہ تو پوچھ کہ......''

لیکن سلطان کسی وجہ سے پورا سوال نہیں کر سکا، خاموش ہو گیا۔

سلطان اچانک جعفر چلپی سے مخاطب ہوا۔ ''تو میرے اور زیادہ قریب کیوں نہیں آ جاتا۔''

جعفر اس سے اور زیادہ قریب ہو گیا۔ زکریا نوازشِ سلطانی دیکھ رہا تھا اور خون کے گھونٹ پی رہا تھا۔

سلطان نے جعفر چلپی سے کہا۔ ''شرمیلے نوجوان! تو پتھر تھا مگر پارس سے چھو کر سونا بن گیا۔''

جعفر چلپی نے معصومیت سے جواب دیا۔ ''حضور والا! میں نے اس سے انکار کب کیا۔ میں پتھر نہیں مٹی تھا جو حضور کی نوازش سے سونا بن گیا۔''

سلطان نے پوچھا۔ ''اب تجھے قربِ سلطانی میسر آ چکا ہے اب اور کیا چاہتا ہے؟''

جعفر نے جواب دیا۔ ''میں جو چاہتا تھا مجھے مل گیا، اب یہ کام اور ہو جائے تو بڑا مزہ آئے گا کہ میں حضور والا کے محافظ دستے میں شامل کر لیا جاؤں، اس طرح میں سلطان کی بہت زیادہ خدمت کر سکوں گا۔''

سلطان نے اچانک سوال کیا۔ ''تو شادی شدہ ہے یا نہیں؟''

جعفر نے جواب دیا۔ ''سلطان معظم! نہ تو میں شادی شدہ ہوں اور نہ ہی شادی کرنا چاہتا ہوں۔ جیسا ہوں، ویسا ہی ٹھیک ہوں۔''

سلطان کچھ دیر تو خاموش رہا۔ اس نے دیکھا کہ زکریا، ناہید کو دیکھنے کے لیے بے چین ہے مگر سلطانی رعب نے اسے بے بس کر رکھا ہے۔

سنان پاشا اور استاد ارسلان یہ جاننے کے لیے بے چین تھے کہ ناہید کو کیوں طلب کیا گیا ہے۔ سلطان نے اچانک سوال کیا۔

''سنان پاشا! شاہ صفوی ان دنوں کہاں ہے؟ اور اس نے اپنی بیوی ناہید کے سلسلے میں کوئی رابطہ قائم کیا ہے یا نہیں؟''

سنان پاشا نے جواب دیا۔ ''سلطان معظم! سننے میں آیا ہے کہ وہ ناہید کے لیے بہت بے قرار ہے۔ وہ سلطان کی خدمت میں مزید سفارت شاید اس لیے نہیں بھیج سکا کہ وہ جانتا ہے سلطان اس کی ہر درخواست رد فرما دیں گے۔''

سلطان نے ناہید سے پوچھا۔ ''لڑکی! کیا تو شاہ کے پاس جانا چاہتی ہے؟''

ناہید نے جواب دیا۔ ''نہیں، میں شاہ کے پاس خوش نہیں رہی۔''

سلطان نے جعفر چلپی سے کہا۔ ''نہ تو تو شادی شدہ ہے اور نہ شادی کرنا چاہتا ہے۔ مجھے تیری باتیں بہت اچھی لگ رہی ہیں۔ لے ناہید کو لے جا، یہ میری طرف سے ایک اعلیٰ و ارفع انعام ہے۔''

سلطان کے غیر متوقع اعلان نے پورے ماحول پر سنسنی سی طاری کر دی۔ ہر کوئی دنگ تھا۔ زکریا کو اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔ سنان پاشا اور استاد ارسلان کو یقین نہیں آتا تھا کہ سلطان نے یہ کوئی سنجیدہ فیصلہ کیا ہے۔ جعفر چلپی میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ سلطان کے اس دلچسپ انعام کو شکریہ کے ساتھ قبول کر لیتا۔ سلطان حیران تھا کہ آخر لوگوں کو یہ ہو کیا گیا ہے کہ اس کی شاندار بخشش پر نعرۂ تحسین کیوں نہیں بلند کرتے۔ ناہید بھی ہکا بکا جعفر چلپی کو دیکھنے کی ناکام جسارت کر رہی تھی۔

آخر اس سکوت کو زکریا نے توڑ دیا۔ کمزور اور نحیف آواز میں سلطان سے پوچھا۔ ''سلطان معظم! کیا یہ اجنبی سپاہی اتنا خوش قسمت ہے کہ اپنی خوش قسمتی کا طول طویل زمانی سفر لمحوں میں طے کر لے؟ یا سلطان معظم اپنے اس اعلان کی صورت میں کوئی دلچسپ مذاق فرما رہے ہیں؟ کیا شاہ کی ناموس اتنی ارزاں ہے کہ اسے ایک معمولی سپاہی کے حوالے کر دیا جائے؟''

سلطان کی پیشانی پر ناگواری سے بل پڑ گئے۔ اس نے زکریا کو ایک بار پھر سرزنش کی۔ ''سنان پاشا! اس مخبوط الحواس نوجوان کو میری نظروں سے دور کر دیا جائے۔''

سنان پاشا زکریا پر یوں جھپٹا جس طرح باز اپنے شکار پر گرتا ہے۔ اس نے زکریا کو شانوں سے پکڑ کر گھسیٹنا شروع کر دیا اور کھینچتا ہوا خیمے سے باہر تک لے گیا۔ وہاں سلطانی محافظوں نے زکریا کو پکڑ کر باندھ دیا اور پھر سلطانی محبس میں ڈال دیا۔

سلطان کی طبیعت بہت مکدر ہو چکی تھی۔ سنان پاشا جب دوبارہ سلطان کی خدمت میں پہنچا تو سلطان کو غضبناک اور حاضرین کو لرزاں و ترساں دیکھا۔ ناہید جعفر چلپی کے قبضے میں جا چکی تھی اور وہاں کا ہر شخص سلطان کی زبان سے بس ایک لفظ سننے کا خواہشمند تھا۔ ''تخلیہ!''

سلطان نے سنان پاشا اور استاد ارسلان کو حکم دیا۔ ''میں تم دونوں کو حکم دیتا ہوں کہ اس وحشی کو انسان بناؤ، اس کو بتاؤ کہ سلطانی مجلس میں کس طرح زبان کھولی جاتی ہے۔ اس کو یہ نکتہ بھی ذہن نشین کرادو کہ وہ سلطنتِ عثمانیہ کا ایک معمولی پرزہ ہے۔ اس کو ہمیشہ یہ خیال رکھنا ہے کہ میں کیا چاہتا ہوں اور اسے اپنے دل سے یہ بات نکال دینا پڑے گی کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ سنان پاشا اس کو بتادے کہ وہ ابھی تک سلطان کے معیار پر پورا نہیں اترا۔'' پھر اچانک جعفر چلپی اور ناہید کو حکم دیا۔ ''تم دونوں ابھی تک یہیں موجود ہو، جاؤ اور خیمے کے باہر کھڑے ہوکر میرے دوسرے حکم کا انتظار کرو۔''

جعفر اور ناہید ایک ساتھ خیمے سے نکل گئے۔ اب سلطان نے استاد ارسلان کو مخاطب کیا۔ ''اور ارسلان تو! تُو تو اس کندۂ ناتراش کا استاد رہ چکا ہے۔ اس کو ابھی تک یہ بھی نہیں معلوم کہ میں کون ہوں اور اس کو میرے روبرو کس طرح رہنا چاہیے۔''

استاد ارسلان زکریا کی جرأت سے ذرا پریشان ضرور ہوا تھا۔ سلطان کو نہایت ہوشیاری سے جواب دیا۔ ''سلطان والاشان! گستاخی معاف۔ زکریا بالطبع ایسا نہیں ہے جیسا وہ ادھر کچھ عرصے سے نظر آرہا ہے۔ جیسا کہ حضور والا خود بھی جانتے ہیں کہ زکریا کے دل ودماغ پر ایک لڑکی سوار ہے اور جب بھی اس لڑکی کا ذکر آتا ہے وہ اپنے ہوش وحواس کھو بیٹھتا ہے۔'' پھر آہستہ سے عرض کیا۔ ''اور یہ اس وقت جو کچھ ہوگیا، میں زکریا کے احساسات سے اس پر غور کرتا ہوں تو اس نتیجے پر پہنچتا ہوں کہ اس نے اپنی زبردست قوتِ ارادی سے کام لے کر......''

سلطان نے اچانک اعلان کردیا۔ ''تخلیہ۔''

استاد ارسلان اپنی بات پوری کیے بغیر ہی سنان پاشا کے ساتھ سلطانی خیمے سے نکل گیا۔

سنان پاشا نے باہر نکلتے ہی استاد ارسلان کے کان میں کہا۔ ''ارسلان! تیرا شاگرد بڑا خوش قسمت ہے ورنہ اس سے کمتر غلطیوں پر میں نے سر اترتے دیکھے ہیں۔''

استاد ارسلان کو بڑا دکھ تھا، جواب دیا۔ ''سنان پاشا! زکریا خوش قسمت نہیں بدقسمت ہے۔ کیا آپ نے ابھی ابھی اس کی بدقسمتی کا مشاہدہ نہیں کیا؟ زکریا کا حق جعفر چلپی نامی گمنام سپاہی کو مل گیا۔''

سنان پاشا نے ناگواری سے کہا۔ ''کیسا حق؟ کس کا [illegible] کو یہ بات بتادینی چاہیے کہ وہ جو کچھ کرتا ہے،

اس کا اثر اس کے اساتذہ اور ان لوگوں پر بھی پڑتا ہے جن کا کسی بھی قسم کا تعلق زکریا سے ہوتا ہے۔''

استاد ارسلان نے سنان پاشا کو کوئی جواب نہیں دیا۔

☆☆☆

سلطان قسطنطنیہ میں جس شان سے داخل ہوا، اس سے خوف کی ایک لہر دوڑ گئی۔ سلطان کے مخالف سازشی عناصر دم بخود رہ گئے۔ کیونکہ ان کا خیال تھا کہ سلطان اپنی افتادِ طبع اور ضدی مزاج ہونے کی وجہ سے قسطنطنیہ واپس نہیں آئے گا لیکن وہ اچانک واپس آچکا تھا۔ اس نے سنان پاشا کو ایشیائے کوچک روانہ کردیا تاکہ شاہ ایران اور شام ومصر کی حرکات وسکنات پر نظر رکھی جاسکے۔ سلطان کو پختہ یقین تھا کہ شکست خوردہ شاہ چوٹ کھائے ہوئے سانپ کی طرح کسی نہ کسی سمت سے حملہ آور ہونے کی کوشش ضرور کرے گا۔ اس نے سنان پاشا کو ہدایت کی کہ وہ شام اور مصر پر کڑی نظریں رکھے کیونکہ شاہ ایران انہیں حلیف بنا کے سلطان کے مقابلے میں کھڑا کرسکتا ہے۔ ان دنوں مصر میں مملوک سلطان حکمران تھا اور خود سلطان بھی اس راز سے واقف تھا کہ مشرق اور مغرب میں مملوکوں کے سوا ایک بھی طاقت ایسی نہیں جو اس کی طوفانی پیش قدمی کی راہ میں حائل ہوسکے۔

سلطان خاموشی سے اپنے محل میں چلا گیا اور کئی دنوں تک مستقبل کے منصوبے بناتا رہا۔ پیری پاشا اس کی خاموشی کو کسی طوفان کا پیش خیمہ سمجھ بیٹھا تھا۔ سازشی عناصر بھی یہی سمجھ رہے تھے کہ سلطان ان کو کوئی ایسی سزا دینے کی فکر میں ہے جس سے باغی اور سرکش ینی چری آئندہ کوئی ایسا قدم نہ اٹھاسکیں جس سے سلطان کو شرمندگی اٹھانا پڑے۔ انہوں نے سلطان کے خلاف سوچنا شروع کردیا۔ وہ قسطنطنیہ کے ات میدان کے سامنے والے صحن میں چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں تقسیم ہوکر سر جوڑ کر بیٹھتے اور آپس میں اشاروں کنایوں میں پوچھتے۔ ''کچھ پتا ہے، سلطان ان دنوں کیا سوچ رہا ہے؟''

اس سوال کا جواب مصلحت اندیشانہ ہوتا۔ ''غالباً وہ اپنے مخالفین کی مکمل تباہی کے درپے ہے۔''

سلطان کے مخالفین کون تھے؟ اس کا ینی چری کو بخوبی علم تھا۔ ینی چری کے عمر رسیدہ اور تجربہ کار لوگ اس فکر میں تھے کہ سلطان کے دل سے عناد نکال باہر کیا جائے لیکن اس کا کوئی موقع نہیں ہاتھ آرہا تھا۔ اس موقع پر انہیں استاد ارسلان یاد آیا جسے سلطان کا قرب اور اعتماد حاصل تھا لیکن ان دنوں استاد ارسلان سلطان کی صحبت میں رہ رہا تھا۔ بس کسی کسی وقت اپنے پرانے ساتھیوں میں بھی پہنچ جایا کرتا

تھا۔ ان دنوں استاد ارسلان کو بس زکریا کی فکر کھائے جارہی تھی۔ اسے زکریا پر رہ رہ کر غصہ آرہا تھا کہ وہ بلاوجہ اپنے آپ کو تباہ و برباد کرنے کی کوشش کیے جارہا تھا۔ استاد ارسلان خاص کر اس فکر میں تھا کہ کوئی موقع ہاتھ آجائے تو وہ زکریا کو سمجھا بجھا دے تاکہ سلطان سے ہوشیار رہے لیکن زکریا سلطانی حراست میں تھا اور کسی کی مجال نہ تھی کہ وہ سلطان کی اجازت اور اس کے متعینہ کارکنوں کے بغیر ملاقات یا کوئی بات کرسکے۔ سلطان اس فکر میں تھا کہ استاد ارسلان اس کے لیے مخبری کرے اور ینی چری میں گھل مل کر ان کے ارادوں کا پتا چلائے۔

استاد ارسلان سلطان کو شاہانِ قدیم کے ولولہ انگیز واقعات سنارہا تھا۔ باتوں باتوں میں استاد ارسلان نے سکندر مقدونی کی بابت بتایا۔ ''جس عمر میں لوگ اپنے کام کا آغاز نہیں کرتے، سکندر محیر العقول کارنامے انجام دے کر اس فانی دنیا سے کوچ کر گیا تھا۔''

سلطان نے حکم دیا۔ ''اس کو واضح طور پر بیان کیا جائے۔''

استاد ارسلان نے جواب دیا۔ ''سلطان والا شان! سکندر بتیس سال کی عمر میں وفات پاچکا تھا۔''

سلطان کو بڑی غیرت آئی۔ بولا۔ ''میں بھی ویسے ہی کارنامے انجام دے سکتا ہوں لیکن اس کی طرح مرنے میں عجلت سے کام نہیں لینا چاہتا۔'' پھر بڑے افسوس سے کہا۔ ''اے کاش! میں اپنی ہی جیسی فوج کا سلطان ہوتا۔ یہ بھگوڑے اور کام چور مجھ سے وابستہ نہ ہوتے۔'' اس نے بطورِ خاص استاد ارسلان کو مخاطب کیا۔ ''غالباً یہ درست ہے کہ ینی چری کے دل میری طرف سے گرد آلود ہیں۔ تیری معلومات کیا کہتی ہے؟''

استاد ارسلان نے جواب دیا۔ ''حضور والا! جب سے میں رکنی وزیر بنا ہوں، ینی چری اور اس کے اعمال و افکار کا مجھے کوئی خاص علم نہیں ہے۔''

سلطان تڑپ کر کھڑا ہوگیا۔ ''بس آگے کچھ نہ کہو، میں سلطان ہوں اور اپنی ہزاروں آنکھوں اور ہزاروں کانوں سے ہر بات کا علم رکھتا ہوں۔ میں نے تجھے سہ رکنی وزراء میں شامل کردیا۔ تیرا یہ فرض تھا کہ تو جس کا نمک کھائے، اس کے لیے کچھ کام بھی کرے۔ تجھے وزارت کے خول سے نکل کر جعفر برمکی بن جانا چاہیے اور یہ دیکھنا چاہیے کہ کون کیا کررہا ہے اور کون کیا کہہ رہا ہے۔''

استاد ارسلان نے عرض کیا۔ ''حضور والا! عراقی گھوڑے کی طرح اس ناچیز کو اشارہ کافی ہے لیکن ساتھ ہی ایک درخواست بھی ہے۔''

سلطان نے کہا۔ ''کیسی درخواست؟ پیش کر۔''

استاد ارسلان نے جواب دیا۔ ''نادان اور ناکام زکریا کو میرے حوالے کردیا جائے۔''

سلطان کے چہرے کا رنگ بدل گیا اور استاد ارسلان کو ایسا لگا کہ گویا سلطان اس درخواست کے جواب میں غم و غصے کا اظہار کرے گا۔ سلطان تیز تیز قدموں سے چہل قدمی کرنے لگا۔ وہ استاد ارسلان کی طرف دیکھے بغیر بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ آخر کچھ دیر بعد استاد ارسلان کے قریب پہنچ کر اس کا بایاں شانہ پکڑلیا۔ پوچھا۔ ''زکریا سے تیرا رشتہ؟''

ارسلان نے کانپتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ ''وہ میرا شاگرد ہے سلطان معظم!''

سلطان نے اس کے شانے کو پرجوش انداز میں جھٹکا دیا۔ ''لیکن وہ میرا معتوب ہے!'' پھر اچانک شانہ چھوڑ دیا اور دوبارہ بے چینی سے ٹہلنے لگا۔

استاد ارسلان نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا۔ ''حضور والا! وہ ناکام اور نامراد جو کچھ بھی ہے حضور کا جاں نثار اور وفادار بھی تو ہے۔ حضور اس کو بساط شطرنج کے پیادے جتنی حیثیت بھی دینے کو تیار نہیں جبکہ میں اسے اس بچے کی طرح سمجھنے پر مجبور ہوں جو سلطان کی گود میں چاند کے لیے ہمک رہا ہو۔''

سلطان نے چڑ کر حکم دیا۔ ''زیادہ حد ادب۔ میری نظروں سے اس وقت تک دور رہ جب تک میں خود طلب نہ کروں!''

استاد ارسلان فوراً ہی سامنے سے ہٹ گیا۔ وہ دوسرے صحن سے نکل کر ینی چری کی اقامتی درس گاہ والے وسیع و عریض حصے میں داخل ہوگیا۔ بے سروسامان، بدحواس، پریشان، فکر اور اندیشوں میں چور مضطرب اور بے چین، یہاں اس کے سابق ساتھی موجود تھے اور یہ خبر آناً فاناً پھیل گئی۔ سلطان کے سہ رکنی وزراء کا ایک رکن وزیر اور اقامتی درس گاہ کا سابقہ استاد ارسلان بے حال پریشاں اور بشکل معتوب اور مغضوب ان میں واپس آگیا ہے۔

استاد ارسلان اپنے سابقہ کمرے میں واپس چلا گیا جسے اس کی عدم موجودگی میں مقفل کردیا گیا تھا۔ کمروں کے منتظم نے اسے کھلوادیا اور استاد ارسلان کو اس وقت تک کمرے کے باہر ہی کھڑا رہنا پڑا جب تک کہ اس کی اچھی

طرح صفائی نہیں کرادی گئی۔ جب وہ کمرے میں داخل ہوا تو اس وقت بھی گرد کے غیر مرئی ذرے وہاں موجود تھے اور انہوں نے استاد ارسلان کے نتھنوں میں گھس کے ایک ہنگامہ برپا کردیا۔ چھینکوں نے اسے بدحال کردیا۔ چہرہ دھواں دھواں ہوگیا اور ناک سرخ ہوگئی۔ جب طبیعت ذرا قابو میں آئی تو وہ اپنے چوبی صندوق کے پاس جا کھڑا ہوا۔ کمروں کا منتظم اس کے پیچھے کھڑا تھا۔ وہ استاد ارسلان کا مطلب سمجھ گیا اور چوبی صندوق کے تالے کی کنجی اس کے حوالے کردی۔ ارسلان نے کنجی لے کر اس کو باہر چلے جانے کی اجازت دے دی۔

استاد ارسلان نے صندوق کھولا تو اس میں موجود کتابوں اور کاغذات نے اسے اپنا ماضی یاددلادیا۔ ان میں ایک ایسی کتاب بھی تھی جس میں استاد ارسلان نے اپنی یادداشتیں اور مشاہیر کے اقوال لکھ رکھے تھے۔ وہ اپنی یادداشتوں کی سرسری ورق گردانی کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد ہی اسے اپنے کمرے میں دوسروں کی موجودگی کا احساس ہونے لگا۔ اس کے پیچھے تجربہ کار اور بہادر ینی چری کھڑے ہوئے تھے اور ان سب کے چہروں پر سوالات تھے۔ استاد ارسلان نے اپنی یادداشت کی کتاب صندوق میں رکھ دی اور آنے والوں کو مسکراتے ہوئے خوش آمدید کہا۔ ایک خرانٹ سردار نے پوچھا۔ ''استاد ارسلان! خیریت تو ہے' آپ یہاں کیسے؟ آپ کی وزارت کو کیا ہوا؟''

کسی دوسرے نے طنزاً کہا۔ ''صاحبان! ہوسکتا ہے ہم میں کوئی چغل خور بھی موجود ہو مگر میں بات صاف کروں گا۔ شاہوں کے نزدیک ردائے وزارت اور پردۂ بکارت بالکل معمولی چیزیں ہوتی ہیں۔ الحذر صحبت سلطاں سے سوبار الحذر۔''

استاد ارسلان نے مایوسی سے کہا۔ ''تم میں میری اس بات کے گواہ بھی موجود ہوں گے کہ میں نے منصب وزارت بخوشی نہیں قبول کیا تھا۔''

ایک نے ہنس کر جواب دیا۔ ''استاد ارسلان! اس میں کسی اور کی گواہی کی کوئی ضرورت نہیں، آپ کے پاؤں کے دونوں تلوے شاید اب بھی گواہی دے دیں گے۔ ان میں ضربات کے نشان تو اب بھی موجود ہیں۔''

وہ سب بڑی دیر تک استاد ارسلان سے اس طرح باتیں کرتے رہے گویا رسم تعزیت ادا کررہے ہوں۔

استاد ارسلان کئی دن تک بہت پریشان رہا۔ سلطان نے پھر اس کی خبر ہی نہ لی۔ پانچویں دن ینی چری کے چند عمر رسیدہ افراد استاد ارسلان سے ملے اور سرگوشی میں اس کو بتایا کہ ہم میں بہتوں نے یہ فیصلہ کرلیا ہے کہ سلطان کے جابرانہ طرزِ عمل کے خلاف ایک عملی احتجاجی قدم اٹھایا جائے۔

استاد ارسلان نے پوچھا۔ ''بھلا وہ کس طرح؟''

اس شخص نے جواب دیا۔ ''ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ رات کو شعلوں کی روشنی میں چنار کے گھنیرے درخت کے نیچے مل بیٹھ کر کوئی فیصلہ کریں۔ اس میں آپ کی موجودگی بھی ضروری ہے۔''

استاد ارسلان نے کہا۔ ''بھائی! جیسا کہ تم سب جانتے ہو کہ میں سلطان کا معتوب اور مغضوب ہوں۔ میں اپنی زندگی کے دن گن گن کر گزار رہا ہوں۔ آپ لوگ جو فیصلہ بھی کریں، اس سے مجھے مطلع کردیں، میں اس کا پابند ہوں گا۔''

خرانٹ ینی چری نے کہا۔ ''نہیں جی، اس سے کام نہیں چلے گا استاد ارسلان۔ اس میں آپ کی موجودگی بہت ضروری ہے۔''

استاد ارسلان نے پوچھا۔ ''اور یہ ہے کب؟''

جواب دیا گیا۔ ''پرسوں رات کو۔''

استاد ارسلان نے کسی قدر تامل سے کہا۔ ''اچھا، میں شامل ہوجاؤں گا۔''

موجود ینی چری کے افراد کے چہروں پر خوشی کی لہر سی دوڑ گئی۔ اب ان میں اتنی جرأت آچکی تھی کہ وہ کھلم کھلا سلطان کی مذمت کرنے لگے۔ وہ صاف صاف کہہ رہے تھے۔ ''جنگیں تو فوجیں جیتتی ہیں اور ملک تو سپاہی فتح کرتے ہیں مگر نام سلطان کا ہوجاتا ہے۔ یہ کیسی اندھیر نگری ہے؟''

خرانٹ فوجی نے اکڑ کر کہا۔ ''اب حساب کتاب کا وقت آچکا ہے۔ ہم سب سلطان کو عین میدان جنگ میں چھوڑ کر واپس چلے جائیں گے اور بہ آوازِ بلند یہ کہتے جائیں گے کہ ملک تو سلطان فتح کیا کرتے ہیں، ہمارا یہاں کیا کام۔''

استاد ارسلان ان کی باتوں سے بہت پریشان ہورہا تھا کیونکہ وہ خوب جانتا تھا کہ یہ ساری خبریں سلطان تک ضرور پہنچ جائیں گی۔ اس نے ینی چریوں کو سمجھایا۔ ''دوستو! ایسی باتیں قبل از وقت مت کرو جن پر بعد میں عمل تک نہ کرسکو۔''

ایک نے غصے میں کہا۔ ''تھڑدلے اور متذبذب لوگوں سے خدا بچائے۔ اگر استاد ارسلان ڈرتے ہیں تو ان کا ہم سے دور رہنا ہی بہتر رہے گا۔''

استاد ارسلان نے بمشکل تمام ینی چریوں کو اپنے

کمرے سے نکالا۔ کئی دن بعد رات کو اس کے دروازے پر انسانوں کی بھنبھناہٹ سی محسوس ہوئی۔ استاد ارسلان نے باہر نکل کر ان انسانوں کو دیکھا۔ یہ ینی چری کے تجربہ کار اور با اثر لوگ تھے اور استاد ارسلان کو اس مخصوص جلسے میں لے جانا چاہتے تھے جو چنار کے نیچے منعقد ہوا تھا۔ ینی چریوں کے خدمت گار اپنے ہاتھوں میں مشعلیں لیے دائیں بائیں کھڑے تھے۔ ایک عمر رسیدہ ینی چری آگے بڑھا اور ارسلان سے کہا۔ ''جناب! لوگ اکٹھا ہو چکے ہیں آپ کا انتظار ہو رہا ہے۔''

استاد ارسلان نے ذرا سا تامل اختیار کیا۔ اس کے بعد ان کے ساتھ ہولیا۔ اس نے دیکھا ینی چریوں نے جگہ جگہ دیگیں الٹ دی تھیں جو اس بات کی علامت تھی کہ ینی چری باغی ہو چکے ہیں اور اب وہ سلطان کا حکم نہیں مانیں گے۔

بوڑھے چنار کے نیچے ینی چری کے لوگ جمع تھے اور مشعلوں کی روشنی میں ان کی بے چینی اور اضطراری کیفیت کو محسوس کیا جا سکتا تھا۔ استاد ارسلان ان میں داخل ہوا تو اس کی بڑی آؤ بھگت ہوئی اور کسی تمہید کے بغیر سلطان کے خلاف باتیں ہونے لگیں۔ وہ کہہ رہے تھے کہ اب وہ کئی سال آرام کرنا چاہتے ہیں اور کسی نئی مہم پر ہرگز نہ جائیں گے۔

استاد ارسلان نے کہا۔ ''کیا یہ بہتر نہ تھا کہ ہم جو کچھ چاہتے ہیں، پہلے سلطان سے اس کا مطالبہ کرتے اور جب اسے مسترد کر دیا جاتا تو دیگیں الٹ کر بغاوت کا اعلان کر دیا جاتا۔''

خرانٹ فوجی نے جواب دیا۔ ''کیا ہم سلطان کی سخت گیری سے واقف نہیں ہیں؟ وہ اپنی بات منوانا تو جانتا ہے، کسی کی ماننا جانتا ہی نہیں۔''

کسی دوسرے نے کہا۔ ''سلطان مطالبہ پیش کرنے والے کو فوراً ہی قتل کرا دیتا۔''

کسی اور نے کہا۔ ''کیا آزمائے کو آزمانا جہالت میں داخل نہیں ہے؟''

استاد ارسلان نے ان سب کے جواب میں کہا۔ ''میں ایک بار پھر یہی مشورہ دوں گا کہ تم لوگ انتہا پسندی سے کام نہ لو۔ تمہارا ہر مطالبہ میں خود سلطان کی خدمت میں پیش کرنے کو تیار ہوں۔ اگر میں مارا جاؤں تو تمہیں اختیار ہوگا کہ جو چاہو کرو۔''

استاد ارسلان کی پیش کش نے سبھی کو حیرت زدہ کر دیا۔

کسی نے سب کو مشورہ دیا۔ ''اگر یہ بات ہے تو ہمیں استاد ارسلان کی بات مان لینا چاہیے اور اب یہ سوچ لو کہ ہمارے مطالبات کیا ہونا چاہئیں۔''

اس کے بعد ہر کوئی کچھ نہ کچھ کہنے لگا اور کسی مصروف ترین بازار کی طرح بے معنی آوازوں سے چنار کے آس پاس کی فضا گونج اٹھی۔ آخر کچھ دیر بعد استاد ارسلان کی خدمت میں چند مطالبے رکھ دیے گئے۔

''دو سال تک مہم جوئی سے پرہیز۔ انعام و اکرام میں اضافہ، سلطان اپنی زیادتیوں پر شرمندگی اور معذرت کا اظہار کرے۔ جو ینی چری کسی بھی وجہ سے گرفتار ہیں انہیں رہا کر دیا جائے۔''

استاد ارسلان نے انہیں یقین دلایا۔ ''کل تک یہ مطالبات سلطان کے گوش گزار کر دیے جائیں گے اور اس کے نتیجے سے تمہیں مطلع کر دیا جائے گا۔ اگر میں قتل کر دیا جاؤں تو تمہیں اختیار ہوگا کہ جو چاہو کرو۔''

ہجوم کا سارا جوش و خروش بہت جلد ختم ہو گیا۔ ہجوم نے استاد ارسلان کی حمایت میں نعرے لگانے شروع کر دیے۔

رات گئے جب وہ اپنے کمرے میں داخل ہوا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہاں زکریا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ ارسلان کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ اس نے حیرت سے پوچھا۔ ''زکریا...... کیا تو اس وقت میرے سامنے سچ مچ موجود ہے یا میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔''

زکریا نے جواب دیا۔ ''استاد محترم! آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ آپ کوئی خواب نہیں دیکھ رہے ہیں۔ آپ اپنے ہوش میں مجھے اپنے روبرو کھڑا دیکھ رہے ہیں۔''

استاد نے حیرت سے سوال کیا۔ ''لیکن تو اس وقت میرے پاس آ کس طرح گیا؟ تو، تو سلطان کا قیدی تھا۔''

زکریا نے جواب دیا۔ ''ہاں، میں واقعی سلطان کا قیدی تھا مگر سلطان نے معلوم نہیں کیوں مجھے رہا کر دیا اور یہ حکم دیا ہے کہ میں آپ کے ساتھ شام کی سرحد میں داخل ہو جاؤں کیونکہ وہاں سے یہ خبریں آ رہی ہیں کہ شاہ نے مصر کے مملوک فرماں روا کو اپنا حلیف بنا لیا ہے۔''

استاد ارسلان نے جواب دیا۔ ''لیکن وہاں تو سنان پاشا پہلے ہی سے موجود ہیں۔''

زکریا نے کہا۔ ''آپ سلطان سے ملاقات فرمالیں، وہ آپ کو یاد فرما رہے ہیں۔''

استاد ارسلان کھٹکا کیونکہ اس نے باغی اور سرکش ینی چری مجلس میں شامل ہو کر سنگین غلطی کی تھی۔ اس نے زکریا سے رازداری سے پوچھا۔ ''جب سلطان نے تجھے میرے پاس روانہ کیا تو اس کی مزاجی کیفیت کیسی تھی؟''

زکریا نے جواب دیا۔ ''وہ بہت ناراض تھا۔ وہ کہتا تھا کہ میں مصر کے سلطان فرماں روا سے الجھنا تو نہیں چاہتا لیکن اگر وہ مجھے جنگ وجدل کی دعوت دے گا تو میں جارحانہ پیش قدمی کے لیے تیار ہوں۔''

استاد ارسلان نے بے چینی سے پوچھا۔ ''ہماری بابت بھی سلطان نے کچھ کہا؟''

زکریا نے جواب دیا۔ ''ہاں، وہ کہتا تھا کہ اگر کسی باغ کے چند درختوں کو کیڑے لگ جائیں تو انہیں جلد از جلد اکھاڑ پھینکنا چاہیے تاکہ ان کی بیماری سے دوسرے درخت محفوظ رہیں۔''

استاد ارسلان کو اپنی موت سامنے نظر آرہی تھی۔ اس کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ آہستہ سے پوچھا۔ ''کیا سلطان تیرے ساتھ مجھے بھی شام کی حدود میں بھیجنا چاہتا ہے؟''

زکریا نے جواب دیا۔ ''ہاں، سلطان نے کہا تو یہی ہے۔''

استاد ارسلان زکریا پر برس پڑا۔ ''زکریا! اگر ہم پر کوئی مصیبت نازل ہوئی اور سلطان نے مجھے قتل کروا دیا تو اس خون ناحق کا وبال تیری گردن پر ہوگا۔ کبھی میں بھی جوان ہوا تھا لیکن میں نے تو جنون یا وحشت کا کبھی بھی مظاہرہ نہیں کیا۔ میں نے تیری طرف داری کر کے اپنی زندگی کی بدترین غلطی کی ہے۔ کیا تو جانتا ہے کہ سلطان نے باغ کے کرم خوردہ درختوں کی مثال دے کر کیا بات کہی ہے؟''

زکریا نے نفی میں گردن ہلا کر جواب دیا۔ ''نہیں، مجھے نہیں معلوم۔''

استاد ارسلان نے کہا۔ ''باغ سے سلطان کی مراد ہے اپنی فوج ینی چری اور کرم خوردہ درختوں کا مطلب ہے سرکش اور باغی عناصر۔ شاید وہ مجھے بھی باغی ہی سمجھتا ہے۔''

زکریا نے کہا۔ ''استاد محترم! میں تو تقدیر کا قائل ہوں۔ اگر ہمارا قتل سلطان کے حکم پر منحصر ہے تو یہ ضرور ہوگا ورنہ ہم زندہ رہیں گے اور ہمیں سلطان کی سنگ دلی کوئی نقصان نہ پہنچا سکے گی۔''

استاد ارسلان کی پوری رات خوف اور تشویش میں گزر گئی۔ اس نے رات کو کئی بار اٹھ اٹھ کر تاروں سے اٹے آسمان کی طرف دیکھا۔ روشن مدھم، ٹمٹماتے، کرنیں بکھیرتے، سفید، زردی مائل، نیلے اور سرخ تاروں کو وہ حسرت بھری نظروں سے یوں دیکھتا رہا، گویا وہ انہیں آخری بار دیکھ رہا تھا اور انہیں دوبارہ دیکھنا نصیب نہ ہوگا۔ اس نے اپنے کمرے کی ایک ایک چیز کو الوداعی نظروں سے دیکھا۔ اس نے چوبی صندوق کو کھولا اور اپنی یادداشتوں کی کتاب پڑھنے لگا اور آخری خالی جگہ پر لکھ دیا۔

''ہر چیز اپنی اصل کی طرف جاتی ہے۔ میں جو ایک قطرہ ہوں، عنقریب عدم کے سمندر میں گم ہو جاؤں گا۔''

صبح تک وہ مرنے کے لیے تیار ہو چکا تھا۔ اس نے زکریا کو ساتھ لیا اور دوسرے صحن کی طرف چل پڑا۔ باغی ینی چری کے سرکردہ لوگوں نے اس کے چہرے کی طمانیت اور استقلال سے اس کی بہادری کا اندازہ لگا لیا اور دل وجان سے اس کی ہمت اور عظمت کے قائل ہو گئے۔ دوسرے صحن میں داخل ہوتے ہی استاد ارسلان اور زکریا کو حراست میں لے لیا گیا اور دونوں کو قیدیوں کی طرح سلطان کی خدمت میں پیش کر دیا گیا۔ سلطان کی مزاجی کیفیت اعتدال پر نہیں تھی۔ اس نے ان دونوں پر ایک سرسری سی نظر ڈالی اور کہنے لگا۔ ''کیا یہ کوئی اچھی بات ہے کہ میں اپنے ہی بھائیوں کو نیست ونابود کر دوں۔ میری خواہش تو یہی تھی کہ میں مغرب کے مسیحی ملکوں کو مسخر کروں مگر میرے اپنے بھائی مجھے خواہ مخواہ اپنی طرف رجوع کر رہے ہیں۔''

استاد ارسلان نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ ''سلطان معظم میری بابت کیا فرماتے ہیں؟''

سلطان نے طنزاً کہا۔ ''ملک فوجیں فتح کرتی ہیں۔ جنگیں سپاہی جیتتے ہیں۔ میری اپنی کوئی حیثیت نہیں، میں کچھ بھی نہیں لیکن میں اس غلط فہمی کو بہت جلد دور کر دینا چاہتا ہوں۔'' پھر اچانک پوچھا۔ ''دیکھیں الٹنے والوں کے نام بتا اور وہ کون لوگ ہیں جو مطالبوں کا سودا لیے پھرتے ہیں۔''

استاد ارسلان نے جواب دیا۔ ''حضور والا! میں نے بڑی کوشش کی کہ وہ اپنی حدود میں رہیں لیکن جب شامتیں کسی کا مقدر بن چکی ہوں تو نصیحتیں بے کار ہو جاتی ہیں۔''

سلطان نے بے نیازی سے کہا۔ ''اب تو ان میں واپس نہیں جائے گا۔ مجھے سنان پاشا نے لکھا ہے کہ شاہ صفوی مصر کے مملوک سلطان سے دوستی کی پینگیں بڑھا رہا ہے۔ اب تو زکریا کے ساتھ حلب روانہ ہو جائے گا۔'' پھر اپنی جیب سے ایک کاغذ نکال کر استاد ارسلان کی طرف بڑھا دیا اور پوچھا۔ ''دیکھ، کیا یہ نام درست ہیں؟ ان میں تیرا نام بھی شامل ہے مگر کسی اور طرح سے۔''

استاد ارسلان فہرست کے ایک ایک نام پر چونک رہا تھا۔ یہ ان لوگوں کی فہرست تھی جو سرکش تھے۔ یہ بڑی مکمل اور جامع فہرست تھی۔ استاد ارسلان کو حیرت تھی کہ یہ فہرست سلطان تک کس طرح پہنچ گئی۔ اس میں استاد ارسلان کا اپنا نام بھی موجود تھا لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی لکھا تھا کہ استاد

ارسلان بغاوت کے خلاف ہے۔ اس لیے وہ پر جوش ارکان کو روکنے کی کوشش کرتا رہا اور بالآخر اس نے وعدہ کیا کہ وہ ان کے مطالبوں کو لے کر سلطان سے ملاقات کرے گا اور منوانے کی کوشش کرے گا۔

سلطان نے پوچھا۔ ''تصدیق کر کہ اس فہرست کے نام درست ہیں یا ان میں اب بھی کچھ نام شامل کیے جاسکتے ہیں؟''

استاد ارسلان نے ڈرے سہمے لہجے میں تصدیق کی۔ ''سلطان معظم! یہ سارے ہی نام درست ہیں۔''

سلطان نے کہا۔ ''میں نے اس میں تیرا نام بھی تلاش کیا تھا مگر تو بہت چالاک ہے۔''

استاد ارسلان نے جواب میں کہا۔ ''زندگی کس کو عزیز نہیں ہوتی، میں تو حضور والا کا نمک خوار ہوں۔''

سلطان بے چینی سے ٹہلتا رہا۔ اس کا کرب کسی خطرناک اقدام کی نشاندہی کر رہا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ اچانک رک گیا اور تالیاں بجا کر غلام کو حکم دیا۔ ''قلم دوات اور کاغذ لایا جائے۔''

حکم کی اسی وقت تعمیل ہوئی۔ سلطان نے یہ چیزیں استاد ارسلان کے حوالے کردیں اور اسے حکم دیا۔ ''اس فہرست میں جتنے بھی سرکشوں کے نام ہیں تو ان سب کے نام ایک مکتوب جاری کر، انہیں یہ خوش خبری سنادے کہ سلطان نے ذرا سی ترمیم کے ساتھ ان کے مطالبات مان لیے ہیں لیکن جہاں تک انعام و اکرام کا تعلق ہے، اس سے جملہ ینی چری کو نہیں نوازا جاسکتا۔ یہ چند سرکردہ و برآوردہ سرداروں ہی کو دیا جاسکتا ہے چنانچہ اس فہرست میں جتنے افراد بھی شامل ہیں، انہیں انعام و اکرام سے نواز دیا جائے گا۔ وہ آئیں اور اپنا انعام و اکرام لے کر واپس چلے جائیں۔ ساتھ ہی انہیں یہ بھی لکھ دے کہ اس سلطانی نوازش کا دوسروں کو علم نہیں ہونا چاہیے۔''

استاد ارسلان کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ اس کو یہ اعزاز حاصل ہو رہا تھا کہ اس نے اپنے بھائیوں کے مطالبات سلطان سے منوا لیے تھے۔ اس نے اسی وقت ینی چری کے باغی اور سرپھرے افراد کے نام ایک خط لکھ دیا اور انعام و اکرام کے لیے انہیں بلالیا۔

دوسرے دن ایک گھڑی دن چڑھے فہرست کے جملہ ینی چری سردار انعام و اکرام کی توقع میں دوسرے صحن میں داخل ہوگئے۔ دوسرے صحن کے محافظوں اور دربانوں نے وہاں کے دستور کے مطابق ان کے ہتھیار رکھوالیے اور انہیں سلطان کی بارگاہ میں روانہ کردیا۔ اس وقت سلطان گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ سلطان نے استاد ارسلان کو اپنے کمرے ہی میں چھپادیا تھا۔ زکریا بھی ان کے پاس ہی موجود تھا۔

سلطانی خدمت گار نے اعلان کیا۔ ''ینی چری کے معزز سردار حاضر ہیں اور سلطانی نوازشات کے طلبگار ہیں۔''

سلطان ایک دم ان کی طرف مڑ گیا اور سرکش ینی چری کے سرداروں سے پوچھا۔ ''جنگیں کون جیتتا ہے؟''

خرانٹ ینی چری نے دلیری سے جواب دیا۔ ''فوجیں!''

سلطان نے پھر سوال کیا۔ ''اور ملک کون فتح کرتا ہے؟''

اس شخص نے جواب دیا۔ ''سپاہی!''

سلطان نے غصے میں کہا۔ ''اور سلطان کیا کرتا ہے؟''

اسی شخص نے جواب دیا۔ ''احکامات نافذ کرتا ہے، انعام و اکرام دیتا ہے۔''

سلطان نے دوسرے سرداروں سے پوچھا۔ ''تم سب گواہی دو کہ یہ سچا ہے یا جھوٹا؟''

اس میں چند نے جواب دیا۔ ''یہ سچا ہے۔''

لیکن چالاک اور موقع شناس بولے۔ ''ملک سلطان معظم فتح فرماتے ہیں اور جنگیں حضور والا جیتتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی نوازشات و عنایات بھی حضور ہی صادر فرماتے ہیں۔''

سلطان چیختا ہوا کھڑا ہوگیا۔ ''شریرو مغرور! تم سب ہم خیال ہو۔ تم سب ہم عقیدہ ہو۔ تمہارے نمائندے نے بس ایک بات صحیح کہی ہے وہ یہ کہ میں احکامات نافذ کرتا ہوں اور میں نے تمہاری قسمتوں کا فیصلہ تمہارے آنے سے پہلے ہی کردیا تھا۔''

اس کے بعد سلطان نے تالی بجائی۔ تالی کی آواز کے ساتھ ہی برہنہ شمشیر برداروں کی ایک مختصر سی جمعیت نمودار ہوئی اور سلطان کے ابروؤں کی ہلکی سی جنبش پر ینی چری سرداروں کے سر قلم کردیے گئے۔

اب سلطان نے استاد ارسلان اور نوکر کو طلب کیا۔ سر بریدہ لاشوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ وہ لوگ ہیں جو جنگیں جیتا کرتے تھے اور ملک فتح کیا کرتے تھے مگر احکامات نافذ کرنا نہیں جانتے تھے۔ چنانچہ جو حکم دینا جانتا تھا، اس نے حکم دیا اور ان کے سر قلم کردیے گئے۔'' پھر ایک ادائے خاص اور انداز بے نیازی سے کہا۔ ''حالانکہ یہ کہہ سکتے تھے کہ ہم جنگیں جیتتے ہیں۔ ہم ملک فتح کرتے ہیں مگر سلطان کے حکم سے، سلطان کی تدابیر اور قوت ارادی سے۔''

استاد ارسلان اور زکریا کی تھرتھری چھوٹی ہوئی تھی۔ سلطان نے ان کی ڈھارس بندھائی، بولا۔ ”میں جنھیں وفادار اور جاں نثار سمجھتا ہوں، انھیں اپنی ریڑھ کی ہڈی سمجھتا ہوں۔ میرے وفاداروں کو مجھ سے خوفزدہ نہیں ہونا چاہیے۔“

استاد ارسلان اور زکریا دعائیں مانگ رہے تھے کہ سلطان انھیں جانے کی اجازت دے دے۔ سلطان نے انھیں جانے کی اجازت دے دی۔ مگر اس حکم کے ساتھ۔ ”تم دونوں کل ہی حلب روانہ ہو جاؤ، تاجروں کے روپ میں یا سیاح بن کے۔ آخر ابن بطوطہ اور محمد ابن جبیر بھی سیاح ہی تھے۔ تم دونوں سیاح بنو گے تو تمہیں ہر جگہ پہنچنے میں آسانی ہو جائے گی۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ شاہ صفوی مصر کے مملوک فرماں روا سے ساز باز کر کے میرے خلاف جنگ وجدل پر اکسا رہا ہے۔ شاید ان دنوں وہ حلب میں مقیم ہے اور میرے خلاف جنگی تیاریوں میں مشغول ہے۔ تم دونوں اس سے ملو اور اس کو سمجھاؤ کہ سلطان سلیم اور سلطان مصر میں عقائد کا بھی اختلاف نہیں پھر یہ جنگ کیوں ہو؟ اور اگر وہ نہ مانے تو حلب کے پاس ہی موجود سنان پاشا کو اس کے ارادوں سے مطلع کر دو میں مملوک سلطان کا علاج کر دوں گا۔“

استاد ارسلان نے سر تسلیم خم کر دیا اور زکریا کے ساتھ وہاں سے چلا آیا۔

سلطان نے باغی ینی چری سرداروں کے ساتھ جو سلوک کیا تھا اس کی تشہیر کر دی گئی اور ان کے سر..... ینی چری میں تحفتاً بھیج دیے گئے اور اس کے ساتھ ہی سلطان نے انھیں حکم دیا کہ وہ سب کوچ کی تیاری کریں۔ انھیں فوراً ہی دیار بکر کی طرف کوچ کرنا ہے۔ اس کے حکم کی تعمیل بڑی سرعت سے ہوئی اور ہر شخص کوچ کی تیاریوں میں مشغول ہو گیا۔

☆☆☆

استاد ارسلان اور زکریا سیاح کے بھیس میں شب و روز کوچ کرتے ہوئے پہلے تو سیواس پہنچے۔ اس کے بعد ایران میں داخل ہو گئے۔ کچھ دن تبریز میں رہے پھر موصل کے قریب حران چلے گئے۔ حران سے حلب زیادہ دور نہیں تھا۔ حران میں بڑی گرمی پڑ رہی تھی اور یہی وہ جگہ تھی جہاں بنو امیہ کا آخری خلیفہ حران بن محمد بن مروان، جس کو مروان الحمار بھی کہتے ہیں، آل عباسؓ سے آخری جنگ ہارا تھا اور یہی وہ جگہ تھی جہاں بنو عباس کو بنو امیہ پر فیصلہ کن تفوق حاصل ہو گیا تھا۔

حران ہی وہ جگہ ہے جہاں سے تقریباً نو میل دور حضرت ابراہیمؑ اور ان کی بیوی سارہؓ کے رہنے اور عبادت کرنے کی جگہ کو بطور یادگار محفوظ کر دیا گیا ہے۔ یہ مکان ایک نہر کے کنارے واقع ہے۔ استاد ارسلان اور زکریا نے حران کی ایک سرائے میں قیام کیا۔ جمعے کی نماز جامع حران میں پڑھی اور یہیں اپنے آپ کو ایک سیاح کی حیثیت سے متعارف کرایا۔ زکریا اس کا بیٹا بن گیا۔ شہریوں نے ان دونوں کی بڑی آؤ بھگت کی۔ کیونکہ انھیں معلوم تھا کہ یہ سیاح اپنے سفرنامے میں جس جس کا بھی ذکر کرے گا وہ تاریخ کا ایک جزو بن جائے گا اور جب تک وہ سفرنامہ رہے گا، ان کا ذکر بھی باقی رہے گا۔ شام کو مغرب سے پہلے ہی وہاں کے امراء اور قاضیوں کے آدمی استاد ارسلان کے پاس پہنچ گئے اور انھیں اپنا مہمان بنانے کی کوشش کی۔ استاد ارسلان نے ان سب کا شکریہ ادا کیا اور کہا۔ ”افسوس کہ اگر میں نے کسی ایک کی مہمان نوازی کو قبول کر لیا تو دوسروں کو دکھ پہنچے گا۔ اس لیے مجھ کو یہیں سرائے میں ہی رہنے دیا جائے۔“

لیکن حنفی عقائد کا قاضی، استاد ارسلان کی خدمت میں خود حاضر ہوا اور ان دونوں کو زبردستی اپنے گھر لے گیا۔ قاضی نے ان دونوں کو بہت آرام پہنچایا اور بڑی فراخ دلی

سے کہہ دیا کہ ارسلان اپنے بیٹے زکریا کے ساتھ جب تک چاہے اس کا مہمان رہے۔ اسے شرفِ میزبانی سے بڑی خوشی ہوگی۔

لیکن استاد ارسلان کا تو مقصد ہی کچھ اور تھا۔ وہ حلب میں داخل ہونے سے پہلے بحیثیت سیاح اتنی شہرت ضرور حاصل کر لینا چاہتا تھا کہ حلب میں موجود مملوک سلطان کی خدمت میں جب پہنچے تو اسے کسی تعارف یا سفارش کی ضرورت نہ پیش آئے۔

وہ حنفی قاضی کے ساتھ حران کے چوبی مسقف بازاروں میں گھومتا پھرتا رہا۔ گھومنے پھرنے کے دوران جس جس کو اس کا علم ہوا کہ ایک سیاح اپنے بیٹے کے ساتھ حران آیا ہوا ہے، وہی ان دونوں کی زیارت کرنے حاضر ہو جاتا۔ وہ دو تین دن تو خوب گھوما پھرا۔ اگر ان کے ساتھ قاضی بہ نفسِ نفیس خود نہ ہوتا تو ان دونوں کو دو گھوڑے اور ایک خدمت گار فراہم کر دیے جاتے۔ دونوں اس خدمت گار کے ساتھ ادھر ادھر گھومتے پھرتے رہے۔ یہاں انہیں وہ نوجوان اور خوبصورت خواتین بھی ملیں جو اس سیاح کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے بے چین تھیں۔ زکریا نے اپنے لیے یہ عزت و احترام جو دیکھا تو اتنا خوش ہوا کہ استاد ارسلان سے اپنی اس خواہش کا اظہار کر دیا کہ ''استادِ محترم! میرا خیال ہے کہ اب سلطان کے پاس واپس جانے کے بجائے سیاحی کو اپنا مشغلہ اور مطمحِ نظر بنا لیا جائے۔ اس میں بڑی عزت ہے اور ہر انسان عزت ہی کے لیے سب کچھ کرتا ہے۔''

استاد ارسلان نے زکریا کو ڈانٹ دیا۔ ''چپ، خبردار جو دوبارہ ایسی کوئی بات کی۔ یہ مت بھول کہ ہم دونوں سلطان کے خدمت گزار ہیں۔ اس وقت دنیا کی کوئی جگہ بھی سلطان کی دسترس سے دور نہیں ہے۔''

زکریا چپ ہو گیا۔ اسی شب کھانے کے بعد حنفی قاضی نے سلطان سلیم، شاہ ایران اور مملوک سلطان کا ذکر چھیڑ دیا۔ قاضی نے کہا۔ ''ترکی سلطان کو ہمارے سلطان سے جھگڑا نہیں کرنا چاہیے کیونکہ اس طرح مسلمانوں کی قوت کو نقصان پہنچے گا اور دشمن خوش ہوں گے۔''

استاد ارسلان نے جواب دیا۔ ''جناب والا! میں ان مباحثوں میں حصہ نہیں لے سکتا کیونکہ آج میں یہاں ہوں، کل ترکی میں پہنچ سکتا ہوں۔ میں ملکی اور سیاسی معاملات پر بات نہیں کروں گا۔''

قاضی نے کہا۔ ''جناب سیاح صاحب! میں نے یہ ذکر بطورِ خاص چھیڑا ہے تاکہ آپ جب حلب میں مملوک سلطان قانصوہ سے ملیں تو اس کو یہ سمجھانے کی کوششیں کریں۔''

استاد ارسلان نے جواب دیا۔ ''قاضی صاحب! میں یہ کوشش کر تو سکتا ہوں مگر ڈر بھی لگتا ہے کیونکہ یہ بحث بہت نازک اور خطرناک ہے۔''

قاضی کا اصرار برقرار رہا، بولا۔ ''اسلام کی خاطر اس نازک اور خطرناک بحث کو نظرانداز نہیں کرنا چاہیے۔''

یہ بحث و مباحثہ ..... رات تک جاری رہا۔ اس دوران کئی امراء نے قاضی سے درخواست کی کہ انہیں بھی سیاح ارسلان اور اس کے بیٹے زکریا کی مہمان نوازی کا شرف بخشا جائے۔ آخر حران کے والی کی دعوت قبول کر لی گئی۔ جس دن دعوت تھی اس دن ظہر کی نماز کے بعد جامع حران کے باہر دس گھوڑے تیار کھڑے ملے۔ یہ خالی گھوڑے حران کے والی نے بھیجے تھے۔ ایک سیاح ارسلان کے لیے، دوسرا اس کے بیٹے زکریا کے لیے، تیسرا قاضی کے لیے اور بقیہ سات گھوڑے قاضی کے خدمت گاروں اور مصاحبوں کے لیے۔

جب یہ لوگ گھوڑوں پر سوار والیِ حران کی طرف روانہ ہوئے تو بطورِ خاص زکریا کو بڑی خوشی اور فخر محسوس ہو رہا تھا۔ استاد ارسلان زکریا کے بے پناہ جذبۂ انبساط کو محسوس کر رہا تھا اور اس کو یہ خدشہ لاحق ہو گیا تھا کہ کہیں فرطِ خوشی سے بے قابو ہو کر زکریا کوئی ایسی بات نہ کر بیٹھے جس سے قاضی یا اس کے مصاحبین کھٹک جائیں اور پھر والیِ حران بھی کسی قسم کے شک و شبہے میں مبتلا ہو جائے۔ اس نے زکریا کو مخاطب کیا۔ ''زکریا! تجھے کیسا لگ رہا ہے؟''

زکریا نے جواب دیا۔ ''میں بہت خوش ہوں استادِ محترم!''

لفظ استادِ محترم پر سبھی چوکنا ہو گئے۔ خود ارسلان بھی گھبرا گیا۔ بات بناتے ہوئے کہا۔ ''بیٹے زکریا! بے شک میں ہی تیرا استاد بھی ہوں اور ہمیشہ میری یہ کوشش رہی ہے کہ باپ کی شفقت کے بجائے استاد کی شفقت اور سختی کے امتزاج سے کام لوں مگر یہ نہ بھول کہ میں تیرا باپ ہوں۔''

زکریا کو فوراً ہی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ خوشامدانہ عرض کیا۔ ''پدرِ محترم! میں اپنے طرزِ تخاطب پر شرمندہ ہوں۔''

استاد ارسلان نے کہا۔ ''مجھ سے شرمندہ رہنے کی کوئی ضرورت نہیں بلکہ ہم دونوں کو فرطِ خوشی اور فخر کی فراوانی میں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ ہم کسی کے سامنے جوابدہ ہیں اور ہمیں یہ جو کچھ بھی ملا ہے، اس کی نوازشوں سے ملا ہے۔''

قاضی نے پوچھا۔ ''سیاح ارسلان! یہ کس کا ذکر ہو رہا ہے؟'' ارسلان نے جواب دیا۔

''اس بزرگ و برتر ذات کا، جس نے مجھے سیاح اور زکریا کو میرے بیٹے ہونے کا شرف بخشا ہے۔''

پردوں کے پیچھے خواتین موجود تھیں اور وہ بھی حاضرین مجلس کی باتوں سے لطف اندوز ہو رہی تھیں۔

کھانے کے بعد نبیذ کا دور چلا تو ارسلان نے پینے سے انکار کر دیا۔ قاضی نے حیرت سے پوچھا۔ ''کیوں، نبیذ پینے میں تامل کیوں ہے؟''

ارسلان نے جواب دیا۔ ''میں اُسے حرام سمجھتا ہوں۔''

قاضی نے مذاکرہ کیا۔ ''حالانکہ علمائے عراق اسے جائز قرار دے چکے ہیں۔''

والی حران نے ہنس کر عرض کیا۔ ''جناب والا! اگر آپ نے نبیذ نہ پی تو میں رقص و سرود میں آپ کو کس طرح شامل کروں گا کیونکہ آپ اسے بھی حرام قرار دے دیں گے۔''

ارسلان کا جی تو پہلے ہی چاہ رہا تھا، والی حران اور قاضی کے اصرار پر نہ صرف خود پی بلکہ اس میں زکریا کو بھی شامل کر لیا۔ آخر میں ارسلان زکریا اور قاضی کے سوا سبھی کو رخصت کر دیا گیا اور والی حران نے چند مغنیائیں بلا لیں۔ ان کے سازندے ان کے ساتھ تھے۔ یہ چار گانے والیاں صورت شکل میں بھی بے مثل تھیں۔ والی حران نے ان سے کہا۔ ''خوش نوا مغنیاؤ! یہ سیاح ارسلان ہے۔ میری خواہش اور کوشش ہے کہ یہ اپنے سفرنامے میں کہیں میرا بھی ذکر کر دے۔ اگر تم چاہو تو تم بھی اپنے فن اور کمال کا ایسا شاندار مظاہرہ کرو کہ اس سے متاثر ہو کر یہ تمہارا بھی ذکر کرنے پر مجبور ہو جائے۔''

زکریا کو چاروں مغنیائیں بڑی اچھی لگ رہی تھیں اور جب انہوں نے گانا شروع کیا تو گویا زکریا کہیں کا بھی نہیں رہ گیا۔ اس موقع پر اس کو بس ایک ہی شکایت پیدا ہو رہی تھی۔ وہ یہ کہ ہر کوئی ارسلان کی طرف متوجہ تھا یہاں تک کہ مغنیائیں بھی ارسلان ہی کی طرف راغب تھیں۔

ان میں ایک مغنیہ بہت زیادہ تیز طرار تھی۔ اس کی شوخیاں اور ناز و انداز دلوں میں اتر جانے والے تھے۔ وہ جب کسی کی طرف مسکرا کر دیکھتی تو گویا پوری کائنات اس طرف ہو جاتی۔ اس نے والی حران اور ارسلان کے سامنے ایک تجویز پیش کی۔ ''صاحبان! میں چاہتی ہوں کہ ہم چاروں میں سے ہر ایک باری باری انفرادی طور پر کچھ گائے اور اپنے اپنے کمال کا مظاہرہ کرے تاکہ سیاح موصوف کو ہمارے بارے میں کچھ لکھتے ہوئے دباؤ محسوس ہو۔''

والی حران نے جواب دیا۔ ''بے شک، بے شک۔ میں اس کی تائید کرتا ہوں۔''

قاضی نے کہا۔ ''لیکن سوال تو یہ ہے کہ کیا سیاح ارسلان ان گانے والیوں کے ذکر سے اپنے سفرنامے کو داغ دار بنانا گوارا بھی کرے گا؟''

تیز طرار مغنیہ چڑ گئی۔ بولی۔ ''قبلہ قاضی صاحب! گستاخی معاف۔ کیا ہماری کوئی ادا، کوئی ناز کوئی انداز آپ کے بے حس دل و دماغ پر اثر انداز نہیں ہوتے؟''

قاضی نے جواب دیا۔ ''ہوتے کیوں نہیں، شرمیں بڑی اثر آفرینی ہوتی ہے۔''

مغنیہ نے کہا۔ ''آپ مجھے کتنے عرصے تک یاد رکھنے پر مجبور پائیں گے خود کو؟''

قاضی نے جواب دیا۔ ''مدتوں! شاید زندگی بھر۔''

مغنیہ نے کہا۔ ''اس طرح یہ سیاح بھی یاد رکھ سکتا ہے اور میں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ اس کے سفرنامے میں میرا ذکر ضرور ہوگا، قطعی ہوگا۔''

والی حران نے مغنیاؤں کو حکم دیا کہ وہ وقت نہ ضائع کریں اور باری باری اپنے فن کا مظاہرہ کریں تاکہ ہمارے مہمان سیاح کو ان کے فن کو پرکھنے اور اس کا ذکر کرنے کا موقع مل جائے۔

احتجاجی بینرز

کہتے ہیں عورتیں دو طرح کی ہوتی ہیں، ایک وہ جو منہ کے اندر زبان رکھتی ہیں اور ایک وہ جو زبان کے اندر منہ رکھتی ہیں۔ ویسے ایک بات تمام عورتوں میں مشترک ہے کہ وہ کان نہیں رکھتیں۔

فرائڈ سے کسی نے پوچھا کہ عورت کس قسم کا شوہر چاہتی ہے؟ تو بولا۔

اپنے باپ جیسا چنانچہ لڑکی اپنے ہونے والے شوہر کا وہی حشر کرتی ہے جو اس کی ماں نے اس کے باپ کا کیا ہوتا ہے۔ ویسے بھی کہا جاتا ہے کہ لڑکی کی رخصتی کے وقت میکے والے دھاڑیں مار مار کر اس لیے روتے ہیں کہ انہیں لڑکی کی جدائی کا غم ہوتا ہے حالانکہ لڑکی کی والدہ کی آنکھوں کے سامنے اس کے شوہر کا ماضی اور داماد کا مستقبل ہوتا ہے۔

مرسلہ۔ احسان سحر، میانوالی

یہ انتہائی شاندار مقابلہ تھا۔ ہر مغنیہ نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا تا کہ ارسلان اور زکریا کو اس کے ذکر کا موقع مل جائے۔

ایک رقص کے لیے کھڑی ہوئی مغنیہ نے حزنیہ کلام سنانا شروع کر دیا۔

''انسان کی تمنائیں بے حد وحساب ہیں لیکن ایک تمنا مشترک ہے۔ فنا سے فرار بقا سے ہمکنار ہونے کی تمنا۔

''انسان ابدیت کی تلاش میں ہے، چونکہ یہ خود زندہ نہیں رہ سکتا، اس لیے یہ اپنے نام اور کام کو ابدیت بخشنا چاہتا ہے۔

''یہ فاتح بنتا ہے تا کہ ابد تک فاتحین کی صف میں اپنا نام چھوڑ جائے۔ یہ کتابیں لکھتا ہے تا کہ اپنی کتابوں ہی کے سہارے زندہ رہ جائے۔

''یہ شاعری کرتا ہے تا کہ اپنے اشعار میں زندہ رہے۔

''یہ سنگ تراشی کرتا ہے اور اپنے بنائے ہوئے مجسموں میں خود کو زندہ پائندہ رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔

''لیکن وائے بدنصیبی، ہائے کم نصیبی کہ نامور فاتحین کے کارناموں کی بھی ایک عمر ہوتی ہے۔

''کتابیں اور شاعر کے اشعار زندگی مستعار رکھتی ہیں۔

''مجسمے ٹوٹ جاتے ہیں اور عمارتیں ڈھے جاتی ہیں۔

''یہاں تو بس ایک ہی چیز کو دوام حاصل ہے اور اس کا نام ہے فنا۔''

حاضرین نے مغنیہ کے پرمعنی اشعار کو بہت پسند کیا اور سیاح ارسلان انہیں لکھتا رہا۔ زکریا پر ایک کیفیت سی طاری ہو گئی۔ اس نے ذرا سی دیر کے لیے سوچا کہ وہ بھی کتنا احمق تھا کہ ایک ناہید کو سب کچھ سمجھ لیا تھا، یہاں تو ناہید کے سوا اور بھی موجود ہیں۔

قاضی نے اپنی رائے دی۔ ''میرا خیال ہے سیاح ارسلان اس مغنیہ کا اس کے پرمعنی اشعار کے ساتھ اپنے سفرنامے میں ذکر ضرور کرے گا۔''

والی حران نے کہا۔ ''اے کاش! میں بھی ایسا ہی ہنر مند ہوتا، تا کہ میں بھی سفرنامے میں جگہ پا جاتا۔''

کچھ دیر بعد دوسری اور تیسری مغنیہ نے اپنے فن کا مظاہرہ کیا اور ارسلان نے ان دونوں کے اشعار بھی لکھ لیے۔ آخر میں اس شوخ وشنگ مغنیہ کی باری آ گئی جس نے حاضرین کو سب سے زیادہ متاثر کیا تھا۔

وہ ایک ادائے خاص سے کھڑی ہوئی، آنچل کو منہ پر ڈال لیا۔ آنچل اتنے باریک کپڑے کا تھا کہ اس میں سے مغنیہ کا صبیح اور ملیح چہرہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اور سیاہ زلفوں کے بیچوں بیچ مانگ کی افشاں کہکشاں کی طرح دمک رہی تھی۔ اس نے ارسلان کے بجائے زکریا کو مخاطب کیا۔ ''سیاح کے نوجوان بیٹے! اس وقت میری توجہ کا مرکز تو ہے۔ محض اس لیے کہ ہم دونوں کی عمریں قدرِ مشترک بن گئی ہیں۔''

زکریا کو یوں محسوس ہوا گویا وہ آسمان پر اڑ رہا ہے۔ قاضی جل بھن کر کباب ہو گیا لیکن ارسلان نے اس کا زیادہ اثر نہیں لیا۔ والی حران نے طنز کیا۔ ''چالاک لڑکی! میں تیرا مطلب سمجھ گیا۔ سیاح باپ کے روبرو بیٹے کو مخاطب کر کے تو نے شفقت پدری کو شہرت و ناموری کا سہارا بنانے کی کوشش کی ہے۔''

مغنیہ نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ وہ اس طرح بیٹھ گئی کہ اس کا چہرہ زکریا کے سامنے رہا۔ اس نے سازندوں کو اشارہ کیا۔ کئی ساز ایک ساتھ بج اٹھے اور ان آوازوں میں مغنیہ کی پرسوز و پرکیف آواز شامل ہو گئی۔

''میں نے ایک دیوانے کی باتیں سنیں اور گم صم رہ گئی۔ فرزانے اس پر ہنس رہے تھے اور ہوشمند اس پر پتھر برسا رہے تھے۔ میں نے اس دیوانے کو پناہ دی اور اپنے گھر لے گئی۔ میں نے اس کے زخموں کو دھویا اور ان پر مرہم رکھ کر پٹی باندھ دی۔

''میں نے اس سے کہا۔ یہ فرزانے تجھے کیوں مار رہے تھے؟ وہ ہنس دیا۔ بولا۔ میں نے کچھ سچی باتیں برملا اور سر بازار کہہ دی تھیں۔

''میں نے سرزنش کی اور کہا۔ دیوانے! فرزانوں میں فرزانوں جیسی باتیں کرو ورنہ تیرا ہمیشہ اس کوے جیسا حشر ہو گا جو موروں میں پھنس گیا تھا۔

''دیوانہ ہنسا اور جواب دیا۔ میں دیوانہ تھا لیکن میرے دونوں ہاتھ خالی تھے۔

''وہ فرزانے تھے لیکن ان کے دونوں ہاتھوں میں پتھر تھے۔ اے لڑکی! ازروئے انصاف تو ہی بتا۔ ان میں کون دیوانہ ہے اور کون فرزانہ؟

''میں نے ان سے کہا تھا کہ وہ ہنستے ہیں حالانکہ ہنسنا صریح مغاہمت ہے۔ ہمیں رونا چاہیے اور پھوٹ پھوٹ کر رونا چاہیے۔ جب ہم اس دنیا میں آتے ہیں تو روتے ہیں اور جب اس دنیا سے جاتے ہیں تو دوسرے روتے ہیں۔ ہم فانی انسان دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے ہیں۔

یا تو ہم عقلمند ہیں مگر بے دین ہیں۔

''یا پھر دین دار ہیں مگر بے وقوف۔
''آہ زمانے نے ہمیں شیشہ سمجھ کر ریزہ ریزہ کر ڈالا۔
ہم پھر کبھی شیشہ نہ بن سکیں گے۔''

اس مغنیہ نے تو ایسا سماں باندھا کہ ہر کوئی مدہوش اور بے خود ہو گیا۔ بس قاضی ذرا جز بز ہو رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ''لڑکی! تو نے میرے ساتھ بڑی زیادتی کی۔ تجھ کو مجھ سے معافی مانگنی ہوگی۔''

مغنیہ نے کہا۔ ''کیسی زیادتی؟ کس بات کی معافی؟''

قاضی نے کہا۔ ''تو نے اپنے اشعار میں انسانوں کو دو گروہوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک وہ جو عقلمند ہیں مگر بے دین اور دوسرے وہ جو دین دار ہیں مگر بے وقوف۔ کیا تو نے غور کیا کہ یہ اشعار تجھے سزا کا مستوجب قرار دے سکتے ہیں۔''

مغنیہ نے مسکرا کر جواب دیا۔ ''قبلہ قاضی صاحب! یہ اشعار میرے نہیں ہیں۔ گیارھویں صدی ہجری کے نابینا شاہ ابو العلا مصری کے ہیں۔ آپ تو ماشاء اللہ عالم ہیں۔ آپ کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ اس نے اور کیا کچھ کہا ہے جسے میں نہیں سنا سکتی۔''

قاضی نے کہا۔ ''ابو العلا قنوطی تھا اور وہ مذہبی تشکیک کا شکار تھا۔ تجھے اس ملحد کا کلام نہیں سنانا چاہیے تھا۔''

والی حران نے مداخلت کی۔ ''قاضی صاحب! پہلے اس قنوطی شاہ کی پوری بات تو سن لینے دیجیے۔'' پھر مغنیہ سے کہا۔ ''لڑکی! وہ اشعار بھی سنا دے جنہیں تو مصلحتاً نظر انداز کر گئی تھی۔''

مغنیہ نے قاضی کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''اجازت ہے؟''

قاضی نے کمزور آواز میں جواب دیا۔ ''جو کچھ سنا چکی، اس میں کون سی اجازت لے لی تھی جو اب اجازت مانگ رہی ہے!''

ارسلان نے اشتیاق ظاہر کیا۔ ''لڑکی! اب امتحان نہ لے اور متروک حصہ بھی سنا دے۔''

مغنیہ نے بقیہ بھی سنا دیا۔
''ابن حنیفی کے پیرو لغزشیں کھا رہے ہیں۔
''مسیحی گمراہ ہو چکے ہیں۔ یہودی سرگرداں ہیں......
مجوسی غلط راستے پر جا رہے ہیں۔
''اے شخص! عقل کو راہنما بنا اور وہی کچھ کر جس کی یہ تصدیق کر دے۔
''یقین رکھ کہ عقل ہی بہترین مشیر ہے۔
''توراۃ میں جو قانون درج ہیں انہیں مت قبول کر... کیونکہ تو صاف گوئی کا خواہاں ہے اور یہ چیز وہاں نہیں ملے گی۔''

قاضی غصے میں اٹھ کھڑا ہوا اور والی حران، ارسلان اور مغنیہ کو غیظ و غضب سے مخاطب کیا۔ ''میں سلطان قانصوہ کو تم لوگوں کی آزاد خیالی اور گمراہی کی خبر کر دوں گا۔ کم از کم یہ خرافات میں تو نہیں برداشت کر سکتا۔''

قاضی پاؤں پٹختا ہوا چلا گیا اور حاضرین کو دم بخود کر گیا۔ اس کے ساتھ ہی ارسلان نے بھی اٹھنا اور جانا چاہا لیکن اس کو والی حران نے روک لیا اور کہا۔ ''سیاح ارسلان! ایسی بھی کیا جلدی۔ قاضی کے روٹھنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔''

مغنیہ نے مسکرا کر قاضی پر طنز کیا۔ ''جو لوگ شے لطیف نہیں رکھتے تنگ نظر ہوتے ہیں۔ اگر خدا نے ہمیں ہمارے کسی اچھے عمل کی جزا میں جنت دی اور قاضی یا اس جیسے کسی اور کو ہمارے ساتھ رکھ دیا گیا تو وہاں ہمیشگی کی زندگی جہنم ہی تو بن جائے گی۔''

اس پر سب کو ہنسی آ گئی۔ زکریا اس کی ہر ہر بات پر قربان ہوا جا رہا تھا۔ بس اس کا یہی جی چاہتا تھا کہ مغنیہ بولتی رہے اور وہ سنتا رہے۔ مغنیہ بھی کبھی آزادانہ اور کبھی کن انکھیوں سے زکریا کو دیکھ لیتی تھی لیکن یہ بات صاف ظاہر تھی کہ مغنیہ کی ہر نظر میں ایک لگاوٹ تھی، چاہت تھی، کشش تھی اور زکریا کا اس محفل سے اٹھنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔

کچھ دیر بعد ہی قاضی کے دو خدمت گار آئے اور انہوں نے والی حران سے درخواست کی۔ ''قاضی کے دونوں مہمانوں کو واپس بھیج دیا جائے۔''

والی حران نے ارسلان سے سرگوشی میں کہا۔ ''میں جانتا تھا کہ قاضی کے آدمی آپ دونوں کو بلانے کے لیے ضرور آئیں گے کیونکہ قاضی سب کچھ برداشت کر لے گا مگر آپ دونوں کی شرفِ میزبانی سے دستبردار ہونا نہیں برداشت کرے گا۔''

ارسلان نے کہا۔ ''لیکن اس وقت تو میں آپ کا مہمان ہوں۔ اس لیے آپ کی اجازت کے بغیر نہیں جا سکتا۔''

زکریا نے مغنیہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''قاضی جیسے تنگ نظر اور دل آزار کا مہمان بنا رہنا بھی بے عزتی ہے۔ اگر میرا بس چلے تو میں اس کو شرفِ میزبانی سے محروم

کردوں۔''

والی حران نے بڑی بے بسی سے کہا۔''افسوس کہ میں آپ دونوں کو یہ مشورہ ہرگز نہ دوں گا کہ آپ قاضی کو اس کی میزبانی کے شرف سے محروم کردیں کیونکہ یہ ایک معاشرتی مسئلہ ہے اور میں یا کوئی بھی اس میں دخل دینا پسند نہیں کرے گا۔''

زکریا نے بے چینی سے پوچھا۔''اچھا اگر ہم اس وقت قاضی کے پاس چلے جائیں تو کیا ہمیں یہاں دوبارہ آنے کی اجازت حاصل رہے گی؟''

والی حران نے جواب دیا۔''ہر وقت، جس وقت بھی جی چاہے، آپ دونوں آسکتے ہیں۔''

زکریا نے تکلف اور آداب کو بالائے طاق رکھتے ہوئے پوچھا۔

''کیا آئندہ بھی اس حسین اور ذہین مغنیہ سے ملاقات ہوسکے گی؟''

ارسلان نے زکریا کو ترشی سے منع کیا۔''بیٹے زکریا! یہ انتہائی لچر سوال ہے۔ کم از کم میری موجودگی میں تجھ کو یہ سوال نہیں کرنا تھا۔''

زکریا نے جواب دیا۔''پدر محترم! دوران سیاحت ہمہ وقتی ساتھ نے ہم دونوں میں بے تکلفی پیدا کردی ہے اور باپ بیٹے کی خوردی اور بزرگی کا احساس دلوں سے جاتا رہا ہے۔ اس لیے اگر مجھ سے بے ادبی یا زیادتی ہوجائے تو مجھ کو معاف فرمایا جائے۔''

مغنیہ مسکرا رہی تھی۔ زکریا سے کہا۔''آپ دونوں سے دوبارہ ملوں گی تو میں بڑی خوشی محسوس کروں گی۔ اس چند روزہ زندگی کو ادب اور تکلف کی نذر کردینا بڑی بدذوقی کی بات ہے۔ جو مزہ مشربی میں ہے، وہ ثقہ بن کر زندہ رہنے میں ہرگز نہیں۔''

باہر قاضی کے ملازم ارسلان اور زکریا کا بڑی... بے چینی سے انتظار کررہے تھے۔ کچھ دیر بعد جب ارسلان اور زکریا باہر نکلے تو ان کے ساتھ ساتھ والی حران اور چاروں مغنیائیں بھی چلی گئیں۔ چلتے چلتے زکریا نے اپنی پسندیدہ مغنیہ سے پوچھا۔''میں نے تجھ سے تیرا نام تو پوچھا ہی نہیں۔''

مغنیہ نے والی حران کی طرف دیکھا۔ والی حران نے جواب دیا۔

''اس کا نام ربابہ ہے صاحبزادے! کیا یہ تجھے بہت زیادہ پسند آگئی ہے؟''

ارسلان نے ترش روئی سے کہا۔''افسوس کہ یہ کچھ زیادہ ہی بے ادب اور بے تکلف ہوگیا ہے۔ ہم سیاح لوگ اس پسند یا ناپسند کے چکر میں پڑنا گوارا نہیں کریں گے۔ ہم آج حران میں ہیں، کل حلب میں ہوں گے تو پرسوں حمص میں۔ ان حالات میں ہم کسی سے دل لگا کر کوئی روگ کیوں لگائیں۔''

والی حران نے کہا۔''ارسلان سیاح! آپ جو کچھ بھی کہہ رہے ہیں بجا کہہ رہے ہیں لیکن جب تک آپ حران میں ہیں، میرے گھر کے دروازے آپ دونوں کے لیے ہر وقت کھلے رہیں گے۔''

ارسلان نے والی حران کی فراخ دلانہ پیش کش کا شکریہ ادا کیا اور انہوں نے ایک دوسرے سے جدا ہوتے وقت گرم جوشی کا مظاہرہ کیا۔ چونکہ رات کی سیاہی نے ہر طرف محاصرہ کررکھا تھا، اس لیے والی حران نے ان کے ساتھ دو مشعل بردار روانہ کردیے جوان کے آگے آگے چل رہے تھے۔ رات کے سناٹے کو اگر کوئی چیز توڑ رہی تھی تو وہ کتوں کے بھونکنے کی آوازیں تھیں۔

قاضی ان دونوں کا بڑی بے چینی سے انتظار کررہا تھا۔ اس نے خلاف توقع نہایت نرم رویہ اختیار کیا۔ ارسلان سے کہا۔

''میرے معزز مہمان! مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کو ایک ایسی محفل میں لے گیا جہاں ملحدانہ کلام سنایا گیا اور مذاہب سماوی کی تحقیر کی گئی۔ میں اپنی اس غلطی پر معذرت خواہ ہوں۔''

ارسلان نے جواب دیا۔''اور میں اس بات پر شرمندہ ہوں کہ جب آپ احتجاجاً وہاں سے رخصت ہوئے تو ہم دونوں نے آپ کا ساتھ نہیں دیا۔''

وہ دونوں کچھ دیر اسی طرح عذر معذرت کرتے رہے۔ اس کے بعد سونے چلے گئے۔ سونے سے پہلے ارسلان، زکریا پر بہت ناراض ہوا۔ اس نے کہا۔''زکریا! مجھے یہ بات پہلے نہیں معلوم تھی کہ تو اس حد تک حسن پرست اور عاشق مزاج واقع ہوا ہے۔ میں خوفزدہ ہوں کہ تو ایک نہ ایک دن کسی لڑکی یا عورت کے چکر میں ہمیں بڑی مصیبت میں پھنسا دے گا۔''

زکریا نے جواب دیا۔''استاد محترم! یہ درست ہے کہ میں حسن پرست اور عاشق مزاج ہوں لیکن میں ایسا کام ہرگز نہیں کروں گا جس سے ہمیں سلطان سے شرمندہ ہونا پڑے اور عتاب میں اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑے۔''

ارسلان نے کہا۔ ''ہم اس وقت محض سیاح ہیں اور سیاح کنبہ نہیں بنا سکتا۔ سیاح کا نہ کوئی گھر ہوتا ہے نہ وطن...... پھر یہ کنبہ کس طرح بنائے گا؟ عورت ہوگی تو بچے بھی ہوں گے اور جب بیوی بچوں کی ذمے داریاں اور ان کی محبتیں پاؤں پکڑنے لگیں گی تو پھر سیاحی ختم ہو جائے گی اور سیاح محض شوہر یا باپ بن کر رہ جائے گا۔''

زکریا لاجواب ہوگیا۔ ارسلان نے مزید کہا۔ ''اب ہم حران میں زیادہ دن نہیں ٹھہریں گے۔ ہمیں جلد از جلد حلب میں داخل ہو جانا ہے۔ وہاں مصر کا مملوک سلطان قانصوہ اپنی سپاہ کے ساتھ موجود ہے۔ ہمیں سلطان قانصوہ تک رسائی حاصل کر کے اپنے سلطان کے لیے کام کرنا ہے۔''

زکریا نے جواب دیا۔ ''استاد محترم! میں آپ کے حکم کا تابع ہوں۔ جیسا فرمائیں گے اس پر عمل کروں گا۔''

ارسلان قاضی کے پاس دو دن اور ٹھہرا۔ اس کے بعد حلب جانے کی اجازت طلب کی۔ قاضی نے انہیں روکنا چاہا۔ کہا۔ ''آپ دونوں ابھی حلب نہ جائیں کیونکہ وہاں جنگ کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ جب سے ترکی سلطان سلیم نے دیار بکر پر قبضہ کیا ہے اور شاہ ایران کو ہزیمت اٹھانا پڑی ہے، مصر کے سلطان قانصوہ کو یہ خطرہ لاحق ہوگیا ہے کہ آئندہ سلطان سلیم کی لشکر کشی شام پر ہوگی اور شام کے بعد وہ مصر کی طرف بڑھتا چلا جائے گا۔ سلطان قانصوہ کے خیال میں سلطان سلیم کو کیوں نہ شام کی سرحد ہی پر روک دیا جائے۔ ان حالات میں حلب جانے میں خطرات تو بہت ہیں، فائدے بالکل نہیں۔''

ارسلان نے ہنس کر جواب دیا۔ ''قاضی محترم! ہم ٹھہریں گے کہاں۔ ہم تو مناظر فطرت کے پرستار ہیں۔ اس کے بعد ہم لوگ......''

قاضی نے آہستہ سے کہا۔ ''میں سلطان قانصوہ کے نام ایک سفارشی خط لکھ دوں گا تاکہ حلب میں تم دونوں کو کسی اچھی سی جگہ پر قیام و طعام کی سہولت مل جائے۔''

اس کے بعد قاضی خاموش ہوگیا لیکن اس کی بے چینی صاف بتا رہی تھی کہ قاضی کو کوئی خیال یا کوئی بات خوفزدہ کر رہی ہے۔ کچھ ہی دیر بعد قاضی نے پوچھا۔ ''جناب والا! کیا میں آپ کے سفرنامے کو ایک نظر دیکھ سکتا ہوں؟''

ارسلان نے جواب دیا۔ ''کیوں نہیں، کیوں نہیں۔''

اور ارسلان نے سفرنامہ قاضی کے حوالے کر دیا۔ قاضی اس کے اوراق جلدی جلدی الٹنے لگا۔ وہ اس میں کچھ تلاش کر رہا تھا۔ ارسلان مسکرا رہا تھا۔ وہ آگے بڑھا اور قاضی کے کان میں کہا۔ ''جناب! آپ جو کچھ تلاش کر رہے ہیں، میں جانتا ہوں۔ سفرنامہ میرے ہاتھ میں دے دیجیے۔ میں وہی حصہ کھول کر آپ کے سامنے رکھ دوں گا جس کی آپ کو تلاش ہے۔''

قاضی نے شوخی اور خوشامد سے ارسلان کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''اب آپ کو کس بات کا انتظار ہے۔ سفرنامے کا وہ صفحہ کھول دیجیے جس کو میں پڑھنا چاہتا ہوں۔''

ارسلان نے سفرنامہ اپنے ہاتھ میں رکھا اور چند صفحوں کی الٹ پلٹ کے بعد ایک صفحہ پہلے تو خود پڑھا، اس کے بعد اس کو قاضی کی طرف بڑھا دیا کہ خود پڑھ لیں۔

قاضی نے بڑی بے چینی سے پڑھا۔ اس میں لکھا تھا:

''حران کے لوگوں نے ہم دونوں کو مہمان بنانے کی کوشش کی لیکن میں نے کسی کی بھی پیش کش قبول نہیں کی۔ آخر کار خوش اخلاق حنفی قاضی یوسف کی میزبانی کو قبول کر لیا۔ قاضی یوسف ایک فرشتہ صفت بزرگ ہیں۔ ان میں تحمل اور رواداری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ قاضی یوسف کی دینی غیرت کا اندازہ اس وقت ہوا جب والی حران کی محفلِ غنا میں مغنیاؤں کی بے باک اور ملحدانہ شاعری پر قاضی یوسف نے احتجاجاً محفل سے علیحدگی اختیار کی۔ خدا قاضی یوسف کو عمر دراز دے اور ان کی دینی اور ملی غیرت کو زندہ و پائندہ رکھے۔''

قاضی ان چند سطروں کو پڑھ کر وارفتہ و دیوانہ سا ہوگیا۔ بولا۔ ''سیاح ارسلان! بخدا آپ اس لائق ہیں کہ آپ کی سفارش کی جائے۔ میں سلطان قانصوہ کو آپ کی بابت ایک سفارشی خط لکھوں گا۔''

ظہر کے بعد والی حران کے آدمی ایک بار پھر ارسلان کے پاس پہنچ گئے اور اس کو مطلع کیا۔ ''والی حران نے آپ کو یاد فرمایا ہے، اسی وقت تشریف لے چلیں۔''

ارسلان نے قاضی یوسف کی طرف دیکھا اور جانے کی اجازت طلب کی۔ قاضی نے کہا۔ ''سیاح ارسلان! آپ جہاں چاہیں چلے جائیں لیکن آپ کی کوشش یہی رہنا چاہیے کہ آپ اپنے دین پر قائم رہیں۔''

ارسلان نے جواب دیا۔ ''قاضی محترم! آپ اس کی فکر ہی نہ کریں۔''

ارسلان نے قاضی والا سفرنامہ تو چھپا دیا اور ایک دوسرا سفرنامہ رومال میں باندھ لیا۔ والی حران نے ان دونوں کا اپنے قصر کے پھاٹک پر استقبال کیا۔ اس وقت اس

کے ساتھ مغنیہ ربابہ بھی تھی، جو ان دونوں کو دیکھ دیکھ کر دزدیدہ نگاہ سے مسکرا رہی تھی۔ والی حران ان دونوں کو اپنے ساتھ لے کر قصر کی بھول بھلیوں میں گم ہوگیا۔ قصر کے اندر شمالی سمت کے کونے میں چند خوبصورت لڑکیاں بیٹھی کسی کا انتظار کر رہی تھیں۔ ارسلان اور زکریا کو ان کے سامنے معزز مہمانوں کی طرح بٹھا دیا گیا۔ والی حران ان دونوں پر بے حد... مہربان تھا۔ خوبصورت لڑکیوں نے انہیں رقص و موسیقی سے لطف اندوز کیا۔ کچھ دیر بعد ان میں دو اور مہمان بھی شامل ہوگئے۔ یہ دونوں تاجر تھے اور انہوں نے والی حران کو بیش قیمت تحائف دے کر شرف مہمان نوازی حاصل کیا تھا۔ ارسلان کو یہ بات ناگوار گزری لیکن والی حران نے ارسلان کو یہ کہہ کر مطمئن کیا کہ ''میں ان دونوں تاجروں کو آپ سے ملوانا چاہتا تھا۔''

ارسلان سے ان دونوں تاجروں کی دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ تاجر زمانے کی بدامنی کا رونا روتے رہے اور ارسلان اپنی شکایت کرتا رہا کہ وہ اس پُرآشوب دور اور جنگ آزما عہد میں سیاحی کس طرح جاری رکھ سکتا ہے۔

زکریا کا اس محفل میں بہت دل لگا۔ اس نے ارسلان سے کئی بار یہ بات کی۔ ''اب ان خوشگوار تجربات کے بعد واپس جانا حماقت ہے۔ کم از کم میرا جی تو نہیں چاہتا۔''

ارسلان نے سرگوشی میں سمجھایا۔ ''کہیں ایسا نہ ہو احمق کہ ہماری ان باتوں کی سلطان کو خبر ہو جائے اور اس کے بعد ہم دونوں کو اگر طلب کر لیا گیا تو کیا حشر ہوگا ہم دونوں کا۔''

والی حران نے شوخی سے پوچھا۔ ''حضرات! کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ دونوں کیوں خوفزدہ ہیں اور آپ کو ڈر کیوں لگا رہتا ہے؟''

ارسلان نے جواب دیا۔ ''جی نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔ ہم سیاح لوگ جنگ و جدل کی فضا سے گھبرا گئے ہیں اور کچھ نہیں۔ تاجروں کو بھی یہی شکایت ہے۔''

والی حران نے کہا۔ ''ہاں، یہ بات تو ہے لیکن میں نے تو ایسا زمانہ نہیں دیکھا جو جنگ و جدل اور رزم و پیکار سے خالی رہا ہو۔''

کچھ دیر بعد تاجروں کو آرام کرنے کے لیے کسی دوسرے کمرے میں بھیج دیا گیا اور ارسلان اور زکریا نوجوان لڑکیوں میں تنہا رہ گئے۔ مغنیہ ربابہ ابھی تک تو خاموش تھی لیکن تاجروں کی عدم موجودگی میں اس نے بولنا شروع کر دیا۔ وہ زکریا سے زیادہ مخاطب رہی۔ والی حران نے ارسلان سے کہا۔ ''ربابہ تو آپ کے بیٹے سے باتیں کر رہی ہے۔ اب میں چاہتا ہوں کہ چند باتیں آپ سے بھی ہو جائیں۔''

ارسلان نے جواب دیا۔ ''شوق سے ضرور کیجیے باتیں، میں تیار ہوں۔''

والی حران ارسلان کو کمرے کے ایک گوشے میں لے گیا اور بولا۔ ''جناب والا! میں یہ جاننے کے لیے بے چین ہوں کہ آپ نے اپنے سفرنامے میں میرا ذکر کس انداز میں کیا ہے۔''

ارسلان نے جواب دیا۔ ''جناب والا! میں آپ کا ذکر معمولی انداز میں تو کرنے سے رہا لیکن میں نے ابھی تک جو کچھ لکھا ہے اتنا نہیں ہے جسے کافی سمجھا جائے۔ میں ابھی اور بہت کچھ بھی لکھوں گا، آپ مطمئن رہیں۔''

والی حران نے کہا۔ ''کیا میں آپ کی وہ تحریر دیکھ سکتا ہوں؟'' ارسلان نے جواب دیا۔ ''کیوں نہیں، ابھی لیجیے۔ اسی وقت دیکھ لیجیے۔''

اس کے بعد ارسلان نے اپنے رومال میں بندھے ہوئے سفرنامے کو باہر نکالا اور والی حران سے متعلقہ حصہ کھول کر اس کے سامنے کر دیا۔ والی حران نے اس کو بڑی بے چینی سے پڑھنا شروع کر دیا۔ اس میں والی حران کے اخلاق اور مہمان نوازی کی بڑی تعریفیں کی گئی تھیں اور اس کے ساتھ ہی قاضی کی مذمتیں درج تھیں۔ والی حران اسے پڑھ کر بہت خوش ہوا اور قاضی کی بڑی مذمت کی۔ آخر میں اس نے کہا۔ ''سیاح ارسلان! آپ کو حلب جانا چاہیے وہاں مصر کا مملوک سلطان قانصوہ آپ کی شاندار پذیرائی کرے گا کیونکہ اس کو بھی سیاحوں سے بڑی دلچسپی ہے اور اس کا خیال ہے کہ سیاح اپنے سفرناموں میں ممدوح حضرات کا ذکر کر کے انہیں جاوداں کر دیتے ہیں۔ میں آپ کے لیے سفارشی خط لکھوں گا تاکہ آپ کو سلطان کی خدمت میں باریابی کا فوراً ہی موقع مل جائے۔''

ارسلان نے درخواست کی۔ ''جناب والا! اگر آپ مجھ پر یہ احسان کرنا ہی چاہتے ہیں تو اس میں دیر نہ کیجیے اور وہ سفارشی اور تعارفی خط آج ہی اسی وقت لکھ دیجیے تاکہ میں کل یہاں سے روانہ ہو جاؤں۔''

والی حران اتنا خوش تھا کہ اس نے سلطان قانصوہ کے نام اسی وقت ایک سفارشی خط لکھ دیا۔ اس نے خط میں لکھا۔ ''ابن جبیر اور ابن بطوطہ کے بعد شاید ارسلان تاریخ کا ایک بڑا سیاح کہلائے گا جو اپنے بیٹے زکریا کے ساتھ سیاحت کو

نکلا ہے اور سیاح وہ لوگ ہوتے ہیں جنہیں معمولی آدمیوں کو بھی اپنے سفرنامے میں شامل کر کے بڑا اور زندہ و پائندہ رکھنے کا ذریعہ حاصل ہوتا ہے۔ سلطان کی خدمت میں ان دونوں کو بھیج کر اس بات کا امیدوار ہوں کہ سلطان ان دونوں کا خاص خیال فرمائیں گے بلکہ ان کے طفیل مجھ عاجز کا بھی خیال رکھیں گے۔''

پوری رات گزارنے کے بعد صبح ارسلان اور زکریا والی حران سے جدا ہونے لگے تو مغنیہ ربابہ کو زکریا کی جدائی کا بڑا ملال تھا۔ اس نے بڑے دکھ سے کہا۔ ''الوداع نوجوان سیاح! شاید اب قیامت ہی میں ملاقات ہوگی۔''

زکریا کے جی میں آئی کہ وہ ارسلان کا ساتھ چھوڑ کر یہیں کا ہو رہے لیکن وہ ایسا یوں نہ کر سکا کہ ربابہ والی حران کی منظورِ نظر تھی۔ دوسرے یہ کہ ارسلان خود بھی ایسا نہیں کرنے دیتا اور کسی بھی موقع پر سلطانی عتاب کا شکار ہونا پڑتا۔ اس نے ربابہ کو بڑی بے بسی سے دیکھا اور حسرت سے کہا۔ ''ہاں، شاید قیامت ہی ملاقات کی ممکنہ گھڑی ہو سکتی ہے۔''

والی حران نے ربابہ کو حکم دیا۔ ''تو اندر جا اور نوجوان سیاح کو آزمائش میں نہ ڈال۔''

یہاں سے رخصت ہو کر یہ دونوں قاضی کے پاس پہنچے اور اس کو مطلع کیا کہ دونوں آج ہی حلب کے لیے روانہ ہو جائیں گے۔ قاضی نے انہیں روکنا چاہا لیکن وہ دونوں نہیں رکے۔ آخر قاضی نے بھی سلطان قانصوہ کے نام ایک سفارشی خط لکھ دیا۔ یہ دونوں قاضی سے جدا ہو کر حران کے اس پڑاؤ پر پہنچے جہاں ایک قافلہ حلب جانے کے لیے تیار تھا۔ قاضی نے زادِ راہ کے نام سے اتنا بہت سارا سامان دے دیا تھا کہ ان دونوں کے لیے اس کا سنبھالنا مشکل ہو گیا۔

ابھی قافلہ چلا بھی نہ تھا کہ والی حران اپنے محافظوں کے ساتھ پڑاؤ پر پہنچ گیا۔ اس نے ارسلان اور زکریا کو... آسانی سے تلاش کر لیا اور انہیں ایک طرف لے جا کر دریافت کیا۔

''زادِ راہ میں قاضی نے آپ دونوں کو کیا کچھ دیا ہے؟''

ارسلان نے جواب دیا۔ ''قاضی نے تو اتنا کچھ دے دیا کہ اس کو سنبھالنا اور دورانِ سفر ساتھ رکھنا مشکل ہو گیا ہے لیکن میں قاضی کی دل شکنی بھی نہیں کر سکتا تھا۔''

والی حران نے تردد سے کہا۔ ''تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ قاضی کی داد و دہش نے آپ کو خاصا متاثر کر دیا ہے۔''

ارسلان نے جواب دیا۔ ''ہاں، یہ بات تو ہے۔ احسان تو انسان کو زیر بار کر ہی دیتا ہے۔ اگر میں اس کا احسان نہ مانوں تو میں ناشکر گزار اور ذلیل انسان کہلاؤں گا۔''

والی حران نے کہا۔ ''لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ اس معاملے میں مجھ پر سبقت لے جائے۔''

اس کے بعد وہ ارسلان اور زکریا کو ایک طرف لے گیا۔ یہاں چند گدھوں پر مختلف قسم کا سامان لدا ہوا تھا۔ والی حران نے کہا۔ ''سیاح ارسلان! یہ سب کچھ آپ دونوں کے لیے ہے۔''

اس کے بعد اسے ایک گھوڑے کی طرف لے گیا۔ اس پر نقاب میں چہرہ چھپائے ایک خاتون بیٹھی تھی۔ والی حران نے اس کو گھوڑے سے اتار لیا اور زکریا سے کہا۔ ''سیاح ارسلان کے بیٹے! تجھے دینے کے لیے میرے پاس اس سے زیادہ قیمتی اور اثر انگیز کوئی اور چیز نہیں تھی۔ پھر میں نے یہ بھی سوچا کہ قیامت کا کیا اعتبار، آئے نہ آئے۔ اگر قیامت کی گھڑی یہیں ممکن ہے تو اس کو کیوں نہ بلا لیا جائے۔ آج سے ربابہ تیری ہے۔ اس کو لے جا اور اپنے سفرنامے میں میرا ذکر بطورِ خاص کر دینا۔''

زکریا کی خوشی کی انتہا نہ رہی اور ارسلان حیران تھا کہ یہ سب کیا ہو گیا۔ اس نے والی حران کو یقین دلایا کہ اس نے اس کے بیٹے زکریا پر جو احسان کیا ہے، وہ ان تمام احسان سے بڑھ چڑھ کر ہے جو اب تک ان دونوں پر کیے گئے ہیں۔

کچھ دیر بعد جب یہ قافلہ حلب کے لیے روانہ ہوا تو اس قافلے میں سب سے زیادہ خوش قسمت شاید زکریا تھا۔ والی حران ان دونوں کو اس وقت تک جاتے ہوئے دیکھتا رہا جب تک وہ دونوں نقطے سے نقطۂ موہوم نہ بن گئے۔

(جاری ہے)

کہانی کے تاریخی ماخذ

تاریخ اسلام	تمدن عرب	تاریخ ایران	تاریخ الخلفاء	فرماں روایان اسلام	الکامل
اکبر [illegible] آبادی	ڈاکٹر گستاؤلی بان	مقبول بیگ بدخشانی	جلال الدین سیوطی	اسٹینلے لین پول	ابن اثیر

پُرکاری

مسریم کے خان

اگر نفس اور فطرت ایک ہی رنگ میں رنگے ہوں تو ان کے عین مطابق انسان بھرپور طریقے سے اپنے حصے کا کردار ادا کرتا ہے جیسا کہ اس نے کیا۔ چونکہ اس کا نفس بھی اسے اپنی فطرت کے مطابق اس رستے پر لیے جا رہا تھا جس پر وہ راضی تھی یہ اور بات کہ نفس کی نہ آنکھیں ہوتی ہیں اور نہ کان... اس لیے اسے بھی کچھ نظر نہ آیا کہ وہ کس سمت جا نکلی ہے... مگر جب اسے احساس ہوا تو خواہشات کے زندان میں قید وہ بے بس پنچھی کے مانند پھڑپھڑا کر رہ گئی... کیونکہ جیسا امتحان ویسا نتیجہ ہر انسان کے مقدر میں محفوظ کر دیا گیا ہے۔

انتہائی ہوشیاری سے دلدل میں اترنے اور نکلنے کا دلچسپ تماشا

وہ ویٹنگ روم میں اپنی نشست پر بیٹھی ہوئی ہاتھوں کی انگلیاں مروڑ رہی تھی۔ ایک عجیب کشمکش اس کے چہرے پر نمایاں تھی۔ اس کے ساتھ ایک بوڑھی عورت بیٹھی تھی۔ لوگ فون پر، انٹرکام پر اور موبائل پر بات کر رہے تھے۔ کی بورڈز کی کھٹ کھٹ سنائی دے رہی تھی۔ افسران اپنے ماتحتوں سے کام کی بات کر رہے تھے۔ یہ سب آوازیں مل کر ایک مخصوص دفتری ماحول تشکیل دے رہی تھیں۔ اچانک وہ چونکی۔ مسز براؤن اسے پکار رہی

12
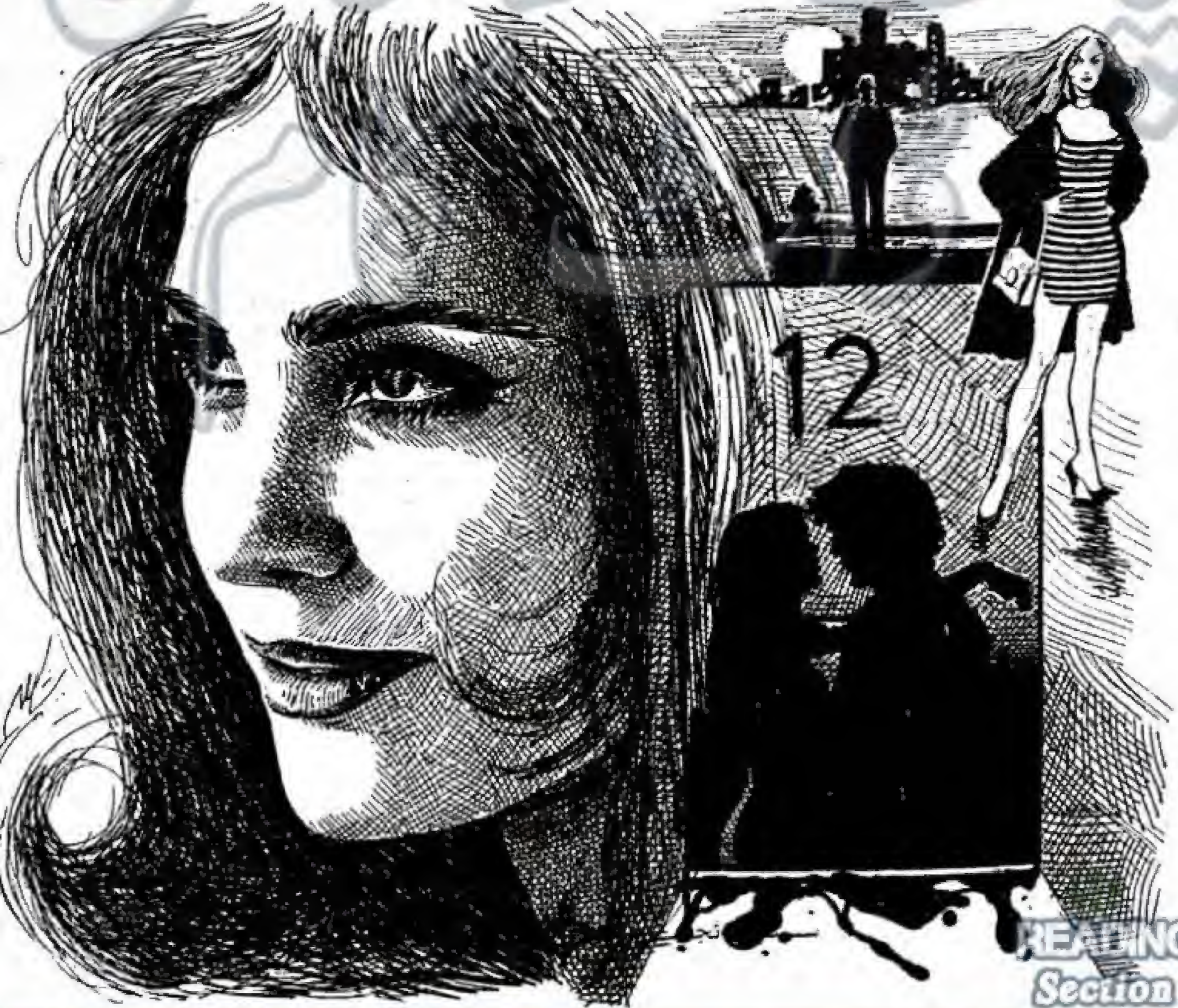
تھی۔ ''کیٹ... مسز جان۔''

وہ جلدی سے اپنا بیگ اٹھاتے ہوئے کھڑی ہو گئی۔ مسز براؤن کا کیبن کسی قدر بڑا تھا۔ وہ اس ری ہیبلی ٹیشن کے ادارے کی ایک سپروائزر تھی۔ یہاں ایسی خواتین کو جن کے شوہر کسی جرم کی وجہ سے جیل میں ہوں اور وہ نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہوں، علاج کی سہولت فراہم کی جاتی تھی۔ کیٹ اسی سلسلے میں یہاں آتی رہی تھی لیکن آج وہ کسی اور وجہ سے آئی تھی۔ مسز براؤن نے پہلے اس سے معذرت کی۔ ''سوری ڈیئر تمہیں انتظار کرنا پڑا۔''

''کوئی بات نہیں۔'' کیٹ نے کسی قدر نروس لہجے میں کہا۔ ''ابھی وقت ہے۔''

''میں بس چند کام نمٹا لوں پھر ہم چلتے ہیں۔'' مسز براؤن نے سامنے رکھے کی بورڈ پر انگلیاں چلاتے ہوئے کہا۔ ''اب کیسا محسوس کر رہی ہو؟''

''بہت اچھا۔''

مسز براؤن شرارت سے مسکرائی۔ ''جان جو آنے والا ہے۔''

جواب میں کیٹ بھی مسکرائی تھی لیکن اس کی مسکراہٹ میں پھیکا پن تھا۔ اس کا پورا نام کیتھلین جینسن تھا۔ چار برس پہلے اس کی شادی جان جینسن سے ہوئی تھی اور اب وہ جیل سے رہا ہونے والا تھا۔ دو برس پہلے کیٹ نے باتھ روم میں اپنی نسیں کاٹ کر خودکشی کی کوشش کی لیکن اس کا اصرار تھا کہ اس نے بقائمی ہوش و حواس کچھ نہیں کیا تھا۔ اس کی..... سائیکاٹرسٹ شیلی براؤن نے اسے علاج کے لیے یہاں ریفر کر دیا تھا۔ تین مہینے وہ اسپتال میں داخل رہی اور اس کی مکمل نگرانی کی جاتی رہی۔ اسے اس مخصوص کمرے میں رکھا گیا تھا جہاں ان مریضوں کو رکھا جاتا تھا جو خود کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتے تھے۔ تین مہینے بعد اس کے حوصلہ افزا ردعمل کی وجہ سے اسے ڈسچارج کر دیا گیا لیکن وہ تھراپی کے لیے باقاعدگی سے سینٹر آنے کی پابند تھی۔ ہفتے میں ایک چکر لازمی تھا۔ بہرحال اس کے بعد اس نے خودکشی کی کوشش نہیں کی۔

آج جان کی رہائی کا دن تھا اور اس نے مسز براؤن سے درخواست کی تھی کہ وہ بھی اس کے ساتھ چلے گی۔ کیٹ اس سے مانوس تھی۔ مسز براؤن راضی ہو گئی۔ اسے بھی کیٹ سے ہمدردی تھی کیونکہ اس کے خیال میں کیٹ نے بہت مشکل وقت گزارا تھا۔ جان ایک بزنس میں شریک تھا۔ اس کے ساتھ دو افراد کارل بروسکی اور جوزف ملرڈ بھی شامل تھے۔ کارل روسی نژاد تھا اور بیس برس پہلے امریکا آیا تھا جبکہ جوزف جرمن نژاد امریکی تھا۔ بزنس میں کوئی مسئلہ ہوا اور ایک فریق نے جان پر الزام لگایا کہ اس نے دھوکا کیا ہے۔ پولیس نے جان کو گرفتار کر لیا اور عدالت میں جرم ثابت ہونے پر اسے سزا سنادی گئی۔ آج اس کی قید کی میعاد پوری ہو گئی تھی اور وہ دو بجے جیل سے رہا کر دیا جاتا۔ کیٹ چاہتی تھی کہ مسز براؤن اس کے ساتھ چلے۔ جب اس نے مسز براؤن سے کہا تو وہ بولی۔

''مجھے چلنے میں تو کوئی حرج نہیں ہے لیکن یہ خاص موقع ہو گا۔ کیا جان اس موقع پر کسی اور کی موجودگی پسند کرے گا؟''

''جان تمہیں اچھی طرح جانتا ہے اور پسند بھی کرتا ہے۔ میں ہر ملاقات پر اسے تمہارے بارے میں بتاتی رہی ہوں۔ تم نے میرے ساتھ جو تعاون کیا ہے، جان اسے بہت سراہتا ہے۔''

''میں نے اپنی ڈیوٹی پوری کی ہے۔'' مسز براؤن نے انکساری سے کہا۔ اب کیٹ اس کے سامنے بیٹھی منتظر تھی کہ اس کا کام ختم ہو تو وہ اس کے ساتھ چلے۔ مسز براؤن نے اپنا کام مکمل کیا اور کھڑی ہو گئی۔ وہ کیٹ کی کار میں روانہ ہوئے۔ وسکونسن اسٹیٹ جیل میڈیسن شہر سے باہر تھی۔ ایک گھنٹے بعد وہ جیل کے باہر پارکنگ میں موجود تھیں۔ ٹھیک دو بجے جالی دار سرکنے والے گیٹ کے پاس جان نمودار ہوا۔ کیٹ اور مسز براؤن گاڑی سے اتر کر دروازے کی طرف بڑھیں۔ جان کے چہرے پر خوشی نمودار ہوئی۔ اس نے عام لباس پہن لیا تھا اور اپنا بیگ شانے پر لٹکایا ہوا تھا۔ اس کی صحت بہتر تھی لیکن جیل نے اس کے چہرے کی تازگی ختم کر دی تھی۔ اس نے باہر آتے ہی کیٹ کو گلے لگا کر پیار کیا۔ پھر مسز براؤن سے ہاتھ ملا کر بولا۔

''میں تمہارا خاص طور سے شکر گزار ہوں۔ جیل میں مجھے سب سے زیادہ فکر کیٹ کی ہوتی تھی لیکن جب اس نے تمہارے بارے میں بتایا تو مجھے تسلی ہوئی کہ اس کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی ہے۔''

''میں نے اپنی ڈیوٹی پوری کی ہے۔'' مسز براؤن نے کہا۔ ''میں بھی تم سے ملنا اور بات کرنا چاہتی تھی۔''

وہ راستے میں ایک ریستوران میں لنچ کے لیے رکے۔ کیٹ واش روم کے لیے گئی تو مسز براؤن نے جان سے کہا۔ ''یہ اچھا موقع ہے، میں تم سے بات کرنا چاہتی تھی۔''

''کیٹ کے بارے میں؟''

مسز براؤن نے سر ہلایا۔ ''ہاں، وہ تقریباً دو سال

سے ہمارے ادارے میں آ رہی ہے۔ اس نے خودکشی کی پہلی کوشش کے بعد اس کا اعادہ نہیں کیا لیکن۔۔۔''

''لیکن کیا؟۔۔۔ وہ نارمل نہیں ہے؟''

مسز براؤن ہچکچائی پھر اس نے سر ہلایا۔ ''بدقسمتی سے یہ بات درست ہے۔ وہ بہت پازیٹو ذہن کی مالک ہے۔ اس نے ہمارے ساتھ مکمل تعاون کیا ہے لیکن اس کی الجھن دور نہیں ہو پا رہی ہے۔ اس لیے اب بہت ضروری ہے کہ تم اس کی زیادہ کیئر کرو۔''

''مجھے احساس ہے کہ وہ میری وجہ سے اس حال کو پہنچی ہے۔'' جان نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ''میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں اس کا پورا خیال رکھوں گا۔''

''اسے ابھی مزید علاج کی ضرورت ہے۔'' مسز براؤن نے کہا۔ ''لیکن مجھے امید ہے تم آ گئے ہو تو اب اسے نارمل ہونے میں زیادہ وقت نہیں لگے گا۔''

''کس قسم کا علاج ہو رہا ہے؟''

''دواؤں کا علاج بند کر دیا ہے، اسے ان کی ضرورت نہیں ہے لیکن سائیکاٹرسٹ سے سیشن جاری ہیں۔ ہفتے میں ایک بار اسے مسٹر پیکارڈ کے پاس جانا ہوتا ہے۔''

''مسٹر پیکارڈ؟'' جان نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

''مسٹر پیکارڈ ہمارے ادارے کے بہترین سائیکاٹرسٹ بھی ہیں۔۔۔ اور وہی کیٹ کو دیکھتے ہیں۔''

لنچ کے بعد وہ روانہ ہوئے۔ مسز براؤن کو دفتر چھوڑ کر وہ گھر روانہ ہوئے۔ جان کے جیل جانے کے بعد کیٹ نے یہ خوب صورت اپارٹمنٹ لیا تھا۔ جان کا آبائی مکان جہاں ان کی شادی ہوئی تھی، فروخت ہو گیا تھا اور قرضوں کی ادائیگی کے بعد جو رقم بچی تھی، اس سے کیٹ نے یہ اپارٹمنٹ لیا تھا اور اب تک گزارہ کرتی آئی تھی۔ پھر اسے سوشل سیکیورٹی کے تحت بھی مدد ملتی تھی۔ اس لیے اسے مالی پریشانیوں کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ جان نے گھوم پھر کر پورا اپارٹمنٹ دیکھا اور تعریف کی۔ ''بہت خوب صورت ہے اور تمہارے وجود نے اسے مزید خوب صورت بنا دیا ہے۔''

رات کسی وقت کیٹ کی آنکھ کھلی تو جان اس کے پہلو میں بے خبر سو رہا تھا۔ وہ اس سے بہت ٹوٹ کر ملا تھا جیسے برسوں کی جدائی کی تلافی کرنا چاہ رہا ہو۔ کیٹ کچھ دیر اسے دیکھتی رہی پھر آنکھیں بند کر کے دوبارہ سو گئی۔ صبح ناشتے پر اس نے جان سے کہا۔ ''اب تم کیا کرو گے؟۔۔۔ میرے پاس جو رقم تھی، وہ بہت کم رہ گئی ہے۔''

کیٹ کا خیال تھا کہ وہ جاب کی بات کرے گا لیکن اس نے کہا۔ ''کل کارل کی کال آئی تھی۔ اس نے مجھے دوبارہ بزنس میں شرکت کی دعوت دی ہے۔ میں اس سے ملوں گا۔''

کیٹ کا چہرہ سفید ہو گیا۔ ''تم دوبارہ اس بزنس میں شامل ہو گے جس کی۔۔۔''

کیٹ کہتے کہتے رک گئی لیکن جان اس کا جملہ سمجھ گیا۔ اس نے نرمی سے کہا۔ ''ڈیئر! ہر بار ایک جیسا نہیں ہوتا ہے۔ میں نے اپنی غلطی سے سبق سیکھا ہے۔ تم فکر مت کرو، اب میں دوبارہ وہ غلطی نہیں کروں گا۔''

کیٹ خاموش رہی۔ ناشتے کے بعد اس نے جان سے کہا۔ ''میں خریداری کرنے جا رہی ہوں، تم نے کچھ منگوانا ہے؟''

''نہیں۔''

''میں جلد آ جاؤں گی۔''

''میں آرام کروں گا۔'' جان نے اپنا ارادہ بتایا۔

کیٹ تیار ہو کر نیچے آئی۔ پارکنگ میں جیڈ صفائی کر رہا تھا۔ وہ تقریباً ساٹھ سال کا خوش مزاج اور دوستانہ مزاج رکھنے والا شخص تھا۔ پارکنگ اس کی ذمے داری تھی۔ وہ یہاں کی ہر چیز کا خیال رکھتا تھا اور بلڈنگ کے لوگوں میں بہت مقبول تھا۔ کیٹ اپنی کار کی طرف بڑھ رہی تھی کہ اس کا پرس گر گیا اور اس میں سے چیزیں نکل کر بکھر گئیں۔ وہ چیزیں سمیٹ رہی تھی کہ جیڈ جلدی سے اس کی مدد کو آ گیا۔ سب چیزیں دوبارہ پرس میں ڈال کر کیٹ نے نروس انداز میں اس کا شکریہ ادا کیا اور کار میں بیٹھ گئی۔ جیڈ پاس ہی کھڑا تھا۔ وہ مسکرایا اور اپنے کام پر چلا گیا۔ وہ ایک جگہ فرش پر گرنے والا آئل صاف کر رہا تھا۔ کیٹ نے انجن اسٹارٹ کیا اور سامنے دیکھا۔ تقریباً سو فٹ دور دیوار تھی جس پر تیزی سے نیچے جانے کا نشان بنا ہوا تھا۔ اس نے ایکسلریٹر کو ریس دی تو کار تیزی سے آگے بڑھی۔ جیڈ نے آخری لمحے میں دیکھا، کار مڑنے کے بجائے سیدھی دیوار میں گھستی چلی گئی تھی۔

☆☆☆

ڈاکٹر کیون پیکارڈ جان کو سمجھا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر وحشت تھی اور وہ چند لمحے پہلے تک چلا رہا تھا کہ اسے اس کی بیوی سے ملنے دیا جائے۔ بالآخر کیون پیکارڈ اسے سمجھانے میں کامیاب رہا کہ ابھی وہ اس کے سامنے نہ جائے، پہلے اسے کیٹ کی ذہنی کیفیت کا اندازہ لگانے دے۔ جان نے گہری سانس لی اور بولا۔ ''ڈاکٹر، میں صرف اسے ایک نظر دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''وہ بالکل ٹھیک ہے۔'' وہاں موجود ڈاکٹر نوسٹر نے کہا۔ کیٹ کا کیس اسی کے پاس آیا تھا۔ ''بس سر میں ہلکی سی چوٹ ہے۔ تمام رپورٹس اور ٹیسٹ نارمل آئے ہیں۔ ممکن ہے اسے آج ہی گھر جانے کی اجازت دے دی جائے بشرطیکہ ڈاکٹر پیکارڈ اس کی اجازت دیں۔''

جان چونکا۔ ''اجازت دیں سے کیا مطلب؟''

ڈاکٹر پیکارڈ نے سر ہلایا۔ ''تم سمجھنے کی کوشش کرو، کیٹ نے کار دیوار سے ٹکرادی اور یہ غلطی نہیں تھی۔''

''یہ غلطی تھی۔'' جان نے اصرار کیا۔

''کوئی پارکنگ میں چالیس میل فی گھنٹا کی رفتار سے کار کو نوّے درجے زاویے پر نہیں موڑتا ہے۔'' وہ بولا۔ ''پولیس کے مطابق ٹکراتے وقت کار کی رفتار اتنی ضرور تھی۔''

جان حیران رہ گیا۔ ڈاکٹر کیون پیکارڈ اسے وہاں چھوڑ کر اسپتال کے ایمرجنسی والے حصے میں آیا جہاں ایک بیڈ پر کیٹ نیم دراز تھی۔ اسے ہوش آگیا تھا اور وہ الجھی ہوئی نظر آرہی تھی۔ کیون نے پردے برابر کیے اور مسکرا کر بولا۔ ''ہائے کیٹ! کیسا محسوس کررہی ہو؟''

''میرے سر میں درد ہے۔'' وہ ماتھا چھو کر بولی۔ اس کے ہاتھ سے کینولا منسلک تھا۔ ''لیکن مجھے کیا ہوا ہے اور میں یہاں کیسے آئی؟''

کیون سنجیدہ ہوگیا۔ ''تمہیں یاد نہیں کہ تمہارے ساتھ کیا ہوا تھا؟''

کیٹ نے نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں۔''

''آخری چیز کیا یاد ہے؟''

کیٹ نے ذہن پر زور دیا۔ ''مجھے بس اتنا یاد ہے کہ میں پارکنگ میں آئی اور اپنی کار میں بیٹھی تھی۔ اس سے پہلے میرا پرس گر گیا اور چیزیں بکھر گئی تھیں۔ پارکنگ کے ملازم جیڈ نے چیزیں سمیٹنے میں میری مدد کی۔ میں نے کار میں بیٹھ کر انجن اسٹارٹ کیا اور پھر مجھے کچھ یاد نہیں۔''

''تم نے کار آگے بڑھائی اور تقریباً چالیس میل فی گھنٹا کی رفتار سے اسے دیوار سے ٹکرادیا۔''

کیٹ حیران ہوئی۔ ''مائی گاڈ! میں قسم کھاتی ہوں مجھے بالکل یاد نہیں ہے۔ میرا ذہن غیر حاضر ہوگیا تھا۔''

کیون اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے نرمی سے کہا۔ ''کیٹ! تم عرصے سے میرے پاس آرہی ہو اور تم ایک بار پہلے بھی خودکشی کی کوشش کرچکی ہو۔''

''خودکشی۔'' وہ دہل گئی پھر اس نے احتجاج کیا۔ ''یہ خودکشی نہیں حادثہ تھا۔''

''پولیس پہلے ہی حادثے کا امکان مسترد کرچکی ہے۔''

''پلیز ڈاکٹر۔'' کیٹ نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور عاجزی سے بولی۔ ''میرا یقین کرو، میرے ذہن میں آج کل دور دور تک خودکشی کا خیال نہیں ہے۔ اب تو جان بھی واپس آگیا ہے۔''

''پھر اس طرح کار دیوار سے ٹکرادینا؟''

''میں تسلیم کرتی ہوں کہ میرے اندر کوئی مسئلہ ہے لیکن یقین کرو میں نے جان بوجھ کر ایسی کوئی حرکت نہیں کی ہے۔''

کیون سوچ میں پڑ گیا۔ یہ ایک ایسی مریضہ کی طرف سے بہت سنگین قدم تھا جو ایک بار پہلے بھی خودکشی کی ناکام کوشش کرچکی تھی۔ عام طور سے ایسی صورت میں مریض کو اسپتال منتقل کردیا جاتا ہے۔ لیکن کیٹ کا رویہ عام نفسیاتی مریضوں سے مختلف تھا۔ دورانِ علاج اس نے کیون سے مکمل تعاون کیا تھا اور اپنی ہر کیفیت اس سے شیئر کرتی تھی۔ ایسا بھی ہوتا کہ وہ اسے کال کرکے بتاتی کہ وہ کیسا محسوس کررہی ہے اور اس سے مشورہ طلب کرتی تھی۔ اس نے کبھی کچھ چھپانے یا اس سے جھوٹ بولنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ہفتہ وار سیشن میں بھی وہ پوری طرح تعاون کرتی تھی۔ اس لیے کیون اپنے اندر اس کے لیے ہمدردی محسوس کررہا تھا۔ وہ ملتجی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس نے پھر آہستہ سے کہا۔ ''پلیز ... ڈاکٹر پلیز ... یہ میری ازدواجی زندگی کا سوال بھی ہے۔ اگر میں اسپتال بھیج دی گئی تو شاید پھر میں اور جان ایک ساتھ نہ رہ سکیں۔''

کیون نے گہری سانس لی۔ ''اوکے... میں اپنے رسک پر تمہیں ریلیز کررہا ہوں۔''

کیٹ مارے خوشی کے رو دی۔ کچھ دیر بعد کیون، جان کو ویٹنگ روم میں کہہ رہا تھا۔ ''اس صورتِ حال میں اسے اسپتال بھیج دینا ہی ٹھیک ہوتا لیکن میں اس کی درخواست پر اور تم پر اعتماد کرتے ہوئے ایک موقع اور دے رہا ہوں۔ مگر اب اسے ہر تیسرے دن میرے پاس آنا ہوگا۔ کسی بھی غیر معمولی صورتِ حال میں تم یا کیٹ مجھ سے فوری رابطہ کروگے۔''

کیون پیکارڈ اپنے مریضوں کے معاملے میں خودمختار تھا اور وہ ان کے بارے میں فیصلہ کرسکتا تھا لیکن ساتھ ہی وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اگر اس کا آگے کوئی غلط نتیجہ نکلا تو اسے قصوروار ٹھہرایا جائے گا۔ وہ شام کو گھر پہنچا تو اس کی بیوی ربی اور آٹھ سال کا بیٹا ایرن ٹی وی پر اس بارے میں آنے والی خبر دیکھ رہے تھے۔ نیوز کاسٹر حادثہ شدہ کار اور اس حادثے

کے بارے میں پولیس کی رپورٹ پر بات کر رہی تھی۔ اس میں پارکنگ اٹینڈنٹ جیڈ اور حادثے کے بعد کیٹ کو طبی امداد دینے والے ڈاکٹر کا انٹرویو بھی شامل تھا۔ جیڈ کا کہنا تھا کہ خاتون نے کار کو سیدھا لے جا کر دیوار سے ٹکرایا تھا اور اس نے اسے موڑنے کی قطعی کوشش نہیں کی تھی۔ پولیس کا بھی یہی کہنا تھا کہ کار بالکل سامنے سے ٹکرائی تھی۔ ڈاکٹر فوسٹر کا کہنا تھا کہ کیٹ بہت خوش قسمت رہی تھی کہ سیٹ بیلٹ نہ باندھنے کے باوجود اسے معمولی سی چوٹ آئی تھی۔ کیون نے میڈیا سے بات کرنے سے انکار کر دیا تھا، اس لیے وہ اس رپورٹ کا حصہ نہیں تھا لیکن رینی جانتی تھی۔ اس نے کہا۔

''یہ تمہاری مریضہ ہے نا؟''

کیون نے سر ہلایا اور ٹی وی دیکھتے ایرن کے سر پر پیار کرتے ہوئے صوفے پر گر گیا۔ ''ہاں، تم جانتی ہو۔''

''یہ ایک بار پہلے بھی خودکشی کی کوشش کر چکی ہے نا؟''

کیون نے ٹائی ڈھیلی کرتے ہوئے سر ہلایا۔ ''ہاں... ایرن کو تم لائی ہو؟''

''تم جانتے ہو میرے لیے رش میں ڈرائیونگ مسئلہ ہوتی ہے۔'' رینی نے شکایت کی۔ ''میں اسے بہت مشکل سے لائی ہوں۔''

''میرا خیال ہے کہ اب ایرن اتنا بڑا ہو گیا ہے کہ خود سے اسکول بس میں آ جا سکے۔''

''بالکل بھی نہیں۔'' رینی جلدی سے بولی۔ ''تم جانتے ہو...؟''

''وہ صرف ایک حادثہ تھا۔'' کیون نے اس کی بات کاٹی۔ ''اس کو چار برس ہو چکے ہیں اور دوبارہ ایسا حادثہ نہیں ہوا۔''

جب انہوں نے ایرن کو اسکول میں داخل کرایا تھا، ایک اسکول بس حادثے کا شکار ہوئی۔ اس کے انجن میں آگ لگنے سے اندر دھواں بھر گیا اور دروازے کا ہائیڈرولک سسٹم جام ہو گیا جس سے بچے اندر پھنسے رہ گئے۔ اس حادثے میں دو درجن بچے دم گھٹنے سے ہلاک ہوئے تھے۔ اس حادثے کے بعد رینی اتنی خوف زدہ ہوئی کہ اس نے فیصلہ کیا کہ ایرن کو وہی اسکول چھوڑنے اور لینے جائیں گے۔ چھوڑنے کا مسئلہ نہیں تھا۔ صبح کیون کام پر جاتے ہوئے ایرن کو اسکول چھوڑ جاتا تھا۔ مسئلہ اسے وہاں سے لینے کا تھا۔ اگرچہ اکثر کیون آ جاتا تھا اور وہ ایرن کو واپس گھر چھوڑ جاتا تھا لیکن کبھی کبھی اسے غیر متوقع مصروفیت پیش آ جاتی اور اس صورت میں وہ نہیں آ پاتا تھا۔ رینی ڈرائیونگ جانتی تھی لیکن پرہجوم سڑکوں پر وہ نروس ہو جاتی تھی۔ اس لیے اس کی کوشش ہوتی کہ کیون ہی ایرن کو اسکول سے لائے۔ کیون نے کوشش کی کہ رینی کا یہ مسئلہ حل ہو جائے مگر اس نے علاج سے انکار کر دیا تھا اس کا کہنا تھا کہ یہ کوئی نفسیاتی مسئلہ نہیں۔ جبکہ کیون کا کہنا تھا ہر وہ مسئلہ نفسیاتی ہوتا ہے جس کا تعلق جسم سے زیادہ ذہن سے ہو بلکہ بہت سے جسمانی مسئلے بھی نفسیاتی ہی ہوتے ہیں۔

''تم نے اسے اسپتال بھیج دیا؟''

''نہیں، میں نے اسے ریلیز کر دیا ہے۔''

رینی حیران ہوئی۔ ''اس نے خودکشی کی کوشش کی تھی اور تم نے اسے اسپتال بھیجنے کے بجائے ریلیز کر دیا؟''

کیون کو جھنجلاہٹ ہونے لگی۔ ''کیونکہ میں نے ایسا مناسب سمجھا۔''

رینی نے اسے عجیب نظروں سے دیکھا لیکن کچھ بولی نہیں۔

☆☆☆

کیٹ سارے راستے نروس رہی۔ جان خاموشی سے ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ وہ گھر میں داخل ہوئے تو جان نے اسے بانہوں میں لے لیا اور پیار سے بولا۔ ''مجھے بہت فکر ہے کہ تمہارے ساتھ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟''

کیٹ نسبتاً پرسکون نظر آنے لگی۔ ''تمہیں یقین ہے نا کہ میں نے ایسا جان بوجھ کر نہیں کیا؟''

''مجھے یقین ہے اور مجھے اس کا بھی یقین ہے کہ اب تمہارے ساتھ ایسا کچھ نہیں ہوگا۔''

''تم نے کہا تھا کہ دوبارہ سے بزنس شروع کرو گے؟''

''بہت جلد... شاید کل میں ان سے ملوں گا۔''

''سنو، کیا ہم پھر اس مکان میں جا سکیں گے جہاں ہماری شادی ہوئی تھی؟''

جان ہچکچایا۔ ''اس مکان میں تو نہیں لیکن میں تمہیں اس سے بھی اچھے مکان میں لے جاؤں گا۔''

کیٹ نے اس کے شانے سے سر لگایا۔ ''آئی ایم سوری، میں نے تمہیں پریشان کیا۔''

''جب تم میری ہو تو تمہاری تمام پریشانیاں بھی میری ہیں۔''

''پتا نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا۔ پچھلے سالوں میں، میں بہت پریشان رہی۔ میری کوئی زندگی نہیں تھی۔ جب چاچا سو گئی جب چاچا کھا لیا۔ کوئی جاب نہیں اور کوئی مصروفیت نہیں تھی۔ لیکن اب تم آ گئے ہو تو میں تمہارے لیے کچھ کرنا چاہتی ہوں۔''

''تم میرے لیے پہلے ہی بہت کچھ کر چکی ہو۔'' جان نے کہا۔ ''تم جانتی ہو مجھے تمہارے ہاتھ کے بنے کھانے

اچھے لگتے ہیں۔''
''اب میں تمہارے لیے خود کھانے بناؤں گی۔'' کیٹ نے کہا۔
''نہیں، فی الحال تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔تم کل تک آرام کرو اس کے بعد جو چاہو کرنا۔''
کیٹ نے اس کی بات مان لی۔اس واقعے کے بعد سے وہ سہمی ہوئی تھی۔جان اگلے دن تک اس کے ساتھ رہا۔پھر اسے کارل کی طرف سے کال آئی اور وہ اس سے ملنے چلا گیا۔وہ دو گھنٹے بعد واپس آگیا تھا اور اس نے کیٹ کو خوشخبری سنائی۔''میں ایک بار پھر کارل اور جوزف کے ساتھ بزنس میں شامل ہونے والا ہوں۔''
''یہ تو خوشی کی بات ہے۔'' کیٹ نے سپاٹ لہجے میں کہا۔
''کل اس خوشی میں کارل کے گھر پارٹی ہے اور ہم اس کے مہمانِ خصوصی ہوں گے۔''
''میں تیار رہوں گی۔''
''میری خواہش ہے کہ تم پارٹی میں سب سے منفرد نظر آؤ۔''

☆☆☆

این فرانز کا دفتر شاندار تھا۔کیون پیکارڈ وہاں پہنچا تو این اس کی منتظر تھی۔این پہلے ری ہیبلی ٹیشن سینٹر میں کام کرتی تھی اور کیٹ کا کیس کچھ عرصے اس کے پاس بھی رہا تھا۔درحقیقت وہی اس کی پہلی معالج تھی پھر اس نے سینٹر چھوڑ دیا کیونکہ اس کی نجی پریکٹس اسے اجازت نہیں دیتی تھی کہ وہ سینٹر کو زیادہ وقت دے سکے۔این خوب صورت عورت تھی۔اس وقت بھی وہ نک سک سے تیار تھی۔کیون سے اس کا تعلق مختصر عرصے کے لیے رہا تھا اور وہ ایک دوسرے سے بے تکلف نہیں تھے بلکہ ان کے تعلق میں ہلکی سی سرد مہری تھی۔جانے کیوں کیون کو این کبھی اچھی نہیں لگی۔پھر اس سے پہلے کہ یہ سرد مہری ختم ہوتی یا بڑھتی، این سینٹر چھوڑ کر چلی گئی۔آج برسوں بعد کیون کو اس سے ملاقات کی ضرورت پیش آئی تھی۔
''تم نے اسے ریلیز کر دیا؟'' این نے اسے دیکھتے ہی الزام لگانے والے انداز میں کہا۔
''میں مطمئن ہوں کہ وہ اب کسی واقعے میں ملوث نہیں ہوگی۔'' کیون نے سرد لہجے میں کہا۔''ویسے بھی یہ میری ذمے داری ہے۔میں تم سے صرف یہ معلوم کرنے آیا ہوں کہ کیا تم نے علاج کے دوران اس میں کوئی خاص بات محسوس کی تھی؟''
این نے شانے ہلائے۔''کیا کہہ سکتی ہوں۔وہ صرف دو مہینے میرے پاس رہی تھی پھر میں نے سینٹر چھوڑ دیا۔ویسے وہ عام کیس ہے، بہت پیچیدہ نہیں ہے۔میرا خیال ہے کہ شوہر کے جیل جانے سے اس میں احساسِ عدم تحفظ پیدا ہوا اور اسی چیز نے اسے خودکشی پر اکسایا۔''
''پہلی بار اس نے بقائمی ہوش و حواس خودکشی کی کوشش کی تھی اور بعد میں دہشت زدہ ہو کر اس نے ایمرجنسی کو کال بھی کر دی تھی اسی وجہ سے اس کی جان بچی لیکن یہ واقعہ اس کی غائب دماغی کی حالت میں پیش آیا۔''
''لاشعور ہی خودکشی کا شائق ہوتا ہے۔'' این نے کہا۔''شعور کا جسم سے قریبی تعلق ہوتا ہے اس لیے وہ اسے نقصان پہنچانے والی کسی حرکت سے گریز کرتا ہے۔''
''یہ سب میں سائیکالوجی کے پہلے سال میں پڑھ چکا ہوں۔میں تم سے یہ معلوم کر رہا ہوں کہ کیا تم سے علاج کے دوران اس نے کبھی غائب دماغی کی شکایت کی؟''
این نے سر ہلایا۔''ایک دو بار... وہ چند منٹ کے لیے غیر حاضر ہوتی تھی۔''
''لیکن مجھ سے اس نے ایک بار بھی یہ شکایت نہیں کی جبکہ وہ مجھ سے معمولی معمولی باتیں بھی شیئر کرتی ہے۔''
''میں اس بارے میں کیا کہہ سکتی ہوں۔''
''کیا تم اسے کوئی دوا دیتی تھیں؟''
''معمولی سی دوائیں، جن سے ذہنی ٹینشن ریلیز ہوتی ہے لیکن ان دنوں ایک نئی دوا آئی ہے۔ایلمورا نامی اس دوا کے ابتدائی نتائج اچھے آئے ہیں۔خاص طور سے جن مریضوں کو غائب دماغی کی شکایت ہوتی ہے، ان کے لیے بہت اچھی ہے۔تم چاہو تو کیٹ کو دے سکتے ہو۔''
''میں دیکھوں گا۔'' کیون بولا۔''تمہاری مدد کا شکریہ۔''

☆☆☆

کیٹ نے تیار ہو کر جان سے پوچھا۔''کیسی لگ رہی ہوں؟''
''خوب صورت۔'' اس نے بے ساختہ کہا۔کیٹ سچ مچ اس پارٹی ڈریس میں بہت دلکش لگ رہی تھی۔البتہ اس کے چہرے کے تاثرات میں ہچکچاہٹ تھی۔
''میں بہت عرصے بعد کسی تقریب میں شریک ہو رہی ہوں۔اپنی شادی کے بعد پہلی تقریب میں۔''
جان اس کے پاس آیا۔''ڈیئر! یہ صرف آغاز ہے اور مجھے امید ہے کہ تم ایسی بہت سی پارٹیوں میں شریک ہوگی اور وہاں سب کی توجہ کا مرکز رہوگی۔''
کیٹ نے کچھ کہا نہیں، وہ صرف سر ہلا کر رہ گئی۔اس

کی کار مرمت کے لیے ورکشاپ میں تھی۔ جان نے ایک تقریباً نئی کار لی تھی۔ وہ اسی پر کارل کے گھر روانہ ہوئے۔ کارل میڈیسن سے کچھ فاصلے پر عالی شان اسٹیٹ میں رہتا تھا۔ وسیع رقبے پر پھیلی اس اسٹیٹ میں بہترین سہولتیں تھیں۔ یہاں پارٹیوں کے لیے ایک پوری عمارت مخصوص تھی۔ جان اور کیٹ وہاں پہنچے تو کارل اور جوزف خود ان کے استقبال کے لیے باہر موجود تھے۔ کارل کے ساتھ اس کی بیوی تھی اور جوزف کے ساتھ اس کی تازہ ترین گرل فرینڈ تھی۔ وہ دونوں گرم جوشی سے کیٹ سے ملیں۔ کارل اور جوزف نے اس کی دل کھول کر تعریف کی لیکن کیٹ خوش نہیں ہوئی۔ اس کے بجائے اس کے چہرے پر گھبراہٹ سی تھی۔ جان نے یہ بات محسوس کی اور اس نے کیٹ کو مشورہ دیا۔ ''میرا خیال ہے کہ تم کوئی ڈرنک لے لو۔''

کیٹ نے سر ہلایا اور بار کی طرف بڑھ گئی۔ اس نے وہاں موجود لڑکی سے کہا۔ ''مجھے ایک کاک ٹیل دینا اور واش روم کس طرف ہے؟''

لڑکی نے عقب کی طرف اشارہ کیا۔ کیٹ واش روم کی طرف گئی۔ واپس آئی تو اس کی گھبراہٹ میں اضافہ ہو گیا تھا اور اس کی آنکھیں دھندلا رہی تھیں۔ وہ اپنا گلاس لے کر نزدیک ہی اسٹینڈنگ ٹیبل کے ساتھ آ گئی۔ وہ سر جھکائے کھڑی تھی کہ جوزف کی گرل فرینڈ کارلا اس کے پاس آئی۔ ''تم پہلی بار کارل کی پارٹی میں آئی ہو؟''

کیٹ نے کچھ کہے بغیر سر ہلایا تو اس کے آنسو ڈھلک کر رخسار پر آ گئے۔ کارلا تشویش زدہ ہو گئی۔ ''تم ٹھیک تو ہو؟''

کیٹ نے سر ہلایا اور گھٹی ہوئی آواز میں بولی۔ ''کیا تم جان کو بلا سکتی ہو... پلیز؟''

''میں ابھی اسے بھیجتی ہوں۔'' کارلا بولی اور تیزی سے اس طرف بڑھی جہاں جان، کارل اور جوزف دوسرے لوگوں کے ساتھ گفتگو کر رہے تھے۔ اس کے جاتے ہی کیٹ لڑکھڑاتے قدموں سے ہال کے پچھلے حصے میں واقع ٹیرس کی طرف بڑھی۔ وہ یوں گہرے گہرے سانس لے رہی تھی جیسے اس کا دم گھٹ رہا ہو۔ جان وہاں آیا اور پھر اسے دیکھتے ہی... ٹیرس کی طرف لپکا۔

''کیٹ! کیا ہوا؟''

وہ پلٹ کر اس کے سینے سے لگ گئی اور سسکتے ہوئے بولی۔ ''پلیز مجھے یہاں سے لے چلو... میں یہ نہیں کر سکتی پلیز۔''

''آرام سے ڈیئر...... آرام سے۔'' جان نے نرمی سے کہا۔ کیٹ کو لرزتے دیکھ کر اس نے اپنا کوٹ اتار کر اسے پہنا دیا۔ وہ اسے بازو میں لے کر ہال میں لایا اور بیرونی دروازے کی طرف بڑھا تو سب اسے دیکھ رہے تھے۔ مگر جان کسی کی طرف توجہ دیے بغیر کیٹ کے ساتھ باہر آیا اور وہ گاڑی میں بیٹھ کر گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ کیٹ گہری سانسوں اور سسکیوں کے درمیان بار بار اس سے معافی مانگ رہی تھی۔ جان اسے تسلی دے رہا تھا۔

''کوئی بات نہیں، تم بہت عرصے بعد کسی تقریب میں آئی تھیں اس لیے ایسا ہو سکتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جلد تم اس کی عادی ہو جاؤ گی بلکہ پارٹیوں میں شرکت کی منتظر رہا کرو گی۔''

کیٹ نے اپنے آنسو صاف کیے۔ ''سچ کہہ رہے ہو؟''

''ہاں، مجھے یقین ہے۔''

''کیا میں ڈاکٹر پیکارڈ کو اس بارے میں بتاؤں؟''

''بالکل، یہ ضروری ہے جبکہ کل تمہیں اس سے ملنا بھی ہے۔'' جان نے تائید کی۔ پھر وہ کارل کو کال کر کے اس سے معذرت کرنے لگا۔

☆☆☆

کیون دفتر کے باہر عمارت کی لابی میں رینی کا منتظر تھا۔ وہ شاپنگ کر کے آ رہی تھی اور پھر وہ اسے لے کر ایرن کو لینے جاتا۔ رینی آئی تو کیون نے ساتھ میں رکھا اپنا کوٹ اٹھاتے ہوئے پہنا اور اس کی طرف بڑھا تھا کہ ٹھٹک گیا۔ رینی کے پیچھے کیٹ بھی اندر آئی تھی۔ آج کیٹ کا اپائنٹ منٹ تھا لیکن وہ مقررہ وقت پر نہیں آئی تھی۔ کیون کو دیکھتے ہی وہ بے قراری سے اس کی طرف بڑھی۔ رینی اور وہ ساتھ ساتھ پہنچے تھے۔ کیون ذرا کنفیوز ہوا کہ پہلے کس سے بات کرے لیکن اس نے رینی کو پیار کر کے کیٹ کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر پریشانی تھی۔ کیون نے کہا۔

''ہیلو کیٹ... آج تم وقت پر نہیں آ سکیں؟''

''کیون! میں بہت پریشان ہوں۔'' کیٹ نے خلافِ معمول اسے ڈاکٹر یا مسٹر پیکارڈ نہیں کہا تھا۔ پہلی بار اس نے اسے براہِ راست نام سے مخاطب کیا تھا۔ ''پلیز! کیا تم مجھے دو منٹ دے سکتے ہو؟''

کیون ہچکچایا۔ ''اس وقت...؟ ابھی میں اپنے بیٹے کو اسکول سے لینے جا رہا ہوں۔''

''پلیز... پلیز کیون...'' کیٹ روہانسی ہو گئی تھی۔ ''مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ مجھ سے صرف دو منٹ بات کر لو۔''

رینی نے عجیب سی نظروں سے کیون کو دیکھا اور

بولی۔ ''ہم لیٹ نہ ہو جائیں۔''

''میں زیادہ وقت نہیں لوں گی۔'' کیٹ نے التجا کی۔ ''تم جانتے ہو میں نے پہلے بھی تمہارا زیادہ وقت نہیں لیا۔''

کیون نے کلائی کی گھڑی دیکھی۔ ''نہیں ابھی وقت ہے، ریِنی! تم بیٹھو میں ابھی آتا ہوں۔''

رینی نے احتجاج کا ارادہ کیا لیکن کیون اس کی طرف دیکھے بغیر کیٹ کا بازو تھام کر بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ وہ اسے سڑک پار ایک ریسٹوران میں لایا اور وہ دونوں ایک صوفے پر بیٹھ گئے۔ کیٹ اس کے ساتھ ایک پاؤں اوپر کر کے بیٹھ گئی۔ منی اسکرٹ میں اس کی سڈول ٹانگیں نمایاں تھیں۔ اس نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''میں سوری کرنا چاہتی تھی کہ میں وقت پر نہیں آسکی۔ میں شاپنگ کرنے چلی گئی تھی۔''

اس نے برابر میں رکھے سفید بڑے شاپر سے ایک سرخ چھوٹا شاپر نکالا جس میں عام طور سے سوٹ پیک ہوتے ہیں۔ اس نے شاپر کیون کو پکڑا دیا۔ اس نے شاپر تھاما اور بولا۔ ''ٹھیک ہے تم شاپنگ پر چلی گئی تھیں پھر...''

کیٹ نے شاپر واپس لے لیا۔ ''میں بہت پریشان ہوں۔ کل جان مجھے پارٹی میں لے گیا اور وہاں مجھے وہی مسئلہ ہونے لگا۔ مجھے لگا کہ میرا سانس رک جائے گا۔''

کیٹ نے کہتے ہوئے کیون کا ہاتھ تھام لیا اور یوں آگے جھک آئی کہ اس سے بہت قریب ہو گئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ''پتا نہیں کیا بات ہے، میں خود کو بہت اکیلا محسوس کرتی ہوں۔''

کیون نے اپنا ہاتھ چھڑا کر گھڑی دیکھی اور معذرت خواہانہ لہجے میں بولا۔ ''سوری کیٹ! مجھے اپنے بیٹے کو اسکول سے لینا ہے اور اس میں دیر ہو رہی ہے۔ ایسا کرو تم کل دفتر آجاؤ۔''

خلافِ توقع کیٹ نے اصرار نہیں کیا اور کھڑی ہو گئی۔ ''میں تمہاری شکر گزار ہوں کہ تم نے میری بات سنی۔''

''کل ملیں گے۔'' کیون نے مسکرا کر کہا اور باہر کی طرف بڑھ گیا مگر اس کی تیز رفتار ڈرائیونگ کے باوجود وہ تاخیر سے اسکول پہنچے تھے جب چھٹی کے بعد تمام بچے جا چکے تھے اور اکیلا ایرن ہراساں کھڑا تھا۔ وہ ایرن اور رینی کو لے کر گھر پہنچا تو رینی کا موڈ خراب تھا۔ اس نے تلخ لہجے میں کہا۔

''کیا ضروری تھا اس پاگل عورت سے بات کرنا۔''

''وہ میری مریضہ ہے۔'' کیون نے فریج سے پانی کی بوتل نکالتے ہوئے کہا۔

''لیکن وہ بغیر اپائنٹ منٹ کے آئی اور تمہیں پکڑ کر لے گئی۔''

''یہ اتفاق تھا، اسے ذہن پر زیادہ سوار مت کرو۔''

''لیکن اس کی وجہ سے ایرن کو انتظار کرنا پڑا۔ وہ اسکول میں اکیلا رہ گیا تھا۔'' رینی تیز لہجے میں بولی۔

''خدا کے لیے اب تم اسے نفسیاتی مسئلہ مت بناؤ اور نہ بڑھا کر بیان کرو۔ بچے چلے گئے تھے لیکن اسکول کا اسٹاف تو موجود تھا اور کسی بھی موقع پر وہ ایرن کو اکیلا نہیں چھوڑتا۔'' کیون نے کہا اور گلاس پٹخ کر دفتر کے لیے روانہ ہو گیا۔ اگلے دن کیٹ آئی۔ اس نے اپنی کیفیت بہت تفصیل سے بیان کی۔ اس نے شکایت کی کہ اسے ایک دو بار پھر غائب دماغی کا سامنا کرنا پڑا۔ اس نے کہا۔

''پلیز ڈاکٹر! مجھے کوئی دوا دو تاکہ میں اس اذیت سے بچ سکوں۔ مجھے بہت خوف آتا ہے جب میں غائب دماغی کے بعد ہوش میں آتی ہوں اور مجھے لگتا ہے کہ اس دوران میں، میں کسی حادثے سے بال بال بچی ہوں۔''

کیون کو اس دوا ایلمورا کا خیال آیا جو این نے بتائی تھی۔ کیون نے پہلے اپنے لیپ ٹاپ پر اس دوا کے بارے میں معلوم کیا اور مطمئن ہو کر کیٹ کو یہ دوا تجویز کر دی۔ اس نے کہا۔ ''تم اس کی ہلکی خوراک لینا اور دو دن بعد مجھے بتانا۔''

کیٹ نے سر ہلایا۔ ''کیا اس سے مجھے فائدہ ہوگا؟''

''امکان ہے، یہ دوا ابھی نئی آئی ہے اور اس کے نتائج حوصلہ افزا ہیں۔''

کیٹ کھڑی ہو گئی پھر اس نے کہا۔ ''میں تمہاری شکر گزار ہوں ڈاکٹر...... کل میں بہت نروس تھی اس لیے بغیر وقت لیے تمہارے پاس آگئی۔ مجھے امید ہے کہ تمہاری بیوی نے برا نہیں مانا ہوگا۔''

جواب میں کیون صرف مسکرا دیا۔ وہ کیٹ کو کیا بتاتا کہ رینی نے کتنا برا منایا تھا۔

☆☆☆

جان کی آنکھ کھلی تو کیٹ بستر پر نہیں تھی۔ وہ چونک کر اٹھا تو اس نے دیکھا کہ کیٹ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی ہے اور میک اپ کر رہی ہے۔ اس نے لپ اسٹک لگائی پھر گلے میں ہار پہنا۔ جان نے اسے آواز دی۔ ''کیٹ! کیا کر رہی ہو؟''

لیکن اس نے کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا۔ وہ خاموشی

سے اٹھی اور آ کر بستر پر دراز ہوگئی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور ایسا لگ رہا تھا، وہ سو چکی ہے۔ جان کچھ دیر حیرت سے اسے دیکھتا رہا پھر خود بھی سو گیا۔ اگلی صبح اسے کارل اور جوزف سے مل کر بزنس میں شرکت کا معاملہ طے کرنا تھا۔ یہ اس کے لیے اہم دن تھا۔ وہ گہری نیند سونا چاہتا تھا تاکہ اگلی صبح تازہ دم اٹھے۔ مگر کچھ دیر بعد لاؤنج سے ڈی وی ڈی پلیئر سے تیز میوزک کی آواز آئی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھا تو کیٹ پھر غائب تھی۔ اس نے چلا کر کہا۔ ”کیٹ! میوزک بند کرو، یہ آدھی رات کا وقت ہے۔“

جب کیٹ کی طرف سے کوئی جواب نہیں ملا تو وہ اٹھ کر لاؤنج میں آیا۔ اس نے پلیئر آف کیا اور کچن کی طرف بڑھا جہاں کیٹ ناشتے کی تیاری کر رہی تھی۔ جان نے اسے آواز دی، اس بار بھی کیٹ نے کوئی ردعمل ظاہر نہیں کیا۔ تب جان نے دیکھا اس کا چہرہ بے تاثر تھا اور آنکھیں جیسے گہری نیند میں تھیں۔ وہ کیٹ کے پاس آیا۔ اس کے ہاتھ سے ڈبل روٹی لے کر رکھ دی اور پھر اسے بیڈ روم میں لے آیا۔ اس نے مزاحمت نہیں کی اور جب جان نے اسے بستر پر لٹایا تو وہ خاموشی سے لیٹ کر سو گئی۔ اگلی صبح وہ جاگی تو اسے کچھ یاد نہیں تھا۔ جان نے اسے بتایا کہ وہ رات میں کیا کرتی رہی تھی۔ کیٹ پریشان ہوگئی۔ ”میرے خدا! میں غائب دماغی سے پریشان تھی اور اب میں نے نیند میں چلنا پھرنا اور کام کرنا بھی شروع کر دیا ہے۔“

جان نے کیون پیکارڈ کو کال کی اور اسے کیٹ کی کیفیت بتائی۔ وہ بھی پریشان ہوگیا۔ اس نے کیٹ سے بات کی اور اس کی پوری کیفیت سننے کے بعد کہا۔ ”تم نے ایلورا کتنی لی ہے؟“

”مجھے یاد نہیں ہے، شاید میں نے دو گولیاں لی تھیں۔“

”میں نے تمہیں ایک گولی کا کہا تھا۔“ کیون فکرمند ہوگیا۔ ”اب تم فوری طور پر اس کا استعمال ترک کر دو۔“

”لیکن اس سے مجھے فائدہ ہوا ہے۔ مجھے اتنا ذہنی سکون ملا ہے کہ میں بتا نہیں سکتی۔“ کیٹ نے احتجاج کیا۔ ”تم کہہ رہے ہو کہ میں یہ دوا چھوڑ دوں؟“

”ہاں کیونکہ میں ڈاکٹر ہوں۔“ کیون نے جواب دیا۔ ”ایسا کرو تم کل مجھ سے ملو۔“

کیٹ کا موڈ خراب ہوگیا۔ اس نے جان کو ناشتا بنا کر دیا لیکن خود نہیں کیا۔ جان نے روانگی سے پہلے اسے بتایا۔ ”آج معاملات طے پا جائیں گے اور میں ایک بار پھر کارل اور جوزف کا پارٹنر بن جاؤں گا۔“

کیٹ کی آنکھوں میں خواب اتر آئے۔ ”پھر ہم اسی گھر میں جا سکیں گے۔“

”اس گھر میں نہیں، اس سے بھی اچھے گھر میں۔“ جان نے کہا اور روانہ ہوگیا۔ اس کا یہ دن بہت مصروف گزرا تھا۔ کارل اور جوزف کے ساتھ اسے وکیل کے دفتر اور پھر عدالت جانا پڑا تھا لیکن شام تک سارے کام احسن انداز میں ہوگئے اور جان دوبارہ سے بزنس میں شریک ہوگیا۔ وہ اس موقع کو کیٹ کے ساتھ منانا چاہتا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ کہیں باہر جائیں لیکن کیٹ کی حالت ایسی نہیں تھی اس لیے وہ اس کے لیے بوکے، شیمپین کی بوتل اور چاکلیٹ کا ڈبا لایا۔ وہ گھر میں داخل ہوا تو کیٹ کہیں دکھائی نہیں دی۔ اس نے آواز دی۔ ”کیٹ! کہاں ہو؟ تمہارے لیے ایک خوشخبری ہے۔“

کیٹ کی طرف سے جواب نہیں آیا تو وہ کچن کی طرف بڑھا۔ وہاں کیٹ کاؤنٹر کے سامنے کھڑی چھری سے سبزی کاٹ رہی تھی۔ تختے پر کٹے ٹماٹروں اور سلاد کا ڈھیر لگا ہوا تھا اور کیٹ مزید کاٹے جا رہی تھی۔ جان تیزی سے اس کی طرف بڑھا۔ ”کیٹ! کیا کر رہی ہو؟“

جیسے ہی اس نے کیٹ کو ہاتھ لگایا، وہ مشینی انداز میں گھومی اور اس نے چاقو جان کے بائیں پہلو میں عین دل کے مقام پر اتار دیا۔ وہ لڑکھڑا کر پیچھے ہٹا۔ کیٹ کے ہاتھ میں دبے چاقو کا سرا تین انچ تک سرخ ہو رہا تھا۔ یعنی چاقو دل میں اتر گیا تھا۔ پیچھے ہوتے ہوئے جان نیچے گرا اور اس نے ڈوبتی آواز میں کیٹ سے کہا۔ ”ایمرجنسی کو کال کرو... پلیز... ایمرجنسی کو کال کرو۔“

کیٹ ساکت کھڑی اسے دیکھ رہی تھی۔ جب جان کا جسم نزع کی کیفیت میں جھٹکے کھا رہا تھا، وہ آرام سے اس کے پاس سے ہوتی ہوئی بیڈ روم میں جا کر لیٹ گئی۔ سائڈ کی دراز میں ایلورا کی کھلی شیشی پڑی تھی۔

☆☆☆

کیون گھر میں ڈنر کر رہا تھا جب اسے یہ خبر ملی اور جب اس نے عجلت میں تیار ہوتے ہوئے رینی کو بتایا تو اس کا چہرہ ستا گیا۔ اس نے کیون سے کہا۔ ”جب میں نے اس عورت کو دیکھا تھا تب ہی مجھے لگ رہا تھا، وہ کچھ کر گزرے گی۔ اس نے تمہیں بھی مشکل میں ڈال دیا ہے۔ تم نے اسے اسپتال بھیجنے کے بجائے ریلیز کر دیا تھا۔“

”یہ باتیں قبل از وقت ہیں۔“ کیون نے نرمی سے

کہا اور کار کی چابی اٹھاتا ہوا باہر نکل گیا۔ بیس منٹ بعد وہ اسپتال میں کیٹ کے سامنے تھا۔ اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں اور مسلسل رونے سے اس کی ناک سرخ ہوگئی تھی۔ کیون نے نرمی سے پوچھا۔ ''کیٹ! یہ سب کیسے ہوا؟''

''میں نہیں جانتی۔'' وہ بلبلا کر رو دی۔ ''میں سو رہی تھی جب میں اٹھی تو میں نے جان کو فرش پر پڑے دیکھا۔ وہ ساکت تھا اور خون پھیلا ہوا تھا۔''

کیٹ کی حالت سے لگ رہا تھا کہ اسے علاج کی ضرورت ہے۔ کیون نے اسے ڈاکٹر کے سپرد کیا اور خود پولیس افسر لوتھر برٹن کے پاس آیا۔ وہ اس کیس کا انچارج تھا۔ اس نے کیون سے تعارف کے بعد اسے بتایا کہ عمارت کے مکینوں نے کیٹ کی چیخیں سن کر پولیس کو کال کی پھر کیٹ نے بھی نائن ون ون کو کال کی تھی۔ وہ ہسٹریا کا شکار تھی اور آپریٹر کو بڑی مشکل سے اس کی بات سمجھ میں آئی تھی۔ ایک پولیس کار موقع پر پہنچی اور پولیس افسران نے اپارٹمنٹ میں جان کو مردہ حالت میں فرش پر پڑے پایا۔ دس منٹ بعد ایمبولینس اور طبی عملہ بھی آ گیا تھا۔ ڈاکٹر نے جان کو مردہ قرار دے دیا اور اس کی لاش اسپتال منتقل کر دی گئی تھی۔ لوتھر نے کیون سے کہا۔

''ابتدائی تفتیش سے لگتا ہے کہ جان کو کچن کی چھری سے قتل کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر نے مسز جان کے ہاتھ پر خون کے ہلکے نشانات پائے ہیں اور چھری پر فنگر پرنٹس بھی موجود ہیں۔ جلد ان کا موازنہ مسز جان کے فنگر پرنٹس سے کیا جائے گا۔''

''سنو آفیسر! وہ نفسیاتی مریضہ ہے۔''

''پولیس کو اس سے کوئی غرض نہیں ہے کہ وہ عام انسان ہے یا نفسیاتی مریضہ ہے۔'' لوتھر کا لہجہ خشک ہو گیا۔ ''ہمارا کام کیس کی تفتیش کر کے ملزم کو مع ثبوت اور گواہوں کے عدالت میں پیش کرنا ہے۔ اس کے بعد یہ معاملہ عدالت، وکیلِ صفائی اور اٹارنی آفس کے ہاتھ میں چلا جائے گا۔''

''لیکن ایک مریضہ ہونے کے ناتے تم کو اسے رعایت دینا ہوگی۔'' کیون نے اصرار کیا۔

''مجھے اس سے انکار نہیں ہے۔'' لوتھر اس بار بدلے ہوئے لہجے میں بولا۔

اگلے دن تک صورتِ حال واضح ہوگئی تھی کہ قتل کیٹ نے کیا ہے۔ چھری پر اس کی انگلیوں کے نشان تھے اور اس کے ہاتھ پر لگا خون بھی جان کا ثابت ہوا تھا۔ اپارٹمنٹ کا دروازہ اندر سے بند تھا اور کسی زبردستی کے آثار بھی نہیں پائے گئے تھے۔ پولیس نے کیٹ کو اسپتال سے حراستی جیل منتقل کر دیا تھا۔ پولیس نے قتلِ عمد کا چارج لگایا تھا۔ بدقسمتی سے اسپتال کے ماہر نفسیات نے کیٹ کی بات ماننے سے انکار کر دیا تھا اور اسی وجہ سے لوتھر نے اس پر سخت چارج لگا دیا تھا۔ بہر حال معاملہ اب عدالت میں جانے والا تھا۔ میڈیا اس کیس میں خاص دلچسپی لے رہا تھا کیونکہ اس میں دلچسپی کے لوازمات بہت زیادہ تھے۔ اول کیٹ ایک مستند نفسیاتی مریضہ تھی۔ دوسرے جان ایک سزا یافتہ شخص تھا۔

پھر کیون پیکارڈ بھی میڈیا کی توجہ کا مرکز تھا کیونکہ جس وقت کیٹ کو حراستی جیل منتقل کیا جا رہا تھا، وہ اس کے ساتھ تھا اور جب کیٹ کو پولیس اندر لے گئی تو کیون نے بعض رپورٹرز کے سوالوں کے جوابات دیے۔ اس نے کیٹ کا دفاع کرتے ہوئے اسے بے گناہ قرار دیا مگر ایک سوال پر وہ پھنس گیا۔ رپورٹرز نے کیٹ کی سابق ہسٹری کی کھوج نکالا تھا اور اس میں کیون نے کیٹ کو تشدد پسند رجحانات سے عاری قرار دیا تھا۔ اس کا مطلب تھا وہ کسی دوسرے کے لیے نقصان دہ نہیں تھی۔ ''تو کیا کیٹ نے اپنے شوہر کو قتل کر کے ثابت نہیں کر دیا کہ تمہارا فیصلہ غلط تھا؟'' ایک رپورٹر نے چیلنج کرتے ہوئے کہا۔ ''یہی نہیں، وہ دو بار خودکشی کی کوشش بھی کر چکی تھی۔''

''یہ میرا فیصلہ تھا اور میں اس کی ذمے داری قبول کرتا ہوں لیکن میرا اب بھی یہی کہنا ہے کہ وہ بے قصور ہے۔ اس نے جو کیا، شعوری کیفیت میں نہیں کیا۔''

اس پر رپورٹرز کی طرف سے سوالات کی ایک بوچھاڑ آئی تھی اور کیون نے محسوس کیا کہ اس موقع پر اسے زیادہ بولنے سے گریز کرنا چاہیے۔ وہ رپورٹرز سے معذرت کرتا ہوا روانہ ہوگیا۔ ایرن کو اسکول سے لینے کا وقت ہوگیا تھا۔ وہ اسے لے کر گھر چھوڑنے آیا تو رینی ٹی وی کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے اسکرین پر دکھائے جانے والے منظر کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہ اچھا نہیں ہو رہا ہے۔''

''کیا اچھا نہیں ہو رہا ہے؟'' کیون کا لہجہ تیز ہوگیا۔

''تم ایک دلدل میں اتر گئے ہو۔'' رینی نے اس کی طرف دیکھا۔ ''جتنی جلدی اس دلدل سے باہر آجاؤ، تمہارے لیے بہتر ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''کیون! تم اس کیس سے دست بردار ہو جاؤ۔ تمہاری مریضہ نے اپنے شوہر کو قتل کیا ہے اور جلد پولیس یہ بات ثابت بھی کر دے گی۔ تب تم بھی اس کی لپیٹ میں آؤ گے۔''

کیون نے تردید کی۔ ''کیٹ قاتل نہیں ہے، اس نے جو کچھ کیا وہ ایک مخصوص ذہنی کیفیت میں کیا۔''

رینی نے اصرار کیا۔ ''تب بھی ذمے دار تم قرار پاؤ گے۔ یہ تمہارا فرض تھا کہ اسے اسپتال بھیجتے نہ کہ اسے رعایت دیتے۔''

''پلیز رینی! یہ تمہارا مسئلہ...''

''یہ میرا مسئلہ ہے اور ایرن کا بھی ہے۔'' رینی کا لہجہ تند ہو گیا تھا۔ ''ہمیں لوگوں کا سامنا کرنا ہوگا۔ جو بار بار ہمیں بتائیں گے کہ تمہاری غلطی سے ایک شخص موت کی نیند سو گیا۔''

''او کے، اگر میں اس سے دست بردار ہو جاتا ہوں تو کیا میری بچت ہو جائے گی؟''

''مشکل ہے۔'' رینی نے اعتراف کیا۔ ''مگر اس سے مزید دوسرے مسائل پیدا نہیں ہوں گے۔''

''یہ تمہارا خیال ہے۔ مسائل سے آنکھیں بند کر لینے سے وہ ختم نہیں ہو جاتے ہیں۔ ان کا سامنا کیا جاتا ہے، تب مسائل ختم ہوتے ہیں۔''

رینی نے محسوس کیا کہ کیون فیصلہ کر چکا ہے، اس کا لہجہ نرم پڑ گیا۔ ''پلیز کیون! تم پھر سوچو۔''

''میں سوچ چکا ہوں۔ اگر میں نے پہلے غلطی کی ہے تب بھی یہ میری ذمے داری ہے کہ اسے تبھاؤں اور اسے ٹھیک کرنے کی کوشش کروں..... لیکن تم دوسروں سے پہلے سوچ رہی ہو کہ میں غلطی پر ہوں۔'' کیون کا لہجہ یہ سب کہتے ہوئے زہریلا ہو گیا تھا اور وہ گھر سے نکل آیا۔ رینی اسے آوازیں دیتی رہ گئی تھی۔ دو دن بعد پولیس نے کیس عدالت میں پیش کر دیا اور وہاں وکیلِ صفائی البرٹ نے اس سے تعاون مانگا۔ اس نے کیون سے پہلی میٹنگ میں کہا۔

''اگر ہم ثابت کر دیں کہ کیٹ نے جس وقت قتل کیا، وہ اپنے حواس میں نہیں تھی، تب ہی ہم اسے بچا سکتے ہیں۔''

البرٹ، کیٹ کی میڈیکل ہسٹری جاننا چاہتا تھا اور کیون نے اسے تفصیل سے کیٹ کے بارے میں بتایا۔ البرٹ ایلمورا کے بارے میں سن کر چونکا تھا۔ اس نے جلدی سے پوچھا۔ ''کیا یہ دوا اس کیفیت کی وجہ ہو سکتی ہے؟''

کیون ہچکچایا۔ ''شاید... مگر اسے عدالت میں ثابت نہیں کیا جا سکتا۔''

البرٹ کو کیون سے زیادہ اپنی موکلہ کی فکر تھی اس لیے اس نے کیون کے اعتراض کے باوجود ایلمورا کا ذکر اپنے دلائل میں شامل کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے کیون سے کہا۔ ''پولیس رپورٹ میں بھی اس کا ذکر ہے۔ کیٹ کے... بیڈ روم میں اس کی کھلی ہوئی شیشی موجود تھی اور جب اسے اسپتال لے جایا گیا تو وہ ایک خاص کیفیت میں تھی۔''

''میرا خیال ہے کہ اس سے ہمیں اتنی مدد نہیں ملے گی۔'' کیون نے کمزور لہجے میں کہا تو البرٹ مسکرایا۔

''اس کے برعکس میرا خیال ہے کہ اس سے ہمیں بہت مدد ملے گی۔''

کیون نے محسوس کیا کہ رینی کی بات درست ثابت ہو رہی تھی۔ وہ ایک دلدل میں پھنس گیا تھا اور اس میں دھنستا جا رہا تھا۔ حسب توقع عدالت میں جیسے ہی دوا کا معاملہ سامنے آیا۔ ڈسٹرکٹ اٹارنی اور دوسرے چونک گئے۔ اس دن کیون کو بہت سے کڑے سوالات کا سامنا کرنا پڑا۔ اس سے پوچھا گیا کہ اس نے کس بنیاد پر یہ دوا کیٹ کو تجویز کی تھی اور کیا اس نے اس دوا کے بارے میں باقاعدہ واقفیت حاصل کی تھی؟ کیون نے این کا ذکر نہیں کیا لیکن عدالت سے نکلتے ہی اس نے سب سے پہلے این سے رابطہ کیا۔

''میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں۔''

''کس سلسلے میں؟''

''تم نے کیٹ کے لیے ایلمورا تجویز کی تھی۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ تم نے کس بنا پر اس دوا کا نام لیا تھا اور اس کے بارے میں تم کیا جانتی ہو؟''

''میں اس کے بارے میں وہی جانتی ہوں جو تم جانتے ہو۔''

کیون حیران ہوا۔ ''کیا مطلب؟ کیا تم نے آج تک اس دوا کو خود تجویز نہیں کیا؟''

''نہیں، میں نے تو سنا تھا۔''

''لیکن تم نے مجھے مشورہ تو دیا تھا۔''

''مسٹر پیکارڈ۔'' این کا لہجہ سرد ہو گیا۔ ''میں نے مشورہ دیا تھا لیکن اس پر عمل تمہاری ذمے داری تھی اور تم مجھے اس میں شامل نہیں کر سکتے۔''

''میں تمہیں شامل نہیں کر رہا ہوں لیکن تم کیٹ کی معالج رہ چکی ہو اگر تم عدالت میں...''

''سوری مسٹر پیکارڈ! میں اس معاملے میں مزید شامل ہونا نہیں چاہتی۔'' این نے کہتے ہوئے کال کاٹ دی۔ اس کا جواب واضح تھا اور این کے انکار کے بعد اب ساری ذمے داری اس پر آنے والی تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ پہلے اسے اس دوا کے بارے میں معلوم کرنا چاہیے۔ اس نے انٹرنیٹ پر ایلمورا کے حوالے سے سرچنگ شروع کی۔ جب

وہ ری ویو پر گیا تو خاصے ہولناک انکشافات سامنے آئے۔ ابتدائی تحقیق کے مطابق ایلمورا کے سائڈ ایفیکٹس بہت زیادہ تھے۔ ان میں تشدد کا رجحان، غائب دماغی اور نیند کی حالت میں افعال شامل تھے۔ چند گھنٹوں کی سرچنگ سے جو تصویر سامنے آئی، وہ اچھی نہیں تھی۔ ایلمورا مریضوں میں شدید تشدد اور جذباتی تغیر کے رجحانات پیدا کرتی تھی۔ مریض بہ ظاہر پرسکون رہتا تھا لیکن اندر سے وہ بہت زیادہ ہیجان کا شکار ہوتا اور نیند کی کیفیت میں وہ ایسے کام کر سکتا تھا جن کی اس سے توقع نہیں کی جاتی ہو۔ اس نے دوبارہ این کا نمبر ملایا اور جیسے ہی اس نے کال ریسیو کی، وہ پھٹ پڑا۔

''تم نے مجھے گمراہ کیا، مجھے کیٹ کو ایسی دوا استعمال کرانے کا مشورہ دیا جس کے سائڈ ایفیکٹ بہت زیادہ ہیں۔''

''میں نے صرف مشورہ دیا تھا اس پر عمل تم نے کیا اور جہاں تک سائڈ ایفیکٹس کا تعلق ہے، وہ ہر دوا کے ہوتے ہیں۔ یہی بات ہے، میں نے اس بارے میں سنا تھا، خود سے جاننے کی کوشش نہیں کی تھی۔''

''اس کے باوجود تم نے مجھے اس کے استعمال کا مشورہ دے دیا۔'' کیون نے تلخی سے کہا۔ ''تم جانتی ہو، اس کا اثر مجھ پر کیا پڑے گا؟''

''نہیں، میں نہیں جانتی اور نہ ہی جاننا چاہتی ہوں اس لیے اب مجھے دوبارہ فون مت کرنا۔'' این نے کہتے ہوئے کال کاٹ دی۔ اس وقت کیون سمجھ رہا تھا کہ یہ قسمت ہے جو اس کے آڑے آرہی ہے۔

☆☆☆

میڈیسن کاؤنٹی کے چیف میڈیکل آفیسر بریڈ کلوز نے کیون کی طرف دیکھا۔ ایک دن پہلے کیون کو اس کی طرف سے بلاوا آیا تھا اور وہ گزشتہ دس منٹ سے اپنے سامنے رکھی فائل دیکھ رہا تھا۔ بالآخر اس نے عینک اتاری اور کیون کی طرف متوجہ ہوا۔ ''مسٹر پیکارڈ! تم یقیناً سمجھ گئے ہوگے کہ تمہیں کیوں طلب کیا گیا ہے۔''

''بدقسمتی سے میں بالکل نہیں سمجھ سکا ہوں۔''

''حالانکہ تمہیں سمجھ جانا چاہیے تھا۔'' بریڈ کا لہجہ سرد ہو گیا۔ وہ تقریباً پچاس برس کا سیاہ فام تھا اور یقیناً بہت قابل آدمی تھا تب ہی اس عہدے تک پہنچا تھا۔ ''تم نے کیٹ کو ایک ایسی دوا تجویز کی جس کے سائڈ ایفیکٹ بہت زیادہ ہیں اور جلد اسے بین قرار دیا جانے والا ہے۔''

''میں اس کے سائڈ ایفیکٹس کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا۔'' کیون نے جواب دیا۔ ''کیونکہ ڈرگ ڈیپارٹمنٹ کی طرف سے اسے بین نہیں کیا گیا ہے، اس لیے میں نے اسے تجویز کردیا۔''

بریڈ نے اپنے سامنے رکھی فائل میں کچھ لکھا اور بولا۔ ''گویا تم اعتراف کررہے ہو کہ تم نے دوا تجویز کی؟''

''یقیناً، میں اس سے کیسے انکار کرسکتا ہوں۔ دوسرے میں نے کیٹ کو کم سے کم مقدار کا مشورہ دیا تھا۔ یہ مقدار چوبیس گھنٹے میں ایک گولی ہے جبکہ وہ اوور ڈوز لے رہی تھی۔''

''تم نے مشورہ تحریری دیا تھا؟''

''نہیں...''

''لیکن دوا کی تجویز تحریری ضرور دی تھی؟''

کیون نے محسوس کیا کہ وہ پھنس رہا تھا۔ اس نے یہ غلطی بھی کی تھی کہ دوا کی مقدار تحریر نہیں کی تھی اور کیٹ سے صرف زبانی کہا تھا کہ وہ کم سے کم مقدار استعمال کرے۔ بریڈ نے کیٹ کی فائل اٹھا کر ایک طرف رکھ دی اور ایک دوسری فائل اٹھائی اور اس کی ورق گردانی کرتے ہوئے کہا۔ ''مسٹر پیکارڈ! تمہاری گزشتہ پانچ سال کی مصروفیات سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ تم روزانہ تقریباً دس گھنٹے کام کرتے ہو۔ تم چار گھنٹے ری ہیبلی ٹیشن سینٹر کی جاب کو دیتے ہو۔ اس کا دورانیہ صبح آٹھ سے دوپہر بارہ بجے تک ہے پھر تم دو سے رات آٹھ بجے تک اپنے کلینک میں کام کرتے ہو۔'' بریڈ نے کہتے ہوئے فائل بند کر دی۔ ''کیا کام کے لحاظ سے یہ وقت بہت زیادہ نہیں ہے...... تم یقیناً بہت مصروف رہتے ہو؟''

''یہ درست ہے۔'' کیون نے اعتراف کیا۔ ''لیکن میرا ایک بچہ ہے جو پرائیویٹ اسکول میں پڑھتا ہے۔ میرا گھر قسطوں پر ہے۔ مجھے اضافی آمدنی کی ضرورت ہے۔''

''ٹھیک ہے لیکن کیا اس سے تم پر دباؤ نہیں آتا ہے اور فی مریض تمہارے پاس وقت کم نہیں ہوجاتا ہے، جیسے تم نے ایلمورا کے بارے میں جاننے کی کوشش نہیں کی۔''

کیون کچھ دیر خاموش رہا پھر اس نے آہستہ سے کہا۔ ''کیا میرے بارے میں کوئی فیصلہ ہوگیا ہے؟''

بریڈ نے سر ہلایا۔ ''مجھے افسوس ہے، فی الحال تمہیں سینٹر کی جاب سے روکا جارہا ہے۔''

کیون اس نوکری سے تقریباً چار ہزار ڈالرز ماہانہ کما رہا تھا اور یہ سوچ کر اس کا دل ڈوبنے لگا کہ اگر یہ پابندی چند

مہینے بھی جاری رہی تو اس کے لیے گھر کے اخراجات جاری رکھنا دشوار ہو جائے گا۔ کئی بار رینی نے اس سے اصرار کیا تھا کہ وہ اتنی محنت نہ کرے اور وہ اس کا ہاتھ بٹانے کے لیے جاب کر لیتی ہے مگر ہر بار کیون نے اسے منع کر دیا۔ وہ چاہتا تھا کہ رینی صرف گھر دیکھے، کمانا اس کی ذمے داری تھی اور وہ اسے پورا کر رہا تھا۔ اسے زیادہ کام کرنے میں مسئلہ نہیں تھا۔ وہ اس سے خوش تھا مگر بریڈ نے اسے احساس دلایا تھا کہ وہ اپنے پیشے سے انصاف نہیں کر رہا ہے۔ اس نے گہری سانس لی۔ ''اور یہ پابندی کب تک جاری رہے گی؟''

''جب تک کیٹ کے کیس کا فیصلہ نہیں ہو جاتا۔'' بریڈ نے کہا۔ ''مسٹر پیکارڈ! میں تمہیں بتا دوں اگر فیصلہ کیٹ کے حق میں آیا اور اسے نفسیاتی بنیادوں پر بری کیا گیا تو یہ تمہارے حق میں بہتر نہیں ہوگا۔ اس کا مطلب ہوگا کہ تم نے کیس کو ٹھیک سے ہینڈل نہیں کیا۔''

کیون بریڈ کے دفتر سے نکلا تو اسے یہ روشن دن بھی سیاہ لگ رہا تھا۔ بات صرف سینٹر کی جاب کی نہیں تھی، وہ پرائیویٹ پریکٹس کر کے اس سے زیادہ کما سکتا تھا لیکن ایک ماہر نفسیات کی حیثیت سے اس کی ساکھ پر جو سوالیہ نشان آجاتا، اس کے بعد کون اس کے کلینک آنا پسند کرتا۔ وہ تباہی کے بالکل پاس آ گیا تھا اور اگر بریڈ کی بات درست نکلتی تو اس تباہی کے آنے میں زیادہ وقت باقی نہیں رہا تھا۔

☆☆☆

''عدالت ملزمہ مسز بینسن کو نفسیاتی وجوہات کی بنا پر اس کیس سے بری کرتے ہوئے اس کا علاج کرانے کا حکم دیتی ہے۔ مسز بینسن اس وقت تک سرکاری تحویل میں رہے گی ... جب تک ڈاکٹر اسے صحت یاب قرار نہیں دے دیتے اور ایک عدالتی بورڈ اس کی توثیق نہیں کر دیتا۔'' جج نے کہتے ہوئے ہتھوڑا مار کے فیصلے پر مہر ثبت کی اور کھڑا ہو گیا۔ عدالت میں موجود تمام افراد اس کے احترام میں کھڑے ہو گئے اور جب جج اپنے چیمبر کی طرف چلا گیا تو لوگ اور میڈیا والے کیٹ اور اس کے وکیل صفائی البرٹ کی طرف دوڑے۔ البرٹ خوش تھا کہ اس نے ایک بہت مشکل اور پیچیدہ کیس میں کامیابی حاصل کی تھی۔ کیون عدالت میں موجود تھا اور ایک طرف خاموش کھڑا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ کیٹ اور البرٹ کے بعد اس کی باری آئے گی اور اسے رپورٹرز کے بہت سارے کڑوے سوالوں کے جوابات دینا ہوں گے۔ اس لیے اس نے خاموشی سے کھسک جانے کا فیصلہ کیا۔

کیس اب تک میڈیا پر موجود تھا اور تقریباً روز ہی کوئی نہ کوئی چینل اس پر تفصیلی خبر نشر کر رہا تھا۔ لازمی بات تھی کہ اس کا ذکر بھی آتا اور پھر یہ ذکر بھی آتا کہ اس نے کیٹ کو دوسری بار خودکشی کی ناکام کوشش کے باوجود اسپتال بھیجنے کے بجائے گھر بھیج دیا اور پھر اسے غلط ادویات دیں جن کی وجہ سے بالآخر اس نے اپنے شوہر کے قتل جیسا کام کر دیا۔ گزشتہ تین ہفتے میں کیون کی نجی پریکٹس آدھی رہ گئی تھی اور اس کے نصف مریضوں نے اس کے پاس آنے سے انکار کر دیا تھا۔ سینٹر کی جاب سے وہ پہلے ہی فارغ تھا اس لیے اب اس کے پاس وقت ہی وقت تھا۔ وہ گھر آیا تو رینی ایرن کو اسکول سے لے آئی تھی اور حسب معمول اس کا موڈ اس بات پر خراب تھا۔ وہ کیون کو دیکھ کر زہریلے لہجے میں بولی۔ ''دیکھ آئے اس حرافہ کو جسے دیکھے بغیر تمہیں چین نہیں آتا ہے۔''

کیون حیران ہوا۔ ''کیا... کیا کہا تم نے؟''

''وہی جو تم نے سنا ہے۔''

''سنو... وہ میرے لیے صرف ایک کیس ہے۔''

''تبھی تم صرف اس کے کیس کا فیصلہ سننے کے لیے ایرن کو لینے کے بجائے عدالت میں جا بیٹھے۔ جبکہ تمہارا وہاں کوئی کام نہیں تھا۔''

''میں کیٹ کا معالج ہوں، میرا وہاں کام تھا۔''

''اب بھگتنا۔'' رینی نے کہا اور تنتناتی ہوئی بیڈ روم میں چلی گئی۔

شام کے وقت ٹی وی سے اسے اندازہ ہوا کہ اب جان مرڈر کیس کو دوسرے زاویے سے لیا جا رہا تھا۔ مریضوں کے حقوق کی تنظیموں اور دواؤں کے صارفین کی تنظیموں نے احتجاج شروع کر دیا تھا اور ان کا مطالبہ تھا کہ ایسے ڈاکٹروں اور غیر تصدیق شدہ ادویات کے استعمال پر چیک رکھا جائے۔ کیون پیکارڈ پر الزام آ رہا تھا کہ اس نے کیٹ کا مسئلہ سمجھے بغیر اسے ایک ایسی دوا دے دی جس نے اس کے اندر تشدد اور جارحیت کے رجحانات کو ابھارا۔ اس کے اثرات نیند میں چلنے اور کام کرنے کی صورت میں نکلے تھے۔ کیون یہ سب دیکھ رہا تھا اور سمجھ رہا تھا کہ اب اس کی مزید کم بختی آنے والی ہے۔ رینی کی برداشت سے یہ سب باہر تھا اور وہ یہ کہتے ہوئے اٹھ گئی۔ ''مجھے یقین ہے اس عورت نے جان بوجھ کر اپنے شوہر کو قتل کیا ہے اور اب ڈراما کر رہی ہے۔''

رینی کی بات نے کیون کو ایک نئے زاویے سے

سوچنے پر مجبور کر دیا۔ کیا یہ سچ تھا کہ کیٹ نے جان بوجھ کر جان کو قتل کیا ہے؟ لیکن کیوں اور اس سے اسے کیا فائدہ ہو گا؟ کیون اٹھ کر کمپیوٹر پر آیا اور کیٹ جیسے دوسرے کیسز کے بارے میں مزید چھان بین شروع کر دی۔ ساتھ ہی وہ ایلمورا کے اثرات دیکھ رہا تھا۔ اس کیس کے دوران پولیس نے ایک نہایت اہم نکتہ نظر انداز کر دیا تھا۔ گرفتاری کے بعد اس نے کیٹ کے خون کا تجزیہ نہیں کرایا تھا جس سے پتا چل سکے کہ اس نے ایلمورا کی کتنی مقدار لی تھی۔ کھلی شیشی اور پھر کیون کا بیان لے کر لوتھر برٹن مطمئن ہو گیا تھا کہ کیٹ نے ایلمورا استعمال کی ہے۔ جب وہ رات دو بجے کمپیوٹر کے سامنے سے اٹھا تو ریٹی سو چکی تھی۔ ایرن ٹھیک نو بجے اپنے بیڈ پر چلا جاتا تھا اس لیے گھر میں سناٹا تھا مگر کیون کے ذہن میں سناٹا نہیں تھا، وہاں بہت شور تھا۔

اس رات اسے دیر سے نیند آئی اور اگلی صبح وہ لوتھر برٹن کے دفتر پہنچ گیا۔ وہ اسے دیکھ کر حیران ہوا۔ اس نے کہا۔ ''مسٹر پیکارڈ! میرا خیال ہے کہ تمہارا کیس ختم ہو گیا ہے۔''

''اس کے برعکس میرا کیس ابھی شروع ہوا ہے۔'' کیون نے سنجیدگی سے کہا۔ ''عدالت نے تسلیم کر لیا کہ کیٹ نے جو کیا وہ ایک مخصوص ذہنی کیفیت میں کیا تھا لیکن اب مجھے پتا چلانا ہے کہ وہ ذہنی کیفیت کیا تھی اور پھر کیٹ کا علاج کرنا ہے۔''

''میرا خیال ہے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ کیٹ سرکاری اسپتال میں جا چکی ہے اور وہاں ماہرین اس کا کیس دیکھ رہے ہیں۔''

''وہ میری مریضہ ہے اس لیے مجھے حق ہے، اس کا کیس دیکھنے کا اور اس سے صرف وہی انکار کر سکتی ہے۔''

''میرا خیال ہے کہ تم خود کو بچانے کی کوشش کر رہے ہو؟''

''چلو ایسا ہی سہی، تم اسے بھی اس کوشش کا ایک حصہ سمجھ سکتے ہو۔ کیٹ ابھی تمہارا کیس ہے اور تم اس کے انچارج ہو۔ تم مجھے اجازت دے سکتے ہو۔''

لوتھر سوچ میں پڑ گیا۔ ''کیون! تم جانتے ہو میڈیا اور انتظامیہ اس معاملے میں تمہیں قصوروار سمجھ رہے ہیں۔ تمہاری خوش قسمتی ہے کہ تم پر کوئی چارج نہیں لگا۔''

''اور یہ تمہاری نااہلی سے ہوا ہے۔'' کیون نے آہستہ سے کہا تو لوتھر کی بھویں تن گئیں۔

''تم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟''

''تم نے گرفتاری کے فوراً بعد کیٹ کا بلڈ ٹیسٹ نہیں کرایا جو تمہاری ذمے داری بنتی تھی۔ اس سے پتا چل جاتا کہ اس نے کتنی دوا استعمال کی۔ اگر وہ نارمل دوا استعمال کرنے کی صورت میں اس حال کو پہنچی تھی تو میرا قصور بنتا تھا لیکن اگر وہ اوور ڈوز لے رہی تھی تو میں بچ جاتا۔''

''اس کے ذمے دار تم ہو۔'' لوتھر برہم ہو گیا۔ ''میں نے تم پر بھروسا کیا۔''

کیون مسکرایا۔ ''اس لحاظ سے میں اور تم ایک ہی سطح پر ہیں، میں نے کیٹ پر بھروسا کیا جو میری پیشہ ورانہ غلطی تھی اور تم نے مجھ پر بھروسا کیا۔ حالانکہ تمہیں اپنی تحقیق خود کرنی چاہیے تھی۔''

لوتھر برٹن کے چہرے پر فکرمندی کے آثار نمودار ہوئے۔ وہ صورتِ حال کا تجزیہ کر رہا تھا۔ یہ واقعی اس کی غلطی تھی اور اگر یہ بات سامنے آتی تو میڈیا اس کا بھی کیون جیسا حال کرتا پھر اوپر والے حرکت میں آنے پر مجبور ہو جاتے۔ اس لیے بہت ضروری تھا کہ کیون اس معاملے میں اپنی زبان بند رکھے۔ کچھ دیر بعد اس نے آہستہ سے کہا۔ ''ٹھیک ہے، تم کیا چاہتے ہو؟''

''میں کیٹ تک رسائی چاہتا ہوں۔'' کیون نے کھل کر کہا۔ اس نے محسوس کر لیا تھا کہ لوتھر دب گیا ہے۔

''اگر اس نے انکار کیا تب...؟''

''اس کے انکار کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔'' کیون نے جواب دیا۔ اس کا مطلب تھا کہ لوتھر اسے بہرصورت کیٹ تک رسائی دے اور یہ اس کے اختیار میں تھا۔ لوتھر جانتا تھا کہ وہ کیون کو انکار کرنے کی پوزیشن میں نہیں، مجبوراً وہ مان گیا۔

''ٹھیک ہے، میں تمہیں اجازت دیتا ہوں لیکن تم اس معاملے کو اس کے علاج تک محدود رکھو گے۔ میری بات سمجھ رہے ہو نا تم؟ یہ کیس ختم ہو گیا ہے اور عدالت نے فیصلہ دے دیا ہے۔ اسے دوبارہ اٹھانا ایک پینڈورا بکس کھولنے کے برابر ہو گا۔''

کیون نے سر ضرور ہلایا لیکن وہ سوچ کچھ اور رہا تھا۔ دو دن بعد وہ اسپتال کے وزیٹر ہال میں کیٹ سے ملا۔ وہ مخصوص نارنجی رنگ کے لباس میں تھی۔ جیل کے قیدیوں کا لباس اس سے ذرا گہرے نارنجی رنگ کا ہوتا ہے۔ مقصد اس کا بھی وہی تھا کہ اگر کوئی مریض اسپتال سے فرار ہو جائے تو باہر اسے دیکھتے ہی پہچان لیا جائے کہ وہ نفسیاتی اسپتال سے بھاگا ہوا ہے۔ وہ اور کیٹ ایک کونے والی میز پر آمنے سامنے تھے۔ کیون نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ ''اب کیسی ہو تم؟''

''میں ٹھیک ہوں۔'' اس نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہا۔'' مجھے اب تک یقین نہیں آ رہا ہے کہ میں نے ایسا کیا ہے اور جان اب اس دنیا میں نہیں رہا ہے۔''

'' مجھے افسوس ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ تم نے جان کو قتل کیا۔'' کیون نے اس کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔'' وار بہت نپا تلا تھا جیسے پیشہ ور قاتل کرتے ہیں۔ چھری کی نوک نے نصف انچ تک دل کو چھید دیا تھا اور جان نے آدھے گھنٹے میں دم توڑ دیا۔ اگر اسے فوری طبی امداد مل جاتی تو اس کے بچنے کا امکان تھا۔ لیکن تم نے تقریباً ایک گھنٹے بعد کال کی جب جان کی موت یقینی ہو چکی تھی۔''

کیٹ کے تاثرات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ اس نے سسکی لی اور اس کی آنکھوں سے نمی جھلکنے لگی۔'' میرے خدا! یہ میں نے کیا کیا... میں نے ایسا کیوں کیا؟''

'' کیٹ! میں یہی جاننے کے لیے تمہارے پاس آیا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ ہم معاملے کی تہ تک پہنچیں۔ جان کی ماں بھی یہی چاہتی ہے۔ اسے بھی یقین ہے کہ تم نے یہ سب... نیند کی کیفیت میں کیا تھا۔ اگر ہم حقیقت کی تہ تک پہنچ گئے تو تمہارا علاج ممکن ہوگا اور تم جلد از جلد اس جگہ سے نکل سکو گی۔''

پہلی بار کیٹ کے تاثرات میں تبدیلی آئی۔'' کیا میں یہاں سے نکل سکتی ہوں؟''

'' بالکل۔'' کیون نے زور دے کر کہا۔'' اگر تم مجھ سے تعاون کرو تو یہ بالکل ممکن ہے۔''

'' مجھے کیا کرنا ہوگا؟''

'' میں تم سے چند سیشن کروں گا۔ اس کے بعد کسی نتیجے پر پہنچنے کے لیے شاید مجھے ادویات اور ہپناٹزم کا سہارا لینا پڑے۔ لیکن اس کے لیے تمہاری رضامندی بہت ضروری ہے۔''

'' میں تیار ہوں۔'' کیٹ نے حسب توقع جواب دیا۔

'' گڈ! میں اگلی ملاقات میں کام شروع کر دوں گا۔''

'' تم کب آؤ گے؟'' کیٹ بے تاب ہو رہی تھی۔

'' شاید اگلے ایک دو دن میں۔''

'' میں انتظار کروں گی۔''

کیون اسپتال سے باہر پارکنگ میں آیا۔ یہ خاص نفسیاتی مریضوں کا اسپتال تھا اور یہاں سیکیورٹی کا انتظام تقریباً جیل جیسا تھا۔ آنے جانے والوں کی مکمل تلاشی لی جاتی تھی اور صرف اجازت شدہ لوگ ہی آ جا سکتے تھے۔ وہ اپنی کار کی طرف جا رہا تھا کہ اس نے این کو اسپتال میں جاتے دیکھا۔ وہ چونک گیا۔ جیسے ہی این انٹرنس سے اندر داخل ہوئی، وہ تیزی سے اس کے پیچھے آیا۔ وہ اندر داخل ہوا تو این کاؤنٹر پر کھڑی تھی۔ وہ وہاں موجود سیکیورٹی آفیسر کو اپنا پاس دکھا رہی تھی۔'' میری کیٹ ہینسن سے ملاقات طے ہے۔''

'' ٹھیک ہے۔'' آفیسر نے پاس دیکھ کر اسے اجازت دے دی۔'' تم وزیٹر ہال میں چلی جاؤ، وہاں موجود وارڈن کیٹ ہینسن سے تمہاری ملاقات کرا دے گی۔''

این اندر کی طرف بڑھ گئی اور کیون دروازے سے واپس ہو گیا۔ اس نے جو جاننا تھا، وہ جان لیا تھا۔ ڈرائیو کرتے ہوئے وہ ذہنی طور پر الجھا ہوا تھا۔ وہ دفتر پہنچ گیا۔ اس کی سیکریٹری مارلین نے اسے بتایا۔'' آج تمہارا صرف ایک اپائنٹ منٹ ہے۔''

کیون سرد آہ بھر کر رہ گیا۔'' اگر یہی صورتِ حال رہی تو شاید مجھے کلینک ہی بند کرنا پڑے۔''

'' اس کا مطلب ہے مجھے ابھی سے دوسری نوکری کی تلاش شروع کر دینی چاہیے۔''

کیون نے سر تھام لیا۔ شام تک وہ اپنے اکلوتے مریض سے نمٹ کر گھر کی طرف روانہ ہوا تو اسے یاد آیا کہ اسے ایرن کو اسکول سے لینا تھا اور اس چکر میں وہ بھول ہی گیا تھا۔ اس نے بوکھلا کر رینی کو کال کی۔'' رینی! ایرن...''

'' تم فکر مت کرو، میں اسے گھر لے آئی ہوں۔'' رینی نے تلخ لہجے میں کہا۔'' آج تم نے حد ہی کر دی۔ وہ بے چارہ پورے دو گھنٹے وہاں انتظار کرتا رہا اور پھر اسکول والوں نے گھر کال کی اور میں جا کر اسے ٹیکسی میں لے آئی۔''

'' آئی ایم سوری...'' کیون نے کہنا چاہا مگر رینی لائن کاٹ چکی تھی۔ اس سے اس کے غصے کا اندازہ ہو رہا تھا۔ کیون نے گہری سانس لی۔ اس کے لیے مشکلات میں اضافہ ہو رہا تھا۔ فی الوقت اس کے ذہن میں ایک ہی خیال تھا کہ این کیٹ سے ملنے کیوں آئی تھی اور کیٹ نے اس بارے میں اسے ایک لفظ نہیں کہا تھا۔ یہ تو طے تھا کہ کیٹ کی مرضی کے بغیر این اس سے ملاقات نہیں کر سکتی تھی۔ کیون نے لوتھر کو کال کی اور اسے این کے بارے میں بتایا۔ وہ بھی حیران ہوا۔

'' مجھے معلوم نہیں ہے۔''

'' لیکن یہ ہوا ہے۔'' کیون نے کہا۔'' میں نے خود این کو پاس کے ساتھ دیکھا اور اسپتال انتظامیہ نے اسے

کیٹ سے ملاقات کی اجازت دی۔''

''میں معلوم کرتا ہوں لیکن کیا کیٹ نے تمہیں اس بارے میں نہیں بتایا؟''

''اب میرا شبہ بڑھ رہا ہے کہ کیٹ وہ نہیں ہے جو خود کو ظاہر کرتی ہے۔''

''تم یوٹرن لے رہے ہو۔''

''حالات مجبور کر رہے ہیں۔''

لوتھر نے کچھ کہا نہیں مگر اس کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ کسی یوٹرن میں کیون کا ساتھ نہیں دے گا۔ کچھ دیر بعد اس نے کیون کو کال کی۔ ''کیٹ نے خود این سے علاج کرانے کی فرمائش کی ہے۔''

''کیا انتظامیہ اس کی پابند ہے کہ مریض کو اس کی مرضی کا معالج فراہم کرے؟''

''بعض صورتوں میں اس کی اجازت ہے۔ معالج کی رضامندی بھی ضروری ہے۔''

کیون گھر پہنچا تو رینی کا موڈ اس کی توقع سے بھی زیادہ خراب تھا۔ اس نے نہ تو کیون سے بات کی اور نہ ہی اس کے لیے کھانا بنایا۔ اسے خود کھانا گرم کر کے کھانا پڑا۔ ایرن بھی خاموش تھا اسے بھی باپ کی یہ بے پروائی پسند نہیں آئی تھی۔ رات سونے سے پہلے کیون نے رینی سے بات کی۔ ''میں ایک بار پھر سوری کر رہا ہوں۔''

''تم سوری کر لیتے ہو لیکن اس کے بعد پھر اسی طرح بے پروائی سے کام لیتے ہو۔''

''تم جانتی تو ہو کہ میں آج کل کن حالات سے گزر رہا ہوں۔ میرا کیریئر داؤ پر لگا ہوا ہے۔''

''لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تم گھر اور بیوی بچے کو بھول جاؤ۔ ذمے داری پوری نہ کرنے کی وجہ سے تم اس حال کو پہنچے ہو۔'' رینی نے اسے آئینہ دکھایا۔

''پلیز! تم مجھے ایک موقع دو، میں کوشش کر رہا ہوں کہ اس مسئلے کو حل کر سکوں۔''

''کیسے...؟'' رینی کا لہجہ طنزیہ ہو گیا۔ ''کیٹ سے اسپتال میں ملاقات کر کے...''

کیون چونکا۔ ''تمہیں کیسے پتا چلا؟''

رینی طنزیہ انداز میں مسکرائی۔ ''میڈیا پر سب آ رہا ہے۔ لیکن تمہیں کوئی خبر نہیں ہے۔ تم اب بھی اس عورت کے پیچھے پاگل ہو رہے ہو۔''

کیون کے اندر غصہ ابھرنے لگا۔ ''تم پھر وہی بات کر رہی ہو۔''

''جب تک تم اس عورت کا پیچھا نہیں چھوڑو گے، میں ایسی باتیں کرتی رہوں گی۔''

''رینی خدا کے لیے، میں اس دلدل سے نکلنے کی کوشش کر رہا ہوں جس میں اپنی حماقت سے پھنس گیا ہوں اور تم میری مدد کرنے کے بجائے مجھے الزام دے رہی ہو۔''

''کیونکہ تم حماقت کا تسلسل جاری رکھے ہوئے ہو۔'' رینی چیخ کر بولی۔

''تم اس بارے میں کچھ نہیں جانتی ہو۔ اس لیے پلیز میری مدد کرو۔'' کیون نے عاجزی سے کہا لیکن رینی کروٹ بدل کر سونے کے لیے لیٹ گئی تھی۔ اگلی صبح وہ سب تیار ہوئے۔ رینی ایک جگہ جاب کے لیے انٹرویو دینے جا رہی تھی۔ کیون پہلے ایرن کو اسکول اور پھر رینی کو اس جگہ چھوڑتا جہاں اسے انٹرویو دینا تھا۔ لیکن جیسے ہی اس نے دروازہ کھولا سامنے درجن سے بھی زیادہ رپورٹرز اور کیمرا مین دکھائی دیے۔ دروازہ کھلتے ہی انہوں نے یلغار کی تھی۔ رینی اور ایرن سہم گئے۔ کیون ان دونوں کو رپورٹرز سے بچاتا ہوا باہر آیا۔ وہ سوالوں کی بوچھاڑ کو نظرانداز کر رہا تھا۔ اس نے رینی اور ایرن کو کار میں بٹھایا اور خود گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ پر آ گیا۔ کار اسٹارٹ کرتے ہی اس نے آگے بڑھا دی۔ رینی روہانسی ہو رہی تھی۔ اس نے کہا۔

''ہماری رسوائی کا یہ تماشا کچھ دیر بعد ساری دنیا دیکھ رہی ہو گی۔''

''کوئی رسوائی نہیں ہوئی ہے۔'' کیون نے سخت لہجے میں کہا۔ ''ایسا ہوتا ہے۔ کچھ عرصے بعد لوگ سب بھول جائیں گے۔''

''ہاں بشرطیکہ تم ان کو کوئی نئی تفریح فراہم نہ کرو۔'' رینی کا لہجہ زہریلا ہو گیا۔ کیون نے اس کی بات ... اَن سنی کی اور بولا۔

''میرا خیال ہے ہم کچھ دن کے لیے پرانے فلیٹ میں چلے جاتے ہیں۔''

اس مکان کو لینے سے پہلے وہ اس فلیٹ میں رہتے تھے۔ کیون نے اسے فروخت نہیں کیا تھا کیونکہ اس کے خیال میں اس کی ضرورت نہیں تھی۔ ویسے بھی اس وقت قیمتیں بہت گری ہوئی تھیں۔ رینی نے سر ہلایا۔ ''میں بھی یہی سوچ رہی ہوں۔''

☆☆☆

کیٹ اس کے سامنے کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھ سامنے میز پر رکھے ہوئے تھے۔ اس کے بائیں

ہاتھ سے کینولا منسلک تھا جس کی نلکی کیون تک جا رہی تھی اور اس نے نلکی کے دوسرے سرے پر ایک سرنج لگا رکھی تھی جس میں دوا بھری ہوئی تھی۔ یہ دوا اس نے کیٹ کے سامنے ایک شیشی سے نکالی تھی۔ شیشی پر اس کا نام بھی لکھا ہوا تھا۔ ذہن کو آزاد کر دینے والی یہ دوا سائیکاٹرسٹ سیشن میں عام استعمال کرتے ہیں جس میں مریض کی لاشعوری گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ایک طرف چھوٹا سا ویڈیو کیمرا اسٹینڈ پر لگا ہوا تھا جو اس سیشن کی ریکارڈنگ کر رہا تھا۔ کیون نے اس کی طرف دیکھا۔ ''کیا تم تیار ہو؟''

کیٹ نے سر ہلایا۔ اس کا چہرہ سپاٹ تھا۔ کیون نے اس کے سامنے ایک از خود حرکت کرنے والا پنڈولم رکھ دیا اور اسے ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اسے دیکھتی رہو اور توجہ میری آواز پر رکھنا۔''

کیٹ پنڈولم کی حرکت دیکھنے لگی۔ کیون نے نلکی سے لگے ہوئے انجکشن کا پسٹن ہلکا سا آگے کیا اور دوا کیٹ کی نسوں میں اتر گئی۔ کیون نے کسی قدر گونجتی آواز میں پوچھا۔ ''جان کے رہا ہونے کے بعد تمہارے اور اس کے تعلقات کیسے تھے؟''

''اچھا تھا، وہ میرا بہت خیال رکھتا تھا۔''

''تم دونوں کے درمیان کوئی سنجیدہ لڑائی ہوئی؟''

''کبھی نہیں۔'' کیٹ نے یقین سے کہا۔ ''اگر میں چپ ہوتی، تب بھی وہ میرا بہت خیال رکھتا تھا۔ اس نے کبھی مجھے شکایت کا موقع نہیں دیا۔''

''پھر کیا وجہ تھی کہ تم نے اسے چاقو مار کر ہلاک کر دیا؟''

کیٹ کے چہرے پر کرب نمودار ہوا۔ ''میں نہیں جانتی۔''

کیون نے انجکشن کا پسٹن مزید دبایا اور تحکمانہ انداز میں بولا۔ ''تم جانتی ہو... اپنے ذہن پر زور دو۔ تم نے کیوں جان کو چاقو مارا؟ وہ بھی عین دل کے مقام پر۔''

کیٹ نے بے چینی سے سر ہلایا۔ ''میں سچ کہہ رہی ہوں، میں نہیں جانتی۔''

''کیٹ! ذہن پر زور دو۔'' کیون نے آواز مدھم کر لی تھی۔ ''یہ بہت ضروری ہے۔ تم اپنے لاشعور کے تہ خانے میں اترو۔'' اس نے کہتے ہوئے انجکشن کا پسٹن پورا دبا دیا۔ اس میں موجود ساری دوا کیٹ کی رگوں میں اتر گئی تھی۔

''میں سچ کہہ رہی ہوں، میں نہیں جانتی... میں بالکل نہیں جانتی۔'' کیٹ کا لہجہ کہتے ہوئے سرگوشی نما ہو گیا اور پھر اس کا سر میز سے جا ٹکا۔ کیون اسے آواز دیتا رہ گیا اور اس نے حرکت نہیں کی۔ وہ گہری نیند میں جا چکی تھی۔ کچھ دیر بعد کیون برابر والے کمرے میں لوتھر برٹن کے پاس تھا۔ اس نے بلاتمہید کہا۔

''یہ عورت فراڈ کر رہی ہے، یہ سائیکو نہیں ہے۔''

لوتھر نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''خوب! تم نے اسے عدالت میں ایڑی چوٹی کا زور لگا کر سائیکو ثابت کیا۔ اسے عدالت سے بری کر دیا گیا اور اب تم کہہ رہے ہو وہ فراڈ ہے۔''

''میری بات کا یقین کرو، وہ فراڈ ہے۔''

''مسٹر پیکارڈ! احمقانہ باتیں مت کرو۔ میں نے غلطی کی جو تمہاری باتوں میں آ گیا۔ اب یہ باب بند ہو چکا ہے۔''

''یہ باب بند نہیں ہوا۔'' کیون نے شیشے کی دیوار کے دوسری طرف میز سے سر ٹکائے لیٹی کیٹ کو دیکھ کر کہا۔ ''میں ثابت کر سکتا ہوں۔ میں نے اس سے سیشن کیا اور اسے وہ دوا دی جس سے شعور سو جاتا ہے اور لاشعور جاگتا رہتا ہے لیکن...'' کیون کہتے ہوئے رکا۔ ''میں نے اسے وہ دوا نہیں دی، انجکشن میں صرف سادہ پانی تھا۔ پھر اس نے اس طرح کیوں ردعمل ظاہر کیا جیسے اسے سچ مچ دوا دی گئی ہے۔''

لوتھر کے چہرے کے تاثرات بدل گئے تھے۔ ''اسے کیسے ثابت کیا جا سکتا ہے؟''

''بہت آسان طریقہ ہے۔ ابھی اس کا بلڈ ٹیسٹ لو۔ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔''

☆☆☆

کیون گھر جاتے ہوئے بہت خوش تھا لیکن ساتھ ہی اس کے ذہن میں سوال آ رہا تھا کہ کیٹ نے ایسا کیوں کیا؟ یہ دولت کا معاملہ نہیں تھا۔ جان کے پاس کوئی بینک بیلنس نہیں تھا، اس کی کوئی انشورنس نہیں تھی۔ بزنس میں اس کا شیئر صرف منافع کی حد تک تھا۔ اگر وہ مر جاتا تو اس کے وارث کو بزنس سے کچھ نہیں ملتا۔ کوئی جائداد بھی نہیں تھی۔ جان کی ماں کا یہ بھی کہنا تھا کہ جان کیٹ سے بہت محبت کرتا تھا۔ وہ اسے ذرا سی تکلیف نہیں دے سکتا تھا۔ خود کیٹ کا بھی یہی کہنا تھا کہ جان نے کبھی اس سے غصے سے بات بھی نہیں کی تھی۔ پھر کیا وجہ تھی؟ جان جیل سے آ گیا تھا اور وہ دوبارہ سے بزنس میں شامل ہو گیا۔ ان کے مالی حالات برے نہیں تھے لیکن یہ آنے والے دنوں میں اور بھی اچھے ہو جاتے۔ حالات ثابت کرتے تھے کہ قتل کی کوئی وجہ نہیں تھی، سوائے کیٹ کی نفسیاتی حالت کے۔

مگر آج کیون نے ثابت کر دیا تھا کہ وہ کتنے پائے کی اداکارہ تھی۔ اس نے نہ صرف پولیس، عدالت اور لوگوں

کو بے وقوف بنایا تھا بلکہ وہ کیون اور اس جیسے کئی ماہرینِ نفسیات کو بھی بے وقوف بنا گئی تھی۔ وہ فلیٹ پر پہنچا تو اسے پھر خیال آیا کہ وہ ایرن کو لینا بھول گیا تھا۔ اس نے سر پر ہاتھ مارا۔ اس کیس نے اسے پریشان کر دیا تھا۔ وہ فلیٹ میں داخل ہوا تو رینی اپنے اور ایرن کے کپڑے سوٹ کیس میں رکھ رہی تھی۔ اس کی صورت سے لگ رہا تھا کہ آج اس نے فیصلہ کر لیا ہے۔ کیون نے معذرت کا آغاز کیا۔ ''ڈیئر! آئی ایم سوری... میں بھول گیا تھا۔''

''وہ بات پرانی ہو گئی ہے۔'' وہ روہانسے لہجے میں بولی۔ ''لیکن مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم اس حد تک گھٹیا پن پر اتر آؤ گے۔''

''رینی! میری بات سنو...''

''اس کے بعد کیا بات سنوں؟'' رینی نے تصویروں کا ایک پلندا اس پر دے مارا۔ تصویریں قالین پر بکھر گئیں۔ کیون نے جھک کر دیکھا اور دنگ رہ گیا۔ یہ اس وقت کی تصویریں تھیں جب وہ کیٹ کے ساتھ دفتر والی عمارت کے سامنے والے کیفے میں کیٹ کے ہمراہ تھا۔ کیٹ اس کے پاس ہو کر بیٹھی تھی۔ اس کا پوز نہایت بے تکلفانہ اور کسی حد تک جسم کو نمایاں کرنے والا تھا۔ ایک تصویر میں کیون اسے شاپنگ بیگ پکڑا رہا تھا، دوسری میں کیٹ بیگ لے رہی تھی اور اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ تیسری تصویر میں وہ بیگ پاس رکھ رہی تھی۔ ایک تصویر میں وہ یوں کیون کی طرف جھکی تھی جیسے اسے بوسہ دینے جا رہی ہو۔ تمام تصویریں کسی بھی بیوی کے دل میں شک پیدا کرنے کے لیے کافی تھیں۔ مگر کیون ان کی حقیقت جانتا تھا۔ اس نے رینی سے کہا۔ ''میں اس کی وضاحت کر سکتا ہوں۔''

''تمہارے پاس الفاظ کے سوا اور کیا ہے۔'' رینی نے سوٹ کیس بند کیا اور ایرن کا ہاتھ پکڑ کر فلیٹ سے نکل گئی۔ کیون اس کے پیچھے آیا لیکن رینی نے ٹیکسی منگوالی تھی۔ وہ ٹیکسی میں بیٹھ کر چلی گئی۔ وہ یقیناً اپنی ماں کے گھر جا رہی تھی۔ کیون کی پریشانیاں کم ہونے میں نہیں آ رہی تھیں لیکن ان تصویروں سے اسے ایک خیال سوجھ گیا تھا۔ اس نے سیل فون نکال کر لوتھر کو کال کی۔ پہلے تو لوتھر نے اس کی تجویز سے اتفاق نہیں کیا لیکن جب کیون نے معاملہ اوپر لے جانے کی بات کی تو وہ مان گیا۔ اس نے کیون سے کہا۔

''اس میں بہت رسک ہے۔''

''کس قسم کا؟''

''اگر کیٹ نہ مانی تو...''

''اس کی فکر مت کرو۔ اسے میں راضی کر لوں گا کیونکہ اب میں اسے سمجھ گیا ہوں۔''

اگلے دن کیون اسپتال میں پھر کیٹ کے سامنے موجود تھا۔ پہلے تو کیٹ نے اس کی تجویز سنتے ہی انکار کر دیا۔ ''تمہارا دماغ درست ہے، میں نے ایسا کوئی کام نہیں کیا ہے؟''

''مجھے افسوس ہے، تمہارا منصوبہ ناکام رہا ہے۔ میں نے تمہاری دھوکے بازی کا ثبوت حاصل کر لیا ہے۔'' کیون نے کہا اور سیشن کے بعد لیے جانے والے اس کے بلڈ ٹیسٹ کی رپورٹ سامنے رکھ دی۔ ''تمہیں صرف سادہ پانی کا انجکشن لگایا گیا تھا، تب تم ایسی اداکاری کیوں کر رہی تھیں جیسے تمہیں دوا دی گئی ہو؟''

کیٹ کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ اس نے بہ مشکل کہا۔ ''میں ایسا نہیں کر سکتی۔''

''ٹھیک ہے۔'' کیون نے رپورٹ کی کاپی واپس اپنی فائل میں رکھی۔ ''اب میں اس معاملے کو دوبارہ کورٹ میں لے جاؤں گا۔ دیکھتے ہیں اس بار عدالت تمہارے لیے کیا فیصلہ کرتی ہے؟''

''ایک منٹ۔'' کیٹ نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔ کیون رک گیا۔ وہ سرگوشی میں بولی۔ ''اگر میں تمہاری بات مان جاؤں تو کیا اس جگہ سے نکل سکوں گی؟''

کیون مسکرایا۔ ''کیوں نہیں... جب ایک بار ثابت ہو جائے گا کہ تمہیں کوئی نفسیاتی مسئلہ نہیں ہے تو تمہیں یہاں رکھنے کا کیا جواز باقی رہ جائے گا۔''

☆☆☆

این فرانز اپنے دفتر میں جو اس کے خوب صورت گھر کے اگلے حصے میں واقع تھا، ایک نوجوان مریض سے بات کر رہی تھی۔ اسے ڈراؤنے خواب دکھائی دیتے تھے اور وہ راتوں کو اس خوف سے ٹھیک سے سو نہیں پاتا تھا۔ اچانک دروازے پر دستک ہوئی اور این نے دیکھا تو اسے کیٹ دکھائی دی۔ وہ حیران ہوئی۔ کیٹ نے اشارہ کیا کہ وہ اندر آنا چاہتی ہے۔ این نے جلدی سے نوجوان سے کہا۔ ''ٹھیک ہے، میں تم سے کل اسی وقت ملوں گی، ابھی مجھے ایک ضروری کام ہے۔''

نوجوان خاموشی سے اٹھ کر چلا گیا اور این نے کیٹ کے لیے دروازہ کھول دیا۔ وہ اندر آ گئی اور بے تابی سے اس

کے گلے لگ گئی۔ اس کا انداز خاص تھا۔ این بھی بے قابو ہو گئی تھی اور دونوں کچھ دیر غیر فطری جذبات میں ڈوبی رہیں۔ پھر این نے سنبھل کر کہا۔ ''تمہیں کب چھوڑا؟''

''ابھی کچھ دیر پہلے۔'' کیٹ مسکرائی۔ ''سب کچھ تمہاری پلاننگ کے مطابق ہوا۔ جان کے قتل سے لے کر میری رہائی تک۔''

این پھر جذباتی ہونے لگی۔ ''اچھا ہوا اسے تم نے مار دیا، ورنہ میں اسے قتل کر دیتی۔ میں تمہارے قریب کسی اور کو برداشت نہیں کر سکتی۔''

''تم نے کیون کو بھی ہوشیاری سے استعمال کیا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ وہ اتنی آسانی سے بے وقوف بن جائے گا۔''

این فخر سے مسکرائی۔ ''وہ مجھ سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ جب میں نے اسے ایلورا استعمال کرنے کا مشورہ دیا، تب مجھے امید نہیں تھی کہ وہ اتنی آسانی سے مان جائے گا۔''

''میں نے ایک بار بھی دوا نہیں کھائی لیکن اس کی وجہ سے کام آسان ہو گیا۔''

این نے حقارت سے کہا۔ ''اس کی ذہانت کا اندازہ اس سے لگاؤ کہ اس نے جان کے قتل کے بعد تمہارا بلڈ ٹیسٹ کرانے کی زحمت ہی نہیں کی۔''

''یہ اس کی نہیں، پولیس کی عقل مندی تھی۔'' کیٹ نے کہا۔

''خیر چھوڑو اسے اتنے دن بعد آئی ہو کیوں نہ ہم کچھ اچھا وقت گزاریں۔'' این نے کہا اور اس کے پاس آئی۔ اس نے کیٹ کو بانہوں میں لیا اور جیسے ہی اس کے ہاتھ کیٹ کی کمر تک گئے وہ رک گئی۔ وہاں ایک موٹا تار موجود تھا۔ این جھٹکے سے پیچھے ہٹی اور اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی۔ کیٹ کے تاثرات لمحوں میں بدل گئے۔ دروازے پر دستک ہوئی تو اس نے کیٹ سے پوچھا۔ ''کیوں... تم نے ایسا کیوں کیا؟''

کیٹ صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔ ''کیونکہ میں اس پاگل خانے سے نکلنا چاہتی تھی اور میرے پاس ان لوگوں کی بات ماننے کے سوا اور کوئی راستہ نہیں تھا۔''

این پھٹ پڑی۔ ''احمق... بے وقوف عورت! اس نے تمہیں استعمال کیا ہے اور اب تمہیں پتا چلے گا۔''

''اس نے وعدہ کیا ہے کہ وہ مجھے اسپتال سے نکال لے گا۔''

''ہاں۔'' این کا لہجہ زہریلا ہو گیا۔ ''جیل میں ڈالنے کے لیے۔''

اسی اثنا میں دروازہ کھلا اور دو پولیس والے اندر آئے اور انہوں نے این کو بازو سے پکڑ کر ہتھکڑی پہنا دی۔ وہ اسے باہر لے گئے۔ کیون، لوتھر کے ساتھ اندر آیا۔ کیٹ نے اپنی کمر سے بندھا مائیکروفون اتار کر لوتھر کے حوالے کیا اور بولی۔ ''میں نے اپنا کام اچھی طرح کیا ہے؟''

''بالکل۔'' لوتھر نے جواب دیا۔ ''اس لیے بھی مجھے افسوس ہو رہا ہے۔''

کیٹ نے چونک کر اسے دیکھا۔ ''افسوس کس بات پر؟''

''کہ مجھے تمہیں گرفتار کرنا پڑے گا۔''

''کیوں؟'' کیٹ چلا اٹھی۔ ''جب میں نے تم سے تعاون کیا اور تم نے وعدہ کیا تھا کہ مجھے آزاد کر دو گے تو پھر مجھے کیوں گرفتار کیا جا رہا ہے؟''

''جان کے قتل کے الزام میں۔'' کیون مسکرایا۔ ''میں نے تمہیں اسپتال سے آزاد کرانے کو کہا تھا، میں نے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔''

کیٹ کا حوصلہ جواب دے گیا۔ وہ یک دم بھاگی لیکن اسے زیادہ دور جانا نصیب نہیں ہوا۔ دو پولیس والوں نے پکڑ کر اسے ہتھکڑی پہنائی اور جب کھینچ کر گاڑی کی طرف لے جا رہے تھے تو وہ چلا چلا کر کہہ رہی تھی کہ اس نے کچھ نہیں کیا ہے۔ لوتھر اور کیون اسے دیکھ رہے تھے۔ کیون نے کہا۔ ''اس عورت کا قصور بھی نہیں ہے۔ جب عین شادی کے دن پولیس آکر اس کے شوہر کو تقریب سے گرفتار کر کے لے جائے تو اس کی ذہنی کیفیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ مگر اصل قصور این کا ہے۔ اس نے کیٹ کے اندر جان سے نفرت کو ابھارا۔ صرف اپنے مقصد کے لیے اور اسے اس مرحلے تک لے آئی جب وہ اپنے شوہر کو قتل کرنے پر راضی ہو گئی۔''

لوتھر نے سر ہلایا۔ ''میں تم سے متفق ہوں، جس نے جتنا کیا ہے اسے اتنی سزا ضرور ملے گی۔ بہرحال تم پر جو الزام آ رہا تھا تم اس سے بچ گئے ہو۔''

''ابھی کہاں؟'' کیون نے سرد آہ بھری۔ ''ابھی تو مجھے اپنی بیوی کو منانا ہے۔ این نے بہت مہارت سے تصویریں لی تھیں لیکن ان ہی تصویروں کی وجہ سے میرا دھیان اس کی طرف گیا اور وہ پھنس گئی۔''

''میرا خیال ہے، آج جو ہوا ہے اس کے بعد تمہیں اپنی بیوی کو منانے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آئے گی۔''

کیون کا بھی یہی خیال تھا اس لیے جب وہ ایرن کو لینے اسکول کی طرف روانہ ہوا تو بہت خوش تھا۔

شیش محل

اسماء قادری

قسط:3

جہاں پر انسان کی بے بسی کی انتہا ہو... وہیں سے ربِ جلیل کی رحمتوں کی ابتدا ہوتی ہے۔ یہ بات کبھی اس نے بچپن میں سنی تھی مگر حادثات و واقعات اور طبقاتی کشمکش میں گھری مختصر سی فانی زندگی کے پیچ و خم میں الجھ کر اسے کچھ یاد نہ رہا... اسے نہیں معلوم تھا کہ یکسانیت سے بے زار اور تنوع کے متلاشی لوگ معزز اور بلند مقام کے حصول کی خاطر خود کو کتنی پستی میں گرا لیتے ہیں۔ وہ ذہین وفطین نوجوان بھی آنکھوں میں خوش امیدی کے خواب لیے راہ میں پلکیں بچھائے اس کا منتظر رہتا تھا لیکن ناکام آرزوئوں اور ناآسودہ تمنائوں کے انجام نے اس کے مندمل زخموں کو لہو لہو کر دیا... راکھ میں دبی چنگاری نے اس کے تمام ارادوں کو خاکستر کر ڈالا۔ دل کی بے ترتیب دھڑکنوں کے ساز کے درمیان جو خوش امیدی کبھی اس کی زندگی کا حصہ تھی اب نہ تو وہ خوش دکھائی دیتا تھا اور نہ ہی کسی کی آنکھ میں اس کے لیے کوئی امید باقی تھی۔ جانے یہ زندگی کا کونسا موڑ تھا... وہ تو شیش محل کے ہر منظر میں محبوب کی مسکراتی آنکھوں کے جلتے دیپ میں اپنے عکس کو دیکھنے کا عادی تھا... کھلتے گلابوں اور محبتوں کی برستی پھوار میں خود کو بھیگا محسوس کرتا تھا کہ اچانک اس شیش محل میں ہر جانب لپکتے شعلوں کی جھلک دکھائی دی تو احساس ہوا کہ وہ لوگوں کے ہجوم میں کس قدر تنہا ہے... جسے وہ اپنا ہمسفر اور رفیق سمجھتا رہا اس سے بڑا رقیب کوئی نہ نکلا۔

اسرار و تحیر کے پردوں میں ملفوف سطر سطر رنگ بدلتی واردات قلبی کی عکاس دلچسپ داستان

''دادا...... دادا......'' شیدو اڈے کے دروازے سے اندر داخل ہوا تو اس کا سانس بری طرح اکھڑ رہا تھا اور آواز کا ہیجان بتاتا تھا کہ وہ کسی بہت غیر معمولی صورتِ حال سے دوچار ہو کر یہاں پہنچا ہے۔

''کیا ہے بے، کیوں شور مچا رہا ہے؟'' اس کی آواز سن کر جمع تو سب ہی ہو گئے تھے لیکن ڈپٹ کر سوال کرنے والا رامو تھا۔

''وہ...... وہ لونڈیا نہیں تھی...... اسے کوئی اٹھا کر لے گیا۔'' پھولے ہوئے سانس کے ساتھ اس نے مشکل سے بتایا۔

''کسے، ثریا بانو کو......؟'' رامو بری طرح بدکا۔ باقی سب کے تیور بھی جارحانہ نظر آنے لگے۔

''کیسے کوئی اسے اٹھا کر لے گیا۔ تم سارے حرام کے جنے کیا بھنگ پی کر پہرا دے رہے تھے؟'' پل بھر میں شیدو کا گریبان رامو کے ہاتھ میں تھا اور آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ ثریا بانو کے اغوا کا خیال ہی ایسا تھا کہ اس کا خون کھول اٹھا تھا۔ ربن دادا کا نائب ہو کر وہ بھلا کیسے یہ بات برداشت کر سکتا تھا کہ دادا کی پناہ میں آئی ثریا کو کوئی اس طرح دن دہاڑے اٹھا کر لے جائے۔ یہ تو دادا کی ناک کٹانے والی بات تھی۔

''نہ...... نہ...... اس کی بات نہیں کر رہا استاد۔'' زور زور سے نفی میں سر ہلاتے ہوئے شیدو نے صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔ ''وہ تو ماں قسم بالکل خیریت سے ہے اور پہرا دینے والے بندے ایک دم چوکس ہو کر ادھر پہرا دے رہے ہیں۔ ادھر آدمی تو کیا چوہے کا بچہ بھی پہرا توڑ کر جانے کی ہمت نہیں کر سکتا۔''

''تو پھر کس کی بات کر رہا ہے تو؟'' رامو نے جھنجلا کر پوچھا البتہ ثریا بانو کے بہ خیریت ہونے کی خبر سن کر اس نے سکون کا سانس لیا تھا اور شیدو کے گریبان پر اس کی گرفت خود بخود ہی ڈھیلی پڑ گئی تھی۔

''وہ جو ادھر گلی میں کرسچن بندہ جوزف رہتا ہے اس کی لونڈیا کی۔'' شیدو کی دی گئی اطلاع نے رامو کا سارا اطمینان ایک بار پھر رخصت کر دیا۔

''کیا کہہ رہا ہے بے...... کس نے تجھے بتایا؟'' اس نے پھر سے شیدو کا گریبان جھنجوڑ ڈالا۔

''میں نے خود دیکھا استاد۔ میں ذرا راؤنڈ مارنے سڑک کی طرف گیا تو مجھے یہ سین نظر آ گیا۔'' شیدو نے سہم کر بتایا۔

''اسے آرام سے بیٹھ کر بات کرنے دے رامو۔ ایسے تلوار تان کر سر پر سوار رہے گا تو سالا کدھری پورا بول سکے گا۔'' ربن دادا کی گونجیلی آواز نے شیدو کی طرف متوجہ جملہ افراد کو چونکایا۔ دادا کس وقت دبے قدموں سیڑھیاں اتر کر نیچے آ گیا تھا، ان میں سے کسی کو خبر نہ ہو سکی تھی۔ رامو نے فوراً دادا کے حکم کی تعمیل کی اور شیدو کا گریبان چھوڑ دیا۔

''فاروق کدھر ہے؟'' شیدو سے کوئی سوال کرنے سے قبل ربن نے وہاں موجود افراد میں فاروق کو غیر حاضر پا کر پہلے اس کی بابت سوال کیا۔ اسے معلوم تھا کہ یہ خبر سب سے زیادہ فاروق پر ہی اثر انداز ہو گی۔ وہ رامو کی کیفیت بھی سمجھ رہا تھا کہ وہ فاروق کے خیال سے ہی اتنا زیادہ ہیجان زدہ ہو گیا تھا۔

''فاروق بھائی تو کوئی آدھا گھنٹا پہلے اڈے سے نکلے ہیں۔ یہ تو نہیں بولے کہ کدھر جا رہے ہیں پر کہا تھا کہ واپسی میں دیر ہو جائے گی۔'' گولو نے آگے آ کر ربن دادا کے سوال کا جواب دیا تو اس نے قدرے اطمینان محسوس کیا۔ وہ خود بھی نہیں چاہتا تھا کہ یہ بری خبر فاروق کے کانوں تک پہنچے۔

''ہاں، اب بول تو کہ کیا ہوا اور تُو نے کیا دیکھا؟'' وہ پورے ارتکاز کے ساتھ شیدو کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''کیا بولوں دادا، ماں قسم سب ایک دم پلک جھپکتے میں ہو گیا۔ اپن نے گلی سے نکلتے ہوئے لونڈیا کو سڑک کی طرف سے آتے دیکھا پھر اچانک ہی ایک سفید موٹر اس کے پیچھے سے آئی اور موٹر میں سے کسی نے لونڈیا کو پکڑ کر اندر کھینچ لیا۔ اپن بھاگ کر ادھر تک پہنچا، تب تک موٹر غائب بھی ہو چکی تھی۔'' شیدو کی آنکھوں میں گویا وہ منظر پھر سے زندہ ہو گیا تھا۔

''موٹر والوں کی صورت دیکھی تھی تُو نے؟'' ربن نے تیوری پر بل ڈالے سنجیدگی سے دریافت کیا۔

''ڈریور کو ایک نظر دیکھا تھا دادا پر سالا اپنے لیے بالکل نیا بو تھا۔'' شیدو کا جواب خاصا مایوس کن تھا۔

''چل رامو، ذرا باہر چل کر خود تھوڑی پوچھ تاچھ کرتے ہیں۔'' شیدو کی طرف سے کوئی کام کی معلومات نہ ملنے پر ربن نے رامو سے کہا تو وہ فوراً تیار ہو گیا۔ دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے اڈے کے دروازے سے باہر نکلے تو گلی میں الگ ہنگامہ کھڑا نظر آیا۔

''جوزف کی بیوی کا طبیعت خراب ہو گیا ہے۔'' گلی میں موجود مردوں میں سے ایک سے استفسار کرنے پر انہیں

معلوم ہوا تو وہ سمجھ گئے کہ شیدو کے ذریعے ان تک پہنچنے والی خبر کسی نے وہاں تک بھی پہنچا دی ہے۔ وہ لوگوں کے درمیان سے راستہ بناتے ہوئے جوزف کے گھر کی طرف بڑھے۔ گھر کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور اندر محلے کے کئی افراد نظر آرہے تھے۔ دو عورتیں بیٹھی زمین پر گری جوزفین کے ہاتھ پیر سہلا رہی تھیں جبکہ جوزف دیوانوں کی طرح اسے پکار رہا تھا لیکن ٹیڑھے ہوتے ہاتھ پیروں اور چہرے کی نیلی پڑتی رنگت والی جوزفین کو دیکھ کر اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کسی عام تدبیر یا پکار سے سنبھلنے والی نہیں ہے۔

''اسپتال لے کر جاؤ اسے۔ سواری منگواؤ، جلدی کرو۔'' اپنی تجربہ کار نگاہوں سے جوزفین کی حالت بھانپ کر ربن حلق کے بل دھاڑا۔ فوراً ہی وہاں ہلچل مچ گئی۔ بھاگم بھاگ سواری کا بندوبست کیا گیا۔ جوزفین کے ساتھ جوزف کے علاوہ بھی محلے کے چند لوگ اسپتال جانا چاہتے تھے لیکن ربن نے سب کو روک کر اپنا ایک آدمی ساتھ کر دیا۔ اس آدمی کو اس نے اپنی جیب الٹ کر اچھی خاصی رقم بھی تھما دی تھی۔ وہ لوگ اسپتال کے لیے روانہ ہو گئے تو ربن محلے والوں کی طرف متوجہ ہوا۔ وہاں لوگوں کی زبان پر وہی داستان تھی جو وہ شیدو کی زبانی سن چکا تھا۔

''کس نے دیکھا تھا لڑکی کو اٹھا کر لے جاتے ہوئے؟'' اس کے بارعب لہجے میں پوچھنے پر پتلون قمیص میں ملبوس ایک اٹھارہ انیس سالہ لڑکا سامنے آیا۔

''اپن نے دیکھا تھا دادا۔ اپن بھی اس سے اپنے کام سے واپس لوٹ رہا تھا۔''

''موٹر والوں کو پہچانا؟'' ربن نے اس سے پوچھا۔

''نہیں دادا! اپن کو تو ان کا شکل نظر بھی نہیں آیا۔ وہ سالا تو ایک دم ہوا کے ماقف موٹر نکال کر لے گیا۔ اپن کو اور کچھ سمجھ نہیں آیا تو بھاگ کر جوزف انکل کو انفارم کرنے کے واسطے ادھر آگیا۔ آنٹی نے بھی اپن کی بات سن لیا اور گر پڑا۔'' وہ کچھ ایسی شرمساری سے ساری تفصیل بتا رہا تھا جیسے جوزفین کی حالت خراب ہونے میں اس کا قصور ہو۔ ربن نے اس سے مزید ایک دو سوالات کیے لیکن وہ بھی شیدو سے زیادہ معلومات فراہم نہ کر سکا۔ ربن نے رامو کے ساتھ جا کر خود جائے وقوعہ کا چکر لگایا اور کوشش کی کہ کوئی ایسا آدمی مل جائے جو ان کی معلومات میں اضافہ کر سکے لیکن کچھ حاصل نہیں ہوا۔

''کچھ سمجھ نہیں آتا کہ لونڈیا کے ساتھ کیا ہوا اور وہ کون لوگ تھے جو اسے یوں اٹھا کر لے گئے۔'' تاریکی نے اپنے پر پھیلانا شروع کیے تب وہ رامو کے ساتھ اڈے پر واپس لوٹا اور پریشانی سے تبصرہ کیا۔

''سمجھ تو سچ مچ نہیں آتا پر ایک بات ہے۔ وہ موٹر میں آئے تھے اس لیے کوئی ہلکی پارٹی تو ہو نہیں سکتی۔ اپن کو تو یہ کوئی بڑا ہی لفڑا لگتا ہے۔ ادھر وہ جوزف بھی اپنی گھر والی کے ساتھ اسپتال میں ہے ورنہ اس سے پوچھ سکتے تھے۔ کوئی دشمنی وشمنی کا چکر ہوا تو اس کو ضرور معلوم ہوئیں گا۔''

''بات تو تیری ایک دم ٹھیک ہے پر اپن کو اصل فکر اس مجنوں کی اولاد کی ہے۔ جنے آج بنا بتائے کدھر نکل گیا ہے۔ واپس آکر سنے گا تو بہت صدمہ لے گا۔ تجھے خبر ہے نا اس کی۔ سالا زبان سے کچھ نہیں بولتا لیکن اندر ہی اندر گھلتا رہتا ہے۔'' ربن کو فاروق کی فکر لگی ہوئی تھی۔

''اپن بھی اسی کے لیے پریشان ہے دادا۔ جانتا ہے ادھر من اٹکا ہوا ہے اپنے شہزادے کا، پر کرے تو کیا کرے۔ کوئی راہ بھی تو دکھائی نہیں دیتی۔'' رامو بھی ربن سے کم پریشان نہیں تھا۔

''تو ایسا کر کسی کو اسپتال خبر لینے بھیج۔ مجھے عورت کی حالت اچھی نہیں لگتی تھی۔ اسپتال والوں نے اسے سنبھال لیا ہو تو اچھا ہے۔ وہ سنبھلے گی تو اپن جوزف سے تھوڑی پوچھ تاچھ کر سکے گا۔'' اس اندھیرے میں ان کے پاس جوزف کی صورت میں روشنی کی واحد کرن ہی موجود تھی اور وہ امید کر رہے تھے کہ جوزف ہی جولیٹ کو اغوا کرنے والوں کے سلسلے میں کوئی نشاندہی کر سکے گا۔ رامو نے فٹافٹ ایک آدمی کو اسپتال کی طرف دوڑا دیا۔

''فاروق لوٹا نہیں ابھی تک؟'' آدمی اسپتال روانہ ہو گیا تو ربن کو پھر فاروق کی یاد نے ستایا۔

''آتا ہی ہوگا۔ گولو نے بولا تو تھا کہ ذرا دیر سے آنے کا بول کر گیا تھا۔'' رامو نے اسے تسلی دی۔ اسی وقت گولو کمرے میں آیا۔ ربن اور رامو دونوں باقی لوگوں سے بالکل الگ تھلگ ہو کر بیٹھے تھے۔

''سجو کھانے کا پوچھتا ہے بابا، کھانا لگاتا ہے یا......'' گولو نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''لگا دے رے۔ کب تک نہیں لگائے گا۔'' ربن نے قدرے بیزاری سے جواب دیا۔

''من نہیں ہے اپن کا، پر معلوم ہے کہ اپن نے انکار کر دیا تو وہ سارے کے سارے بھی بھوکے بیٹھے رہیں گے۔ سالوں کی اتنی محبت کبھی کبھی تو تنگ کر کے رکھ دیتی ہے۔'' گولو اس کی اجازت پا کر کمرے سے باہر نکل گیا تو اس نے

شکایتی انداز میں رامو سے کہا۔
''وہ تم کو اپنے پتا سمان مانتے ہیں دادا۔'' رامو نے اسے جتایا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ فاروق کی وجہ سے جولیٹ کے اغوا کے واقعے نے ربن کو خاصا متاثر کیا ہے اور وہ خلافِ مزاج پریشان نظر آرہا ہے۔

''تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔ چل، چل کر کھانا کھاتے ہیں۔ یوں بھی یہ پیٹ کا دوزخ تو آدمی کو ہر حال میں بھرنا ہی پڑتا ہے۔ بڑے سے بڑا غم سہہ کر بھی آدمی چار چھ وقت سے زیادہ کا فاقہ نہیں کرسکتا۔'' وہ اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا تو رامو نے بھی اس کی پیروی کی۔

''فاروق تو ابھی تک پہنچا نہیں۔ جنے کدھر پھر رہا ہے۔ اکیلے باہر کھانا کھانے کی عادت تو نہیں ہے اسے۔'' بال کمرے کی طرف جاتے ہوئے ایک بار پھر اسے فاروق کی فکر دامن گیر ہوئی۔ حقیقتاً وہ رامو کے اندازے سے کہیں زیادہ مضطرب تھا اور اس اضطراب کی وجہ محض جولیٹ کا اغوا نہیں تھا۔ کسی بہت غیر معمولی پن کا احساس تھا جو اندر ہی اندر اس کے دل کو مسلے جارہا تھا۔ اپنی اس کیفیت کو وہ خود بھی سمجھنے سے قاصر تھا۔ اس جیسے خود کو باندھ کر رکھنے والے آدمی کی یہ غیر معمولی کیفیت بلاوجہ تھی بھی نہیں۔ اس اڈے کے لوگ اگر اسے اپنے باپ جیسا درجہ دیتے تھے تو وہ بھی ان کو اپنی اولاد کی طرح ہی سمجھتا تھا اور پھر فاروق اور گولو کی تو بات ہی الگ تھی۔ ان دونوں کے لیے اس کے دل میں جتنا پیار تھا، اس کا تو کسی کو اندازہ بھی نہیں ہوسکتا تھا۔ پیار کی شدت ہی تو تھی جو فاروق پر ٹوٹنے والی مصیبت سے بے خبر ہوتے ہوئے بھی اس کا دل کسی انہونی کے احساس سے دھڑکے جارہا تھا۔ دسترخوان پر سب کے خیال سے بیٹھ کر کھانا کھاتے ہوئے بھی اس کی بے چینی میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ کھانا بھی اس نے یونہی رسمی سا کھایا۔ دسترخوان پر موجود دوسرے لوگوں نے بھی اس کی کیفیت کو محسوس کیا لیکن اس کا موڈ دیکھتے ہوئے کسی نے مخاطب ہونے کی جرأت نہیں کی۔ کھانا لذیذ ہونے کے باوجود کسی سے سیر ہوکر نہ کھایا جاسکا اور جلد دسترخوان سمیٹ لیا گیا۔ کھانے کے بعد گولو نے سب کو بجو کا بنایا ہوا قہوہ پیش کیا۔ قہوہ پینے کے بعد پیالیاں سمیٹی جاچکی تھیں جب جوزفین کی خبر لینے اسپتال جانے والا لوٹ کر آیا۔ اس کے پاس کوئی اچھی خبر نہیں تھی۔

''ڈاکٹر کہتے ہیں دل کا دورہ پڑا ہے۔ حالت بہت نازک ہے۔ کس وقت کیا ہوجائے، کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ جوزف کی حالت بھی بہت خراب ہے۔ منہ سے ایک لفظ نہیں نکال رہا بس سر تھامے ایک طرف بیٹھا ہے۔ ایسا معلوم پڑتا ہے جیسے سکتے میں ہو۔'' اس کی فراہم کردہ اطلاعات نے ماحول کو مزید اداس کردیا۔ وہ سارے موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جینے والے تھے لیکن اس المیے نے ہر ایک کو اپنی جگہ کسی نہ کسی حد تک متاثر ضرور کیا تھا۔

''ادھر کی پوری... جانکاری رکھو۔ روپے پیسے کے علاوہ بھی جس چیز کی ضرورت ہو، اسے پورا کرو۔ اپن کے بس میں جو ہے وہ تو کرنا ہی چاہیے۔ باقی اوپر والے کی مرضی کہ وہ کیا چاہتا ہے۔'' ملنے والی خبروں کو سن کر پل بھر خاموش رہنے کے بعد ربن نے ہدایات جاری کیں اور خود سب کے درمیان سے اٹھ کر چلا گیا۔ اس کے پیچھے رامو نے سارے معاملات نمٹانے شروع کردیے۔ پہلے دو افراد کو رقم دے کر اسپتال روانہ کیا اور پھر پہرے پر موجود آدمیوں کی تبدیلی کے سلسلے میں احکامات جاری کرنے لگا۔ جلد ہی علاقے کا پہرا دینے کے لیے نئے بندے روانہ ہوگئے اور پہلے والے واپس لوٹنے لگے۔ ان کے تازہ دم ہونے تک بجو اور گولو نے پھرتی سے دسترخوان لگادیا۔ ان افراد کو چونکہ ابھی موقع ملا تھا چنانچہ کھانا کھاتے ہوئے وہ زور و شور سے گزرنے والے واقعے پر بھی تبصرہ کررہے تھے۔

''معلوم نہیں کیا گڑبڑ ہے۔ کئی دن سے جوزف کے گھر موٹر سے اتر کر ایک بندے کو جاتے ہوئے تو سب نے ہی دیکھا ہے۔ حلیے سے وہ بندہ ڈرائیور لگتا تھا اور ہمیشہ کچھ نہ کچھ ہاتھ میں لیے جوزف کے دروازے تک جاتا تھا۔ دروازے سے اندر جاتے ہم نے کبھی نہیں دیکھا جو سمجھیں کہ وہ سالا جوزف کا کوئی رشتے دار تھا۔''

''کیا جوزف کی بیٹی کو اٹھانے والے اسی موٹر میں ڈال کر لے گئے ہیں جس میں وہ بندہ آتا تھا؟'' ملنے والی ان اطلاعات پر رامو نے چونک کر سوال کیا۔

''نہیں استاد! شیدو نے بتایا ہے کہ لڑکی کو سفید موٹر والے اٹھا کر لے گئے ہیں اور وہ بندہ تو نیلی موٹر میں آتا تھا۔'' ایک بندے نے اس کے سوال کا جواب دیا۔

''نیلی موٹر والے کے بارے میں کچھ چھان پھٹک کی تھی تم لوگوں نے؟'' رامو نے کسی امید کے تحت پوچھا۔

''نہیں استاد! دادا نے اپن کو بنا ضرورت کے محلے والوں کے معاملات میں پڑنے سے منع کررکھا ہے، اس لیے اپن اس چکر میں نہیں پڑا۔'' اسی شخص نے جواب دیا تو رامو ایک گہرا سانس لے کر رہ گیا۔ ربن کی اس ہدایت کا اسے خود بھی علم تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ محلے والوں کو اڈے

کے لوگوں سے کوئی شکایت ہو اس لیے اس نے اپنے آدمیوں کو محدود رکھا ہوا تھا ورنہ بعض اوقات اس بات کا خدشہ رہتا تھا کہ زیادہ سے زیادہ جانکاری رکھنے کے چکر میں اڈے والے کسی کی ذاتیات میں دخل دے بیٹھیں۔ کسی کی مشکل یا پریشانی میں ساتھ دینا البتہ بالکل مختلف بات تھی۔ اس عمل کو حقِ محلے داری سمجھا جاتا جیسا کہ ثریا بانو کے معاملے میں ہوا تھا۔ اس کے بچے کو اغوا ہوتے دیکھ کر فاروق بلاخوف وخطر میدان میں کود پڑا تھا اور اب ربن مستقل اس کی سرپرستی کر رہا تھا۔

''جوزف کا ڈاٹر بڑا اچھا گرل تھا۔ گاڈ نوز اسے کس نے کڈنیپ کرلیا۔ اب واپس آ بھی گیا تو کیا ہوگا۔ اس کا تو پورا لائف برباد ہوگیا۔'' جانی نامی ایک بندے نے افسوس سے تبصرہ کیا تو راموں نے ہونٹ بھینچ لیے۔ سب ہی کو اس واقعے پر افسوس تھا لیکن اصل فکر تو فاروق کی تھی۔ اس کے علم میں یہ خبر آتی تو وہ جانے کیا ردِعمل ظاہر کرتا۔ فاروق جو جولیٹ سے خاموش لیکن بہت گہری محبت کرتا تھا، اس اتنے بڑے المیے کے وقت جانے کہاں غائب ہوگیا تھا؟ ذہن میں چکراتے اس سوال کے ساتھ ہی اس نے دروازے پر دستک کی آواز سنی۔ دستک سن کر گولو نے فوراً باہر کا رخ کیا۔ وہ واپس آیا تو اس کے ساتھ ایک کمزور اور قدرے گھبرایا ہوا آدمی موجود تھا۔

''یہ بولتا ہے استاد کہ اس کے پاس کوئی خاص خبر ہے۔'' گولو نے اسے سیدھا رامو کے سامنے لاکھڑا کیا۔ آنے والے نے دونوں ہاتھ جوڑ کر رامو کو نمسکار کیا۔

''ہاں بھئی کون ہے تو اور کیا خبر لایا ہے؟'' رامو نے نووارد کو سر سے پیر تک گھورتے ہوئے مخصوص لہجے میں پوچھا۔

''میں رام داس کوچبان ہوں دادا...... پچھلے دنوں جو ادھر لفڑا ہوا تھا تو میں ہی اس بابو کو جس نے بچے کو بچایا تھا، ادھر لایا تھا۔'' اس نے لرزتی آواز میں اپنا تعارف کرواتے ہوئے جو حوالہ دیا، اس سے سب سمجھ گئے کہ وہ فاروق کے بارے میں بات کر رہا ہے۔

''ٹھیک ہے اپن سمجھ گیا۔ تو آگے بول کیا بات ہے؟'' رام داس کے انداز میں کوئی غیر معمولی بات محسوس کر کے رامو نے تیز لہجے میں پوچھا۔

''اپن اڈے پاڑے کے لفڑوں میں پڑنے والا آدمی نہیں ہوں دادا۔ اپن بہت گریب ہے پر وہ بابو اپنے کو بہت اچھا لگا تھا اس لیے اپن اسے کٹھنائی میں دیکھ کر رہ نہ سکا۔ خبر (خبر) دینے ادھر آگیا۔'' رام داس کے الفاظ رامو کے ذہن میں پیدا ہوتے اندیشوں کی تصدیق کر رہے تھے۔

''جلدی بتا کیا بات ہے؟'' عالمِ اضطراب میں وہ اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا۔

''اس بابو کا ادھر بازار میں زمرد بائی کے کوٹھے پر مجو دادا اور اس کے آدمیوں سے پھڈا ہوگیا تھا، پر بابو مجو دادا کے ایک انگریز مہمان کی آڑ لے کر ادھر سے نکلنے میں سپھل ہوگیا۔ وہ میرے ہی تانگے میں ادھر سے نکلا تھا۔ راستے میں اس نے انگریز افسر کو تانگے سے اتار دیا۔ میں بابو کو ادھر اڈے پر چھوڑنے آرہا تھا کہ ایک جیپ نے راستہ روک لیا۔ اس جیپ میں مجو دادا، اس کے ساتھی اور انگریز افسر سب تھے۔ انہوں نے بندوقوں کے زور پر بابو کو قابو کرلیا اور جیپ میں بٹھا کر اپنے ساتھ لے گئے۔'' رام داس کوچبان کی دی اطلاع ایسی تھی کہ کوئی بھی اپنی جگہ چین سے بیٹھا نہ رہ سکا۔ گولو تو بے ساختہ ہی ''بابا، بابا'' پکارتا ہوا اوپری منزل کی طرف دوڑا۔

''کدھر لے گئے وہ حرام کے جنے اسے؟'' رامو نے حلق کے بل دہاڑتے ہوئے کوچبان کا گریبان تھام کر اس سے پوچھا۔

''اپن نے جتنا بتایا اس سے جیادہ کچھ نہیں جانتا دادا۔ اپن کو تو بس وہ بابو اچھا لگا تھا اس لیے ادھر کھبر کرنے آگیا تھا۔'' رامو کے تیور دیکھ کر لرزیدہ کوچبان کی گھگی بندھ گئی۔

''اسے چھوڑ دے رامو اور چین سے بیٹھ۔'' گولو کے ساتھ سیڑھیاں اترتے ربن نے بلند آواز میں ٹوکا تو رامو کا ہاتھ کوچبان کے گریبان سے ہٹ گیا لیکن چہرے پر شاک کی کیفیت اپنی جگہ تھی۔

''یہ کہتا ہے دادا کہ فاروق کو مجو دادا اور اس کے ساتھی بندوق کے زور پر اٹھا کر لے گئے ہیں۔ ساتھ کوئی انگریز افسر بھی تھا۔'' اس نے ربن کو اطلاع فراہم کی، کیونکہ ربن کے پیچھے پیچھے سیڑھیاں اترتے گولو کی حالت سے صاف اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ ربن کو کوئی کام کی بات نہیں بتا سکا... ہوگا۔ بری طرح بلکتا وہ مسلسل بس فاروق بھائی، فاروق بھائی کی گردان کر رہا تھا اور ربن یقیناً اصل صورتِ حال جاننے کے لیے ہی نیچے آرہا تھا۔ رامو کی فراہم کردہ اطلاع پر اس کے چہرے پر پل بھر کو تاریک سا سایہ لہرایا لیکن پھر اس نے خود کو سنبھال لیا۔

''اپنے کو اجازت دو دادا۔ اس مجو دادا کے اڈے کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے۔ اس حرام کے پلّے کی ہمت کیسے ہوئی اپنے فاروق بھائی پر ہاتھ ڈالنے کی؟''

ربن سیڑھیاں اتر کر رامو کے برابر میں آکر کھڑا ہوا تو اڈے کے لوگوں نے طیش کے عالم میں بولنا شروع کر دیا۔

''شیدو بالکل ٹھیک بولا دادا۔ اپنے فاروق بھائی کے لیے تو جان بھی حاضر ہے۔'' ایک اور نے بولنے والے کی تائید کی اور پھر تو سب ہی نے بولنا شروع کر دیا۔ وہ سب ہی بہت زیادہ غم و غصے کا شکار تھے۔

''بس۔'' ربن نے ہاتھ اٹھا کر ان سب کو بولنے سے روکا پھر سنجیدگی سے رامو کی طرف متوجہ ہوا۔

''اپن کو پوری بات بول رامو۔'' جواب میں رامو نے اسے کوچبان کی فراہم کردہ مکمل خبر منتقل کر دی۔ اس سارے قصے میں فاروق کا زمرد بائی کے کوٹھے پر جانا سب کے لیے تعجب کا باعث تھا۔ وہ سب لگ بھگ آٹھ سال سے فاروق کو جانتے تھے اور اچھی طرح واقف تھے کہ اسے اس بازار سے کوئی شغف نہیں تھا تو پھر آخر وہ کیا کرنے وہاں گیا تھا؟ یہ ایک ایسا سوال تھا جس کا جواب کسی کے پاس نہیں تھا۔ ربن کے بہت سے سوالوں کے جواب میں کوچبان بھی بس اتنا ہی بتا سکا جو اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، البتہ اس سے ایک کام کی بات پتا چل گئی۔ اس کے مطابق گورے افسر نے فاروق کو اپنے ساتھ پولیس اسٹیشن لے جانے اور اپنے طریقے سے نمٹنے کا ذکر کیا تھا اور مجو کی خواہش پر بھی فاروق کو اس کے حوالے کرنے کے لیے تیار نہیں ہوا تھا۔ ان ساری معلومات کے حصول کے بعد کوچبان کو وہاں سے جانے کی اجازت دے دی گئی۔ ربن کے اشارے پر رامو نے اسے چند نوٹ بھی تھما دیے۔

''یہ تو بڑی گڑبڑی ہو گئی دادا۔ اپن تو سمجھا تھا کہ فاروق کو مجو نے اس لیے پکڑا ہوگا کہ اس کے بدلے اپنے ساتھ ثریا بانو کا سودا کر سکے پر وہ گورا تو اسے اپنے ساتھ تھانے لے گیا۔ اب یہ بھی نہیں پتا کہ وہ کس تھانے میں لے گیا ہوگا اپنے شہزادے کو۔'' رام داس کوچبان کی روانگی کے بعد سب سے پہلے رامو نے لب کشائی کی۔

''تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔ مجو نے سوچا تو کچھ ایسا ہی ہوگا لیکن اپنے گورے دوست کی وجہ سے مجبور ہو گیا۔ خیر کوئی بات نہیں، اپن کا کام تھوڑا بڑھ گیا ہے پر معلوم تو ہو ہی جائے گا کہ کدھر رکھا ہے اس گورے نے اپنے جگر کے ٹکڑے کو۔'' ربن کی آنکھوں میں سرخی اور لہجے میں سنگینی تھی۔

''دادا ایک دم ٹھیک کہہ رہا ہے رامو استاد...... اپنے فاروق بھائی کی تلاش میں ہم لوگ شہر کا ایک ایک تھانہ چھان مارے گا۔'' وجے نے جذباتی لہجے میں اعلان کیا۔

''تھوڑا سنبھل کر رے۔ جوش میں آدمی کی بدھی ماری جاتی ہے۔ کیا ادھر میدان خالی چھوڑ کر تم سارے کے سارے تھانے چھاننے نکل کھڑے ہو گے تاکہ پیچھے سے وہ مجو آئے اور ہاتھ دکھا جائے۔ ہاتھ پیر سنبھال کر سب ادھر ہی بیٹھو۔ جب ضرورت ہو گی تو اپن خود تم سے بولے گا۔'' ربن نے گویا سب کو ایک مشترکہ ڈانٹ پلائی پھر خود رامو کی طرف متوجہ ہوا۔

''تو نانا کی طرف چلا جا رامو۔ اس کو سب حال بولنا۔ نانا کام کا آدمی ہے۔ ادھر مجو کے اڈے پر بھی ایک دو بندے اس کا دم بھرتے ہیں۔ نانا سے بول کہ ان بندوں کے ذریعے معلوم کرنے کی کوشش کرے کہ گورا افسر فاروق کو کدھر لے گیا ہے۔ مجو اور اس کے چیلوں کو ضرور اس تھانے کا پتا معلوم ہو گا۔ تھانے کا پتا لگ جائے تو اپن فاروق کو ادھر سے لانے کے واسطے ہاتھ پیر مارے گا۔'' ربن کے رامو کو دیے گئے حکم نے ثابت کر دیا کہ واقعی وہ بہت مضبوط اعصاب کا بندہ ہے جو خراب ترین حالات میں بھی درست سمت میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ فاروق کی تلاش میں شہر کے سارے تھانوں کو چھاننے کے مشکل اور دقت طلب کام کے مقابلے میں یہ کہیں زیادہ آسان تھا کہ مجو کے اڈے سے معلومات حاصل کی جائیں۔ رامو اس کے حکم پر ایک بندے کے ساتھ نانا کے پاڑے پر جانے کے لیے فوراً ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے ساتھ ہی ربن بھی وہاں موجود افراد کو حفاظت اور چوکسی کے سلسلے میں چند ہدایات دینے کے بعد کہیں روانگی کے لیے تیار ہو گیا تھا۔ وہ کسی کو بھی اپنے ساتھ نہیں لے جا رہا تھا اور کسی میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ اس سے اس کے ارادے کی بابت دریافت کر سکے۔

''تو اپنا بولا کام نمٹا، اپن بھی فارغ ہو کر ادھر نانا کے پاڑے پر ہی پہنچے گا۔'' نکلتے سے اس نے رامو سے صرف اتنا کہا تھا اور سب کو الجھن زدہ چھوڑ کر کسی نامعلوم مقام کے لیے روانہ ہو گیا تھا۔ دم بہ دم گہری ہوتی رات میں جب وہ پورے شہر کے معمول سے الٹ رات کی تاریکی میں جاگ اٹھنے والے بارونق و روشنیوں سے جگمگاتے محلے میں داخل ہو رہا تھا تو عین اسی وقت اسپتال کے بستر پر موجود موت و زیست کی کشمکش میں مبتلا جوزفین نے اپنی آخری سانس لی تھی اور اسے زندگی کی طرف لوٹانے کی جدوجہد کرنے والے مسیحاؤں کو قدرت کے فیصلے کے سامنے اپنی شکست کا اعتراف کرنا پڑا تھا۔

☆☆☆

آسمانی مہین آنچل کو نزاکت سے انگلیوں میں دبائے سج سج چلتی وہ ہموار راستے سے گزر رہی تھی کہ یک دم ہی راستہ پتھریلا اور ناہموار ہو گیا اور اس کے خوب صورت چہرے پر پریشانی جھلکنے لگی۔ اس نے پیچھے مڑ کر اس راستے کو دیکھنا چاہا جس سے گزر کر وہ یہاں تک پہنچی تھی لیکن کچھ نظر نہ آیا۔ ایسا لگتا تھا جیسے پیچھے کوئی خلا ہو جس سے گزر کر وہ اس پتھریلی زمین پر پہنچی ہو۔ عالم مجبوری میں اس نے اسی پتھریلے راستے پر چلنا شروع کر دیا لیکن اس کے نازک پیروں نے ابھی چند قدم کا ہی فاصلہ طے کیا تھا کہ وہ بری طرح لڑکھڑائی اور اس کے پیروں سے چپلیں نکل کر یکا یک کہیں غائب ہو گئیں۔ اس کے حسین چہرے پر پریشانی کا تاثر مزید بڑھ گیا۔ اس نے ادھر اُدھر نظریں گھما کر پہلے اپنی چپلیں ڈھونڈنی چاہیں لیکن پھر ناکام ہونے پر ننگے پیر ہی آگے کی سمت چل پڑی۔ ننگے پاؤں ہونے کی وجہ سے نکیلے پتھروں سے بھرا دہ راستہ اس کے تلوؤں کو زخمی کر رہا تھا اور زخموں سے نکلتا خون راستے کو بھی رنگین کرتا جا رہا تھا۔

کچھ اور آگے چلنے پر اس راستے پر جھاڑیاں نظر آنے لگیں۔ یہ بے پھل اور بے پھول کانٹے دار جھاڑیاں تھیں جن میں آہستہ آہستہ اتنا اضافہ ہوتا جا رہا تھا کہ اس کے گزرنے کے لیے راستہ بھی تنگ ہو گیا تھا۔ بالآخر بے پناہ احتیاط کے باوجود اس کا آسمانی آنچل ایک کانٹے دار جھاڑی میں الجھ گیا۔ اس نے گھبرا کر آنچل کو جھاڑی سے آزاد کروانا چاہا لیکن کامیاب ہونے کے بجائے بری طرح ڈگمگائی اور لڑھک کر یک دم ہی منظر سے غائب ہو گئی۔ جھاڑی کی دوسری طرف کوئی کھائی تھی یا کچھ اور...... بالکل بھی اندازہ نہیں ہو رہا تھا کیونکہ اس طرف بہت گہری دھند تھی۔ بصارت کو بالکل صفر کر دینے والی دھند اور اس دھند کے سوا اگر منظر میں کچھ نظر آتا تھا تو وہ تھا جھاڑیوں میں اٹکا اس کا آسمانی مہین آنچل۔

''جولی......'' اس منظر کو دیکھ کر فاروق نے ایک وحشت بھری چیخ ماری اور اپنے بھاری ہوتے پپوٹوں کو بڑی جدوجہد سے کھولنے کے بعد ارد گرد کے منظر کو دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ آنکھوں سے بہتے پانی کے باعث دھندلا جانے والی نظر کے ساتھ کچھ بھی دیکھنا، وہ بھی اس صورت میں کہ آدمی کا جسم چھت کے ساتھ الٹا لٹکا ہوا ہو، بہت مشکل تھا۔ پھر بھی اپنی قوتِ ارادی کو مجتمع کرنے کے بعد وہ اس لائق ہو گیا کہ سپاٹ دیواروں والے اس کمرے کو شناخت کر سکے جہاں وہ اس وقت موجود تھا۔ کمرے کو شناخت کرتے ہی اسے یاد آ گیا کہ یہ اس تھانے کا کمرا ہے جہاں اسے ولیم لے کر آیا تھا اور ولیم کے حکم پر اسے کچھ بھی کہنے سننے کا موقع دیے بغیر ایک موٹی رسی سے باندھ کر چھت کے ساتھ الٹا لٹکانے کے بعد بے تحاشا مارنا شروع کر دیا گیا تھا۔

مارنے والے دو پولیس کے سپاہی تھے جو ڈنڈوں کی مدد سے بنا کسی تکلف کے اسے بے تحاشا مارتے رہے تھے۔ مارتے ہوئے انہوں نے کوئی تخصیص نہیں رکھی تھی کہ اس کے جسم کے کس حصے پر ضرب لگ رہی ہے۔ اس فری اسٹائل مارکٹائی کے دوران دونوں سپاہیوں میں سے کسی ایک کے ڈنڈے نے اس کے سر کے پچھلے حصے کو بھی نشانہ بنا ڈالا تھا جس کے نتیجے میں وہ بے ہوش ہو گیا تھا اور اب آنکھ کھلی تو اس کیفیت میں کہ وہ اپنی جسمانی چوٹوں سے زیادہ اس خواب کی وجہ سے بے چین تھا جو اس نے عالمِ غنودگی میں دیکھا تھا۔ ہاں وہ خواب ہی تھا جس میں وہ جولی کو عجیب و غریب حالات سے گزرتا ہوا دیکھ رہا تھا اور اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اس نے ایسا خواب کیوں کر دیکھا؟ کیا صرف اس لیے کہ وہ کئی دن سے جولی کو پریشان محسوس کر رہا تھا اور اب خود مشکل میں گرفتار ہو گیا تھا تو وہ کچھ اور بھی شدت سے یاد آئی تھی لیکن شاید ایسا نہیں تھا۔ بات محض اتنی سی نہیں تھی۔ اگر اتنی سی بات ہوتی تو دل کو اتنی شدید بے چینی لاحق نہ ہوتی جو اس وقت وہ محسوس کر رہا تھا۔ اس کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ کوئی بہت بڑی گڑبڑ ہو چکی ہے اور جولی کسی مشکل میں پھنس گئی ہے۔

''کوئی ہے؟'' اضطرابی کیفیت میں وہ حلق میں چبھے کانٹوں کے باوجود پوری قوت سے چلّایا۔ اس کا دل کہہ رہا تھا کہ کم سے کم آج اسے اس عالمِ بے کسی میں نہیں ہونا چاہیے تھا جس میں وہ مبتلا تھا۔

''کیا بات ہے ہیرو...... کیوں چلّا رہا ہے؟'' دو تین بار پکارنے پر زرد روشنی میں اسے مارنے والے سپاہیوں میں سے ایک کی صورت دکھائی دی اور اس نے پُرخشونت لہجے میں پوچھا۔

''مجھے یہاں سے جانا ہے۔'' اس کے لہجے کی پروا کیے بغیر فاروق نے بے چینی سے اپنا مدعا بیان کیا۔

''ہا...... ایسے کیسے ہیرو۔ ابھی تو ہم تیرے اندر سے تیری ساری غنڈا گردی اور اکڑ باہر نکالیں گے تاکہ تو بھی جان لے کہ بڑے افسروں سے پنگا لینے والے تجھ جیسے بدمعاشوں کا کیا انت ہوتا ہے۔'' سپاہی نے اسے استہزائیہ

لہجے میں جواب دیا۔
''میں صاحب سے معافی مانگنے کو تیار ہوں۔ تم مجھے ان کے سامنے لے چلو، میں خود ان سے بات کرلوں گا۔'' عام حالات میں فاروق کبھی یہ انداز اختیار نہیں کرتا۔ ربن کی تربیت نے اس کو اتنا جاندار تو ضرور بنا دیا تھا کہ جسمانی چوٹوں کو خاموشی سے سہہ جاتا لیکن یہ تو دل کی بے چینی تھی جو اسے اتنے التجائیہ انداز میں بات کرنے پر مجبور کررہی تھی۔
''معافی تو تجھے مانگنی ہی مانگنی ہے، پر پہلے کیے کی سزا تو بھگت لے۔ صاحب کا اپمان کرکے اتنی آسانی سے اپنی جان کیسے چھڑا سکتا ہے تو۔'' سپاہی کو اس پر ذرا رحم نہیں آرہا تھا۔
''تم صاحب سے میری بات تو کرواؤ۔'' مایوس کن جواب کے باوجود اس نے ایک بار پھر درخواست کی۔
''منہ بند کرکے لٹکا رہ۔ صاحب تیری بتی سننے کو کوئی ادھر ہی جم کر نہیں بیٹھے ہوئے۔ اب وہ سویرے ہی ادھر آئیں گے پھر تیرا فیصلہ کریں گے۔ اپنے کو تجھے ساری رات ایسے ہی لٹکا کر رکھنے کا حکم ہے۔ اگر زیادہ شور کیا تو ایک بار پھر ڈنڈے سے سر بجا کر چپ کروادیں گے۔'' سپاہی اسے بری طرح ڈپٹ کر باہر نکل گیا۔ وہ بھلا کیسے سمجھ سکتا تھا کہ التجا کرتا یہ شخص الٹا لٹکے رہنے کی اذیت سے بھی بڑھ کر کسی اذیت میں مبتلا ہے، ورنہ کبھی بھول کر بھی اس سے کوئی درخواست نہیں کرتا۔

☆☆☆

زمرد بائی اور چاند بانو دونوں ربن دادا کے روبرو بیٹھی تھیں۔ زمرد بائی کے چہرے کے تاثرات میں سراسیمگی اور چاند بانو کے تاثرات میں آزردگی کا عنصر غالب نظر آتا تھا۔
''ہم تو بڑی مشکل میں پڑ گئے سرکار۔ آپ کی آپس کی دشمنی ہم غریبوں کے لیے آزمائش بن گئی ہے۔ ساری لڑکیاں اور ملازم خوف زدہ ہیں کہ جانے آگے کیا ہونے والا ہے۔ آس پاس حسد کرنے والوں کی پہلے ہی کمی نہیں تھی۔ اب سارے کے سارے حاسد کان لگائے بیٹھے ہیں کہ زمرد بائی کے بالا خانے پر ہونے والے ہنگامے کی اصل وجہ جان سکیں۔ بات بھی تو معمولی نہیں۔ گولی چلی ہے یہاں اور آواز دور دور تک گئی ہے۔ وہ تو میرے مولا نے خیر کی کہ کوئی غریب ملازم گولی کی زد میں نہیں آگیا۔ ورنہ میں اکیلی عورت کہاں تھانے چوکی کے چکر میں پڑتی۔ اب بھی کوئی کم پریشانی نہیں ہے۔ مجو دادا صاف دھمکیاں دے گیا ہے کہ بعد کو ہم سے نمٹ لے گا۔ اکیلے مجو دادا کی بات ہوتی تو پھر بھی چلو میں کوئی نہ کوئی حل نکال لیتی لیکن ادھر تو گورے افسر کا بھی مسئلہ ہے۔ ان گوروں کا راج چلتا ہے پورے ہندوستان میں۔ وہ چاہے گا تو ہمیں اس بازار سے ہی نکلوا دے گا۔ اب آپ ہی بتائیں سرکار کہ یہ ٹھکانا ہاتھ سے نکل گیا تو ہم سارے کے سارے کدھر جائیں گے۔ ایک اکیلی میری جان کا رزق تو بندھا نہیں ہے اس بالا خانے سے۔ دسیوں جی اور بھی لگے ہیں ساتھ۔ لڑکیاں ہیں، سازندے ہیں، کام کاج نمٹانے والے ملازمین ہیں۔ آخر اتنی بہت سی جانوں کو لے کر میں کدھر کا رخ کروں گی۔ میں تو بڑی مشکل میں پڑگئی۔''
زمرد بائی کو اپنی ہی فکر لاحق تھی اور نہیں جانتی تھی کہ ربن اس سے بھی بڑی پریشانی میں مبتلا اس کے کوٹھے تک آیا ہے۔ اس نے صورت حال سے مکمل آگاہی کی خاطر زمرد بائی سے ملاقات کا فیصلہ کیا تھا۔ اس کی آمد کی اطلاع سن کر چاند بانو از خود زمرد بائی کے پیچھے وہاں چلی آئی تھی اور قدرے کوفت زدہ سی بائی کی باتیں سن رہی تھی۔ زمرد بائی نے ربن کی آمد کی وجہ جاننے کی کوشش کیے بغیر اپنا رونا گانا شروع کردیا تھا جبکہ چاند بانو کے دل میں یہ خیال تھا کہ آخر ربن کو ایسی کیا ضرورت محسوس ہوئی کہ فاروق کے یہاں سے لوٹنے کے بعد وہ از خود یہاں چلا آیا۔
یہ ٹھیک تھا کہ مجو کے سامنے فاروق نے خود اس کوٹھے کی حفاظت کا اعلان کیا تھا لیکن اگر ربن کی آمد اسی سلسلے کی کوئی کڑی تھی تو اسے اکیلا یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ فاروق کا ساتھ میں آنا غیر ضروری سمجھا جاتا پھر بھی دو چار دوسرے بندے تو ساتھ ہوتے جو کوٹھے کی حفاظت کی ذمے داری سنبھال لیتے لیکن ایسا کچھ نہیں تھا بلکہ الٹا ربن کے چہرے کی گمبھیرتا چاند بانو کا دل ہولا رہی تھی۔ زمرد بائی نے تو ربن سے یہ بھی دریافت نہیں کیا تھا کہ یہاں سے نکلنے کے بعد فاروق صحیح سلامت اڈے تک واپس پہنچ گیا ہے یا نہیں۔ اس کی تو اپنی ہی کہانیاں چل رہی تھیں جو جانے کتنی دیر تک چلتی رہتیں اگر جو ربن ہاتھ اٹھا کر اسے مزید بولنے سے نہ روک دیتا۔
''فاروق یہاں کیوں آیا تھا؟'' زمرد بائی کا منہ بند ہوا تو ربن نے اس سے سوال کیا۔
''یہ بھی خوب ہی پوچھا آپ نے سرکار۔ یہ بھی بھلا کوئی پوچھنے والی بات ہے کہ کوئی آنے والا یہاں کیوں آیا تھا۔'' ناک پر انگلی رکھتے ہوئے زمرد بائی نے اس کے سوال پر حیرت کا اظہار کیا۔
''کسی اور میں اور فاروق میں بہت فرق ہے زمرد

بائی۔ فاروق ان لوگوں میں سے نہیں ہے جو دل بہلانے کو اس بازار کا رخ کرتے ہیں۔ اگر وہ یہاں آیا تھا تو اس کے پیچھے کوئی خاص وجہ ہوگی اور میں وہ وجہ جاننا چاہتا ہوں۔'' ربن نے دوٹوک لہجے میں اپنی آمد کا مقصد بیان کیا۔

''وہ ہمارے بے حد اصرار پر بڑی مجبوری میں یہاں آئے تھے دادا۔'' اس سے قبل کہ زمرد بائی ربن کو گھما پھرا کر کوئی جواب دیتی، چاند بانو نے اعتراف کرلیا اور جھکی نظروں سے بتانے لگی۔

''نانا کے پاڑے پر سجنے والی محفل میں ہم نے انہیں دیکھا تھا اور وہیں، اپنا دل ہار بیٹھے تھے۔ ہم نے اسی وقت اپنے ایک خاص ملازم کے ہاتھ انہیں رقعہ پہنچا کر ملاقات کی درخواست بھی کرڈالی تھی لیکن جب ان پر ہماری درخواست کا کوئی اثر نہیں ہوا تو ہم پر ضد سوار ہوگئی اور کسی نہ کسی طور ہم نے انہیں راضی کر ہی لیا کہ وہ صرف ایک بار یہاں آکر ہم سے مل لیں۔ ہماری التجا پر وہ صرف ایک ملاقات کرنے کی خاطر یہاں تک آئے تھے لیکن بڑی مشکل میں گرفتار ہو گئے۔ یہ ان کی جرأت اور بہادری ہی تھی کہ اتنی خراب صورتِ حال کو سنبھال لیا اور دسیوں دشمنوں پر قابو پاکر یہاں سے نکلنے میں کامیاب ہوگئے۔ وہ خیریت سے آپ تک پہنچ تو گئے ہیں نا؟'' چاند بانو کے لہجے میں وہی تشویش تھی جو کوئی محبت کرنے والا اپنے محبوب کے لیے محسوس کرتا ہے۔

''اپن کو یہاں ہونے والے لفڑے کی ساری تفصیل بتاؤ لڑکی۔'' اس کے سوال کو نظرانداز کرتے ہوئے ربن نے اس سے مطالبہ کیا تو وہ دھیرے دھیرے سارا واقعہ سنانے لگی۔ رام داس کو چہان کے ذریعے اس کے علم میں صرف وہی کچھ آیا تھا جو اس بالاخانے سے باہر پیش آیا تھا۔ چاند بانو کی سنائی گئی تفصیل نے ساری تصویر واضح کردی۔

''بتایئے نا دادا کہ وہ خیریت سے پہنچ گئے ہیں یا نہیں؟'' سب سن کر دل ہی دل میں حساب کتاب کرتے ربن کی خاموشی کو محسوس کرکے چاند بانو نے بے چینی سے دریافت کیا۔

''نہیں، وہ خیریت سے اپن تک نہیں پہنچا تب ہی تو اپن ادھر دوڑا آیا ہے۔'' اسے جواب دیتے ہوئے ربن دادا نے کوچہان کی زبانی علم میں آنے والے حالات اختصار سے بیان کردیے۔ فاروق کے غیاب کی خبر سن کر چاند بانو نے بے ساختہ ہی اپنے سینے پر ہاتھ رکھ لیا اور اس کے خوب صورت نینوں سے ٹپاٹپ آنسو گرنے لگے۔

''یہ سب ہماری وجہ سے ہوا ہے۔ نہ ہم اتنا اصرار کر کے انہیں یہاں آنے پر مجبور کرتے، نہ ہی وہ اس مشکل میں پڑتے۔'' اس کے لہجے میں پچھتاوا تھا۔

''نصیب سے بھاگ کر آدمی کدھر جا سکتا ہے۔ جو اس کے نصیب میں لکھا تھا، سو ہوا۔ اب تو یہ دعا کرو کہ وہ جہاں ہو خیریت سے ہو اور ہم اسے ڈھونڈ لانے میں کامیاب ہو جائیں۔'' ربن عام آدمی نہیں تھا کہ چاند بانو کے اعتراف کو اس کا جرم بنا ڈالتا۔ اس نے ایک زمانہ دیکھ رکھا تھا اور سمجھتا تھا کہ وہ سچ مچ فاروق کے آگے اتنی بری طرح دل ہار گئی ہوگی کہ ہزار جتن کرکے اسے کسی نہ کسی طور ایک ملاقات پر راضی کرلیا ہوگا۔ اس کے بعد آگے جو کچھ پیش آیا، وہ محض اتفاق تھا جسے نصیب کا لکھا ہی قرار دیا جا سکتا تھا اور نصیب کے لکھے کے لیے کسی بے بس کو الزام دینا بھلا کہاں کا اصول تھا چنانچہ اپنے دل کی ابتر کیفیت کے باوجود اس نے چاند بانو کو دلاسا دیا۔ اس کی بات سن کر چاند بانو کے گلاب کی پنکھڑیوں سے ہونٹ محض لرز کر رہ گئے اور کوئی آواز نہ نکل سکی۔ اب معلوم نہیں ان لرزیدہ ہونٹوں سے اس نے ربن سے کچھ کہنا چاہا تھا یا اس کی حسبِ ہدایت فاروق کے لیے کوئی دعا مانگی تھی۔

''اس بالاخانے کی حفاظت کا کیا ہوگا سرکار؟'' ربن دادا واپسی کے لیے کھڑا ہوا تھا کہ زمرد بائی نے یاددہانی کروانے والے انداز میں اس سے دریافت کیا۔

''اپنے بندے ادھر پہنچ جائیں گے۔ اپنے دل کے ٹکڑے نے تم سے جو وعدہ کیا تھا، اپن اسے پورا کیے بغیر کیسے رہ سکتا ہے۔'' ربن نے سنجیدگی سے اسے جواب دیا اور تیز تیز قدموں سے باہر کی طرف بڑھ گیا۔ رات خاصی گہری ہو چکی تھی لیکن جن کے دلوں میں آگ لگی ہو، وہ کہاں چین سے بیٹھ سکتے ہیں۔ ربن کو بھی کسی طرح قرار نہیں تھا۔ اس.... بے قراری کو سینے میں چھپائے وہ زمرد بائی کے کوٹھے سے سیدھا نانا کے پاڑے کی طرف روانہ ہوگیا۔ رامو کی پہلے سے موجودگی کے باعث وہاں سب کو اس کی آمد کے بارے میں علم تھا چنانچہ گلی میں ہی ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور فوراً ہی نانا تک پہنچا دیا گیا۔ نانا نے بڑی دلجوئی کرنے والے انداز میں اس سے معانقہ کیا اور ہاتھ پکڑ کر اپنے پہلو میں ہی بٹھالیا۔

''بندے کو پیغام بھجوا دیا ہے۔ تھوڑی دیر میں پہنچتا ہی ہوگا۔ اپن نے کہلوا دیا تھا کہ پوری جانکاری لے کر ادھر آئے اس لیے اسے تھوڑا سمے لگ گیا ہے ورنہ اپنے بلاوے پر تو فوراً سر کے بل دوڑا آتا ہے۔'' ربن کا ہاتھ اپنے ہاتھ سے دباتے ہوئے نانا نے آہستہ سے اسے بتایا۔ جواباً وہ

محض سر ہلا کر رہ گیا۔ انتظار کا ایک ایک پل اس پر بھاری تھا۔ نانا کے ایک آدمی نے خوشبودار قہوہ لا کر پیش کیا تو اس کی طرف بھی ہاتھ نہ بڑھایا۔

''ایسا کیا دادا، تھوڑا ہمت سے کام لو۔ تمہارا لونڈا تمہارے کو مل جائیں گا۔ وہ صرف تمہارا نہیں، اپنا بھی بچہ ہے۔ اس دن دعوت پر آیا تھا تو اپنے من کو بھی بہت بھایا تھا۔ اپن کوئی اسے اس کے حال پر چھوڑنے والا تھوڑی ہے۔ بھگوان کی سوگند جب تک وہ تم تک پہنچ نہیں جاتا، اپن بھی چین سے نہیں بیٹھے گا۔'' اس کی کیفیت کو محسوس کر کے نانا اسے دلاسا دینے لگا۔ اس کے ایک بار مزید اصرار پر ربن نے قہوے کی پیالی تھام لی۔ رامو اور نانا نے بھی ساتھ دیا اور تینوں چھوٹی چھوٹی چسکیاں بھرنے لگے۔ خوش ذائقہ و خوشبودار قہوہ اس وقت بہت بے دلی سے بس ایک دوسرے کی خاطر ہی حلق سے اتارا جا رہا تھا۔ قہوے کی پیالیاں خالی ہونے سے قبل ہی درمیانی قامت اور سانولی رنگت کے ایک آدمی کو ان کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ وہ یقیناً ربن کو پہچانتا تھا چنانچہ نانا کے ساتھ اسے بھی نہایت ادب سے پرنام کیا۔

''ہاں بھئی سوریا کیا کھبر لایا ہے۔ اپنا کام ہوا یا نہیں؟'' نانا نے بارعب لہجے میں اس سے دریافت کیا۔

''تم کوئی کام بولو اور اپن اسے نہ کرے، ایسا کیسے ہو سکتا ہے نانا۔ تمہارے حکم پر تو اپن اپنی جان بھی دے سکتا ہے۔'' اس نے نہایت عقیدت مندانہ لہجے میں نانا کی بات کا جواب دیا۔ اصل میں نانا کی حیثیت اس کے لیے ایک محسن کی سی تھی۔ چند برس قبل جب وہ بہت معمولی سا غنڈا تھا اور نیا نیا مجو کے اڈے سے وابستہ ہوا تھا، اس کے سر پر ایک بڑی مصیبت آن پڑی تھی۔ کچھ غنڈوں نے اس کی چھوٹی بہن کو تاڑ لیا تھا۔ وہ آتے جاتے اس بے چاری کو تنگ کرنے لگے تھے۔ بیزار ہو کر اس نے گھر سے نکلنا ہی کم کر دیا لیکن گھر کی چار دیواری میں بھی کم بخت اسے چین سے نہیں بیٹھنے دے رہے تھے۔ دروازے کے باہر کھڑے ہو کر واہیات فقرے کسنا اور گھر کے اندر الٹی سیدھی چیزیں پھینکنا ان کا محبوب مشغلہ بن گیا تھا۔ سوریا ان دنوں مجو کے اڈے پر اپنی جگہ بنانے کے چکر میں تھا اس لیے دن رات کا بیشتر حصہ وہیں گزارتا تھا۔ اسے کچھ خبر نہیں تھی کہ اس کے گھر میں کیا پریشانی چل رہی ہے اور جوان بہن اور بوڑھی ماں کس مشکل میں مبتلا ہیں۔ اس کے مزاج کی تیزی کی وجہ سے ماں اور بہن نے بھی اسے کچھ نہیں بتایا تھا اور خاموشی سے سب کچھ سہہ رہی تھیں لیکن ایسی باتیں کب تک چھپتی ہیں۔ ایک دن اتفاق سے سوریا دن کی روشنی میں گھر کی طرف آنکلا اور اس نے اپنے دروازے پر کھڑے بے ہودہ فقرے کستے غنڈوں کو دیکھ لیا۔ ایسے میں بھلا اس کے لیے خاموش رہنا کیسے ممکن تھا۔ وہ اپنے اناڑی پن اور ان غنڈوں کی تعداد کو خاطر میں لائے بغیر ان سے بھڑ گیا۔ نیا نیا چاقو تھامنا سیکھا تھا، چار چار مشٹنڈوں سے مقابلہ کیسے کر پاتا نتیجے میں اچھا خاصا زخمی ہو گیا۔ بند دروازے کے پیچھے کانپتی لرزتی ماں بہن اسے زخمی دیکھ کر اندر کیسے رک سکتی تھیں چنانچہ گھبراہٹ میں باہر نکل آئیں۔ اس کی بہن کو سامنے پا کر غنڈوں نے اعلان کر دیا کہ وہ لڑکی کو اپنے ساتھ اٹھا کر لے جا رہے ہیں۔ جس مائی کے لال میں ہمت ہو، ان کا راستہ روکنے کی کوشش کر دیکھے۔

سوریا اپنے ہی خون میں لت پت پڑا خاک چاٹ رہا تھا، بہن کی ڈھال کیسے بنتا۔ بوڑھی کمزور ماں ان غنڈوں کے قدموں میں گر کر رحم کی التجا کرنے کے سوا کیا کرنے کے لائق تھی۔ محلے والوں کی حیثیت بھی تماش بینوں سے زیادہ نہیں تھی کہ ان میں سے کوئی بھی پرائی آگ میں ہاتھ ڈال کر اپنا گھر خاک کروانے کی حماقت نہیں کر سکتا تھا۔ ایسے میں نانا کا وہاں سے اتفاقیہ گزر سوریا کی بہن کو بچانے کا سبب بن گیا۔ سوریا کو سیکنڈوں میں پچھاڑ دینے والے غنڈے نانا کی مہارت کے سامنے چند منٹ سے زیادہ نہ ٹھہر سکے اور اپنے اپنے زخموں کو چاٹتے مشکل سے جان بچا کر وہاں سے نکلے۔ بعد میں سوریا کو اسپتال پہنچانے اور اس کے علاج معالجے کی ذمے داری اٹھانے کے علاوہ نانا نے اس کی بہن کی حفاظت کی ذمے داری بھی اپنے سر لے لی۔ نانا کا نام سامنے آنے کے بعد کس کی ہمت تھی کہ دوبارہ اس طرف کا رخ کرتا۔ صحت یاب ہونے کے بعد سوریا نانا کے قدموں سے لپٹ گیا کہ نانا اسے اپنی شاگردی میں لے لے لیکن اس کی مجو کے اڈے سے وابستگی نانا کے علم میں آ چکی تھی، سو اس نے اس درخواست کو منظور نہیں کیا اور سوریا کو ہدایت کی کہ جس کھونٹے سے بندھ گیا ہے اب اسی سے بندھا رہے۔ ضرورت پڑنے پر وہ خود اسے خدمت کا موقع دے گا۔ بعد میں نانا نے سوریا کی بہن کی شادی بھی اپنے خرچے پر کروائی اور اسے مکمل طور پر اپنا بے دام غلام بنا ڈالا۔ نانا کے حکم کی وجہ سے سوریا جڑا تو مجو کے اڈے سے ہی رہا لیکن اس کی جذباتی وابستگی نانا کے ساتھ رہی۔ اس کی خواہش پر نانا نے اسے اپنے فن کے چند کمالات بھی سکھائے لیکن کبھی کوئی بڑا کام نہیں لیا۔ کام کے بندوں کی اس کے پاس کوئی کمی نہیں

تھی لیکن اب وہ وقت آ گیا تھا کہ سوریا اس کے احسان کا بدلہ اتارتا اور انہیں فاروق کے سلسلے میں درکار معلومات فراہم کرتا۔

''پھر کیا جانکاری کر کے آیا ہے تو لونڈے کے بارے میں؟ کدھری لے گیا ہے وہ گورا افسر اسے اپنے ساتھ؟'' سوریا کا فدویانہ انداز نانا کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی اس لیے بے نیازی سے پوچھا۔

''وہ ادھر اسٹیشن والے تھانے میں ہے۔ انگریز افسر اور مجو دادا دونوں اس سے بڑی خار کھائے بیٹھے ہیں۔ دادا تو اسے اپنے ساتھ لانے کو مانگتا تھا پر گورا افسر ولیم بولا کہ پہلے اسے اپنی انسلٹ کا بدلہ چکانے کا ہے۔ اپن کو لگتا ہے کہ ادھر تھانے میں اس کی ٹھیک ٹھاک دھنا دھن ہو رہی ہو گی۔ پر مجو دادا کو اتنے پر چین نہیں آنے والا۔ اس نے ولیم کو راضی کر لیا ہے کہ سویرے تک لڑکا اس کے حوالے کر دیا جائے گا۔ وہ لڑکے کے بدلے میں ربن دادا سے ثریا بانو کا سودا کرنا مانگتا ہے۔ اسے معلوم ہے کہ ربن دادا اس لونڈے کو بہت چاہتا ہے اس لیے سمجھتا ہے کہ اس کے بدلے میں دادا سے کچھ بھی حاصل کر سکتا ہے۔'' ربن اور رامو کی طرف کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے سوریا نے اپنی حاصل کردہ معلومات فراہم کیں۔ اس کی فراہم کردہ معلومات پر ربن کی کنپٹی کی رگیں ابھر آئیں اور اندازہ ہونے لگا کہ وہ کتنے اشتعال میں ہے لیکن زبان سے اس نے کسی قسم کا اظہار نہیں کیا۔

''بس اتنا ہی ہے یا اور بھی کچھ ہے تیرے پاس بکنے کے لیے؟'' نانا نے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

''اور کیا ہوئیں گا نانا۔ اپن نے سب پورا پورا بول دیا ہے۔'' سوریا جز بز ہوا۔

''وہ حرام کا جنا مجو دوبارہ ربن دادا کے علاقے میں گھسنے کی تو نہیں سوچ رہا ہے؟'' نانا نے اس سے دریافت کیا۔

''نہ، ابھی ایسا کچھ نہیں ہے۔ ابھی تو پہلی بار جانے والے ہی بیٹھے اپنے زخم چاٹ رہے ہیں۔ ابھی کسی میں اتنا دم ہی نہیں کہ ایسا کچھ سوچ سکے۔''

''تو شامل نہیں تھا پہلی بار حملہ کرنے والوں میں؟'' رامو نے بالکل اچانک ہی اسے خشمگیں نگاہوں سے گھورتے ہوئے پوچھ ڈالا۔

''توبہ کرو استاد توبہ۔ اپن کیسے ایسی غلطی کر سکتا تھا۔ اپن تو الٹی دست کا بہانہ بنا کر پہلے ہی بستر پر لمبا لیٹ گیا تھا۔'' سوریا نے فخر سے اپنا کارنامہ سنایا۔

''چل ٹھیک ہے۔ ابھی نکل ادھر سے، پر یاد رکھنا جب بھی کوئی کام کی بات معلوم ہو، سیدھا ادھر آ کر بکنا ہے۔'' نانا نے اسے جانے کی اجازت دیتے ہوئے ہدایت کی۔

''یہ بھی کوئی بولنے کا بات ہے نانا۔ تم بے فکر ہو جاؤ۔ اپن اپنا کام اچھی طرح سمجھ گیا ہے۔'' سوریا نے یقین دہانی کروائی اور باری باری ان تینوں کے پیر چھو کر باہر نکل گیا۔

''چل رامو، ابھی رات ہی رات میں اپن کو بھی بہت کام کرنا ہے۔'' اس کے روانہ ہوتے ہی ربن بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

''اپن کے کرنے کو کچھ ہو تو بولو دادا۔'' نانا نے بھی کھڑے ہو کر اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے نہایت خلوص سے دریافت کیا۔

''تم نے جتنا کر دیا، یہ بہت ہے۔ اصل کام تو فاروق کا پتا لگانا تھا، آگے اپن خود سب دیکھ لے گا۔ اتنا بے بس نہیں ہوں اپن کہ کوئی اپنے شہزادے کو تھانے میں لے جا کر بند کر دے اور اپن ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھا رہ جائے۔'' ربن نے سرخ آنکھوں کے ساتھ اسے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے دادا! ابھی تو تم یہ کام دیکھو، اس کے بعد اپن مل کر مجو کا کوئی انتظام کرے گا۔ اس کو بہت ڈھیل دے دیا ہے اب اور نہیں چھوڑ سکتا۔'' نانا نے اپنے عزم کا اظہار کیا۔ ربن کو مجو کا بندوبست کرنے سے زیادہ فی الحال فاروق کی فکر تھی، سو اس موضوع پر مزید بات کیے بغیر وہاں سے روانہ ہو گیا۔ اپنے اڈے سے وہ جو سواری لے کر چلا تھا، اسے چھوڑا نہیں تھا اور زمرد بائی کے کوٹھے سے یہاں اپنے ساتھ لایا تھا۔ یہی عقل مندی رامو نے بھی کی تھی۔ چنانچہ کافی رات ہو جانے کے باوجود انہیں اس سلسلے میں کوئی پریشانی نہیں تھی۔

''تو اڈے واپس جا رامو اور آٹھ دس بندوں کو اسٹیشن والے تھانے کی طرف بھیج دے۔ ان سے کہنا کہ صرف باہر ہی باہر رہ کر نگرانی کرنی ہے اور خیال رکھنا ہے کہ مجو یا اس کے ساتھی فاروق کو اپنے ساتھ لے کر نہ نکل جائیں۔ اگر ایسا ہونے لگے تو سالوں کو ادھیڑ کر رکھ دیں پر اپنا فاروق کسی طرح مجو کے اڈے پر نہ پہنچنے پائے۔ میں ذرا وکیل کی طرف جاتا ہوں۔ انگریز افسر کی بدمعاشی سے نمٹنے کے لیے وہی سب سے بہتر رہے گا۔''

اس نے رامو کو ہدایت دینے کے ساتھ اپنے پروگرام سے بھی آگاہ کیا تو رامو سمجھ گیا کہ ربن سرکار سے براہ راست جھگڑا مول لینے کو تیار نہیں ہے اور سب کچھ قاعدے قرینے سے کرنا چاہتا ہے ورنہ اس کے آدمی تو اتنے بے جگر تھے کہ تھانے میں گھس کر بھی فاروق کو باہر نکال سکتے

تھے لیکن شاید یہ مناسب نہ ہوتا۔ وہ لوگ کتنے ہی منظم سہی لیکن سرکار سے ٹکر لے کر مشکل میں پڑ جاتے۔ انگریزوں کا ویسے ہی کچھ پتا نہیں تھا کہ اپنے غلام ہندوستانیوں سے کب کیسا سلوک کر جائیں۔ ان میں زیادہ تر تو حکمرانی کے نشے میں ہی چور رہتے تھے لیکن کچھ ایسے بھی تھے جو قواعد و قوانین کی پابندی کو پسند کرتے تھے۔ حکمرانی کا نشہ اگرچہ مستقل جاری آزادی کی تحریک کی وجہ سے کسی حد تک ٹوٹنے لگا تھا اور بدلتی ہوئی صورتِ حال پر انگریز سرکار قدرے گھبراہٹ کا شکار تھی پھر بھی احتیاط ہی بہتر تھی۔ کم از کم انہیں ایسا کوئی طریقہ کار اختیار نہیں کرنا تھا کہ انصاف پسندوں کی ہمدردی و حمایت سے محروم ہو جاتے یوں بھی وہ کون سے معاشرے کے معززین میں شمار ہوتے تھے۔ اڈے پاڑے کی دنیا کا آدمی کتنا ہی وضع دار اور مہذب ہو معاشرے اور قانون کی نظروں میں تو ہمیشہ مشکوک اور نامعتبر ہی ٹھہرتا ہے۔ ہاں آدمی ربن جیسا ہو تو مشکل سے مشکل حالات میں بھی دماغ کو حاضر رکھ کر بقا کی کوئی نہ کوئی راہ نکال لیتا ہے۔ اپنے قابل اور ذہین وکیل کی مدد سے اب بھی وہ یقیناً ایسی ہی کوئی راہ نکالنے گیا تھا اور پیچھے رامو کو اپنی ذمے داری نبھانی تھی۔

ربن کی ہدایات پر من و عن عمل ہو اور فاروق کی محبت سے چور ساتھیوں کے جذبات کو بھی باندھ کر رکھا جائے، یہ ان حالات میں بہت ضروری تھا۔ اڈے پر واپس پہنچ کر اپنی یہ ذمے داری نبھانے سے قبل اسے جوزفین کی موت کی افسوس ناک خبر سننی پڑی۔ یہ اطلاع اسے انہی دو افراد نے فراہم کی تھی جو ربن کی ہدایت پر جوزف کی ہر طرح کی مالی اور اخلاقی معاونت کے لیے اسپتال میں موجود تھے۔ ان افراد کے مطابق جوزفین کی اچانک موت نے جوزف کے دماغ پر بہت اثر ڈالا تھا اور اس وقت تو وہ بالکل بھی اپنے حواس میں نہیں تھا۔ ان حالات کو جان کر رامو کو سخت افسوس ہوا۔ وہ سمجھ سکتا تھا کہ جوزف کے دل پر کیا گزر رہی ہے۔ ایک ایسا شخص جس کی اکلوتی جوان بیٹی اغوا کر لی گئی تھی اور محبوب بیوی ہمیشہ کے لیے بچھڑ گئی تھی، اپنے حواس نہ کھوتا تو کیا کرتا۔ افسوس ناک بات یہ بھی تھی کہ وہ لوگ چاہتے ہوئے بھی ابھی تک جولیٹ کی بازیابی کے سلسلے میں کچھ نہیں کر سکے تھے اور الٹا فاروق والے مسئلے میں الجھ گئے تھے۔ فاروق واپس آتا تو اس سے سامنا کرنا مشکل ہو جاتا، وہ چاہے زبان سے کچھ نہ کہتا لیکن وہ تو اپنی جگہ شرمندگی محسوس کرتے کہ اس کی محبوب ہستی کو واپس نہ لا سکے۔ بہرحال ابھی تو فاروق کی واپسی کے سلسلے میں اقدامات کرنے تھے، سو آٹھ افراد کو منتخب کرنے کے بعد اس نے سخت ہدایات کے ساتھ انہیں تھانے کی طرف روانہ کر دیا۔

''استاد! ذرا گولو کو دیکھ لو۔ تم لوگوں کے جانے کے بعد سے پگلا مستقل روئے جا رہا ہے۔ سب نے لاکھ تسلی دی لیکن اسے قرار نہیں آتا۔'' آدمیوں کی تھانے کی طرف روانگی کے بعد رامو، جوزف کے گھر کی طرف جانے کا قصد کر رہا تھا کہ بجو نے اسے اطلاع دی۔

''کدھر ہے وہ؟'' اس اطلاع پر رامو نے چونک کر تشویش سے پوچھا۔ گولو کی فاروق سے بے تحاشا محبت کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی چنانچہ طے تھا کہ وہ اس وقت شدید صدمے کی کیفیت میں ہوگا۔

''اوپر فاروق بھائی کے کمرے میں ہے۔'' بجو نے اس کے سوال کا جواب دیا تو وہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچ گیا۔ گولو فاروق کے بستر ہی پر اوندھے منہ لیٹا ہوا تھا اور اس کا ہولے ہولے لرزتا جسم گواہی دے رہا تھا کہ اب بھی اس کا رونا جاری ہے۔

''گولو.....!'' رامو نے محبت سے اسے پکارا تو وہ تڑپ کر بستر سے اٹھا۔ اس کی آنسوؤں سے بھری سرخ آنکھیں دیکھ کر رامو کے دل کو دھچکا سا لگا۔ اسے خود بھی تو فاروق کم عزیز نہیں تھا لیکن بس وہ میدانِ عمل کا آدمی ہو کر اس طرح بیٹھ کر آنسو نہیں بہا سکتا تھا۔

''فاروق بھائی کو ساتھ نہیں لائے استاد؟ کدھر ہیں فاروق بھائی اور بابا کہاں ہیں؟'' رامو کی صورت دیکھتے ہی اس نے پے در پے سوالات کا سلسلہ شروع کر دیا۔

''آ جائیں گے تیرے فاروق بھائی۔ پتا لگ گیا ہے اس کا۔ دادا اسے چھڑانے کے واسطے کوشش کر رہا ہے۔ تو چنتا نہ کر۔ ہم سب ہیں نا۔ ہم سب کے ہوتے کوئی تیرے فاروق بھائی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔'' اس کے قریب بیٹھ کر اسے اپنے بازو کے حصار میں لیتے ہوئے رامو نے اسے تسلی دی۔

''سچ کہہ رہے ہو استاد؟'' گولو کے لہجے میں بیک وقت بے یقینی اور امید تھی۔

''پہلے کبھی تجھ سے جھوٹ بولا ہے کیا؟ تو دیکھ لینا سویرے تک دادا ضرور فاروق استاد کو لے کر آ جائے گا۔ تیرا فاروق بھائی آئے گا تو تیری یہ بسورتی صورت دیکھ کر کیا سوچے گا۔ وہ تو تجھے بہت بہادر سمجھتا ہے۔ ایسے عورتوں کی طرح روتے دیکھے گا تو اسے کتنا دکھ ہوگا، کچھ پتا ہے تجھے؟'' رامو اس کا مزاج آشنا تھا اس لیے سیدھا اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

''یہ تو تم نے ایک دم ٹھیک بولا استاد...... اپن ابھی اپنا حال ٹھیک کرتا ہے۔'' حسب توقع گولو اس کی باتوں کے جال میں پھنس گیا اور جلدی جلدی آستینوں سے آنسو صاف کرتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس کی معصومیت اور سادگی پر دھیرے سے مسکراتا رامو بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ اب اس کا رخ جوزف کے گھر کی طرف تھا جہاں پہلے ہی محلے کے بہت سے افراد جمع تھے۔ جوزفین کی لاش اسپتال سے لائی جا چکی تھی اور اندر کمرے میں رکھی تھی۔ کمرے میں محلے کی عورتیں جمع تھیں اور مرد صحن میں بیٹھے تھے۔ مردوں کے درمیان لب بستہ جوزف بھی موجود تھا۔ اس کی آنکھوں میں ویرانی تھی اور آنسو غم کی انتہا پر پہنچ کر بالکل خشک ہو چکے تھے۔ رامو اس کے قریب ہی بیٹھ گیا اور دلاسا دینے کے انداز میں اس کے بازو کو تھپکا لیکن جوزف نے کسی طرح کا ردِعمل ظاہر نہیں کیا۔ ایسا لگتا تھا کہ غم کی شدت نے اسے پتھرا کر رکھ دیا ہو۔

''پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے بے چارے پر۔ جب سے اسپتال سے آیا ہے، سکتے کی حالت میں بیٹھا ہے۔ نہ روتا ہے، نہ کسی سے کچھ بولتا ہے۔'' غلام چاچا نے افسردہ لہجے میں رامو کو بتایا تو اس نے سر کو تفہیمی جنبش دی پھر بولا۔

''اس بے چارے کو ہوش نہیں، پر کفن دفن کا تو کچھ کرنا ہوگا نا۔ محلے میں جو لوگ جوزف کے مذہب سے تعلق رکھتے ہیں وہ اس معاملے کو دیکھ لیں۔ جو بھی خرچہ ہوئیں گا، اڈے سے مل جائیں گا۔''

''خرچے کا مسئلہ نہیں ہے استاد۔ خرچہ تو محلے والے مل کر بھی اٹھا لیں گے اور کفن دفن بھی ہو جائے گا لیکن اصل فکر تو اس کی بیٹی کی ہے۔ کسی طرح وہ واپس مل جائے۔ وہ آ گئی تو جوزف بھی سنبھل جائے گا۔''

''تم ٹھیک بول رہے ہو چاچا لیکن سمجھ نہیں آتا کہ لڑکی کو کدھر جا کر ڈھونڈیں۔ آس پاس جتنے لوگوں سے پوچھا کوئی کچھ نہیں بتا پایا۔ اب تو ایک ہی اپائے ہے کہ پولیس میں رپٹ (رپورٹ) کرا دیں پر پولیس بھی تو تب ہی کچھ کر سکے گی نا جب یہ منہ سے کچھ پھوٹے گا۔ کچھ نہ کچھ تو پتا ہوئیں گا نا اسے کہ کون دشمن تھا جو ایسی جی داری سے لڑکی کو اٹھا کر لے گیا۔ یہ تھوڑا آگے پیچھے کا خبر دے تو اپن بھی کچھ کر سکے گا۔ اپن کو بھی کم چنتا نہیں ہے اس کی پر سالے ہاتھ پیر بالکل بندھے ہیں۔ کوئی راستہ ہی دکھائی نہیں پڑتا۔'' غلام چاچا کی بات کے جواب میں رامو نے پوری تقریر کر ڈالی لیکن جوزف نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ایسا لگتا تھا کہ اس کا دماغ بالکل ماؤف ہو چکا ہے اور وہ سب کے درمیان بیٹھا ہونے کے باوجود کچھ بھی سننے سے قاصر ہے۔

''تمہاری بات بھی ٹھیک ہے استاد لیکن کوئی کیا کر سکتا ہے۔ بے چارے کو دو اتنے بڑے صدمے ایک ساتھ جھیلنے پڑے ہیں کہ حواسوں میں ہی نہیں رہا۔ حواس کا اس طرح سے چھن جانا آدمی کے اپنے اختیار میں تو نہیں ہوتا نا۔'' غلام چاچا نے جوزف کی وکالت کی تو رامو نے خاموشی اختیار کر لی پھر کچھ دیر بعد وہاں سے جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

''ابھی اپن چلتا ہوں چاچا۔ اپن کو اپنی طرف کے بھی بہت جھمیلے دیکھنے ہیں، پر کوئی بھی ضرورت پڑنے پر اڈے کا رخ کرنے سے مت ہچکچانا۔ جو بھی موجود ہوا، پورا خیال کرے گا۔'' وہاں سے نکلنے سے قبل وہ حقِ محلے داری ادا کرنا نہیں بھولا تھا۔

☆☆☆

جوان العمر وکیل اشوک بچن رات کے آخری پہر ربن کو اپنے دروازے پر دیکھ کر دنگ رہ گیا لیکن دروازے پر ہی سوال و جواب کرنے کے بجائے اسے اپنے ساتھ اندر آنے کی دعوت دی اور اپنے ساتھ خوب صورتی سے سجے ڈرائنگ روم میں لے گیا۔ ڈرائنگ روم خاصا وسیع تھا جس میں قیمتی فرنیچر کو نہایت قرینے سے رکھنے کے ساتھ ساتھ آرائشی اشیا بھی نہایت ڈھنگ سے سجائی گئی تھیں۔ ان میں سے زیادہ تر اشیا لندن سے درآمد شدہ تھیں کیونکہ خود اشوک بچن کی چہیتی بیوی بھی وہیں سے درآمد شدہ تھی اور وہ یہ ساری چیزیں اپنے ساتھ سامان میں بھر کر لائی تھی۔ اشوک اور سوزی کی شادی اصل میں ان کے دھواں دھار عشق کا نتیجہ تھی اور یہ عشق اس وقت شروع ہوا تھا جب اشوک وکالت کی ڈگری کے لیے انگلستان میں قیام پذیر تھا۔ اشوک کا باپ بھی ایک نامی گرامی وکیل تھا جو بہت اونچے معاوضے پر صرف امراء کے مقدمات ہی لڑنا پسند کرتا تھا لیکن اشوک نے اپنے باپ سے بالکل مختلف راہ اختیار کی تھی۔ کوئی بھی کیس ہاتھ میں لینے سے قبل وہ پارٹی کی حیثیت سے زیادہ اس کیس میں اپنی دلچسپی کے عنصر کو مدنظر رکھتا تھا۔ اپنی اسی افتادِ طبع کی وجہ سے اس نے ربن کا وکیل بننا منظور کر لیا تھا حالانکہ اس کے اس فیصلے پر اس کا باپ سخت ناراض ہوا تھا اور اس کے خیال کے مطابق اشوک نے اڈے پاڑے کے لوگوں سے تعلق جوڑ کر اس کی نیک نامی کو شدید دھچکا پہنچایا تھا۔ اس بات کو بنیاد بنا کر اس نے اشوک سے ملنا جلنا تقریباً ترک کر رکھا تھا لیکن اشوک کو اس کی بہت زیادہ فکر نہیں تھی۔ اس کا موقف تھا

کہ وہ اپنے پیشہ ورانہ فیصلے کرنے کے لیے آزاد ہے اور پیشہ ورانہ و نجی زندگی کے معاملات کو ایک دوسرے سے الگ رکھنا چاہتا ہے۔ اصل میں وہ ربن کی شخصیت سے متاثر ہوا تھا اور اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ اڈے کی دنیا سے تعلق رکھنے کے باوجود یہ شخص اتنا بااصول ہے کہ کبھی اس پر کوئی غلط مقدمہ لڑنے کے لیے زور نہیں ڈالے گا۔ اب تک کے تعلق میں اس کا یہ اندازہ درست ہی ثابت ہوا تھا۔ مالی اعتبار سے بھی اسے ربن کی طرف سے کوئی شکایت نہیں تھی، وہ ہمیشہ اسے اس کی منہ مانگی فیس ادا کرتا تھا۔

''اس سے کیسے آنا ہوا دادا! لگتا ہے کوئی بڑی سمسیا ہے۔'' ربن کو ڈرائنگ روم میں بٹھانے کے بعد اشوک نے اس سے دریافت کیا۔ وہ ربن کے حلیے کو دیکھ کر اندازہ لگا چکا تھا کہ آج کی رات دادا نے بستر سے کمر نہیں لگائی ہے اور شب آنکھوں میں کٹی ہے۔

''بڑی پریشانی نہ ہوتی تو آپ کو اس پہر کاہے کو زحمت دیتے وکیل بابو! اپن تو یوں سمجھو کہ اس وقت جلتے توے پر بیٹھے ہیں۔''

''ارے ایسا کیا ہوا آخر؟'' ربن کے انداز پر اشوک چونک گیا مگر اس سے قبل کہ ربن اسے کچھ بتاتا، ڈرائنگ روم کے کھلے دروازے سے اشوک کی بیوی سوزی کی آواز سنائی دی۔

''اشوک؟ کہاں ہو ڈارلنگ! اتنی رات کو کون آیا ہے؟'' آواز کے فوراً بعد ہی اس کی شکل بھی دکھائی دے گئی۔ وہ سلیپنگ سوٹ میں تھی جس کے اوپر ایک ڈھیلا ڈھالا گاؤن بھی لے رکھا تھا، اس کے باوجود اندازہ ہوتا تھا کہ تخلیق کے مرحلے سے گزر رہی ہے۔

''اپنے ربن دادا آئے ہیں ڈیئر...... انہیں کوئی بڑا پرابلم ہو گیا ہے۔'' اشوک نے اسے بتایا تو وہ فوراً ربن کی طرف متوجہ ہوئی۔

''اوہ تو آپ ہیں ربن دادا! اشوک ہم سے آپ کا بہت بات کرتا۔ ہی سوچ لائیکس یو۔'' دورانِ تعلیم اس نے اشوک کے ساتھ ایک لمبا عرصہ گزارا تھا اس لیے شادی ہو کر یہاں آنے سے قبل اچھی خاصی ہندوستانی سیکھ گئی تھی۔ زبان کی یہ جانکاری یہاں ایڈجسٹ ہونے میں اس کے لیے بہت معاون ثابت ہوئی تھی اور وہ اپنے گھر میں کام کاج کرنے والے ملازمین کے علاوہ دیگر افراد سے بھی بہ آسانی ڈیلنگ کر لیتی تھی۔

''یہ وکیل بابو کی مہربانی ہے کہ... آپ کے سامنے اچھے الفاظ میں اپنا ذکر کیا، ورنہ اپن بہت معمولی آدمی ہے۔'' سوزی کے اشتیاق کا نرمی سے جواب دے کر ربن پھر اشوک کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس وقت اشوک سے فاروق کے مسئلے پر بات کرنا اس کی سب سے بڑی ترجیح تھی۔ اشوک بھی اس کا مدعا سمجھ گیا اور اپنی پوری توجہ اس کی طرف مبذول کرتے ہوئے بولا۔

''ہاں دادا! اب بتاؤ کیا پرابلم ہے اور میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں؟'' جواب میں ربن نے اپنی حاصل کردہ تمام معلومات اس کے گوش گزار کر دیں۔ سوزی بھی اشوک کے ساتھ والے صوفے پر بیٹھی خاموشی سے سب سنتی رہی۔

''انگریز افسر ولیم...... یہ معاملہ تو واقعی خاصا گڑبڑ ہو گیا۔'' ساری بات سننے کے بعد اشوک نے پُرسوچ لہجے میں تشویش کا اظہار کیا۔

''انگریز افسر ہے تو کیا ہوا صاحب، کیا انگریز ہونے کی وجہ سے اسے کسی کو بھی ایسے ہی لٹکا دینے کا پرمٹ مل گیا ہے۔ اپن صبح سے پہلے اپنے شہزادے کو اپنے پاس دیکھنا چاہتا ہوں ورنہ وہ بجو...... اسے تھانے سے اپنے ساتھ لے جانے کی کوشش کرے گا اور اپن صاف بتا رہا ہوں کہ اگر ایسا ہوا تو بڑا ہنگامہ ہو ئیں گا۔ اپن کے آدمی ادھر تھانے کے باہر بالکل الرٹ کھڑے ہیں۔ اپنے ایک اشارے پر وہ خون کی ندیاں بہا دیں گے۔'' آواز بلند نہ ہونے کے باوجود ربن کے لہجے میں جلال تھا۔

''دھیرج دادا دھیرج۔ ذرا دماغ کو ٹھنڈا رکھو۔'' اشوک نے اسے سمجھایا۔

''یہ ہنڈرڈ پرسنٹ ٹھیک بولتا ہے اشوک۔ مسٹر ولیم کا بالکل رائٹ نہیں بنتا ہے کہ بغیر وارنٹ کے ایسے کسی کو اریسٹ کر کے ٹارچر کرے اور پھر اپنی مرضی سے کسی کے بھی حوالے کر دے۔ اس ساری بات کو سن کر تو ایسا لگتا ہے کہ اس نے ایف آئی آر بھی نہیں کٹوائی ہوگی ورنہ ایسے کیسے لڑکے کو کسی کی کسٹڈی میں دینے کا پرامس کر سکتا تھا۔ تم کو فوراً پولیس اسٹیشن جا کر وہاں کے انچارج سے بات کرنا چاہیے۔'' سوزی نے ربن کی حمایت کرتے ہوئے فوراً اشوک کو مشورہ دیا۔

''یو آر جینئیس سوزی۔ واقعی میں نے یہ تو سوچا ہی نہیں تھا کہ ولیم نے بغیر ایف آئی آر کے فاروق کو پولیس کسٹڈی میں رکھا ہوا ہوگا۔ اب دیکھنا میں کیسے ان پولیس والوں کا بینڈ بجاتا ہوں۔'' سوزی کا مشورہ اشوک کے دل کو لگا اور وہ ایک تپائی پر رکھے فون کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ ''تم دادا کو

چائے پلاؤ تب تک میں کچھ کام نمٹاتا ہوں۔"
"اوکے، ابھی لائی۔" ربن کے روکنے سے قبل سوزی ڈرائنگ روم سے باہر نکل گئی۔ ان کے گھر ملازمین صرف دن کے وقت خدمت انجام دیتے تھے اس لیے اس وقت اسے ہی چائے تیار کرنی تھی۔ ادھر اشوک ٹیلی فون پر کسی سے بات کررہا تھا۔ اس کی گفتگو سے ربن کو اندازہ ہوا کہ اس نے پہلی کال کسی پولیس افسر اور دوسری کسی صحافی کو کی ہے۔ اس نے ان سے متعلقہ تھانے پہنچنے کی درخواست کی تھی جو صحافی کی طرف سے تو فوراً قبول کرلی گئی تھی البتہ پولیس افسر نے اشوک سے بہت سے سوالات کیے تھے۔
"کام بنتا نظر آرہا ہے دادا۔ تم بیٹھو میں ذرا چینج کر کے آتا ہوں۔" اشوک جوش سے بولتا ہوا ڈرائنگ روم سے باہر نکل گیا۔ اسی وقت سوزی چائے کی ٹرے اٹھائے چلی آئی۔ ٹرے میں چائے کی پیالیوں کے علاوہ ایک پلیٹ میں بسکٹ بھی موجود تھے۔
"لیجیے۔" ٹرے اس کے سامنے میز پر رکھتے ہوئے وہ اخلاق سے بولی۔
"آپ نے بے کار میں تکلف کیا۔ اپن کا کچھ بھی کھانے پینے کو من نہیں ہے۔" ربن اس تکلف پر کچھ کھسیا سا گیا، ویسے دل نہ چاہنے کی بات بھی اپنی جگہ بالکل درست تھی۔
"من نہیں ہے پھر بھی میری محنت کا خیال کر کے آپ کو یہ چائے پینی پڑے گی۔" جواب میں سوزی نے نرم سی مسکراہٹ کے ساتھ اصرار کیا تو ربن کو ہاتھ آگے بڑھانا ہی پڑا۔ سوزی کے اصرار پر اس نے دو بسکٹ بھی حلق سے نیچے اتار لیے۔ سچ ہے عورت کی بات ہی اور ہوتی ہے۔ وہ کچھ منوانے پر آئے تو منوا کر ہی چھوڑتی ہے۔ سوزی جیسی خوش شکل وخوش اطوار عورت کے لیے تو یہ اور بھی آسان ہوجاتا ہے۔ ربن کے چائے ختم کرنے تک اشوک تیار ہوکر لوٹ آیا۔ اس نے ٹرے میں سے اپنی چائے کی پیالی اٹھا کر منہ سے لگائی اور کھڑے کھڑے ایک ہی سانس میں ختم کرڈالی۔
"ٹھنڈی چائے پینے کی عادت تم جیسوں کے بڑے کام آتی ہے۔" سوزی نے اس کی اس حرکت پر تبصرہ کیا تو وہ ہنس پڑا اور ربن کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ اس کے پاس اپنی ذاتی موٹر کار تھی اور اس نے ربن سے اسی میں چلنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ ربن کے لیے اس سے اچھی بات بھلا کیا ہوتی۔ جب تک اشوک موٹر کار نکالتا، وہ باہر منتظر کھڑے گاڑی بان کو اس کا معاوضہ دے کر فارغ کر آیا۔ رات بھر کی خواری کے بدلے اس نے اسے اتنی رقم دی تھی کہ وہ ہفتہ بھر میں بھی مشکل سے ہی اتنا کما پاتا چنانچہ دعائیں دیتا ہوا وہاں سے رخصت ہوا۔ وکیل اشوک کی موٹر کار میں بیٹھ کر جب وہ اپنے مطلوبہ تھانے پہنچے تو ربن کی تیز نظروں نے ادھر ادھر بکھرے اپنے آدمیوں کو تاڑ لیا۔ انہوں نے بھی اسے دیکھ لیا تھا اور اس کے ساتھ وکیل کو دیکھ کر پرامید ہو گئے تھے۔ ربن کو بھی اطمینان ہوا تھا کہ فاروق ابھی تھانے میں ہی ہے۔ اگر مجو نے اسے یہاں سے لے جانے کی کوشش کی ہوتی تو تھانے کے باہر کا نقشہ یقیناً مختلف ہوتا۔ وہ اشوک کے ساتھ اس کی گاڑی سے اترا تو عین اسی وقت وہاں ایک پولیس جیپ بھی آکر رکی۔ جیپ کو باوردی ڈرائیور چلا رہا تھا جبکہ ساتھ میں موجود افسرانہ شان والا شخص ٹو پیس سوٹ پہنے ہوئے تھا۔ یونیفارم میں نہ ہونے کے باوجود اس کے ہیئر کٹ کروفر سے صاف پتا چل رہا تھا کہ وہ کوئی پولیس آفیسر ہے۔
"میں بالکل ٹھیک ٹائم پر پہنچا ہوں۔" جیپ سے اتر کر اس نے اشوک سے ہاتھ ملایا اور خوش دلی سے بولا۔
"پولیس کو ٹائم پر ہی پہنچنا چاہیے۔" اس کی بات کے جواب میں اشوک نے جملہ کسا تو وہ قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔ پھر بولا۔ "ایسا کرو کہ تم فٹافٹ اندر جا کر تھانے دار سے ملاقات کرلو ورنہ اس تک پہلے ہی میرے آنے کی خبر پہنچ جائے گی اور تمہیں پورا مزہ نہیں آئے گا۔ میں ذرا ٹھہر کر اندر آتا ہوں۔"
"اوکے سر۔" اشوک نے مسکراتے ہوئے کہا اور ربن کو لے کر تھانے کے اندر کا رخ کیا۔
"یہ ایس ایس پی چاؤلہ ہے۔ پتاجی کے اچھے دوستوں میں سے ہے اس لیے میری بھی اس سے اچھی جان پہچان ہے۔" اندر کی طرف جاتے ہوئے اس نے ربن کو معلومات فراہم کیں۔ چاؤلہ سے اس نے ربن کا تعارف نہیں کروایا تھا تو یقیناً اس کے نزدیک یہی مناسب ہوگا۔ ربن خود بھی ان اعلیٰ افسروں کے مزاج کو سمجھتا تھا۔ یہ خود بھی نچلے طبقے کے لوگوں سے ربط ضبط رکھنے میں محتاط رہتے تھے اور ربن کا تو معاملہ ہی دیگر تھا۔ وہ اڈے کی دنیا کا آدمی تھا جسے لوگ دادا کہہ کر پکارتے تھے۔ ایک پولیس افسر بھلا کسی دادا سے کیسے دوستانہ تعلق رکھ سکتا تھا، چاہے وہ مزاجاً انصاف پسند ہی ہوتا۔
"میں ایڈووکیٹ اشوک بجن ہوں اور تھانہ انچارج سے ملنا چاہتا ہوں۔" اندر کی طرف جاتے ہوئے ایک سنتری نے ان کا راستہ روکنے کی کوشش کی تو اشوک نے بارعب لہجے میں اپنا تعارف کروایا۔

"آپ بیٹھیں میں صاحب کو اطلاع دیتا ہوں۔"
سنتری یقیناً اشوک کے لہجے سے متاثر ہوا تھا چنانچہ ایک طرف پڑی بینچوں کی طرف اشارہ کر کے احترام سے بولا۔ اشوک نے اپنے قدموں کو یوں روک لیا جیسے اس کی درخواست قبول کرنے کا ارادہ رکھتا ہو لیکن جونہی سنتری تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا ایک کمرے کے دروازے سے اندر داخل ہوا، اشوک بھی ربن کو لیے اس کمرے میں گھس گیا۔ سنتری جو ابھی تھانے دار کو آنے والوں کے بارے میں بتا ہی رہا تھا، اس حرکت پر ہکا بکا رہ گیا جبکہ تھانے دار پُرخشونت نظروں سے ان دونوں کو گھورنے لگا۔

"مجھے ایڈووکیٹ اشوک بچن کہتے ہیں اور میں مسٹر فاروق کی ضمانت کے سلسلے میں آیا ہوں جنہیں کل رات آپ کے تھانے میں لایا گیا تھا۔" تھانے دار کی نظروں کی پروا نہ کرتے ہوئے اشوک نے اپنا تعارف کروایا اور خود ہی ایک کرسی کھینچ کر اس کے مقابل بیٹھ گیا۔ ربن نے بھی اس کی تقلید کی۔

"اشوک بچن...... کہیں آپ ایڈووکیٹ پرتھوی بچن کے بیٹے تو نہیں ہیں؟" تھانے دار نے اس کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے محتاط لہجے میں پوچھا۔ پرتھوی بچن جس پائے کا وکیل تھا، اس سے سب ہی ڈرتے تھے۔

"آپ نے ٹھیک پہچانا لیکن اس وقت تو میں مسٹر فاروق کے وکیل کی حیثیت سے آپ کے پاس آیا ہوں۔ آپ پلیز مجھے ایف آئی آر دکھائیں کہ آپ نے انہیں کس جرم کے تحت گرفتار کیا ہے۔" اشوک کا اعتماد قابلِ داد تھا۔ اپنے والد کے حوالے پر اس نے بہت بے نیازی کا مظاہرہ کیا تھا جیسے تھانے دار کو جتانا مقصود ہو کہ وہ اپنے باپ کے بغیر بھی بہت کچھ کر سکتا ہے۔

"اس نام کے کسی صاحب کو تو ہم نے گرفتار نہیں کیا۔ آپ کو شاید غلط انفارمیشن ملی ہے۔" اس بار تھانے دار نے پینترا بدلا اور فاروق کی گرفتاری سے صاف انکار کر دیا۔

"آپ کی یادداشت کی بحالی کے لیے میں آپ کو یاد دلاتا ہوں کہ فاروق احمد کو آپ نے مسٹر ولیم کے حکم پر اریسٹ کیا تھا بلکہ مسٹر ولیم خود اس لڑکے کو آپ کی کسٹڈی میں دے کر گئے تھے۔" اشوک نے ذرا تند لہجہ اختیار کیا۔
عین اسی وقت سنتری تیزی سے اندر داخل ہوا اور تھانے دار کے پہلو میں کھڑے ہو کر جھک کر سرگوشی میں اس سے کچھ کہا۔ تھانے دار کی پیشانی پر فوراً ہی بل پڑ گئے اور وہ خاصا پریشان دکھائی دینے لگا۔ اس پریشانی کے عالم میں وہ اپنی
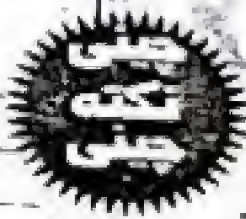
کرسی سے اٹھا تھا کہ بھاری قدموں کی آواز کے ساتھ ایس ایس پی چاؤلہ دروازے پر نمودار ہوا۔ تھانے دار نے عرق آلود پیشانی کے ساتھ پھرتی سے اسے سیلیوٹ کیا۔

''اوہو، بچن صاحب بھی اتنے سویرے یہاں موجود ہیں۔لگتا ہے کوئی خاص بات ہے۔'' چاؤلہ نے اشوک پر نظر ڈالتے ہوئے تبصرہ کیا۔

''جی ہاں، اپنے ایک موکل کی ضمانت کے لیے آیا ہوں لیکن انچارج صاحب گرفتاری سے ہی صاف انکاری ہیں۔'' اشوک نے خوش دلی سے اس کی بات کا جواب دیتے ہوئے شکوہ کیا۔ اس وقت دونوں کا انداز ایسا تھا جیسے ابھی ابھی ایک دوسرے سے ملاقات ہوئی ہو۔ اس کے شکوے پر چاؤلہ نے خشمگیں نظروں سے تھانے دار کو گھورا۔

''سر...... سر...... وہ......'' وہ مشکل میں پڑ کر ہکلانے لگا۔

''میرے ساتھ آؤ۔'' چاؤلہ نے اسے سخت لہجے میں حکم دیا اور خود تیزی سے باہر کا رخ کیا۔ تھانے دار کو بھی اس کی پیروی کرنی پڑی۔ اس کی اپنے پیچھے موجودگی کا یقین رکھتے ہوئے چاؤلہ اب تیز قدموں سے اس کمرے کی طرف بڑھ رہا تھا جسے پولیس والے سخت تفتیش کے لیے استعمال کرتے تھے۔ کمرے کے دروازے پر ایک سنتری موجود تھا جس نے چاؤلہ کو دیکھ کر اسے سیلیوٹ مارا اور پھر اس کے اشارے پر جھجکتے ہوئے دروازہ کھول دیا۔ دروازہ کھلتے ہی چاؤلہ کو چھت سے الٹا لٹکا فاروق نظر آ گیا۔ اس کی حالت سے ظاہر تھا کہ وہ کئی گھنٹوں سے اسی طرح لٹکا ہوا ہے۔

''واٹ از دس؟'' چاؤلہ نے پھاڑ کھانے والے لہجے میں تھانہ انچارج سے دریافت کیا۔

''میرا کوئی دوش نہیں سر۔ اسے رات ڈائریکٹر آف واٹر بورڈ مسٹر ولیم اپنے ساتھ لائے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اس لڑکے کی وجہ سے ان کی سخت انسلٹ ہوئی ہے اس لیے اسے ٹھیک ٹھاک سزا ملنی چاہیے۔ میں نے ان سے کہا کہ میں ایف آئی آر کاٹ دیتا ہوں لیکن انہوں نے منع کر دیا۔ اب آپ بتائیں کہ میں ان کا حکم ماننے کے سوا کیا کر سکتا تھا؟'' تھانے دار منہ بسورتے ہوئے اپنی صفائی پیش کرنے لگا۔

''ٹھیک کہا تم نے...... گورے افسر کے حکم کو تو ٹال ہی نہیں سکتے تھے تم اور اب تم جیسے ایڈیٹ کا کیا پورے پولیس ڈیپارٹمنٹ کو بھگتنا پڑے گا۔ اس لڑکے کی ضمانت کے لیے جو وکیل آیا ہے، اسے جانتے ہو تم؟ وہ اشوک بچن ہے۔ پرتھوی بچن کا بیٹا جو اپنے باپ سے بھی کہیں زیادہ چالاک ہے۔'' چاؤلہ اس پر برسنے لگا۔

''آئی نو سر...... میں نے پہچان لیا ہے اور سمجھ نہیں آ رہا کہ کیا کروں۔ ایک طرف یہ ہے تو دوسری طرف مسٹر ولیم۔'' تھانے دار کی حالت واقعی پتلی تھی۔

''سب سے پہلے اس لڑکے کو نیچے اترواؤ ایڈیٹ۔ تمہیں اشوک بچن کے کام کرنے کا طریقہ نہیں معلوم ہے۔ کسی بھی سمے اس کا کوئی جرنلسٹ دوست اپنا کیمرا لے کر یہاں تھانے پہنچ جائے گا اور پھر اس لڑکے کی فوٹو پولیس ڈیپارٹمنٹ کے لیے کلنک بنی ہر نیوز پیپر کے فرنٹ پیج پر چھپی ہو گی۔ کیا جواب دو گے تم بغیر ایف آئی آر کے اس شخص کو اتنی بری طرح ٹارچر کرنے پر؟'' چاؤلہ بری طرح دہاڑا تو تھانے دار سر سے پیر تک بہتے پسینے کے ساتھ فاروق کو اتارنے کے سلسلے میں ہدایات دینے لگا۔ وہ نیم بے ہوش تھا اور کسی طور اس لائق نہیں تھا کہ فوری طور پر اپنے قدموں پر کھڑا ہو سکے۔ اس لیے اسے اتارنے کے بعد سہارا دے کر ایک کرسی پر بٹھا دیا گیا۔

''پانچ دس منٹ کے اندر اس کا حلیہ جتنا سدھار سکتے ہو، سدھارو اور اپنے ساتھ لے کر آؤ۔ تب تک میں ان لوگوں سے نمٹتا ہوں۔'' فاروق کی حالت دیکھتے ہوئے چاؤلہ نے سختی سے حکم دیا اور خود پلٹ گیا۔ اس کے واپس انچارج کے کمرے میں پہنچنے تک وہاں اشوک کا جرنلسٹ دوست پہنچ چکا تھا۔

''یہ راج مہرہ ہیں۔ میرے دوست اور سینئر جرنلسٹ۔'' اشوک نے نو وارد کا چاؤلہ سے تعارف کروایا تو اس نے رسمی سے انداز میں اس سے مصافحہ کیا اور دوبارہ اشوک کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''تمہارا کام ہو گیا ہے۔ تمہارا بندہ آ رہا ہے۔ تم اسے اپنے ساتھ لے جا سکتے ہو۔''

''اوکے تب تک ہم پیپر ورک نمٹا لیتے ہیں۔'' اشوک نے میز پر دھرے اپنے بریف کیس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

''اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ تم ایسے ہی اس لڑکے کو اپنے ساتھ لے جا سکتے ہو۔'' اس بار چاؤلہ نے قدرے رکھائی سے جواب دیا۔ اشوک کا ساتھ دینے کے باوجود بہرحال اس پر اپنے محکمے کی ساکھ برقرار رکھنے کی ذمے داری بھی عائد ہوتی تھی جس سے وہ صرفِ نظر نہیں کر سکتا تھا۔

''اوکے، ایز یو وِش۔'' جواب میں اشوک نے بے نیازی کا مظاہرہ کیا۔

''یہ کیا ہو رہا ہے بھائی۔ تم نے اتنی صبح صبح میری دوڑ

لگوائی اور اب لگتا ہے کہ مجھے سوکھے منہ، بنا کسی نیوز کے ہی یہاں سے لوٹنا ہوگا۔" راج مہرہ نے اس صورت حال پر احتجاج کیا۔

"ڈونٹ وری مسٹر مہرہ۔ یہ تھانہ ہے یہاں سے آپ کو کوئی دوسری نیوز مل جائے گی۔ آپ بس اس معاملے کو جانے دیجیے۔" اشوک کے بجائے چاؤلہ نے اسے جواب دیا تو وہ سوالیہ نظروں سے اشوک کو دیکھنے لگا۔

"ٹھیک ہے یار، چاؤلہ صاحب نے ہم سے اتنا کوآپریٹ کیا ہے تو ہمیں بھی ان کا تھوڑا خیال کرنا ہوگا۔ اپنے ڈیپارٹمنٹ کو بچانا بھی تو فرض ہے نا ان پر۔" اشوک نے اسے سمجھایا۔

"میں نے صرف پرتھوی کی وجہ سے تمہارا اتنا ساتھ دیا ہے ورنہ پولیس کے پاس سارے ہتھکنڈوں کا توڑ موجود ہوتا ہے۔" چاؤلہ تجربہ کار آدمی تھا اور خوب سمجھ رہا تھا کہ اس کے سامنے طے شدہ ڈراما کیا جا رہا ہے اس لیے آف موڈ کے ساتھ انہیں جتایا۔ اسی وقت تھانہ انچارج فاروق کو لیے اندر داخل ہوا۔ اس کا منہ وغیرہ دھلوا کر بالوں میں کنگھی کر دی گئی تھی اس لیے حلیہ قدرے بہتر ہو گیا تھا پھر بھی وہ جس طرح ڈگمگاتے ہوئے زمین پر قدم رکھ رہا تھا اس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اندر سے اس کی حالت کتنی خراب ہے۔ اب تک بالکل خاموش تماشائی کا کردار ادا کرتا ربن اسے اس حال میں دیکھ کر اپنی جگہ بیٹھا نہ رہ سکا اور لپک کر اس کی طرف بڑھا۔ اگلے ہی لمحے فاروق اس کی باہوں کے حصار میں تھا۔

"یہ کیا حال ہو گیا ہے رے تیرا؟" اسے سینے سے لگائے لگائے ربن دکھ سے بڑبڑایا۔

"میں ٹھیک ہوں دادا، تم پریشان مت ہو۔" فاروق نے اسے تسلی دینی چاہی۔

"چپ رہ۔ مجھے بھی دکھائی پڑ رہا ہے کہ تو کتنا ٹھیک ہے۔" اس نے خفگی اور محبت سے فاروق کو ڈپٹا۔

"آپ درمیان میں نہ ہوتے چاؤلہ صاحب تو میں اس لڑکے کا یہ حال کرنے پر آپ کے ڈیپارٹمنٹ کی دھجیاں اڑا دیتا۔ بہر حال آپ نے جتنا کوآپریٹ کیا اس کے لیے تھینکس آلاٹ۔ کوشش کریں کہ اپنے ڈیپارٹمنٹ کے لوگوں کو بھی قانون سکھا سکیں ورنہ پولیس کی یہ غنڈا گردی کسی روز خود ڈیپارٹمنٹ کے گلے میں بھی آ سکتی ہے۔" اشوک کو بھی فاروق کی حالت دیکھ کر افسوس ہوا تھا چنانچہ خفگی کا اظہار کیے بغیر نہ رہ سکا۔ اگلے ہی لمحے وہ سب تھانے سے روانہ ہو رہے تھے۔ ربن نے فاروق کے گرد اپنا بازو اس طرح لپیٹ رکھا تھا کہ اسے چلنے میں سہارا مل رہا تھا۔

"تھینکس فار کمنگ راج۔ تم جاؤ، میں ذرا فاروق کو ہاسپٹل پہنچا دوں۔" تھانے سے نکل کر اپنی گاڑی کے قریب پہنچنے پر اشوک نے راج مہرہ سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا تو اس نے سر ہلا دیا۔ ادھر ربن کے آدمیوں نے بھی فاروق کو اس کے ساتھ دیکھ لیا تھا اور قریب آنے کے لیے بے چین ہو رہے تھے۔ ربن نے اشارے سے شیدو کو اپنے قریب بلایا اور بولا۔

"تم سارے واپس اڈے لوٹ جاؤ اور ادھر کا دھیان رکھو۔ اپن ہیرو کو لے کر ہاسپٹل جاتا ہے۔"

"اپن بھی تمہارے پیچھے آتا ہے دادا۔" شیدو جھٹ بولا۔

"چل ٹھیک ہے تو آجا پر باقیوں کو واپس بھیج دے۔" ربن نے کچھ سوچ کر اسے اجازت دے دی۔

"ہاسپٹل جانے کی کیا ضرورت ہے دادا! ہم بھی اڈے ہی چلتے ہیں۔" فاروق نے ان کی گفتگو میں دخل دیا تو ربن خفا ہو گیا۔

"تو بالکل چپکا رہ۔ اپن کو پتا ہے کہ تجھے کدھر کو لے کر جانا ٹھیک ہے۔" اس نے فاروق کو ڈپٹا۔

"دادا ٹھیک کہہ رہے ہیں دوست۔ تمہیں ہاسپٹل چلنا چاہیے۔" اشوک نے بھی سمجھایا تو فاروق کو خاموش ہونا پڑا ورنہ اس کی جو کیفیت تھی، وہ خود ہی جانتا تھا۔ پولیس والوں کی پہنچائی گئی تکلیفوں نے اسے اتنا نڈھال نہیں کیا تھا جتنا جولیٹ سے متعلق دکھائی دینے والا ایک خواب نڈھال کر گیا تھا۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ جلد از جلد اپنے ٹھکانے پر پہنچ جائے اور کسی طرح جولیٹ کی خبر گیری کرے۔ واقف حال ہونے کے باوجود وہ اس وقت ربن سے کوئی سوال نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اسے معلوم تھا کہ اگر وہ اس کی تلاش میں تھانے تک پہنچا ہے تو اس پر گزرے تمام حالات سے بھی واقف ہو گیا ہوگا۔ جاننے کے اس عمل میں چاند بانو کا بھی ذکر آتا تھا اور فاروق کیسے وضاحت کر سکتا تھا کہ پل پل جولیٹ کے عشق کا دم بھرتے ہوئے وہ بھلا کیا کرنے چاند بانو کے پاس گیا تھا۔

اشوک اپنی گاڑی میں بٹھا کر انہیں اسپتال لے گیا تو ربن نے بہت زیادہ شکریے کے ساتھ اسے واپس گھر روانہ کر دیا۔ اس معاملے میں مدد پر وہ فیس کی شکل میں جو ادائیگی کرتا وہ تو اپنی جگہ تھی لیکن احسان مندی کا اظہار اس لیے بھی ضروری تھا کہ اشوک نے اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے اپنے

ذاتی تعلقات کا استعمال کیا تھا ورنہ فاروق کی تھانے سے واپسی اتنی آسان ثابت نہ ہوتی۔ اسپتال میں بھی اشوک کی اچھی جان پہچان تھی اس لیے روانگی سے قبل وہ اس بات کا بندوبست کر گیا تھا کہ ڈاکٹرز بغیر حیل و حجت کے فاروق کا علاج کریں۔ فاروق کو معائنے کے لیے اندر کہیں لے جایا گیا تو ربن کو انتظار گاہ میں بیٹھنا پڑا۔ اتنی دیر میں شیدو بھی وہاں پہنچ گیا۔ فاروق کا حال احوال پوچھنے کے ساتھ اس نے ربن کو جوزفین کی موت کی اطلاع بھی سنا ڈالی۔ اس اطلاع کو سن کر ربن کی فکر مزید بڑھ گئی۔ اس نے شیدو کو ہدایت کی کہ اس سلسلے میں فاروق سے کوئی ذکر نہ کیا جائے اور باقی لوگوں کو بھی یہ بات سمجھا دی جائے کہ جولیٹ کے اغوا اور جوزفین کی موت سمیت کسی بھی بری خبر کا ابھی فاروق کے سامنے ذکر نہیں کرنا ہے۔ شیدو نے فوراً ہی اثبات میں سر ہلایا۔

''بلکہ ایسا کر کہ تو اڈے واپس لوٹ جا۔ ابھی تو فاروق کا معائنہ ہو رہا ہے۔ ڈاکٹر اسے کسی سے ملنے نہیں دیں گے۔ تو اڈے پہنچ کر رامو سے بول کہ پہلے میت والے گھر میں کھانے پینے اور دوسری چیزوں کا بندوبست کر دے پھر یہاں چلا آئے۔ اپن کو اس سے کچھ کام ہے۔'' رامو اس کا دست راست تھا اور اسے کچھ کاموں کے سلسلے میں اس کی موجودگی کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی اس لیے اس نے شیدو کو ایک نیا حکم دیا۔ شیدو کو نہ چاہتے ہوئے بھی وہاں سے روانہ ہونا پڑا ورنہ اس کی خواہش تھی کہ وہ ربن کو اڈے بھجوا دے تاکہ وہ تھوڑی دیر آرام کر کے تازہ دم ہو سکے لیکن اس وقت وہ مشورہ دینے کی بھی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ فاروق کی طرف سے بھرپور اطمینان ہوئے بغیر دادا اسپتال سے ہلے گا بھی نہیں۔ اس کے جانے کے کچھ دیر بعد ڈاکٹر نے ربن کو بلوایا۔

''نوجوان کو بہت بری طرح ٹارچر کیا گیا ہے۔ جسم پر موجود چوٹوں کے علاوہ سر پر بھی چوٹ ہے۔ نوجوان مضبوط قوتِ ارادی کا مالک لگتا ہے اس لیے اتنی سخت چوٹوں کے باوجود اس نے خود کو سنبھالا ہوا ہے لیکن ہمیں اپنا پورا اطمینان کرنا ہوگا۔ ایکسرے کے علاوہ دو تین دوسرے ٹیسٹ بھی لینے ہوں گے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ اسے ہاسپٹل میں ایڈمٹ رکھا جائے۔'' اسمارٹ سے ادھیڑ عمر ڈاکٹر نے اس پر صورتِ حال واضح کی۔

''ٹھیک ہے ڈاکٹر صاحب! جیسا آپ ٹھیک سمجھو۔ اپن تو بس اپنے ہیرو کو ایک دم ٹھیک دیکھنا مانگتا ہے۔ آپ جتنے دن چاہو اسے یہاں رکھو۔'' ربن نے بردباری سے اسے جواب دیا۔ ڈاکٹر کی باتوں نے ایک طرف جہاں اسے فاروق کی طرف سے تشویش میں مبتلا کیا تھا، وہیں وہ یہ اطمینان بھی محسوس کر رہا تھا کہ اسپتال میں رہنے کی صورت میں وہ فوری طور پر جولیٹ اور اس کے گھرانے پر گزرے حالات سے باخبر نہیں ہو سکے گا۔ اس طرح انہیں جولیٹ کی بازیابی کے سلسلے میں ہاتھ پیر چلانے کے لیے کچھ مہلت مل جاتی۔

''پرابلم یہ ہے مسٹر کہ تمہارا مریض ہاسپٹل میں رکنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ معائنے کے دوران بھی وہ کئی بار اصرار کر چکا ہے کہ اسے ہاسپٹل سے ڈسچارج کر دیا جائے۔ اگر وہ ہم سے کوآپریٹ نہیں کرے گا تو ہم اس کا علاج کیسے کریں گے؟'' ڈاکٹر نے اسے بتایا۔

''اس کا آپ فکر نہیں کرو۔ اپن اسے سمجھا دے گا۔ آپ اپنے کو اس کے پاس جانے کا اجازت دے دو۔''

''ٹھیک ہے تم اس سے مل لو لیکن بہت زیادہ باتیں مت کرنا۔ مجھے اس کے سر کی چوٹ کی طرف سے فکر ہے اور میں نہیں چاہتا کہ اس کے دماغ پر کوئی بوجھ پڑے۔ شام میں پانچ بجے دماغ کے بڑے ڈاکٹر اسپتال پہنچیں گے تو میں ان سے بھی اس کا معائنہ کرواؤں گا۔'' اجازت دینے کے ساتھ ہی ڈاکٹرز نے اسے چند باتیں سمجھانا بھی ضروری سمجھا۔ ربن جواب میں صرف سر ہی ہلا سکا۔ فاروق کے بارے میں کسی بھی تشویش ناک خبر کو سننے کے لیے اس کا دل راضی نہیں ہوتا تھا۔ وہ بڑی مشکل سے خود پر قابو پا کر اس کے کمرے میں پہنچا۔

''آ گئے دادا...... چلو واپس اڈے چلتے ہیں۔ وہاں سب لوگ راہ دیکھ رہے ہوں گے۔ یہاں اکیلے میں تو میرا دل گھبرا جائے گا۔'' اسے دیکھتے ہی فاروق بستر پر اٹھ بیٹھا۔

''چپکا پڑا رہ۔ ڈاکٹر نے بولا ہے کہ ابھی تیرے تھوڑے ٹیسٹ لینے ہیں۔ ٹیسٹ ہو جائیں اور ڈاکٹر اجازت دے دے تو پھر واپس چلتے ہیں۔'' ربن نے نرم گرم لہجے میں اسے جواب دیا۔

''میں ٹھیک ہوں دادا۔ ٹیسٹ ویسٹ سب ڈاکٹروں کے چونچلے ہیں۔ اپنے اندر کا حال آدمی خود بہتر جانتا ہے۔ جب میں کہہ رہا ہوں کہ میں ٹھیک ہوں تو اس کا مطلب ہے کہ سب ٹھیک ہے۔ ڈاکٹر سے بولو کہ دوا دارو دے کے مجھے فارغ کر دے۔ ڈاکٹر نہیں سمجھتا لیکن تم تو جانتے ہو نا کہ اپنی دنیا کے آدمی کتنی موٹی کھال کے ہوتے ہیں۔ لوٹ پوٹ کر تھوڑے دنوں میں خود ہی ٹھیک ہو جاتے ہیں۔'' وہ اسے قائل کرنے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا۔

''میں نے کہہ دیا کہ چپکا پڑا رہ تو بس چپکا پڑا رہ۔ مجھے زیادہ بھاشن دینے کی ضرورت نہیں ہے تجھے۔ تیری زیادہ مانتا ہوں تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تو مجھ پر حکم چلانے لگے۔ حکم تو میرا ہی چلے گا یا نہیں؟'' ربن جان بوجھ کر اس پر بگڑا۔

''میں نے ایسا کب کہا دادا۔ تمہارے حکم پر تو میں بنا چوں کیے اپنی جان بھی دے سکتا ہوں۔'' اس کے انداز پر فاروق بوکھلا گیا۔

''کسی کے لیے جان دینا ہی سب کچھ نہیں ہوا کرتا۔ اپنے پیاروں کی جان لے کر کون خوش رہ سکتا ہے۔ جینے کا سواد تو اسی صورت ملتا ہے جب اپنے پیارے اپنی نظروں کے سامنے ہنستے کھیلتے آباد رہیں۔ تو میری مان کر، میرے دل کے اطمینان کے لیے ڈاکٹروں کے کہنے تک یہاں رہنے پر راضی ہو جا تو یہ میرے لیے کافی ہے۔'' ربن نے اسے سمجھایا تو وہ خاموش ہو گیا اور بس اتنا بولا۔

''ٹھیک ہے دادا جیسے تم بولو۔''

''جیتا رہ میرا شیر۔ تو نے میرا دل خوش کر دیا۔ میں ڈاکٹر سے کہوں گا کہ زیادہ دن تجھے یہاں نہ روکیں۔ رکنا بھی پڑا تو کوئی بات نہیں۔ میں سب سے تیری ملاقات کروانے کی اجازت لے لوں گا۔ وہ سارے مردود بھی کب تیرا دیدار کیے بغیر رہ سکتے ہیں۔ ایک ذرا سا اشارہ مل جائے میری طرف سے تو دوڑے چلے آئیں گے۔'' اس کے جواب نے ربن کو خوش کر دیا۔ اسے خوش دیکھ کر فاروق بھی مسکرانے لگا لیکن دل کی گہرائیوں میں جو بے نام سی اداسی بسی تھی، اس کا کہاں کوئی علاج تھا۔ اس اداسی کو اسے خود تنہا اپنی جان پر جھیلنا تھا۔

☆☆☆

اس کے اطراف میں بہت گہری تاریکی تھی۔ اتنی گہری تاریکی کہ اسے اپنا آپ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اپنے وجود کی تلاش میں اس نے ہاتھ پیر چلانے چاہے تو کامیاب نہیں ہو سکی۔ ایسا لگتا تھا کہ پورا وجود ایک بھاری پتھر میں تبدیل ہو گیا ہو لیکن وجود پتھر بن گیا ہوتا تو درد اور گھٹن کا شدید احساس کیونکر ہو پاتا۔ اس کا حال تو قبر میں زندہ دفن کر دیے جانے والے شخص کا سا تھا۔ قبر کے سوا بھلا اور کون سی جگہ ہوتی ہے جہاں اتنی تاریکی اور گھٹن ہو اور انسان اپنی مرضی سے اپنے اعضا کو جنبش بھی نہ دے سکے۔ اس کے لیے تو اپنی بند آنکھوں کو بھی کھولنا ممکن نہیں ہو پا رہا تھا۔ اٹک اٹک کر آتی سانس احساس دلا رہی تھی کہ وہ ابھی مری نہیں ہے اور جب زندہ تھی تو قبر میں رہنا کیونکر قبول کر سکتی تھی۔ اس نے اپنی پوری قوت بند آنکھوں کو کھولنے پر صرف کر دی۔ آخر کار اس کی کوشش رنگ لائی اور سختی سے بند پپوٹوں نے جنبش کی۔ پپوٹے ذرا سے کھلے تو روشنی نے اس کی آنکھوں تک رسائی حاصل کی اور پہلی بار اسے احساس ہوا کہ وہ حقیقتاً قبر میں نہیں ہے۔ یہ احساس بڑا قوت بخش تھا چنانچہ اس نے اس بار ایک جھٹکے سے آنکھیں کھول دیں۔ اس کے اردگرد بہت تیز روشنی نہیں تھی لیکن بہت دیر کی بند آنکھیں کھلنے پر چندھیا سی گئیں۔ تاریکی سے روشنی کا عادی ہونے میں آنکھوں کو چند سیکنڈ لگے اور جب وہ اپنے اردگرد کا منظر دیکھنے کے لائق ہوئی تو اسے پتا چلا کہ وہ ایک پُرآسائش کمرے میں بستر پر لیٹی ہوئی ہے۔ بستر بہت نرم اور آرام دہ تھا اس کے باوجود وہ اپنے پورے جسم کو پھوڑے کی طرح دکھتا ہوا محسوس کر رہی تھی۔

''یہ کون سی جگہ ہے اور میں یہاں کیسے پہنچی؟''.....

بے ہوشی سے ہوش میں آتے اس کے دماغ نے سوالات اٹھانے شروع کیے تو وہ ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھی اور یادداشت کے پردے پر بہت سے مناظر ابھر آئے۔ دلدار آغا کا دھمکی آمیز فون، دفتر سے اپنی روانگی اور پھر گھر کے قریب ہونے والا اغوا......سب اسے یاد آ گیا۔ اس نے سخت عالم وحشت میں اپنے آپ کو ٹٹولا اور سب کچھ گنوا دینے کے احساس سے پتھرا گئی لیکن سکتے کی یہ کیفیت بس کچھ دیر کی ہی تھی، اگلا مرحلہ جنون اور وحشت کا تھا جس نے اسے بستر سے اٹھا کر دروازے تک پہنچا دیا تھا۔ وہ جیسے اس دروازے سے باہر نکل کر ساری دنیا کو تہس نہس کر ڈالنے کا ارادہ رکھتی تھی لیکن باہر سے بند دروازے نے اس کی راہ روک لی۔ عالم جنون میں اس نے دروازے کو بری طرح پیٹ ڈالا اور کئی بار زور آزمائی کی لیکن اس جیسی نازک لڑکی بھلا اتنے مضبوط دروازے کا کیا بگاڑ سکتی تھی۔ تھک ہار کر اس نے دروازہ کھولنے کی کوشش ترک کی اور کمرے میں موجود سامان اٹھا اٹھا کر دروازے پر مارنے لگی۔ ذرا سی دیر میں دروازے کے سامنے ٹوٹی پھوٹی آرائشی اشیا، تکیوں اور چادروں وغیرہ کا ڈھیر لگ گیا لیکن باہر سے کوئی ردعمل ظاہر نہ ہوا اور ایسی خاموشی چھائی رہی جیسے بند دروازے کے اس پار کوئی ذی روح موجود ہی نہ ہو، اگر ہو تو قوتِ سماعت سے مکمل طور پر محروم ہو۔ اس خاموشی نے اس کے اشتعال کو رفتہ رفتہ احساسِ بے بسی میں بدلنا شروع کر دیا اور وہ وہیں دروازے کے سامنے بیٹھ کر زور زور سے رونے لگی۔ روتے ہوئے وہ

صرف اپنی بربادی پر ماتم کناں نہیں تھی بلکہ اسے اپنے ماں باپ اور عارف کا بھی خیال آرہا تھا۔
وہ مقررہ وقت پر دفتر سے گھر نہیں پہنچی ہوگی تو اس کے ماں باپ پر کیا گزری ہوگی، وہ سمجھ سکتی تھی۔ ہوسکتا ہے وہ پریشانی میں اسے تلاش کرنے نکل کھڑے ہوئے ہوں اور عارف سے بھی اس کے بارے میں معلوم کرنے پہنچ گئے ہوں لیکن عارف ان کو کیا بتا سکتا تھا، وہ تو خود پریشان ہوگیا ہوگا اور اب جبکہ پوری رات گزرنے کے بعد دن بھی خاصا چڑھ گیا تھا تو وہ لوگ کیا کر رہے ہوں گے؟ ہوسکتا ہے جوزف اور جوزفین کا خیال دلدار آغا کی طرف گیا ہو لیکن ان جیسے بے حیثیت لوگ اتنے بڑے جاگیردار، صنعت کار اور سیاست دان کے خلاف کیا کرنے کی طاقت رکھتے تھے؟ ان کی آواز تو نقار خانے میں طوطی کی آواز جیسی ہوگی جس پر کوئی کان بھی نہیں دھرے گا۔ خیالات کا ایک ہجوم تھا جو مسلسل روتے ہوئے اس کے ذہن سے گزرتا جارہا تھا۔
یک دم ہی اسے دروازے کی طرف سے کھٹکا سا سنائی دیا۔ اس نے چونک کر اس طرف دیکھا تو بند دروازہ کھلنے کے بعد دوبارہ بند ہورہا تھا۔ اس نے لپک کر دروازے تک پہنچنے کی کوشش کی لیکن اس کے پہنچنے سے قبل ہی دروازہ بند ہو چکا تھا۔ اس نے دوبارہ دروازے کو بجانا شروع کر دیا لیکن پہلے کی طرح ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ شدید مایوسی کے عالم میں وہ پلٹ رہی تھی جب اس کی نظر فرش پر پڑے سفید لفافے پر گئی۔ یہ لفافہ پہلے یہاں موجود نہیں تھا۔ یعنی دروازہ کھلنے اور بند ہونے کے وقفے کے دوران کسی نے اسے اندر پھینکا تھا۔ اس نے لپک کر وہ لفافہ اٹھالیا اور اسے کھول کر اس میں موجود تہ کیا ہوا کاغذ باہر نکالا۔ وہ اس کے نام لکھا ایک مختصر خط تھا۔ جس میں لکھا تھا۔
''جولیٹ ڈارلنگ!
تم نے اپنی سرکشی کا انجام دیکھ لیا۔ میں نے تم سے کہا تھا نا کہ میں جو حاصل کرنا چاہوں، اسے ہر قیمت پر حاصل کر لیتا ہوں سو تمہیں بھی فتح کر ہی ڈالا لیکن اب مجھے تمہارے مستقبل کا خیال ستا رہا ہے۔ یہاں سے واپس جا کر ایک نارمل لائف شروع کرنے کے لائق تو اب تم رہی نہیں ہو اس لیے بہتر ہے کہ میری آفر قبول کرلو۔ میں تمہیں بہت عیش و آرام کی زندگی دے سکتا ہوں۔ بشرطیکہ آج رات تم کھلی بانہوں سے مسکراتے ہوئے میرا استقبال کرو۔
تمہارے حسن کا پرستار
دلدار آغا۔''
خط کی تحریر پڑھ کر جولیٹ کی مٹھیاں بھنچ گئیں اور اس نے شدید اشتعال کے عالم میں اس کے کئی پرزے کر ڈالے۔ اس پر بھی غصہ کم نہ ہوا تو منہ بھر بھر کر وہ ساری گالیاں دلدار آغا کو دینے لگی جو اس نے اپنے اردگرد کے ماحول سے سنی تو بہت تھیں لیکن اچھی تربیت کے باعث کبھی اس کی زبان پر نہیں آسکی تھیں۔ گالیاں دیتے ہوئے وہ مسلسل دروازے پر مکے بھی برسا رہی تھی لیکن پہلے ہی کی طرح اس بار بھی کوئی ردعمل ظاہر نہیں ہوا اور اسے نڈھال ہوکر بیٹھنا پڑا۔ اس کی جسمانی حالت یوں بھی اچھی نہیں تھی اور وہ شدید نقاہت محسوس کر رہی تھی۔ گزرنے والے حادثے نے اس کے جسم پر جو اثرات مرتب کیے تھے، وہ اپنی جگہ تھے...... اس کے علاوہ بھوک اور پیاس نے بھی اسے کمزور کر دیا تھا۔ اس نے کل دوپہر دفتر میں بہت ہلکا سا لنچ لیا تھا اور اس کے بعد سے اس کے پیٹ میں غذا کے نام پر کوئی شے نہیں گئی تھی۔ روشن دان سے آتی سورج کی روشنی سے اندازہ ہورہا تھا کہ رات کے بعد دن کا بھی کافی حصہ گزر چکا ہے لیکن یہاں کسی نے اسے کھانے پینے کو نہیں پوچھا تھا۔ شاید اس طرح اس کے اعصاب کو توڑنے کی کوشش کی جارہی تھی کیونکہ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ بھوک اور پیاس کا عفریت جب انسان کے وجود میں اپنے پنجے گاڑتا ہے تو اسے کسی نہ کسی مرحلے پر آکر اپنی شکست تسلیم کرنی پڑتی ہے۔ یہ مرحلہ کب آتا ہے؟ اس کا انحصار ہر ایک کی برداشت کی حد پر ہوتا ہے۔ فی الحال تو جولیٹ اپنے لٹنے پر ماتم کناں اس قید خانے سے رہائی کی فکر میں مبتلا تھی اس لیے کھانے پینے کی طرف اس کا دھیان نہیں گیا تھا۔ نقاہت البتہ اسے محسوس ہورہی تھی۔ یہ نقاہت ہی تھی جس نے اسے روتے روتے نیم غنودگی میں مبتلا کر دیا۔ اپنی اس غنودہ کیفیت سے وہ اس وقت چونک کر ہوش میں آئی جب اس نے اپنے شانے پر کسی کے ہاتھ کا لمس محسوس کیا۔ اس لمس کو محسوس کر کے وہ بدک سی گئی لیکن پھر اپنے سامنے ایک اجنبی لڑکی کو پا کر حیران رہ گئی۔ لڑکی کے چہرے پر نرمی تھی اور وہ بہت ترحم آمیز نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔
''کون ہو تم؟'' جولیٹ نے وحشت زدہ لہجے میں اس سے دریافت کیا۔
''میرا نام صبیحہ ہے۔ مجھے مسٹر آغا کے حکم پر آپ کی خدمت کے لیے بھیجا گیا ہے لیکن میں آپ کے لیے مسز آغا کا ایک خفیہ پیغام بھی لے کر آئی ہوں۔'' لڑکی نے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے بہت مدھم آواز میں اسے بتایا تو وہ مزید

حیران رہ گئی۔ دلدار آغا کے اس قید خانے میں بھلا ثنا نے اسے کیا پیغام بھیجا ہوگا، وہ سمجھنے سے قاصر تھی۔

''مسز آغا نے پیغام دیا ہے کہ جو کچھ ہوا انہیں اس پر بہت افسوس ہے۔ اگر انہیں بروقت اطلاع مل جاتی تو وہ آپ کو بچانے کی پوری کوشش کرتیں۔ اب بھی وہ آپ کی مدد کرنا چاہتی ہیں لیکن اس کے لیے آپ کو میری ہدایات پر عمل کرنا ہوگا۔'' اس کی حیرت کو نظر انداز کیے صبیحہ اپنی بات بولتی رہی۔ جولیٹ کے لیے اس کا وجود گھپ اندھیرے میں روشنی کی کرن کی طرح تھا۔ چنانچہ وہ توجہ سے اس کی بات سنتی رہی۔ صبیحہ نے اس سے اپنا جو تعارف کروایا اس کے مطابق وہ آرائش حسن کی ایک ماہر تھی جو دلدار آغا کے حکم پر اس کے لیے لباس اور دیگر آرائشی سامان لے کر یہاں پہنچی تھی تاکہ کل چوروں کی طرح شب خون مارنے والا آغا آج پورے اہتمام سے اس کے حسن سے لطف اندوز ہو سکے۔ صبیحہ کا لایا ہوا سامان ایک بیگ میں اس کے قریب ہی دھرا تھا۔ صبیحہ کو نہیں معلوم تھا کہ ثنا کو کس ذریعے سے یہاں کے حالات کا علم ہوا تھا لیکن اس نے فون پر اس سے رابطہ کیا اور اسے ہدایت دی کہ آغا کی قید میں موجود جولیٹ کو رہائی دلانے کی پوری کوشش کرنی ہے۔ اس سلسلے میں ایک محفوظ منصوبہ بھی ثنا نے ہی اسے بتایا تھا۔ اپنی رہائی کی طرف سے تقریباً مایوس ہو جانے والی جولیٹ نے زیادہ تفصیلات میں جانے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور صبیحہ کی زبانی سنے منصوبے پر عمل کرنے کے لیے تیار ہوگئی۔

تھوڑی دیر میں کمرے کا نقشہ کچھ یوں تھا کہ صبیحہ نے اپنے ساتھ لایا گیا کامدار جوڑا پہن لیا تھا جبکہ جولیٹ کے جسم پر اس کا اتارا ہوا لباس تھا۔ خود اس کا اپنا لباس تو استعمال کے قابل ہی نہیں رہا تھا۔ لباس کی تبدیلی کے بعد اس نے صبیحہ کی ہدایت کے مطابق اس کے ہاتھ پیروں کو اپنے لباس کی دھجیاں پھاڑ کر ان کی مدد سے باندھ دیا اور منہ بھی ایک رومال ٹھونس کر بند کر دیا۔ اب وہ صبیحہ کا بڑا سا دوپٹا اپنے سر اور چہرے کے گرد لپیٹے وہاں سے نکلنے کے لیے تیار تھی۔ وہ یہاں سے نکل جاتی تو بعد میں صبیحہ یہ کہانی سناتی کہ جولیٹ نے دھوکے سے اس کے سر پر کچھ مار کر اسے بے ہوش کر دیا تھا اور اس کی بے ہوشی کے دوران ہی وہ چالاکی سے کام لے کر فرار ہونے میں کامیاب ہوگئی۔

وہاں سے نکلنے سے قبل جولیٹ نے صبیحہ کا شکریہ ادا کیا کہ وہ اس کی مدد کر کے اپنے لیے رسک لے رہی ہے لیکن بہرحال اسے اتنا اندازہ تھا کہ اس کے فرار پر صبیحہ سے بہت زیادہ سخت سلوک نہیں کیا جائے گا ورنہ وہ خود بھی اس منصوبے کا حصہ بننے کے لیے راضی نہ ہوتی۔

اس بار کوشش کرنے پر کمرے کا دروازہ آسانی سے کھل گیا تھا۔ شاید صبیحہ کی اندر موجودگی کے باعث اسے باہر سے بند کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی تھی۔ اس نے دروازہ کھول کر محتاط انداز میں باہر قدم رکھا تو برآمدے میں ایک مسلح آدمی کو دیکھ کر ٹھٹک گئی لیکن اس مسلح شخص نے اس کی طرف ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالنے کے سوا کوئی ردعمل ظاہر نہ کیا تو اس کا حوصلہ بلند ہوگیا اور یاد آگیا کہ اس وقت وہ صبیحہ کا لباس پہنے ہوئے ہے اس لیے اس آدمی نے اسے صبیحہ ہی سمجھا ہوگا۔ وہ تیز تیز قدموں سے چلتی اس کے قریب سے گزر کر برآمدہ پار کر گئی۔ بیرونی گیٹ تک کا راستہ اسے صبیحہ نے اچھی طرح سمجھا دیا تھا، اس لیے وہ بغیر کسی دشواری کے باہر تک پہنچ گئی۔ گیٹ پر موجود چوکیدار نے بھی اس سے کسی قسم کا تعرض نہیں کیا۔ کوٹھی سے نکلنے کے بعد وہ صبیحہ کی ہدایت کے مطابق دائیں جانب چند قدم چلی تو اسے سبز رنگ کی ایک موٹر کار نظر آگئی۔ کار کے باہر ڈرائیور منتظر کھڑا تھا۔ اس کے قریب رکتے ہی ڈرائیور نے پچھلی نشست کا دروازہ کھولا اور جیسے ہی وہ سوار ہوئی، موٹر اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔ یہ مغرب کے بعد کا وقت تھا چنانچہ اندھیرا چھا رہا تھا اس کے باوجود جولیٹ نے کوشش کی کہ راستہ ذہن نشین کر سکے۔ وہ اس کوٹھی کو یاد رکھنا چاہتی تھی جہاں اس کی زندگی برباد کی گئی تھی۔ ذہن میں کوئی باقاعدہ منصوبہ نہ ہونے کے باوجود اس نے طے کر لیا تھا کہ وہ دلدار آغا سے اس کے اس ظلم کا حساب ضرور لے گی۔

''بی بی! آپ یہاں اتر کر کوئی سواری لے لیں۔ مجھے آپ کو بس یہیں تک پہنچانے کا حکم ملا تھا۔'' ایک بارونق چوراہے پر پہنچ کر ڈرائیور نے گاڑی روک لی اور مؤدب لہجے میں کہا تو اسے گاڑی سے اترنا پڑا۔ وہ بمبئی کی رہائشی تھی اور یہیں پل بڑھ کر جوان ہوئی تھی اس لیے اس جگہ کو شناخت کرنے میں اسے کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ یہاں سے اس کی رہائش گاہ زیادہ دور نہیں تھی اور وہ کوئی بھی سواری لے کر بہ آسانی گھر تک پہنچ سکتی تھی۔ کرائے کا بھی کوئی مسئلہ نہیں تھا کیونکہ صبیحہ کا ہینڈ بیگ اس کے پاس تھا اور صبیحہ نے اسے بتایا تھا کہ اس میں کچھ رقم موجود ہے۔ اس کے اترتے ہی ڈرائیور

گاڑی آگے بڑھا لے گیا جبکہ اس نے ایک تانگے کا رخ کیا۔ تانگے والے سے سالم تانگے کا کرایہ طے کرنے کے بعد وہ اس میں سوار ہو گئی۔ جلد ہی تانگا جانے پہچانے راستوں سے گزر کر اس کے محلے تک پہنچ گیا۔ وہ جو اب تک اپنے کامیاب فرار کے جوش میں تھی، بری طرح کانپنے لگی۔ چوبیس گھنٹوں سے زیادہ گھر سے غائب رہنے والی لڑکی کے لیے محلے میں کیسی کیسی داستانیں نہ پھیلی ہوں گی' اسے ادراک تھا لیکن اپنے ماں باپ کی خاطر اسے یہاں لوٹنا تو تھا ہی۔ اس نے کوچبان کو تانگا گلی کے اندر لے جانے کی ہدایت کی تا کہ راستے میں کسی سے ملے بغیر سیدھی اپنے گھر تک پہنچ جائے۔ گلی تنگ ہونے کے باوجود اتنی گنجائش تھی کہ اس میں سے تانگا گزر جائے لیکن آگے سے بند ہونے کی وجہ سے واپس باہر نکلنے میں مشکل پیش آتی تھی اس لیے عموماً یہاں کے مکین تانگے وغیرہ کو باہر ہی رکوا کر پیدل اپنے گھروں تک جاتے تھے۔

تانگا گلی سے گزرنے لگا تو گلی میں موجود ایک دو... راہ گیروں کو بالکل دیواروں کے ساتھ چپک کر اسے راستہ دینا پڑا۔ تانگے کی آواز پر اپنے گھر کے دروازے پر کھڑی بچے کو آواز دیتی للیتا موسی نے پر تجسس نظروں سے اندر بیٹھی سواری کو دیکھنا چاہا تو جولیٹ نے اپنے چہرے کے گرد لپٹے دوپٹے کو اور بھی سختی سے تھام لیا۔ موسی کے گھر کے سامنے سے گزر کر تانگا اس کے گھر کے دروازے پر پہنچا تو اس نے کوچبان کو رکنے کا حکم دیا اور تانگے میں بیٹھے بیٹھے ہی اسے مطلوبہ کرایہ ادا کرنے کے بعد نیچے اتری۔ دروازہ کھلا ہوا تھا اور اندر سے کسی کے بولنے کی آواز آرہی تھی۔ آواز شناسا ہونے کے باوجود اس وقت اپنے منتشر اعصاب کی وجہ سے وہ اسے شناخت نہ کر پائی البتہ اس بات کو اس نے پوری شدت سے محسوس کیا کہ خاموشی نہ ہونے پر بھی گھر پر ویرانی سی چھائی ہوئی ہے۔ یہ دل کو جکڑ لینے والی ویرانی تھی۔

''مام۔'' اس نے گھبرا کر جوزفین کو پکارا اور لرزتے قدموں سے اس کمرے کی طرف بڑھی جو اس کے والدین کے زیر استعمال رہتا تھا۔ بولنے کی آواز بھی اسے اسی کمرے سے سنائی دی تھی۔ اس کے کمرے تک پہنچنے سے قبل ہی دو افراد تیزی سے باہر نکلے۔ ان میں سے ایک غلام چاچا جبکہ دوسرا عارف تھا۔ عارف کو دیکھ کر اس کی ساری ہمتیں ٹوٹ گئیں۔

''عارف.....'' اس نے ڈوبتی ہوئی آواز میں عارف کو پکارا اور سہارے کے لیے اپنا بازو آگے پھیلایا۔ سکتہ زدہ سا عارف اپنی جگہ سے حرکت نہ کرسکا البتہ غلام چاچا نے تیزی سے آگے بڑھ کر اسے سنبھال لیا۔ عالم بے ہوشی میں جاتے جاتے بھی جولیٹ نے اس بات کو پوری شدت کے ساتھ محسوس کیا تھا کہ عارف نے اس کے گرتے ہوئے وجود کو سنبھالنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

☆☆☆

ربن اسپتال کے باغیچے میں نصب لکڑی کی ایک بینچ پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے اردگرد اور بھی بہت سے لوگ تھے۔ یہ زیادہ تر ان مریضوں کے اعزاء تھے جو اسپتال میں داخل تھے۔ اپنے اپنے مریض کی حالت کے حساب سے ہر شخص کے چہرے کا تاثر مختلف تھا۔ کہیں شدید پریشانی کے بادل چھائے تھے تو کہیں امید کی کرنیں چمک رہی تھیں۔ کوئی خوشی سے نہال تھا کہ اس کا مریض صحت یابی کے بعد اب اسپتال سے رخصت ہونے کو ہے۔ اتنے بہت سے لوگوں میں تنہا ربن کا چہرہ سپاٹ تھا لیکن اندر پریشانی نے پنجے گاڑ رکھے تھے۔ کچھ دیر قبل دماغ کے ماہر ڈاکٹر کی آمد پر فاروق کو معائنے کے لیے کسی دوسرے کمرے میں لے جایا گیا تھا۔ ساتھ ہی اسے یہ بھی بتا دیا گیا تھا کہ اس وقت فاروق کے کچھ ضروری ٹیسٹ اور ایکسرے وغیرہ بھی لیے جائیں گے جس کے لیے کم سے کم دو گھنٹے کا وقت درکار ہوگا۔ اس پورے عمل کے دوران ربن کی موجودگی کو غیر ضروری قرار دیتے ہوئے اسے باہر بیٹھنے کا حکم سنایا گیا تھا۔ ڈاکٹر کے مطابق اس دوران مریض کی دیکھ بھال اور نگرانی کے لیے اسپتال کے تربیت یافتہ عملے کے علاوہ کسی دوسرے فرد کی موجودگی نہ صرف غیر ضروری تھی بلکہ ان کی یکسوئی میں خلل کا سبب بھی بن سکتی تھی۔ چنانچہ فاروق کے قریب رہنے کی خواہش دل میں رکھنے کے باوجود سمجھداری کا ثبوت دیتے ہوئے اس نے کسی قسم کی بحث نہیں کی تھی اور اب باہر بیٹھا گھڑیاں گن رہا تھا۔ اسے رامو کا بھی انتظار تھا۔ اندازہ تھا کہ وہ اپنا کام نمٹا کر آتا ہی ہوگا۔ اس کا یہ اندازہ درست ثابت ہوا اور اس نے اسپتال کے بڑے گیٹ سے رامو کو اندر داخل ہوتے دیکھا۔ رامو کی نظر اس پر نہیں پڑی تھی چنانچہ وہ سیدھا مرکزی عمارت کی طرف بڑھتا جا رہا تھا۔ ربن نے بینچ سے کھڑے ہو کر اسے پکارا اور ہاتھ سے اشارہ کیا تو وہ اس کی طرف چلا آیا۔ اس کے قریب آنے پر ربن دوبارہ بینچ پر بیٹھ گیا اور اسے بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''ادھر کیوں بیٹھے ہو دادا..... اندر ہیرو اکیلا ہے کیا؟'' اس کے قریب بینچ پر بیٹھتے ہوئے رامو نے ذرا تشویش سے پوچھا۔

''بڑا ڈاکٹر آیا ہوا ہے۔ اپنے ہیرو کو ٹھونک بجا کر دیکھنے کو اس کے پاس لے کر گئے ہوئے ہیں۔ اپن کو حکم سنایا ہے کہ دو گھنٹے تک ادھر نہیں آنا ہے اس لیے اپن یہاں آکر بیٹھ گئے ہیں۔'' اس نے منہ بناتے ہوئے رامو کو بتایا تو اس کا چہرہ اتر گیا۔ اتنا تو اسے بھی معلوم تھا کہ ہر مریض کو بڑے ڈاکٹر کے سامنے معائنے کے لیے پیش نہیں کیا جاتا۔ کیس عام نوعیت کا ہو تو عام ڈاکٹر ہی نمٹا دیتے ہیں۔ بڑے ڈاکٹر تک بات اسی صورت میں پہنچتی ہے جب مریض کی طرف سے کچھ خدشات لاحق ہوں۔

''کیوں رونی صورت بناتا ہے رے۔ کچھ نہیں ہونے کا اسے۔ وہ میرا شیر ببر ہے۔ دیکھنا کیسے اس جھٹکے سے سنبھل کر کھڑا ہو جائے گا۔'' ربن خود اندر سے آزردہ تھا اس کے باوجود بڑے حوصلے سے رامو کو دلاسا دیا تو وہ اثبات میں سر ہلانے لگا اور پھر بولا۔

''ادھر وہ سارے بھی اسپتال آنے کے لیے اُتاولے ہو رہے ہیں۔ گولو تو میرے سر ہی ہو گیا تھا۔ بڑی مشکل سے روک کر آیا ہوں۔''

''اچھا کیا۔ ابھی کسی کو ادھر آنے کا فائدہ نہیں ہے۔ ڈاکٹر نے بھیڑ بھاڑ لگانے سے منع کیا ہے۔ وہ سارے حرام خور آئیں گے اور ملاقات کی اجازت نہیں ملے گی تو خانخواہ ہنگامہ کریں گے۔ تو بتا اپنے سارے کام نمٹا آیا یا نہیں؟'' بات کے اختتام پر ربن نے اس سے سوال کیا۔

''سب ہو گیا دادا۔ ادھر زمرد بائی کے کوٹھے پر پہرے کے لیے اپنے آدمی بٹھا دیے ہیں اور اسے تسلی دے دی ہے کہ اب مجو یا کسی اور آدمی نے اس کوٹھے کا رخ کیا تو اس کی خیر نہیں ہوگی۔ بائی نے سلام اور شکریہ کہلوایا ہے۔ نانا کو ساتھ لے کر چھ سات خاص خاص اڈوں کے داداؤں سے بھی مل آیا ہوں۔ سب نے مجو کی حرکتوں پر غصے کا اظہار کیا ہے۔ سبھی کو افسوس ہے کہ مجو نے اڈے کی دنیا کے اصولوں کا خیال نہیں کیا۔ وہ سب ہمارا ساتھ دینے کو تیار ہیں اور اس بات پر راضی ہیں کہ اصول کی بنیاد پر مجو کا فیصلہ کر دیا جائے۔ اب یہ تم پر ہوگا کہ فیصلے کے لیے کیا دن رکھتے ہو۔ وہ سارے تو ایک بلاوے پر سے پر پہنچنے کو تیار ہیں۔'' رامو نے اسے ان دو اہم کاموں سے متعلق

اطلاعات فراہم کیں جن کے لیے ربن نے اسے ہدایات دے کر روانہ کیا تھا۔

''پاس کا ہی کوئی دن رکھ لیں گے فیصلے کے لیے۔ اب اور ڈھیل نہیں دینے کی ہے اس حرام کے جنے کو۔ ورنہ وہ کوئی اور ہاتھ دکھا جائے گا۔'' ربن نے سرخ آنکھوں کے ساتھ فیصلہ سنایا۔ رامو جانتا تھا کہ فاروق کے ساتھ ہونے والے ظلم نے ربن کو بے حد غم و غصے میں مبتلا کر رکھا ہے اور حقیقتاً وہ مجو کا جلد از جلد فیصلہ کر دینا چاہتا ہے۔ یہ اب بہت ضروری ہو گیا تھا۔ خاموش رہ کر اپنے لوگوں کا مزید نقصان برداشت کرنا کسی طور ممکن نہیں تھا جبکہ مجو کے تیور بتا رہے تھے کہ جب تک اس کا کوئی مستقل علاج نہیں کیا جاتا، وہ بار بار ڈسنے کی کوشش کرتا رہے گا۔ ایسے ڈسنے والے سانپ کا زہر نکال دینا ہی بہتر تھا۔

''ادھر کا کیا حال ہے۔ جوزف نے منہ سے کچھ پھوٹا کہ نہیں؟'' پریشانی کے باوجود ربن کا دماغ ہر طرف دوڑ رہا تھا۔

''اس کی بیوی کو دفنا دیا گیا ہے پر اس کے بعد اس کی حالت اور بھی خراب ہو گئی تھی۔ محلے والوں نے ڈاکٹر کو بلا لیا تھا۔ اس نے سکون کا انجکشن لگا دیا ہے۔ سو کر اٹھے تو شاید کچھ بولنے کے لائق ہو سکے۔'' رامو نے اسے مطلع کیا۔

''ادھر کی فکر کرنا بھی ضروری ہے۔ یہ جو برے حال میں اسپتال میں لیٹا ہے، اس خبر کو سہہ نہیں سکے گا۔ اچھا ہے کہ کچھ اتا پتا لگنے تک ادھر ہی پڑا رہے۔'' اس کا اشارہ فاروق کی طرف تھا۔

''اس بات کی چنتا تو مجھے بھی ہے دادا۔ بس بھگوان اپنی کرپا کرے۔ میں نے اپنے طور پر سب کو سمجھا تو دیا ہے کہ فاروق استاد سے ملاقات ہونے پر کوئی اس کے سامنے کسی اچھی بری خبر کا ذکر نہیں کرے گا۔ اب دیکھو کہ کیا ہوتا ہے۔ ایسی باتیں چھپتی کدھر ہیں۔'' رامو بھی اپنی جگہ تشویش میں مبتلا تھا۔

''اے رامو، وہ دیکھ۔ وہ جو لوگ گیٹ سے اندر آ رہے ہیں ان میں غلام چاچا اور للیتا موسی بھی ہیں نا؟'' گفتگو کے دوران ادھر ادھر بھی نظر رکھے ربن نے اسپتال کے گیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ذرا بلند آواز سے کہا تو رامو نے بھی اس طرف دیکھا۔

''ہاں ہیں تو وہی لوگ۔ یہ کس کو اسپتال لے کر آئے ہیں؟'' اسپتال کے عملے کے افراد اسٹریچر پر کسی کو تیزی سے اندر لے جا رہے تھے اور ان کے پیچھے غلام چاچا اور للیتا موسی کے علاوہ ایک نوجوان بھی دکھائی دے رہا تھا۔ اس منظر کو دیکھ کر رامو اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ قدرتی طور پر اس کا دھیان سب سے پہلے جوزف کی طرف گیا تھا کہ کہیں اس کی حالت مزید خراب تو نہیں ہو گئی جو اسے ایمرجنسی میں اسپتال لانا پڑا۔

''چل، چل کر دیکھتے ہیں۔'' ربن نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا اور دونوں تیزی سے قدم اٹھاتے ایمرجنسی کے شعبے کی طرف بڑھ گئے۔ جلد ہی انہوں نے ان لوگوں کو جا لیا البتہ اسٹریچر پر لایا جانے والا مریض اب نظر نہیں آ رہا تھا۔ اسے اسپتال کا عملہ اندر لے گیا تھا۔

''خیریت ہے غلام بھائی، کس کو لے کر ادھر آئے ہو؟'' غلام چاچا کا ہاتھ تھامتے ہوئے ربن نے اس سے پوچھا۔

''اپنی جولی ہے۔'' غلام چاچا نے مختصر جواب دیا۔ اس کے لہجے میں گہرا دکھ تھا۔

''جولی...... مطلب جوزف کی لڑکی؟'' ربن بری طرح چونکا۔

''ہاں وہی ہے۔ غریب ابھی تھوڑی دیر پہلے گھر پہنچی تھی۔ آتے کے ساتھ بے ہوش ہو گئی۔ گھر پر ہوش میں لانے کی کوشش کی پھر نا کام ہو کر اسے ادھر لے آئے۔'' انہوں نے اسے بتایا۔

''تم نے دیکھا تھا کہ کیسے اور کس کے ساتھ آئی؟'' ربن کو پوری تفصیل جاننے کی بے چینی تھی۔

''تانگے میں اکیلی آئی تھی۔'' غلام چاچا کے پاس بھی مختصر ہی معلومات موجود تھیں۔

''جو بھی ہے، چلو پہلے ڈاکٹر سے اس کا حال معلوم کرتے ہیں باقی باتیں تو بعد میں بھی پتا چل سکتی ہیں۔'' تجسس کے باوجود ربن نے زیادہ کرید کرنا مناسب نہیں سمجھا اور اس سمت قدم بڑھائے جہاں جولیٹ کا اسٹریچر لے جایا گیا تھا۔ رامو سمیت غلام چاچا اور للیتا موسی نے بھی اس کی تقلید کی لیکن ان کے ساتھ آنے والا نوجوان جو کہ عارف تھا، اپنی جگہ کھڑا رہا۔

''یہ لڑکا کون ہے؟'' ربن نے ذرا تجسس سے غلام احمد سے سوال کیا۔

''جولی کے ساتھ اس کے دفتر میں کام کرتا ہے۔ کہہ رہا تھا کہ آج جولی دفتر نہیں آئی تو اس کی خیریت معلوم کرنے گھر چلا آیا۔ جوزف تو اپنے ہوش میں نہیں تھا۔ مجھے مجبوری میں اسے حالات سے آگاہ کرنا پڑا۔'' انہوں نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے دھیمی آواز میں بتایا۔

''اپن کو خیال پڑتا ہے کہ اپن پہلے بھی دو ایک بار

اسے محلے میں آتے جاتے دیکھ چکا ہے۔'' اس کا جواب سن کر ربن نے پُرسوچ انداز میں کہا۔

''جوزف کے گھر ہی بھی کبھار آتا تھا۔ اصل میں جولی کو پسند کرتا ہے اور دونوں آپس میں شادی کا ارادہ رکھتے ہیں۔'' غلام چاچا نے اس کی معلومات میں اضافہ کیا تو اس کی آنکھوں میں سوچ کے بادل چھا گئے۔ غلام احمد نے جو معلومات فراہم کی تھیں، ان کے حساب سے تو اس شخص کی زندگی میں جولیٹ کی بہت زیادہ اہمیت ہونی چاہیے تھی لیکن وہ ان لوگوں کے ساتھ آگے آنے کے بجائے پیچھے ہی رک گیا تھا۔ اس کا انداز بھی بڑا الجھا الجھا سا تھا جیسے اپنی یہاں موجودگی کے بارے میں بھی کنفیوز ہو کہ یہاں رکے یا واپس لوٹ جائے۔ بہرحال یہ وقت اس کے رویوں پر غور کرنے سے زیادہ جولیٹ کی فکر کرنے کا تھا۔ وہ سب بھی اسی سلسلے میں تگ ودو کرنے لگے۔ بہت دیر تک کسی نے انہیں واضح طور پر کچھ نہیں بتایا۔ آخر کافی دیر بعد ایک وارڈ بوائے نے پیغام دیا کہ ڈاکٹر سریتا اپنے کمرے میں مریضہ کے عزیزوں سے ملاقات کرنا چاہتی ہیں لیکن ملاقات کے لیے صرف دو افراد جاسکتے ہیں۔ اس ملاقات کے لیے متفقہ طور پر ربن اور للیتا کے نام تجویز ہوئے۔

''میں ڈاکٹر سریتا سے ملتا ہوں تو جب تک جا کر فاروق کو دیکھ لے کہ ڈاکٹروں نے اسے فارغ کردیا یا نہیں۔'' ربن نے راموکو ہدایت کی اور خود للیتا موسی کے ساتھ وارڈ بوائے کی راہنمائی میں ڈاکٹر سریتا کے کمرے میں پہنچ گیا۔ وہ چالیس بیالیس سال کی ایک قبول صورت عورت تھی جس نے ہلکے سبز رنگ کی پرنٹڈ ساڑی پہن رکھی تھی۔ آنکھوں پر موجود چشمے کے ساتھ وہ بہت سنجیدہ مزاج عورت ہونے کا تاثر دے رہی تھی۔ ربن اور للیتا اجازت لے کر اس کے کمرے میں داخل ہوئے تو اس نے انہیں سامنے رکھی کرسیوں پر بیٹھنے کی پیشکش کی اور پھر سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''کیا آپ پیشنٹ کے ماتا پتا ہیں؟''

''اسے اپنی ہی بچی سمجھیں ڈاکٹر۔'' ربن نے تدبر سے اس کے سوال کا جواب دیا۔

''مطلب یہ کہ وہ آپ کی بیٹی نہیں ہے؟'' ذہین ڈاکٹر نے فوراً ہی حقیقت سمجھ لی۔

''اس گریب کی ماں آج سویرے ہی پرلوک سدھاری ہے اور باپ غم میں بستر سے لگا ہے۔ ایسے میں ہم محلے والے ہی اس کے ماتا پتا ہیں۔'' اس بار للیتا نے دکھی سے لہجے میں اس کی بات کا جواب دیا۔

''اوہ آئی سی۔'' ڈاکٹر کے ہونٹ دائرے کی شکل میں سکڑے پھر وہ ذرا سا گلا کھنکھارتے ہوئے سنجیدگی سے بولی۔ ''میں آپ لوگوں کو صاف شبدھوں میں انفارم کر دینا چاہتی ہوں کہ یہ ایک پولیس کیس ہے۔ لڑکی کی عزت لوٹی گئی ہے اور اس صدمے نے اس کے ذہن پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ ہم نے ٹریٹمنٹ کر دیا ہے اور چانس ہے کہ وہ چند گھنٹوں میں پوری طرح ہوش میں آجائے گی لیکن اس کے بعد اسے اور اس کے ساتھ موجود افراد کو پولیس کا سامنا کرنا پڑے گا۔ کیا آپ لوگ پولیس کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہیں؟''

''پولیس کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ اپن پولیس سے نمٹ لے گا۔'' ذرا سے توقف کے بعد ربن نے اس کے سوال کا جواب دیا۔ جولیٹ پر گزرنے والے حادثے کا سن کر اس کے دل ودماغ کو جھٹکا لگا تھا اس لیے وہ فوری طور پر کچھ نہیں بول سکا تھا۔

''اوکے، ایز یو وش۔ میں ریسپشن پر کہلوا دیتی ہوں کہ اسپتال کے ضروری کاغذات پر آپ سے سائن لے لیں۔ ایسی صورت میں آپ کو مستقل ویٹنگ روم میں موجود رہنا پڑے گا تاکہ پولیس آئے تو آپ کی ملاقات ہوسکے۔'' اس کا جواب سن کر ڈاکٹر نے اسے ہدایت کی۔

''اپن کو ادھر سے تھوڑا ہٹنا بھی پڑ سکتا ہے ڈاکٹر۔ کیا ہے کہ اسی ہاسپٹل میں اپنا ایک دوسرا پیشنٹ بھی داخل ہے۔ اس کے سر پر گہری چوٹ لگی ہے۔ اپنے کو باہر نکال کر دماغ کا بڑا ڈاکٹر اس کا معائنہ کررہا ہے۔ کہتے ہیں کچھ ٹیسٹ ویسٹ بھی لینے ہیں۔ ابھی اپن کو وہاں جا کر اس کا حال بھی معلوم کرنے کا ہے۔ پر آپ فکر مت کرو، اِدھر اپن کا کوئی نہ کوئی بندہ موجود رہیں گا اور پولیس آئی تو اپنے کو خبر کر دے گا۔ آپ کو پہلے سے اس واسطے بتا رہے ہیں کہ کہیں اپن کو غیر موجود پا کر آپ سمجھو کہ اپن پولیس کے نام سے گھبرا کر غائب ہوگیا ہے۔'' ربن نے قدرے تفصیل سے اسے اپنی صورتِ حال سے آگاہ کیا۔

''اوکے، میں آپ کا پرابلم سمجھ گئی ہوں۔ اسپتال کی طرف سے آپ سے پورا کوآپریٹ کیا جائے گا۔ آپ بغیر چنتا کے اپنے دوسرے مریض کو بھی دیکھ سکتے ہیں۔'' لیڈی ڈاکٹر نے ہمدردی سے اسے جواب دینے کے ساتھ رخصت کی اجازت دے دی تو وہ اور للیتا کمرے سے باہر نکل آئے۔

''یہ کیا ہوگیا بھگوان۔ اتنی پیاری بچی تھی جولی۔ اس

کے منہ پر یہ کیسی کالک لگ گئی۔'' باہر آنے کے بعد للیتا اپنے دونوں گال پیٹتے ہوئے جولی پر گزرنے والے حادثے پر افسوس کرنے لگی۔

''چپ کر جاؤ موسی اور بھول جاؤ وہ سب جو ابھی تم نے ڈاکٹر کی زبانی سنا۔ اپن اس قصے کو دوبارہ کسی کی زبان سے نہیں سننا چاہتا۔'' ربن نے فوراً ہی اسے ڈپٹتے ہوئے تنبیہ کی۔

''ٹھیک ہے، میں اپنی زبان سی لیتی ہوں۔ پر سب کے من میں شک تو رہے گا کہ ایک اٹھائی گئی لڑکی جو پوری رات اور دن گزارنے کے بعد گھر واپس لوٹی ہے، پہلے سی پوتر واپس نہیں لوٹی ہوگی۔'' للیتا نے عورتوں والی مخصوص فطرت کا مظاہرہ کیا۔

''شک کی بات جانے دو۔ شک کرنے والے تو دیویوں اور پیرزادیوں کو بھی نہیں چھوڑتے، بس تم اپنی زبان سے کچھ مت نکالنا۔'' ربن نے ایک بار پھر سختی سے اسے سمجھایا تو وہ دوبارہ منہ کھولنے کی ہمت نہیں کرسکی۔ پھر وہ لوگ انتظار گاہ میں پہنچ گئے جہاں غلام چاچا ان کا منتظر تھا۔

''تم موسی کو لے کر واپس چلے جاؤ غلام بھائی۔ اُدھر اڈے سے دو بندے ادھر بھجوا دینا۔ ادھر کا سب اپن سنبھال لے گا۔ تم ادھر جوزف کو دیکھو۔'' انتظار گاہ میں پہنچ کر اس نے غلام چاچا کو اپنا سوچا سمجھا حکم سنایا۔

''اگر تم کہو دادا تو میں موسی کو ادھر ہی چھوڑ دیتا ہوں۔ عورت کے لیے عورت کا ساتھ اچھا ہوتا ہے۔'' غلام چاچا نے دبی زبان میں للیتا کی وہاں موجودگی کی اہمیت کا خیال دلانا چاہا۔

''عورتوں کی یہاں کدھری کمی ہے۔ یہ ڈاکٹریں، نرسیں، مائیاں سب عورتیں ہی تو ہیں اور عام عورتوں سے زیادہ مریض کا خیال رکھنے کا طریقہ جانتی ہیں۔'' ربن نے فوراً ہی اس کی بات مسترد کردی۔

''جیسا تم کہو دادا۔'' اس کا موڈ دیکھتے ہوئے غلام چاچا نے بھی زیادہ بحث نہیں کی اور للیتا کو ساتھ لے کر وہاں سے روانہ ہوگیا۔ ان لوگوں کی روانگی کے بعد ربن نے کلائی میں موجود گھڑی میں وقت دیکھا۔ اسے فاروق کے پاس سے آئے ہوئے تقریباً دو گھنٹے ہو چکے تھے اور امکان تھا کہ ڈاکٹروں نے اپنا کام نمٹا لیا ہوگا چنانچہ اسے وہاں جانے کی بے چینی ہونے لگی لیکن جولیٹ کی ذمے داری لینے کے بعد اسے یہاں سے ہٹنا بھی مناسب نہیں لگ رہا تھا۔ بے چینی میں وہ ادھر سے ادھر ٹہلنے لگا۔ کچھ دیر کے انتظار کے بعد رامو واپس آتا ہوا نظر آیا۔

''کیا ہوا، ہوگیا معائنہ..... کیا کہا ڈاکٹر نے؟'' اس نے ایک ساتھ رامو سے کئی سوالات کر ڈالے۔

''ابھی وہ لوگ فارغ نہیں ہوئے دادا۔ اپن تھوڑی دیر انتظار کیا پھر تمہارے خیال سے واپس آگیا۔'' رامو نے اسے اطلاع دی اور پھر انتظار گاہ میں ادھر سے ادھر نظر دوڑانے کے بعد پوچھنے لگا۔

''وہ تینوں کدھر گئے؟''

''لونڈا کب نکلا اس کا تو اپن کو نہیں معلوم، البتہ للیتا اور غلام احمد کو اپن نے خود واپس بھجوا دیا۔ غلام سے بول دیا ہے کہ ادھر اڈے سے دو آدمی ادھر بھیج دے تاکہ دونوں طرف کوئی نہ کوئی ہر وقت موجود رہے۔ اب اس معاملے کو بھی اپن کو ہی دیکھنا ہوگا۔'' وہ دھیمی آواز میں رامو کو سمجھانے لگا کہ پولیس کے تفتیش کے لیے آنے کی صورت میں کیسے معاملات نمٹانے ہوں گے۔ رامو بھی توجہ سے اس کا ایک ایک لفظ سنتا رہا۔ انتظار گاہ میں ان کے علاوہ بھی چند لوگ موجود تھے اور معاملے کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے اسے ربن کی یہ احتیاط مناسب ہی لگ رہی تھی۔

''بندوں کے آنے تک تو ادھر ٹھہر جب تک اپن اپنے ہیرو کی خبر لیتا ہے۔'' ضروری ہدایات دینے کے بعد ایک بار پھر وہ فاروق تک پہنچنے کے لیے پر تولنے لگا۔

''میری بات مانو دادا تو تم بھی تھوڑی دیر کے لیے اڈے کا چکر لگا لو۔ پوری رات اور دن گزر گیا ہے تمہیں ایسے گھن چکر بنے ہوئے۔ جا کر نہا دھو کر تھوڑا آرام کرنے سے طبیعت تازہ دم ہو جائے گی اور ان..... کی بھی تسلی ہو جائے گی۔ میں جب جاتا ہوں میرا ناک میں دم کر دیتے ہیں سالے کہ ہمیں فاروق استاد کا حال بتاؤ یا اسپتال آنے کی اجازت دو۔ تم اپنے منہ سے سمجھاؤ گے تو الگ بات ہو گی، ذرا سکون میں آجائیں گے..... کی اولاد۔'' ربن کے مسلے ہوئے کپڑوں اور سرخ آنکھوں کو دیکھتے ہوئے رامو نے ذرا طریقے سے اسے صلاح دی۔

''اچھا، پہلے ڈاکٹر سے مل لوں پھر دیکھتا ہوں۔'' ربن نے دھیمے لہجے میں جواب دیا اور مضبوطی سے قدم جماتا انتظار گاہ سے باہر نکل گیا۔ اس کی پشت پر نظر ٹکائے رامو بھی ایک سرد آہ بھرتا ہوا کرسی پر ٹک گیا۔ اسے معلوم تھا کہ مضبوطی سے قدم جما کر چلتے اس شخص کے اندر کی دنیا میں سخت بھونچال آیا ہوا ہے اور فاروق کی طرف سے کوئی اطمینان بخش خبر سنے بغیر اسے سکون نہیں مل سکتا تھا۔ وہ اپنے

دل میں لاتعداد بار کی گئی فاروق کی سلامتی کی دعاؤں کو ایک بار پھر دہرانے لگا۔ ادھر ربن اسپتال کے اس حصے تک پہنچ چکا تھا جہاں فاروق کو رکھا گیا تھا۔ اس کے سامنے ہی اسپتال کے عملے نے فاروق کو دوبارہ کمرے میں منتقل کیا۔ وہ وہیل چیئر پر تھا اور اس منظر کو دیکھ کر ربن کے دل کو دھکا سا لگا تھا۔

''کیا ہوا ڈاکٹر صاحب! کیا بولا بڑے ڈاکٹر نے؟'' اس نے سب سے پیچھے موجود ڈاکٹر کو روک لیا۔

''ابھی کچھ نہیں بول سکتے۔ کل رپورٹیں آجائیں تو صحیح معلوم ہوگا البتہ ڈاکٹر صاحب تمہارے ساتھی سے بات کر کے بہت خوش ہوئے اور کہا کہ اتنے مضبوط اعصاب کے آدمی کے ساتھ اگر کوئی گڑبڑ ہوئی بھی تو یہ جلدی ری کور کر لے گا۔'' ڈاکٹر نے تشفی آمیز انداز میں اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر سمجھایا تو اس نے بھی حوصلے سے سر کو جنبش دی اور فاروق کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ وہ جاگ رہا تھا اور بیزار سا بستر پر لیٹا تھا۔

''اور کتنا رکنا ہے یہاں دادا! تم میری بات مانو تو واپس چلتے ہیں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں البتہ یہاں رہا تو ضرور بیمار پڑ جاؤں گا۔ کیسا بیماروں کا سا سلوک کر رہے ہیں یہ لوگ میرے ساتھ۔ میں نے کہا بھی کہ میں اپنے پیروں پر چل سکتا ہوں پھر بھی زبردستی وہیل چیئر پر بٹھا دیا۔'' اس کی شکل دیکھتے ہی فاروق نے شکوہ کیا۔

''جس کا جو کام ہو، وہ ہی بہتر فیصلہ کر سکتا ہے کہ کیا کرنا ہے۔ ابھی اپن چاقو چلانے کے لیے کسی دوسرے کا مشورہ تو نہیں سنتا نا تو یہ ڈاکٹر لوگوں کو بھی ان کی مرضی سے ان کا کام کرنے دے۔ دو ایک دن کی بات ہے پھر اپنے کو اپنے ٹھکانے پر ہی جانا ہے۔'' ربن نے اسے سمجھایا تو وہ خاموشی اختیار کر گیا۔ تھوڑی دیر میں اڈے کے آدمی بھی وہاں پہنچ گئے۔ وہ اپنے ساتھ بڑا سا توشے دان اور کپڑوں کا بیگ لائے تھے۔ بیگ میں فاروق اور ربن دونوں ہی کے صاف ستھرے لباسوں کے علاوہ دھلی ہوئی اجلی چادریں بھی موجود تھیں۔ توشے دان میں بھی فاروق کے لیے یخنی اور دلیا کے علاوہ ربن کے لیے بھنا ہوا گوشت کا سالن اور روٹیاں موجود تھیں۔ کھانا مقدار میں اتنا تھا کہ تین چار افراد آسانی سے کھا سکتے تھے۔

''یہ اتنی جلدی سارا کچھ کس نے کر ڈالا؟'' غلام احمد اور للیا کی واپسی کے وقت کو ذہن میں رکھتے ہوئے ربن نے حیرت سے پوچھا۔

''جلدی کیا دادا! سجو اور گولو پہلے ہی ساری تیاری کر کے بیٹھے ہوئے تھے۔ ادھر سے تمہاری اجازت نہیں تھی ورنہ وہ پہلے ہی یہ سب لے کر ادھر پہنچ چکے ہوتے۔ اب بھی مشکل سے رکے ہیں اور ہمیں آنے دیا ہے۔'' اپنے ساتھ سب لانے والے وجے نے اسے مطلع کیا۔

''دیوانے ہیں دونوں۔ ادھر اسپتال میں کس چیز کی کمی ہے۔ مریض کے لیے تینوں وقت اچھا کھانا دیتے ہیں۔ ساتھ والا بھی کینٹین سے لے کر کھا سکتا ہے۔ صرف کپڑے بھی بھجوا دیتے تو کافی ہوتا۔'' اپنی بات کہتے ہوئے ربن کے چہرے پر ان لوگوں کے لیے محبت تھی۔

''کوئی بات نہیں دادا، اب اتنا کچھ آگیا ہے تو سب مل کر کھا لیتے ہیں۔'' فاروق کو خیال آیا کہ اتنے عرصے میں اس نے ربن کو کچھ کھاتے ہوئے نہیں دیکھا تھا اس لیے گفتگو میں دخل دیتے ہوئے صلاح دی۔ اس کے کہنے پر وجے اور شیدو مل کر کھانا نکالنے لگے۔ اسے انہوں نے اوپر بستر پر ہی کھانے کے لیے دے دیا اور بستر کے ساتھ اٹینڈنٹ کے لیے رکھی کرسی ہٹا کر ایک طرف رکھتے ہوئے فرش پر چادر بچھا کر باقی افراد کے لیے دسترخوان لگا دیا۔ دسترخوان لگانے کے بعد شیدو خود ان کے ساتھ کھانے میں شامل نہیں ہوا اور رامو کو کھانے کے لیے وہاں بھیجنے کا کہتے ہوئے باہر نکل گیا۔ رامو کے آنے کے بعد ان سب نے مل کر کھانا کھایا۔ ربن کا ہاتھ کچھ آہستہ چل رہا تھا لیکن رامو اصرار کر کے اسے کھانے پر مجبور کرتا رہا۔ کھانے کے بعد رامو نے اس سے اڈے واپس جانے کے سلسلے میں سوال کیا۔

''اب رات کو جا کر کیا کرنا رے۔ کھانا، کپڑے سب ادھر ہی آگئے ہیں۔ رات میں چادر بچھا کر ادھر ہی سو جاتا ہوں۔ سویرے دیکھوں گا کہ کیا کرنا ہے۔'' اس نے رامو کو ٹال دیا تو وہ مزید اصرار کی ہمت نہیں کر سکا۔

''تو ادھر نظر رکھنے کے لیے واپس چلے جانا۔ شیدو اور وجے دونوں باہر رکے رہیں گے۔ ضرورت پڑی تو میں ان میں سے کسی کو یہاں بلا کر خود باہر چلا جاؤں گا۔'' رامو کی طرف سے کوئی بحث نہ ہونے پر اس نے آگے کا پروگرام ترتیب دیا۔ اچھی بات یہ تھی کہ فاروق کا اس طرف زیادہ دھیان نہیں تھا، ورنہ وہ سوال کر سکتا تھا کہ رامو اب تک کہاں تھا اور اسے بلانے کے بعد شیدو کدھر غائب ہو گیا تھا۔ شیدو اور وجے تو پہلے ہی جانتے تھے کہ فاروق کے سامنے جولیٹ والے معاملے پر بھاپ بھی نہیں نکالنی ہے۔

''مجو کا کیا ہوا۔ اس کو لگام ڈالنے کے لیے بھی کسی نے کچھ کیا یا سب مجھ ہٹے کٹے بندے کی بے کار فکر پال کر اسپتال کے چکر لگانے میں لگے ہوئے ہیں؟'' کھانے کے بعد دودھ پتی کا دور چل رہا تھا جب فاروق نے اچانک پوچھا۔

''اس کو کیسے بے لگام چھوڑ سکتے ہیں۔ سالے کا پکا بندوبست کرنے کی تیاری کر لی ہے۔ جلد اچھی خبر سننے کو ملے گی تجھے۔'' رامو نے اسے تسلی دی۔ وہ تفصیلات جاننے کے لیے اس سے سوال کرنا چاہتا تھا کہ ایک نرس اندر داخل ہوئی۔ اکٹھے تین افراد کو وہاں دیکھ کر وہ خفا ہونے لگی۔

''پیشنٹ کے پاس اتنا رش کیوں لگایا ہوا ہے آپ لوگوں نے؟ اسے یہاں آرام اور علاج کے لیے رکھا گیا ہے۔ کوئی پکنک کے لیے نہیں آیا ہوا کہ اتنے بہت سے لوگ جمع ہو گئے ہیں۔ اتنے لوگوں کو یہاں آنے کی پرمیشن کس نے دی؟ یقیناً گیٹ کیپر کو رشوت دی ہوگی۔ میں ابھی اس کی اوپر کمپلین کرتی ہوں۔'' وہ جتنی خوش شکل تھی، زبان کی اتنی ہی تیکھی تھی۔

''سوری سسٹر! پر اس غریب آدمی کا کمپلین نہیں کرنے کا ہے۔ اپن ادھر سے چلا جاتا ہے۔'' رامو نے فوراً مصالحت سے کام لیا۔

''کمپلین تو اس کی کرنی پڑے گی۔ رشوت لے کر ہاسپٹل کا ڈسپلن خراب کرتا ہے۔'' اس کی خوب صورت پیشانی پر ان لوگوں کے اٹھ کھڑے ہو جانے کے باوجود بل برقرار تھے۔

''معاف کر دو سسٹر! غریب نوکری سے گیا تو اس کے بیوی بچوں کو فاقے کرنے پڑیں گے۔'' اس بار فاروق نے درخواست کی۔ وہ جو فائل میں سے اس کی کیس ہسٹری دیکھ رہی تھی، تھوڑی نرم پڑ گئی۔

''اوکے۔ آپ کے کہنے پر میں رک جاتی ہوں لیکن اب آپ لوگوں کو بھی خیال رکھنا ہوگا اور بغیر پرمیشن کے آپ کے روم میں ہرگز بھی ایک سے زیادہ اٹینڈنٹ نظر نہیں آئے گا۔'' اس نے تنبیہ کی اور فائل ہاتھ سے رکھ کر اس کا بلڈ پریشر چیک کرنے لگی۔ فاروق کی سحر انگیزی سے واقف وجے اور رامو نرس کے اس طرح نرم پڑنے پر مسکراتے ہوئے باہر نکل گئے۔ نرس نے بلڈ پریشر کے بعد بخار وغیرہ چیک کیا اور کھانے کی بابت معلوم کرنے کے بعد اپنی نگرانی میں دوائیں کھلائیں۔

''اب آپ آرام کریں۔ ڈاکٹر پرکاش رات کو دس بجے آخری راؤنڈ لگائیں گے۔ انہیں کوئی کمپلین نہیں ہونی چاہیے۔ میں خود بھی چکر لگا کر چیک کرتی رہوں گی۔'' اس نے پہلا جملہ فاروق جبکہ دوسرا ربن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ دونوں ہی نے بڑی فرماں برداری سے سر ہلا کر اس کی ہدایات پر عمل کی یقین دہانی کروائی۔ جب وہ کمرے کی لائٹ بجھا کر نائٹ بلب روشن کرنے کے بعد باہر نکلی تو فاروق اور ربن کے ہونٹوں پر مشترکہ ہنسی چھوٹ گئی۔ ہنسی کی اس آواز کو دونوں نے ہی اپنی اپنی جگہ بڑا اجنبی محسوس کیا جیسے حیرت زدہ ہوں کہ اپنی اپنی قلبی کیفیت کے ساتھ یہ ہنسی کیسے ہونٹوں تک چلی آئی؟

☆☆☆

''مام، ڈیڈ...... کہاں ہیں آپ؟ میں ڈوب رہی ہوں۔ مجھے یہاں سے نکالیں۔'' وہ بہت گہرے پانی میں تھی۔ پانی گہرا ہونے کے ساتھ ساتھ بہت تیز رفتار بھی تھا اس لیے اسے بھی اپنے ساتھ بہائے لے جا رہا تھا اور اسے باوجود ہاتھ پیر چلانے کے خود کو ڈوبنے سے بچانے میں ناکامی ہو رہی تھی۔ اپنی اس ناکامی پر ہی اس نے بے بس ہو کر کسی ننھی سی بچی کی طرح مدد کے لیے ماں باپ کو پکارنا شروع کر دیا تھا لیکن وہ دونوں اسے کہیں نظر نہیں آ رہے تھے۔ یہ بات اس کے لیے اپنے ڈوبنے سے بھی زیادہ تشویش ناک تھی کیونکہ اس نے تو ہمیشہ اپنے مام، ڈیڈ کو اپنے قریب پایا تھا۔ اس سے بے تحاشا محبت کرنے والے مام، ڈیڈ ہمیشہ کسی چراغ کی طرح اس کو اپنی ہتھیلیوں کی پناہ میں رکھتے تھے اور اب ایسے موقع پر جب وہ ڈوبنے والی تھی تو ان دونوں کا کہیں نام و نشان نہیں تھا۔ آخر ایسا کیسے ہو سکتا تھا کہ وہ اس کی پکار پر بھی اس کی مدد کے لیے نہ آئیں؟ اس سوال نے اس کے پہلے سے اکھڑتے سانس کو مزید اکھاڑنا شروع کر دیا تھا اور اسے لگ رہا تھا کہ وہ کسی بھی لمحے ڈوب جائے گی۔ شدید مایوسی کے عالم میں اچانک ہی اسے کنارے پر کھڑا عارف نظر آیا تو امید کی ایک کرن سی دل میں پھوٹی اور زندگی کی خواہش میں اس نے اپنی پوری طاقت سے عارف کو پکارا۔ اسے یقین تھا کہ اس کی پکار سن کر عارف اسے بچانے کے لیے اس تند و تیز پانی میں کود پڑے گا اور پھر اسے اپنے بازوؤں میں بھر کر کنارے تک لے جائے گا ...... لیکن یہ کیا؟ عارف اس کی پکار سن کر بھی کنارے پر ہی جم کر کھڑا رہا تھا اور اجنبی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''عارف! یہ میں ہوں تمہاری جولی۔ پلیز مجھے

ڈوبنے سے بچاؤ۔'' اسے لگا کہ عارف نے اسے پہچانا نہیں ہے تو اپنی پوری قوت سے چیخ کر اسے اپنے بارے میں بتانے لگی لیکن اس بار بھی عارف پر کوئی اثر نہیں ہوا اور وہ بنا ایک قدم آگے بڑھائے، ہاتھ باندھے کنارے پر کھڑا رہا۔ اس کے اس رویّے پر حیرت زدہ وہ ہاتھ پیر چلانا بھی بھول گئی اور ایک تند لہر نے اسے اس بری طرح اچھالا کہ کنارے پر کھڑا عارف اس کی نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ اب اس کے پاس امید کی کوئی کرن باقی نہیں رہی تھی، سو ہاتھ پیر چلانے کی زحمت کیے بغیر خود کو موجوں کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا۔ ان موجوں کے رحم وکرم پر جو کسی بھی لمحے اسے ڈبو سکتی تھیں۔

''ایزی گرل ایزی، ریلیکس ہو جاؤ۔ تم یہاں محفوظ ہو۔ کوئی تمہیں کچھ نہیں کرسکتا۔'' شاید وہ ڈوبتے ہوئے بری طرح چیخ رہی تھی جب اس نے اپنے نزدیک سے ایک نسوانی آواز کے ساتھ کسی کے نرم ہاتھوں کا لمس محسوس کیا۔ اس مہربان آواز اور لمس نے بتدریج اس کی چیخوں کو قابو میں کرنے میں مدد دی اور جب اس نے اپنی آنکھیں کھولیں تو بالکل مختلف ماحول میں تھی۔ پانی کی تند و تیز لہروں کی جگہ ایک روشن اور صاف ستھرے کمرے نے لے لی تھی اور کچھ مہربان چہرے اس کے بے حد قریب موجود تھے۔ وہ چند لمحے نا سمجھی کے عالم میں آنکھیں پٹپٹاتی رہی پھر آہستہ آہستہ اسے ادراک ہونے لگا کہ وہ نرم بستر پر لیٹی ہوئی ہے اور پسینے میں نہائے اس کے جسم کو ڈرپ کے ذریعے توانائی فراہم کی جارہی ہے۔

''تم شاید کوئی برا سپنا دیکھ رہی تھیں۔'' اس کے عین سامنے سفید کوٹ پہنے کھڑی عورت نے نرم لہجے میں اس سے پوچھا تو وہ سوچ میں پڑگئی۔

''برا سپنا...... کیا میں کوئی سپنا دیکھ رہی تھی؟'' سوال ذہن میں جاگا تو آہستہ آہستہ بہت سی حقیقتیں بھی جاگنے لگیں اور اسے وہ سب یاد آگیا جو اس پر بیتا تھا۔

''سپنا کہاں تھا وہ...... کاش سپنا ہی ہوتا۔'' یہ بڑبڑاتے ہوئے وہ بری طرح سسکی تو اس کے سرہانے کھڑی ڈاکٹر سریتا نے گہرا رنج محسوس کیا۔ وہ جانتی تھی ایک دوشیزہ کے لیے اس کی عزت کسی شیش محل سے بھی بڑھ کر قیمتی ہوتی ہے اور اس کے سامنے لیٹی لڑکی کی عزت کا شیش محل ایک جھٹکے میں مسمار کردیا گیا تھا۔ ایسے میں اس کی ذہنی حالت جتنی بھی ابتر ہوتی کم ہی تھا اور اسے اس وقت کسی طور اس ٹوٹی پھوٹی لڑکی کو سنبھالنے کے لیے اپنی مسیحائی کا ہنر دکھانا تھا چنانچہ اس کا معائنہ کرنے کے ساتھ ساتھ ہلکی پھلکی باتیں بھی کرتی رہی۔ اس کے ساتھ موجود نرس اس کی بھرپور معاونت کررہی تھی۔

''شی از بیٹر دین یسٹرڈے۔'' تفصیلی چیک اپ کے بعد اس نے نرس کو مخاطب کرکے تبصرہ کیا۔

''تو کیا میں باہر موجود پولیس والوں کو اس کا بیان لینے آنے کی پرمیشن دے دوں؟'' نرس نے سوال کیا تو ڈاکٹر سریتا ذرا سوچ میں پڑگئی اور جولیٹ کے زرد چہرے کو غور سے دیکھا۔ وہ قدرے ہراساں نظر آنے لگی تھی۔

''پولیس والے تمہارا بیان لینا چاہتے ہیں اور میں زیادہ دیر تک انہیں ان کی ڈیوٹی سے نہیں روک سکتی۔ بہتر ہے کہ تم خود کو ذہنی طور پر تیار کرلو۔ میں آدھے گھنٹے بعد انہیں اندر بلوالوں گی۔'' نرم لہجے میں کہتی ڈاکٹر کی یہ بات سن کر جولیٹ کے ہونٹ ذرا سے کپکپائے لیکن پھر اس نے زبان سے کچھ کہے بغیر اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ پڑھی لکھی اور باشعور لڑکی تھی اور جانتی تھی کہ جس حادثے سے گزر چکی ہے، اس کے بعد اسے لامحالہ ان سارے مراحل سے گزرنا ہی ہوگا۔

''ویٹس آ بریو گرل۔'' ڈاکٹر نے اس کے فیصلے کو سراہا اور ہولے سے اس کے گال کو تھپکنے کے بعد نرس کو اسے دی جانے والی دواؤں کے سلسلے میں ہدایات جاری کرتی باہر نکل گئی۔ بستر پر دراز جولیٹ کا ذہن اب اپنے حالات کا جائزہ لے رہا تھا۔ جب تک وہ دلدار آغا کی قید میں تھی، سب سے زیادہ فکر اس قید خانے سے نکل بھاگنے کی تھی لیکن وہاں سے نکلنے کے بعد کئی دوسرے تلخ حقائق منہ پھاڑے اس کے سامنے کھڑے تھے۔ اب وہ اس معاشرے میں سر اٹھا کر چلنے کے لائق ایک عزت دار لڑکی نہیں رہی تھی اور اس سے اس کا یہ غرور چھیننے والا شخص اتنا باحیثیت و بااختیار تھا کہ وہ کسی کے سامنے اس کا نام لیتی بھی تو کوئی یقین نہیں کرتا لیکن کر بھی لیتا تو اسے سزا دینے کی ہمت کس میں تھی؟ وہ حقیر سے پولیس والے جو اس کا بیان لینے کے لیے باہر موجود تھے کیا اتنی ہمت رکھتے تھے کہ اس کی زبان سے دلدار آغا کا نام سننے پر اس کے خلاف کوئی کارروائی کر پاتے؟ ہرگز بھی نہیں...... وہ تو اس سے اس الزام کا ثبوت پیش کرنے کا مطالبہ کرتے اور اپنے لیر لیر ہوجانے والے وجود کے باوجود وہ کوئی ثبوت، کوئی گواہ پیش کرنے کی اہل نہیں تھی۔ اپنی بے بسی کے اس احساس پر پہلے تو اس کی آنکھوں میں آنسو امڈے لیکن پھر غصے کی ایک تیز لہر نے ان

دلکش کہانیوں ودیگر دلچسپیوں کا حسین مرقع نومبر 2015ء کا دل خوش کُن پاکیزہ

ماہنامہ

پاکیزہ

کراچی

نگہت سیما اور **قیصرہ حیات** کے خوب صورت قسط وار ناول

دُرِ ثمن بلال کے حسین ناول کی اگلی جاندار قسط

شیریں حیدر نے پردہ اٹھایا کچھ دلدوز حقائق سے اپنی بھرپور تحریر..... **زندگی خاک نہ تھی**..... میں

نبیلہ ابر راجا کے تجسس سے بھرے ناولٹ **متاعِ دل** کی آخری قسط

بشریٰ گوندل ایک بھرپور مکمل ناول کے ہمراہ

ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی کے پُرروح سفر کی عقیدت بھری داستان

انسانی نفسیات پر گہری نظر رکھتی

ہماری مایہ ناز مصنفہ **رفاقت جاوید**

سے خوب صورت ملاقات

علاوہ ازیں......

سیما سراج ، قانتہ رابعہ، فرحین اظفر،

نزہت جبیں ضیا، نگہت اعظمی ودیگر رائٹرز کی پُرحیرت کاوشیں

اس کے ساتھ، ساتھ مثبت تفریحی معلومات سے مزین مستقل سلسلے صرف آپ کی خوش ذوقی کی نذر

آنسوؤں کو بہنے سے روک دیا۔

''میں تمہیں ہرگز بھی معاف نہیں کروں گی دلدار آغا۔ تمہیں اپنے کیے کی سزا بھگتنی ہوگی اور یہ سزا میں خود تمہیں دوں گی۔'' تصور میں دلدار آغا کو مخاطب کرتے ہوئے اس نے ایک فیصلہ کر ڈالا چنانچہ جب پولیس والے اس کا بیان لینے اندر آئے تو اس کے ہونٹوں پر دلدار آغا کا نام نہیں آیا۔

''مجھے نہیں معلوم کہ وہ کون لوگ تھے اور مجھے کہاں لے گئے تھے۔ دفتر سے واپسی میں انہوں نے اچانک ہی مجھے اغوا کرلیا تھا اس کے بعد میں مستقل بے ہوش رہی اور میں نے کسی کا چہرہ نہیں دیکھا۔'' سپاٹ چہرے کے ساتھ اس نے پولیس والوں کو یہ مختصر بیان دیا۔

''تم وہاں سے واپس کیسے آگئیں؟'' اس بیان پر اس سے سوال کرنے والے نے تند لہجے میں پوچھا۔

''ان لوگوں نے خود ہی میری آنکھوں پر پٹی باندھ کر مجھے ایک چوراہے تک چھوڑ دیا تھا۔'' اس کا جواب اب بھی مختصر ہی تھا۔

''کیا تم نے اپنے اغوا کرنے والوں میں سے کسی کا چہرہ دیکھا یا اس جگہ کے بارے میں کچھ بتا سکتی ہو جہاں تمہیں رکھا گیا تھا؟'' پولیس والے بھی کب اتنی آسانی سے پیچھا چھوڑنے والے تھے۔

''میں نے کہا نا کہ مجھے بے ہوش رکھا گیا تھا پھر میں کیسے کچھ دیکھ سکتی تھی؟'' اس نے جھنجلائے ہوئے انداز میں جواب دیا۔

''دیکھو لڑکی، ہم سے کچھ چھپانے کی کوشش مت کرو اور سب کچھ سچ سچ بتا دو۔'' پولیس والے نے اسے ڈپٹا۔

''جو میں بتا سکتی تھی بتا دیا۔ اس سے زیادہ بتانے کے لیے میرے پاس کچھ نہیں ہے۔'' اس نے رکھائی سے جواب دیا اور تکیے پر سر رکھ کر یوں آنکھیں موند لیں جیسے بری طرح نڈھال ہوگئی ہو۔

''پلیز آفیسر! میری پیشنٹ نے اپنا اسٹیٹمنٹ دے دیا ہے۔ اس سے زیادہ پریشر ڈال کر میں آپ کو اسے مینٹلی ڈسٹرب کرنے کی پرمیشن نہیں دے سکتی۔'' ڈاکٹر سریتا جو اس وقت وہیں موجود تھی، اس کی حالت دیکھ کر درمیان میں دخل دے بیٹھی۔ مجبوراً پولیس والوں کو وہاں سے رخصت ہونا پڑا۔ ان کے باہر نکلنے کے بعد ڈاکٹر سریتا نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔

''آر یو او کے؟''

اس کے مہربانی سے پوچھے گئے سوال پر جولیٹ نے آنکھیں کھولیں اور آہستہ سے اثبات میں سر ہلانے کے بعد پوچھنے لگی۔ ''کیا میرے ساتھ کوئی موجود نہیں ہے ڈاکٹر؟'' یہ ایسا سوال تھا جو وہ بہت دیر سے کرنا چاہ رہی تھی لیکن کرنے کی ہمت نہیں پا رہی تھی۔ اسے یاد تھا کہ اپنے گھر کے کھلے دروازے سے اندر جانے پر اس نے وہاں غلام چاچا اور عارف کو دیکھا تھا لیکن مام، ڈیڈ اسے نظر نہیں آئے تھے۔ ہاں وہاں محسوس کرنے والی ویرانی ضرور تھی اور وہ ویرانی ہی اسے سوال کرنے سے روکتی رہی تھی۔ اسے لگتا تھا کہ معلوم حادثے کے سوا بھی اس کے ساتھ کوئی دوسرا بڑا حادثہ گزر چکا ہے۔

''تمہارے ایک اٹینڈنٹ باہر موجود ہیں۔ میں انہیں اندر بھیجتی ہوں۔'' ڈاکٹر سریتا اسے آہستہ سے جواب دے کر باہر نکل گئیں۔ ان کی صبح سویرے ربن سے ایک اور ملاقات ہوئی تھی اور اس ملاقات میں ربن نے انہیں جوزفین کی موت اور جوزف کی حالت دونوں سے آگاہ کر دیا تھا اس لیے وہ اپنے دل میں جولیٹ کے لیے بہت زیادہ ہمدردی محسوس کر رہی تھیں۔ انہوں نے ربن کے لیے بھی اپنے دل میں خاصا احترام محسوس کیا تھا کہ وہ محلے داری کا حق ادا کرنے کے لیے اتنے خلوص سے مصروف عمل ہے ورنہ یہاں کب کوئی کسی کی اتنی فکر کرتا ہے۔ ربن ڈاکٹر سریتا کا پیغام ملتے ہی جولیٹ کے کمرے میں پہنچ گیا۔ جولیٹ اسے پہچانتی تھی لیکن اپنے اٹینڈنٹ کے طور پر اسے سامنے پا کر حیران رہ گئی۔ ماں باپ کے علاوہ اگر محلے کے کسی دوسرے فرد کا چہرہ بھی دکھائی دیتا تو اتنی حیرت نہیں ہوتی جتنی ربن کو دیکھ کر ہو رہی تھی۔

''کیسی ہو بٹیا؟ اب طبیعت کیسی ہے؟'' ربن کی جہاندیدہ نظروں نے اس کی حیرت کو بھانپ لیا لیکن اس نے خود کو بالکل نارمل رکھتے ہوئے جولیٹ کے سر پر ہاتھ رکھ کر اس سے دریافت کیا۔ اس کے انداز میں کچھ ایسی شفقت اور اپنائیت تھی کہ جولیٹ کا دل بھر آنے لگا لیکن اس نے خود پر قابو پا لیا۔ دلدار آغا سے انتقام کا فیصلہ کر لینے کے بعد اب وہ کسی طور کمزور نہیں پڑنا چاہتی تھی اور آنسو کمزوری کا سب سے بڑا اظہار ہوتے ہیں اس لیے وہ انہیں آنکھوں تک آنے کی اجازت نہیں دینا چاہتی تھی۔

''میرے مام، ڈیڈ کہاں ہیں؟ وہ یہاں ہاسپٹل کیوں نہیں آئے؟'' اس نے بڑی کوشش سے اپنے لہجے کو سپاٹ رکھتے ہوئے دریافت کیا۔

''تمہارے ڈیڈی کی طبیعت تھوڑی گڑبڑ تھی اس لیے وہ لوگ یہاں نہیں آسکے...... پر تم فکر نہ کرو بٹیا، اپن ہے یہاں۔ اپن اور اپن کے ساتھی تمہارا پورا خیال رکھیں گے۔'' ربن نے مصلحت سے کام لیتے ہوئے ہلکے پھلکے لہجے میں اسے آدھے سچ سے آگاہ کیا۔ جتنے بڑے حادثے سے وہ گزر چکی تھی، اس کے بعد جوزفین کی موت کی اطلاع فوری طور پر دینا قطعی مناسب نہیں ہوتا۔ ادھر جولیٹ، جوزف کی بیماری کی خبر سن کر ہی اچھی خاصی پریشان ہوگئی تھی۔ وہ سمجھ سکتی تھی کہ طبیعت کی خرابی کی وجہ اس کے ساتھ بیتنے والا حادثہ ہی ہوگا، ورنہ تو جوزف صحت کے اعتبار سے بالکل فٹ بندہ تھا جسے ہلکا پھلکا بخار یا نزلہ زکام بھی اتفاقاً سال میں ایک آدھ بار ہی ہوتا تھا۔ وہ یہ بھی سمجھ رہی تھی کہ ربن نے اسے طبیعت کی تھوڑی خرابی کا بتایا تھا لیکن تھوڑی طبیعت خراب ہونے پر اس کے والدین ان حالات میں اسے تنہا اسپتال میں نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ یقیناً اس کی طبیعت بہت زیادہ خراب تھی جب ہی تو جوزفین بھی اسپتال نہیں آسکی تھی اور اسے یوں ایک تقریباً اجنبی شخص کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا تھا۔ اسے اپنے والدین کے ربن پر اس درجے اعتماد پر بھی حیرت ہو رہی تھی اور وہ سوچ رہی تھی کہ کیا ثریا بانو والے واقعے نے ایک غنڈے کو اتنا معتبر بنا دیا ہے کہ اس کے والدین نے مشکل حالات میں پرانے محلے داروں سے مدد لینے کے بجائے اس پر بھروسا کرنا مناسب سمجھا۔

''زیادہ مغز پر زور مت دو بٹیا! اپن کے لیے تم بیٹی سے بھی بڑھ کر ہو۔ ادھر معاملہ ذرا پولیس تھانے کا تھا اس لیے اپن نے خود ہاسپٹل میں ٹھہرنے کا آفر کیا۔ تم سمجھ سکتی ہو کہ سیدھے سادے محلے والوں کے بجائے اپن پولیس والوں سے بات چیت کرنے کے لیے زیادہ ٹھیک آدمی ہے۔ ابھی بھی اپن نے تیرا بیان لینے کے لیے آنے والے وردی والوں کو اچھی طرح سمجھا کر بھیجا تھا کہ جاستی چخ چخ نہیں کرنی ہے اپنی بٹیا سے۔ اگر اپن انہیں نکیل ڈال کر نہیں بھیجتا تو اتنی جلدی وہ تمہارے پاس سے ٹلنے والے نہیں تھے۔'' ربن گویا اس کا ذہن پڑھ رہا تھا چنانچہ اپنی یہاں موجودگی کا بھرپور جواز پیش کیا۔

''میں اب بہتر محسوس کر رہی ہوں اور فوری طور پر گھر جانا چاہتی ہوں۔'' وہ جانے اس کی دلیل سے مطمئن ہوئی یا نہیں لیکن فوراً ہی اپنا مطالبہ پیش کر دیا۔

''اس کے لیے تو ڈاکٹر کا پرمیشن لینا پڑے گا۔ ڈاکٹر نے کہا کہ تم فٹ ہو تو تب ہی گھر جانے کی اجازت ملے گی نا۔'' اس کا مطالبہ سن کر ربن نے نرمی سے اسے سمجھایا۔

''میں کچھ نہیں جانتی، بس مجھے گھر جانا ہے۔'' اس نے ضدی لہجے میں اپنا مطالبہ دہرایا۔

''ٹھیک ہے، اپن ڈاکٹر سے بات کرتا ہے۔'' ربن نے اس سے مزید بحث نہیں کی اور فوراً ہی باہر نکل گیا۔ دوبارہ وہ تقریباً دس منٹ بعد واپس آیا۔

''کیا ہوا...... ڈاکٹر نے چھٹی دے دی؟'' جولیٹ نے بے تابی سے پوچھا تو اس نے مایوسی سے نفی میں سر ہلایا اور بولا۔ ''چھٹی نہیں ملی۔ ڈاکٹر سریتا ڈیوٹی آف کر کے جا چکی ہے اور دوسری ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ وہ اس کی پرمیشن کے بغیر اس کی پیشنٹ کو ڈسچارج نہیں کر سکتی۔ اگر چھٹی چاہیے تو ڈاکٹر سریتا کے آنے کا انتظار کرنا ہوگا اور وہ تو اب رات میں ہی آئے گی۔'' ربن کا جواب اس کے لیے خاصا مایوس کن تھا لیکن اس کے پاس مزید بحث کی گنجائش نہیں تھی، سو خاموش ہوگئی۔

''کاہے کو اتنی پریشان ہوتی ہو بٹیا۔ ادھر جوزف کا خیال رکھنے کے واسطے بہت لوگ ہے۔ اپن بھی ادھر ہی کا چکر لگانے جارہا ہے، واپس آکر تمہیں جوزف کا خیریت بتائیں گا۔ اپن کے پیچھے ادھر اسپتال میں اپنا ایک آدمی رہے گا۔ تم کو کچھ کام ہو تو نرس کو بول کر اسے پیغام بھیج دینا۔'' اس کی مایوسی کو محسوس کر کے ربن نے اسے دلاسا دیا پھر چند ایک مزید باتیں کر کے باہر نکل گیا۔ انتظار گاہ میں موجود شیدو کو بھی اس نے چند ایک ہدایات دیں اور اڈے کے لیے روانہ ہوگیا۔ رات رامو کے علاوہ صبح ناشتے کے بعد فاروق نے بھی اس پر بہت زور دیا کہ وہ کچھ دیر کے لیے وہاں سے ہو آئے۔ خود اسے بھی یہی مناسب معلوم ہوا تھا ورنہ اس کی مسلسل غیر حاضری پر اس کے ساتھی تشویش میں مبتلا ہو جاتے اور انہیں یہ گمان ہوتا کہ فاروق کی طبیعت بہت زیادہ خراب ہے جب ہی وہ اسپتال سے ہٹنے کو تیار نہیں ہے۔ ساتھیوں کی تشفی کے لیے اڈے کا چکر لگانے سے قبل اس نے جولیٹ کی خبر گیری کرنا ضروری سمجھا تھا اور پولیس کے بیان لینے والا معاملہ نمٹنے کے بعد اب خاصے سکون سے اڈے کی طرف جارہا تھا۔

اس وقت اس کے جسم پر ایک صاف ستھرا لباس تھا۔ یہ وہی لباس تھا جو کل اڈے سے اسے بھجوایا گیا تھا۔ لباس تبدیل کرنے سے قبل اس نے شیو وغیرہ بنا کر اپنا حلیہ بھی

خاصا بہتر کرلیا تھا اس لیے مطمئن تھا کہ اپنے ساتھیوں کو تسلی دینے میں کامیاب رہے گا۔ اڈے پر پہنچتے ہی سب نے اسے گھیر لیا۔ خاص طور پر گولو تو اس کے گلے کا ہار ہی بن گیا۔ ربن کو دیکھ کر اسے رامو کا سمجھایا بجھایا سب بھول گیا تھا۔ چنانچہ فاروق کے لیے اپنی تشویش کا اظہار کرتے ہوئے اس کے سینے سے لگ کر خوب رویا۔

''کیوں روتا ہے رے۔ ٹھیک ہے تیرا فاروق بھائی۔ جلد چھٹی مل جائے گی اسے...... اسی لیے کسی کو ادھر ہاسپٹل آنے سے روک دیا ہے اپن نے۔ خامخواہ کے رش سے ڈاکٹر لوگ ناراض ہوجاتے ہیں۔ تو بس یہیں رہ کر اس کا انتظار کر اور کمرا وغیرہ تیار رکھ۔ تیرا فاروق بھائی چھٹی ہو کر واپس آجائے تو دل بھر کر اسے دیکھ لیجیو اور جیسی چاہے خدمت کرلو۔'' اسے تسلی دینے کے ساتھ ساتھ اس کے اسپتال لے چلنے کے مطالبے پر ربن نے اسے سمجھایا۔ گولو اس کا لاڈلا تھا لیکن کسی بھی بات پر اس سے بہت زیادہ ضد نہیں کرتا تھا اس لیے فوراً ہی اپنے مطالبے سے دست بردار ہوگیا۔ ربن بھی سب کی تسلی تشفی کے بعد رامو کے ساتھ اہم امور پر تبادلہ خیال میں مصروف ہوگیا۔ اس کی اڈے پر موجودگی سے یہاں کی فضا میں واضح تبدیلی آگئی تھی اور سب لوگ گرم جوشی سے اپنے اپنے فرائض انجام دے رہے تھے۔ جو نے بڑے اہتمام سے دوپہر کا کھانا تیار کیا تھا۔ ساتھ ہی وہ فاروق کا پرہیزی کھانا تیار کرنا بھی نہیں بھولا تھا، حالانکہ اس تک یہ اطلاع پہنچائی جا چکی تھی کہ اسپتال میں مریضوں کو بہترین کھانا فراہم کرنے کا انتظام موجود ہے۔ شاید دل کی تسلی کے لیے یہ اہتمام ضروری تھا کہ اس کے پاس اپنی محبت کے اظہار کے لیے یہی ایک ذریعہ تھا۔

کھانے سے قبل ربن نے اڈے سے متعلق امور دیکھنے کے علاوہ غلام چاچا سمیت محلے کے چند افراد سے ملاقات بھی کی اور جوزف کا حال معلوم کرنے اس کے گھر بھی گیا۔ اسے جولیٹ کے ساتھ بیتے حادثے کے بارے میں کچھ نہیں بتایا گیا تھا اور اب بھی زیادہ تر مسکن دواؤں کے ذریعے غنودگی میں رکھا جارہا تھا۔ اس کا علاج کرنے والے ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ اگر ایسا نہیں کیا گیا تو شدید ذہنی دباؤ کی وجہ سے اس کے دماغ کی کوئی رگ پھٹ بھی سکتی ہے۔ اس لیے بہتر تھا کہ اسے دھیرے دھیرے ہی حقائق سے باخبر کیا جائے۔ ابھی تو وہ اس لائق بھی نہیں تھا کہ جوزفین سے جدائی کے صدمے کو قبول کرپاتا۔ جوزف کی حالت پر افسردہ ربن کے لیے کھانے سے پورا انصاف کرنا مشکل تھا لیکن جو کی محنت اور دیگر ساتھیوں کی دل جوئی کے خیال نے اسے دسترخوان پر بٹھائے رکھا۔ کھانے کے بعد وہ فوراً ہی اسپتال کے لیے روانہ ہوگیا۔ اس سے قبل ہی ایک آدمی فاروق کے پرہیزی کھانے کے علاوہ شیدو اور ذوجے کا کھانا لے کر اسپتال روانہ ہو چکا تھا۔

اسپتال پہنچ کر وہ سیدھا فاروق کے کمرے کی طرف گیا۔ اس کے اندازے کے مطابق اس وقت ان لوگوں کو کھانے میں مصروف ہونا چاہیے تھا لیکن کمرے کے باہر ہی وہ وجے اور کھانا لے کر آنے والے آدمی کے ستے ہوئے چہرے دیکھ کر ٹھٹک گیا۔

''کیا بات ہے؟'' تین لفظی اس سوال میں اس کے اندر کے سارے اندیشے بول رہے تھے۔

''فاروق بھائی کی طبیعت اچھی نہیں ہے دادا۔ پہلے سر میں ہلکا ہلکا درد ہورہا تھا پھر بڑھتا گیا۔ آدھے گھنٹے سے تو بہت بری حالت ہے۔ اندر ڈاکٹر لوگ انہیں دیکھ رہے ہیں۔ اپن کو باہر نکال کر کھڑا کردیا ہے اس لیے کچھ نہیں معلوم کہ اب کیا حال ہے۔'' اسے صورتِ حال سے آگاہ کرتا وجے آخر میں بلک پڑا۔ خود ربن کے دل پر یہ سب سن کر اتنی کڑی گزری کہ وہ روتے بلکتے وجے کو تسلی تک نہیں دے سکا۔ فاروق کے سر پر پولیس والوں کے ڈنڈوں سے کیے گئے تشدد کے نتیجے میں چوٹ لگی تھی اور اس چوٹ کی وجہ سے ڈاکٹرز پہلے ہی تشویش کا اظہار کر چکے تھے۔ ایسے میں سر میں ہونے والی شدید تکلیف کا سن کر اس کا پریشان ہوجانا قدرتی امر تھا۔ اس بری خبر پر ساکت وصامت کھڑا وہ اندر جانے یا نہ جانے کے بارے میں ابھی کوئی فیصلہ نہیں کرسکا تھا کہ کمرے کا دروازہ کھلا اور سنجیدہ صورت ڈاکٹر نے باہر قدم رکھا۔ ربن لپک کر ڈاکٹر کے قریب پہنچا لیکن اس کے سپاٹ تاثرات نے یک دم ہی اس کی قوتِ گویائی چھین لی اور وہ فاروق کی طبیعت کی بابت کوئی سوال کرنے سے قاصر رہا۔ اچانک ہی ڈاکٹر نے اس کے شانے پر تسلی دینے والے انداز میں ہاتھ رکھ دیا۔ ڈاکٹر کے اس انداز پر اس کا دل بری طرح کانپ اٹھا۔

زندگی کے تلخ و ترش حقائق اور
محبت کی فریب کاریوں کا مزید
احوال اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

"باؤ جی۔ ذرا بکرے کے سامنے سے ہٹ کر کھڑے ہو جاؤ۔" جانور بیچنے والے نے کہا۔

"کیوں بھائی؟"

"اعلیٰ نسل کا بکرا ہے۔ تم جیسے مفلس کے گھر قربان ہوا تو مرنے کے بعد بھی افسوس کرتا رہے گا۔"

"ابے کیا بات کر رہا ہے، میں بکرا خریدنے آیا ہوں۔ تیری بکواس سننے نہیں آیا۔"

"اچھا!" اس نے اوپر سے نیچے تک مجھے دیکھا۔

دشمن بکرا

منظر امام

دور چاہے جو بھی ہو اس کمبخت مہنگائی نے ہر عہد میں ظلم ڈھایا ہے۔ اب چاہے سال کے 364 دن کھانے کو نہ ہو مگر... سال میں ایک دن اپنی شان جھاڑنے کے لیے ایڑی چوٹی کا دم لگا دیا جاتا ہے۔ ان کا شمار بھی انہی لوگوں میں ہوتا تھا جو جھوٹی شان کی خاطر جان بھی وار دیتے ہیں... لیکن سوئے اتفاق ان کے پاس شان تو تھی ہی نہیں جان بھی دھان پان سی تھی۔ بس اسی فکر میں وہ گھلتے جا رہے تھے۔

اس نہ ملنے والی مایا کے ہاتھوں بے مایا ہونے والوں کا کرب

''کتنے لے کر آئے ہو؟''
''پانچ ہزار۔''
''باؤجی۔ اچھا ہے کہ یہ بکرا اردو نہیں سمجھتا ورنہ یہیں ٹکر مار کر بے ہوش کر دیتا۔''
''تم عجیب بے ہودہ آدمی ہو۔'' مجھے غصہ آ گیا۔
''اچھا بھائی، آگے جا۔ آگے مرغیاں بیچنے والے بھی کھڑے ہیں، ان میں سے دو چار سستی مرغیاں پکڑ لے۔''
میرا دل چاہا کہ میں اس کم بخت کی گردن دبا دوں لیکن اس کی گردن میری ران سے زیادہ موٹی تھی اس لیے دل مسوس کر آگے بڑھ گیا۔
میں نے یہ سوچ لیا تھا کہ میں اس بار قربانی ضرور کروں گا۔ اس لیے میں بکرا منڈی میں دکھائی دے رہا تھا۔ اب یہ سن لیں کہ مجھے قربانی پر اکسانے والا میرا پڑوسی ملک ایاز ہے۔ اس نے اپنی طنزیہ باتوں سے میری زندگی عذاب کر دی تھی۔ راستے میں ملاقات ہوتی تو سب سے پہلا سوال یہی کرتا۔ ''ہاں بھائی نعیم صاحب۔ قربانی کے لیے جانور لائے یا نہیں لائے؟''
''نہیں بھائی، ابھی تو نہیں لایا ہوں۔''
''ہمت بھی نہیں کرنا اور ویسے بھی تمہارے حالات ایسے نہیں کہ تم قربانی کر سکو۔''
اب بتاؤ۔ ایسی فضول باتیں سن کر دماغ خراب ہونا تھا یا نہیں؟ اس لیے میں بھنا کر پانچ ہزار جیب میں ڈال کر بکرا منڈی پہنچ ہی گیا اور یہاں آ کر احساس ہوا کہ ملک ایاز ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ میری اتنی حیثیت بھی نہیں تھی کہ کسی بکرے کے سامنے کھڑا بھی ہو سکتا۔ ایک نے تو انتہا کر دی۔ ابھی میں اس کے بکرے کے سامنے جا کر کھڑا ہی ہوا تھا کہ اس نے شور کرنا شروع کر دیا۔ ''جا بھائی جا...... یہ تیری حیثیت کا بکرا نہیں ہے، آگے بڑھ۔''
''اے تو نے کیا مجھے فقیر سمجھ رکھا ہے۔''
''بھائی۔ تیری تو صورت ہی پر مفلس لکھا ہوا ہے۔'' اس نے کہا۔ ''کیوں دام پوچھ کر ٹائم ضائع کرے گا۔''
میں ابھی اسے کوئی مناسب جواب دینے کی سوچ ہی رہا تھا کہ کسی نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ وہ ایک...... ادھیڑ عمر شخص تھا جس نے بہت قیمتی لباس پہن رکھا تھا۔ ''بکرا خریدنے آئے ہو؟'' اس نے پوچھا۔
''جی جناب۔'' نہ جانے کیوں میں اس سے کچھ مرعوب سا ہو گیا تھا۔
''آؤ میرے ساتھ۔''
''کیا آپ بکرے بیچتے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔
''نہیں، بات کچھ اور ہے۔'' اس نے کہا۔ ''تم میرے ساتھ چلے آؤ۔ تمہارے فائدے کی بات ہے۔ تمہارا چہرہ بتا رہا ہے کہ تم ایک مفلوک الحال انسان ہو اور برادری میں ناک اونچی رکھنے کے چکر میں جانور خریدنے آ گئے ہو۔ کیوں یہی بات ہے نا؟''
''جی جناب۔ ایسا ہی سمجھ لیں۔'' میرے تصور میں ملک ایاز آ گیا تھا۔
''اس لیے کہہ رہا ہوں۔ میرے ساتھ آؤ، بہت فائدہ ہوگا۔''
میں اس کے ساتھ ہو لیا۔ جانوروں اور انسانوں سے بچتے ہوئے ہم اس جگہ آ گئے جہاں گاڑیاں پارک ہوتی تھیں۔ اس کی گاڑی بہت شاندار تھی جس کے قریب اس کا باوردی ڈرائیور کھڑا تھا۔ ''بیٹھ جاؤ۔'' اس نے اگلی سیٹ کی طرف اشارہ کیا۔
''جی۔ میں بیٹھ جاؤں؟''
''ہاں۔ میں تم ہی سے کہہ رہا ہوں، بیٹھ جاؤ۔ ڈرو نہیں۔''
ڈرائیور نے میرے لیے دروازہ کھول دیا۔ میں اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گیا جبکہ اس نے پچھلی سیٹ سنبھال لی تھی، گاڑی روانہ ہو گئی۔
راستے بھر ہمارے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ لیکن میں اس کے بارے میں سوچتا رہا۔ کون ہے، کیا چاہتا ہے مجھ سے، میں تو جانتا بھی نہیں ہوں اس کو۔ یہ کچھ اسی قسم کی بات معلوم ہوتی تھی جیسے کسی مفلس شخص کے پاس اچانک کوئی امیر آدمی آ کر کھڑا ہو جاتا ہے کہ دیکھ بھائی، میں تیرا وہ چاچا ہوں جو تیرے باپ سے میلے میں بچھڑ کر جنوبی افریقا چلا گیا تھا۔ وہاں میں نے ہیروں کی تجارت کی اور ارب پتی ہو کر واپس آیا ہوں۔ تو میرا جانشین ہے اس لیے میں اپنی دولت تیرے حوالے کر رہا ہوں، وغیرہ وغیرہ۔
لیکن میں یہ اچھی طرح جانتا ہوں کہ میرے باپ کا کوئی بھائی میلے میں نہیں بچھڑا۔ سب کے سب یہیں مر کھپ گئے تھے۔ اس لیے یہ شخص کوئی اور ہی تھا۔
بہت دیر سفر کے بعد گاڑی ایک شاندار مکان کے احاطے میں داخل ہو گئی۔ مجھے گاڑی سے اتار کر ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا گیا۔ کیا شاندار ڈرائنگ روم تھا۔ دیکھ کر دل خوش ہو گیا۔ وہ بھی میرے سامنے بیٹھ گیا۔

''نام کیا ہے تمہارا؟'' اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔
''فہیم۔'' میں نے بتایا۔
''بے روزگار ہو؟'' اس نے دوسرا سوال کیا۔
''جی جناب۔ ایسا ہی سمجھ لیں۔''
''چوری کا تجربہ ہے؟'' اس نے اچانک ایک بے تکی بات پوچھ لی۔
''چوری!'' میں نے پریشان ہوکر اس کی طرف دیکھا۔ ''آپ چوری کا پوچھ رہے ہیں؟''
''ہاں، چوری کا پوچھ رہا ہوں۔ ویسے صورت تو چوروں ہی والی ہے۔''
''دیکھیں جناب! آپ میری غربت کا مذاق نہیں اڑا سکتے۔''
''بے وقوف انسان۔ ایک چانس دے رہا ہوں تمہیں۔'' اس نے کہا۔ ''پچاس ہزار ملیں گے۔''
''پچاس ہزار؟''
''ہاں، اور وہ بھی کیش۔ بس میرے لیے ایک بکرا چرانا ہے۔'' اس نے بتایا۔
''بکرا چرانا ہے۔'' میں حیرت سے پاگل ہوا جارہا تھا۔ ''کیا بات کررہے ہیں آپ؟ آپ کے لیے بکروں کی کیا کمی ہے، آپ کے پاس اچھی خاصی دولت ہے جو آپ مجھے پچاس ہزار دے رہے ہیں اس میں کئی بکرے خود بھی خرید سکتے ہیں۔''
''لیکن یہ ایک خاص بکرا ہے۔'' اس نے کہا۔ ''وہ دشمن بکرا ہے۔''
''دشمن بکرا۔ کیا یہ کوئی نئی نسل آئی ہے بکروں کی؟''
''نہیں۔ وہ بکرا میرے دشمن کے پاس ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''تم اسے میرا کاروباری حریف سمجھ لو۔''
پھر اس نے جو کہانی سنائی وہ کچھ یوں تھی کہ ایک بکرا اس شخص کو اور اس کے دشمن دونوں کو پسند آگیا تھا۔ اس شخص سے ذرا سی چوک ہوگئی اور وہ بکرا دشمن کے ہاتھ چلا گیا۔
''سمجھ گئے؟'' اس نے کہانی سنانے کے بعد پوچھا۔ ''اب میں ہر قیمت پر وہ بکرا اپنے پاس دیکھنا چاہتا ہوں۔''
''جناب عالی۔ ایک بکرے کے لیے اتنی جدوجہد کی کیا ضرورت ہے۔ لعنت بھیجیں دوسرا خرید لیں۔''
''بے وقوف انسان۔ بات بکرے کی نہیں ہے۔ بات اپنی انا اور اپنی آن کی ہے ورنہ میں ایسے دس بکرے خرید سکتا ہوں۔''

''سمجھ گیا۔ تو آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں وہ بکرا چرا کر آپ کی خدمت میں پیش کردوں اور خود جیل چلا جاؤں۔''
''نہیں، کسی کو پتا نہیں چلے گا کہ تم نے وہ بکرا چرایا ہے۔ میں بتادوں گا کہ وہ بکرا کہاں رکھا ہے۔ بہت محفوظ جگہ ہے، تم سوزوکی لے کر جانا اور اس بکرے کو اٹھا کر لے آنا۔ بس اتنی سی بات ہے۔''
''اور آپ مجھے پچاس ہزار دے دیں گے؟''
''ہاں، اسی وقت۔''
''لیکن میں کیسے پہچانوں گا کہ یہ وہی بکرا ہے؟''
''بہت آسان ہے۔ بالکل سفید بکرا ہے لیکن اس کی پیشانی پر سیاہ داغ ہے۔ دور سے ہی معلوم ہوجائے گا کہ یہ وہی ہے۔''
''چلیں ٹھیک ہے۔ اب آپ مجھے مکمل ایڈریس سمجھا دیں اور پچیس ہزار روپے ایڈوانس دے دیں۔''
''کیا پاگل ہوگئے ہو۔ ابھی کام ہوا نہیں اور پچیس ہزار ایڈوانس دے دوں۔'' وہ اپنی جیب سے پانچ سو کا ایک نوٹ نکالتے ہوئے بولا۔ ''یہ لو پانچ سو روپے، سوزوکی کا کرایہ۔ بکرا لے کر آؤ۔ پچاس ہزار لے جاؤ۔''

☺☺☺

میں بکرا لے آیا تھا۔
بہت ہی دبلا اور مردار قسم کا بکرا تھا۔ سوائے سفید رنگ اور ماتھے پر سیاہ داغ کے اس میں اور کوئی خاص خوبی نہیں تھی۔ جانے کس ٹائپ کی انا کا سوال تھا۔ میں نے بکرا اس کے سامنے پیش کردیا۔ ''یہ لیں شوکت صاحب اپنا بکرا۔''
وہ بکرے کو دیکھتے ہی اچھل پڑا۔ ''شاباش، یہ کام کیا ہے تم نے، کوئی دشواری تو نہیں ہوئی؟''
''نہیں جناب۔ آپ نے جو ایڈریس بتایا تھا، میں سیدھا پہنچ گیا تھا۔ کوٹھی کے برابر میں ایک خالی پلاٹ ہے۔ بکرا وہیں بندھا ہوا تھا۔ کوئی نگرانی بھی نہیں ہورہی تھی۔ بڑی آسانی سے سوزوکی میں ڈال کے لے آیا۔''
''اب میرے دشمن کے دل پر چھریاں چل رہی ہوں گی۔'' اس نے کہا۔ ''وہ تڑپ رہا ہوگا۔''
''جناب! میرے پیسوں کا کیا ہوگا؟'' میں نے پوچھا۔
''تم کیا مجھے بے ایمان سمجھتے ہو۔ جو سودا ہوگیا وہ ہوگیا، یہ لو پچاس ہزار۔'' اس نے پچاس ہزار کی گڈی میری طرف بڑھادی۔
میرے تو ہاتھ پاؤں ہی پھول گئے۔ اتنی سی محنت کے پچاس ہزار... بلکہ مجھے کوئی تیر بھی مارنا نہیں پڑا تھا، بس

گیا اور بکرا اٹھا کر لے آیا۔
میں اس کی خوشی دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔ وہ بکرے کو پیار کر رہا تھا۔ اس پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ اب وہ میری طرف دھیان ہی نہیں دے رہا تھا، میں بھی خاموشی سے اٹھ کر باہر آ گیا۔
میری جیب میں پچاس ہزار آ چکے تھے۔ ان پیسوں سے کیا، کیا نہیں ہو سکتا تھا۔ عجیب آدمی تھا، دشمن سے بکرا لینے کے لیے پچاس ہزار خرچ کر ڈالے۔
پھر اچانک ایک خیال میرے ذہن میں آ گیا۔ بہت زبردست خیال تھا۔ اگر یہ شخص دشمن کے قبضے میں بکرے کے جانے کے بعد اس طرح بے چین ہو رہا تھا تو پھر دشمن کا بھی تو یہی حال ہوگا۔ اس کی بھی تو انا ہوگی۔
بس یہ خیال آیا اور کچھ دیر کے بعد میں اس شخص کے دشمن کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا دشمن بھی دولت مند آدمی تھا، اسی کی طرح شاندار۔ میں بڑی مشکل سے اس تک پہنچنے میں کامیاب ہوا تھا۔
''ہاں مسٹر! کیا کہنے آئے ہو؟'' اس نے پوچھا۔ ''جو کچھ کہنا ہے جلدی کہو۔ میں ویسے ہی بہت پریشان ہو رہا ہوں۔''
''جناب عالی! میں ایک شریف اور بے ضرر سا انسان ہوں۔'' میں نے کہنا شروع کیا۔ ''غریب آدمی ہوں اسی لیے ایک تھرڈ کلاس بائیک ہے میرے پاس۔''
''تم پاگل تو نہیں۔ کہنا کیا چاہتے ہو؟''
''سنیے تو سہی جناب۔ کل رات اتفاق سے میں آپ کے مکان کے سامنے سے گزر رہا تھا تو میں نے ایک مشکوک سی حرکت دیکھی۔''
''اچھا'' وہ اب سنبھل کر بیٹھ گیا تھا۔ ''کیا دیکھا تم نے؟''
''جناب! میں نے ایک سوزوکی کھڑی ہوئی دیکھی اور دو چار آدمی دیکھے۔ میں نے اپنی بائیک اندھیرے میں کھڑی کر دی تھی۔ میں ان کی حرکات دیکھ رہا تھا۔ پھر میں نے دیکھا کہ وہ آپ کی کوٹھی کے برابر والے پلاٹ سے کوئی جانور اٹھا کر لے جا رہے تھے۔ میرا خیال ہے کہ کوئی بکرا تھا۔''
''ہاں۔ وہ بکرا ہی تھا، تو یہ سب کچھ تمہارے سامنے ہوا تھا؟''
''جی جناب۔ بس میں یہی بتانے کے لیے چلا آیا ہوں۔''
''کیا فائدہ ایسے بتانے کا۔ کاش پتا چل جاتا کہ یہ حرکت کس کی ہے؟''
''میں بھی کام ادھورا نہیں چھوڑتا جناب۔'' میں نے کہا۔ ''میرے پاس بائیک تھی اور یہ اندازہ بھی ہو گیا تھا کہ یہ کوئی غیر اخلاقی حرکت ہو رہی ہے اسی لیے میں نے سوزوکی کا تعاقب شروع کر دیا۔''
''شاباش، شاباش۔ جیتے رہو۔''
''پھر جناب اس طرح میں نے وہ مکان دیکھ لیا جہاں وہ بکرا پہنچایا گیا ہے۔''
''زندہ باد۔ تم کام کے آدمی ہو، یہ بتاؤ وہ مکان کس کا ہے؟''
''نام کی پلیٹ لگی ہوئی تھی۔ کسی شوکت علی چیمہ کا نام لکھا ہوا تھا۔''
''ہاں، یہ وہی ہے، میرا دشمن۔'' وہ صوفے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ''آخر اس نے بکرا حاصل کر ہی لیا۔ اپنی ضد پوری کر لی اس نے لیکن میں بھی رندھاوا ہوں۔ وہ بکرا اتنی آسانی سے لے جانے نہیں دوں گا۔'' پھر وہ سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا۔ ''نوجوان۔ تم بہت کام کے آدمی معلوم ہوتے ہو، کیا تم وہ بکرا میرے لیے حاصل کر سکتے ہو؟''
''آپ کے لیے بکرا حاصل کروں؟''
''ہاں، چاہے کسی طرح بھی ہو۔ یہ میری عزت اور انا کا سوال ہے۔'' اس نے کہا۔ ''میں اس کے لیے تمہیں پورے پچاس ہزار روپے دوں گا۔''
''پچاس ہزار؟''
''ہاں، بالکل کیش۔''
''جناب۔ آپ کسی بندے کو بھیج کر وہ بکرا اس سے خرید لیں۔'' میں نے کہا۔
''نہیں، وہ اس طرح نہیں بیچے گا۔ وہ بھی میری طرح پیسے والا آدمی ہے۔ یہ معاملہ انا اور ضد کا ہے۔ اس میں پیسوں کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ تم وہ بکرا لاؤ اور پچاس ہزار لے جاؤ۔''
''ٹھیک ہے صاحب۔ میں آپ کے لیے کوشش کروں گا۔''
میں جانتا تھا کہ یہ کوئی اتنا مشکل کام نہیں ہے۔ شوکت علی کے یہاں وہ بکرا جس جگہ بندھا ہوا تھا، وہاں میری رسائی بہت آسانی سے ہو سکتی تھی۔
میں نے اسی رات یہ کام کر دکھایا۔ اندازے کے مطابق یہ کام بھی بہت آسان ثابت ہوا تھا۔ میں نے جب بکرا لے جا کر رندھاوا کے سامنے پیش کیا تو خوشی سے اس کے آنسو نکل آئے۔ ''زندہ باد۔ کیا کام دکھایا ہے تم نے۔ اب میرا دشمن تڑپ رہا ہوگا۔ اپنے بکرے کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر پاگل ہو رہا ہوگا۔''

''جناب۔ میرے لیے کیا حکم ہے؟''

''تم تو اتنے کام کے آدمی نکلے۔'' اس نے کہا۔ ''یہ لو اپنے پچاس ہزار۔'' اس نے پچاس ہزار میری طرف بڑھا دیے۔

''واہ!'' میں پھڑک اٹھا تھا۔ دو راتوں کی محنت کے بعد ایک لاکھ مل گئے تھے۔ ایک لاکھ، جو ایک ساتھ مجھے کبھی مل ہی نہیں سکتے تھے۔

میں اس کا شکریہ ادا کر کے اس کے مکان سے باہر آ گیا۔ ایک لاکھ میری جیب میں تھے جن سے بہت کچھ ہو سکتا تھا.... اپنے گھر کی طرف جاتے ہوئے میرے ذہن نے ایک اور قلابازی کھائی۔

سیدھی سی بات تھی۔ اگر رندھاوا اس بکرے کو دوبارہ حاصل کر کے اتنا خوش ہو رہا تھا تو شوکت علی کا کیا حال ہوگا۔ بس یہی ڈراما مجھے شوکت علی کے پاس جا کر کرنا تھا۔

جب میں شوکت علی کے پاس پہنچا تو اس کی حالت دیکھنے والی تھی، وہ کسی اداس الو کی طرح اداس ہو رہا تھا۔ ''نوجوان، تمہاری ساری محنت بے کار چلی گئی۔'' اس نے بتایا۔

''کیوں جناب!، کیا ہوا؟''

''بکرا چوری ہو گیا ہے۔'' اس نے کہا۔ ''کوئی شاطر چور اسے رات کو چرا کر لے گیا۔''

''اوہ، یہ تو بہت افسوس کی بات ہے جناب۔'' میں مسکرا کر بولا۔

''کیوں...... تم مسکرا کیوں رہے ہو؟'' اس نے غصے سے میری طرف دیکھا۔

''اس لیے کہ مجھے معلوم ہے کہ آپ کا بکرا کہاں ہے۔'' میں نے بتایا۔

''بتاؤ۔ کہاں ہے؟'' وہ یہ سن کر بے تاب ہو گیا تھا۔

''اسی رندھاوا کے پاس۔''

''کیا!'' وہ اچھل پڑا۔ ''تمہیں کیسے معلوم؟''

''آپ تو جانتے ہیں جناب کہ میں ایک غریب آدمی ہوں۔ ایک پرانی سی بائیک ہے میرے پاس۔'' میں نے کہا۔ ''میں اسی بائیک پر گھومتا رہتا ہوں۔ اتفاق سے میرا گزر رندھاوا کے گھر کے سامنے سے ہوا تو میں نے آپ کے بکرے کو اسی جگہ کھڑا ہوا دیکھ لیا۔''

''شاباش! اس کا مطلب یہ ہوا کہ رندھاوا کے آدمیوں نے یہ کام کر دکھایا ہے۔''

''جی جناب! اس کے علاوہ اور کیا کہہ سکتا ہوں۔ لیکن رندھاوا کے آدمیوں کو کیا معلوم کہ وہ بکرا میرے پاس تھا؟'' اس نے میری طرف دیکھا۔

یہ ایک ٹیڑھا سوال تھا۔ واقعی رندھاوا کو کیسے معلوم ہو سکتا تھا کہ وہ بکرا شوکت علی کے پاس ہے۔ جب تک میں نہ بتاتا۔

لیکن قدرت شاید میری مدد چاہتی تھی۔ اس لیے خود اس نے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ میرے دفتر کے کسی آدمی نے خبر کر دی ہوگی۔''

''کیا آپ نے دفتر والوں کو بتا دیا تھا جناب؟''

''ہاں بھائی۔ مجھ سے خوشی برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ اسی لیے میں نے بتا دیا اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اس کم بخت کے کچھ جاسوس میرے یہاں بھی ہیں۔''

''بس تو بات سمجھ میں آ گئی جناب۔ ان میں سے کسی نے بتا دیا ہوگا۔'' میں نے کہا۔

''سوال یہ ہے کہ اب کیا ہو؟''

''جو آپ فرمائیں۔''

''سنو۔ کیا دوبارہ یہی کام میرے لیے کر سکتے ہو؟'' اس نے پوچھا۔ ''اس بار میں تمہیں پورے ڈیڑھ لاکھ دوں گا۔ اس رندھاوا کی ایسی کی تیسی۔''

''ڈیڑھ لاکھ!'' میرے تو ہوش اڑ گئے۔ ''ڈیڑھ لاکھ کا بکرا۔''

''ہاں۔ وہی بکرا اس کم بخت سے چرا کر لاؤ اور مجھ سے ڈیڑھ لاکھ لے جاؤ۔''

''ٹھیک ہے جناب۔ آپ کی عزت اور آن کی خاطر میں اپنی جان پر کھیل کر وہ بکرا وہاں سے لاؤں گا۔''

''تو پھر جاؤ، میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔''

مجھے اس بکرے کی قسمت پر رشک آنے لگا تھا۔ ادھر سے ادھر ہوتا پھر رہا تھا اور ہر بار اس کی قیمت بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ اب اس کی قیمت ڈیڑھ لاکھ تک پہنچ چکی تھی۔

ایک لاکھ میرے پاس تھے۔ ڈیڑھ لاکھ اور آ جاتے تو مزہ ہی آ جاتا اور ویسے بھی مجھے بکرا چوری کرنے کی پریکٹس تو ہو ہی چکی تھی اسی لیے اب یہ کام میرے لیے زیادہ مشکل نہیں تھا۔

میں اسی رات رندھاوا کے گھر بکرا چوری کرنے پہنچ گیا۔

لیکن وہاں کے حالات دیکھ کر میری ہمت جواب دے گئی۔ وہ بکرا رندھاوا کے مکان کے برابر والے خالی پلاٹ میں بندھا ہوا تھا اور اس کے اردگرد خطرناک صورت والے مسلح افراد پہرا دے رہے تھے۔

یعنی اس بار رندھاوا نے ایسا بندوبست کر رکھا تھا کہ کوئی بکرا چوری نہ کر سکے۔ یہ انتظام دیکھ کر سخت مایوسی ہوئی تھی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بکرا کس طرح چوری کروں۔ دوسری طرف ڈیڑھ لاکھ کی رقم تھی، لیکن اب وہ رقم ڈوبتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ میں خالی ہاتھ واپس آ گیا۔

ساری رات کروٹیں لیتے اور سوچتے ہوئے گزر گئی تھی۔ کیا ہوسکتا ہے؟ بکرا کس طرح حاصل کروں؟ پھر دوسری صبح میں اپنی ناکامی کا اعتراف کرنے شوکت علی کے پاس پہنچ گیا۔ ''نہیں جناب۔ اس بار بکرا چرانا بہت مشکل ہوگیا ہے۔'' میں نے بتایا۔ ''رندھاوا نے اس پر پہرے لگا دیے ہیں۔''

''یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی۔'' شوکت علی غصے سے بولا۔ ''مجھے تو ہر حال میں وہ بکرا چاہیے۔''

''آپ ہی بتائیں جناب۔ میں وہ بکرا کس طرح حاصل کروں؟''

''یہ میں نہیں جانتا۔'' شوکت علی نے کہا۔ ''میں تمہاری مجبوری کے لیے اپنی ناک کی قربانی تو نہیں دے سکتا۔ چلو، میں رقم بڑھا رہا ہوں، دو لاکھ دوں گا تم کو۔''

''دو لاکھ!'' میں بے ہوش ہوتے ہوتے بچا تھا۔ ''یعنی آپ مجھے اس بکرے کے دو لاکھ دیں گے؟''

''ہاں۔ اور تم جانتے ہو کہ میں اپنی بات کا پکا انسان ہوں۔ جو کہہ دیا وہ کہہ دیا۔''

اور اچانک میرے ذہن میں ایک ترکیب آ گئی۔

''ٹھیک ہے جناب۔ سودا ہو گیا۔'' میں نے کہا۔ ''میں وہ بکرا آپ کے پاس پہنچا دوں گا۔''

''اور مجھ سے دو لاکھ لے لینا۔''

میرے ذہن میں جو ترکیب آئی وہ بہت آسان تھی۔ مجھے بکرا چرانا نہیں بلکہ خرید لینا تھا۔ لہٰذا ایک گھنٹے کے بعد میں رندھاوا کے سامنے بیٹھا ہوا اسے قائل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ''دیکھیں جناب! آپ تو ایک بزنس مین ہیں اور آپ جیسے آدمی کو انا اور ضد وغیرہ جیسی حماقتوں سے دور رہنا چاہیے۔ یہ سب آج کے دور میں فالتو باتیں ہیں۔''

''تو پھر بزنس مین کو کیا کرنا چاہیے؟''

''موقع ملتے ہی موقعے سے فائدہ اٹھا لینا چاہیے۔'' میں نے کہا۔ ''مثال کے طور پر آپ کے بکرے کی قیمت اگر ایک لاکھ لگ رہی ہے تو فوراً دے دیں۔ یہ سوچے بغیر کہ اسے کون خرید رہا ہے اور کیوں خرید رہا ہے۔''

''کیا واقعی ایک لاکھ قیمت مل رہی ہے؟''

''جی جناب! پورے ایک لاکھ۔'' میں نے بتایا۔ ''بلکہ خریدنے والے نے ایک لاکھ دے کر مجھے سودا کرنے کے لیے بھیجا ہے۔'' میں نے ایک لاکھ کی گڈی میز پر رکھ دی۔

رندھاوا کی نگاہیں ایک لاکھ پر جم کر رہ گئیں۔ یہ وہی ایک لاکھ تھے جو مجھے شوکت علی اور رندھاوا سے ملے تھے یعنی پچاس ہزار شوکت علی نے دیے تھے اور پچاس ہزار رندھاوا نے۔

میری اسکیم یہی تھی۔ ایک لاکھ میں بکرا خرید کر میں شوکت علی کے پاس لے کر پہنچ جاتا۔ وہاں سے دو لاکھ مل جاتے۔ یعنی اس سودے میں ایک لاکھ کا منافع تھا۔

''ٹھیک ہے۔ تم بکرا لے جاسکتے ہو۔'' رندھاوا نے گڈی اٹھا کر اپنی جیب میں رکھ لی۔

اور میں بکرا لے کر دل ہی دل میں اپنی فتح کا جشن مناتا ہوا شوکت علی کے پاس پہنچ گیا۔ ''مبارک ہو جناب۔ میں نے وہ بکرا حاصل کر لیا ہے۔'' میں نے خوش خبری سنائی۔

''تو پھر میں کیا کروں؟'' اس نے بڑی رکھائی سے کہا۔

''جناب یہ وہی بکرا ہے۔ جو میں نے رندھاوا سے حاصل کیا ہے آپ کے لیے۔''

''بھائی سچ یہ ہے کہ اب مجھے اس قسم کے تماشے سے کوئی دلچسپی نہیں رہی۔'' اس نے کہا۔ ''یہ ضد اور انا وغیرہ بے کار کی چیزیں ہیں۔ تم نے بکرا حاصل کر لیا ہے، اب وہ تم ہی کو مبارک ہو۔''

''لیکن جناب! وہ...... وہ دو لاکھ۔'' غم اور غصے سے میری حالت عجیب ہو رہی تھی۔

''میرا کیا دماغ خراب ہے جو خواہ مخواہ کے دو لاکھ خرچ کروں۔'' اس نے کہا۔ ''ہاں۔ اگر بکرا بیچنا چاہتے ہو تو تین ہزار میں دے کر چلے جاؤ۔''

بھاگتے چور کی لنگوٹی بہتر تھی۔ میں اس کم بخت بکرے کو اپنے ساتھ کہاں کہاں لیے پھرتا۔ میں نے دل ہی دل میں گالیاں دیتے ہوئے بکرا اس کے حوالے کیا اور اپنی قسمت کو روتا ہوا گھر واپس آ گیا۔

ایک لاکھ کی رقم مختصر ہو کر صرف تین ہزار رہ گئی تھی۔

میں یہ کہانی اس لیے تحریر کر رہا ہوں کہ آپ کو اندازہ ہو جائے کہ ایک تو لالچ بہت بری بلا ہوتی ہے اور دوسرے یہ کہ اگر آپ کی جیب میں صرف پانچ ہزار ہوں تو کبھی بکرا منڈی کا رخ نہ کیجیے۔ ہوسکتا ہے کہ وہاں آج بھی شوکت علی جیسے لوگ گھوم رہے ہوں اور بکرا چرانے کے چکر میں پڑ جائیں۔

☺☺☺

میگی، بار کی جانب جاتے ہوئے پیانو پلیئر کے قریب سے گزری۔ اس نے پیانو پلیئر کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ نہ ہی پیانو کی دھن میں مگن موسیقار نے آنکھ اٹھا کر میگی کو دیکھا۔

پیانو پلیئر درحقیقت کسی کو بھی نہیں دیکھ رہا تھا۔ ہر چیز سے بے نیاز۔ اس کا وجیہہ چہرہ کسی بھی قسم کے تاثرات سے عاری تھا۔ نگاہ سامنے کی جانب کسی غیر مرئی نکتے پر جمی ہوئی تھی۔ وہ میوزک شیٹ کو بھی نہیں دیکھ رہا تھا۔ حتیٰ کہ اس کی نظریں پیانو کی کیز پر بھی نہیں تھیں۔ یقیناً وہ کوئی باکمال فنکار تھا۔

اس کے ہاتھ اور انگلیاں پیانو کے ''کی بورڈ'' پر بڑی مہارت سے حرکت کر رہی تھیں۔ مگر مکمل طور پر اس کے قابو میں تھے۔

دیوار گیر گھڑی رات کا ایک بجا رہی تھی۔ بار کے پیچھے پیٹ... تنہا تھا۔ کام کرنے والی لڑکیوں میں صرف میگی وہاں نظر آ رہی تھی۔ وہ قدم بڑھاتی ہوئی بار کے سامنے ایک اسٹول پر بیٹھ گئی۔

ابھی وہ بیٹھی ہی تھی کہ ایک اور آدمی بار میں داخل ہوا۔ نو وارد سیدھا میگی کے قریب اسٹول پر آن بیٹھا۔ اس نے پیٹ کو دو عدد بیئر کا اشارہ کیا۔

نو وارد تین راتوں سے متواتر وہاں آ رہا تھا۔ وہ ایک خوش لباس اور خوش شکل آدمی تھا۔ اس کی گہری سیاہ آنکھیں چمک دار تھیں اور اس کے چہرے سے الگ معلوم ہوتی تھیں۔

اس نے سر گھما کر اپنی چمک دار نگاہ میگی کے خوب صورت چہرے پر مرکوز کی۔

''ہاں، پھر کیا سوچا ہے بی؟'' اس کی آواز میں ہلکی سی بے قراری تھی۔

''کس بارے میں؟''

''خوب۔'' نو وارد مسکرایا۔ ''تمہیں نہیں معلوم؟''

دل کی بات کا لفظوں میں کہے بغیر...... اظہار کا دلچسپ انداز

سُریلا پیغام

امجد رئیس

دنیا نے ذرائع ابلاغ کے حوالے سے اتنی حیرت انگیز ترقی کی ہے کہ چند سیکنڈ میں بات ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچ جاتی ہے لیکن... جب یہ سب اتنا آسان نہ تھا تب بھی بات کرنا مشکل نہیں لگتا تھا کیونکہ رستہ نکالنے والے اپنا سفر آسان کر ہی لیا کرتے تھے جیسے کہ انہوں نے کیا... انتہائی خفیہ پیغام اتنے سہل انداز میں پہنچایا کہ دشمنوں کے فرشتوں کو بھی خبر نہ ہو سکی اور یہی ادا ان کی فتح اور مخالفین کی شکست بن کر ذہنوں میں محفوظ ہو گئی۔

میگی نے بیئر کا گھونٹ لیا۔ ''موکسی، تمہیں یہ خیال کیسے آیا کہ میں تمہارے ساتھ ڈیٹ پر جاؤں گی؟''

''کیا تم انکار کر رہی ہو؟'' وہ بولا۔ ''نہیں، ایسا نہیں ہے..... میں جانتا ہوں کہ تم زندگی سے لطف اندوز ہونا پسند کرتی ہو۔''

''اکثر لوگ چاہتے ہیں اور پسند کرتے ہیں۔ میں بھی ان میں شامل ہوں اور انجوائے کر رہی ہوں۔'' میگی نے جواب دیا۔

''یہاں...... اکیلے؟''

''میں اکیلی نہیں ہوں۔ شادی شدہ ہوں۔ تم نے دیکھا ہے میرے شوہر کو؟''

''مجھے کیا ضرورت ہے اسے دیکھنے کی۔'' موکسی نے کہا۔ ''ویسے بھی وہ سمندر کا باسی ہے۔''

''مرچنٹ میرین میں ہے تو سمندر سے واسطہ رہے گا۔'' میگی نے کہا۔

''خیر چھوڑو، چلیں کیا؟'' موکسی نے بے تابی کا اظہار کیا۔

''اور میرا شوہر؟''

''تم ہی نے بتایا تھا کہ وہ چھ مہینے سے ڈیوٹی پر گیا ہوا ہے۔''

''وہ واپس آ چکا ہے۔ کیا تم موسیقی سے لطف اندوز نہیں ہو سکتے؟'' میگی نے پیانو پلیئر کی جانب دیکھا۔ موکسی نے بھی ایک نظر ڈالی...... فنکار سابقہ حالت میں مگن تھا۔ وہ کسی کو نہیں دیکھ رہا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ سروں کے سمندر میں ڈوبا ہوا ہے......

''یہ وقت موسیقی سے لطف اندوز ہونے کے لیے نہیں ہے۔ آؤ چلتے ہیں۔'' اس نے کہا۔

''میرے شوہر کو یہ پسند نہیں ہے۔''

''اسے پتا ہی نہیں چلے گا۔ نہ وہ تمہیں دیکھ پائے گا، نہ تم سے بات چیت کر سکے گا۔''

''اس کے باوجود اس کے پاس ایک طریقہ ہے مجھ سے رابطہ کرنے کا۔'' میگی مسکرائی۔

موکسی نے گھور کر دیکھا۔ ''کیا تمہیں نشہ چڑھ رہا ہے؟ کیا وہ جادوگر ہے؟''

''ہاں اپنے کام کا جادوگر۔ وہ بڑا فنکار ہے۔''

اس سے پیشتر کہ موکسی کوئی تبصرہ کرتا، بار ہاؤس کا دروازہ کھلا۔ دو آدمی اندر آئے۔ دونوں نے اچٹتی ہوئی نگاہ موکسی پر ڈالی اور بوتھ نما چھوٹے سے کمرے میں بیٹھ گئے۔ یہاں روشنی کم تھی۔ وہ کمرا بالکل پیانو پلیئر کے عقب میں تھا۔ سروں کا کھلاڑی حسبِ سابق ہر چیز سے لاتعلق لگ رہا تھا۔

میگی اسٹول سے اٹھی۔ وہ شاید دو نئے گاہکوں کی طرف جانے کا ارادہ رکھتی تھی۔ گھڑی ایک بجا کر آگے بڑھ گئی تھی۔

''بیٹھو ہنی...... ایک اور بیئر ہو جائے۔'' موکسی نے بے تکلفی کا مظاہرہ کیا۔

میگی نے اعتراض نہیں کیا۔ ''وہ اب تک موکسی کو ایک گاہک کی طرح ڈیل کر رہی تھی۔ اسی لیے اس نے اب تک اس کی کسی پیشکش کا کھلا منفی ردعمل نہیں دیا تھا۔

پیٹ نے دو جام اور تیار کر دیے۔

''تم میرے ساتھ چل رہی ہو اور تم بھی یہ بات جانتی ہو۔'' موکسی نے کہا۔ ''وہ کیسا شوہر ہے... جس نے تمہیں یہاں فضول جگہ پر کام کرنے کے لیے چھوڑا ہوا ہے؟''

دفعتاً پیانو کی دھن تبدیل ہو گئی۔ میگی کے علاوہ کسی نے خاص توجہ نہیں دی۔ وہ بظاہر موکسی سے باتیں کر رہی تھی لیکن اس کے کان بدلے ہوئے سروں پر لگے تھے۔

''ٹھیک ہے۔'' میگی کھڑی ہو گئی۔ ''شاید تم فیصلہ کر کے آئے ہو لیکن مجھے ایک فون کرنا پڑے گا۔''

''گڈ'' موکسی نے چٹکی بجائی۔ ''مگر اسے یہ نہ بتانا کہ تم بار بند ہونے کے بعد کہاں گئی تھیں۔''

''کیا یہ سمجھانے کی ضرورت ہے؟'' میگی اٹھلائی۔

''او کے۔ سوری بے بی۔''

میگی بار کے عقبی دروازے میں غائب ہو گئی۔ موکسی نے گھڑی کی جانب دیکھا۔ پونے دو ہو رہے تھے۔ دو بجے بار بند ہو جانا تھا۔ پھر اس نے بے چینی سے چھوٹے کمرے کی جانب دیکھا جہاں دو گاہک موجود تھے۔ بار تقریباً خالی ہو چکا تھا۔

موکسی نے عقبی دروازے کو دیکھا۔ اس کی توقع کے مطابق میگی نے زیادہ دیر نہیں لگائی تھی۔ وہ واپس آ کر پھر اسٹول پر بیٹھ گئی۔

''پیٹ بار بند کرنے والا ہے، تم چلو۔'' میگی نے کہا۔

''میں تمہاری خاطر انتظار کر لوں گا۔''

آخری گاہک بھی رخصت ہو چکا تھا۔ دو بجنے والے تھے۔

میگی نے پیانو پلیئر کے عقب والے نیم تاریک کمرے کی جانب سرسری نظر ڈال کر ہٹالی۔

بار کی آمدنی پیٹ کے پاس چرمی تھیلے میں تھی... جو کیش رجسٹر کے پاس رکھا تھا۔ وہ اسے سیف میں منتقل کرنے والا تھا۔

''بے بی! تمہیں معلوم ہے آج تم رضامند نہ ہوتیں تو میں تمہیں زبردستی لے جاتا۔'' موکسی نے کہا۔

''کیا واقعی؟'' میگی مسکرائی۔
''شیور۔''
پیٹ اس وقت کھڑکیوں کے ... بلائنڈز سیدھے کر رہا تھا۔
''او کے۔'' موکسی نے بلند آواز میں کہا۔
پیانو پلیئر کھڑا ہو چکا تھا۔ اس کے کھڑے ہوتے ہی عقبی کمرے سے دونوں افراد باہر آگئے۔ فنکار نے اپنے ہاتھ اوپر اٹھا دیے۔ ان دونوں کے ہاتھوں میں پسٹل تھے۔
حیرت انگیز طور پر اس نے اب بھی پلٹ کر نہیں دیکھا تھا...... ممکن ہے ان دونوں میں سے کسی نے دھمکی آمیز سرگوشی کی ہو۔ پیانو سے نکلنے والے سُر خاموش تھے۔
موکسی کے ہاتھ میں بھی گن نظر آ رہی تھی۔
''او کے، بے بی...... اب ہم دونوں ساتھ نکلیں گے۔'' موکسی نے کہا۔
''میں تو چل رہی تھی۔ گن کی کیا ضرورت ہے...... کیا قتل کرو گے؟''
''قتل تو تم مجھے کر چکی ہو۔''
''وہ دونوں کون ہیں؟'' میگی نے معصومیت سے سوال کیا۔
موکسی نے جواب نہیں دیا۔ پیٹ نے بھی ہاتھ اوپر کر دیے تھے۔ کیونکہ موکسی کی گن کا رخ میگی کی طرف نہیں، پیٹ کی جانب تھا۔ پیٹ سمجھ گیا تھا کہ کیا ہونے والا ہے۔ تاہم اسے میگی کی بے فکری سمجھ نہیں آ رہی تھی......
میگی اب بھی اسٹول پر بیٹھی تھی۔
''چلو اٹھو، وہ بیگ بھی اٹھا لو۔'' میگی نے گویا حکم جاری کیا۔
''اچھا تو یہ پروگرام تھا۔'' میگی نے تبصرہ کیا۔
''چلو جلدی کرو۔''
''ایک جام اور نہ ہو جائے؟'' میگی نے ادائے دلبری سے کہا۔
پیٹ کو شک ہوا کہ میگی ان تینوں کے ساتھ مل گئی ہے۔ اس نے پیانو پلیئر کی جانب دیکھا۔ دونوں لٹیروں میں سے ایک موکسی کی جانب آیا۔
''کیوں وقت ضائع کر رہے ہو؟'' وہ بولا۔
میگی کا سر نفی میں ہل رہا تھا۔ موکسی نے بے قراری محسوس کی۔
''میرے ساتھ نہیں گئیں تو کہیں بھی جانے کے قابل نہیں رہو گی۔'' موکسی غرایا۔

اسی وقت بھڑا مار کر پولیس اہلکار اندر گھسے۔ پیانو پلیئر زمین پر لیٹا تھا۔ اس کے ہاتھ میں گن تھی، جس کا رخ موکسی کی جانب تھا۔ تینوں لٹیرے سکتہ زدہ رہ گئے۔
تینوں کچھ کرنے سے پیشتر ہی قابو میں آ چکے تھے......
پیانو پلیئر میگی کے پاس کھڑا تھا۔ پولیس اہلکار موکسی اور اس کے ساتھیوں کو نہتا کر کے ہتھکڑیاں پہنا رہے تھے۔
پیٹ حیرت زدہ رہ گیا تھا۔
''میرے شوہر سے ملو۔'' میگی نے پیانو پلیئر کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالا۔ ''جیرالڈ... یہ موکسی ہے۔ دلچسپ بندہ ہے۔''

☆☆☆

پیانو پلیئر، پیٹ کے سوالات کے جواب دے رہا تھا۔ ''ان دونوں نے اندر آتے ہی مجھے کور کر لیا تھا۔ آخر تک ہتھیار ان کے ہاتھ میں تھے۔ وہ دونوں کمرے میں تھے۔ بار کاؤنٹر کی جانب سے دیکھے نہیں جا سکتے تھے۔''
''لیکن تم تو ادھر ادھر دیکھ ہی نہیں رہے تھے؟''
''میرے سُر دیکھ رہے تھے، وہ مجھ سے باتیں کرتے ہیں اور میری بیوی سے بھی۔'' جیرالڈ نے قہقہہ لگایا۔
پیٹ نے غیر یقینی نظروں سے جیرالڈ کو دیکھا۔
''پیانو کے سامنے ایک چھوٹا ڈیلے کاؤنٹر ہے جہاں بوتلیں سجی ہیں۔ پیانو پر میری جگہ بیٹھ کر دیکھو گے تو کافی کچھ سمجھ جاؤ گے...... ویسے یہ بات صحیح ہے کہ میرے سُر بولتے ہیں۔'' جیرالڈ نے بات ختم کی۔
''ان دونوں کے آنے کے بعد جیرالڈ نے دھن بدل دی تھی۔ میں چونک اٹھی کیونکہ وہ کوئی دھن نہیں تھی۔ ہاں سُر ضرور بلند ہو رہے تھے۔ جو کہہ رہے تھے کہ مجھے فوری طور پر پولیس کو بلانا چاہیے۔ کوئی بھی نہیں سمجھ سکا اور میں فون کر آئی۔''
موکسی کا چہرہ پتھرایا ہوا تھا۔
''چلیں ہنی۔'' میگی نے جیرالڈ کے گلے میں ہاتھ ڈالا۔ پیانو پلیئر نے سر گھما کر میگی کو دیکھا۔ اس کی آنکھیں بے تاثر تھیں، تاہم اس کے لبوں پر پُرمسرت مسکراہٹ تھی۔
وہ میگی کو پیانو کے قریب لے آیا۔ ایک انگلی سے اس نے تین کیز کو دبایا۔ تین سُر بلند ہوئے۔
''سمجھ میں آیا؟'' وہ بولا۔
میگی کا چہرہ تر و تازہ ہو گیا۔ ''میں یہ کیسے بھول سکتی ہوں؟'' اس نے کہا۔ اس کا مطلب ہے:
I-Love-You

بے بنیاد

مرزا امجد بیگ

تعلق کوئی بھی ہو وفا اور اعتبار... انسان کا مان بڑھا بھی دیتے ہیں اور کبھی کسی کی جان سے کھیل بھی جاتے ہیں، جبکہ اس کا انحصار انسان کی نیّت پر ہوتا ہے۔ اگرچہ ان کا تعلق بھی واجبی سا تھا مگر تاڑنے والے تو قیامت کی نگاہ رکھتے تھے اور جنہیں قیامت برپا کرنے اور نگاہوں کے استعمال میں کمال بھی حاصل ہو تو وہ لوگ وقت کا انتظار نہیں کرتے۔ یہاں تو موقع بھی، دستور بھی سب کچھ تو ان کی توقع کے عین مطابق تھا لہٰذا بے دھڑک ہلا بول دیا گیا لیکن... ہائے ری بے خبری... بھول گئے تھے کہ خدا کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے جو جسم پر کوئی نشان نہیں چھوڑتی، البتہ روح پر اتنے گہرے گھاؤ ڈالتی ہے کہ انسان ان کے بھرنے کا انتظار کرتے کرتے قبر میں اتر جاتا ہے... مرزا امجد بیگ اگرچہ نہ تو لاٹھی تھے اور نہ گھاؤ مگر اصل مجرم کو بے نقاب کرکے لاٹھی اور گھاؤ کا آپس میں تعلق گہرا کرانے کا ذریعہ ضرور بن گئے تھے۔ دلچسپ مدلل ثبوت حاضرینِ عدالت کے لیے حیرت کا باعث تھے۔

ذرا سی بے پروائی اور اندھے اعتماد میں جان سے گزر جانے والی ایک عورت کا انجام

عام طور پر یہی دیکھنے میں آیا ہے کہ جب پولیس کسی شخص کو ملزم نامزد کردیتی ہے تو دنیا والوں کی نظر میں وہ قابلِ مذمت ہو جاتا ہے لیکن اصولی طور پر لوگوں کا یہ عمومی رویہ درست نہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ اگر پولیس والوں کی نگاہ میں کوئی ملزم ہے تو وہ مجرم بھی ثابت ہو جائے۔ اس سلسلے میں کوئی فارمولا نہیں بنایا جاسکتا۔ کسی بھی ملزم کے مجرم ہونے یا بے گناہ ہونے کا فیصلہ متعلقہ عدالت کرتی ہے اور عدالت یہ فیصلہ حالات و واقعات کی روشنی اور دونوں جانب سے فراہم کردہ ثبوتوں کی جانچ پڑتال کے بعد کرتی ہے۔ وکیلِ استغاثہ اور وکیلِ صفائی اپنے اپنے جوہر دکھانے کے لیے آزاد ہوتے ہیں۔

آج میں آپ کی خدمت میں جس کیس کی روداد پیش کررہا ہوں، اس میں میرا کردار وکیلِ صفائی کا تھا۔ میرے مؤکل پر ایک خوب صورت عورت کو قتل کرنے کا الزام تھا یعنی وہ اس کیس میں ملزم تھا۔ اس کیس کو عدالت میں لگے ہوئے تین ماہ سے زیادہ کا عرصہ ہوگیا تھا مگر آج پہلی باقاعدہ سماعت تھی۔ اس کیس سے متعلق تمام افراد عدالت کے کمرے میں موجود تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں کارروائی شروع ہوگئی۔

جج نے حاضرینِ عدالت پر ایک بھرپور نظر ڈالی اور اثبات میں گردن ہلانے کے بعد کارروائی کا آغاز کردیا۔ اصول کے مطابق جج نے فردِ جرم پڑھ کر سنائی۔ میرے مؤکل نے صحت جرم سے صاف انکار کردیا۔

اس کے بعد میرے مؤکل یعنی اس کیس کے ملزم کا حلفیہ بیان ریکارڈ کیا گیا اور باقاعدہ جرح کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ وکیلِ استغاثہ جج کی اجازت حاصل کرکے اکیوزڈ باکس کے قریب پہنچا پھر میرے مؤکل اور اس کیس کے ملزم کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے سخت لہجے میں سوال کیا۔

''کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تم ٹیپو سلطان کے کیا لگتے ہو؟''

یہ ایک عجیب و غریب اور غیر متوقع سوال تھا۔ ملزم چند لمحات کے لیے گڑبڑا گیا پھر سنبھلتے ہوئے بولا۔ ''میں نے ٹیپو سلطان کا نام ہی سنا ہے یا...... یہ جانتا ہوں کہ...... ٹیپو، حیدر علی کا بیٹا تھا۔''

''یعنی تمہاری ان سے کوئی رشتے داری نہیں ہے......؟''

''بالکل نہیں!'' ملزم نے پوری قطعیت سے جواب دیا۔
جج سمیت حاضرین عدالت وکیلِ استغاثہ کی اس غیر منطقی اور غیر متعلق جرح پر حیرت بھری نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے لیکن میں پوری طرح مطمئن تھا کیونکہ میں جانتا تھا، جرح کا یہ انداز وکیل استغاثہ کا کوئی اسٹنٹ ہوسکتا ہے۔ میں بھی بعض اوقات گواہوں کو کنفیوز کر کے ان کی زبان کھلوانے کے لیے اسی نوعیت کے ہتھکنڈے استعمال کیا کرتا تھا۔ وکیل استغاثہ جلد ہی کھل گیا۔ وہ طنزیہ لہجے میں مستفسر ہوا۔
''جب تمہارا ٹیپو سلطان سے کوئی تعلق یا رشتے داری نہیں تو پھر تم کس خوشی میں خود کو ''ٹیپو'' کہلاتے ہو؟''
''اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔'' ملزم نے کمال سادگی سے جواب دیا۔ ''میرا نام تو عارف ہے۔ بچپن میں ہم سب دوست مل کر مختلف کھیل، کھیلا کرتے تھے جن میں ڈراما بھی شامل تھا۔ جب ہم ''ٹیپو سلطان'' والا ڈراما کرتے تھے تو اس میں ٹیپو کا کردار میں کیا کرتا تھا۔ بس، جبھی سے میں ''ٹیپو'' مشہور ہوگیا۔ لوگ میرا اصلی نام بھول گئے اور ''ٹیپو، ٹیپو'' کہنے لگے اور آج تک ایسا ہی ہے۔''
ملزم نے اتنی وضاحت کے ساتھ جواب دیا تھا کہ وکیلِ استغاثہ کو اب اس موضوع پر ایک لفظ کہنے کی ضرورت نہیں محسوس ہونا چاہیے تھی اور یہ موضوع ویسے بھی زیرِ ساعت کیس سے کوئی تعلق نہیں رکھتا تھا لیکن وہ وکیل استغاثہ ہی کیا جو ملزم کی جان بخش دے۔ وہ عجیب سی نظر سے ملزم کو دیکھتے ہوئے معنی خیز لہجے میں بولا۔
''اچھا تو تم ایکٹر بھی ہو...... اب یہ نہیں کہہ دینا کہ تم نے وہ قتل بھی ایکٹنگ ہی میں کیا تھا۔''
''میں نے کسی کو قتل نہیں کیا۔'' ملزم نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔ ''اس لیے مجھے ایسا کچھ بھی کہنے کی ضرورت نہیں۔''
''تمہاری ایکٹنگ کو تو میں بھی مان گیا ہوں۔'' وکیلِ استغاثہ نے ملزم کو گھورتے ہوئے کہا۔ ''تمہاری معصومیت اور چہرے پر سجی سادگی کو دیکھ کر کوئی تصور بھی نہیں کرسکتا کہ تم ایک قاتل ہو۔''
''آبجیکشن یور آنر......!'' میں نے جج کی جانب دیکھتے ہوئے تیز آواز میں کہا۔ ''میرے فاضل دوست کی غیر متعلق جرح کو تو برداشت کیا جاسکتا ہے مگر غیر قانونی ریمارکس کو نہیں۔''
''آپ کہنا کیا چاہ رہے ہیں وکیل صاحب؟'' جج نے سنجیدہ لہجے میں مجھ سے استفسار کیا۔

''جنابِ عالی!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں وضاحت کردی۔ ''میرے مؤکل پر عائد کردہ الزام ابھی ثابت نہیں ہوا چنانچہ اسے مجرم قرار دینا بھی انصاف کے اصولوں کے منافی ہے، چہ جائیکہ اسے ''قاتل'' کہہ کر مخاطب کیا جائے اور وہ بھی...... عدالت میں، ایک سمجھ دار اور بردبار منصف کے روبرو......''
میرے اعتراض میں وزن تھا اور وہ قانونی اعتبار سے خاصا طاقت ور بھی تھا لہٰذا جج نے اسے درست تسلیم کرتے ہوئے وکیلِ استغاثہ کو ہدایت کی کہ وہ ملزم کے لیے ''قاتل یا مجرم'' کے الفاظ استعمال کیے بغیر جرح کے سلسلے کو جاری رکھے۔ وکیلِ استغاثہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے ملزم کی جانب متوجہ ہوگیا اور ایک نئے انداز سے وار کیا۔
''کیا یہ درست ہے کہ تم اپنی اداکاری سے دوسروں کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتے ہو؟''
''یہ آپ میری تعریف کررہے ہیں یا مذاق اڑا رہے ہیں......؟'' ملزم نے بڑی معصومیت سے پوچھا۔
''تم جو بھی سمجھو مگر میرے سوال کا جواب دو۔'' وکیلِ استغاثہ نے اکتاہٹ بھرے انداز میں کہا۔ پھر میرے مؤکل کو گھورنے لگا۔ اس کے گھورنے میں خفگی شامل تھی۔
''جی ہاں، یہ بالکل درست ہے۔'' ملزم نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔ ''اور یہ میں اپنے منہ میاں مٹھو والی بات نہیں کررہا۔ لوگوں کی میرے بارے میں یہی رائے ہے۔''
''لوگوں کی......'' وکیلِ استغاثہ الفاظ چباتے ہوئے بولا۔ ''خاص طور پر خوب صورت عورتوں کی...... ہیں نا؟''
''پتا نہیں...... آپ کیا کہہ رہے ہیں۔'' ملزم نے بیزاری سے کہا۔
''میں جو بھی کہہ رہا ہوں، تم اسے اچھی طرح سمجھ رہے ہو مگر چہرے کے تاثرات سے ظاہر نہیں ہونے دے رہے۔'' وکیلِ استغاثہ نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''آخر ایک اداکار ہو نا؟''
''جنابِ عالی!'' میں اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہوا اور اپنے مؤکل کی حمایت میں بولنا شروع کیا۔ ''میرے فاضل دوست ملزم کی اداکارانہ صلاحیتوں کا ذکر کر کے اسے پریشان کرنے کی کوشش تو کر ہی رہے تھے۔ اب انہوں نے اس تذکرے میں خوب صورت عورتوں کو بھی شامل کرلیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں، یہ عدالت کا قیمتی وقت برباد کرنے کے مترادف ہے۔ اس وقت اس عدالت میں ایک قتل کے کیس کی سماعت ہورہی ہے...... ملزم کی اداکاری یا اس کی اداکاری

سے متاثر ہونے والی خوب صورت عورتوں کی نہیں۔''
''آپ اس سلسلے میں کیا کہیں گے وکیل صاحب؟''
جج نے وکیل استغاثہ کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔
''یور آنر! میں نے ابھی تک ایک بھی غیر ضروری یا غیر متعلقہ بات نہیں کی۔'' وکیل استغاثہ نے گہری سنجیدگی سے جواب دیا۔ ''اداکاری، ملزم کا ایک آزمودہ ہتھیار ہے اور ملزم عموماً اس ہتھیار کو خوب صورت عورتوں پر استعمال کرتا ہے۔ زیرِ سماعت کیس میں مقتولہ اسی ہتھیار کا شکار ہو کر موت کے منہ میں چلی گئی ہے۔''
''وکیل صاحب!......'' جج گہری دلچسپی لیتے ہوئے بولا۔ ''آپ اپنے اس دعوے کی وضاحت کریں جو آپ نے ابھی ملزم کے حوالے سے کیا ہے۔''
''جنابِ عالی!'' وکیل استغاثہ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولنا شروع کیا۔ ''ملزم ایک ہینڈسم اور اسمارٹ شخص ہے اور اوپر سے بلا کا اداکار بھی۔ میں نے اس کی ذات کے حوالے سے ابھی جو دعویٰ کیا ہے اسے سمجھنے کے لیے عورتوں کی مخصوص نفسیات کا جائزہ لینا بہت ضروری ہے۔ عورتیں فطری طور پر ایسے مردوں کو زیادہ پسند کرتی ہیں جو وجیہہ و شکیل ہونے کے ساتھ ساتھ خوش گفتار بھی ہوں۔ ملزم ان خصوصیات پر صد فیصد پورا اترتا ہے پھر اس کی اداکاری کی صلاحیت ''بونس'' میں اس کی مدد کرتی ہے لہٰذا مقتولہ کو اپنے دام میں لانے کے لیے اسے زیادہ محنت نہیں کرنا پڑی ہوگی۔''
''یور آنر......!'' میں نے اپنے مؤکل کا دفاع کرتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''میرے فاضل دوست نے عورتوں کی نفسیات کے حوالے سے ابھی معزز عدالت کے سامنے جو فلسفہ بیان کیا ہے، اسے فارمولا سمجھ کر ہر عورت پر اپلائی نہیں کیا جاسکتا......''
''میں نے بھی فارمولے کی بات نہیں کی۔'' وکیل استغاثہ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا۔ ''یہ عورتوں کی عمومی نفسیات کا ذکر تھا۔''
جج کی دلچسپی ہر گزرتے لمحے کے ساتھ بڑھتی جارہی تھی۔ اس نے وکیل استغاثہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''وکیل صاحب! آپ نے ابھی ملزم کی جن خصوصیات کا حوالہ دے کر مقتولہ یعنی عورتوں کی عمومی نفسیات کو جس انداز میں بیان کیا ہے اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ مقتولہ اور ملزم کے بیچ کوئی معاملہ چل رہا تھا......؟''
''جی ہاں......'' اس نے بڑے اعتماد سے سر کو اثباتی جنبش دی۔ ''ایسی ہی بات تھی جنابِ عالی!
''یہ سراسر زیادتی ہے یور آنر۔'' میں نے احتجاجی انداز میں کہا۔ ''میرے فاضل دوست ملزم پر ایک سنگین الزام عائد کرنے کے علاوہ ..... مقتولہ کی بھی کردار کشی کرنے کی کوشش کر رہے ہیں حالانکہ یہ مقتولہ کی وکالت کے لیے ہی عدالت میں آئے ہیں۔''
''جو حقیقت ہے، میں نے وہی بیان کی ہے۔'' وہ ٹھوس لہجے میں بولا۔ ''اس سے ملزم کی چالاکی اور عیاری کا بھی پتا چلتا ہے کہ وہ کس طرح مقتولہ کو اپنی محبت کے جال میں پھنسا کر اس سے رقم بٹور رہا تھا۔''
''یہ رقم بٹورنے کا کیا چکر ہے وکیل صاحب؟'' جج نے وکیل استغاثہ سے پوچھا۔ ''اس کے ساتھ ہی اس معاملے کی بھی وضاحت کریں جو آپ کے بقول مقتولہ اور ملزم کے بیچ چل رہا تھا؟''
''جنابِ عالی!'' وکیل استغاثہ نے کھنکھار کر گلا صاف کیا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتانے لگا۔ ''جیسا کہ میں نے عرض کیا، ملزم نے اپنی وجاہت اور اسمارٹ نیس کا ہتھیار استعمال کرتے ہوئے مقتولہ کو بڑی مہارت کے ساتھ شیشے میں اتار لیا تھا۔ مقتولہ اپنے فلیٹ میں اکیلی رہتی تھی۔ اس کا شوہر روزگار کے سلسلے میں بیرونِ ملک گیا ہوا تھا لہٰذا مقتولہ کو دام میں لانے کے لیے ملزم کو زیادہ محنت نہیں کرنا پڑی تھی۔ یہ ویسے بھی اداکاری کا ماہر ہے اور خوب صورت جملے بول کر خواتین کا دل جیتنے میں بھی اسے خاصا تجربہ حاصل ہے۔ اس بات میں کسی شک و شبے کی گنجائش نہیں کہ ملزم نے مقتولہ کو پوری طرح اپنی مٹھی میں کر رکھا تھا اور......''
''جب ملزم اور مقتولہ کے درمیان پیار و محبت کا کوئی معاملہ چل رہا تھا تو پھر ملزم، مقتولہ کی جان سے کیسے کھیل سکتا ہے؟'' میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے خاصے چبھتے ہوئے لہجے میں سوال کیا تو جج اثبات میں گردن ہلا کر وکیل استغاثہ سے مستفسر ہوا۔
''وکیلِ صفائی کی بات میں وزن ہے۔ آپ اس نکتے کی وضاحت کریں وکیل صاحب؟''
''جناب! میں اسی طرف آرہا تھا لیکن میرے فاضل دوست نے بیچ میں ٹانگ اڑا کر مجھے روک دیا۔'' وہ خفگی آمیز انداز میں مجھے گھورنے کے بعد دوبارہ جج کی جانب متوجہ ہوگیا۔ ''اگر مجھے اپنی بات پوری کرنے کا موقع دیا جائے تو سب کچھ کھل کر سامنے آجائے گا۔''
''ٹھیک ہے وکیل صاحب! آپ اپنا بیان مکمل کرلیں۔'' جج نے گہری سنجیدگی سے کہا پھر میری طرف

دیکھتے ہوئے اضافہ کیا۔ ''بیگ صاحب! آپ اپنی باری پر بولیں گے۔''

''او کے یور آنر......!'' میں نے گردن کے ہلکے سے خم کے ساتھ کہا۔

''جیسا کہ میں واضح الفاظ میں بتا چکا ہوں کہ مقتولہ کے ساتھ ملزم کی محبت ایک خوب صورت ناٹک سے زیادہ کچھ نہیں تھا۔ اس ڈرامے باز کو ایسے ڈرامے کرنے میں کسی وقت کا سامنا نہیں کرنا پڑتا تھا۔ مقتولہ سمجھتی رہی کہ ملزم اس کے ساتھ سنجیدہ ہے مگر یہ تو اسے الو بنا کر گاہے بہ گاہے اس سے پیسے بٹورتا رہتا تھا۔ مقتولہ کا شوہر بیرونِ ملک سے کما کر یہاں بھیج رہا تھا لہٰذا مقتولہ کے پاس روپے پیسے کی کوئی کمی نہیں تھی۔'' وہ سانس لینے کے لیے متوقف ہوا پھر حاضرینِ عدالت پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالنے کے بعد دوبارہ جج کی جانب متوجہ ہوگیا۔

''اب جیسا کہ ڈیفنس کونسلر نے اعتراض اٹھایا ہے کہ جب ان دونوں کے بیچ محبت کا کھیل جاری تھا یا میوچل انڈر اسٹینڈنگ تھی تو پھر ملزم مقتولہ کی جان لینے کے بارے میں کیسے سوچ سکتا ہے......'' اس نے ایک بار پھر توقف کیا پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''ایک بات ذہن میں رہے کہ صرف مقتولہ ایسا سمجھ رہی تھی کہ ملزم محبت کے معاملے میں اس کے ساتھ سنجیدہ ہے جو کہ اس کی سنگین نوعیت کی غلط فہمی تھی۔ ملزم ایک خاص منصوبے کے تحت قدم قدم آگے بڑھا رہا تھا۔ گاہے بہ گاہے، پانچ سو، ہزار تو وہ مقتولہ سے لیتا ہی رہتا تھا جو اس نے کبھی واپس کرنے کی کوشش کی اور نہ ہی مقتولہ نے کبھی ایسا کوئی مطالبہ کیا۔ وہ اسی بات پر خوش تھی، کوئی سچی محبت کرنے والا اسے مل گیا ہے لہٰذا اس نے کبھی پانچ سو، ہزار کا حساب ہی نہیں رکھا۔ خرابی اس وقت پیدا ہوئی جب ملزم نے مقتولہ سے ایک ساتھ پچاس ہزار روپے مانگ لیے۔ مقتولہ نے اتنی بڑی رقم دینے سے انکار کر دیا تو ملزم کا موڈ خراب ہوگیا چنانچہ یہ کئی روز تک اس سے ملنے بھی نہیں گیا۔ یہ اس طرح اپنی ناراضگی کا اظہار کر رہا تھا۔ بہرحال، چند روز کے بعد ان میں دوبارہ میل جول شروع ہوگیا۔ اس موقعے پر مقتولہ ہی نے ملزم سے رابطہ کیا تھا۔ وہ قدم قدم پر اس سے مشورہ کرنے کی عادی ہو چکی تھی۔ ملزم نے مقتولہ کو دوبارہ جوائن تو کرلیا لیکن اپنے رویے سے خفگی کا اظہار بھی جاری رکھا۔ وقت اپنی مخصوص رفتار کے ساتھ آگے بڑھتا رہا اور سترہ اگست کا دن آگیا یعنی وقوعہ کا دن...... جب ملزم نے مقتولہ کو موت کے گھاٹ اتار دیا کیونکہ......'' ڈرامائی انداز اختیار کرتے ہوئے اس نے لمحاتی توقف کیا پھر اپنی بات مکمل کردی۔

''کیونکہ مقتولہ نے ملزم کو چوری کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا تھا۔''

''چوری......؟'' بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

''وکیل صاحب! آپ کس چوری کی بات کر رہے ہیں؟'' جج نے بھویں سکیڑتے ہوئے پوچھا۔ ''استغاثہ میں تو ایسی کسی چوری کا ذکر نہیں ہے؟''

''دراصل...... ملزم چوری کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکا تھا۔'' وکیلِ استغاثہ نے لنگڑی وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''مقتولہ نے اسے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا تھا لہٰذا ملزم نے اسے موت کے گھاٹ اتارا اور جائے وقوعہ سے فرار ہوگیا...... دیٹس آل یور آنر۔''

''دیٹس آل یور آنر'' کے الفاظ کا مطلب یہی تھا کہ وکیل استغاثہ کو مزید کچھ نہیں کہنا لہٰذا میں اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہوا اور براہِ راست وکیلِ مخالف کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''کیا آپ معزز عدالت کے روبرو یہ ثابت کرسکتے ہیں کہ وقوعہ کے روز ملزم، مقتولہ سے ملنے اس کے فلیٹ پر گیا تھا اور یہ کہ ملزم ہی نے مقتولہ کا خون کیا ہے۔ آپ کو یہ بھی بتانا ہوگا کہ ملزم مبینہ چوری کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑا گیا تھا۔ اس ''راز'' کا آپ کو کیسے پتا چلا جبکہ اس فلیٹ میں رہنے والا فردِ واحد یعنی مقتولہ تو اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھی تھی......؟''

''جی ہاں۔ میں یہ سب ثابت کرسکتا ہوں۔'' وہ بڑے اعتماد سے بولا۔ ''بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ ہی ثابت کرسکتا ہوں۔''

''زیادہ کیا......؟'' میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

''مثلاً یہ کہ......'' وہ بڑے اسٹائل سے بتانے لگا۔ ''یہ کہ ملزم، مقتولہ کو محبت کے نام پر کس طرح فریب دے رہا تھا۔ اس نے مقتولہ سے مبلغ پچاس ہزار روپے کس مقصد سے حاصل کرنا چاہے تھے، وہ اس رقم کا کیا کرنا چاہ رہا تھا۔ وغیرہ وغیرہ......''

''بس تو پھر بسم اللہ کریں۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''بتانا شروع کریں۔''

''جنابِ عالی!'' وہ روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے بولا۔ ''جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے، ملزم نے بڑی عیاری اور ہوشیاری سے مقتولہ کو یہ یقین دلا دیا تھا کہ وہ اس

سے سچی محبت کرتا ہے۔ مقتولہ، ملزم کی چھوٹی موٹی فرمائشیں پوری کرتی رہتی تھی مثلاً جب بھی ملزم کو پانچ سو، ہزار روپے کی ضرورت ہوتی، وہ اسے دے دیا کرتی تھی لیکن یہ پانچ سو، ہزار ملزم کی منزل نہیں تھے۔ وہ کوئی لمبا ہاتھ مارنے کے چکر میں تھا چنانچہ ایک مناسب موقع دیکھ کر اس نے مقتولہ سے پچاس ہزار روپے مانگ لیے۔ وہ جانتا تھا کہ مقتولہ کے اکاؤنٹ میں اس سے زیادہ رقم موجود ہے۔ مقتولہ کا شوہر دیارِ غیر میں محنت مشقت کرکے جو دولت کما رہا تھا، اس کا بڑا حصہ وہ پاکستان یعنی اپنی بیوی کو بھیج دیا کرتا تھا جو وہ اپنے ذاتی اکاؤنٹ میں جمع کرا دیا کرتی تھی لیکن پتا نہیں، اس روز مقتولہ کے جی میں کیا آئی کہ اس نے ملزم کو رقم دینے سے صاف انکار کر دیا۔ اس پر ملزم نے ایک داؤ کھیلا اور مقتولہ سے کہا کہ وہ یہ رقم بہ طور قرض اس سے مانگ رہا ہے جو دو تین ماہ کے بعد وہ اسے لوٹا دے گا لیکن مقتولہ نے اس کی بات نہ مانی اور ملزم اس سے روٹھ گیا۔ ان امور کی تصدیق کے لیے ملزم اس وقت عدالت میں موجود ہے۔ اس سے پوچھا جاسکتا ہے......''

وکیل استغاثہ یہاں تک بولنے کے بعد خاموش ہوگیا اور پُرمعنی انداز میں جج کی طرف دیکھنے لگا۔ جج اس کے مقصد کی تہ میں پہنچ گیا اور اس نے براہِ راست ملزم سے سوال کیا۔

''مقتولہ کی موت سے چند روز پہلے تم نے اس سے پچاس ہزار روپے مانگے تھے؟''

''یس سر!'' ملزم نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

''اور اس نے تمہیں یہ رقم دینے سے انکار کر دیا تھا؟'' جج نے پوچھا۔

''جی سر!'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''اور اس بات کا اسے پورا حق تھا۔ رقم اس کی تھی۔ اس کی مرضی، وہ مجھے دیتی یا نہ دیتی......''

''تم نے مقتولہ سے یہ بھی کہا تھا کہ وہ دو تین ماہ کے لیے تمہیں پچاس ہزار روپے قرض ہی دے دے؟''

''جی ہاں۔ میں نے یہ کہا تھا۔'' اس نے بڑی سادگی سے جواب دیا۔

''اور...... کیا یہ بھی درست ہے کہ جب مقتولہ نے رقم دینے سے صاف انکار کر دیا تو تم اس سے ناراض ہوگئے تھے؟'' جج نے ملزم کو گھورتے ہوئے پوچھا۔ ''چند روز تک خفا رہنے کے بعد تم دونوں میں دوبارہ رسم و راہ شروع ہوگئی تھی؟''

''جی سر...... ایسا ہی ہوا تھا۔'' ملزم نے بڑے تحمل سے جواب دیا۔

جج مطمئن انداز میں وکیل استغاثہ کی طرف دیکھنے لگا۔ وکیل استغاثہ نے روئے سخن جج کی جانب پھیرتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''جنابِ عالی! آپ نے ملزم کی کامیاب اداکاری ملاحظہ فرمائی۔ اس نے کتنی شرافت سے ہر بات قبول کر لی ہے اور اگر یہ کسی بات سے انکار کرتا تو میں زندہ ثبوت عدالت میں پیش کر دیتا۔''

جج نے وکیل استغاثہ کے دعوے پر کوئی ریمارکس نہ دیے اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں مستفسر ہوا۔ ''آپ کی وضاحت مکمل ہوگئی وکیل صاحب؟''

''نہیں جناب......!'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میرے فاضل دوست نے جتنے سوالات کیے تھے ان میں سے بہت سوں کے جواب ابھی باقی ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔'' جج نے کرسیِ انصاف کی پشت گاہ سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔ ''آپ اپنا بیان جاری رکھیں۔''

''تو جنابِ عالی......'' وکیل استغاثہ نے جوابات کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے بولنا شروع کیا۔ ''ملزم اور مقتولہ میں بول چال کا سلسلہ بحال ہوگیا تھا لیکن ملزم اب بھی اپنے رویے سے مقتولہ کو یہ باور کرانے کی کوشش میں رہتا تھا کہ وہ اس سے ناراض ہے۔ دراصل، وہ موقع کی تلاش میں تھا اور یہ سنہری موقع اسے سترہ اگست کو مل گیا۔''

وکیل استغاثہ نے ڈرامائی انداز میں بیان ادھورا چھوڑ کر حاضرین عدالت پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی پھر مجھے معاندانہ نظر سے دیکھنے کے بعد دوبارہ گویا ہوا۔

''سترہ اگست کو مقتولہ نے بینک سے پچاس ہزار روپے نکلوائے تھے۔ اسے ایک پلاٹ کی خریداری کے سلسلے میں اگلے روز یعنی اٹھارہ اگست کی صبح، اسٹیٹ ایجنٹ کے ذریعے کسی پارٹی کو پیمنٹ کرنا تھی۔ پچاس ہزار کی یہ رقم سترہ اور اٹھارہ اگست کی درمیانی رات مقتولہ کے فلیٹ پر موجود رہنا تھی اور اس بات سے ملزم اچھی طرح واقف تھا لہٰذا وہ سترہ اگست کی رات بغیر کسی کام کے مقتولہ کے فلیٹ پر پہنچ گیا۔ مقتولہ اس کے لیے چائے بنانے کی غرض سے کچن کی طرف گئی تو ملزم کو کارروائی کرنے کا موقع مل گیا۔ یہ جس مذموم عزم کی تکمیل کے لیے مقتولہ کے فلیٹ پر پہنچا تھا، اس کام کے لیے اس سے اچھا موقع اور کوئی نہیں ہوسکتا تھا۔ یہ ڈرائنگ روم سے اٹھ کر چپکے سے بیڈروم میں گھس گیا اور مقتولہ کی الماری کے ساتھ ''مصروف'' ہوگیا۔ اسے یہ بات معلوم تھی کہ مقتولہ اپنے زیورات، رقم اور دیگر قیمتی اشیا اسی

الماری میں رکھتی ہے۔ اس کی بدقسمتی کہ مقتولہ اس کی توقع سے بہت پہلے کسی کام سے بیڈروم میں آگئی اور اسے رنگے ہاتھوں چوری کرتے ہوئے پکڑ لیا......'' لحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''مقتولہ کے تو وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ ملزم ایسی گری ہوئی حرکت بھی کر سکتا ہے۔ اس دوران میں ملزم الماری کے اندر سے رقم تلاش کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ مقتولہ کے قدموں کی آہٹ سن کر وہ تیزی سے پلٹا تو مقتولہ کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ رقم والا بھورا لفافہ ملزم کے ہاتھ میں نظر آرہا تھا۔ اس کے بعد مقتولہ کی جانب سے حتی الامکان مزاحمت لازمی بات تھی۔ مقتولہ کی فطری مزاحمت پر ملزم کے شیطانی ذہن نے ایک فوری فیصلہ کیا اور اپنا راز فاش ہونے سے بچانے کے لیے اس نے مقتولہ کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاموش کر دیا......یعنی اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔''

''واہ واہ......سبحان اللہ!'' میں نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ''بہت ہی سنسنی خیز اور خوب صورت کہانی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے، میرے فاضل دوست سترہ اگست کی رات جائے وقوعہ پر بہ نفس نفیس موجود تھے اور قتل کی یہ واردات انہوں نے اپنی آنکھوں سے ہوتے دیکھی ہے جو اتنی روانی سے اس المناک واقعے کی کمنٹری کر رہے ہیں......ہیں نا؟''

''میں اس وقت جائے واردات پر موجود نہیں تھا۔'' اس نے کھا جانے والی نظر سے مجھے دیکھا اور بولا۔ ''استغاثہ کے پاس ایسی ٹھوس شہادتیں اور ایسے معتبر گواہ موجود ہیں جو ملزم کے اس کارنامے کی تصدیق کر دیں گے۔''

''ویل ڈن......!'' میں نے تپانے والے انداز میں وکیل استغاثہ کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''تو آپ یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ وقوعہ کی رات ملزم، مقتولہ کی الماری سے پچاس ہزار روپے چراتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑا گیا۔ جب مقتولہ نے اس چوری کے خلاف مزاحمت کی تو ملزم نے اسے قتل کیا اور جائے وقوعہ سے فرار ہو گیا......میں غلط تو نہیں کہہ رہا نا؟''

''جی نہیں۔ آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' وہ اسراری لہجے میں بولا۔ ''میں نے بالکل یہی کہا ہے اور اس میں کسی شک وشبے کی گنجائش بھی نہیں۔ اب آپ پوچھیں گے کہ وہ کیسے......تو میں خود ہی بتا دیتا ہوں......'' لحاتی توقف کر کے اس نے فخریہ انداز میں میری طرف دیکھا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''ایک خوب صورت عورت اپنے فلیٹ کے بیڈروم میں مردہ پائی جاتی ہے۔ آلۂ قتل اس کی لاش کے قریب پڑا ملتا ہے۔ آخری مرتبہ اس کے فلیٹ میں ملزم کو داخل ہوتے دیکھا جاتا ہے۔ آلۂ قتل پر ملزم کی انگلیوں کے واضح نشانات ملتے ہیں اور مقتولہ کی الماری میں سے پچاس ہزار روپے غائب پائے جاتے ہیں تو اس کا ایک ہی مطلب نکلتا ہے جناب کہ......ملزم، مقتولہ سے ملنے اس کے فلیٹ پر پہنچا، مقتولہ کی بے خبری کا فائدہ اٹھا کر اس نے بیڈروم والی الماری سے پچاس ہزار روپے چرائے اور رنگے ہاتھوں پکڑے جانے پر وہ مقتولہ کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد رقم لے کر مقتولہ کے فلیٹ سے نکل گیا۔''

''اور یہ کیسے پتا چلا کہ مبلغ پچاس ہزار روپے کسی بھورے لفافے میں رکھے ہوئے تھے اور مقتولہ، ملزم کو ڈرائنگ روم میں بٹھا کر اس کے لیے چائے بنانے کچن کی طرف چلی گئی تھی؟'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔ ''تھوڑی دیر پہلے آپ نے معزز عدالت کے روبرو کچھ اسی قسم کی باتیں کی ہیں۔ کی ہیں یا نہیں......؟''

''بالکل کی ہیں۔'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے مضبوط لہجے میں بولا۔ ''اور ان باتوں کو ثابت کرنے کے لیے استغاثہ کے پاس بہت سی واقعاتی شہادتیں اور دیگر گواہ موجود ہیں، جنہیں مناسب وقت آنے پر عدالت میں پیش کیا جائے گا۔''

''اوکے......ڈیفنس مناسب وقت کا انتظار کرے گا۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''سردست، یہ بتا دیں کہ کیا پولیس ملزم سے پچاس ہزار روپے بازیاب کرانے میں کامیاب رہی تھی؟''

''مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ پولیس کو اس مقصد میں کامیابی نہیں ہو سکی۔'' وہ مایوسی سے گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''اس چالاک شخص نے گرفتاری سے پہلے رقم کو ٹھکانے لگا دیا تھا۔''

''ٹھکانے لگا دیا تھا تو کیا ہوا؟'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''پولیس کے پاس تو ایسے ایسے ہتھکنڈے ہیں کہ یہ پتھروں کو بھی بولنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ یہ ملزم بے چارہ ان تجربہ کار لوگوں کے سامنے کیا بیچتا تھا۔''

''یہ اتنا بھی بے چارہ اور معصوم نہیں جتنا شکل سے دکھائی دیتا ہے۔'' وہ ملزم کی جانب اشارہ کرتے ہوئے عجیب سے تمسخرانہ انداز میں بولا۔ ''آپ کو بھی اس کی

فنکارانہ صلاحیتوں کا اندازہ نہیں ہے۔"

میں نے اس کے ریمارکس پر کوئی تبصرہ کرنا ضروری نہ سمجھا اور گہری سنجیدگی سے سوال کیا۔ "کیا استغاثہ کے اسٹاک میں کوئی ایسا گواہ موجود ہے جس نے قتل کی یہ واردات ہوتے دیکھی ہو..... میرا اشارہ عینی شاہد کی طرف ہے؟"

وہ چند لمحوں تک مجھے گھورتا رہا پھر چہک کر بولا "اس کے لیے عینی شاہد کی کیا ضرورت ہے.......؟"

"کمال کرتے ہیں آپ بھی۔" میں نے وکیل استغاثہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے خاصے جارحانہ انداز میں کہا۔ "قتل کی ایک سنگین واردات ہوئی تھی جس کی تفصیل آپ نے کچھ ایسے انداز میں بیان کی ہے جیسے یہ آپ کا آنکھوں دیکھا حال ہو یا کسی چشم دید گواہ نے آپ کو اس بارے میں بتایا ہو......"

"آلۂ قتل پر ملزم کے فنگر پرنٹس کا پایا جانا......"

"یہ بات آپ پہلے بھی دو تین مرتبہ بتا چکے ہیں میرے محترم دوست!" اس نے بولنا شروع کیا ہی تھا کہ میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ "آپ کے پاس قتل کی اس واردات کا کوئی عینی شاہد ہے یا نہیں...... ہاں یا نہیں میں میرے سوال کا جواب دیں؟"

وہ بے بسی سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ "نہیں...... مگر واقعاتی شہادتوں سے......"

"واقعاتی شہادتوں کو بعد میں دیکھیں گے۔" میں نے ایک بار پھر اس کی بات کاٹ دی۔ "سردست، یہ بتائیں کہ آپ کو کیسے پتا چلا، ملزم اور مقتولہ کے درمیان سچا یا جھوٹا کسی بھی نوعیت کا کوئی معاملہ چل رہا تھا؟"

"استغاثہ کے پاس ایسا ایک معتبر گواہ موجود ہے جو ملزم اور مقتولہ کے باہمی عشقیہ معاملات سے پوری طرح آگاہ ہے۔" وہ فخر سے سینہ پھلاتے ہوئے بولا۔ "وقت آنے پر مذکورہ گواہ کو عدالت میں پیش کیا جائے گا۔ استغاثہ کے گواہوں کی فہرست میں اس کا نام شامل ہے۔"

اس کے ساتھ ہی عدالت کا مقررہ وقت ختم ہوگیا۔ جج نے پندرہ روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کردی۔

آگے بڑھنے سے قبل میں آپ کو اس کیس کے پس منظر سے آگاہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں تاکہ آگے آنے والی عدالتی کارروائی کے دوران میں آپ کا ذہن کسی الجھن کا شکار نہ ہو۔ ایک بات کی وضاحت کرتا چلوں کہ ان میں سے بہت سی باتیں مجھے بعد میں پتا چلی تھیں لیکن واقعات کی ترتیب کا خیال رکھتے ہوئے، میں نے انہیں ایک ترتیب میں پرو دیا ہے۔

☆☆☆

ملزم عارف ٹیپو کا تعلق ایک متوسط خاندان سے تھا اور وہ اپنی فیملی کا کفیل بھی تھا۔ اس کی فیملی میں ایک ماں، ایک باپ اور ایک چھوٹی بہن فوزیہ تھی۔ فوزیہ کی عمر تیرہ چودہ سال رہی ہوگی۔ ٹیپو کی ماں عالیہ کا زیادہ تر وقت اپنے شوہر تاج دین کی دیکھ بھال میں گزرتا تھا۔ تاج دین کو ایک سال پہلے فالج کا اٹیک ہوا تھا۔ اس خطرناک حملے میں اس کی زندگی تو بچ گئی تھی تاہم وہ بیڈ کا ہوکر رہ گیا تھا۔ اس کے جسم کا نچلا حصہ یعنی دونوں ٹانگیں بے جان ہوکر رہ گئی تھیں جن میں معمولی سی حرکت بھی ممکن نہیں تھی۔ اس کے ساتھ ہی اس کا دایاں ہاتھ یعنی بازو بھی اس اٹیک سے بری طرح متاثر ہوکر کسی کام کا نہیں رہا تھا۔ اس حادثے سے قبل تاج دین ایک فیکٹری میں کام کرتا تھا اور گھر کا خرچ چلانا اسی کی ذمے داری تھی، ان کی رہائش خداداد کالونی میں تھی۔

ٹیپو تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ ٹیوشنز وغیرہ کرکے گھر کے معاشی معاملات میں تھوڑا بہت حصہ ملا دیا کرتا تھا۔ وہ معاشرے کے جس طبقے سے تعلق رکھتے تھے، اس لحاظ سے ان کی اچھی گزر بسر ہو رہی تھی لیکن تاج دین کے مفلوج ہوجانے سے گھر کا سارا انتظام درہم برہم ہوکر رہ گیا تھا۔ ظاہر ہے، تاج دین کی نوکری چھوٹنے سے آمدنی کا سلسلہ رک گیا تھا۔ وہ کسی ایسی فیکٹری میں بھی کام نہیں کرتا تھا کہ اس نوعیت کے حادثے کی صورت میں فیکٹری اس کے ساتھ کسی قسم کا مالی تعاون کرتی اور نہ ہی وہاں فنڈز وغیرہ کا کوئی سسٹم تھا چنانچہ ٹیپو کو میدان میں اترنا پڑا۔

جب تاج دین کو فالج کا اٹیک ہوا، ٹیپو گریجویشن کے فائنل ایئر میں تھا۔ اس نے فوری طور پر کوشش کرکے ایک کوریئر کمپنی میں "رائیڈر" کی جاب پکڑلی۔ اس کمپنی کا نام "فلائنگ ہارس کوریئرز" تھا۔ رائیڈر کی نوکری دیکھنے میں آسان مگر جسم و جاں کو بری طرح تھکا دینے والی ہوتی ہے۔ صبح وہ کمپنی کے آفس پہنچتا، وہاں سے ڈاک (مختلف لیٹرز اور دیگر پارسلز وغیرہ) اٹھاتا اور بائیک پر شہرنوردی شروع کردیتا۔

اس ٹف جاب کی وجہ سے اس کا ٹیوشنز والا کام خاصا متاثر ہوا تھا۔ پورا دن شہر کی سڑکیں ناپنے کے بعد وہ اس قدر تھک جایا کرتا تھا کہ ٹیوشن پڑھانا تو دور کی بات، وہ اپنی اسٹڈی پر بھی خاطر خواہ دھیان نہیں دے پا رہا تھا۔ بہرحال، وقت کے سامنے انسان مجبور ہوتا ہے لہٰذا وہ بھی اپنی فیملی کو چلانے کے لیے یہ مشقت طلب کام کرنے پر

مجبور ہو گیا تھا۔
مقتولہ سے اس کی علیک سلیک اسی کوریئر والی سروس کی وجہ سے ہوئی تھی۔ مقتولہ کا شوہر کویت میں رہتے ہوئے اپنی بیوی سے جو خط کتابت کرتا تھا، ان میں سے اکثر لیٹرز کوریئر سروس ہی سے آیا اور جایا کرتے تھے۔ جس علاقے میں مقتولہ کی رہائش تھی وہ ملزم کی فیلڈ کا حصہ تھا لہٰذا مقتولہ کے لیٹرز وغیرہ وہی پہنچایا کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ ان دونوں میں ذہنی ہم آہنگی پیدا ہو گئی اور وہ قریب سے قریب تر ہوتے چلے گئے لیکن یہ قربت اس نوعیت کی ہرگز نہیں تھی جیسا کہ پچھلی پیشی پر وکیل استغاثہ نے بیان فرمائی تھی۔
ان دونوں میں اچھی انڈر اسٹینڈنگ تھی اور یہ بھی سچ ہے کہ ملزم اکثر و بیشتر بغیر کسی کام کے بھی مقتولہ کے فلیٹ پر چلا جاتا تھا یا وہ کسی کام سے خود ہی اسے بلا لیا کرتی تھی اور یہ کام کسی معاملے میں مشورہ کرنے کی حد تک ہوتا تھا۔ مقتولہ اپنے اکثر معاملات میں ملزم سے صلاح مشورہ کرتی رہتی تھی اور اس کی بلڈنگ والوں کو یہ خبر تھی کہ ملزم اس سے ملنے آیا کرتا ہے۔ کبھی کوریئر لیٹر لے کر اور کبھی کسی اور بہانے۔ اپنی موت کے وقت مقتولہ طارق روڈ کے کمرشل ایریا کی ایک بلڈنگ میں رہائش پذیر تھی۔
مقتولہ کی سسرال محمود آباد میں رہتی تھی۔ ''سسرال رہتی تھی'' سے مراد ہے کہ اس کی سسرال والے محمود آباد میں آباد تھے۔ سسرال میں اس کی ساس، جیٹھ، جیٹھانی اور ان کے دو بچے شامل تھے۔ یہ گھر محمود آباد نمبر ایک میں تھا۔ ایک سال پہلے تک مقتولہ بھی اپنی سسرال کے ساتھ ہی رہتی تھی مگر مسلسل ان بن کے نتیجے میں وہ ان لوگوں سے الگ ہو گئی تھی۔ مقتولہ کی ایک گہری دوست بہادر آباد کے علاقے میں رہتی تھی۔ اسی نے مقتولہ کو طارق روڈ کے کمرشل ایریا میں دو کمرے کا ایک فلیٹ کرائے پر دلوا دیا تھا جس میں وہ اکیلی رہ رہی تھی۔ اس کی دوست کی رہائش یہاں سے واکنگ ڈسٹینس پر تھی۔ ان کی دوسرے تیسرے دن ملاقات ہو جاتی تھی۔ کبھی مقتولہ اپنی دوست کی طرف چلی جاتی اور کبھی وہ اس سے ملاقات کرنے چلی آتی تھی۔ اگر انہیں ملاقات کا موقع نہ ملتا تو فون پر بات چیت ہو جاتی تھی۔
مقتولہ کا اپنی سسرال والوں سے میل جول نہ ہونے کے برابر رہ گیا تھا۔ وہ ان سے الگ رہ کر خوش تھی۔ ان لوگوں نے بھی اس کی طرف جھانک کر بھی یہ دیکھنے کی کوشش نہیں کی تھی کہ وہ کس حال میں ہے۔ مقتولہ کو اس فلیٹ میں رہتے ہوئے لگ بھگ ایک سال ہوا تھا کہ ایک رات اسے بڑی بے دردی سے قتل کر دیا گیا تھا اور اس کے قتل کا الزام میرے مؤکل کے سر تھا۔
اگلی پیشی میں اچھا خاصا وقت تھا۔ ان پندرہ دنوں میں، میں نے اس کیس کے مختلف پہلوؤں کا اچھی طرح جائزہ لے لیا تھا۔ اس طرح مجھے آئندہ کے لیے تیاری کرنے میں بہت مدد ملی تھی۔ میں نے مفید معلومات جمع کرنے کے لیے چند اہم لوگوں سے ملاقاتیں بھی کی تھیں جن کا ذکر آگے ہے گا ہے، عدالتی کارروائی کے درمیان آپ کو پڑھنے کو ملے گا۔

☆☆☆

آئندہ پیشی پر استغاثہ کے گواہوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ گزشتہ پیشی پر وکیل استغاثہ نے واقعاتی شہادتوں اور استغاثہ کے گواہوں کے حوالے سے بڑھ چڑھ کر اچھل کود مچائی تھی۔ دیکھنا یہ تھا کہ اس کے ترکش میں کون کون سے تیر جمع تھے اور میں اپنے مؤکل کو ان تیروں سے بچانے کے لیے کس طرح دلائل کی ڈھال کا استعمال کرتا ہوں۔ استغاثہ کی جانب سے لگ بھگ آٹھ گواہوں کی فہرست عدالت میں پیش کی گئی تھی لیکن میں یہاں پر صرف انہی گواہوں کا ذکر کروں گا جن کے بیان اور شہادت میں کوئی نکتے کی بات ہو گی۔
اس سے پہلے کہ استغاثہ کی طرف سے کسی گواہ کو پیش کیا جاتا، میں نے جج سے درخواست کی۔ ''جناب عالی! اگر معزز عدالت کی اجازت ہو تو میں اس کیس کے آئی او (انکوائری آفیسر) سے چند سوالات کرنا چاہتا ہوں۔''
کسی بھی کیس کے انکوائری آفیسر کی حیثیت اس کیس میں استغاثہ کے ایک گواہ ایسی ہوتی ہے اور اسے ہر پیشی پر عدالت میں حاضر رہنا پڑتا ہے۔ جج نے میری درخواست کو منظور کرتے ہوئے آئی او کو کٹہرے میں بلا لیا۔
اس کیس کے تفتیشی افسر کا نام رضا اللہ خان تھا۔ عہدے کے اعتبار سے وہ ایک سب انسپکٹر تھا۔ وہ ایک گورا چٹا، پستہ قامت اور بھاری بھرکم جسم کا مالک شخص تھا۔ اس کی حرکات و سکنات سے یہی محسوس ہوتا تھا کہ فطری اور طبعی طور پر وہ ایک سست الوجود انسان ہو گا۔
آئی او وٹنس باکس میں آ کر کھڑا ہوا تو میں اس کے قریب چلا گیا پھر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔
''آئی او صاحب! آپ کا نام رضا اللہ خان ہے مگر آپ ''شاہ جی'' کے نام سے زیادہ مشہور ہیں۔ کیا یہ کھلا تضاد نہیں ہے......؟''

''بیگ صاحب!'' اس کے انداز سے یہی لگتا تھا کہ آج ناشتے میں اس نے صرف ایک پاؤ چھوٹی والی ہری مرچیں چبائی تھیں۔ ''آپ میری ذات پر تفتیش اور تحقیق کرنے کے بجائے زیرِ سماعت کیس تک محدود رہیں تو اس سے معزز عدالت کا قیمتی وقت برباد ہونے سے بچ جائے گا۔''

ایک سروے کے مطابق موٹے اور چھوٹے قد کے مالک انسان کو نسبتاً زیادہ غصہ آتا ہے لہٰذا آئی او جس لہجے میں بات کر رہا تھا، اس میں اس کی بدنیتی شامل نہیں تھی بلکہ وہ اپنے عظیم الشان جثے سے مجبور تھا۔ میں نے گرم توے پر ایک آدھ پراٹھے کی ٹرائی مارنے میں کوئی قباحت نہ جانی اور سادگی سے کہا۔

''اوہ...... ''ذات'' سے اچھا یاد دلایا آپ نے۔ رضا اللہ تو ٹھیک ہے۔ یعنی آپ اللہ کی رضا سے۔ اس کے ساتھ ''خان'' بھی چلے گا...... کہ یہ ''خان صاحب'' اللہ کی رضا ہیں مگر ''شاہ جی'' کہیں فٹ نہیں ہو رہا۔ بس آپ میری ایک مشکل آسان کر دیں......'' لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس لی پھر اپنے چہرے پر مصنوعی سنجیدگی طاری کرتے ہوئے پوچھا۔

''میں آپ کو کس نام سے پکاروں...... رضا اللہ، خان صاحب یا شاہ جی؟''

''جو آپ کی پسند......!'' اس نے مجھے گھورتے ہوئے مختصر جواب دیا۔

''ٹھیک ہے...... تو پھر میں عوام الناس کی سنت پر عمل کرتے ہوئے آپ کو ''شاہ جی'' ہی کہوں گا۔'' میں نے اس گول مٹول، گورے چٹے اور غصیلے پولیس آفیسر کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا اور پوچھا۔ ''آپ کو اس واقعے کی اطلاع کب ملی تھی؟''

ایک لمحہ سوچنے کے بعد اس نے جواب دیا۔ ''اٹھارہ اگست کی صبح۔''

''پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق، مقتولہ کی موت سترہ اگست کی رات نو اور دس بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔'' میں نے بہ دستور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''اس کا مطلب ہے، آپ کو وقوعہ کے دوسرے دن اس واقعے کی خبر ہوئی تھی...... اس تاخیر کا کوئی سبب......؟''

''مقتولہ اپنے فلیٹ میں اکیلی رہتی تھی۔'' میرے استفسار کے جواب میں وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''اور اس کے پاس لوگوں کا زیادہ آنا جانا بھی نہیں تھا۔ پچھلی رات ملزم اس سے ملاقات کر کے گیا تھا۔ اس کے بعد کوئی مقتولہ سے ملنے نہیں آیا تھا......'' وہ سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''اگلی صبح مقتولہ کی گھریلو ملازمہ معمول کے مطابق جب کام کرنے اس کے فلیٹ پر پہنچی تو مقتولہ کو اس کے بیڈ روم میں مردہ پایا۔''

''اوہ...... تو مقتولہ کی لاش کی دریافت کا سہرا ماسی کے سر ہے؟''

''جی...... جی ہاں، بالکل۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''نجمہ نامی وہ ماسی روزانہ صبح نو سے دس بجے تک مقتولہ کے فلیٹ پر کام کرنے آتی تھی۔ اٹھارہ اگست کی صبح بھی وہ حسبِ معمول اپنا کام کرنے آئی تھی مگر اس روز کام کرنے کی نوبت ہی نہیں آئی کیونکہ...... وہ جس کا کام کرنے وہاں آیا کرتی تھی، وہی زندہ نہیں رہی تھی۔''

''تو اس واقعے کی اطلاع آپ کو نجمہ ماسی نے دی تھی؟'' میں نے معتدل انداز میں پوچھا۔

''جی نہیں......'' وہ نفی میں گردن ہلا کر رہ گیا۔

میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ ''تو پھر......؟''

''اس واقعے کی اطلاع ہمیں جعفر علی نامی ایک شخص نے دی تھی۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''لگ بھگ ساڑھے نو بجے صبح جعفر علی نے تھانے فون کر کے ہمیں اس واقعے کے بارے میں بتایا تھا۔''

''جعفر علی......!'' میں نے زیرِ لب دہرایا۔ ''کہیں یہ وہی شخص تو نہیں جس کے توسط سے مقتولہ گلشن اقبال میں کوئی پلاٹ وغیرہ خریدنا چاہتی تھیں۔ میرا مطلب ہے...... پراپرٹی ایجنٹ جعفر علی؟''

''جی...... جی ہاں۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''آپ کا اندازہ بالکل درست ہے۔''

''مگر جعفر علی کو کیسے خبر ہوئی کہ مقتولہ کو پچھلی رات کسی نے اس کے فلیٹ میں قتل کر دیا ہے؟'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔

''جعفر علی اٹھارہ اگست کی صبح مقتولہ کے گھر گیا تھا اور نجمہ ماسی نے اسے وہاں کی صورتِ حال سے آگاہ کیا تھا۔'' اس نے جواب دیا۔ ''جعفر علی کا نام استغاثہ کے گواہوں کی فہرست میں شامل ہے۔ تفصیل وہی آپ کو بتائے گا۔''

''ٹھیک ہے، میں تفصیل اسی سے پوچھ لوں گا۔'' میں نے سوچتی ہوئی نظر سے اسے دیکھا۔ ''تھوڑی دیر پہلے آپ

نے بتایا ہے کہ مقتولہ اپنے فلیٹ پر اکیلی رہتی تھی اور اس کے پاس زیادہ لوگوں کا آنا جانا نہیں تھا۔ آپ نے دعویٰ کیا ہے کہ وقوعہ کی رات ملزم، مقتولہ سے ملاقات کر کے گیا تھا اور ملزم کے بعد کوئی بھی شخص مقتولہ سے ملنے نہیں آیا تھا؟"

"جی ہاں، میں نے یہی کہا ہے۔" اس نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

"آپ اتنا بڑا دعویٰ کس بنیاد پر کر رہے ہیں۔" میں نے گھور کر اسے دیکھا۔ "کیا آپ وقوعہ کی رات مقتولہ کے فلیٹ پر پہرا دے رہے تھے؟"

"جی نہیں...... ایسی کوئی بات نہیں۔" وہ میری چوٹ پر برا سا منہ بناتے ہوئے بولا۔

"پھر کیسی بات ہے؟" میں نے جارحانہ انداز میں پوچھا۔

"ہم نے مقتولہ کے فلیٹ کے گرد و پیش میں تفتیش کی ہے۔" وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "اس گلی میں واقع دکانوں اور گھروں کے مالکان سے پوچھ گچھ کی ہے۔ ہمیں اس بات کی ٹھوس شہادتیں ملی ہیں کہ ملزم وقوعہ کی رات مقتولہ سے ملنے آیا تھا۔"

"کیا آپ کو اس امر کی بھی شہادتیں ملی ہیں کہ ملزم کے بعد مقتولہ سے ملنے کوئی نہیں آیا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"ایسی شہادتوں کی ضرورت ہی نہیں تھی۔" وہ فخریہ لہجے میں بولا۔

"کیوں ضرورت نہیں تھی؟" میں نے بہ آواز بلند پوچھا۔ "ملزم کے جانے کے بعد بھی تو کوئی شخص وہاں پہنچ کر مقتولہ کو موت کے گھاٹ اتار سکتا تھا۔ ملزم ہی قربانی کا بکرا کیوں بنا؟"

"نہیں۔ یہ کام ملزم کے سوا اور کسی کا ہو ہی نہیں سکتا۔" وہ بڑے وثوق سے بولا۔ "ہماری تفتیش کے مطابق ملزم وقوعہ کی رات نو، ساڑھے نو بجے مقتولہ سے ملنے آیا تھا اور پندرہ بیس منٹ کے بعد وہ اپنا کام کر کے واپس چلا گیا تھا۔ یعنی اس کی واپسی کم و بیش رات دس بجے ہوئی تھی۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ، مقتولہ کی موت کا وقت رات نو اور دس بجے کے درمیان بتاتی ہے۔ ملزم کے جانے کے بعد اگر کوئی مقتولہ کے فلیٹ پر آیا بھی تھا تو وہ قاتل نہیں ہو سکتا اور...... اور اس صورت میں اس واقعے کا راز رات ہی میں کھل جانا چاہیے تھا مگر ایسا نہیں ہوا۔ اگلی صبح گھریلو ملازمہ نجمہ کی آمد پر ہی پتا چلا کہ مقتولہ کو اس کے بیڈ روم میں موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔"

"وقوعہ کا راز رات میں نہ کھلنے کے سلسلے میں آپ نے جو فلسفہ بیان کیا ہے، اس میں کوئی منطقی دم خم تو نہیں بہر حال......" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "جعفر علی کی اطلاع پر آپ جائے وقوعہ پر کتنے بجے پہنچے تھے؟"

"لگ بھگ دس بجے......"

"کیا اس وقت تک اسٹیٹ ایجنٹ جعفر علی وقوعہ پر موجود تھا؟"

"جی ہاں۔" اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

"کیا وہ اسٹیٹ ایجنٹ آپ کی وقوعہ کی کارروائی کے دوران میں تمام وقت جائے واردات پر موجود رہا تھا؟" میں نے گہری سنجیدگی سے سوال کیا۔

"نہیں جناب! وہ پانچ دس منٹ کے بعد مجھ سے اجازت لے کر وہاں سے چلا گیا تھا۔" اس نے بتایا۔ "جعفر علی کے مطابق، اسے اپنی ایجنسی پر کسی سے ضروری میٹنگ کرنا تھی لہٰذا وہ زیادہ دیر تک جائے وقوعہ پر رک نہیں سکتا تھا۔"

"اٹھارہ اگست کی صبح اسٹیٹ ایجنٹ کی سب سے زیادہ ضروری میٹنگ تو مقتولہ کے ساتھ تھی۔" میں نے چبھتے ہوئے انداز میں کہا۔ "وہ مقتولہ کو گلشن اقبال میں کوئی پلاٹ وغیرہ دلوانے والا تھا۔ اسی سلسلے میں مقتولہ نے اسے پچاس ہزار کی پیمنٹ کرنا تھی جو اس نے گزشتہ روز یعنی سترہ اگست ہی کو بینک سے نکلوا لیے تھے۔ پھر...... پھر جعفر علی کو اور کون سا ضروری کام یاد آ گیا تھا؟"

"میں اس کیس کا انکوائری آفیسر ہوں، جعفر علی کا سیکریٹری نہیں۔" وہ منہ بگاڑ کر عجیب سے لہجے میں بولا۔ "یہ سوال آپ جعفر علی سے کریں تو زیادہ مناسب رہے گا......"

"اس تجویز کے لیے بہت بہت شکریہ۔" میں نے طنزیہ انداز میں کہا پھر پوچھا۔ "وکیل استغاثہ کے مطابق جائے وقوعہ سے کچھ ایسی شہادتیں بھی ملی تھیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ملزم وقوعہ کی رات مقتولہ کے فلیٹ پر گیا تھا، مقتولہ نے اس کے لیے چائے بنائی تھی اور ملزم نے مقتولہ کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا......" میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔ "آپ اس کیس کے تفتیشی افسر ہیں۔ وکیل استغاثہ کے بیان کا کس طرح دفاع کریں گے......؟"

"بہت آسانی سے۔" وہ بڑے اعتماد کے ساتھ بولا۔ "مقتولہ، ملزم کو ڈرائنگ روم میں بٹھا کر اس کے لیے چائے بنانے کچن میں چلی گئی تھی مگر اسی دوران میں جب وہ کسی ضروری کام سے بیڈ روم کی طرف گئی تو......"

''تو اس نے دیکھا کہ......'' میں اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا۔ ''ملزم اس کی الماری کے ساتھ کسی مذموم کارروائی میں مصروف تھا۔ مقتولہ کی آمد پر جب وہ چونک کر مڑا تو اس کے ہاتھ میں براؤن لفافہ دیکھ کر مقتولہ فوراً سمجھ گئی کہ ملزم نے اس کی الماری میں سے پچاس ہزار روپے چوری کرلیے ہیں۔ چوری پکڑے جانے پر ملزم نے قریبی میز پر رکھا ہوا بھاری بھرکم گلدان اٹھایا اور مقتولہ کے سر پر دے مارا۔ مقتولہ وہیں گر کر اللہ کو پیاری ہوگئی اور ملزم چپکے سے جائے وقوعہ سے فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا۔ پچاس ہزار کی رقم سمیت......؟''

''دیٹس رائٹ......'' وہ جلدی سے بولا۔ ''بالکل ایسا ہی ہوا تھا۔''

''یہ بات وکیل استغاثہ نے پچھلی پیشی پر دس مختلف زاویوں سے دہرائی تھی۔'' میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ ''میں نے آپ سے اس امر کی تفصیل نہیں مانگی تھی بلکہ ان واقعاتی شہادتوں کے بارے میں سوال کیا تھا جن کی بنا پر میرے مؤکل کا وقوعہ کی رات مقتولہ سے ملنے اس کے فلیٹ پر آنا، مقتولہ کا ملزم کے لیے چائے بنانا، مقتولہ کا ملزم کو چوری کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑنا اور پکڑے جانے پر مقتولہ کو قتل کرنا ثابت ہوتا ہے......؟''

''دیکھیں جناب......!'' میرے خاموش ہوتے پر وہ سنبھلے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''جس گلی میں مقتولہ کا فلیٹ واقع ہے، وہیں پر مقتولہ والی بلڈنگ کے سامنے ایک ٹیلرنگ شاپ ہے۔ اس شاپ کے مالک کا نام اصغر علی ہے جو ماسٹر صاحب کے نام سے مشہور ہے۔ ''ماسٹر جی'' نے ملزم کو وقوعہ کی رات اس بلڈنگ کی سیڑھیاں چڑھتے دیکھا تھا جہاں سیکنڈ فلور کے ایک فلیٹ میں مقتولہ کی رہائش تھی۔ ماسٹر صاحب آپ کو یہ بھی بتائیں گے کہ ملزم صرف مقتولہ ہی سے ملنے اس بلڈنگ میں آیا کرتا تھا......'' وہ تھوڑی دیر کے لیے رکا، دو تین گہری سانسیں لیں پھر اپنی وضاحت کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''میں نے جائے وقوعہ کا بڑی باریک بینی سے جائزہ لیا ہے۔ کچن کے اندر چائے اور چائے کے برتن موجود تھے۔ میرا مطلب ہے، تیار حالت میں۔ چائے بنانے کے بعد مقتولہ نے دو کپوں میں چائے نکال لی تھی جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بھی ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر ملزم کے ساتھ چائے پینے کا ارادہ رکھتی تھی مگر کسی فوری خیال کے تحت اسے چائے ڈرائنگ روم تک پہنچانے سے پہلے بیڈروم کی طرف جانا پڑا اور......'' وہ ایک مرتبہ پھر ڈرامائی انداز میں متوقف ہوا، ایک طائرانہ نگاہ حاضرینِ عدالت پر ڈالی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''بیڈروم میں مقتولہ نے جو منظر دیکھا، وہ اس کا دماغ گھمانے کے لیے کافی تھا۔ وہ ملزم سے ایسی گری ہوئی حرکت کی توقع نہیں کرسکتی تھی۔ بہرحال اس رات مقتولہ کے فلیٹ پر جو خوفناک واقعہ پیش آیا، اسی کے نتیجے میں اس وقت ہم سب عدالت میں موجود ہیں۔ میں نے جائے وقوعہ پر سے وہ وزنی گلدان بھی تلاش کرلیا تھا جس کی خطرناک ضرب سے مقتولہ کو موت کے منہ میں دھکیلا گیا تھا۔ اس گلدان کے بعض حصوں پر ملزم کے فنگر پرنٹس پائے گئے تھے۔''

''بہت خوب......!'' میں نے اس کے خاموش ہونے پر استہزائیہ انداز میں کہا۔ ''شاہ جی! اگرچہ آپ نے بڑے متاثر کن انداز میں میرے مؤکل اور اس کیس کے ملزم کو مجرم ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا ہے مگر معذرت کے ساتھ کہوں گا کہ آپ کا جوشِ خطابت مجھے ذرا سا بھی متاثر نہیں کرسکا۔ کیا آپ کے خیال میں ملزم اتنا ہی بے وقوف تھا کہ آلۂ قتل کو جائے وقوعہ پر چھوڑ کر فرار ہوگیا تاکہ پولیس بہ آسانی سراغ لگاتے ہوئے اس کی گردن تک پہنچ جائے؟''

''بات بے وقوفی کی نہیں ہے وکیل صاحب......!'' وہ زہر کے گھونٹ پیتے ہوئے بولا۔ ''اصل میں جب ملزم رنگے ہاتھوں پکڑا گیا تھا تو اس پر بے انتہا گھبراہٹ طاری ہوگئی تھی اور اسی گھبراہٹ میں اس نے مقتولہ پر قاتلانہ حملہ کردیا تھا پھر جب مقتولہ تیورا کر بیڈروم کے فرش پر گری تو ملزم کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور وہ سب کچھ بھول بھال کر جائے وقوعہ سے فرار ہوگیا تھا۔ اس افراتفری میں اسے آلۂ قتل کو ٹھکانے لگانے کا خیال کیسے آسکتا تھا......؟''

''جبکہ پچاس ہزار روپے والے بھورے لفافے کو وہ ٹھکانے لگانے میں ایک لمحے کے لیے نہیں چوکا تھا۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''استغاثہ کی رپورٹ کے مطابق ملزم مقتولہ کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد پچاس ہزار روپے والے بھورے لفافے کے ساتھ جائے وقوعہ سے فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا تھا......اور وہ پچاس ہزار روپے پولیس ابھی تک برآمد یا بازیاب نہیں کراسکی......؟''

آئی او نے میرے تبصرے پر کچھ نہیں کہا۔ وہ الجھن زدہ نظر سے کبھی مجھے اور کبھی وکیل استغاثہ کو تکنے لگا۔ میں نے کھنکھار کر

گلا صاف کیا اور خاصے کرارے لہجے میں استفسار کیا۔
''شاہ جی! آپ آلۂ قتل کو تو اچھی طرح پہچانتے ہیں نا......؟''
''کیوں نہیں۔'' وہ ترت بولا۔ ''وہ گلدان ادھر میز پر رکھا ہے......''
''میز پر رکھا ہے......'' آئی او کے الفاظ دہراتے ہوئے میں ایک جانب بڑھ گیا۔
عدالت کے کمرے میں ایک جانب میز پر زیر سماعت کیس سے متعلق تمام چیزیں رکھی ہوتی ہیں جن میں آلۂ قتل کو نمایاں حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ مذکورہ وزنی گلدان بھی ایک سیلوفین بیگ میں محفوظ میز پر موجود تھا۔ وہ چھوٹا مگر وزنی گلدان سنگ مرمر کا بنا ہوا تھا جس کی لمبائی لگ بھگ نو انچ اور چوڑائی چار سے پانچ انچ رہی ہوگی۔ وہ اس وقت گل دستے سے عاری تھا یعنی اس کے اندر پھول وغیرہ چنے ہوئے نہیں تھے۔ جب اس گلدان کی مدد سے مقتول کے سر کو نشانہ بنایا گیا تھا تو اس کے اندر موجود پھول نکل کر دور جا گرے تھے اور دوبارہ انہیں گلدان کے اندر سجانے کی کوشش کی گئی تھی اور نہ ہی ضرورت محسوس کی گئی تھی۔
میں نے گلدان والا سیلوفین بیگ میز پر سے اٹھالیا اور سبک قدموں سے چلتے ہوئے، وٹنس باکس میں کھڑے اس کیس کے انکوائری آفیسر رضا اللہ خان المعروف شاہ جی کے سامنے آگیا پھر مذکورہ بیگ کو اس کی آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے پوچھا۔
''تو آپ کے خیال میں اسی گلدان کی ضرب سے مقتولہ کو ہلاک کیا گیا تھا؟''
''جی ہاں، بالکل!'' اس نے پُر وثوق لہجے میں جواب دیا۔ ''اس گلدان پر جا بجا ملزم کی انگلیوں کے نشانات پائے گئے تھے۔ اگر آپ کو یقین نہیں آرہا تو فنگر پرنٹس رپورٹ دیکھ سکتے ہیں......''
''مجھے آپ کی بات پر یقین ہے آئی او صاحب!'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یقیناً اس گلدان پر میرے مؤکل کی انگلیوں کے نشانات پائے جاسکتے ہیں۔ ملزم اکثر مقتولہ سے ملنے اس کے فلیٹ پر جایا کرتا تھا اور یہ گلدان مقتولہ کے بیڈ کے نزدیک ہی ایک چھوٹی میز پر رکھا رہتا تھا۔ ملزم نے اس گلدان کو کئی بار چھوا ہوگا۔ یہ کوئی ایسی انہونی بات تو نہیں......''
''مجھے ملزم کے گلدان کو چھونے پر کوئی حیرت یا اچنبھا نہیں وکیل صاحب۔'' وہ قطع کلامی کرتے ہوئے بولا۔

''میں تو یہ عرض کر رہا ہوں کہ وقوعہ کی رات ملزم نے اپنی چوری پکڑے جانے پر اس گلدان کا ایک خطرناک وار کر کے مقتولہ کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔''
''اس گلدان کا وار کر کے......؟'' میں نے سیلوفین بیگ آئی او کو دکھاتے ہوئے بڑی معصومیت سے پوچھا۔
''جی ہاں...... اسی گلدان سے۔'' اس نے جواب دیا۔
میں نے بھولے پن کی بامقصد اداکاری جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ کا مطلب ہے، جب وقوعہ کی رات ملزم مقتولہ کے بیڈروم میں، اس کی الماری میں سے پچاس ہزار روپے چوری کر رہا تھا تو مقتولہ کسی ضروری کام سے بیڈروم میں پہنچ گئی تھی؟''
''جی...... جی...... میرا یہی مطلب ہے۔'' اس نے جلدی سے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''مقتولہ کی آہٹ محسوس کرتے ہی ملزم تیزی سے پلٹا تھا۔''
''اور مقتولہ نے ملزم کے ہاتھ میں وہ بھورا لفافہ دیکھ لیا تھا جس کے اندر استغاثہ کے مطابق پورے پچاس ہزار کی رقم رکھی تھی؟'' میں نے اپنی جرح میں ایک دم تیزی لاتے ہوئے پوچھا۔
''جی بالکل......'' اس نے تائیدی انداز میں جواب دیا۔
''ملزم رنگے ہاتھوں پکڑے جانے پر بوکھلا گیا تھا؟''
''ایگزیکٹلی......!''
''ان لمحات میں ملزم اور مقتولہ ایک دوسرے کے روبرو تھے......؟''
''اس میں کسی شک کی گنجائش ہو ہی نہیں سکتی۔'' اس نے مضبوط لہجے میں کہا۔
میں نے فائنل ٹچ لگاتے ہوئے اضافہ کیا۔ ''اپنے جرم کا راز کھل جانے پر ملزم نے مقتولہ کو موت کے گھاٹ اتارنے کا فیصلہ کرلیا اور فوری طور پر اپنے اس فیصلے کو عملی جامہ بھی پہنا دیا...... اس نے گلدان اٹھا کر مقتولہ کے سر پر دے مارا...... ایسا ہی ہوا تھا نا......؟''
''بے شک ایسا ہی ہوا تھا۔'' وہ پورے تیقن سے بولا۔
''اور یہ...... ایک محض اتفاق ہے کہ...... دونوں کے عین روبرو ہونے کے باوجود بھی معجزاتی طور پر گلدان کی ضرب مقتولہ کی کھوپڑی کے عقبی حصے پر لگی تھی۔'' میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ''میں غلط تو نہیں کہہ رہا آئی او صاحب......؟''
''آں......!'' وہ الجھی ہوئی نظروں سے مجھے تکنے لگا۔
''آں ہاں، نہیں آئی او صاحب!'' میں نے قدرے

درشت لہجے میں استفسار کیا۔ ''آپ اس کیس کے تفتیشی افسر ہیں۔ جائے وقوعہ پر یقیناً آپ نے سب سے زیادہ توجہ مقتولہ پر ہی دی ہوگی اور یہ تو ممکن نہیں کہ اس کی کھوپڑی کے عقبی متاثرہ حصے پر آپ کی نظر نہ پڑی ہو۔ پھر پوسٹ مارٹم رپورٹ بھی اس امر کی تصدیق کرتی ہے کہ وزنی گلدان سے مقتولہ کے سر کے عقبی حصے کو نشانہ بنایا گیا تھا۔ آپ کیا فرماتے ہیں بیچ اس مسئلے کے......؟ ہم اس وقت ایک دوسرے کے آمنے سامنے کھڑے ہیں جیسا کہ استغاثہ کی رپورٹ کی رو سے وقوعہ کے وقت ملزم اور مقتولہ روبرو کھڑے تھے۔ کیا میں اس پوزیشن میں کھڑے کھڑے کسی وزنی شے کا وار کر کے آپ کی کھوپڑی کے عقبی حصے کو چٹخا سکتا ہوں یا...... کیا آپ بھی تجربہ میرے ساتھ دہرا سکتے ہیں......؟''

میرے پے در پے اور تابڑ توڑ منطقی سوالات نے تفتیشی افسر کو بوکھلا کر رکھ دیا۔ وہ اضطراری انداز میں.... بے بسی سے وکیلِ استغاثہ کی طرف دیکھنے لگا۔ میں نے بہ آوازِ بلند کہا۔

''میں پوری ذمے داری کے ساتھ کہہ سکتا ہوں شاہ جی کہ...... آپ کے پاس میرے کسی سوال کا کوئی جواب نہیں ہے......''

اس کے ساتھ ہی عدالت کا مقررہ وقت ختم ہو گیا۔ جج نے پندرہ روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کرنے کا اعلان کیا۔

''دی کورٹ از ایڈ جارنڈ......!''

میں عدالت سے باہر آیا اور پارکنگ لاٹ کی جانب بڑھنے لگا تو عقب سے کسی کی پکار سن کر مجھے رکنا پڑا۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو مقتولہ کا شوہر مجھے اپنی طرف بڑھتا دکھائی دیا۔ وہ خاصا تیزی میں نظر آتا تھا۔

جیسا کہ میں نے شروع میں بیان کیا ہے کہ مقتولہ کا شوہر روزگار کے سلسلے میں ملک سے باہر گیا ہوا تھا۔ وہ کویت کی کسی آئل کمپنی میں ملازمت کرتا تھا۔ تاہم اپنی بیوی کی موت کا سن کر وہ واپس آ گیا تھا۔ وہ ہر پیشی پر عدالت میں موجود ہوتا تھا، البتہ ابھی تک اس سے میری براہِ راست بات چیت نہیں ہوئی تھی۔

وہ اضطراری قدموں سے چلتے ہوئے میرے قریب پہنچا اور خاصے عقیدت بھرے لہجے میں بولا۔ ''السلام علیکم بیگ صاحب......!''

''وعلیکم السلام!'' میں نے اسی کے انداز میں سلام کا جواب دیا اور سوالیہ نظر سے اسے تکنے لگا۔

وہ قدرے سنبھلے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''بیگ صاحب! آپ کی وکالت نے مجھے بہت متاثر کیا ہے۔ آپ بہت تجربہ کار وکیل ہیں۔''

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ میں تجربہ کار وکیل ہوں یا اناڑی۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''حقیقت تو یہ ہے کہ میں آپ کے لیے وکیلِ مخالف ہوں۔''

''اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''اسی لیے میں آپ سے ایک تفصیلی ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔''

''تفصیلی ملاقات...... میں سمجھا نہیں۔'' میں نے الجھن زدہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ''میں تو اپنے مؤکل کو بچانے کی کوشش کر رہا ہوں جو کہ ایک ایسا شخص ہے جس پر آپ کی بیوی کو قتل کرنے کا الزام ہے۔ مجھ سے مختصر یا تفصیلی ملاقات کرنے سے آپ کو کیا فائدہ ہوگا؟''

وہ اپنی وضع قطع اور بات چیت سے خاصا معقول انسان نظر آتا تھا۔ میں نے اسے سلجھا ہوا اور مہذب شخص پایا۔ میرے سوال کے جواب میں اس نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''بیگ صاحب! میرا فوکس اس بات پر ہے کہ میری بیوی کو بے دردی سے قتل کیا گیا ہے۔ میں اس کے قاتل کو کیفرِ کردار تک پہنچتے ہوئے دیکھنا چاہتا ہوں، چاہے وہ آپ کا مؤکل ہو یا کوئی اور......''

''تو آپ کے اس ''فوکس'' کے سلسلے میں، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ''آپ مجھ سے کیوں تفصیلی ملاقات کرنا چاہتے ہیں؟''

''اصل قاتل تک پہنچنے اور اسے بے نقاب کرنے کے لیے میں آپ کی خدمات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔'' وہ دوٹوک انداز میں بولا۔

''اس کا تو یہ مطلب ہوا کہ آپ نے میرے مؤکل کو بے گناہ تسلیم کر لیا ہے؟''

''کسی حد تک......'' وہ سوچتے ہوئے انداز میں بولا۔ ''میں نے ابھی تک جتنی عدالتی کارروائی دیکھی ہے، اس کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ آئندہ چند پیشیوں میں آپ اپنے مؤکل کو صاف بچا لے جائیں گے۔''

''اوہ...... تو یہ بات ہے۔'' میں نے ہپ پاکٹ کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''اگلی پیشی میں پندرہ روز باقی ہیں۔ آپ شام میں کسی وقت میرے آفس میں آ کر

ملاقات کر سکتے ہیں۔''

بات کے اختتام پر میں نے اپنے بٹوے میں سے وزیٹنگ کارڈ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے شکریے کے ساتھ کارڈ وصول کیا۔ میں اس سے ہاتھ ملا کر رخصت ہو گیا۔ مجھے یقین تھا کہ ایک آدھ روز میں وہ مجھ سے ملنے ضرور آئے گا۔

☆☆☆

آئندہ پیشی پر استغاثہ کی جانب سے صدیق بھائی نامی ایک شخص کو عدالت میں پیش کیا گیا۔ صدیق بھائی لوگوں کو سود پر پیسا دیتا تھا۔ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ استغاثہ نے کس مقصد کی خاطر صدیق بھائی کا نام استغاثہ کے گواہوں کی فہرست میں شامل کیا تھا۔

صدیق بھائی متناسب البدن اور درمیانے قد کا ایک کلین شیو شخص تھا۔ اس نے کٹہرے میں کھڑے ہو کر سچ بولنے کا حلف اٹھایا پھر اپنا بیان ریکارڈ کرا دیا۔ اس کے بعد وکیل استغاثہ جرح کے لیے وٹنس باکس کے قریب چلا گیا۔ اس نے بڑے سنسنی خیز انداز میں سوالات کا آغاز کیا۔

''صدیق بھائی......!'' وکیل استغاثہ نے ایکوزڈ باکس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''کیا آپ اس شخص کو جانتے ہیں؟''

''کیوں نہیں......'' اس نے بڑی کراری آواز میں جواب دیا۔ ''انسان کا جس کی طرف ایک بھی پیسا ہوتا ہے، وہ اسے بہ خوبی یاد رکھتا ہے۔ یہ بندہ تو میرے اسی ہزار کھائے بیٹھا ہے۔ اسے میں کیسے بھول سکتا ہوں۔''

''اسی ہزار روپے!'' وکیل استغاثہ نے حیرت کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔ ''کیا ملزم نے آپ سے اسی ہزار ادھار لیے تھے؟''

''وکیل صاحب! میں سیدھی اور کھری بات کرنے کا عادی ہوں۔'' صدیق بھائی نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''میں ایک کاروباری آدمی ہوں اور اپنا پیسا سود پر چلاتا ہوں۔ ملزم نے کوئی سال، ڈیڑھ سال پہلے مجھ سے پچاس ہزار روپے سود پر ادھار لیے تھے۔ شروع میں تو یہ سود کی رقم باقاعدہ ادا کرتا رہا پھر اس نے مختلف قسم کی بہانے بازی شروع کر دی۔ اس طرح سود کی رقم بڑھتے بڑھتے اسی ہزار تک جا پہنچی۔ میں نے اس کے گھر کے چکر لگانا شروع کر دیے۔ کئی بار بدمزگی بھی ہوئی۔ میں اپنا معاملہ اس کے علاقے کے 'بڑے' کے پاس لے گیا۔ بڑے نے دونوں طرف کی بات سنی پھر اپنا فیصلہ سنا دیا۔ اگرچہ وہ فیصلہ ملزم کی حمایت میں جاتا تھا لیکن میں نے بڑے کی بات مان لی تھی۔''

وکیل استغاثہ نے پوچھا۔ ''اس بڑے نے کیا فیصلہ سنایا تھا؟''

''اس نے کہا تھا کہ ملزم ایک ماہ کے اندر اندر مجھے اصل رقم یعنی پچاس ہزار روپے ادا کر دے گا لہٰذا میں سود کی مد میں جمع ہونے والے تیس ہزار کو بھول جاؤں۔'' گواہ نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ ''مجھے میری اصل رقم واپس مل رہی تھی اس لیے میں نے بڑے کا فیصلہ قبول کر لیا۔''

''تو کیا ملزم نے ایک ماہ کے اندر تمہارے پچاس ہزار لوٹا دیے تھے؟''

''اگر لوٹا دیے ہوتے تو میں اسے اپنا مقروض کیوں کہتا؟'' صدیق بھائی طنزیہ انداز میں ملزم کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''اب یہ معاملہ عدالت کے سامنے کھل ہی گیا ہے تو میں اس سے پورے اسی ہزار ہی وصول کروں گا۔''

''ملزم نے کس بھروسے پر ایک ماہ کے اندر آپ کو پچاس ہزار روپے ادا کرنے کی بات کی تھی؟'' وکیل استغاثہ نے کریدنے والے انداز میں پوچھا۔ ''اس کے پاس تو سود والی رقم ادا کرنے کے لیے پیسے نہیں تھے۔ یہ یکمشت پچاس ہزار کہاں سے مہیا کر دیتا......؟''

''یہ سوال اس وقت بھی اٹھا تھا جب ''بڑے'' کے سامنے اس نے ایک ماہ کے اندر مجھے پچاس ہزار ادا کرنے کا وعدہ کیا تھا۔'' صدیق بھائی نے جواب دیا۔ ''ملزم نے کہا تھا کہ وہ اپنی ایک دوست سے پچاس ہزار لے کر مجھے دے دے گا۔''

''اپنے دوست سے یا اپنی دوست سے؟'' وکیل استغاثہ نے تیکھے انداز میں پوچھا۔

''اپنی دوست سے۔'' گواہ نے دوٹوک انداز میں بتایا۔

''اپنی دوست سے ملزم کی مراد کہیں مقتولہ تو نہیں تھی؟''

''اس وقت مجھے اس کی دوست کے بارے میں کچھ پتا نہیں تھا۔'' گواہ نے سادگی سے بتایا۔ ''لیکن بعد میں یہ ثابت ہو گیا کہ وہ مقتولہ ہی سے پچاس ہزار روپے لے کر مجھے دینے والا تھا۔''

''دینے والا تھا۔'' وکیل استغاثہ نے معنی خیز انداز میں گواہ کے آخری الفاظ دہرائے پھر پوچھا۔ ''اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ دیے نہیں تھے......؟''

''اگر دے دیے ہوتے تو پھر رونا کس بات کا تھا وکیل صاحب!'' صدیق بھائی نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔ ''ایک ماہ کے بعد اس نے مجھے ایک نیا راگ سنانا

شروع کر دیا تھا۔"
"کون سا نیا راگ؟" وکیل استغاثہ قطع کلامی کرتے ہوئے بولا۔
"اس نے مجھ سے کہا کہ اس کی دوست نے رقم دینے سے صاف انکار کر دیا ہے۔" صدیق بھائی وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "اب اگر میں تین ماہ تک صبر کرلوں تو یہ مجھے کسی اور ذریعے سے وہ رقم مہیا کر دے گا۔"
"تو کیا آپ تین ماہ تک صبر کرنے کے لیے راضی ہو گئے تھے؟" وکیل استغاثہ نے پوچھا۔
"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جناب!" وہ ٹھوس لہجے میں بولا۔ "میں تو اب ایک دن مزید انتظار نہیں کر سکتا تھا، تین ماہ میں تو لگ بھگ سو دن ہوتے ہیں۔"
"پھر...... پھر آپ نے کیا کیا......؟"
"بہت کچھ کرنے کے بارے میں سوچا تھا مگر اس سے پہلے ہی یہ بندہ قتل کے کیس میں پولیس کے ہتھے چڑھ گیا......" گواہ بات ادھوری چھوڑ کر نفرت آمیز انداز میں ملزم کو گھورنے لگا۔
وکیل استغاثہ نے جج کی جانب دیکھتے ہوئے بہ آوازِ بلند کہا۔ "جنابِ عالی! ملزم معزز عدالت کے روبرو اس بات کا اقرار کر چکا ہے کہ اس نے مقتولہ سے پچاس ہزار روپے ادھار مانگے تھے۔ مقتولہ کو چونکہ کوئی پلاٹ وغیرہ خریدنا تھا اس لیے اس نے ملزم کو رقم دینے سے صاف انکار کر دیا تھا جس پر وہ مقتولہ سے چند روز کے لیے ناراض بھی ہو گیا تھا۔ خیر، وہ بات آئی گئی ہو گئی اور مقتولہ نے کسی طرح ملزم کو منا کر اس کی خفگی دور تو کر دی لیکن ملزم کا مسئلہ جوں کا توں اٹکا ہوا تھا۔ وہ ایک ماہ میں صدیق بھائی کو پچاس ہزار روپے واپس نہیں کر سکا تھا اور صدیق بھائی مزید اس کے کسی وعدے پر اعتبار کرنے کو تیار نہیں تھے۔ صدیق بھائی نے یقیناً ملزم کو خطرناک نتائج کی دھمکیاں بھی دی ہوں گی۔ ملزم کے پاس پچاس ہزار کے بندوبست کا کوئی آسرا نہیں تھا۔ مقتولہ اس کی واحد امید تھی اور اسے وہ ٹرائی کر چکا تھا چنانچہ......" وکیل استغاثہ نے ڈرامائی انداز میں توقف کر کے بڑے فخریہ انداز میں پہلے حاضرینِ عدالت کو اور پھر مجھے دیکھا۔ اس کے بعد اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔
"چنانچہ اس نے مقتولہ کے گھر سے رقم چرانے کا فیصلہ کر لیا۔ وقوعہ کی رات وہ مقتولہ سے ملنے اس کے گھر پہنچا۔ مقتولہ اس کے لیے چائے بنانے باورچی خانے میں گئی تو ملزم اس کے بیڈ روم میں پہنچ گیا۔ ملزم کو یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ گزشتہ روز مقتولہ نے بینک سے پچاس ہزار روپے نکلوائے تھے جو اگلے روز اسے پلاٹ کی خرید کے سلسلے میں پراپرٹی ایجنٹ کی معرفت پارٹی کو ادا کرنے تھے۔ ملزم کا چونکہ مقتولہ کے گھر آنا جانا تھا لہٰذا اسے اچھی طرح خبر تھی کہ مقتولہ کس الماری میں رقم وغیرہ رکھتی تھی لیکن اس کی بدقسمتی کہ جیسے ہی اس نے الماری میں سے رقم والا براؤن لفافہ نکالا، مقتولہ کسی ضروری کام سے بیڈ روم میں پہنچ گئی اور یہ رنگے ہاتھوں پکڑا گیا۔ اس نے وزنی گلدان کا خطرناک وار کر کے مقتولہ کو موت کی نیند سلایا اور خود جائے وقوعہ سے فرار ہو گیا۔"
"آبجیکشن یور آنر......!" میں نے بہ آوازِ بلند کہا۔
جج نے سوالیہ نظر سے میری طرف دیکھا اور پوچھا۔ "آپ کو کس بات پر اعتراض ہے وکیل صاحب؟"
"متعدد باتوں پر!" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔
"اپنے اعتراضات کی وضاحت کریں۔" جج نے گہری سنجیدگی سے کہا۔
"جنابِ عالی!" میں نے مضبوط انداز میں بولنا شروع کیا۔ "اس امر میں کسی شک و شبہے کی گنجائش تلاش نہیں کی جا سکتی کہ علاقے کے "بڑے" کے فیصلے کے مطابق ملزم نے صدیق بھائی کو ایک ماہ میں پچاس ہزار روپے ادا کرنے کا جو وعدہ کیا تھا، اس کا دارومدار صد فیصد مقتولہ پر تھا۔ ملزم کو پورا یقین تھا کہ اگر وہ مقتولہ سے پچاس ہزار روپے ادھار مانگے گا تو وہ انکار نہیں کرے گی مگر اس کی توقع کے برعکس مقتولہ نے اسے ادھار رقم دینے سے صاف انکار کر دیا تھا مگر......" میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔
"مگر یہ بات درست نہیں کہ مقتولہ کے چٹے انکار کے بعد ملزم کے پاس کوئی راستہ باقی نہیں رہ گیا تھا اور...... اس نے مسئلے کے آخری حل کے طور پر مقتولہ کی الماری سے رقم چرانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔"
"تو آپ کے خیال میں ملزم کہیں اور سے بھی پچاس ہزار کا انتظام کرنے کی اہلیت رکھتا تھا؟" جج نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔
"بے شک!" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ "ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے...... ملزم اس وقت عدالت میں موجود ہے۔ اگر معزز عدالت کی اجازت ہو تو اسی سے پوچھ لیتے ہیں......" بات کے اختتام پر میں نے

سوالیہ نظر سے جج کی طرف دیکھا۔
''اجازت ہے۔'' جج نے فراخ دلی سے کہا۔
میں وٹنس باکس کو چھوڑ کر اکیوزڈ باکس کی جانب بڑھ گیا جہاں ملزم سر جھکائے خاموش کھڑا تھا۔ عدالتی کارروائی کے دوران میں سب سے زیادہ قابلِ رحم حالت ملزم کی ہوتی ہے۔ اسے اپنے خلاف ہر قسم کی ترش اور تلخ بات سن کر خاموش رہنا پڑتا ہے۔ جب میں اپنے مؤکل اور اس کیس کے ملزم عارف عرف ٹیپو کے نزدیک پہنچا تو اس نے نگاہ اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ویرانی اور چہرے پر غیر یقینی کی سی کیفیت تھی۔ میں نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور ملزم کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔
''کیا یہ سچ ہے کہ سال، ڈیڑھ سال پہلے تم نے صدیق بھائی سے سود پر پچاس ہزار روپے قرض لیے تھے؟''
''جی......'' اس نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔
''ابتدا میں تم باقاعدگی سے سود کی رقم ادا کرتے رہے لیکن کچھ عرصے کے بعد تمہارے لیے اپنی ماہانہ آمدنی میں سے یہ رقم نکالنا ممکن نہ رہا اور سود کی رقم بتدریج بڑھتی رہی۔'' میں نے اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''جب یہ رقم اسی ہزار تک پہنچ گئی اور اس کی ادائیگی کسی بھی طور پر تمہارے بس میں نہ رہی تو تمہارے علاقے کے ایک بااثر شخص نے اصل قرض کی رقم یعنی پچاس ہزار روپے پر تمہارے اور صدیق بھائی کے درمیان مک مکا کرادیا تھا۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟''
''نہیں جناب! آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ ''حقیقت میں ایسا ہی ہوا تھا۔''
''اور یہ بھی ایک ٹھوس حقیقت ہے کہ تم نے یہ پچاس ہزار روپے قرض صدیق بھائی سے ایک خاص مقصد کے لیے ادھار لیے تھے؟''
''جی ہاں...... میرے والد صاحب کو فالج کا اٹیک ہوگیا تھا۔ ان کے جسم کا زیریں حصہ اور ایک بازو بالکل بے جان ہو کر رہ گیا تھا۔ مجھے اپنے والد صاحب کے علاج کے لیے یہ رقم ادھار لینا پڑی تھی۔'' ٹیپو نے دکھ بھرے لہجے میں بتایا۔ ''ابو کی بیماری میں تو کوئی نمایاں اور مثبت تبدیلی ابھی تک رونما نہیں ہوئی مگر اس دوران میں میری مالی مجبوریوں کے باعث قرض کی رقم پچاس ہزار سے بڑھ کر اسی ہزار تک جا پہنچی تھی۔ وہ تو اللہ بھلا کرے ہمارے علاقے کے اس بڑے کا جنھوں نے بیچ میں پڑ کر مک مکا کرادیا تھا اور صدیق بھائی کو اس بات پر راضی کرلیا تھا کہ میں اصل قرض یعنی پچاس ہزار ہی واپس کروں گا مگر......'' اس نے لمحاتی توقف کر کے ایک افسردہ سی سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔
''مگر قرض ایک ایسی لعنت ہے جو آسانی سے پیچھا نہیں چھوڑتی......''
''حالانکہ تم نے اس لعنت سے نجات حاصل کرنے کے لیے مقتولہ کے آگے بھی ہاتھ پھیلایا تھا۔'' میں نے ہمدردی بھرے لہجے میں کہا۔ ''مگر اس نے تمہارا مان نہیں رکھا۔''
''ہر انسان کی اپنی مرضی ہوتی ہے۔'' وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔ ''میں مقتولہ کو ادھار دینے پر مجبور تو نہیں کرسکتا تھا۔ بہر حال، مجھے اس کے رویے سے بہت دکھ پہنچا تھا۔ تین ماہ ہی کی تو بات تھی۔''
''تین ماہ کی بات......؟'' سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے بھی میں نے حیرت بھرے انداز میں استفسار کیا۔ ''اس کا کیا مطلب ہوا؟''
''بہت آسان مطلب ہے جناب۔'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ ''میں نے مقتولہ سے پچاس ہزار روپے قرض مانگتے وقت اسے یہ یقین دلانے کی کوشش کی تھی کہ میں اس کی یہ رقم تین ماہ کے بعد واپس کردوں گا۔''
''اوہ...... تو جبھی......!'' میں نے معنی خیز انداز میں گردن ہلائی اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''جب مقتولہ نے آپ کو پچاس ہزار روپے ادھار دینے سے انکار کردیا تو تم نے صدیق بھائی سے بھی تین ماہ تک صبر کرنے کی درخواست کی تھی؟''
''جی...... جی ہاں......'' وہ جلدی سے بولا۔ ''بالکل یہی بات تھی۔''
''بالکل یہی بات تھی۔'' میں نے اس کے آخری الفاظ دہرانے کے بعد کہا۔ ''اس سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ تین ماہ کے بعد تمہیں کہیں سے کوئی تگڑی رقم ملنے والی تھی جس کے آسرے پر تم نے پہلے مقتولہ سے قرض لینے کی کوشش کی اور بعدازاں صدیق بھائی کو تین ماہ تک انتظار کرنے کے لیے کہا تھا؟''
''آپ بالکل درست فرما رہے ہیں۔'' اس نے اثبات میں جواب دیا۔
''وہ تگڑی رقم تمہارے پاس کہاں سے آنے والی تھی؟'' میں نے سرسراتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔
''میں نے اپنے محلے میں ایک خاتون کے پاس بی سی

(کمیٹی) ڈالی تھی۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔'' جمیلہ خالہ کے پاس اکثر بیسیاں ڈلتی رہتی ہیں۔ یہ پورے ساٹھ ہزار کی بی سی تھی جو تین ماہ کے بعد نمبر کے حساب سے مجھے ملنے والی تھی۔ میں نے اسی بی سی کی آس میں صدیق بھائی کے سودی کاروبار سے نجات حاصل کرنے کے لیے پہلے مقتولہ سے ادھار مانگنے کی کوشش کی تھی۔ جب اس نے رقم دینے سے صاف انکار کر دیا تو پھر میں نے صدیق بھائی ہی کو تین ماہ تک صبر کرنے کے لیے کہا تھا۔ افسوس......'' اس نے رک کر بڑے دکھی انداز میں ایک بوجھل سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''مگر افسوس کہ اب اس کیس کو عدالت میں لگے ہوئے چار ماہ سے زیادہ کا عرصہ ہو گیا ہے۔ وہ بی سی کھلی اور اس کی رقم مختلف نوعیت کے عدالتی بکھیڑوں کی نذر ہو گئی ہے۔ جو تھوڑے بہت بچے ہیں، اس کیس کے اختتام تک وہ بھی مٹھی سے نکل جائیں گے۔ میں وہیں کا وہیں رہ جاؤں گا...... خالی ہاتھ اور مقروض......''

''زیادہ غمزدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔'' میں نے تسلی بھرے لہجے میں کہا۔'' تمہاری بے گناہی ثابت ہو جانے کے بعد میں استغاثہ پر ایک کیس ''ہتک عزت اور ہرجانے'' کا دائر کروں گا۔ اس کیس پر تمہارے جتنے بھی اخراجات ہوں گے، وہ میں تمہیں عدالت سے دلوا کر رہوں گا۔''

اس کے بعد میں نے روئے سخن جج کی سمت موڑتے ہوئے پُراعتماد انداز میں کہا۔'' اگر عدالت ضرورت محسوس کرے گی تو میں آئندہ پیشی پر ملزم کی محلے دار جمیلہ خالہ کو گواہی کے لیے عدالت میں پیش کر دوں گا تاکہ ملزم کی نیک نیتی ثابت ہو جائے۔''

''ٹھیک ہے۔ آپ اگلی پیشی پر صفائی کی گواہ جمیلہ خالہ کو عدالت میں حاضر کرنے کا انتظام کریں۔'' جج نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''ایک بات اور جناب عالی۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

جج نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔'' وہ کیا......؟''

''استغاثہ کی جانب سے بار بار اس سبق کو دہرایا جا رہا ہے کہ......'' میں نے گمبھیر انداز میں بولنا شروع کیا۔'' ملزم وقوعہ کی رات چوری کی نیت سے مقتولہ کے فلیٹ پر پہنچا تھا اور جب وہ چوری کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑا گیا تو اس نے وزنی گلدان کا وار کر کے مقتولہ کو موت کے گھاٹ اتارا اور جائے وقوعہ سے فرار ہو گیا جبکہ حقائق اس کے برعکس ہیں......'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس خارج کی پھر دلائل کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے مزید کہا۔

''حقائق کے مطابق ملزم وقوعہ کی رات لگ بھگ آٹھ بجے مقتولہ کے فلیٹ پر پہنچا تھا اور کم و بیش پندرہ منٹ کے بعد وہ واپس چلا گیا تھا جبکہ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق مقتولہ کی موت رات نو اور دس بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ملزم کے رخصت ہونے کے بعد کوئی مقتولہ سے ملنے آیا تھا اور...... وہی ''کوئی'' اس کا قاتل ہو سکتا ہے۔ ایک اور خاص بلکہ خاص الخاص بات یہ کہ......'' میں نے ڈرامائی انداز میں ایک بار پھر توقف کیا۔ چند لمحات کے بعد میں جج کو بتا رہا تھا۔

''جناب عالی! تفتیشی افسر رضا اللہ خان عرف ''شاہ جی'' نے پچھلی پیشی پر اس امر کی تصدیق کی تھی کہ مقتولہ کی کھوپڑی کے عقبی حصے کو چٹخا کر اسے موت کے منہ میں دھکیلا گیا تھا اور ایسا اسی صورت ممکن تھا اگر قاتل وزنی گلدان کو مقتولہ کے عقب میں کھڑے ہو کر اس کی کھوپڑی پر آزماتا مگر استغاثہ کا زور بیاں اس بات پہ دلالت کرتا ہے کہ مقتولہ کے قدموں کی آہٹ سن کر جب ملزم مڑا تو اس کے ہاتھ میں رقم والا براؤن لفافہ موجود تھا۔ گویا ان لمحات میں ملزم اور مقتولہ ایک دوسرے کے روبرو کھڑے تھے۔ ایسی صورت میں یہ کسی بھی طور ممکن نہیں کہ ملزم نے مقتولہ کی کھوپڑی کے عقبی حصے پر وزنی گلدان کی ضرب لگا کر اسے حوالۂ موت کیا ہو۔ استغاثہ کا استدلال میرے مؤکل کے حق میں جاتا ہے جبکہ اس کے ساتھ ہی یہ استدلال پوسٹ مارٹم رپورٹ کی مخالفت میں بھی جاتا ہے۔ میں صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ......'' میں نے ذرا رک کر ایک آسودہ سانس خارج کی پھر ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔

''کہ جناب عالی! میرا مؤکل بے گناہ ہے۔ اسے ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت اس کیس میں پھنسانے کی کوشش کی گئی ہے۔ دیٹس آل یور آنر......!''

میری جرح مکمل ہونے پر جج خاموشی سے چند لمحوں تک اپنے سامنے پھیلے ہوئے کاغذات کا جائزہ لیتا رہا پھر گردن اٹھا کر دیوار گیر کلاک کی جانب دیکھا۔

عدالت کا مقررہ وقت ختم ہونے میں صرف پانچ منٹ باقی تھے۔ اس قلیل مدت میں کسی اور گواہ کو بھگتنا ممکن نہیں تھا لہٰذا جج نے دس روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔

مقتولہ کا شوہر ہر پیشی پر عدالت میں موجود ہوتا تھا۔ وہ اپنی بیوی کے قتل والے واقعے کے بعد اپنی نوکری سے چھٹی لے کر کویت سے پاکستان آگیا تھا۔ چند روز پہلے وہ دفتر آکر مجھ سے ایک بھرپور ملاقات کر گیا تھا۔ وہ ایک سنجیدہ اور بردبار شخص تھا۔ میرے اندازِ وکالت نے اسے خاصا متاثر کیا تھا۔ میں جس مدلل اور بھرپور طریقے سے اپنے مؤکل کا دفاع کر رہا تھا، اس نے مقتولہ کے شوہر کو میرا گرویدہ بنا دیا تھا۔ اس روز بھی جب میں عدالت سے نکلا تو وہ میرے ساتھ تھا۔ راہداری میں پہلو بہ پہلو چلتے ہوئے اس نے مجھ سے کہا۔

''بیگ صاحب! مجھے اس بات سے کوئی غرض نہیں کہ میری بیوی کا قاتل کون ہے۔ بس، میں یہ چاہتا ہوں کہ قاتل جو کوئی بھی ہے، اسے قرار واقعی سزا ملنا چاہیے۔''

''میں بھی یہی چاہتا ہوں۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اور انشاء اللہ! میں بہت جلد اصل قاتل کو... بے نقاب کر کے عدالت سے کڑی سزا دلوانے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔''

''انشاء اللہ!'' اس نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی پھر بولا۔ ''بیگ صاحب! مجھ سمیت عدالت کو بھی اس بات کا بخوبی اندازہ ہو چکا ہے کہ ملزم نے میری بیوی کو قتل نہیں کیا۔ آپ کے دلائل میں بہت وزن ہے۔ واقعی...... اگر ملزم میری بیوی پر وزنی گلدان کا وار کرتا تو اس کی کھوپڑی کا سامنے والا حصہ یعنی سر یا چہرہ زخمی ہوتا۔ یقیناً قاتل نے عقب سے گلدان کا وار کر کے میری بیوی کو موت کی نیند سلایا ہے۔ اس سلسلے میں تو آپ نے تفتیشی افسر کو بھی لاجواب کر دیا تھا۔''

''جناب! عدالت میں واقعاتی شہادتوں اور ٹھوس دلائل کی بنیاد پر ہی کارآمد نکات اٹھا کر قانونی جنگ لڑی جاتی ہے۔ اگر کوئی وکیل عدالتی اکھاڑے کے ان داؤ پیچ سے واقف نہ ہو تو وہ جیتی ہوئی بازی بھی ہار جائے گا۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں جو کچھ بھی کر رہا ہوں، یہ میرے پیشے کا تقاضا ہے۔''

''اگر میں غلط نہیں کہہ رہا تو......'' وہ ٹٹولتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''آپ اصل قاتل تک پہنچ چکے ہیں؟''

''کسی حد تک آپ یہ بات کہہ سکتے ہیں......!'' میں نے گول مول جواب دیا۔

''مجھے نہیں بتائیں گے......؟''

''ابھی نہیں!'' میں نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ''قبل از وقت کچھ کہنا مناسب نہیں ہوگا۔ میرا خیال ہے، ایک دو پیشیوں کے بعد سارا معاملہ کھل کر سامنے آجائے گا۔''

''ٹھیک ہے۔'' وہ مصلحت آمیز انداز میں بولا۔ ''اگر آپ سر دست نہیں بتانا چاہتے تو میں اصرار نہیں کروں گا۔ ویسے دنیا اور انسانوں کو سمجھنے کا جتنا تجربہ میں رکھتا ہوں اس کی روشنی میں بڑے وثوق سے میں کہہ سکتا ہوں کہ آپ اصل قاتل تک رسائی حاصل کر چکے ہیں۔''

میں نے اس کے تجرباتی تجزیے کے جواب میں کچھ نہ کہا۔ ہم چلتے ہوئے پارکنگ ایریا میں پہنچ گئے۔ بہ وقتِ رخصت اس نے مجھ سے پوچھا۔

''میرے لیے کیا حکم ہے بیگ صاحب؟''

''آپ کے لیے میری دو تجاویز ہیں۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''ایک تو آپ عدالت کے احاطے میں مجھ سے زیادہ میل جول نہ رکھا کریں۔ جو بھی اہم بات کرنا ہو، آپ میرے دفتر تشریف لا سکتے ہیں یا فون پر بھی بات ہو سکتی ہے۔ میں اس کیس میں آپ کے لیے مخالف وکیل کا کردار ادا کر رہا ہوں۔ ہماری بے تکلف ملاقاتوں سے زیرِ سماعت کیس پر منفی اثرات مرتب ہو سکتے ہیں۔''

''میں سمجھ گیا۔ آئندہ میں اس سلسلے میں احتیاط کروں گا۔'' وہ گہری سنجیدگی سے سر ہلاتے ہوئے بولا پھر پوچھا۔ ''اور دوسری بات؟''

''آپ آئندہ پیشی پر اپنی بیوی کی اس دوست کو عدالت میں پیش کرنے کا بندوبست کریں گے جو بہادر آباد میں رہتی ہے۔ جس نے آپ کی بیوی کو طارق روڈ والا فلیٹ کرائے پر دلوایا تھا۔'' میں نے کہا۔

''خیریت......؟'' وہ سوالیہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔

''ہاں، خیریت ہے۔'' میں نے کہا۔ ''میں سمجھتا ہوں، آئندہ عدالتی کارروائی کے دوران میں اس کی گواہی کی ضرورت پیش آسکتی ہے اور......'' لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اور اگر آسانی سے ممکن ہو تو آئندہ پیشی سے پہلے ان خاتون کو ایک بار دفتر لا کر مجھ سے ملوا بھی دیں۔''

''ٹھیک ہے جناب۔ میں یہ کر لوں گا۔'' اس نے پُراعتماد انداز میں کہا۔ ''آپ اس سلسلے میں بے فکر ہو جائیں۔''

اور میں بے فکر ہو گیا۔

☆☆☆

اگلی پیشی پر سب سے پہلے ہمارے کیس کا نمبر لگا ہوا تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر طمانیت کا احساس ہوا کیونکہ پچھلی دو

پیشیوں پر ہمارے کیس کو بہت کم وقت مل پایا تھا مگر آج امید نظر آ رہی تھی کہ اچھی خاصی عدالتی کارروائی آگے بڑھ جائے گی۔

سب سے پہلے میں نے ملزم کی محلے دار جمیلہ خالہ کو گواہی کے لیے پیش کیا۔ گزشتہ پیشی پر جج نے جمیلہ کو عدالت حاضر کرنے کے لیے خاص طور پر مجھ سے کہا تھا۔ یہ وہی عورت تھی جس کے پاس ملزم نے ساٹھ ہزار روپے والی ''بی سی'' ڈال رکھی تھی اور اسی ساٹھ ہزار روپے کے برتے پر ملزم نے مقتولہ سے پچاس ہزار روپے ادھار مانگے تھے مگر مقتولہ نے اسے رقم دینے سے انکار کر دیا تھا۔ مقتولہ کی طرف سے مایوس ہونے کے بعد اس نے صدیق بھائی سے تین ماہ صبر کرنے کے لیے کہا تھا کیونکہ تین ماہ کے بعد اس کی ''بی سی'' نکل آتی لیکن اس سے پہلے ہی یہ افسوسناک واقعہ پیش آ گیا تھا۔

جمیلہ خالہ نے سچ بولنے کا حلف اٹھایا۔ اس کے بعد اپنا بیان ریکارڈ کرا دیا۔ اس کے بیان سے ان تمام امور کی تصدیق ہوتی تھی جو ملزم کے موقف کا بنیادی جز تھے۔ وکیل استغاثہ نے مختصر سی جرح کے بعد صفائی کے گواہ کو فارغ کر دیا۔ میرا مقصد پورا ہو چکا تھا لہٰذا میں نے گواہ سے کوئی سوال نہیں کیا۔

اس کے بعد استغاثہ کی جانب سے مقتولہ کی گھریلو ملازمہ یعنی نجمہ ماسی کو گواہی کے لیے پیش کیا گیا۔ نجمہ درمیانی عمر کی ایک ہوشیار عورت تھی۔ اس کی آنکھیں مسلسل حرکت میں رہتی تھیں۔ نجمہ کی ایک حوالے سے اس کیس میں بڑی اہمیت تھی۔ یہ وہ عورت تھی جس نے سب سے پہلے مقتولہ کی لاش کو دیکھا تھا بلکہ لاش کی دریافت کا سہرا اسی کے سر جاتا تھا۔

نجمہ نے سچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد اپنا مختصر سا بیان ریکارڈ کرا دیا تو وکیل استغاثہ جرح کے لیے اس کے پاس چلا گیا۔ اس نے ملزم کی جانب اشارہ کرتے ہوئے گواہ سے سوال کیا۔

''کیا تم اس شخص کو جانتی ہو؟''

''جی......!'' اس نے بڑی سرعت سے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''اس بندے نے باجی کو قتل کیا ہے۔''

نجمہ کا جواب اگرچہ خاصا سنسنی خیز تھا تاہم اس وقت کی صورتِ حال میں ملازم وغیرہ اسی نوعیت کے بیان دیا کرتے ہیں۔

وکیل استغاثہ نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا تم جانتی ہو کہ یہ بندہ اکثر مقتولہ سے ملنے اس کے فلیٹ پر آیا کرتا تھا؟''

''جی...... یہ بات مجھے پتا ہے۔'' وہ معتدل انداز میں بولی۔

''اٹھارہ اگست کی صبح جب تم مقتولہ کے گھر کام کرنے آئیں تو تم نے وہاں کیا دیکھا؟'' وکیل استغاثہ نے سوال کیا۔

''میں نے باجی کو بیڈ روم میں مردہ پایا۔'' وہ جھرجھری لیتے ہوئے بولی۔

''اس کے بعد کیا ہوا تھا؟'' وکیل استغاثہ نے سنسناتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

''میں باجی کی لاش کو دیکھ کر بری طرح گھبرا گئی تھی۔'' نجمہ نے اضطراری انداز میں بتایا۔ ''میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ اسی پریشانی میں، میں گھر سے باہر نکل آئی تھی۔''

''گھر سے باہر آ کر تم نے کیا کیا تھا؟''

''کچھ بھی نہیں جی۔'' وہ عجیب سے لہجے میں بولی۔ ''اس کے بعد تو سب کچھ جعفر صاحب نے کیا تھا۔''

''جعفر صاحب......!'' وکیل استغاثہ نے سوالیہ نظر سے گواہ کی طرف دیکھا۔ ''تمہارا مطلب ہے، وہ اسٹیٹ ایجنٹ جس کے توسط سے مقتولہ کوئی فلیٹ وغیرہ خریدنے کا ارادہ رکھتی تھی؟''

''جی...... جی ہاں وہی۔'' وہ ترت بولی۔ ''میں نے جعفر صاحب کو بتایا کہ کسی نے باجی کو قتل کر دیا ہے۔ جعفر صاحب گھر کے اندر آئے۔ انہوں نے صورتِ حال کا جائزہ لیا پھر پولیس کو فون کر کے اس واقعے کے بارے میں بتا دیا تھا۔''

وکیل استغاثہ نے مزید تین چار ضمنی سوال کرنے کے بعد جرح موقوف کر دی۔

اس کے بعد جج سے اجازت لے کر میں وٹنس باکس کے قریب چلا گیا پھر گواہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سوال کیا۔

''نجمہ بی بی! تمہیں مقتولہ کے پاس کام کرتے ہوئے کتنا عرصہ ہوا تھا؟''

''جی چار سال......'' وہ بڑی معصومیت سے بولی۔

''مطلب یہ کہ تم مقتولہ کی خاندانی گھریلو ملازمہ ہو؟'' میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

وہ آنکھیں پٹ پٹاتے ہوئے بولی۔ ''جی، میں سمجھی نہیں......''

''میرا مطلب یہ ہے کہ کیا تم مقتولہ کے خاندان کی کئی سال سے خدمت کر رہی ہو؟'' میں نے وضاحت

کرتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں ان کے پاس کام کرتے ہوئے طویل عرصہ گزر گیا ہے؟''

''جی نہیں۔ ایسی تو کوئی بات نہیں۔'' وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولی۔

''پھر تم نے جھوٹ کیوں بولا؟'' میں نے قدرے سخت لہجے میں پوچھا۔

''جھوٹ......'' وہ الجھ کر رہ گئی۔ ''میں نے کون سا جھوٹ بولا ہے؟''

''میری معلومات کے مطابق مقتولہ کو کرائے کے اس فلیٹ میں رہائش اختیار کیے لگ بھگ ایک سال ہو گیا تھا جب یہ افسوس ناک واقعہ پیش آیا'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ''اور تم نے تھوڑی دیر پہلے میرے ایک سوال کے جواب میں بتایا ہے کہ تمہیں مقتولہ کے پاس کام کرتے ہوئے چار سال ہو گئے تھے۔ یہ جھوٹ نہیں تو اور کیا ہے......؟''

''آپ میری بات کو سمجھ نہیں سکے وکیل صاحب۔'' وہ جلدی سے صورتِ حال کو سنبھالتے ہوئے بولی۔ ''یا یوں کہیں کہ میں ٹھیک طرح سے آپ کو بتا نہیں سکی۔ میرا وہ مطلب نہیں تھا جو آپ نے لیا۔''

''پھر تمہارا کیا مطلب تھا نجمہ بی بی؟'' میں نے گھور کر اس کی طرف دیکھا۔

''وہ جی...... میں یہ کہہ رہی تھی کہ مجھے اس گھر میں کام کرتے ہوئے چار سال ہو گئے ہیں۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''باجی تو سال، سوا سال پہلے اس گھر میں رہنے آئی تھیں۔ باجی سے پہلے جو لوگ وہاں رہ کر گئے تھے، میں ان کے پاس بھی کام کرتی تھی۔ باجی جب اس فلیٹ میں رہنے آئیں تو میں آ کر ان سے ملی اور ان سے کام کے بارے میں پوچھا۔ باجی کو کام کرنے والی ماسی کی ضرورت تھی۔ انہوں نے مجھے رکھ لیا۔''

''تو تمہارے کہنے کا یہ مطلب ہوا کہ تم مقتولہ کے پاس سال، سوا سال سے کام کر رہی تھیں؟'' میں نے تصدیق طلب انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ ''ویسے تمہیں اس فلیٹ میں ماسی گیری کرتے ہوئے چار سال ہو گئے ہیں......؟''

''جی...... یہی حقیقت ہے۔'' وہ گردن کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولی۔

''نجمہ بی بی!'' میں نے جرح کے سلسلے کو دراز کرتے ہوئے پوچھا۔ ''تم نے تھوڑی دیر پہلے وکیل استغاثہ کے ایک سوال کے جواب میں، ملزم کے حوالے سے بتایا ہے کہ...... اس بندے نے باجی کو قتل کیا ہے...... کیا تم نے ملزم کو قتل کی یہ واردات کرتے ہوئے دیکھا تھا؟''

''نن...... نہیں جی......'' وہ گڑبڑائے ہوئے انداز میں بولی۔ ''قتل تو پچھلی رات کو ہوا تھا اور...... میں صبح میں باجی کے پاس کام کرنے آتی ہوں...... میں بھلا باجی کو قتل ہوتے کیسے دیکھ سکتی ہوں؟''

''پھر تم نے اتنے وثوق سے کیسے بتایا کہ ملزم نے مقتولہ کو قتل کیا ہے؟''

''وہ جی...... یہ بندہ باجی کے قتل کے الزام ہی میں تو عدالت تک پہنچا ہے۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''اگر اس نے باجی کو قتل نہ کیا ہوتا تو پھر اس پر قتل کا مقدمہ کیوں چلتا......؟''

''میرے موکل پر تمہاری باجی کو قتل کرنے کا الزام ہے، اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اس نے تمہاری باجی کو قتل بھی کیا ہے۔'' میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''یہ فیصلہ کرنا عدالت کا کام ہے کہ تمہاری باجی کا اصل قاتل کون ہے۔''

''جی...... مجھے جو پتا تھا، وہ میں نے آپ کو بتا دیا ہے۔'' وہ معتدل انداز میں بولی۔ ''موٹی عقل کی ہوں نا...... مجھے اپنی بات سمجھانا نہیں آتی۔''

''وکیل استغاثہ کے ایک سوال کے جواب میں تم نے اس امر کی تصدیق بھی کی ہے کہ تم ملزم کے حوالے سے جانتی ہو کہ یہ مقتولہ سے ملنے آیا کرتا تھا۔'' میں نے کہا۔ ''یہ بات تمہیں کس طرح پتا چلی تھی؟''

''کس طرح پتا چلنا تھی جناب......'' وہ منہ بگاڑ کر بولی۔ ''میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور باجی نے بھی مجھے بتایا تھا۔''

''تم نے اپنی آنکھوں سے کیا دیکھا تھا اور تمہاری باجی نے تمہیں کیا بتایا تھا؟'' میں نے گواہ کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ ''نجمہ بی بی! میں تمہاری زبان سے حقیقت جاننا چاہتا ہوں......؟''

''جناب! یہ بندہ......'' وہ انگلی سے اکیوزڈ باکس میں کھڑے ملزم کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ''کئی بار میری موجودگی میں بھی باجی سے ملنے آتا رہا ہے۔ باجی نے مجھے بتایا تھا کہ یہ کسی ایسے محکمے میں کام کرتا ہے جس کا تعلق ڈاک وغیرہ سے ہے۔ یہ باجی کے خط وغیرہ لے کر آیا کرتا تھا۔''

''صرف خط یا......؟'' میں نے معنی خیز انداز میں

اس کی طرف دیکھا۔

''یا کیا جی؟'' وہ الجھن زدہ لہجے میں بولی۔

''میرا مطلب ہے کہ ملزم صرف خطوط پہنچانے مقتولہ کے فلیٹ پر آیا کرتا تھا یا اس کا تمہاری مقتولہ باجی سے کوئی اور بھی تعلق تھا؟'' موقع محل دیکھتے ہوئے میں نے ملزم کی حمایت میں جانے والا ایک سنسنی خیز سوال کر ڈالا تھا۔

''جی...... میں آپ کی بات سمجھ نہیں سکی۔'' وہ سوالیہ نظر سے مجھے تکنے لگی۔ ''آپ کس قسم کے تعلق کی بات کر رہے ہیں؟''

''پیار محبت کا تعلق!'' میں نے نجمہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ٹھوس انداز میں کہا۔ ''گھریلو ملازموں کو ایسے معاملات کی بڑی خبر ہوتی ہے۔ کیا ملزم اور مقتولہ کے درمیان کوئی عشق وغیرہ چل رہا تھا؟''

''نہیں جی......'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''میرے علم میں ایسی کوئی بات نہیں۔''

''نجمہ بی بی! اٹھارہ اگست کی صبح جب تم حسبِ معمول کام کرنے مقتولہ کے گھر پہنچیں تو تم نے مقتولہ کو بیڈ روم میں مردہ پایا تھا۔'' میں نے سوالات کے زاویے میں تھوڑی تبدیلی لاتے ہوئے کہا۔ ''کیا میں صحیح کہہ رہا ہوں؟''

''جی ہاں......'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''میں نے بیڈ روم میں باجی کی لاش پڑی دیکھی تھی۔''

''تمہیں کیسے پتا چلا کہ مقتولہ زندگی سے خالی ہو چکی ہے؟'' میں نے تیز لہجے میں دریافت کیا۔ ''کیا تم نے مقتولہ کی لاش کو ہلا جلا کر یا چھو کر دیکھا تھا؟''

''نن...... نہیں......!'' اس نے نفی میں گردن ہلا دی۔

''پھر تم نے کس بات سے اندازہ لگایا کہ مقتولہ مر چکی ہے؟'' میں نے استفسار کیا۔ ''یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ وہ گہری بے ہوشی میں ہو......''

''جی نہیں۔'' وہ قطعیت سے بولی۔ ''باجی بے ہوشی کی حالت میں نہیں تھیں۔ میں نے ان کے سر کا پچھلا حصہ دیکھ لیا تھا جہاں سے نکلنے والے خون نے فرش کو بھی رنگ دیا تھا اور قریب ہی تھوڑے فاصلے پر پتھر کا وہ گلدان بھی پڑا تھا جس کی ضرب لگا کر باجی کو موت کے گھاٹ اتار گیا تھا۔ گلدان کے ایک کونے پر بھی خون لگا ہوا تھا۔''

''بھئی واہ......!'' میں نے تعریفی انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ ''تمہیں تو پولیس میں یا کسی تفتیشی ادارے میں ہونا چاہیے......''

میرے اس میٹھے طنز پر وہ کچھ نہیں بولی۔ میں نے سوالات کے سلسلے کو سمیٹتے ہوئے استغاثہ کی گواہ سے پوچھا۔

''مقتولہ کی لاش کو دیکھ کر تم بری طرح گھبرا گئی تھیں اور اسی پریشانی میں گھر سے باہر نکل آئی تھیں تاکہ دوسروں کو اس واقعے کے بارے میں بتا سکو۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟''

''جی نہیں...... آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔

''اور جیسے ہی تم باہر نکلیں، تم نے جعفر علی کو دیکھا؟''

''جی...... جی ہاں۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔

''تم نے اسٹیٹ ایجنٹ جعفر علی کو بتایا کہ کسی نے تمہاری باجی یعنی مقتولہ کو قتل کر دیا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''جعفر علی تمہارے ساتھ گھر کے اندر آئے پھر صورتِ حال کی سنگینی کو بھانپتے ہوئے انہوں نے پولیس اسٹیشن فون کر کے اس واقعے کی اطلاع دی تھی۔ ایسا ہی ہوا تھا نا؟''

''جی بالکل ایسا ہی ہوا تھا۔''

''تم اسٹیٹ ایجنٹ جعفر علی کو کب سے جانتی ہو؟''

''اسی دن سے جب یہ واقعہ پیش آیا تھا۔'' اس نے جواب دیا۔

''یعنی وقوعہ سے پہلے تمہاری کبھی جعفر علی سے ملاقات نہیں ہوئی تھی؟'' میں نے پوچھا۔

''جی نہیں۔'' اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''کبھی نہیں......!''

''گویا جعفر علی تمہارے لیے بالکل نیا تھا؟''

''جی ہاں، میں نے اسے زندگی میں پہلی بار دیکھا تھا۔''

''جب اسٹیٹ ایجنٹ جعفر علی تمہارے لیے ایک اجنبی شخص تھا۔ زندگی میں پہلے کبھی اس سے تمہاری ملاقات نہیں ہوئی تھی تو......'' میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں اضافہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''تو پھر کس بنا پر تم نے جعفر علی کو بتایا تھا کہ کسی نے تمہاری باجی کو قتل کر دیا ہے۔ اس قسم کی اطلاعات تو کسی شناسا یا متعلقہ شخص ہی کو دی جا سکتی ہیں......؟''

''میں جعفر صاحب کو بالکل نہیں جانتی تھی۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''جب میں گھبرا کر گھر سے باہر نکلی تو وہ سامنے نظر آئے۔ میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی انہوں نے پوچھا کہ کیا بات ہے۔ میڈم ہما تو ٹھیک ہیں نا؟ انہوں نے باجی کا نام لیا تو میں سمجھ گئی کہ وہ باجی کے کوئی جاننے والے یا عزیز ہیں اسی لیے میں نے انہیں بتایا تھا کہ...... کسی نے باجی کو قتل کر دیا ہے۔''

''ٹھیک ہے، تمہاری وضاحت میں معقولیت اور منطق پائی جاتی ہے۔'' میں نے کہا۔
''اب میں تم سے جو بھی پوچھوں، اس کا اچھی طرح سوچ سمجھ کر جواب دینا۔''
وہ الجھن زدہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے پوچھا۔
''تم روزانہ کتنے بجے مقتولہ کے گھر کام کرنے جایا کرتی تھیں؟''
''لگ بھگ نو بجے صبح۔''
''اور کام سے فارغ کب تک ہو جاتی تھیں؟''
''دس بجے کے آس پاس لیکن......''
وہ کچھ کہتے کہتے رکی تو میں نے جلدی سے کہا۔
''لیکن کیا......؟''
''یہ نو سے دس بجے تک کا وقت عام دنوں کے لیے ہے۔'' اس نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ ''اتوار کے دن باجی دیر تک سوتی تھیں اس لیے میں دس سے گیارہ بجے تک کام کرنے کے لیے آیا کرتی تھی یعنی عام دنوں سے ایک گھنٹا لیٹ۔''
''اٹھارہ اگست کو اتوار نہیں تھا۔'' میں نے نجمہ ماسی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اس لیے تم نو بجے ہی مقتولہ کے گھر پہنچی ہو گی...؟''
''جی!'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ''جی ہاں......''
''جب تم مقتولہ کے گھر پہنچیں تو تمہارے لیے دروازہ کس نے کھولا تھا؟'' میں نے پوچھا۔
''دروازہ......!'' اس نے ایک لمحہ سوچا پھر جواب دیا۔ ''دروازہ تو پہلے سے کھلا ہوا تھا۔''
''دروازہ پہلے سے کھلا ہوا تھا...... کیا مطلب ہے تمہارا؟''
''میں نے باجی کے گھر پہنچ کر حسبِ معمول دروازے کی گھنٹی بجائی تھی۔'' اس نے بتایا۔ ''دو تین بار گھنٹی بجانے کے باوجود بھی جب دروازہ نہیں کھلا تو میں نے دروازے پر دستک دینا شروع کی مگر اس کا بھی کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا چنانچہ بے خیالی میں، میں نے دروازے کے ہینڈل کو گھما کر دیکھا اور اس وقت پتا چلا کہ دروازہ اندر سے لاک نہیں تھا۔ مجھے اس بات پر حیرت تو ہوئی تاہم یہ سوچ کر میں فلیٹ کے اندر داخل ہو گئی کہ شاید باجی اس وقت واش روم میں ہوں اور انہوں نے میرے لیے بیرونی دروازہ کھلا چھوڑ دیا ہو۔ میرا مطلب ہے، اس کا لاک کھول دیا ہو لیکن جب میں بیڈ روم میں پہنچی تو وہاں باجی کو مردہ حالت میں پڑے دیکھا......''
میں نے استغاثہ کی گواہ نجمہ ماسی پر جرح ختم کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا جناب عالی......!''
اگلی گواہی ٹیلر ماسٹر اصغر صاحب کی تھی۔ مقتولہ کے فلیٹ کے نیچے گلی میں ماسٹر صاحب کی ٹیلرنگ شاپ تھی۔ ماسٹر صاحب اس بات کے گواہ تھے کہ انہوں نے وقوعہ کی رات ملزم کو مقتولہ والی بلڈنگ میں داخل ہوتے دیکھا تھا اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ ملزم وہاں پر صرف مقتولہ ہی سے ملنے آتا تھا۔ باوجود کوشش کے بھی ماسٹر صاحب ملزم کی آمد و شد کا درست وقت نہیں بتا سکے۔ وکیل استغاثہ کے اصرار پر وہ اس کا مطلوبہ وقت بتانے لگتے اور میری تنقید پر وہ الجھن میں پڑ جاتے کہ شاید میں ہی ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ بہر حال، ماسٹر صاحب کافی کھسکے ہوئے نظر آتے تھے۔ میری نظر میں وہ گواہ کی اہلیت پر پورے نہیں اترتے تھے۔ ماسٹر صاحب کے بعد استغاثہ کی جانب سے عامر نامی ایک نوجوان کو گواہی کے لیے عدالت میں پیش کیا گیا۔
عامر بھی اسی کوریئر کمپنی میں ملازم تھا جہاں اس کیس کا ملزم کام کرتا تھا۔ عامر نے کھلم کھلا ملزم کے خلاف بیان دیا تھا اور اس کا فوکس اس بات پر تھا کہ ملزم عشق کا جھانسا دے کر مقتولہ کو بے وقوف بناتا رہتا تھا۔ گواہ نے وکیل استغاثہ کے مختلف سوالات کے جواب میں یہ بھی بتایا کہ یہ ضروری نہیں تھا کہ ملزم صرف ڈاک لے کر ہی مقتولہ کے فلیٹ پر جایا کرتا تھا۔ وہ اپنی مرضی سے جب جی چاہتا، وہاں پہنچ جاتا تھا۔ وقوعہ کے روز بھی وہ کسی لیٹر کے بغیر ہی وہاں گیا تھا۔
میں نے عامر پر نہایت ہی مختصر جرح کی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ اس کے پاس اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ مقتولہ اور ملزم کے بیچ عشقیہ معاملات چل رہے تھے۔ جواب میں اس نے بتایا کہ اس کے پاس ان کے عشق کے دستاویزی ثبوت تو نہیں ہیں تاہم یہ باتیں گاہے بہ گاہے خود ملزم ہی نے اسے بتائی تھیں۔ بہر حال، رسمی سی جرح کے بعد میں نے استغاثہ کے جھوٹے گواہ عامر پر جرح ختم کرتے ہوئے جج سے کہا۔
''جناب عالی! عدالت میں شروع سے لے کر اب تک استغاثہ کی جانب سے اس بات کو بڑھا چڑھا کر اچھالا جا رہا ہے کہ مقتولہ اور ملزم کے بیچ عشقیہ نوعیت کے کچھ معاملات چل رہے تھے اور ان معاملات میں ملزم بد دیانتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنا الو سیدھا کرتا رہتا تھا جبکہ حقیقت اس کے برعکس تھی۔''
میں نے دانستہ بات ادھوری چھوڑی تو جج نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔ ''اور حقیقت کیا ہے؟''

''حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں کے بیچ پیار محبت والا کوئی معاملہ تھا ہی نہیں اور اس امر کی تصدیق استغاثہ کی گواہ نجمہ ماسی کے بیان سے بھی ہوتی ہے۔ نجمہ کے علاوہ میرے پاس ایک ایسی گواہ بھی موجود ہے جو مقتولہ کے معاملات کو سب سے زیادہ بہتر انداز میں جانتی ہے۔''
''کون ہے وہ گواہ؟'' جج نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھا۔
''مقتولہ کی عزیز ترین اور واحد دوست نشا!'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''جس نے مقتولہ کو طارق روڈ والا وہ فلیٹ کرائے پر دلوایا تھا۔ وہ خود بہادر آباد میں رہتی ہے۔ مقتولہ کی زندگی کا کوئی گوشہ نشا سے ڈھکا چھپا نہیں ہے۔''
''کیا آپ نشا کو گواہی کے لیے عدالت میں پیش کرسکتے ہیں؟'' جج نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔
میں چونکہ مقتولہ کے شوہر کے توسط سے پہلے ہی اس کا بندوبست کرچکا تھا اس لیے پُراعتماد لہجے میں جواب دیا۔
''جی ہاں......صرف ایک منٹ میں......''
''اس کا مطلب ہے، نشا اس وقت عدالت کے احاطے میں کہیں موجود ہے؟'' جج کی سرسراتی ہوئی آواز ابھری۔
''جناب عالی!'' میں نے ڈرامائی انداز میں کہا۔ ''احاطے میں نہیں بلکہ وہ اس وقت عدالت کے کمرے کے اندر موجود ہے۔''

☆☆☆

منظر اسی عدالت کا تھا اور گواہوں والے کٹہرے میں استغاثہ کا سب سے اہم اور آخری گواہ اسٹیٹ ایجنٹ جعفر علی کھڑا تھا۔ جعفر علی کی عمر پینتالیس اور پچاس کے درمیان رہی ہوگی۔ وہ اس وقت عمدہ تراش کے ایک نفیس سوٹ میں ملبوس تھا۔ جعفر علی نے سچ بولنے کا حلف اٹھایا پھر اپنا مختصر سا بیان ریکارڈ کرادیا۔ آج استغاثہ کی جانب سے مقتولہ اور ملزم کے عشقیہ معاملات کو اچھالنے کی ایک ذراسی کوشش بھی نہیں کی گئی تھی اور اس کی ایک خاص وجہ تھی۔
پچھلی پیشی پر صفائی کی گواہ نشا نے بڑے بھرپور انداز میں حقِ دوستی نبھاتے ہوئے مقتولہ کا دفاع کیا تھا جو... بہ الفاظ دیگر میرے موکل یعنی اس کیس کے ملزم کا بھی دفاع تھا۔ اسی سبب آج استغاثہ نے اس ایشو کو ٹچ کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔
وکیل استغاثہ نے گواہ کو فارغ کیا تو میں جج کی اجازت حاصل کرنے کے بعد وٹنس باکس کے قریب چلا گیا۔ میں نے اپنے مخصوص انداز میں ہلکی پھلکی چھیڑ چھاڑ سے جرح کا آغاز کیا۔
''جعفر صاحب! آج کل اسٹیٹ کا بزنس کیسا چل رہا ہے؟''
وہ بھی زندہ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔ ''اسٹیٹ کے معاملات تو آپ ہیڈ آف اسٹیٹ یعنی صدر پاکستان سے پوچھیں وکیل صاحب۔ امورِ حکمرانی سے مجھ غریب کا کیا کام......''
''ٹھیک ہے، اسٹیٹ نہ سہی ریئل اسٹیٹ ہی کے بارے میں بتادیں۔'' میں نے زیرِلب مسکراتے ہوئے کہا۔ ''آپ غریب کا جس چیز سے واسطہ ہے، وہی پوچھ لیتے ہیں۔''
''بس جی، اللہ کا شکر ہے۔'' وہ معتدل انداز میں بولا پھر گہری سنجیدگی سے پوچھنے لگا۔ ''آپ کا کوئی مسئلہ ہو تو بتائیں؟''
عدالتی کارروائی کے دوران میں اگر اس قسم کی کوئی بات صفائی کے گواہ کی طرف سے آتی تو ابھی تک وکیل استغاثہ کی تیز آواز عدالت کے کمرے میں گونج چکی ہوتی۔ ''آبجیکشن یور آنر......!''
''میرا کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے۔'' میں نے جعفر علی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ویسے خرید و فروخت کے سلسلے میں آپ لوگوں کا یہ فارمولا میری سمجھ میں بالکل نہیں آتا......''
''کون سا فارمولا وکیل صاحب؟'' وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔
''اگر کوئی شخص کچھ خریدنے کے لیے آپ کے پاس پہنچے تو آپ کے مطابق مارکیٹ بہت چڑھی ہوئی ہوتی ہے۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''اگر اسی وقت کوئی شخص اپنی پراپرٹی بیچنے کے سلسلے میں آجائے تو آپ اسے مارکیٹ گری ہوئی بتاتے ہیں۔ یہ کیا راز ہے آخر؟''
''ایسا ہوتا ضرور ہے مگر یہ کوئی فارمولا نہیں۔'' وہ بڑی رسان سے بولا۔ ''آپ اسے تمام اسٹیٹ ایجنٹس پر لاگو نہیں کرسکتے۔ زندگی کے ہر شعبے میں کالی بھیڑیں تو ہوتی ہی ہیں۔ ہماری فیلڈ میں بھی ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جو ذاتی مفاد کی خاطر کسٹمرز کے ساتھ غلط بیانی کرتے ہیں۔ بہرحال، میں اس روّیے کو مناسب نہیں سمجھتا۔''
''کافی عرصے کے بعد ایک معقول اور باشعور اسٹیٹ ایجنٹ سے ملاقات ہوئی ہے۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا پھر زیرِ سماعت موضوع کی طرف آگیا اور پوچھا۔ ''جعفر صاحب! آپ مقتولہ اور ملزم کے باہمی تعلقات کے بارے میں کیا جانتے ہیں؟''

''کچھ زیادہ نہیں۔'' وہ سادہ سے لہجے میں بولا۔
''ایک دوبار یہ مقتولہ کے ساتھ میرے آفس یعنی میری ایجنسی پر آیا تھا۔''
''اور مقتولہ کو آپ کب سے جانتے ہیں؟''
''اس سے بھی تین چار بار ہی ملاقات ہوئی تھی۔'' وہ معتدل انداز میں بولا۔
''کیا یہ درست ہے کہ مقتولہ آپ کے توسط سے گلشن اقبال میں کوئی پلاٹ خریدنا چاہتی تھیں؟'' میں نے پوچھا۔
وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''جی ہاں، یہ بات درست ہے۔''
''اور اسی سلسلے میں مقتولہ نے وقوعہ سے ایک روز پہلے بینک سے پچاس ہزار روپے نکلوائے تھے؟'' میں نے جرح کے سلسلے کو دراز کرتے ہوئے پوچھا۔
''جی ہاں، بالکل۔'' وہ تائیدی انداز میں بولا۔
''جس روز صبح مقتولہ کی لاش اس کے فلیٹ سے دریافت ہوئی، اس دن پارٹی کو پیمنٹ کرنا تھی۔ اسی لیے ایک روز پہلے مقتولہ نے بینک سے پچاس ہزار روپے نکلوالیے تھے۔''
اس قسم کے معاملات میں پیمنٹ عموماً پے آرڈر سے کی جاتی ہے لیکن بعض لوگ کیش کو ترجیح دیتے ہیں اس لیے میں نے اس حوالے سے جرح نہیں کی۔
''یعنی یہ بات آپ کے علم میں تھی کہ وقوعہ کی رات مقتولہ کے فلیٹ پر پچاس ہزار روپے کیش رکھے ہوئے ہیں؟''
اس نے اثبات میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔
میں نے پوچھا۔ ''آپ کو کیش والی یہ بات کس طرح پتا چلی تھی؟''
''مقتولہ نے خود بتائی تھی۔'' اس نے جواب دیا۔
''کب......؟''
''سترہ اگست کو۔''
''مطلب اسی روز جب اس نے بینک سے رقم نکلوائی تھی؟''
''جی ہاں......!'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔
''یہ بھی درست ہے کہ اٹھارہ اگست کی صبح آپ مقتولہ سے ملنے اس کے فلیٹ پر گئے تھے۔'' میں نے کہا۔ ''یہ الگ بات کہ آپ کی ملاقات اس کی لاش سے ہوئی تھی؟''
''جی...... اور مجھے اس واقعے کا سخت افسوس ہے۔'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا جب میں وہاں پہنچوں گا تو وہ مجھے مردہ حالت میں ملے گی۔''
''مقتولہ کی موت کے بارے میں سب سے پہلے آپ کو کس نے بتایا تھا؟''

سات عادتیں

☆ ایک دفعہ خلیفہ ہارون الرشید نے لوگوں سے کہا۔ اگر نیک بننا چاہتے ہو تو بچوں جیسی عادتیں اپنالو۔ بچوں میں سات عادتیں ہوتی ہیں اگر بڑوں میں بھی ہوں تو وہ صحیح معنوں میں مومن بن جاتے ہیں، وہ یہ ہیں۔

(1) بچے رزق کا غم نہیں کرتے۔
(2) مل کر کھاتے ہیں۔
(3) لڑتے ہیں تو دل میں کینہ نہیں رکھتے۔
(4) لڑائی کے بعد جلد صلح کر لیتے ہیں۔
(5) اپنے بڑوں سے ڈرتے ہیں۔
(6) ذرا سی دھمکی سے رونے لگتے ہیں۔
(7) دشمنی کا لباس نہیں پہنتے۔

مرسلہ۔ طالب حسین طلحہ، تحصیل حاصل پور منڈی

''اس کی گھریلو ملازمہ نے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''میں زینے چڑھ کر فلیٹ کے دروازے پر پہنچا ہی تھا کہ دروازہ کھلا اور ملازمہ گھبرائی ہوئی باہر نکلی پھر اس نے بتایا کہ باجی کو کسی نے قتل کردیا ہے۔ اس وقت مجھے معلوم نہیں تھا کہ باجی سے اس کی مراد کیا تھی لیکن جب میں ملازمہ کے ساتھ فلیٹ کے اندر پہنچا تو بیڈروم میں مقتولہ کی لاش دیکھ کر صورتِ حال واضح ہوگئی۔''
''پولیس کو بھی آپ ہی نے اطلاع دی تھی......؟''
''جی ہاں۔'' اس نے اثبات میں جواب دیا۔
''جب پولیس جائے وقوعہ پر پہنچی تو آپ وہاں موجود تھے؟''
''بالکل...... میں پولیس کی آمد کے بعد ہی وہاں سے گیا تھا۔''
''جعفر صاحب!'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔ ''میری معلومات کے مطابق آپ پولیس کی آمد کے فوراً بعد ہی جائے وقوعہ سے رخصت ہوگئے تھے...... پانچ دس منٹ بعد...... کیونکہ آپ کو کوئی ضروری کام یاد آگیا تھا؟''
''جی ہاں...... آپ کی معلومات بالکل درست ہیں۔''
''کیا میں جان سکتا ہوں کہ وہ ضروری کام کون سا تھا جس نے آپ کو جائے وقوعہ پر پولیس کی کارروائی دیکھنے کے لیے رکنے کی اجازت نہیں دی تھی؟'' میں نے بے دستور

اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''مجھے پارٹی کو صورتِ حال سے آگاہ کرنا تھا اس لیے میں جائے وقوعہ پر زیادہ دیر رک نہیں سکا تھا۔'' اس نے پُراعتماد انداز میں جواب دیا۔

''کون سی پارٹی...... ؟'' میں نے تیز آواز میں استفسار کیا۔

''جس پارٹی سے مقتولہ گلشن اقبال والا پلاٹ خرید رہی تھی۔'' اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا پھر تفصیل بتانے لگا۔ ''گزشتہ روز یہ بات طے ہوگئی تھی کہ پارٹی ڈائریکٹ رجسٹری آفس پہنچے گی اور میں مقتولہ کو ساتھ لے کر آؤں گا۔ جب میں مقتولہ کے فلیٹ پر پہنچا تو وہاں کی صورتِ حال ہی بدلی ہوئی تھی۔ اس سانحے کے بعد مقتولہ کو ساتھ لے کر رجسٹری آفس کا رخ کرنا میرے لیے ممکن نہیں رہا تھا لہٰذا میں نے پارٹی کے گھر فون کیا تو وہاں سے پتا چلا کہ پارٹی رجسٹری آفس کی جانب روانہ ہوچکی ہے۔ اب میرے پاس صرف ایک ہی راستہ باقی رہ گیا تھا کہ فوری طور پر رجسٹری آفس پہنچ کر پارٹی کو بتاؤں کہ پلاٹ والی ڈیل اب ممکن نہیں رہی۔ اگر میں پارٹی کو اطلاع نہ کرتا تو وہ بے چارہ ہمارے انتظار میں رجسٹری آفس میں بیٹھا پریشان ہوتا رہتا......'' لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس خارج کی پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔ ''یہ ہے ساری کہانی جناب......!''

''جعفر صاحب! آپ کی اس کہانی سے یہ تو ظاہر ہوتا ہے کہ سترہ اگست کو آپ کے اور مقتولہ کے درمیان یہ تو طے ہوگیا تھا کہ اٹھارہ اگست کی صبح آپ دونوں ایک ساتھ رجسٹری آفس جائیں گے۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''لیکن کیا یہ بات بھی طے شدہ تھی کہ آپ مقتولہ کو اس کے فلیٹ سے پک کریں گے...... آپ اٹھارہ اگست کی صبح مقتولہ کے فلیٹ پر کیا لینے گئے تھے؟''

''جی ہاں، آپ کا اندازہ بالکل درست ہے۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''گزشتہ رات یہ بات بھی طے ہوگئی تھی کہ میں اگلی صبح مقتولہ کو اس کے فلیٹ سے پک کرلوں گا اور اسی لیے میں اس کے فلیٹ پر پہنچا تھا۔''

''گزشتہ رات یہ بات طے ہوگئی تھی۔'' میں نے اسی کے الفاظ دہرائے پھر استفسار کیا۔ ''گزشتہ رات کتنے بجے......؟''

''فکس ٹائم بتانا تو مشکل ہے۔'' وہ سادہ سے لہجے میں بولا۔ ''یہی کوئی نو، سوا نو بجے......!''

اس کے جواب نے مجھے چونکنے پر مجبور کردیا۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق مقتولہ کی موت سترہ اگست رات نو اور دس بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی اور جعفر علی نو، سوا نو بجے کی بات کررہا تھا گویا مقتولہ نے اپنی موت سے پہلے آخری مرتبہ استغاثہ کے گواہ جعفر علی سے بات کی تھی۔

''جعفر صاحب!'' میں نے گواہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سنسنی خیز انداز میں پوچھا۔ ''معزز عدالت یہ جاننا چاہتی ہے کہ وقوعہ کے روز رات نو، سوا نو بجے آپ اور مقتولہ کے درمیان اگلے روز کے پروگرام کے حوالے سے کہاں بات ہوئی تھی...... فون پر یا آپ کی اسٹیٹ ایجنسی پر......؟''

''نہ فون پر اور نہ ہی اسٹیٹ ایجنسی پر۔'' وہ سادگی سے بولا۔

میں نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔ ''پھر کہاں؟''

''مقتولہ کے فلیٹ پر۔'' اس نے جواب دیا۔

''کیا مطلب؟'' میں نے اضطراری انداز میں پوچھا۔ ''کیا آپ سترہ اگست کی رات مقتولہ سے ملنے اس کے فلیٹ پر گئے تھے؟''

''جی ہاں......'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں لگ بھگ دس منٹ وہاں رکا تھا۔ یوں سمجھ لیں، نو سے سوا نو بجے تک۔ ہمارے درمیان کل کا پروگرام طے ہوا اور پھر میں وہاں سے نکل آیا تھا۔ مقتولہ نے چائے کے لیے بہت اصرار کیا تھا اور یہ بھی کہا تھا کہ چائے تیار رکھی ہے مگر میں نے معذرت کرلی تھی کیونکہ میں چائے پیتا ہی نہیں۔''

''اوہ......!'' میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور کہا۔ ''اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ جب آپ رات نو، سوا نو بجے مقتولہ کے فلیٹ سے نکلے تو وہ زندہ تھی؟''

''جی ہاں۔'' اس نے اثبات میں گردن ہلائی اور بولا۔ ''اسی لیے تو جب اٹھارہ اگست کی صبح میں مقتولہ کے فلیٹ پر پہنچا اور گھبرائی ہوئی ملازمہ نے مجھے بتایا کہ باجی کو کسی نے قتل کردیا ہے تو مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا کیونکہ میں رات کو اسے زندہ سلامت چھوڑ کر گیا تھا۔''

''جعفر صاحب!'' میں نے استغاثہ کے گواہ کو تیز نظر سے گھورا۔ ''ابھی آپ نے فرمایا کہ جب آپ اٹھارہ اگست کی صبح مقتولہ کے فلیٹ پر پہنچے تو مقتولہ کی گھریلو ملازمہ نے آپ کو بتایا کہ باجی کو کسی نے قتل کردیا ہے۔ آپ کو کیسے پتا چلا کہ اطلاع دینے والی وہ عورت مقتولہ کی گھریلو ملازمہ ہے اور...... کچھ دیر پہلے آپ معزز عدالت کو بتا چکے ہیں کہ گھریلو ملازمہ کی اطلاع پر آپ کو یہ اندازہ نہیں ہوسکا تھا کہ ''باجی'' سے اس کی کیا مراد ہے۔ یہ تو بیڈروم میں پہنچ کر آپ کو پتا چلا تھا کہ مقتولہ کو کسی نے موت کے گھاٹ اتار دیا ہے؟''

''یہ صحیح ہے کہ ''باجی'' کے ذکر پر میرا دھیان مقتولہ کی

طرف نہیں گیا تھا۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''مگر اتنا تو مجھے پتا تھا کہ اطلاع دینے والی مقتولہ کی گھریلو ملازمہ ہی تھی۔''

''کیسے پتا تھا......؟'' میں نے تیز لہجے میں استفسار کیا۔ ''کیا آپ پہلے سے اس کو جانتے تھے؟''

''جانتا تو نہیں تھا......'' وہ معتدل انداز میں بولا۔ ''لیکن مجھے اندازہ تھا کہ یہ عورت مقتولہ کے گھر میں کام کرنے والی کوئی ماسی ہے۔''

''اندازہ کیسے ہوا تھا؟'' میں نے بال کی کھال اتارتے ہوئے سوال کیا۔ ''کیا اس کے چہرے پر ''ماسی'' یا ''گھریلو ملازمہ'' کے الفاظ لکھے ہوئے آپ نے دیکھ لیے تھے؟''

''آپ بھی کیسی باتیں کرتے ہیں وکیل صاحب......'' وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''کسی کے چہرے پر بھلا ایسی باتیں کہاں لکھی ہوتی ہیں۔''

''پھر......!'' میں آسانی سے اس کی جان چھوڑنے والا نہیں تھا۔ ''پھر آپ نے کس بات سے اندازہ لگایا کہ وہ عورت مقتولہ کی گھریلو ملازمہ ہے؟''

''میں نے گزشتہ رات مقتولہ کو جس لہجے میں اس عورت کے ساتھ بات کرتے دیکھا اور سنا تھا، ایسا انداز عموماً گھریلو ملازماؤں کے لیے ہی اپنایا جاتا ہے۔''

''گزشتہ رات......!'' میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''مطلب یہ کہ جب آپ آئندہ روز کی پلاننگ کرنے مقتولہ کے فلیٹ پر گئے تھے؟''

''جی ہاں......آپ کا اندازہ درست ہے۔''

''کیا اس وقت نجمہ ماسی بھی وہاں موجود تھی؟''

وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''نہیں......''

''پھر؟'' میں نے سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ ''آپ نے کہاں مقتولہ اور گھریلو ملازمہ کے مابین ہونے والی گفتگو سماعت فرمائی تھی؟''

''سترہ اگست کی رات جب نو، سوا نو بجے میں مقتولہ سے ملاقات کر کے اس کے فلیٹ سے باہر نکلا تو گھریلو ملازمہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آرہی تھی۔'' استغاثہ کے گواہ جعفر علی نے بڑے اطمینان سے بتایا۔ ''مقتولہ چونکہ مجھے رخصت کرنے دروازے تک چلی آئی تھی اس لیے اس کی جیسے ہی نجمہ پر نظر پڑی اس نے کہا تھا۔ اتنی دیر کردی۔ میں نے تو تمہیں سات بجے آنے کو کہا تھا؟''

''پھر نجمہ نے مقتولہ کے سوال کے جواب میں کیا کہا تھا؟''

''مجھے نہیں معلوم۔'' وہ ٹھوس انداز میں بولا۔ ''میں ان کی باتیں سننے کے لیے وہاں رکا نہیں تھا۔''

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ......'' میں نے سنسنی خیز انداز میں کہا۔ ''اگلی صبح یعنی اٹھارہ اگست کو جب آپ مقتولہ کے فلیٹ پر پہنچے تو آپ کا چہرہ نجمہ کے لیے اجنبی تھا اور نہ ہی اس کی صورت آپ کے لیے ناشناسا کیونکہ وقوعہ کی رات آپ دونوں کا آمنا سامنا ہو چکا تھا۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا مسٹر جعفر علی؟''

''جی نہیں...... آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' وہ بڑے وثوق سے بولا۔ ''بالکل یہی حقیقت ہے۔''

''اگر حقیقت یہی ہے تو پھر......'' میں نے گردن موڑ کر جج کی طرف دیکھا اور ڈرامائی انداز میں کہا۔ ''مقتولہ کی گھریلو ملازمہ نے اپنی گواہی کے دوران میں جھوٹ کیوں بولا تھا...... ہیئر از پوائنٹ یور آنر!''

اس کے ساتھ ہی عدالت کا مقررہ وقت ختم ہوگیا۔ جج نے استغاثہ کو حکم دیا کہ وہ آئندہ روز مقتولہ کی گھریلو ملازمہ نجمہ کو عدالت میں پیش کرے تا کہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہوسکے۔

☆☆☆

اس کیس کا فیصلہ تو گزشتہ روز ہی ہو گیا تھا جب جعفر علی کے بیان کی روشنی میں نجمہ بی بی کا کھلا جھوٹ عدالت کے سامنے آیا تھا تاہم اتمام حجت بھی ضروری تھا لہٰذا میں وٹنس باکس میں کھڑی نجمہ کے پاس چلا گیا۔ اس کی حالت سے بخوبی اندازہ ہو رہا تھا کہ اسے اپنے انجام کا احساس ہو گیا تھا۔ میری فرمائش پر جج نے استغاثہ کے گواہ جعفر علی کو بھی اس روز عدالت میں دوبارہ بلا لیا تھا تا کہ جھوٹ اور سچ کو پہچاننے میں کسی دقت کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ میں کسی رورعایت کے بغیر نجمہ پر چڑھ دوڑا۔

''نجمہ بی بی! پچھلی پیشی پر میں نے تم سے پوچھا، تم جعفر علی کو کب سے جانتی ہو؟ تو تم نے بتایا، پہلے اس سے کبھی نہیں ملی تھی۔ میں نے پوچھا۔ کیا جعفر علی تمہارے لیے اجنبی تھا؟ تم نے جواب دیا، میری زندگی میں کبھی اس سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ اٹھارہ اگست کی صبح میں نے اسے پہلی بار دیکھا تھا۔ میں نے پوچھا، تم نے ایک غیر شناسا اور اجنبی شخص کو اپنی باجی یعنی مقتولہ کی موت کے بارے میں کیوں بتایا تو تمہارا جواب تھا، جعفر علی نے باجی یعنی میڈم ہما کا نام لے کر جب مجھ سے پوچھا تو میں یہی سمجھی تھی کہ یہ باجی کے کوئی جاننے والے یا عزیز ہیں۔ تم نے......'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر جارحانہ انداز میں پوچھا۔

''تم نے یہ لاتعداد جھوٹ کیوں بولے؟ اس وقت

جعفر علی بھی یہاں موجود ہے۔ اگر تم نے مزید کوئی غلط بیانی کی تو عدالت تمہیں خود دیکھ لے گی۔ جعفر علی تمہارے بیان کی تردید کرنے میں کسی ہچکچاہٹ سے کام نہیں لے گا۔''

اس کی حالت پہلے ہی خاصی خراب ہو رہی تھی۔ میرے تابڑتوڑ حملوں نے رہی سہی کسر بھی نکال دی اور وہ تیورا کر کٹہرے کے فرش پر گری اور بے ہوش ہوگئی۔ جعفر علی کو کٹہرے میں بلانے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔

گزشتہ پیشی پر ہونے والی کارروائی نے مقتولہ ہما کے قاتل کی نشاندہی تو کردی تھی۔ اب نجمہ کی بے ہوشی والے طرزِ عمل نے اس نشاندہی پر مہرِ تصدیق ثبت کردی تھی اور جہاں تک میرے مؤکل اور اس کیس کے ملزم کا تعلق تھا تو......تو اس کی بے گناہی کا فیصلہ اسی وقت ہوگیا تھا جب یہ بات عدالت کے سامنے ثابت ہوئی کہ ملزم مقتولہ کے روبرو ہونے کے باعث اس کی کھوپڑی کے عقبی حصے پر وزنی گلدان سے وار نہیں کرسکتا تھا۔

نجمہ نے ہوش میں آنے کے بعد جو بیان دیا، بہ الفاظِ دیگر اقبالِ جرم کیا، اس کی روشنی میں آئندہ پیشی پر میرے مؤکل کو باعزت قتل کے اس مقدمے سے بری کردیا گیا۔ اپنے اقبالی بیان میں نجمہ نے بتایا تھا کہ اس کے دل میں اچانک لالچ آگیا تھا۔ اس کی باجی نے کسی کام کے لیے سات بجے اسے اپنے پاس بلایا تھا مگر وہ لیٹ ہوگئی۔ جب وہ سوا نو بجے مقتولہ کے فلیٹ پر پہنچی تو اس نے مقتولہ کو رقم والا بھورا لفافہ الماری میں رکھتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ بس، اسی وقت شیطان نے اس کے ذہن پر قبضہ کرلیا اور اس نے دولت کے لالچ میں وزنی گلدان اٹھا کر مقتولہ کے سر پر دے مارا اور رقم والا لفافہ اٹھا کر رفوچکر ہوگئی۔ دروازے کو اس نے نارمل انداز میں بند کردیا تھا۔

نجمہ نے فوری لالچ میں آکر جو کام کیا تھا، وہ کوئی سوچا سمجھا منصوبہ نہیں تھا لہٰذا اس کے فنگر پرنٹس بھی گلدان پر یقیناً ثبت ہوئے ہوں گے جن کا ملزم کے فنگر پرنٹس کے ساتھ پایا جانا ضروری تھا لیکن پولیس کو نجمہ کے فنگر پرنٹس نظر نہیں آئے یا انہوں نے اس طرف دھیان دینے کی زحمت ہی گوارا نہیں کی تھی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ نجمہ کی انگلیوں کے نشانات کو اس لیے اہمیت نہ دی گئی ہو کہ گھریلو ملازماؤں کے فنگر پرنٹس تو گھر میں ہر جگہ پائے جاتے ہیں۔ یہ کوئی خاص بات نہیں۔ ملزم چونکہ مقتولہ کے بیڈروم میں بھی آتا جاتا تھا اور بیڈروم کے قریب رکھے اس گلدان کو اکثر چھوتا رہتا تھا لہٰذا سب سے زیادہ اسی کی انگلیوں کے نشانات مذکورہ گلدان پر پائے گئے تھے۔ پولیس نے اپنا کام آسان کرنے کے لیے ماسٹر جی اور عامر کی گواہی کو بہت زیادہ اہمیت دیتے ہوئے میرے مؤکل کو بے بنیاد اس کیس میں گھسیٹ لیا تھا۔

اس کیس کا ایک دلچسپ پہلو مقتولہ کا شوہر یعنی کویت پلٹ فیصل شیرازی ہے۔ کیس کے وسط ہی میں وہ میرے لیے ایک کلائنٹ کی ہی حیثیت اختیار کرچکا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ میں اپنے مؤکل کو بے گناہ ثابت کرنے کے ساتھ ہی اس کی بیوی کے قاتل کو بھی بے نقاب کردوں اور میں نے ایسا کر دکھایا تھا۔ نہ صرف یہ کہ میں نے ہما کی قاتل نجمہ ماسی کو بے نقاب کردیا تھا بلکہ بھورے لفافے والے پچاس ہزار میں سے پینتالیس ہزار بھی بازیاب کرالیے تھے۔ وقوعہ سے لے کر فیصلہ ہونے تک کے عرصے کے دوران میں نجمہ ماسی نے صرف پانچ ہزار ہی خرچ کیے تھے۔

اگلے روز مقتولہ کا شوہر فیصل شیرازی میرے آفس میں آیا۔ اس نے میری فیس کے علاوہ دس ہزار روپے بھی مجھے دیے۔ میں نے پوچھا۔

''یہ کس لیے ہیں؟''

''یہ آپ میری طرف سے اپنے مؤکل کو دیجیے گا۔'' وہ خلوصِ دل سے بولا۔ ''ہر جانے کے کیس کا فیصلہ پتا نہیں کب ہو اور کب اس غریب کو پیسے ملیں۔ اس بدنصیب کی تو ساری ''بی سی'' ہی اس کیس کی نذر ہوگئی ہے۔''

''نہ صرف ''بی سی'' اس کیس کی نذر ہوگئی بلکہ سود خور صدیق بھائی کے پچاس ہزار ابھی تک اس کے سر پر باقی ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''میں نے آپ سے جو فیس لی ہے، وہ اسی نیت سے لی ہے کہ یہ رقم بھی میں اپنے مؤکل ٹیپو کو دے دوں گا۔ اس کے گھر میں مفلوج باپ بھی تو پڑا ہے......'' میں نے لمحاتی توقف کرکے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ ''ویسے بھی فیس والے ان پیسوں پر میرا حق بھی نہیں بنتا۔ میں نے نجمہ کو بے نقاب کرنے کے لیے الگ سے کوئی محنت نہیں کی۔''

وہ فرطِ جذبات سے بولا۔ ''بیگ صاحب! آپ ایک منجھے ہوئے اور تجربہ کار وکیل ہی نہیں، بلکہ ایک عظیم انسان بھی ہیں۔''

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے میرے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا تھا، وہ اس کی ذاتی رائے تھی اور کسی کی ذاتی رائے پر بھلا کیا تبصرہ کیا جاسکتا ہے۔

(تحریر: حسام بٹ)

کرشمہ

طاہر جاوید مغل

دولت ہو یا اولاد... دنیا میں بہت بڑا امتحان ہے۔ جس کو مل جائے وہ بھی بے چین اور جسے نہ ملے وہ بھی بے سکون۔ جسے جو مل جائے اسے بھی قناعت نہیں اور جسے جتنا مل جائے اسے بھی صبر نہیں... عجیب منطق اور قدرت کی اپنی تقسیم ہے لیکن... ہر صورت میں آزمائش صرف اور صرف انسان کی ہے۔ یہی وہ نکتہ ہے جو ہر ایک کی سمجھ میں نہیں آسکتا لیکن... جسے سمجھ آجائے اسے اللہ کی رضا میں راضی ہوجانے کا سلیقہ آجاتا ہے۔

بے شمار محبتوں کی بھیڑ میں تنہا رہ جانے والوں کا قصہ

وہ اکتوبر کی ایک خنک صبح تھی۔ موسم آج نسبتاً سرد تھا۔ میں اپنے نرم گرم بستر میں بیٹھی کمرے کی کھڑکی سے باہر کا نظارہ کر رہی تھی۔ رات ہونے والی طوفانی بارش تھم چکی تھی۔ کمرے کی کھڑکی سے نظر آنے والے درخت کی شاخیں آج اپنے کچھ اور پتوں سے محروم ہوچکی تھیں۔

میں سات بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی اور سب سے چھوٹی بھی۔ اس لیے سب نے بڑے ناز اور لاڈوں سے پالا تھا۔ اکثر ایسا ہوتا کہ امی کسی بات پر مجھے ڈانٹ دیتیں۔

میں تنگ کر کہتی۔ ''آپ تو مجھ سے پیار ہی نہیں کرتیں۔''
''ہاں..... ہاں، پیار نہیں کرتی۔ جتنی دعاؤں سے تجھے حاصل کیا ہے، ساری زندگی کسی چیز کے لیے نہیں کیں۔''
ابو جان بھی اکثر مسکراتے ہوئے اپنے دوستوں اور عزیزوں میں کہتے۔ ''بھئی ماشاء اللہ سات بیٹوں کی اس خوب صورت جھیل میں ہمارا پیارا سا کنول کا پھول کھل ہی گیا آخر۔''

بیٹا ہو یا بیٹی، دونوں کی اپنی اپنی اہمیت اور رونق ہوتی ہے۔ امی مجھے بتایا کرتی تھیں کہ ان سے زیادہ ابو جان کو بیٹی کا شوق تھا۔ سب سے بڑے بھائی فیصل کے بعد فہد، عامر اور ذیشان پیدا ہوئے۔ عرفان، صالح اور ارقم کی مرتبہ امی ابو کی شدید خواہش تھی کہ اب اللہ پاک ایک بیٹی دے دے۔
اللہ پاک بندے کو آزماتے ہیں کہ یہ مجھ پر بھروسا کرنے اور مجھ سے مانگنے میں کہاں تک جاتا ہے اور اللہ پاک آزماتے اسے ہی ہیں جن پر ان کی نظرِ خاص ہوتی ہے۔ کہتے ہیں کہ ہوتا وہی ہے جو اللہ نے انسان کی تقدیر میں لکھ دیا ہو۔ لیکن یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ انسان اپنے رب کو پکارے اور وہ اس کی پکار نہ سنے۔ یہ بڑی عجیب حقیقت ہے کہ کئی دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ تقدیر اپنی جگہ موجود رہتی ہے اور اللہ تعالیٰ ہماری دعا بھی قبول کر لیتے ہیں۔
میری پیدائش پر امی ابو اور بھائیوں نے خوب خوشیاں منائیں۔ اس وقت کی پرانی تصویریں ہمارے البم میں موجود تھیں اور ان تصویروں کو دیکھ کر اس خوب صورت دن کی بے مثال مسرتوں کا احساس ہوتا تھا۔
امی اور ابو کی طرف کے تقریباً سارے رشتے دار دوسرے شہروں میں رہتے تھے اور سال میں ایک آدھ دفعہ ہی ملنا ہوتا تھا۔ شائستہ آنٹی یہاں لاہور میں ہی رہتی تھیں، وہ امی کی بچپن کی دوست تھیں۔ بہت گہری اور شاندار دوستی تھی ان کی۔ دونوں کا اکثر ایک دوسرے کے گھر آنا جانا رہتا تھا۔ اس وجہ سے ان کے میاں بھی ایک دوسرے کو جاننے سمجھنے لگے تھے اور ان کے درمیان بھی ایک اچھی اور.... بے تکلفی والی دوستی پروان چڑھ گئی تھی۔ میری پیدائش پر شائستہ آنٹی نے ایک پُرتکلف دعوت کا اہتمام بھی کیا تھا اور اس دعوت کی تصویریں بھی ہمارے فیملی البم میں موجود تھیں۔ شائستہ آنٹی ایک مقامی اسپتال میں نرسنگ کے شعبے میں انچارج کے فرائض انجام دیتی تھیں۔ بچپن میں ہم انہیں آنٹی شائستہ کہتے تھے لیکن بعد میں خالہ شائستہ کہنے لگے۔

وقت گزرتا گیا اور بہت اچھا گزرا۔ میں اب یونیورسٹی میں تھی اور بی ایس سی میتھ میٹکس کر رہی تھی۔ بڑے چار بھائیوں کی شادی ہو چکی تھی اور باقی پڑھ رہے تھے یا جاب کر رہے تھے۔ ابو اب کافی بوڑھے ہو چکے تھے، اس لیے بڑے بھائی کاروبار میں ان کا ہاتھ بٹاتے تھے۔ ہمارا فرنیچر کا کام تھا۔ زندگی کی گاڑی رواں دواں تھی کہ ایک ایسا جھٹکا لگا جس نے ہم سب کو بنیادوں سے ہلا کر رکھ دیا۔ امی ابو عید کے تیسرے دن فیصل آباد میں مقیم چچا جان سے ملنے جا رہے تھے کہ راستے میں ان کی گاڑی کو حادثہ پیش آ گیا۔ میرے پیارے ابو تو موقع پر ہی ختم ہو گئے۔ امی جان دو دن ایک مقامی اسپتال میں بے ہوشی کی حالت میں رہیں پھر وہ بھی ہم سے جدا ہو گئیں۔ اس حادثے نے ہم سب کو بری طرح متاثر کیا تھا۔ خاص طور سے مجھے ایسا لگتا تھا کہ میری روح تک زخمی ہو گئی ہے۔
امی ابو کے بعد پانچ چھ ماہ تک میں ذہنی طور پر بہت اپ سیٹ رہی۔ بڑے بھائی شادی شدہ تھے، چھوٹے پڑھ رہے تھے۔ اس لیے وہ کوشش کے باوجود بھی مجھے بہت کم وقت دے پاتے تھے۔ اس موقع پر خالہ شائستہ نے مجھے تنہا نہیں چھوڑا۔ وہ ہفتے میں دو تین دفعہ ہمارے گھر کا چکر ضرور لگاتیں۔ کبھی مجھے شاپنگ کے لیے لے جاتیں۔ کبھی ہم اکٹھے بیٹھ کر کوئی ''مووی'' دیکھ لیتے۔ رفتہ رفتہ میرا ڈپریشن کم ہونے لگا۔ اس کے ساتھ ساتھ میں خالہ شائستہ کے ساتھ انسیت کا رشتہ کچھ اور گہرا محسوس کرنے لگی۔ وہ تھیں ہی اس قابل۔

ہاں تو میں بات کر رہی تھی کہ اس رات کافی بارش ہوئی تھی اور اب میں اپنے کمرے میں بیٹھی کھڑکی سے باہر کا نظارہ کر رہی تھی۔ اسی دوران میں باہر مین گیٹ کھلنے کی آواز آئی۔ میں جلدی سے دوسری کھڑکی کی طرف آئی اور نیچے جھانکا۔ ہمارے پورچ میں سفید سوزوکی مہران پارک ہو رہی تھی۔ میں جان گئی کہ خالہ شائستہ آئی ہیں۔ میں نے جلدی سے اپنے کمرے کی حالت درست کی اور باہر لاؤنج میں آگئی۔ خالہ بھابی سے مل رہی تھیں۔ خالہ شائستہ نے چھ سات سال پہلے اسپتال والی ملازمت چھوڑ دی تھی۔ اب وہ شوقیہ طور پر اپنے میاں کے ساتھ کام کر رہی تھیں۔ ان کے میاں کو ہم انکل ظہیر کہتے تھے۔ وہ ایک پندرہ روزہ میگزین نکالتے تھے۔ اس میگزین میں خواتین والے پورشن کو خالہ شائستہ ہینڈل کرتی تھیں۔ آج کل وہ خود لکھتی بھی تھیں اور ان کے لکھے ہوئے آرٹیکل خواتین میں بڑے شوق سے

پڑھے جاتے تھے۔ پچھلے دنوں خالہ نے مجھے بتایا تھا کہ وہ ایسی فیملیز کے بارے میں ایک تفصیلی آرٹیکل لکھ رہی ہیں جن میں بچے یا پھر بچی کی شدید خواہش ہوتی ہے اور عرصہ دراز کے بعد قدرت ان کی یہ خواہش پوری کر دیتی ہے۔ انہوں نے ہماری اپنی فیملی کی مثال بھی دی تھی اور بتایا تھا کہ سات بھائیوں کے بعد میرے پیدا ہونے پر میری فیملی کے جذبات اور احساسات کیا تھے۔

آج خالہ آئیں تو رسمی گفتگو کے بعد پھر یہی موضوع چھڑ گیا۔ خالہ نے مجھے بتایا کہ انہوں نے چند ایسے والدین سے رابطے کیے ہیں جن کو کئی بیٹوں کے بعد بیٹی یا پھر کئی بیٹیوں کے بعد بیٹا نصیب ہوا۔

میں نے پوچھا۔ ''خالہ! کیا آپ ایسی فیملیز سے انٹرویو کریں گی؟''

وہ بولیں۔ ''بیٹا جی! کروں گی نہیں...... شروع کر چکی ہوں۔ ایک فیملی سے پرسوں ملی تھی۔ ایک فیملی سے ملنے کے لیے ہفتے کو لاہور سے باہر جا رہی ہوں۔''

''کہاں؟'' میں نے پوچھا۔

''فیصل آباد...... یہ خاتون ایک ریٹائرڈ اسکول ٹیچر ہیں۔ بیس سال پہلے، اللہ نے انہیں آٹھ بیٹیوں کے بعد بیٹا عطا کیا۔ ٹیلی فون پر ان خاتون سے میری بات ہوئی ہے۔ اب آمنے سامنے بیٹھ کر ان سے تفصیلی انٹرویو کروں گی۔'' پھر ایکدم انہوں نے جیسے چونک کر کہا۔ ''اور اگر تمہارے پاس ٹائم ہے تو تم بھی آ جاؤ۔ کمپنی رہے گی۔''

''میں؟''

''ہاں بھئی، کئی دفعہ تم نے کہا ہے کہ فیصل آباد سائڈ پر کبھی نہیں گئی ہو اور فارغ بھی تو ہو آج کل۔''

میں تین دن پہلے ہی فائنل پیپرز سے فارغ ہوئی تھی اور میرا دل بھی بہت چاہ رہا تھا ان دنوں کہیں آؤٹنگ کرنے کا...... تھوڑی سی سوچ بچار کے بعد میں نے خالہ شائستہ کے ساتھ جانے کا فیصلہ کر لیا۔

☆☆☆

ہفتے کے روز تقریباً ساڑھے بارہ بجے ہم فیصل آباد کی گلستان کالونی میں تھے۔ ہمیں مطلوبہ مکان ڈھونڈنے میں زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔ یہ تقریباً ایک کنال میں بنایا گیا سادہ سا گھر تھا لیکن اس کی تعمیر سے نفاست جھلکتی تھی۔ گیٹ پر احمد خان کے نام کی پلیٹ لگی تھی۔ خالہ نے دو ڈبیل بجائی تو فوراً ہی ایک ادھیڑ عمر خاتون نے چھوٹا گیٹ کھول دیا۔ یہی منزہ احمد تھیں۔ ایسے لگا جیسے وہ کافی دیر سے ہماری آمد کا

انتظار کر رہی تھیں۔

خالہ شائستہ سے ملنے کے بعد انہوں نے مجھے گلے لگایا۔ ان کے انداز میں بے حد گرمجوشی تھی۔ اچانک مجھے اپنے کاندھے پر نمی محسوس ہوئی۔ میں جلدی سے پیچھے ہٹی۔

''ارے آنٹی! یہ کیا...... آپ کی آنکھوں میں آنسو؟''

''کچھ نہیں بیٹی! بس ایسے ہی یہ سوچ کر آنکھیں بھیگ گئیں کہ بیٹا ہو یا بیٹی، والدین کو دونوں کی خواہش ہوتی ہے۔ کسی ایک سے بھی محرومی...... بہرحال محرومی ہی ہوتی ہے۔''

وہ ٹشو پیپر سے آنکھیں صاف کرتی ہوئی ہمیں اندر لے آئیں اور بات جاری رکھتے ہوئے بولیں۔ ''اصل میں شائستہ نے فون پر تمہاری آمد کی اطلاع بھی دی تھی اور بتایا تھا کہ آپ سات بھائیوں کی اکلوتی بہن ہو اور سب کی لاڈلی بھی۔'' پھر وہ خالہ شائستہ سے مخاطب ہو کر بولیں۔ ''شائستہ! آپ کیسی ہیں؟ بہت تجسس تھا آپ کو دیکھنے اور آپ سے ملنے کا۔''

''میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں۔ آپ سنائیں آج کل کیا مصروفیت ہے؟'' خالہ نے بے تکلفی سے کہا۔

''بس آج کل ایک پرائیویٹ اسکول میں دو تین گھنٹے کے لیے ٹیچنگ کر رہی ہوں۔ بالکل فارغ بھی تو نہیں بیٹھا جاتا نا۔'' وہ مسکرا کر بولیں۔ ان کی مسکراہٹ میں خلوص اور خوش خلقی کی جھلک تھی۔ یوں لگتا تھا کہ وہ ہر ملنے والے کو اپنے دل میں جگہ دیتی ہیں۔

وہ باتیں کرتے ہوئے وقفے وقفے سے مجھے دیکھ لیتی تھیں۔ ایک دفعہ انہوں نے مجھے دیکھا تو میں بھی انہی کو دیکھ رہی تھی۔ وہ ٹھٹک گئیں۔

''ماشاء اللہ بہت ہی پیاری بچی ہے۔'' انہوں نے جلدی سے کہا پھر ملازمہ کو آواز دی اور اسے مشروب لانے اور کھانا لگانے کے بارے میں ہدایات دیں۔

ہمارے کافی منع کرنے کے باوجود انہوں نے ہمارے لیے دوپہر کا کھانا لگوایا۔ ''کھانا'' کہنا تو ناانصافی ہوگی، یہ ان کی طرف سے ایک پُرتکلف دعوت ہی ہوگئی تھی۔ کھانے کی میز پر انہوں نے بتایا کہ ان کا بیٹا ایان یونیورسٹی گیا ہوا ہے اور شام تک واپس آئے گا۔ ان کے شوہر احمد خان کو فوت ہوئے تین چار سال گزر چکے تھے۔ وفات سے پہلے وہ اپنی تمام بیٹیوں کی ذمے داری سے سبکدوش ہو چکے تھے۔

پُرتکلف کھانے کے بعد ہم واپس ڈرائنگ روم میں آ بیٹھے۔ خالہ شائستہ نے اپنی نوٹ بک نکالی اور آنٹی کے خیالات قلم بند کرنے لگیں کہ جب آٹھ بیٹیوں کے بعد اللہ پاک نے ان کو بیٹا دیا تو ان کے احساسات کیا تھے۔ اس وقت مسز احمد یعنی آنٹی صفیہ کا ایک جملہ مجھے بہت اچھا لگا۔ انہوں نے کہا۔ ''خوشی تو بے انتہا ہوئی شائستہ لیکن ایسا لگتا ہے کہ اگر ایان کی جگہ پھر بیٹی ہی ہوتی تو آج مجھے اس سے بھی اتنا ہی پیار ہوتا جتنا اپنے دوسرے بچوں سے ہے۔''

ان کی اس بات میں یہ عالمگیر سچائی جھلک دکھا رہی تھی کہ اولاد ''من چاہی'' ہو یا نہ ہو لیکن اس کے اندر قدرت نے وہ کشش اور مقناطیسیت رکھی ہوتی ہے کہ وہ والدین کے دلوں میں جگہ بنا کر رہتی ہے۔

ہمارا ارادہ تھا کہ ہم شام چار بجے تک فیصل آباد سے واپس چل پڑیں گے اور نو دس بجے تک لاہور پہنچ جائیں گے۔ آنٹی صفیہ سے بڑی مزے مزے کی باتیں ہوئیں اور ہماری اچھی خاصی بے تکلفی ہوگئی۔ شام کی چائے سے فارغ ہوئے تو چھ بج چکے تھے۔ آنٹی صفیہ نے کہا۔ ''بھئی، اب تو رات ہونے والی ہے۔ اس وقت اتنا لمبا سفر کرنا ٹھیک نہیں۔ آپ لوگ صبح روانہ ہو جانا۔''

''ارے نہیں صفیہ باجی! ایسے تو اچھا نہیں لگتا نا۔ ایسے تو ہم رحمت کے بجائے زحمت بن جائیں گے۔'' خالہ نے کہا۔

''نہیں بھئی! ایسی بات تو نہ کریں۔ آپ دونوں کی کمپنی میں تو اتنا مزہ آیا ہے کہ وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلا...... اور پھر پرانی یادیں بھی تازہ ہوگئیں میری۔''

میں نے کہا۔ ''مجھے تو لگتا ہے آنٹی کہ اتنی پُرتکلف چائے اصل میں آپ کی سازش تھی، ہمیں لیٹ کر دینے کے لیے۔''

خالہ اور آنٹی صفیہ دونوں ہنسنے لگیں۔

مجھے کچھ الگ سا محسوس ہو رہا تھا۔ پتا نہیں کیوں مجھے لگتا تھا کہ یہاں کوئی بات مجھ سے چھپائی جا رہی ہے۔ کسی وقت صفیہ آنٹی اور خالہ آپس میں کچھ کھسر پھسر بھی کرنے لگتی تھیں۔

خالہ شائستہ نے ظہیر انکل کو فون کیا اور انہیں صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ یہ بھی کہا کہ وہ میرے گھر فون کر کے بھی اطلاع دے دیں۔ آج کی رات ہم یہاں فیصل آباد میں صفیہ آنٹی کے ہاں ہی ٹھہر رہے تھے۔

آنٹی کا بیٹا ایان آٹھ بجے کے قریب گھر آ گیا۔ اس کی منگنی وغیرہ ہو چکی تھی۔ وہ وضع قطع سے کافی نیک اور

دین دار لگتا تھا۔ چہرے پر چمک تھی۔ اگر اس کی ڈاڑھی نہ ہوتی تو اس کی مشابہت بہت زیادہ میرے فیصل بھائی سے ہوتی۔

کھانے کے بعد کچھ دیر ہلکی پھلکی گفتگو ہوئی پھر صفیہ آنٹی نے ہمیں ہمارا بیڈروم دکھایا اور کہا کہ کسی چیز کی ضرورت ہو تو بلاتکلف بتائیں۔

خالہ شائستہ تو لیٹنے کے تھوڑی دیر بعد ہی سو گئیں، مجھے نیند نہیں آرہی تھی۔ کمرے کی لائٹ آف تھی اور باہر کوریڈور میں لگے ہوئے انرجی سیور کی بہت مدھم سی روشنی کمرے میں آرہی تھی۔ میں آنکھیں موندے لیٹی ہوئی تھی کہ اچانک مجھے دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ میں نے لیٹے لیٹے آنکھوں کو نیم وا کر کے دیکھا۔ یہ آنٹی صفیہ تھیں۔ ایک لمبی چادر میں لپٹی ہوئی، وہ ہولے سے اندر آئیں۔ خوف اور تجسس کی ایک لہر میرے اندر دوڑ گئی۔ ہارر فلموں کے مناظر نگاہوں کے سامنے گھوم گئے۔ رات کے اس پہر آنٹی اتنی خاموشی سے میرے کمرے میں کیا لینے آئی تھیں؟ میں اسی طرح آنکھیں بند کیے پڑی رہی۔ وہ بے آواز قدم اٹھاتی میرے پاس آئیں، تھوڑی دیر یونہی ساکت کھڑی رہیں پھر بڑی آہستگی سے اپنا بھاری نرم ہاتھ میرے ماتھے پر رکھ دیا...... میں اندر سے لرز گئی۔ بہر حال دل کو یہ تسلی تھی کہ خالہ شائستہ ساتھ والے بیڈ پر موجود ہیں اور میں کسی پریشانی کی صورت میں انہیں آواز دے سکتی ہوں۔

اچانک مجھے محسوس ہوا کہ آنٹی رو رہی ہیں۔ میں خوف اور تجسس کی ملی جلی کیفیت کو چھپائے نرم بستر پر بے حرکت پڑی رہی۔ وہ منہ میں کچھ بولیں جس کی مجھے سمجھ نہیں آئی۔ پھر انہوں نے جھک کر میرا ماتھا چوما۔ بڑے ہولے سے ایک دو بار میرے سر پر ہاتھ پھیرا۔ کچھ دیر بعد وہ جیسے خاموشی سے آئی تھیں، ویسے ہی واپس چلی گئیں۔ کمرے میں ایک بار پھر میں اور خالہ تنہا رہ گئے۔ میں نے ذرا اٹھ کر خالہ کی طرف دیکھا، وہ سو رہی تھیں۔ میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اب خوف کم ہوتا جا رہا تھا اور تجسس بڑھ گیا تھا۔ یہ خیال بھی آرہا تھا کہ کہیں آنٹی صفیہ پر کوئی سایہ وغیرہ تو نہیں...... یا پھر سائیکو کیس؟

رات آخری پہر بس تھوڑی دیر کے لیے نیند آئی۔ صبح موقع ملتے ہی میں نے خالہ شائستہ کو رات والا واقعہ سنایا۔

خالہ شائستہ پہلے تو حیران نظر آئیں پھر مسکرانے لگیں۔ بولیں۔ ''میں نے اندازہ لگایا ہے کہ صفیہ بہت زود رنج اور جذباتی عورت ہے۔ حالات کی تلخیوں اور زندگی

مایوسی کفر ہے

کہنے میں تو یہ تین لفظ ہیں لیکن اگر ان پر غور کیا جائے تو ان تین لفظوں میں زندگی کے تمام رخ پنہاں ہیں۔ دنیا میں بہت سے لوگ کامیاب ہوئے اور بہت سے ناکام۔ جو کامیاب ہوئے ان لوگوں نے ان تین لفظوں کو پہچانا اور اس پر عمل کیا اور جو ناکام ہوئے ان لوگوں نے ان تین لفظوں کی اہمیت کو پہچان کر گنوا دیا۔

جب انسان دل سے کوئی کام کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو نہ صرف یہ کائنات بلکہ اس کائنات کا خالق بھی اس کی مدد کرتا ہے اور اگر انسان اس کام میں ناکامی پائے تب بھی خدا اس کا ساتھ نہیں چھوڑتا لیکن اگر انسان مایوس ہو کر صبر کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دے تو خدا بھی اس کا ساتھ چھوڑ دیتا ہے...... یہی وجہ ہے کہ...... خدا کفر کو پسند نہیں کرتا۔

مرسلہ۔ طالب حسین طلحہ، تحصیل حاصل پور منڈی

الٹا اثر

صبح کے اخبار میں شراب کی بہت سی برائیاں لکھی ہوئی تھیں۔ بیوی اپنے شوہر کو پڑھ کر سنا رہی تھی کہ شراب پینے سے کیا کیا نقصان ہوتا ہے۔

شوہر کچھ دیر سوچتا رہا پھر بولا۔ ''چلو کل سے بند کیے دیتے ہیں۔'' بیوی بہت خوش ہوئی کہ چلو شوہر کے دماغ میں کام کی بات آگئی۔

دوسرے دن جب صبح ہوئی تو بیوی کو پتا چلا کہ شوہر کی شراب نہیں بلکہ اخبار بند ہو گیا ہے۔

انتخاب۔ ریاض بٹ، حسن ابدال

کے سرد گرم نے ان کا دل بہت ہلکا کر چھوڑا ہے۔ ذرا ذرا سی بات پر آبدیدہ ہو جاتی ہیں۔ کل تم نے دیکھا ہی تھا۔ تم سے ملیں اور تمہیں دیکھتے ہی ان کی آنکھیں نم ہو گئیں اور رات کو جب ان کے مرحوم شوہر کا ذکر آیا تھا تو بھی ان کی آواز فوراً بھرا گئی تھی۔"

آنٹی شائستہ نے اپنی طرف سے وضاحت کر دی تھی لیکن پتا نہیں کیوں میں مطمئن نہیں ہوئی۔ میرے دل و دماغ میں یہ سوال بدستور اٹھتا رہا کہ کل رات والا واقعہ کیوں ہوا۔

☆☆☆

صبح ناشتا کرتے کے ساتھ ہی ہم لوگ نکل پڑے۔ ہمیں الوداع کرتے وقت بھی آنٹی کا رویہ ناقابلِ فہم تھا۔ پہلے وہ خالہ شائستہ سے ملیں۔ "بہت بہت شکریہ شائستہ آپ یہاں آئیں۔ میری پرانی یادیں تازہ کیں۔ میں آپ کا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گی۔ بہت بہت شکریہ۔"

پھر آبدیدہ نگاہوں سے انہوں نے مجھے دیکھا اور گلے لگایا۔ "ماشاء اللہ بڑے خوش نصیب تھے تمہارے والدین، جنہیں اتنی پیاری اور سمجھدار بیٹی ملی۔"

"خدا حافظ آنٹی۔ کبھی آپ بھی ہم سے ملنے لاہور آئیں۔" میں نے کہا۔

وہ کھانستے ہوئے بولیں۔ "طبیعت خراب رہتی ہے بیٹی۔ لمبے سفر سے دل بہت گھبراتا ہے۔ پھر بھی، اگر دانہ پانی ہوا تو ضرور آؤں گی۔"

ہم لاہور واپس آ گئے۔ خالہ شائستہ اپنے کام میں مصروف ہو گئیں۔ میں چھٹیوں کے بعد پھر یونیورسٹی جانے لگی۔ سب کچھ معمول کے مطابق تھا لیکن پتا نہیں کیوں فیصل آباد والا ٹور ذہن سے نکلتا نہیں تھا۔ خاص طور سے آنٹی صفیہ کا عجیب و غریب رویہ۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ پے در پے پیش آنے والے مشکل حالات انسان کو جذباتیت کی طرف دھکیل دیتے ہیں۔ وہ چھوٹے چھوٹے غموں اور خوشیوں کا اور اک بہت بڑے پیمانے پر کرنے لگتا ہے۔ ذرا سی بات پر رو دینا یا خوشی سے نہال ہو جانا، ایسے لوگ کبھی کبھی دور دراز کے رشتے ناتوں میں بھی بڑی اپنائیت اور چاہت محسوس کرنے لگتے ہیں۔ شاید صفیہ آنٹی کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ تھا۔

آٹھ دس روز بعد ایک دن خالہ شائستہ ہمارے گھر آئیں تو شام کے فوراً بعد ہی تیز طوفانی بارش شروع ہو گئی اور وہ رات کو گھر واپس نہ جا سکیں۔ باقی اہلِ خانہ کے سونے کے بعد بھی میں اور خالہ جاگتے رہے...... اور کھڑکیوں پر بارش کی بوچھاڑیں دیکھتے رہے۔ جلد ہی میری زبان پر وہ سوال آ گیا جو پچھلے کئی روز سے دل و دماغ کو اتھل پتھل کر رہا تھا۔ میں نے کہا۔ "خالہ! آپ نے کبھی کوئی بات مجھ سے چھپائی نہیں لیکن پتا نہیں کیوں مجھے اب لگتا ہے کہ فیصل آباد میں آپ نے مجھ سے کچھ نہ کچھ چھپایا ضرور ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"آنٹی صفیہ کا رویہ ایسا کیوں تھا؟ کیا وہ مجھے پہلے سے جانتی تھیں یا میرے بارے میں...... انہیں کوئی خاص بات معلوم تھی؟"

خالہ شائستہ کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ وہ شدید تذبذب میں نظر آئیں، جیسے مجھ سے کچھ چھپانا چاہتی ہوں اور یہ بھی سوچ رہی ہوں کہ کچھ چھپایا نہ جائے، جو کچھ ہے بتا دیا جائے۔ میرے مسلسل اصرار نے انہیں شدید کشمکش سے دوچار کر دیا۔ بالآخر وہ ایک نتیجے پر پہنچ گئیں۔ انہوں نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگائی اور لمبی سانس لے کر بولیں۔ "کنول! تمہیں وعدہ کرنا ہوگا کہ میں جو تمہیں بتاؤں گی، وہ ہمیشہ ہم دونوں کے درمیان ہی رہے گا۔"

"میں وعدہ کرتی ہوں خالہ۔" میں نے فیصلہ کن انداز میں ان کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"اور میں یہ بھی چاہتی ہوں کہ جو کچھ میں بتاؤں، تم اسے اپنی زندگی پر اثر انداز نہیں ہونے دو گی۔"

"آپ جیسا کہیں گی میں ویسا ہی کروں گی۔ میں آپ کی تمام شرائط سنے بغیر انہیں قبول کرتی ہوں۔"

خالہ نے کھڑکیوں سے باہر موسلا دھار بارش کی بوچھاڑیں دیکھیں اور کہا۔ "وہ بھی ایک ایسی ہی طوفانی رات تھی۔ میں اسپتال کے گائنی وارڈ میں نائٹ ڈیوٹی پر تھی۔ اس وقت لیبر روم میں دو عورتیں ایسی تھیں جنہیں میں اچھی طرح جانتی تھی۔ دونوں اس وقت کسی بھی وقت ایک نئی زندگی کو وجود دے سکتی تھیں۔ ان میں سے ایک تو تمہاری ماں یعنی میری گہری سہیلی تھی...... اور دوسری یہی صفیہ نامی عورت تھی جس سے تم پچھلے ہفتے فیصل آباد میں مل کر آئی ہو۔ دونوں عورتیں شدید خدشات میں مبتلا تھیں۔ میری سہیلی سات بیٹوں کے بعد پھر بیٹے کو جنم دینا نہیں چاہتی تھی اور صفیہ آٹھ بیٹیوں کے بعد پھر ایک اور بیٹی نہیں چاہتی تھی...... تو اس رات ہم تینوں نے باہمی رضامندی کے ساتھ ایک اہم فیصلہ کیا۔ میرا خیال ہے کہ تم بات کو کچھ کچھ سمجھ گئی ہو۔ وہ فیصلہ یہی تھا کہ اگر بچے کی ولادت دونوں

عورتوں کی شدید خواہش کے برعکس ہوئی تو ہم بچوں کو بدل دیں گے۔ آٹھ بہنوں کو بھائی دے دیں گے اور سات بھائیوں کو بہن دے دیں گے۔ یہ بڑا انوکھا فیصلہ تھا اور یاد رہے کہ یہ ان دنوں کی بات ہے جب ابھی الٹرا ساؤنڈ کے ذریعے زچگی سے پہلے بچے کی جنس معلوم کرنے کی سہولت نہیں تھی۔ وہ بڑی عجیب رات تھی۔ بیس سال گزرنے کے بعد مجھے آج بھی اس کا ایک ایک پل یاد ہے۔ رات کے آخری حصے میں وہی کچھ ہوا تھا جس کے خدشات تھے۔ تمہاری ماں نے آٹھویں بیٹے کو جنم دے دیا اور صفیہ نے نویں بیٹی کو۔ یہ دونوں گھرانوں کے لیے نہایت مایوس کن اور غم ناک رات ثابت ہو سکتی تھی لیکن ہم نے اسے خوشیوں اور قہقہوں سے بھرپور رات میں بدل دیا۔ اس رات اسپتال کے گائنی وارڈ میں اتنی مٹھائی تقسیم ہوئی تھی کہ کھانے والوں کی ہمت جواب دے گئی تھی۔"

خالہ شائستہ بول رہی تھیں اور ان کی آنکھوں میں آنسو لرز رہے تھے۔ وہ جیسے ماضی کی اس برساتی رات کو اپنے تصور میں زندہ دیکھ رہی تھیں۔

میں سکتے کی سی کیفیت میں تھی۔ خالہ رک رک کر اپنی بات جاری رکھے ہوئے تھیں۔ انہوں نے بتایا کہ دونوں بچوں کے باپوں اور دیگر عزیزوں کو اس حقیقت سے بے خبر رکھا گیا تھا اور اس صورتِ حال کے مطابق یہی درست تھا۔ بہر حال اللہ غلطیاں معاف کرنے والا ہے۔

آخر میں خالہ نے کہا۔ "اب تمہارے امی ابو اس دنیا میں نہیں۔ صفیہ کے شوہر بھی فوت ہو چکے ہیں۔ صرف صفیہ حیات ہے۔ وہ بھی اب بیمار رہتی ہے۔ وہ بڑے عرصے سے میری منت کر رہی تھی کہ اس کی زندگی کا کچھ پتا نہیں، وہ ایک بار تمہیں دیکھنا چاہتی ہے۔ میں کوشش کے باوجود اس کی بات نہ ٹال سکی۔ مجھے معاف کرنا کنول بیٹی! میں نے تم سے انٹرویو اور آرٹیکل لکھنے والا جھوٹ بولا...... بہر حال یہ جھوٹ اس لیے بھی قابلِ معافی ہے کہ اس کی وجہ سے ایک ماں کی دیرینہ آرزو پوری ہوئی ہے۔ اس نے تمہیں جی بھر کر دیکھ لیا ہے، پیار کر لیا ہے......"

میں حیرت زدہ بیٹھی تھی۔ لگتا تھا کہ جاگتی آنکھوں سے کوئی خواب دیکھ رہی ہوں یا پھر کسی سنسنی خیز فلم کے مناظر میری آنکھوں کے سامنے سے گزر رہے ہیں۔

باہر بادل دہاڑ رہے تھے اور پانی برس رہا تھا۔

اس رات کا منظر بھی واقعی بہت پراسرار اور عجیب تھا۔

محفلِ شعر و سخن

❊ محمد رشید سیال......روہڑی، ضلع سکھر
وہ اک شخص جس کی یادوں سے چلتی ہے میری نبضِ حیات
تم کیسے طبیب ہو کہتے ہو کہ بھول جاؤ اسے

❊ منیزہ رضوان......کراچی
میرے دل کی راکھ کرید مت اسے مسکرا کے ہوا نہ دے
یہ چراغ پھر بھی چراغ ہے کہیں تیرا ہاتھ جلا نہ دے
نئے دور کے نئے خواب ہیں، نئے موسموں کے گلاب ہیں
یہ محبتوں کے چراغ ہیں انہیں نفرتوں کی ہوا نہ دے

❊ احمد جہانزیب......سرگودھا
دنیا دارو دنیا چھوڑو دنیا میں بدنامی ہے
اس دنیا کے ترک کیے سے ہوتی نیک انجامی ہے

❊ فیصل شیروانی......خانیوال
کیا وفا و جفا کی بات کریں
درمیاں اب تو کچھ رہا بھی نہیں
درد وہ بھی سہا ہے تیرے لیے
میری قسمت میں جو لکھا بھی نہیں

❊ رعنا رضوی......یو کے
اجالے اپنی یادوں کے ہمارے ساتھ رہنے دو
نہ جانے کس گلی میں زندگی کی شام ہو جائے

❊ علی عمران......ملتان
اتنے ناصح ملے رستے میں کہ، توبہ توبہ
بڑی مشکل سے میں شوریدہ سروں تک پہنچا

❊ ماجد تسکین عباس کھارا......نور پور تھل، ضلع خوشاب
تکلف کی حدوں کو خود گرا کر اب وہ کہتا ہے
تیرا بے باک سا لہجہ مجھے اچھا نہیں لگتا

❊ ریاض بٹ......حسن ابدال
اداس آنکھوں سے آنسو نہیں نکلتے ہیں
موتیوں کی طرح سیپوں میں پلتے ہیں
یہ اک پیڑ ہے آ اس سے گلے مل کے روئیں ہم
یہاں سے تیرے میرے رستے بدلتے ہیں

❊ انعم کمال......کراچی
یادوں کی میز پر کوئی تصویر چھوڑ دو
کب سے ہمارے ذہن کا کمرا اداس ہے

❊ جنید احمد ملک......گلستان جوہر، کراچی
پتھر جنہوں نے پھینکے تھے ان سے گلہ نہیں
گھر ہی ملے تھے ہم کو نصیب سے کانچ کے

❊ ہادیہ ایمان، ماہا ایمان......کھاتاں
جاتی ہی نہیں شامِ الم جاں کے افق سے
ڈوبے ہیں کچھ اس طرح سے دن عہدِ طرب کے
اس شام کے دامن میں شفق بھی تو نہیں ہے
مل جائیں جہاں رنگ تیرے عارض و لب کے

❊ ارسلان حیدر......راولپنڈی
یہی رت تھی، یہی فضا تھی، یہی زمانہ تھا
یہیں سے ہم نے محبت کی ابتدا کی تھی

٭ ظفر اقبال ظفر...... کامرہ، شرقی
دل کہتا ہے استخارہ کرلو
استخارہ کہتا ہے کنارہ کرلو

٭ جاوید اختر رانا...... پاکپتن شریف
ہر شجر سے نہ رکھ امیدِ ثمر
کچھ شجر بے ثمر بھی ہوتے ہیں
سیپیوں کو نہ جان بے مایہ
سیپیوں میں گہر بھی ہوتے ہیں

٭ عبدالجبار رومی انصاری...... چوہنگ لاہور
اجڑے ہوئے لوگوں سے گریزاں نہ ہوا کر
حالات کی قبروں کے کتبے بھی پڑھا کر
کیا جانیے کیوں تیز ہوا سوچ میں گم ہے
خوابیدہ پرندوں کو درختوں سے اڑا کر

٭ ظفر اللہ وڑائچ...... وہاڑی سٹی
غم بھی دیے تو یوں کہ نہ واپس لیے کبھی
ان کے ہماری ذات پہ احسان ہی رہے

٭ مدحت...... کراچی
قید میں گزرے گی جو عمر بڑے کام کی تھی
پر میں کیا کرتی کہ زنجیر تیرے نام کی تھی
جس کے ماتھے پہ میرے بخت کا تارہ چمکا
چاند کے ڈوبنے کی بات اسی شام کی تھی

٭ زوہیب احمد ملک...... گلستان جوہر، کراچی
قدموں میں بھی تکان تھی، گھر بھی قریب تھا
پر کیا کریں کہ اب کے سفر ہی عجیب تھا
نکلے اگر تو چاند دریچے میں رک بھی جائے
اس شہرِ بے چراغ میں کس کا نصیب تھا

٭ مہتاب احمد...... حیدرآباد
میری آنکھ بند تھی جب تلک وہ نظر میں نورِ جمال تھا
کھلی آنکھ تو نہ خبر رہی کہ وہ خواب تھا کہ خیال تھا

٭ سید احسن علی...... اوکاڑہ
وہ ایک ہی چہرہ تو نہیں سارے جہان میں
جو دور ہے وہ دل سے اتر کیوں نہیں جاتا

٭ سجاد علی...... تحصیل عیسیٰ خیل ضلع میانوالی
استادِ عشق سچ کہا تو نے بہت نالائق ہوں میں
مدت سے اک شخص کو منانا نہیں آیا

٭ قاری محمد رمضان حسرت الحسنی...... نور پور تھل، خوشاب
خوابوں کی طرح تھا نہ خیالوں کی طرح تھا
وہ شخص ریاضی کے سوالوں کی طرح تھا
الجھا ہوا ایسا کہ کبھی کھل ہی نہ پایا
سلجھا ہوا ایسا کہ مثالوں کی طرح تھا

٭ بلقیس بانو...... نواب شاہ
گواہی کیسے ٹوٹتی، معاملہ خدا کا تھا
مرا اور اس کا رابطہ تو ہاتھ اور دعا کا تھا
بکھر گیا ہے پھول تو ہم ہی سے پوچھ کچھ ہوئی
حساب باغباں سے ہے، کیا دھرا ہوا کا تھا

٭ مہوش ادریس...... اسلام آباد
بادباں کھلنے سے پہلے کا اشارہ دیکھنا
میں سمندر دیکھتی ہوں، تم کنارہ دیکھنا
یوں بچھڑنا بھی بہت آساں نہ تھا اس سے مگر
جاتے جاتے اس کا وہ مڑ کر دوبارہ دیکھنا

٭ سید عبادت کاظمی...... ڈیرہ اسماعیل خان
مجھے غم زدہ دیکھ کر تیرے ہونٹ جو کھل اٹھے
مجھے اپنے حال کا غم نہیں تیرے مسکرانے کا شکریہ

٭ مرزا طاہر الدین بیگ...... میرپور خاص
آج کیا دیکھ کے بھر آئی ہیں تیری آنکھیں
ہم پہ اے دوست یہ ساعت تو ہمیشہ گزری

٭ چودھری محمد یعقوب...... خانیوال
ہے شوق سفر ایسا کہ اک عمر سے ہم نے
منزل بھی نہیں پائی، رستہ بھی نہیں بدلا

٭ محمد اقبال...... کورنگی، کراچی
بچھڑا ہے جو اک بار تو ملتے نہیں دیکھا
اس زخم کو ہم نے کبھی سلتے نہیں دیکھا
اک بار جسے چاٹ گئی دھوپ کی خواہش
پھر شاخ پہ اس پھول کو کھلتے نہیں دیکھا

٭ شمیم الدین...... سیالکوٹ
بہت سنبھل کے چلنے والی تھی پر اب کے بار تو
وہ گل کھلے کہ شوخیٔ صبا ہی اور ہوگئی

٭ عالیہ رحیم...... ٹنڈوالہ یار
زمین پہ پاؤں تھے قیام آسمان میں تھا
میری طرح سے وہ شخص بھی امتحان میں تھا

❄ جبران احمد ملک.....گلشنِ اقبال، کراچی
جب تک وہ بے نشان رہا، دسترس میں تھا
خوش نام ہوگیا تو ہمارا نہیں رہا

❄ نبیل خان.....کوئٹہ
جن چیزوں کے ہرا رہنے کی دعا کی تھی
ان میں آج سے شامل زخمِ ہنر بھی ہے

❄ محسن اعجاز.....حیدرآباد
کچھ تو تیرے موسم ہی مجھے راس کم آئے
اور کچھ میری مٹی میں بغاوت بھی بہت تھی

❄ شازیہ.....کراچی
دل دکھا ہے تو کھلی ہے میرے وجدان کی آنکھ
اک شگوفہ تھا کہ شبنم کے جگانے سے اٹھا

❄ انیس الرحمان.....لاہور
شاخِ بدن کو تازہ پھول نشانی دے
کوئی تو ہو جو میری جڑوں کو پانی دے

❄ مختار علی.....گوجرانوالہ
اک حرفِ تلخ میری زباں سے نکل چکا
کیا عذر ہو کہ تیر کماں سے نکل چکا

❄ محمد کمال انور.....اورنگی ٹاؤن، کراچی
کوئی ستارہ میرے ساتھ ساتھ چلنے لگا
سفر میں جیسے ہی مجھ کو ترا خیال آیا

❄ کاشف رفیق.....سکھر
نہ مٹ سکے گا، کوئی میرے شیشہ گر سے کہہ دے
جو فاصلہ پڑ گیا دلوں میں لکیر ایسا

❄ ثاقب کمال.....کراچی
تمام رات برستی ہے ریت پر شبنم
میں اپنے چاند سے جب بھی خفا سا لگتا ہوں

❄ فرحان شیخ.....پاک کالونی، کراچی
یہی انداز ہے میرا سمندر فتح کرنے کا
مری کاغذ کی کشتی میں کئی جگنو بھی ہوتے ہیں

❄ امتیاز علی.....پھالیاں
وہ فرشتے آپ تلاش کریئے کہانیوں کی کتاب میں
جو برا کہیں نہ برا سنیں، کوئی شخص ان سے خفا نہ ہو

❄ اشعر علی.....ملتان
مری نظر میں ہے ڈوبنے کا منظر بھی
غروب ہوتا ہوا آفتاب دے جاؤ

❄ محمد راشد.....خانیوال
شہر مکاں، دکانوں والے سب پردے کرنوں نے لپیٹے
ختم ہوا سب کھیل تماشا جا اب گھر جا رات ہوئی

❄ احمد علی.....رحیم یار خان
چڑیوں کے لیے چاول پودوں کے لیے پانی
تھوڑی سی محبت دے ہم چاہنے والوں کو

❄ ممتاز احمد.....میانوالی
کچھ تو پاس بچا کر رکھو، سب کچھ کاروبار نہ جانو
دل کے دروازے مت کھولو اس گھر کو بازار نہ جانو

❄ کہکشاں پرویز.....فیصل آباد
سب کچھ خاک ہوا ہے لیکن چہرہ کیا نورانی ہے
پتھر نیچے بیٹھ گیا ہے اوپر بہتا پانی ہے

❄ منور حسن.....نواب شاہ
پاس سے دیکھو جگنو آنسو، دور سے دیکھو تارا آنسو
میں پھولوں کی سیج پہ بیٹھا آدھی رات کا تنہا آنسو

❄ زرمین.....اسلام آباد
میں اگر بھاگا تو پھر ہرگز نہیں آتے کا ہاتھ
کہہ دو وحشت سے کہ کیوں چھیڑے ہے دیوانی مجھے

❄ ناصر خان.....بہاولپور
پہنچا نہ کبھی قافلے تک آہ عزیزو!
مجھ سا بھی جہاں میں کوئی بدنام دکھاؤ

❄ انجم امین.....پشاور
کھلی ہوئی ہیں مری زیرِ خاک بھی آنکھیں
کسی کا آہ یہاں تک ہے انتظار مجھے

کوپن برائے شمارہ دسمبر 2015

مُحفلِ شعر و سُخن

نام : ---------------------------------

پتا : ---------------------------------

اعتراف

ثمر عباس

کسی کی برتری اور اپنی کمتری کا اعتراف اگرچہ ایک مشکل کام ہے مگر کرنے والے اسے بھی کرجاتے ہیں... اسے بھی یہ تسلیم کرنے میں اگرچہ چالیس سال لگے لیکن بالآخر اسے اعتراف کرنا پڑا کہ اس سے زندگی میں وہ ایک ایسی غلطی سرزد ہوئی جس کی تلافی ممکن ہی نہ تھی مگر... اس اعتراف نے جیسے اس کے ضمیر سے ایک بوجھ اتار دیا تھا۔ گویا قدرت اپنے تقاضے ہر انداز سے پورے کرنا جانتی ہے۔

دھندلی یادوں سے ابھرنے والے ایک دلخراش منظر

کی عکاسی
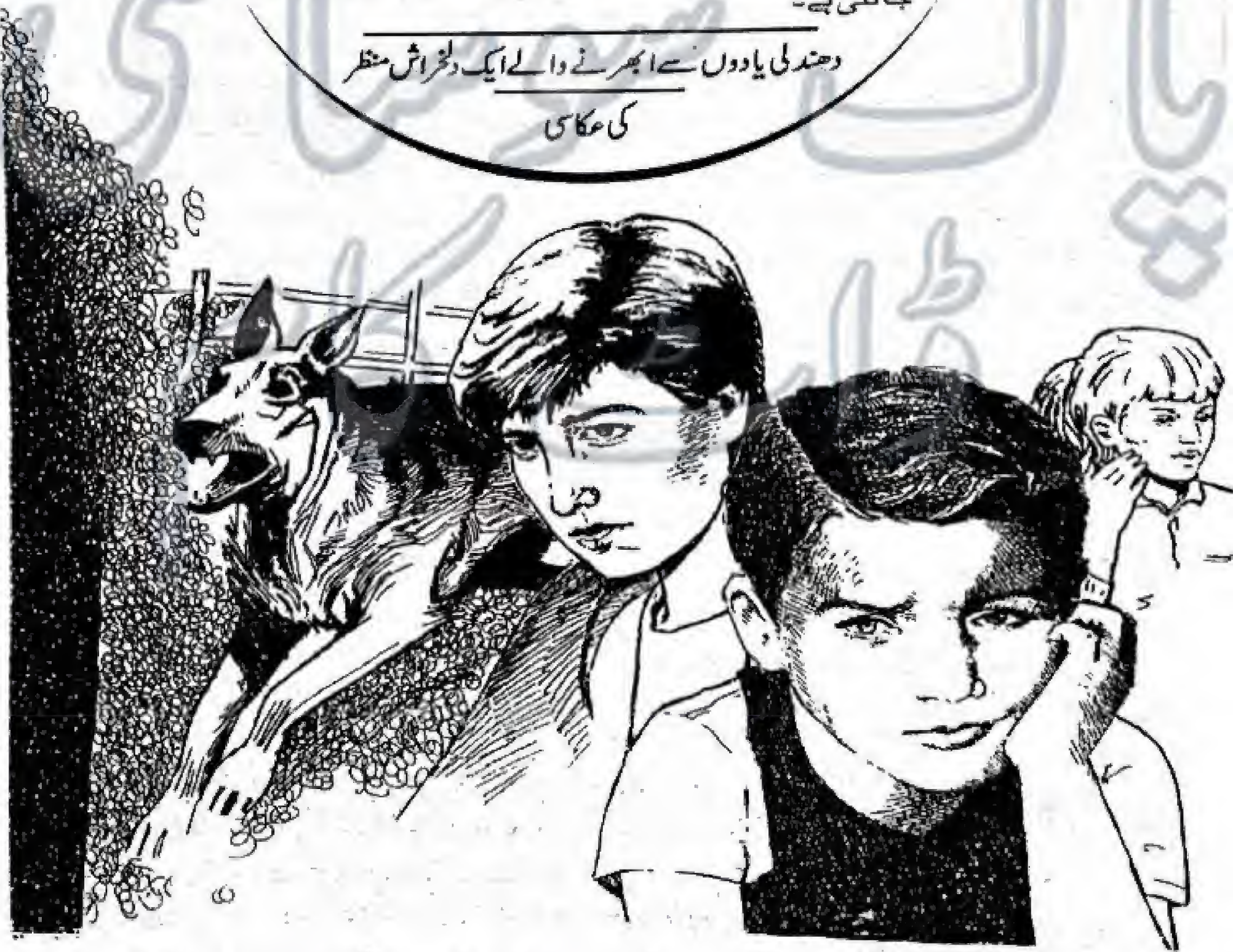
ہر انسان اپنی زندگی میں کوئی نہ کوئی غلطی ضرور کرتا ہے۔ ان میں کچھ معمولی اور کچھ غیر معمولی نوعیت کی ہوتی ہیں۔ ان میں سے بہت سی باتیں بھلا دی جاتی ہیں اور کچھ زندگی بھر کے لیے ضمیر پر بوجھ بن جاتی ہیں۔ ہم دونوں نے طے کرلیا تھا کہ دوبارہ کبھی اس بارے میں گفتگو نہیں کریں گے اور نہ ہی کسی اور کے سامنے اس کا تذکرہ کریں گے لیکن اب اس واقعے کو چالیس برس گزر چکے ہیں۔ میں بوڑھی ہوچکی ہوں اور میری بہن اس دنیا میں نہیں ہے۔ ویسے بھی

بوڑھی عورتوں کی بات پر کون توجہ دیتا ہے۔ اس لیے میں سمجھتی ہوں کہ اسے دہرانے میں کوئی حرج نہیں رہا لیکن... کم از کم اس اعتراف کے بعد میں ضمیر کے بوجھ سے تو آزاد ہو جاؤں گی۔

☆☆☆

میں اور الما سورج نکلنے سے پہلے ہی ناشتا کرلیا کرتے تھے۔ جبکہ ماما اس سے بھی پہلے کام کے لیے نکل جاتی تھیں۔ اس وقت باہر اندھیرا چھایا ہوتا تھا اور چاند ستاروں کے ساتھ ساتھ کہیں کہیں لالٹین کی روشنی نظر آجاتی جو علی الصباح کام پر جانے کے لیے لوگ ساتھ لے کر نکلتے تھے۔ گھر سے جاتے وقت ماما مجھ سے دو باتیں ضرور کہتی تھیں، ایک تو یہ کہ دودھ کا برتن اچھی طرح دھولینا اور دوسرے بہن کا خیال رکھنا۔ حالانکہ مجھے ان ہدایات کی ضرورت نہیں تھی۔ میں وقت سے پہلے ہی بہت کچھ دیکھ اور جان گئی تھی۔ ناشتے سے فارغ ہو کر ہم دونوں اچھی طرح رگڑ رگڑ کر اپنے ہاتھ اور منہ پانی سے دھوتے کیونکہ ہمیں بتایا گیا تھا کہ لوگ صاف ستھرے بچوں سے دودھ لینا پسند کرتے ہیں۔

ہمیشہ کی طرح ہم نے دودھ کی بھری ہوئی بالٹی اٹھائی اور اس کے ڈھکنے پر لگے ہوئے ہینڈل کو ایک طرف سے میں نے اور دوسری جانب سے الما نے پکڑا۔ ہم پتھر یلے راستے پر ننگے پیر دودھ سے بھری ہوئی وزنی بالٹی اٹھائے چلے جارہے تھے لیکن دونوں میں سے کسی کو بھی اس تکلیف کا احساس نہیں تھا۔ وقت ہی ایسا آگیا تھا کہ ہم کانچ کے ٹکڑوں پر بھی چل سکتے تھے۔ ہم کئی گھروں کے آگے سے گزرتے ہوئے ہیریسن کے دروازے پر پہنچے۔ ان کے کچن سے آنے والی روشنی پورچ تک آرہی تھی۔ میں نے وہیں سے آواز لگائی۔ ''مسز ہیریسن! باہر آجائیں۔ اس سے پہلے کہ ہمیں دستک دینی پڑ جائے۔''

''ایک منٹ ٹھہرو۔ میں آرہی ہوں۔''

اس نے آنے میں دیر نہیں لگائی۔ اس کے ہاتھ میں ایک پیالہ نما برتن تھا جسے وہ میری طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ ''خدا تمہارا بھلا کرے کہ تم ہر روز ہمارے لیے تازہ دودھ لے کر آتی ہو۔''

میں نے ناپ کر اس کے پیالے میں چار کپ دودھ ڈالا جس سے وہ منہ تک بھر گیا۔ اس نے ایک ایک کر کے میرے ہاتھ پر چند سکے رکھے جنہیں الما بہ آواز بلند گنتی رہی پھر میں نے سکے اپنی جیب میں ڈال لیے۔ بالٹی کا وزن اب کچھ کم ہو گیا تھا لیکن اب بھی اسے اٹھانا مجھ اکیلے کے بس کی بات نہیں تھی لہٰذا الما کو میرا ساتھ دینا پڑ گیا۔ اس کے بعد ہم دوسرے گھروں میں دودھ دیتے ہوئے اس سڑک پر جا نکلے جو گارنی کے گھر کی طرف جاتی تھی۔

مجھے وہ دن اچھی طرح یاد تھا جب پچھلی گرمیوں میں ماما نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنی گائے کا دودھ پڑوسیوں کو بیچ کر اپنی آمدنی میں اضافہ کرنا چاہتی ہیں لیکن اپنی ملازمت کی وجہ سے وہ لوگوں کے گھروں تک دودھ پہنچانے کا کام نہیں کرسکتی تھیں تب میں اور الما آگے بڑھے اور انہیں یقین دلایا کہ ہم دونوں اس کام میں ان کی مدد کرسکتے ہیں۔ تب ہی ہم نے طے کرلیا تھا کہ کس گھر میں دودھ پہنچانا ہے اور کن گھروں کو چھوڑ دینا ہے۔ ان میں گارنی کا گھر بھی شامل تھا لیکن ایک روز گھر واپس آتے ہوئے ہم نے گارنی کی بیٹی جیسی کو باہر پورچ میں بیٹھے ہوئے دیکھا۔ وہ اپنے دونوں بازو گھٹنوں کے گرد لپیٹے ہوئے تھی۔ میں اسے اس حال میں دیکھ کر گھبرا گئی۔ مجھ سے برداشت نہ ہوسکا۔ میں سیدھی اس کے پاس گئی اور اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ اس کی سبز آنکھیں زمرد کی طرح چمک رہی تھیں اور اس کے چہرے پر ہلکا سا نشان پڑا ہوا تھا۔

''کیا ہوا؟'' میں نے پوچھا تو جیسی نے نفی میں سر ہلا دیا۔ وہ بولی۔ ''کچھ نہیں۔''

اندر سے کسی کے بولنے کی آواز آئی۔ ''کون ہے جیسی...... تم کس سے باتیں کر رہی ہو؟''

''الما اور میری ہیں۔'' جیسی نے مکان کی طرف منہ کر کے جواب دیا۔

''گڈ مارننگ!'' میں نے اس کی ماں کو باہر آتے دیکھ کر کہا۔ ''ہم اپنی گائے کا دودھ بیچتے ہیں۔ اگر تم چاہو تو کل سے تمہیں بھی دے دیا کریں گے۔ فی کپ ایک پینی۔''

اس نے ہمیں غور سے دیکھا اور بولی۔ ''ٹھیک ہے۔ دو کپ کافی ہوں گے۔'' پھر جیسی سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔ ''تم اندر آکر بے بی کو سنبھالو۔ مجھے بہت سارے کام کرنا ہیں۔''

☆☆☆

اس روز جیسی اسکول نہیں آئی بلکہ اس نے پورے ہفتے ہی ناغہ کیا۔ شاید وہ اپنے چہرے پر لگے ہوئے داغ کسی کو نہیں دکھانا چاہتی تھی جبکہ لڑکوں کا معاملہ مختلف تھا۔ اس کے بھائیوں کے چہرے پر چاہے کتنے ہی زخم اور داغ کیوں نہ ہوں وہ اسکول سے چھٹی نہیں کرتے تھے اور نہ ہی ٹیچر نے ان سے اس بارے میں کبھی پوچھا۔ انہیں اس ....

کی پروا کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی جبکہ وہ خود ڈنڈے اور چھڑی کا آزادانہ استعمال کیا کرتے تھے اور آئے دن کوئی نہ کوئی طالب علم ان کا نشانہ بن جاتا تھا۔ البتہ میں اور الما ابھی تک محفوظ تھیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ہم اپنا کام اچھی طرح کیا کرتے تھے اور صرف اپنی باری آنے پر ہی بولتے تھے۔ ہم جانتے تھے کہ ہمارے لیے اس اسکول کی کیا اہمیت ہے۔ یہیں سے ہم اپنے لیے زندگی کی نئی راہیں تلاش کر سکتے تھے۔ ہمیں ان یخ بستہ صبحوں سے نجات مل سکتی تھی جب ہم منہ اندھیرے باہر نکل کر گھر گھر دودھ پہنچاتے تھے۔ اس گھر میں پیٹ بھر کر کھانا نصیب نہیں ہوتا تھا لیکن ہم یہی ظاہر کرتے تھے کہ ہم نے سیر ہو کر کھایا ہے۔ جانتے تھے کہ اگر ماں سے مزید کھانے کو مانگ لیا تو اس کے چہرے پر چھا جانے والا دکھ ہم سے نہیں دیکھا جائے گا۔

میں اور الما مختلف منصوبے بنایا کرتے تھے۔ ہمیں امید تھی کہ اسکول کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد ٹیچر یا کسی اسٹور میں کلرک کی ملازمت مل جائے گی یا کم از کم ہم ایسی جگہ کام کر سکیں گے جہاں موسم کی سختی اثر انداز نہ ہوتی ہو اور ہم جسمانی مشقت کے بجائے ذہن کا استعمال کریں کیونکہ جسمانی کام کرنے والے کسی وقت بھی حادثے کا شکار ہو سکتے ہیں۔ جیسے کہ ہمارا باپ جو ایک ویگن کے پہیوں تلے آ کر اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا یا میری ماں جو جانسن کی لانڈری میں کام کرتی تھی اور اس کی صحت دن بہ دن گرتی جا رہی تھی۔ وہ دن بھر گیلے کپڑوں کا ڈھیر ایک تالاب سے دوسرے تالاب میں منتقل کرتی رہتی۔ اس کے بازو اور ہاتھ گرم پانی اور سستے صابن سے لتھڑے رہتے جس کی وجہ سے رات بھر اس کے جسم میں خارش ہوتی تھی۔

دوسرے بچے بالخصوص گارنی بوائز کے لیے اسکول ایک تفریح کی جگہ تھی جہاں وہ وقت گزارنے، دوستوں سے ہنسنے بولنے اور کھیل کود کے لیے آتے تھے۔ گارنی کے دونوں جڑواں بیٹے اسٹیفن اور مائیکل کتاب کھول کر بیٹھ جاتے اور اس پر نظریں جمائے اس طرح ہونٹ ہلاتے رہتے جیسے سبق پڑھ رہے ہوں لیکن جب ان کی ٹیچر مس کولیئر ان سے کھڑے ہو کر ریڈنگ کے لیے کہتی تو وہ یوں چونک جاتے جیسے گہری نیند سے جاگے ہوں۔ ان کے باقاعدگی سے اسکول آنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس طرح انہیں گھر کے کاموں سے چھٹکارا مل جاتا تھا۔

دودھ بیچنے کے بعد ہم اپنی گائے کو دریا کے کنارے لے جاتے جہاں وہ اپنی من پسند جگہ پر گھاس چرتی۔ البتہ

بعد از مرگ

”کیا تم موت کے بعد زندگی پر یقین رکھتے ہو؟“ مالک نے آفس بوائے سے پوچھا۔

”جی ہاں جناب! لیکن بات کیا ہے جناب؟“ آفس بوائے نے ذرا حیرانگی سے پوچھا۔

”کل جب تم اپنے دادا کے جنازے میں شرکت کے لیے گئے تھے تو ادھر وہ تمہاری تلاش میں آئے تھے۔“

مرسلہ: ریاض بٹ، حسن ابدال

ناقابلِ انکار

☆ سب سے بڑی حقیقت موت ہے۔
☆ سب سے بڑی مہلت زندگی ہے۔
☆ سب سے بڑی آزمائش مال و دولت ہے۔
☆ سب سے بری عادت جھوٹ ہے۔
☆ سب سے بہترین کتاب قرآن مجید ہے۔
☆ سب سے بڑی عدالت محشر ہے۔

مرسلہ۔ رانا سجاد اختر، سینٹرل جیل ملتان

برف باری کے دنوں میں ہم اسے صحن تک ہی محدود رکھتے تھے۔ اس ڈر سے کہ کہیں برف پر پھسل کر اس کی ٹانگ نہ ٹوٹ جائے اور اسے کھانے کے لیے وہ چارا دیتے جو اس کے دودھ کی فروخت سے ہونے والے پیسوں سے خریدا جاتا۔ یہ ہمارا روز کا معمول تھا کہ جس گاہک سے ہمیں جتنے پیسے ملتے، انہیں جیب میں ڈالنے کے بعد بہ آوازِ بلند گنتے رہتے۔ پھر ان پیسوں کو میز کی دراز میں رکھ کر اسکول چلے جاتے۔ اسکول سے واپس آنے کے بعد اس رقم کا اندراج ایک کاغذ میں کیا جاتا اور پھر اسے تہ کر کے احتیاط سے ایک بکس میں رکھ دیتے۔ ہمیں یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ پیسے بینک میں رکھے جاتے ہیں اور نہ ہی بینک اکاؤنٹ کھولنے کے لیے یہ کافی رقم تھی۔ ہمیں یہ خطرہ بھی نہیں تھا کہ کوئی ان پیسوں کو چرا سکتا ہے۔ ماما روزانہ کی آمدنی اور خرچ دیکھا کرتی تھیں۔ ہم صرف چارا خریدنے کے لیے اس میں سے پیسے نکالتے تھے لیکن یہ رقم بہت آہستگی سے بڑھ رہی تھی۔ ہم نے ابھی تک اس رقم کو خرچ کرنے کا کوئی منصوبہ نہیں بنایا تھا اور نہ ہی ہم کسی خاص مقصد کے لیے رقم جمع کر رہے تھے۔

ہم نے زندگی کے معاملات کو بڑی حد تک اپنے قابو میں کر لیا تھا۔ ماما روزانہ دو میل پیدل چل کر لانڈری جاتی

تھیں۔ ان کے کپڑوں سے صابن اور سوڈے کی بو آ رہی ہوتی تھی۔ میرے لیے سب سے زیادہ تلخ اوقات وہ ہوتے جب ہم اپنے دادا سے ملنے جاتے تھے۔ مجھے نہیں معلوم کہ انہوں نے کبھی ہمیں مدد کی پیشکش کی ہو اور میری ماں نے اسے اس لیے ٹھکرا دیا ہو کہ ہمارے پاس اپنا مکان اور جانوروں کا باڑا تھا جس سے ہمارا گزارہ ہو رہا تھا یا انہوں نے کوئی مدد کی ہو تو اس میں بے دلی اور تلخی کا عنصر شامل رہا ہو۔ حالانکہ ان کے پاس پیسوں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ ان کا خیال تھا کہ ہم نے ان سے بیٹا چھین لیا جو ان کا سب سے قیمتی اثاثہ تھا اور اسے کھو دینے کے بعد ہم مزید کسی امداد کے حق دار نہیں تھے۔

وہ تین فروری کا دن تھا اور چند روز پہلے ہی شدید برف باری ختم ہوئی تھی۔ ہم اسکول کے لیے روانہ ہوئے۔ اس روز میرے اور الما کے پاس پیسے گننے کا کوئی کام نہیں تھا کیونکہ گائے کا دودھ خشک ہو گیا تھا اور اب وہ مارچ میں دوبارہ دودھ دینے کے قابل ہوتی۔ ماما نے ہمیں یقین دلایا تھا کہ گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ بچھڑے کی پیدائش کے بعد گائے پہلے سے زیادہ مقدار میں دودھ دے گی جس سے ہمیں اچھی آمدنی ہو سکتی ہے۔ اگر وہ بچھیا ہوئی تو مائیکل اسے خرید لے گا اور اگر وہ بیل ہوا تو قصائی اسے لے جائے گا۔ الما کی سمجھ میں یہ بات آ گئی اور وہ انہی پیسوں کو بار بار گن کے اپنے آپ کو مطمئن کرتی رہتی لیکن میرے لیے یہ سب کچھ برداشت کرنا مشکل تھا۔ مجھے وہ دن شدت سے یاد آ رہے تھے جب میں تاروں کی چھاؤں میں اٹھ کر گائے کا دودھ دوہتی تھی اور سخت سردی میں اس کے جسم سے نکلنے والی حرارت سے مجھے بڑا سکون ملتا تھا۔ میں اپنا چہرہ اور کندھے اس کے جسم سے لگا دیتی اور اس کے تھنوں سے نکلنے والا دودھ میرے ہاتھوں کو حرارت بخشتا تھا۔

ہم ابھی راستے میں ہی تھے کہ جان گارنی ہمارے پاس سے گزرا۔ وہ غصے کے عالم میں بڑبڑا رہا تھا اور اس کی سانسوں سے الکحل کی بو آ رہی تھی۔ ہم ایک موڑ پر جا کر رک گئے۔ اس جگہ سے ہمیں سڑک پار کرنے میں بہت احتیاط کرنا پڑتی تھی کیونکہ اس جگہ سڑک ڈھلوان تھی اور برف باری کی وجہ سے جگہ جگہ برف کے تودے نظر آ رہے تھے۔ جان نے تیزی سے سڑک پار کرنے کی کوشش کی اور اچانک ہی مسٹر ہیریسن کے چھکڑے کے سامنے آ گیا۔ ہیریسن نے فوراً ہی لگام کھینچ کر گاڑی روکنے کی کوشش کی لیکن جان نے انہیں برا بھلا کہنے کے ساتھ ساتھ گھوڑوں پر بھی ہاتھ اٹھا لیا۔ بے زبان جانور پر ظلم ہوتا دیکھ کر ہیریسن چھکڑے سے نیچے اتر آیا اور دونوں آپس میں گتھم گتھا ہو گئے۔ وہ ٹھنڈی زمین پر گرے ایک دوسرے پر چلا رہے تھے۔ میں نے الما کا ہاتھ پکڑ کر پیچھے کیا اور ہم دونوں ایک دوسرے باڑے کی دیوار کے پیچھے چھپ گئے۔ اتنی دیر میں وہاں کافی لوگ جمع ہو گئے اور انہوں نے دونوں کو الگ کیا۔ مسٹر ہیریسن نے اتنی دیر میں اس کی اچھی خاصی ٹھکائی کر دی تھی۔ الما اور میں دور کھڑے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ ہم نے پہلی بار دو بڑے آدمیوں کو لڑتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس قصبے میں لوگ سکون سے رہتے اور چرچ کے احکامات پر عمل کرتے تھے۔ گارنی نے مجھے اور میری بہن کو دیکھا پھر اس کی نظریں ہمارے پیچھے کھڑے ہوئے لڑکوں پر جم گئیں۔ اس نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''تم دونوں یہاں آؤ۔'' اس کی آواز برف کی طرح سخت تھی۔ وہ دونوں لڑکے اپنے باپ کی شکست کا منظر دیکھ چکے تھے اور جانتے تھے کہ گھر پہنچنے کے بعد ان پر کیا گزرے گی۔ اسٹیفن اپنے بھائی کا ہاتھ پکڑ کر باپ کے ساتھ چلا گیا اور جب وہ اسکول آیا تو اس کے ساتھ مائیکل اور جلیسی نہیں تھے۔ اس نے دونوں کے نہ آنے کی کوئی وجہ بھی نہیں بتائی۔ اس دن ہمارے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی اور ہم خاموشی سے اسٹیفن کے ساتھ والی بینچ پر بیٹھے رہے۔

☆☆☆

رات میں کسی وقت میری آنکھ کھل گئی۔ باپ کے انتقال کے بعد ایسا اکثر ہونے لگا تھا۔ میں نے الما کی طرف دیکھا۔ وہ بے خبر سو رہی تھی پھر میں ننگے پاؤں چلتی ہوئی ماں کے کمرے میں گئی اور اس کے سینے کے زیر و بم سے اندازہ لگا لیا کہ اس کی سانس معمول کے مطابق چل رہی ہے۔ ان دونوں کی جانب سے مطمئن ہونے کے بعد میں نے ماں کی سبز شال اپنے نائٹ گاؤن کے گرد لپیٹی اور دبے قدموں چلتی ہوئی عقبی صحن میں چلی آئی۔ چاند کی مدھم روشنی میں ہماری گائے بھی شیڈ کے نیچے بے خبر سو رہی تھی۔ میں وہاں کھڑی اسے دیکھ ہی رہی تھی کہ مجھے برف پر کسی کے چلنے کی آواز سنائی دی۔ کوئی شخص ہمارے باڑے میں سے گزر رہا تھا۔ میں نے غور سے دیکھا تو مجھے اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی لالٹین نظر آئی۔ مجھ سے بے احتیاطی میں ایک غلطی ہو گئی۔ وہ میری آواز سن کر رک گیا اور لالٹین اونچی کر کے اردگرد دیکھنے لگا۔ اس سے تو اسے کوئی فائدہ نہیں ہوا لیکن لالٹین کی روشنی میں مجھے اس کا چہرہ نظر آ گیا۔ میں اپنی جگہ پر

ساکت کھڑی رہی۔ چند منٹ بعد وہ آگے بڑھا اور ہمارے احاطے کی باڑ پھلانگ کر دوسری جانب نکل گیا۔ وہ اسٹیفن تھا اور میں سوچ رہی تھی کہ کیا اسے بھی میری طرح رات کو جاگنے کی عادت ہے۔

مجھے بستر پر لیٹے تھوڑی ہی دیر ہوئی ہوگی کہ باہر سے چیخنے چلانے اور لوگوں کے بھاگنے کی آوازیں آنے لگیں۔ الما گھبرا کر اٹھ بیٹھی اور مجھ سے لپٹ کر رونے لگی۔ ماما بھی اپنے کمرے سے باہر آگئیں اور ہم دونوں کا ہاتھ پکڑ کر بیرونی دروازے کی طرف بڑھیں تاکہ جان سکیں کہ کیا واقعہ پیش آیا ہے۔ اڑوس پڑوس کے لوگ ہیریسن کے مکان کی طرف بڑھ رہے تھے جس سے شعلے اٹھتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔

''لڑکیو...... جلدی سے تیار ہوجاؤ۔'' ماما نے کہا۔ ''ہمیں بھی وہاں جانا چاہیے۔ شاید ہم ان کی کچھ مدد کرسکیں۔''

جب ہم وہاں پہنچے تو آگ کے شعلے مزید بلند ہوچکے تھے اور سیاہ آسمان زرد شعلوں کی لپیٹ میں آچکا تھا۔ لوگ پانی کی بالٹیاں بھر بھر کر آگے بجھانے کی کوشش کررہے تھے جو ہیریسن کے چھکڑے اور غلے کے گودام کو اپنی لپیٹ میں لے چکی تھی۔ ہم جس جگہ پر دوسری عورتوں اور لڑکیوں کے ساتھ کھڑے ہوئے تھے، وہاں کی برف بھی آگ کی حدت سے پانی کے دھارے میں تبدیل ہوچکی تھی۔ اس شوروغل میں مختلف قسم کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ ''دونوں گھوڑے غائب ہیں...... ایک لالٹین ٹوٹی ہوئی ملی ہے...... گارنی...... وہ کہاں ہے......'' وغیرہ وغیرہ۔

خدا خدا کرکے آگ پر قابو پالیا گیا۔ تباہ شدہ چھکڑے اور گودام کے جلے ہوئے شہتیروں کے قریب کھڑے ہوئے لوگوں نے ان لڑکوں کو آگے جانے سے منع کیا جو آگ بجھانے کی خوشی میں رقص کررہے تھے۔ محلے کے بزرگ ہیریسن کے گرد جمع تھے لیکن ہم ان کی گفتگو نہیں سن سکے۔ ہیریسن اپنے مکان میں گیا اور ایک رائفل لے کر باہر آگیا۔ سب لوگوں نے اپنی بالٹیاں اور بیلچے باڑ کے ساتھ رکھ دیے اور اس کے ساتھ چل پڑے۔ البتہ کچھ نوجوان وہیں رک گئے تاکہ بچی کچی چنگاریوں کو بجھا دیں ورنہ تیز ہوا دوبارہ انہیں شعلوں میں تبدیل کرسکتی تھی جبکہ کچھ لوگ گھوڑوں کو ڈھونڈنے کے لیے نکل پڑے۔ کچھ عورتیں مسز ہیریسن کی دل جوئی کے لیے مکان کے اندر چلی گئیں۔ جبکہ بقیہ عورتیں جن میں ہم لوگ بھی شامل تھے، مردوں کے پیچھے ہولیں۔ کچھ لوگ اپنے گھروں کو چلے گئے اور جب واپس آئے تو ان کے شانوں پر بندوقیں لٹک رہی تھیں اور میں سوچ رہی تھی کہ کئی ماہ پہلے ہرن کے شکار کے موقع پر یہ بندوقیں استعمال کی گئی تھیں۔ اس کے بعد سے اب تک ان سے کوئی فائر نہیں کیا گیا تھا۔ خدا خیر کرے...... آنے والے منظر کا تصور کرکے ہی میرا دل ڈوبنے لگا۔

وہ سب گارنی کے مکان کے باہر جمع ہوگئے تھے۔ پورا مکان گھپ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا اور کھڑکیوں سے ذرا سی بھی روشنی باہر نہیں آرہی تھی۔ ان میں سے ایک شخص آگے بڑھا اور اس نے گارنی کا نام لے کر دروازے پر دستک دی۔ اس کے بعد کئی بار اس کا نام پکارا گیا لیکن اندر سے کوئی جواب نہ ملا۔ مجمع میں اضطراب اور بے چینی بڑھتی جارہی تھی۔ ان میں ایسے لوگوں کی اکثریت تھی جو دن میں چودہ گھنٹے کام کرنے کے بعد رات میں مکمل آرام کے خواہاں ہوتے تھے لہٰذا اس وقت بھی ان کی یہی خواہش ہوگی کہ وہ جلد از جلد یہ معاملہ نمٹا کر اپنے بستروں میں دبک جائیں اور میں سوچ رہی تھی کہ اگر اندر سے کوئی جواب نہ آیا تو ان لوگوں کا اگلا ردعمل کیا ہوگا لیکن اس کی نوبت نہیں آئی۔ کچھ دیر بعد دروازہ کھلا اور سارہ گارنی چھوٹی بچی کو گود میں لیے ہوئے باہر آئی۔

''ہم تمہارے شوہر سے بات کرنے آئے ہیں۔'' مجمع میں سے ایک بزرگ بولا۔

''وہ سوچکا ہے۔'' اس نے مجمع کی طرف پریشان نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''اسے جگادو۔ ہمارا اس سے ملنا بہت ضروری ہے۔''

اس نے ایک بار پھر مجمع کی طرف دیکھا اور بڑبڑاتی ہوئی اندر چلی گئی۔ کچھ دیر بعد ایک لالٹین روشن ہوئی اور جان گارنی باہر آگیا۔ اس نے ایک نظر مجمع پر ڈالی اور اپنے سامنے کھڑے لوگوں کو سوالیہ انداز میں دیکھنے لگا جیسے کہہ رہا ہو کہ کیا تماشا لگا رکھا ہے۔

''تھوڑی دیر پہلے تم کہاں تھے؟'' اس سے پوچھا گیا۔

''میں شام سے ہی گھر میں ہوں اور ایک منٹ کے لیے بھی باہر نہیں گیا...... لیکن تم کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''ایک شریف آدمی کے چھکڑے اور گودام کو آگ لگا دی گئی ہے اور یہ وہی شخص ہے جس کے ساتھ آج دن میں تمہارا جھگڑا ہوا تھا۔ آگ بجھانے کی کوشش میں کچھ اور لوگ بھی زخمی ہوئے ہیں۔''

''وہ ایک معمولی سی لڑائی تھی لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ میں کسی کے گھر میں آگ لگادوں۔ میری اس سے

کوئی دشمنی نہیں ہے۔''

اسی دوران میں سارہ بھی واپس آکر اپنے شوہر سے کچھ فاصلے پر کھڑی ہوگئی تھی پھر میں نے جیسی کو بھی باہر آتے دیکھا۔ وہ بہت آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ شاید بہت سے لوگوں نے اس بات کو نوٹ کیا ہو۔ دونوں جڑواں بھائی بھی اس کے ساتھ تھے۔

لوگ اس کے جواب سے مطمئن نہیں ہوئے۔ گارنی نے ان کے موڈ کا اندازہ لگالیا۔ وہ تیزی سے مڑا اور اپنی بیوی کا بازو پکڑتے ہوئے بولا۔ ''انہیں بتاؤ کہ میں ساری رات کہاں تھا۔''

وہ چند لمحے خاموش رہی۔ غالباً سوچ رہی تھی کہ لوگ اس کی گواہی کو کتنی اہمیت دیں گے۔ کیا وہ اپنے شوہر کو بچانے کے لیے جھوٹ بول رہی ہے؟ کیا وہ اپنے شوہر سے خوف زدہ ہے یا پھر انہیں سب کچھ سچ سچ بتا دینا چاہیے...... چاہے اس کے بعد وہ سب لوگ اس کے شوہر کے خلاف ہی کیوں نہ ہو جائیں۔

''یہ حادثے کے بعد سے گھر میں ہی ہے۔'' اس نے اٹکتے ہوئے کہا۔

مجمع میں سرگوشیاں شروع ہوگئیں۔ سارہ اس واقعے کو حادثہ قرار دے رہی تھی جبکہ لوگوں کی رائے اس کے برعکس تھی۔ اگر کوئی شخص نشے کے عالم میں گھوڑوں کے سامنے آجائے تو اسے حادثہ نہیں کہا جاسکتا اور نہ ہی جلے ہوئے چھکڑے اور غلے کی کوٹھڑی کے پاس ٹوٹی ہوئی لالٹین کی موجودگی کوئی حادثہ ہو سکتی ہے۔ میں نے جیسی کی طرف دیکھا جو اپنے بھائیوں کے ساتھ سر جھکائے بیٹھی ہوئی تھی۔ انہوں نے گرم لباس اور جوتے پہن رکھے تھے۔ میری سمجھ میں اس تیاری کا مقصد نہیں آیا۔ جب جیسی نے محسوس کیا کہ میں اسے دیکھ رہی ہوں تو اس نے اسٹیفن کا بازو مضبوطی سے پکڑلیا۔

وہ لوگ کچھ دیر آپس میں صلاح مشورہ کرتے رہے پھر ان میں سے ایک بولا۔ ''گارنی! تمہیں یہاں سے جانا ہوگا چاہے تم قانون کی گرفت میں نہ آؤ لیکن اس الزام سے اپنے آپ کو نہیں بچا سکتے۔ اس سے پہلے بھی تم ہمارے لیے کئی مرتبہ مشکلات پیدا کر چکے ہو لیکن اب تمہیں مزید کوئی موقع نہیں دیا جاسکتا۔''

گارنی ایک قدم آگے بڑھ کر بولا۔ ''میں کہیں نہیں جاؤں گا۔ تم سب یہاں سے دفع ہو جاؤ۔''

''تمہیں جانا ہوگا ورنہ ہم مالک مکان سے کہہ کر صبح تک تمہارے بیوی بچوں کو یہاں سے بے دخل کردیں گے۔''

میں نے جیسی کو اپنی جگہ سے سرکتے اور اس کی ماں کو فریاد کرتے سنا۔ وہ روتے ہوئے ان لوگوں سے اپنا فیصلہ تبدیل کرنے کے لیے کہہ رہی تھی۔ اس کی آہ وزاری سن کر ان لوگوں کا دل پسیج گیا اور انہوں نے اپنے فیصلے میں ترمیم کرتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے، صرف تم یہاں سے چلے جاؤ۔ تمہارے بیوی بچوں سے ہمارا کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ یہ لوگ تمہارے جانے کے بعد بھی یہاں رہ سکتے ہیں۔ ہم ان کی گزر بسر کا بندوبست کردیں گے۔ اب فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔''

جیسی مضطرب نظر آنے لگی۔ وہ جانتی تھی کہ ان کے گھر میں گنتی کی چند لالٹینیں ہیں اور ان میں سے ایک غائب تھی۔ اس نے اپنا ہاتھ اسٹیفن کی گردن کے گرد ڈال دیا تاکہ اسے بولنے سے باز رکھ سکے لیکن میں جانتی تھی کہ وہ کچھ نہیں کہے گا۔ وہ پتھر کی طرح ساکت کھڑا ہوا تھا۔ شاید وہ نہیں جانتا تھا کہ اس سے جو حرکت سرزد ہو چکی ہے، اس کا کیا نتیجہ نکلے گا۔ کیا اسے معلوم نہیں تھا کہ اس کا الزام اس کے باپ کے سر ہی آئے گا؟

یہ تو میں ہی جانتی تھی کہ باپ سے محروم ہو جانے کا کیا مطلب ہوتا ہے۔ جان گارنی کتنا ہی برا سہی لیکن وہ اپنے بیوی بچوں کا واحد سہارا تھا لیکن میں کچھ نہ بولی۔ اگر جیسی، میں یا اسٹیفن خود ہی کہہ دیتا کہ یہ آگ اس نے لگائی تھی تو پھر ہیریسن کا نقصان پورا کرنے کا مطالبہ کیا جاتا۔ اس طرح اسٹیفن مکمل طور پر اپنے باپ کے رحم وکرم پر ہوتا۔ سب لوگ گارنی کے فیصلے کا انتظار کررہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ گارنی کو نکال کر دوسرے لوگوں اور ان کے اثاثوں کا تحفظ کررہے ہیں لیکن یہ میں ہی جانتی تھی کہ اس طرح وہ ایک لڑکے کو بھی پناہ دے رہے تھے۔

گارنی مجمع کو گھورتے ہوئے اپنی بیوی کی جانب بڑھا۔ وہ اس کے تیور دیکھ کر سہم گئی۔ اس نے اپنا ایک بازو مضبوطی سے بچی کے گرد لپیٹ لیا اور دوسرے ہاتھ سے ریلنگ کا سہارا لیتے ہوئے سیڑھیوں پر بیٹھ گئی۔ گارنی دانت پیستے ہوئے بولا۔

''مجھے تم لوگوں کی ضرورت نہیں۔ میں تم لوگوں سے چھٹکارا حاصل کر کے پرسکون ہو جاؤں گا۔''

یہ کہہ کر وہ گھر کے اندر چلا گیا۔ میری ماں آگے بڑھی اور اس نے سارہ کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔

''تم اور بچے ہمارے ساتھ گھر چلو، جب تک وہ اپنا سامان لے کر یہاں سے چلا نہیں جاتا۔ یہ لوگ اسے

رخصت کردیں گے۔ پھر وہ ہماری طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولی۔ ''میری اور الما...... تم بچوں کو لے کر آؤ۔''

اس سے پہلے کہ ہم وہاں سے روانہ ہوتے، گارنی ایک ہاتھ میں رائفل پکڑے باہر آگیا اور چلاتے ہوئے بولا۔ ''تم لوگ مجھے نہیں بتاؤ گے کہ کیا کرنا ہے یا کہاں جانا ہے۔''

اس نے رائفل فضا میں بلند کی۔ اس کی نال کا رخ مجمع کی جانب تھا۔ پھر یکے بعد دیگرے دو فائر ہوئے اور وہ لڑکھڑا کر پیچھے کی جانب گر گیا۔ سارہ چیخ مار کر میری ماں کے بازوؤں میں جھول گئی۔ اس نے بڑی مشکل سے اسے سنبھالا۔ میں اور الما بچوں کی جانب بڑھے۔ جیسی اور مائیکل بری طرح کانپ رہے تھے جبکہ اسٹیفن حسبِ معمول پُرسکون تھا۔

وہ رات ان لوگوں نے ہمارے گھر گزاری۔ میری ماں نے زبردستی انہیں چائے پلائی اور ان کے لیے کھانا بنایا۔ وہ بے حد غمزدہ اور نڈھال تھے۔ صبح تک گارنی کو دفنا دیا گیا اور وہ لوگ اپنے گھر واپس چلے گئے لیکن ایک ہی رات میں دونوں گھروں کے درمیان دوستی کا رشتہ قائم ہوگیا۔

علاقے کے بڑوں نے سارہ کے لیے بھی اسی لانڈری میں ملازمت کا بندوبست کردیا جہاں میری ماں کام کیا کرتی تھی۔ جیسی کا اسکول جانا بند ہوگیا تھا کیونکہ وہ ماں کی غیر موجودگی میں گھر پر رہ کر چھوٹی بہن کی دیکھ بھال کرتی تھی۔ ہم اسکول سے چھٹی ہونے کے بعد اس کے گھر جاتے اور اس دن اسکول میں جو پڑھایا جاتا یا ہوم ورک ملتا، وہ اسے بتادیتے۔ اسٹیفن اور مائیکل کو گروسری اسٹور میں کام مل گیا تھا جہاں وہ دن بھر سامان تولتے، سبزیاں دھوتے اور گوشت کے پیکٹ بناتے۔ وہ گندے ہاتھوں اور میلے کپڑوں کے ساتھ گھر واپس آتے لیکن وہ سبزیاں اور پھل بھی لے آتے جو بیچنے کے قابل نہیں ہوتے تھے۔ بعض اوقات قصائی انہیں گوشت کے چھچھڑے بھی دے دیا کرتا تھا۔ ان دونوں نے بھی اسکول آنا چھوڑ دیا تھا۔ مائیکل اکثر غائب ہوجاتا اور کئی کئی دن تک اس کی شکل نظر نہیں آتی پھر یہ سلسلہ ہفتوں اور مہینوں پر محیط ہوگیا۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ ہم اس کی شکل دیکھنے کو بھی ترس گئے۔

کئی سال گزر گئے۔ اسٹیفن دل لگا کر کام کر رہا تھا۔ اسٹیفن کو مزید ذمے داریاں دے دی گئی تھیں اور ایک دن وہ اسٹور کا منیجر بن گیا۔ پھر اس نے اپنا ذاتی اسٹور کھول لیا۔

جیسی نے ساری عمر شادی نہیں کی۔ اسے اس لفظ سے ہی چڑ تھی۔ [illegible] گھر میں ماں کا حشر دیکھ چکی تھی اور اکثر کہا کرتی کہ اگر اس کا باپ نہ مرتا تو وہ ایک دن اپنے ہاتھوں سے اس کا خاتمہ کردیتی۔ وہ کسی مرد کی غلامی کرنے سے بہتر سمجھتی تھی کہ دوسرے لوگوں کے بچوں کی دیکھ بھال کرکے مطمئن زندگی گزار دے۔ اسے اپنی بہن کو سنبھالنے کا تجربہ تھا چنانچہ اس نے اپنے گھر میں ہی ڈے کیئر سینٹر کھول لیا جہاں وہ کام پر جانے والی ماؤں کے بچوں کی دیکھ بھال کیا کرتی تھی۔

جب مجھے یقین ہوگیا کہ الما اور اسٹیفن تیزی سے ایک دوسرے کے قریب آرہے ہیں تو میں نے الما کو اس کی حقیقت بتانے کا فیصلہ کرلیا۔ میری نظر میں اسٹیفن ایک مجرم تھا جس کی ایک طفلانہ حرکت کی وجہ سے اس کے باپ کو زندگی سے ہاتھ دھونا پڑے اور پورا خاندان ناقابلِ بیان مصائب میں گرفتار ہوگیا۔ اگر مجھے ذرا سا بھی شبہ ہوتا کہ وہ... ایسا انتہائی قدم اٹھائے گا تو میں مجمع کو اس کی حرکت کے بارے میں بتادیتی۔ یہ احساس مجھے بہت بعد میں ہوا کہ کس جذبے کے تحت میں ایسا نہ کرسکی۔

ایک روز مجھے الما سے تنہائی میں بات کرنے کا موقع مل گیا اور میں نے اسے اسٹیفن کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ میرا مقصد انہیں دور کرنا نہیں تھا اور نہ ہی مجھے ایسی کوئی خواہش تھی۔ میں جانتی تھی کہ ایسا ممکن نہیں ہے۔ وہ اپنے باپ سے بہت مختلف تھا اور شاید اسی لیے بہت سے لوگ اسے پسند کرتے تھے۔ اس کی بہت سی عادتیں میرے باپ سے ملتی جلتی تھیں۔ اسی لیے وہ مجھے بھی اچھا لگتا تھا لیکن کیا اسے پسند کرنے کی یہی ایک واحد وجہ تھی؟ اس کا جواب میں کبھی اپنے آپ سے حاصل نہ کرسکی۔

اسٹیفن نے کبھی مجھ سے خاموش رہنے کے لیے نہیں کہا۔ مجھے نہیں معلوم کہ الما نے یہ بات اسے بتائی یا نہیں کہ میں اس کی حرکت کے بارے میں جانتی ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اس نے اسٹیفن کو بتا دیا ہوگا کیونکہ وہ دونوں اتنے قریب تھے کہ شاید سانس بھی ساتھ ہی لیتے ہوں۔ بدقسمتی سے الما عین جوانی میں ہی انتقال کرگئی۔ وہ بہت کم عمر تھی اور اس نے زندگی کی کوئی خوشی نہیں دیکھی تھی۔ اس کے مرنے کے بعد اسٹیفن بھی ایک روز چپکے سے کہیں چلا گیا۔ اس نے مجھے اتنا موقع بھی نہ دیا کہ اس کے سامنے اپنے چور جذبوں کا اعتراف کرلیتی۔ کم از کم اسے اتنا یقین تو آجاتا کہ جس طرح اب تک میں نے اس کے جرم کی پردہ پوشی کی تھی، آئندہ بھی کرتی رہوں گی۔ شاید میں نے الما کو بھی یہ بات بتا کر غلطی کی تھی کیونکہ اس طرح میرے ہاتھ تو پھر بھی کچھ نہ آیا۔
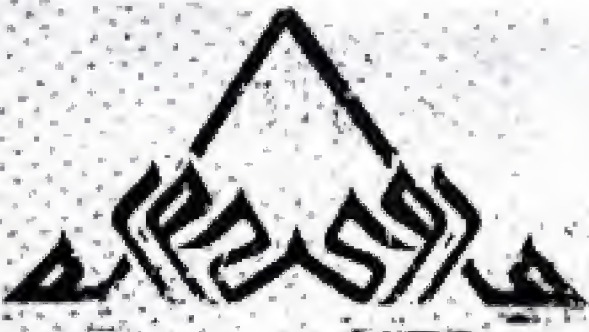
محی الدین نواب

چوبیسویں قسط

اگر کوئی کائنات کے رمز کو سمجھنے کی سعی کرے تو سب سے پہلے اسے انسان کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ خاموش صحرا کی ویرانی ہو یا پُرجوش لہروں کی روانی... سمندر کی گہرائی ہو یا آسمان کی بلندی... چاند ستاروں کا حسن ہو یا قوسِ قزح کے رنگ... تہ در تہ زمین کی پرتیں ہوں یا بلند آسمان کے سات پردے... ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے ہوں یا بادو باراں کی طوفانی گرج۔ کبھی ہلکی ہلکی بوندوں کی پھوار کا ترنم اور کبھی بجلی کی چمک، کہیں پھولوں کی مہک، کہیں کانٹوں کی کسک... اللہ تعالیٰ نے یہ سب چیزیں اس کائنات میں جگہ جگہ بکھیر دیں اور... ہر شے کو ایک مقام بھی عطا کیا، مگر... جب انسان کو بنایا تو اس پوری کائنات کو جیسے اس کے اندر کہیں چپکے سے بسا دیا اور یہ بھی عجب کھیل ہے کہیں نام یکساں ہیں مگر تقدیریں الگ اور کہیں چہرے حیران کن حد تک ایک جیسے ہیں مگر ان کی تقدیر کا لکھا کہیں ایک دوسرے سے میل نہیں کھاتا۔ اس داستان کی ماروی وہ نہیں جو سندھ کی دھرتی پر عزت و احترام کی ایک علامت کے طور پر جانی جاتی ہے، اسے یہ بھی پتا نہیں کہ اس کا نام ماروی کس نے اور کیوں رکھا... شاید اس کے بڑوں نے سوچا ہو کہ نام کی یکسانیت سے مقدر کی دیوی اس پر بھی مہربان ہو جائے... جدید ماروی بہت عقیدت کے ساتھ اپنی ہم نام پر رشک کرتی ہے... یہ جانتے ہوئے کہ وہ کبھی اس مقام کے قریب بھی نہیں پھٹک سکے گی... ورق ورق، سطر سطر دلچسپی، تحیّر اور لطیف جذبوں میں سموئی ہوئی ایک کہانی جس کے ہر موڑ پر کہیں حسن و عشق کا ملن ہے تو کہیں رقابت کی جلن... آج کے زمانے کے اسی چلن میں رنگین و سنگین لمحات کی لمحہ لمحہ روداد کو سمیٹتے، نئے رنگ و آہنگ کا تحیّر خیز سنگم۔

ایک چہرہ کئی روپ، کبھی چھاؤں کبھی دھوپ، محبت کی عنایتوں، رفاقتوں اور رقابتوں کا ایک دل ربا سلسلہ

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

یہ داستان ہے دورِ جدید کی ماروی اور اس کے عاشق مراد علی منگی کی۔ مراد ایک گدھا گاڑی والا ہے جو اپنے والد اور ماروی، چاچا جمر د اور چاچی متی کے ساتھ اندرونِ سندھ کے ایک گاؤں میں رہتے تھے، گاؤں کا وڈیرا حشمت جلالی ایک بدنیت انسان تھا جس نے ماروی کا رشتہ دس ہزار نقد کے عوض مانگا تھا، چونکہ ماروی مراد کی منگ تھی اور دونوں بچپن ہی سے ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے لہٰذا وہ اس پر راضی نہیں تھی نتیجتاً انہیں گوٹھ چھوڑنا پڑا۔ مراد جو کہ ثانوی تعلیم یافتہ تھا وڈیرا حشمت کی منشی گیری کرتا تھا۔ وڈیرا حشمت جلالی اور اس کے بیٹے روایتی ذہنیت کے مالک تھے اور انہوں نے جائداد بچانے کی خاطر اپنی بیٹی زلیخا کی شادی قرآن سے کردی۔ ماں نے مخالفت کی مگر اس کی ایک نہ چلی۔ زلیخا نے بغاوت کا راستہ اپنایا اور مراد کو مجبور کیا کہ وہ اس کی تنہائیوں کا ساتھی بن جائے۔ مراد تیار نہ ہوا اور ایک رات گزارنے کے بعد اپنے باپ کے ساتھ گاؤں سے غائب ہوگیا۔ گاؤں سے فرار ہوکر یہ دونوں کراچی کے ایک مضافاتی علاقے یمن گوٹھ آگئے جہاں ماروی اپنے چاچا، چاچی کے ساتھ پہلے ہی آچکی تھی۔ یہیں مراد کی ملاقات اتفاقاً محبوب علی چانڈیو سے ہوگئی جو کہ ممبر اسمبلی اور بزنس ٹائیکون، لیکن ہو بہو مراد کا ہم شکل تھا۔ بس دونوں کے درمیان صرف قسمت کا فرق تھا۔ محبوب چانڈیو اپنے ہم شکل کو دیکھ کر حیران ہوا پھر اسے یاد آیا کہ حشمت جلالی جو کہ خود بھی ممبر اسمبلی تھا اس کا ذکر اپنی بیٹی کے قاتل کی حیثیت سے کرچکا تھا۔ اس کے استفسار پر مراد نے اپنی بے گناہی کا اعلان کیا۔ ہوا کچھ یوں تھا کہ مراد کے فرار کے بعد زلیخا نے اپنی ماں کے تعاون سے گاؤں کے ایک اور نوجوان جمال سے شادی کرلی اور خاموشی سے فرار ہوگئی۔ وڈیرے اور اس کے بیٹوں کو پتا چلا تو انہوں نے تلاش شروع کرائی۔ ناکامی پر انہوں نے بے عزتی سے بچنے کے لیے ایک نوکرانی جو کہ زلیخا کے ہی قد کاٹھ کی تھی برباد کر کے قتل کردیا اور اس کا چہرہ تیزاب سے مسخ کر کے اسے اپنی بیٹی ظاہر کر کے الزام مراد پر لگا دیا۔ یہاں شہر میں محبوب جب مراد سے ملا تو اس نے مراد کو اپنے پاس رکھ کر بہترین تربیت دینے کا فیصلہ کیا، ارادہ اسے اپنی جگہ رکھ کر خود گوشہ نشین ہونا تھا۔ محبوب کے سرپرست اس کے والد کے زمانے کے معروف جج تھے جو اس کے کاروباری معاملات کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ انہی کے مشورے پر ایک ماڈل میرا کو سیکریٹری کے طور پر رکھا گیا۔ مراد سے ملاقات کے دوران ماروی کی جھلک دیکھ کر محبوب اس پر دل و جان سے مرمٹا لیکن یہ ایک پاکیزہ جذبہ تھا جس میں کوئی کھوٹ نہ تھا۔ اس نے اپنی مصنوعات کے لیے بہ طور ماڈل ماروی کو چنا اور مراد کے ذریعے اسے راضی کیا.... مراد زلیخا کے قاتل کی حیثیت سے گرفتار ہوگیا۔ زلیخا مراد کے بچے کو جنم دے کر دوسرے بچے کی پیدائش کے دوران چل بسی لیکن وڈیرا باپ اور بیٹوں کو خبر نہیں تھی کہ زلیخا کہاں اور کس حال میں ہے۔ ماں رابعہ جانتی تھی لیکن مراد سے نالاں تھی۔ وہ شوہر اور بیٹوں سے بھی ناراض تھی لہٰذا انہیں خبر نہیں کی۔ مراد اس قتل کے مقدمے میں ملوث تھا اور محبوب چانڈیو ماروی کی خاطر اس کے مقدمے کی پیروی کررہا تھا۔ اسی باعث اس کی وڈیرا حشمت سے دشمنی ہوگئی۔ یوں ماروی کے دشمنوں میں اضافہ ہوگیا۔ اسے اغوا کرنے کی کوشش کی گئی جب وہ اپنی سہیلی کی شادی میں شرکت کے لیے گوٹھ گئی، تاہم محبوب چانڈیو اسے بچالایا۔ دوسری جانب جاسوس سیکرٹ ایجنٹ برنارڈ کو رہا کرانے کے لیے اسکاٹ لینڈ سے تین ایجنٹ مرینہ بہرام اور دارا اکبر آئے۔ مرینہ مراد کو ایک نظر دیکھ کر دل ہار گئی۔ مراد کو مرینہ جیلر باپ کی مدد سے جیل سے باہر نکال لائی اور محبوب اس کی جگہ بند ہوگیا۔ باہر نکل کر مراد مرینہ کی نیت بھانپ کر اسے جھانسا دیتے ہوئے اس کے شکنجے سے فرار ہوگیا۔ جبکہ دوسری جانب میرا اور جج صاحب محبوب کو تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ مرینہ اپنے باپ کے بل پر بہت شاطرانہ چالیں چل رہی تھی۔ ماروی چاچی اور چاچا مرینہ کے ہاتھ لگ گئے لیکن کسی نہ کسی طرح مراد کو معلوم ہوگیا کہ مرینہ ماروی کو جام تھارو کے چودھری کے پاس لے جارہی ہے لہٰذا مشکلات سے نبرد آزما ہوتے ہوئے اس نے ماروی کو اس کے چنگل سے آزاد کرالیا۔ لیکن بدقسمتی سے ماروی کے سر میں چوٹ لگی جس کے باعث اس کی یادداشت چلی گئی۔ مراد شہر پہنچ کر جیل میں محبوب سے ملاقات کر کے اسے رازداری کے ساتھ جیل سے واپس جانے پر آمادہ کر کے خود سلاخوں کے پیچھے بند ہوگیا۔ مرینہ اور مراد میں فساد بڑھتا جارہا تھا۔ مرینہ کے پالتو غنڈے مراد کو کسی نہ کسی طرح جیل سے نکال کر لے گئے۔ باہر نکال کر ان کے درمیان سخت مقابلہ ہوا۔ جس میں قانون کا خطرناک مجرم برنارڈ مراد کے ہاتھوں مارا گیا.... ماروی کا علاج ہوا مگر ماروی نے محبوب اور مراد دونوں کو نہیں پہچانا۔ مرینہ مراد کو ہندوستان لے آئی تھی۔ مراد مرینہ کی قید سے نکل گیا اور ماسٹر کو بوبو کے ساتھ مل گیا۔ مرینہ کو پتا چل گیا کہ مراد ماسٹر کے ساتھ ملا ہوا ہے۔ ادھر ماروی کے دوبارہ سر میں چوٹ لگنے سے اس کی یادداشت واپس آگئی۔ مراد مرینہ کے زیرِ اثر آچکا تھا۔ ماروی کو پتا چل گیا اور اس نے مراد کو اپنانے سے انکار کردیا۔ ادھر مرینہ دوبارہ TMET فیسر بن گئی تھی مراد نے سرجری کے ماہر ڈاکٹر کیمی سن سے اپنے چہرے کی پلاسٹک سرجری کروالی۔ ڈاکٹر نے اسے اپنے بچھڑے ہوئے بیٹے ایمان علی کی شکل دے دی۔ وہ ڈاکٹر کے گھر پر ہی رہنے لگا۔ وہاں اس کے ساتھ ایمان کا دوست عبداللہ کبڈی بھی آگیا۔ ماروی کی یادداشت واپس آگئی تھی۔ ادھر مرینہ انڈیا پہنچ گئی تھی۔ مراد نے اسے قابو کر کے اس کی سرجری کروادی اور ایک انجکشن لگوادیا جس سے اس پر پاگل پن کے دورے پڑنے لگے۔ تاہم اس نے ڈائریکٹر جنرل کو اپنے مرینہ ہونے کا ثبوت دے دیا تھا۔ مراد اسرائیل پہنچ گیا تھا۔ وہاں اس کی ملاقات ڈاکٹر کیمی سن کے بیٹے ایمان سے ہوگئی۔ مراد نے ایمان کو اپنی تمام باتیں بتادیں۔ مرینہ بھی اسرائیل پہنچ گئی اور ایمان، مراد بن کر اسے اپنے پیچھے بھٹکانے لگا۔ مراد کو لندن والی فلائٹ میں میکی براؤن مل گیا۔ مراد کے پیچھے میکی براؤن کی بیٹی لگ گئی۔ ادھر مرینہ نے ایمان کو مراد سمجھ کے اس سے ملنا چاہا تاہم ایمان دشمنوں کی فائرنگ سے زخمی ہوکر اسپتال پہنچ گیا اور مرینہ جان گئی کہ یہ مراد نہیں ہے۔ مراد پاکستان گیا اور ماروی کو لے کر لندن آگیا مگر مرینہ سے مراد کے تعلقات کے بارے میں جان کر ماروی اس سے دور ہوگئی اور پاکستان آگئی۔ ادھر مراد... دوبارہ اپنا چہرہ تبدیل کر کے انڈیا پہنچ گیا اور میکی براؤن کی بیٹی کے پیچھے لگ گیا اور اسے اغوا کرلیا۔ تاہم بعد میں اسے چھوڑ دیا مگر میڈونا کو مرینہ سے بچانے کے لیے مراد اسے لے کر نکل پڑا لیکن مرینہ نے راستے میں اسے چھاپ لیا۔ ان دونوں میں مقابلہ ہوا مراد شدید زخمی ہوا جبکہ مرینہ کے بارے میں خیال تھا کہ وہ ماری گئی۔ ایمان علی اور میڈونا مراد کو محفوظ پناہ

گاہ میں لے آئے۔ مرینہ زخمی حالت میں تھی۔ وہ ایک تانترک مہاراج کی چھتر چھایہ میں پہنچ گئی۔ وہ اس کا علاج کرنے لگا۔ ادھر مراد کا علاج مولانا اجمیری کر رہے تھے۔ وہ چلنے پھرنے کے قابل ہو گیا۔ مراد کی زندگی بچانے میں میڈونا نے بہت اہم کردار ادا کیا تھا۔ مراد نے فیصلہ کیا کہ وہ میڈونا سے نکاح کرلے گا۔ وہ میڈونا کو لے کر شاپنگ کے لیے نکلا، مگر مرینہ نے میڈونا کو دیکھ لیا اور اسے اغوا کر لیا تاہم مراد سے رابطہ ہونے پر مرینہ اور مراد میں صلح ہو گئی مگر اس دوران میڈونا وہاں سے نکل گئی۔ اور بابا اجمیری کے کہنے پر واپس اپنے باپ کے پاس چلی گئی۔ مراد اور مرینہ بھی بابا اجمیری سے ملے اور انہوں نے بتایا کہ جب تک اس کی زندگی میں ایک عورت ہے وہ مزید نکاح نہیں کر پائے گا۔ مراد مرینہ سے نکاح پڑھانا چاہتا تھا مگر کوئی نہ کوئی رکاوٹ آرہی تھی۔ ادھر ماروی نے مراد سے دور جا کر گمنامی کی زندگی گزارنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور وہ محبوب کے ساتھ ملک سے باہر جانے کا منصوبہ بنا رہی تھی۔ ادھر ڈاکٹر ٹمی سن نے مراد کی نئی شکل جو بنائی تھی، وہ اس کے لیے وبال بن گئی۔ وہ مرینہ سے نکاح پڑھانے کے معاملات طے کرنے گیا تاہم وہاں اسے موجودہ شکل میں دیکھ کر کچھ لوگ اسے اپنا رشتہ دار سمجھنے لگے اور اسے اپنے ساتھ لے گئے۔ اب وہاں ایک نئی مصیبت اس کی منتظر تھی۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

ماروی کا یہ عزم تھا، اسے بے وفا ہرجائی سے دور جانا ہے۔ مراد کے حالات خواہ کیسے ہی ہوں۔ وہ کتنا ہی مجبور اور بے بس ہو گیا ہو، ہر حال میں یہی کہا جائے گا کہ وہ اپنے کرتوت سے ماروی کو دور کر رہا تھا۔

اس وقت ماروی فون کو کان سے لگائے بیٹھی تھی۔ محبوب اس کے کانوں تک پہنچ کر بول رہا تھا۔ ''میں یہاں آتے ہی مصروف ہو گیا ہوں۔ تم یہاں آؤ گی تو پہلے کچھ دنوں تک میرے اپارٹمنٹ میں رہو گی۔ تمہاری صورت اور پرسنالٹی بدلتے ہی ایک مسلم گھرانے میں مستقل رہائش کا انتظام ہو جائے گا۔ میں چاہتا ہوں جتنی جلد ہو سکے، وہاں سے نکل آؤ۔''

وہ اپنے کمرے میں دروازے کو اندر سے بند کیے بیٹھی تھی۔ اس نے اپنے منصوبے اور نئی زندگی گزارنے کے سلسلے میں اس بار چاچی چاچا کو بھی رازدار نہیں بنایا تھا۔ اتنی محتاط تھی کہ اپنے سائے سے بھی چھپ کر جانے والی تھی۔

تنہا رازداری سے گھر چھوڑنا' شہر اور ملک چھوڑنا آسان نہ تھا۔ اپنے ساتھ کچھ تو ضروری سامان لے جانا تھا لیکن وہ ایک جوڑا کپڑا بھی نہیں لے جارہی تھی۔ محبوب اس کا ویزا وغیرہ لگوا کر گیا تھا، قانونی کاغذی کارروائیاں چپ چاپ ہو گئی تھیں۔ صرف اسے کسی فلائٹ میں ایک سیٹ حاصل کرنا تھی۔

یہ محبوب ہی تھا جو پیار کے پہلے دن سے اسے عزت آبرو سے سلامتی دیتا آرہا تھا۔ ایک اکیلی عورت کے لندن جانے اور وہاں محفوظ رہنے کے جو انتظامات وہ کر رہا تھا اور کوئی کر نہیں سکتا تھا۔

اب ماروی کو ٹکٹ خریدنے کے لیے گھر سے باہر جانے آنے کے لیے چاچی چاچا سے سو طرح کے بہانے کرنے تھے۔ گھر سے نکلتے وقت اس کے شانے سے ایک بیگ لٹکا رہتا تھا۔ اس میں پاسپورٹ اور دیگر ضروری کاغذات موجود رہتے تھے۔ محبوب نے کہہ دیا تھا کہ وہ لندن پہنچے گی تو اسی وقت اس کے لیے ملبوسات اور تمام ضرورت کا سامان خرید لیا جائے گا۔ اب وہ کہہ رہا تھا کہ اسے جلد سے جلد آجانا چاہیے۔

اس نے کہا۔ ''میں ابھی گھر سے نکلوں گی۔ کسی فلائٹ کی ٹکٹ حاصل کرنے کے بعد آپ کو کال کروں گی۔ میں کوشش کروں گی کہ آج ہی کوئی فلائٹ مل جائے۔ اب یہاں مجھ سے رہا نہیں جارہا ہے۔'' وہ اندر سے بکھری ہوئی تھی۔ اس نے کہا۔ ''یہ خیال پریشان کرتا ہے کہ اچانک ہی مراد نہ آجائے۔ کسی سوکن کے ساتھ آئے گا۔ تب بھی میں کمزور پڑ جاؤں گی، مجھے جلد از جلد یہاں سے جانا چاہیے۔''

''پریشان نہ ہو، مراد نہیں آئے گا۔ حوصلہ رکھو اور فوراً چلی آؤ۔ میں تمہاری اگلی کال کا انتظار کرتا رہوں گا۔''

رابطہ ختم ہو گیا۔ وہ کسی ائیرویز ایجنسی میں جا کر ٹکٹ حاصل کرنے کے لیے اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔ الماری سے ایک جوڑا نکال کر لباس تبدیل کرنے لگی۔

دروازے پر دستک سنائی دی۔ بشریٰ کی آواز آئی۔ ''ماروی! کیا کر رہی ہو؟''

وہ ماروی کو پہلے بھابی کہا کرتی تھی۔ پھر اس نے دیکھا کہ وہ مراد سے بدظن ہو گئی ہے، وہ اس کا ذکر بھی نہیں کرتی ہے۔ نہ کسی سے اس کے بارے میں مشورہ کرتی ہے تو اس نے پوچھا تھا۔ ''بھابی! کیسے گزارہ ہو گا۔ تم اتنی لمبی زندگی اس کے ساتھ کیسے گزارو گی؟''

اس نے کہا تھا۔ ''میں کہیں دور چلی جاؤں گی۔ اب اس کے ساتھ نہیں رہوں گی اور آئندہ مجھے بھابی نہ کہا کرو۔ میری بہن ہو، مجھے ماروی کہا کرو۔''

تب سے وہ بہن اور سہیلی بن گئی تھی۔ ماروی نے دروازہ کھولا۔ بشریٰ کے ساتھ چاچی بھی تھی۔ اس نے ماروی کو عبا میں دیکھ کر پوچھا۔ ''کہیں جارہی ہو؟''

''ہاں۔ میمن گوٹھ عابدہ کے پاس جارہی ہوں۔''

بشریٰ نے کہا۔ ''میں بھی چلوں؟ فارغ بیٹھی ہوں۔ بلّا بھی کہیں گیا ہوا ہے۔''

وہ کسی فلائٹ میں سیٹ حاصل کرنے کے لیے کسی کو ساتھ نہیں لے جاسکتی تھی۔ اس نے کہا۔ ''میری سہیلی کا ایک بہت ہی پرسنل معاملہ ہے۔ وہ تمہاری موجودگی میں نہیں بولے گی۔ مجھے وہاں تنہا جانا ہوگا۔''

چاچی نے کہا۔ ''تم پرسوں بھی وہاں گئی تھیں۔ بات کیا ہے؟ ادھر دو چار روز سے اکیلی جانے آنے لگی ہو۔ ہم سے بھی کوئی بات نہیں چھپاتی تھیں۔ اب دروازے کو اندر سے بند کرکے کسی سے فون پر باتیں بھی کرتی ہو۔''

بشریٰ نے کہا۔ ''ماروی! ہم سے کچھ نہ چھپاؤ۔ سچ بولو، کیا مراد سے پھر دوستی ہو رہی ہے؟''

وہ بشریٰ اور چاچی کے ساتھ گھر سے باہر آتے ہوئے بولی۔ ''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ کوئی دوستی ووستی نہیں ہو رہی ہے۔ ابھی عابدہ سے باتیں کر رہی تھی۔ اسی سے ملنے جا رہی ہوں۔'' وہ گھر سے باہر آکر تنہا جانے لگی۔ اتنی بڑی دنیا میں وہ بالکل اکیلی دکھائی دے رہی تھی۔

بشریٰ اور چاچی دروازے پر کھڑی اسے جاتے دیکھ رہی تھیں۔ جب وہ گلی کے موڑ پر نظروں سے اوجھل ہوگئی تو چاچی نے بڑے دکھ سے کہا۔ ''میری بچی کی خوشیاں غارت ہوگئی ہیں۔ ایک مدت ہوئی میں نے اسے مسکراتے نہیں دیکھا۔''

بشریٰ نے کہا۔ ''یہ پہلے تو کہیں تنہا نہیں جاتی تھیں۔''

''میں خود ہی اسے جانے دیتی ہوں۔ کوئی سوال نہیں کرتی کہ یہ کہاں جا رہی ہے۔ اپنے مرد پر سے بھروسا اٹھ جائے تو پیار کرنے والیاں اسی طرح بدروح کی طرح بھٹکتی رہتی ہیں۔''

وہاں سے چند قدم کے فاصلے پر بشریٰ اور بلّے کی رہائش گاہ تھی۔ وہ ماروی کے متعلق سنجیدگی سے سوچتی ہوئی اپنے مکان کا دروازہ کھول کر اندر آئی۔ اس وقت یہ سوچ رہی تھی کہ وہ مراد سے بدظن ہے۔ خود اس نے اور چاچی نے بھی کہا تھا کہ اب مراد سے فون پر بھی باتیں نہیں کرتی ہے۔ پھر وہ بند کمرے میں کس سے فون پر بولتی ہے؟ اور آج کل تنہا کہاں جاتی ہے؟

مراد، ماروی، بلّا، بشریٰ اور چاچی وغیرہ کے درمیان گہرا اعتماد قائم تھا۔ وہ ایک دوسرے سے اپنی کوئی بات نہیں چھپاتے تھے۔ اب تو بشریٰ اور بلّا بھی رازداری سے اپنی زندگی کا رُخ بدلنے والے تھے۔

گویا سب ہی حالات سے مجبور ہوکر آئندہ ایک دوسرے سے چھپ کر زندگی گزارنے کے لیے چپ چاپ اپنی اپنی راہ لینے والے تھے۔

دل میں یہ نیک نیتی اور دوستی قائم تھی کہ چھپ کر نئی زندگی گزارنے کے دوران میں بھی ایک دوسرے سے غافل نہیں رہیں گے۔ اجنبی بن کر بھی ایک دوسرے کے کام آتے رہیں گے۔

بشریٰ سوچ رہی تھی۔ ''پتا نہیں ماروی کیا کرتی پھر رہی ہے؟ ہم بھی جو کر رہے ہیں، اس کی خبر ماروی کو نہیں ہے اور نہ ہی مراد بھائی جانتے ہیں۔ ہم سب کی سلامتی اسی میں ہے۔ ہم اسی طرح پُرامن شریفانہ زندگی گزار سکیں گے۔''

اس نے ذرا گھوم کر کمرے پر ایک نظر ڈالی۔ وہاں رہنے سہنے کا صرف ضروری سامان تھا اور کم سے کم تھا۔ جلد ہی سب کچھ چھوڑ کر جانا تھا اور دروازہ کھلا چھوڑ کر جانا تھا تاکہ پڑوسیوں اور محلے والوں کو معلوم ہو جائے کہ ہنسوں کا جوڑا وہاں سے پرواز کر چکا ہے۔

اس نے بیڈ کے سرے پر بیٹھ کر بلّے کو پکارا۔ ''کہاں ہو؟ کیا کر رہے ہو؟''

اس نے کہا۔ ''بہت مصروف ہوں۔ متعلقہ ماہرین سے ملاقاتیں کر رہا ہوں۔ یہ چاہتا ہوں کہ یہیں ہمارے چہرے تبدیل ہو جائیں تو بہتر ہوگا۔ ملک سے باہر جانے میں خاصی رقم ضائع ہوگی۔ وقت بھی برباد ہوگا۔''

وہ بولی۔ ''تبدیل ہونے کے بعد اسی شہر میں رہنا ہے۔ کوشش کرو، تبدیل ہونے کا یہ بڑا مرحلہ یہیں طے ہو جائے۔''

''کراچی شہر میں کیا نہیں ہوتا۔ ہمارے چہرے بھی بدل جائیں گے لیکن مکمل رازداری کی ضمانت نہیں ملے گی۔ جو ماہر اور اس کے معاون ہمیں تبدیل کریں گے، انہیں ہماری اصلیت معلوم رہے گی۔ وہ پیٹ کے ہلکے ہوں گے تو جانے انجانے میں کہیں بھی ہماری حقیقت اگل دیں گے۔''

وہ ایک ذرا توقف سے بولا۔ ''دانشمندی یہ ہوگی کہ ہم یورپ، افریقا یا فارایسٹ میں جاکر اپنی شناخت تبدیل کریں۔ وہاں کوئی یہ جان نہیں سکے گا کہ ہم تبدیل ہونے کے بعد پاکستان کے شہر کراچی میں رہنے آئے ہیں۔''

''اس کا مطلب ہے، نئی زندگی شروع کرنے میں اچھا خاصا وقت لگے گا؟''

''وقت لگنے دو۔ ہم آئندہ اپنی زندگی کو پوری طرح محفوظ رکھیں گے۔ ایسی صاف ستھری زندگی گزاریں گے کہ قانون کے محافظ بھی ہم پر شبہ نہیں کریں گے۔''

بشریٰ نے کہا۔ ''ماروی ذہنی انتشار میں ہے۔ ابھی

پھر اکیلی کہیں گئی ہے۔ وہ کہاں جاتی ہوگی؟ بند کمرے میں کس سے فون پر باتیں کرتی ہوگی؟"

"خدا بہتر جانتا ہے۔ ماروی کے بارے میں کوئی غلط رائے قائم نہیں کی جاسکتی۔"

"چاچی کو بھی شکایت ہے کہ وہ بند کمرے میں کسی سے باتیں کرتی ہے جبکہ چاچی سے اپنی کوئی بات نہیں چھپاتی تھی۔"

"وہ محبوب کی نیکیوں سے متاثر ہے۔ اس کی دل سے قدر کرتی ہے۔ انسان ڈوبتے وقت تنکے کا بھی سہارا پکڑ لیتا ہے۔ شاید وہ بند کمرے میں اپنا دکھڑا روتی ہوگی۔ یوں اس کی ہمدردیاں حاصل کر کے اپنے دل کا بوجھ کم کرتی ہوگی۔"

وہ فون پر پہلے کی باتیں سن رہی تھی۔ ایسے وقت ایک پڑوسن نے آکر کہا۔ "اے بہن! باہر آؤ۔ ماروی کے دروازے پر ایک بہت خوب صورت قیمتی گاڑی آئی ہے۔"

وہ تیزی سے مکان سے باہر آئی۔ دور ہی سے پہچان گئی، وہاں محبوب کی کار کھڑی ہوئی تھی۔ وہ تیزی سے چلتی ہوئی اس کار کے پاس سے گزرتی ہوئی مکان کے اندر آئی۔ سامنے ہی کمرے میں سمیرا اور معروف جی کھڑے ہوئے تھے۔

چاچی ان سے کہہ رہی تھی۔ "ہم نے بہت دنوں سے محبوب صاحب کی صورت نہیں دیکھی۔ سمیرا! تم اچھی طرح جانتی ہو۔ اب ان سے ہمارا کوئی تعلق نہیں رہا ہے۔"

معروف نے کہا۔ "ہم مانتے ہیں۔ یہ بھی جانتے ہیں کہ محبوب کبھی تعلق ختم نہیں کرے گا۔ مرتے دم تک اس کے پیچھے بھاگتا رہے گا۔ وہ پرسوں یہاں سے لندن کے لیے روانہ ہوا تھا۔ اس نے وہاں پہنچتے ہی ہم سے رابطہ ختم کر دیا۔ فون پر بھی بات نہیں کر رہا ہے۔"

چاچی نے پوچھا۔ "وہ کہاں گم ہو گئے ہیں، کیوں آپ لوگوں سے چھپ رہے ہیں؟ آپ ہم سے کیا چاہتے ہیں؟"

"اس کی زندگی میں اوّل اور آخر ماروی ہے۔ شاید وہ جانتی ہوگی کہ محبوب ابھی کہاں ہے اور ہم سے کیوں چھپ رہا ہے۔"

سمیرا نے کہا۔ "پلیز ماروی کو کال کریں۔ وہ کہاں ہے؟ ہم ابھی اس سے بات کریں گے۔"

بشریٰ نے اپنے فون پر نمبر پنچ کرتے ہوئے کہا۔ "میں کال کر رہی ہوں۔ محبوب صاحب کو خدا سلامت رکھے۔ کہیں وہ کسی حادثے سے دوچار نہ ہو گئے ہوں۔"

سمیرا نے کہا۔ "ہمارے درجنوں آدمی لندن میں انہیں تلاش کر رہے ہیں۔ وہاں کی پولیس ان سے تعاون کر رہی ہے۔ خدا کا شکر ہے، انہیں کوئی حادثہ پیش نہیں آیا ہے۔"

فون پر ماروی کی آواز ابھری۔ "ہیلو بشریٰ! کیا بات ہے؟ کیوں فون کیا ہے؟"

وہ بولی۔ "یہاں سمیرا اور معروف صاحب آئے ہیں۔ کہتے ہیں محبوب صاحب لندن جا کر پرسوں سے لاپتا ہو گئے ہیں۔ وہ انہیں تلاش کرنے یہاں تمہارے گھر آئے ہیں۔"

اس نے کہا۔ "فون سمیرا کو دو۔"

دینے سے پہلے ہی سمیرا نے فون بشریٰ کے ہاتھ سے لے کر کہا۔ "سوری ماروی! محبوب اچانک گم ہو گئے ہیں۔ پرسوں رات سے انہیں لندن میں تلاش کیا جا رہا ہے۔ مجھے وہاں ان کی جائداد کی تفصیل معلوم نہیں ہے۔ وہ اپنے کس کاٹیج یا اپارٹمنٹ میں ہوں گے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ انہوں نے اچانک مجھ سے منہ کیوں پھیر لیا ہے؟"

یہ کہتے ہی وہ رونے لگی۔ ماروی کو اچانک محسوس ہوا کہ وہ ایک سہاگن کے سہاگ کو اس سے دور کر رہی ہے۔ اس کے شوہر کو اپنے نئے مقاصد کے لیے اس سے چھین رہی ہے۔

اس نے کہا۔ "سمیرا! تم بہت ذہین اور تعلیم یافتہ ہو اور ایک کمزور عورت کی طرح رو رہی ہو۔"

سمیرا نے پوچھا۔ "مراد نے تمہیں چھوڑ دیا ہے۔ کیا تم اس کے لیے نہیں روتی ہو؟ اپنے مرد سے چھوٹ جانے کا دکھ کیا ہوتا ہے، یہ تم سے زیادہ کون سمجھے گا۔ اب میں سمجھ رہی ہوں۔"

"تو میری طرح صبر کرنا سیکھو۔ وہ ضرور واپس آئیں گے۔"

"میں جانتی ہوں۔ انہیں دنیا کی کوئی عورت باندھ کر نہیں رکھ سکتی۔ انہیں کوئی مجبوری نہیں روک سکتی۔ سچ کہتی ہوں۔ تمہاری طرف سے ڈر لگا رہتا تھا کہ کسی دن تم جکڑ لوگی تو وہ واپسی کے تمام راستے بھول جائیں گے۔ لیکن تم تو یہاں مراد کے لیے سوگ منا رہی ہو۔ پھر ایسی کیا بات ہوئی ہے کہ وہ اچانک بیوی کو گھر گرہستی کو دولت جائداد اور کاروبار کو چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔ ماروی! بولو۔ وہ کہاں پھنس گئے ہوں گے؟"

سمیرا کے اس پیچیدہ اور اہم سوال کا جواب صرف اسی کے پاس تھا۔ وہ اب تک محبوب سے ایک عرصے تک دور رہ کر اسے تڑپاتی رہی تھی۔ پہلی بار بہت مجبور ہو کر اسے اپنے نئے مقصد کے لیے اپنے قریب لا رہی تھی۔

دل میں کوئی چور نہیں تھا۔ نیت میں کھوٹ نہیں تھا۔ صرف اس کا سہارا لے رہی تھی اور اپنے مزاج کے خلاف پہلی بار ایک سہاگن سے اس کے شوہر کو دور کر رہی تھی۔ غلطیاں سب کرتے ہیں۔ وہ مجبوراً ایک بڑی غلطی کر رہی تھی۔

سمیرا نے پوچھا۔ ''تم چپ کیوں ہو؟''
وہ اپنے ضمیر سے لڑ رہی تھی۔ اس نے کہا۔ ''سوچ رہی ہوں میں اپنے مراد کو واپس نہیں لاسکتی۔ تمہارے لیے کیا کرسکتی ہوں۔ تم بولو، میں کیا کروں؟''
وہ بولی۔ ''میرا دل کہتا ہے کہ وہ جہاں بھی ہیں۔ وہ تم سے کسی وقت بھی فون پر بات کر سکتے ہیں۔ وہ تنہا نہیں رہ سکیں گے۔ تمہارا خیال انہیں ستاتا رہے گا۔''
''میں سمجھ گئی۔ تم کیا کہنا چاہتی ہو۔ میں وعدہ کرتی ہوں، محبوب جب بھی مجھے کال کریں گے، میں ان سے تمہاری بات ضرور کراؤں گی۔ وہ تم سے بات نہیں کرنا چاہیں گے تو میں بھی ان سے بات نہیں کروں گی۔''
''تم بہت اچھی ہو۔ تم ہی نے شرافت اور دیانت داری سے مجھے محبوب کی شریکِ حیات بنایا ہے۔ تم ہی اسے واپس لاسکوگی۔''
ماروی اس سے زیادہ بات کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اس کا ضمیر کہہ رہا تھا کہ وہ سمیرا پر ظلم کررہی ہے۔ اس نے جھوٹ کہا کہ فون پر سگنل آ رہا ہے۔ بیٹری ڈاؤن ہورہی ہے۔ وہ آگے بات نہیں کر سکے گی۔
یہ کہہ کر اس نے فون کا سوئچ آف کردیا۔ وہ ایک ائرلائن کے آفس کے سامنے کھڑی تھی۔ اسے دوسرے دن صبح دس بجے کی فلائٹ میں ایک سیٹ مل گئی تھی۔ اس کے لیے محبوب کی طرف جانے کا راستہ کھل گیا تھا۔
اسے کل تک بہت محتاط رہنا تھا۔ بڑی رازداری سے گھر سے نکل کر ائرپورٹ تک جانا تھا۔ اس نے گھر آکر چاچی کو اپنی سہیلی کا دکھڑا سنایا اور کہا کہ وہ اپنی سہیلی عابدہ اور اس کے شوہر کے درمیان صلح کرا رہی ہے۔ اس کے لیے وہ کل صبح آٹھ بجے پھر سیمن گوٹھ جائے گی اور اس کا گھر پھر سے آباد کرکے دعائیں لے گی۔
اس رات اس نے بند کمرے میں چاچی کے نام خط لکھا۔ ''چاچی! تم میرے لیے ماں سے بڑھ کر ہو۔ میں تمہاری گود میں پرورش پا کر جوان ہوئی ہوں۔ تم نے میرے لیے بڑے دکھ اٹھائے ہیں۔ مراد اور محبوب کے معاملے میں دن رات میرے لیے پریشان ہوتی رہی ہو۔ آج بھی میری بہترین ازدواجی گھریلو زندگی کے لیے دعائیں مانگتی رہتی ہو لیکن افسوس میری اور تمہاری دعائیں قبول نہیں ہورہی ہیں۔ محبت ساری دنیا کے لیے اچھی ہوگی لیکن میرے لیے کینسر کی بیماری ہوگئی ہے۔ مراد میرے اندر سے نہیں نکل رہا ہے۔ اگر عشق کسی ایک سے ہوتا ہے تو مجھے صرف مراد سے ہے۔ پھر مراد کو صرف مجھ سے عشق کیوں نہیں ہے؟ اس کے عشق میں کھوٹ ہے۔ میری سوکنوں کی ملاوٹ ہے اور میں عشق کے نام پر سراسر فریب کھا رہی ہوں۔ چاچی! میں خود کو اس فریب سے بچانے کے لیے جارہی ہوں۔ اگر دور ہوکر، گم ہوکر بھی اسے بھلا نہ سکی تو اس کا مطلب ہوگا میں بے وقوف ہوں اور جذباتی عشق میں مبتلا ہوکر سراسر نقصان اٹھاتی رہوں گی۔ میں آئندہ ایک حد تک کوشش کرتی رہوں گی کہ اسے بالکل ہی بھلا دوں۔ اپنی زندگی سے مٹا دوں۔ اگر نہ مٹا سکی تو میرے سامنے دو ہی راستے ہوں گے۔ ایک تو یہ کہ جان پر کھیل جاؤں۔ لیکن مراد کے پاس کبھی واپس نہ جاؤں۔ دوسرا راستہ یہ ہے کہ خودکشی حرام ہے۔ اس لیے جان نہ دوں۔ اپنی محبت اپنی وفاداری کسی دوسرے کے سپرد کردوں تو یہ انتقام ہوگا اور یہ انتقام ہی مراد کو میری زندگی سے مٹائے گا۔
''میں شرمندہ ہوں کہ تمہیں اعتماد میں لیے بغیر جارہی ہوں۔ میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ تمہیں رازدار بناتی تو تم مجھے تنہا کہیں جانے نہ دیتیں۔ مجھے بے یار و مددگار چھوڑنے کے لیے تمہارا دل بھی نہ مانتا۔ پھر یہ کہ مراد کے تمام دشمن مجھے چہرے سے پہچانتے ہیں۔ وہ مجھے یہاں نہیں پائیں گے تو آپ کو اور چاچا کو پریشان کریں گے۔ آپ دونوں پر ظلم بھی کریں گے۔ یہ خط اسی لیے لکھ رہی ہوں کہ دشمن اسے پڑھیں اور یقین کرلیں کہ چاچی چاچا میری گمشدگی کے سلسلے میں رازدار نہیں ہیں۔ کوئی بھی دشمن آپ دونوں پر ظلم کرکے مجھ تک کبھی پہنچ نہیں پائے گا۔ میں نے بینک سے ایک کروڑ اسی لاکھ نکال لیے ہیں۔ یہ تمام رقم میرے بیڈ کے فوم کے نیچے تم دونوں کے لیے رکھی ہوئی ہے۔ میری فکر ذرا نہ کریں کہ میں تنہا کہاں گئی ہوں اور کیسے زندگی گزاروں گی؟ میں خوب سوچ سمجھ کر جارہی ہوں۔ چاچی...! میری ماں...! میرا کہا سنا معاف کردیں۔ خدا حافظ۔ آپ کی بدنصیب بیٹی ماروی۔''
وہ خط لکھنے کے بعد تھوڑی دیر تک کروٹیں بدلتی رہی پھر سوگئی۔ اس نے اپنے ذہن سے یہ بات نکال دی تھی کہ وہ سمیرا کے حقوق چھین رہی ہے۔ اس نے یہ کہہ کر اپنے ضمیر کو تھپک کر سلا دیا کہ وہ سمیرا کی سوکن بننے نہیں جارہی ہے۔ اس نے محبوب سے صرف مدد مانگی تھی۔ کہیں مستقل ٹھکانا بنانے کے لیے صرف اس کا عارضی سہارا چاہا تھا۔ یہ محبوب کی اپنی مرضی تھی۔ سمیرا سے دور رہنے کا فیصلہ اس کا اپنا تھا۔ اس نے ماروی کو یقین دلایا تھا کہ سمیرا اسے دور رہنے کے باوجود

اس کے تمام حقوق ادا کرتا رہے گا۔ وہ اسے چھوڑنے سے پہلے اس کے نام ایک خط چھوڑ گیا تھا۔

''میری شریکِ حیات سمیرا......!

میں ایک طویل عرصے سے ذہنی انتشار میں مبتلا ہوں۔ دولت ہے، عیش و آرام ہے لیکن دماغی سکون اور دل کا قرار نہیں ہے۔ میں نے اپنی تمام دولت و جائداد اور کاروبار کو سنبھالنے کا اور ان سے فائدہ اٹھانے کا مختار نامہ تمہارے نام لکھ دیا ہے۔ یوں بھی تم میری شریکِ حیات ہو۔ میرے بعد یہ سب کچھ تمہارا ہی ہوگا۔ یہ وعدہ کر کے جارہا ہوں کہ کبھی کوئی سوکن تمہارے حقوق میں حصے دار نہیں بنے گی۔ میں تم سے پوری طرح انصاف کرنے کے باوجود ایک ناانصافی یہ کررہا ہوں کہ ایک نامعلوم مدت کے لیے تم سے دور جارہا ہوں۔ انشاء اللہ زندگی رہی تو واپس ضرور آؤں گا۔ فقط تمہارا اپنا۔ محبوب علی چانڈیو۔''

ابھی یہ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ وہ ماروی کا سچا عاشق اور دیوانہ تھا۔ دیوانہ تو مراد بھی تھا بلکہ بچپن سے اس کا عاشق تھا لیکن مراد اسے حاصل کرنے کے بعد دھیما پڑ گیا تھا۔

آئندہ محبوب کی آزمائش تھی۔ اگر ماروی اسے حاصل ہو جاتی تو کیا اس کے لیے بھی گھر کی مرغی دال برابر ہو جاتی؟ فی الحال ابھی کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔ حقیقتاً یہ کہہ سکتے تھے کہ ''ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں۔''

ماروی اگلی صبح سات بجے ہی گھر سے نکل گئی۔ چاچی نے بشریٰ کو بتایا تھا کہ وہ دوسرے دن بھی صبح سہیلی سے ملنے جائے گی۔ اس نے بلّے سے یہ طے کیا تھا کہ کل چپ چاپ ماروی کا تعاقب کیا جائے گا۔ وہ دیکھیں گے کہ وہ بار بار میمن گوٹھ کیوں جاتی ہے؟

اس نے علی الصباح بلّے کو جگایا۔ ''اٹھو۔ ماروی نکل جائے گی تو ہم اس کے پیچھے نہیں جاسکیں گے۔''

وہ نیند میں کسمساتے ہوئے بولا۔ ''مجھے سونے دو۔ پلیز تم چلی جاؤ یا پھر جانے دو، وہ کہیں بھی جائے۔ یہ اطمینان ہے کہ واپس بخیریت آجاتی ہے۔''

بشریٰ کے دل میں تجسس بھرا ہوا تھا۔ وہ کھوج لگائے بغیر سکون سے نہیں رہ سکتی تھی۔ وہ فوراً ہی تیار ہو کر کھڑکی کے پردے کے پیچھے سے گلی میں تاکنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد ماروی گھر سے نکل کر اس کے مکان کے سامنے سے گزرتی جارہی تھی۔ اس نے جاتے جاتے سر گھما کر دیکھا۔ بشریٰ پردے کے پیچھے نظر نہیں آئی۔

وہ مطمئن ہو کر ٹیکسی اسٹینڈ میں آکر ایک رکشے میں بیٹھ گئی۔ بشریٰ ایک چادر میں چھپی ہوئی تھی۔ اس نے دوسرے رکشے میں بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''وہ جو آگے رکشا جارہا ہے، اس کے پیچھے چلو اور اس سے ذرا دور ہی دور رہو۔''

وہ دونوں رکشے آگے پیچھے دوڑتے ہوئے جانے لگے۔ وہ بشریٰ سے بے خبر تھی۔ چاچی اور چاچا کو چھوڑ کر جاتے ہوئے اسے یوں لگ رہا تھا جیسے دنیا چھوڑ کر جارہی ہو۔ اب آگے اس کا کوئی نہیں تھا۔

وہ پریشانی سے یہ سوچ رہی تھی۔ 'پہلی بار بالکل تنہا ایک ملک سے دوسرے ملک جانا ہے۔ لندن انجانی جگہ ہے۔ وہاں میرا کیا بنے گا؟ خدانخواستہ محبوب ائرپورٹ پر نہ آئے تو میں کہاں جاؤں گی؟'

محبوب سے فون پر مسلسل رابطہ تھا۔ وہ حوصلہ دے رہا تھا کہ بالکل نہ گھبرائے۔ وہ لندن ائرپورٹ پر اس کے استقبال کے لیے موجود رہے گا۔ اسے کہیں بھٹکنا نہیں پڑے گا۔ وہ زندگی میں پہلی بار بہت بڑا قدم اٹھا چکی تھی۔ حوصلہ بھی کررہی تھی اور گھبرا بھی رہی تھی۔

دل ہی دل میں کہہ رہی تھی۔ ''جا ہرجائی! تیرے بچپن کا پیار گیا۔ تیرے عشق کا دعویٰ فنا ہوگیا۔ اب یہ ماروی تجھے کیا نظر آئے گی۔ جبکہ صورت بدلنے کے بعد آئینے میں خود کو بھی دکھائی نہیں دے گی۔''

بشریٰ نے حیرانی سے دیکھا۔ ماروی میمن گوٹھ کی طرف نہیں جارہی تھی۔ اس نے فوراً ہی فون پر کہا۔ ''بلّے...! اُٹھ جا۔ ماروی ائرپورٹ کی طرف جارہی ہے۔ یہ تو حیران کررہی ہے۔''

وہ جماہی لیتے ہوئے بولا۔ ''کیا مصیبت ہے۔ وہ ائرپورٹ کیوں جارہی ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ مراد رازداری سے آرہا ہو؟ اور یہ بات ہم سے بھی چھپائی جارہی ہو۔''

وہ جھنجلا کر بولی۔ ''تو وہیں سے بولے گا۔ بستر سے نہیں اُٹھے گا۔ اگر یہ مراد کے ساتھ ائرپورٹ سے کسی دوسری جگہ جائے گی تو میں بار بار رکشے میں پیچھا نہیں کر سکوں گی۔ تو فوراً آئے گا تو ہم ان کے پیچھے جاسکیں گے۔''

''ہاں۔ ٹھیک کہتی ہے۔ یہ ماروی اور مراد کچھ زیادہ ہی پراسرار ہو گئے ہیں۔ میں آرہا ہوں۔''

وہ باتیں کرتی ہوئی ائرپورٹ پہنچ گئی۔ ماروی کے شانے سے ایک بیگ لٹکا ہوا تھا۔ یہ شبہ بھی نہیں ہوسکتا تھا کہ وہ صرف ایک بیگ اٹھا کر بیرونِ ملک سفر کے لیے جائے گی۔

فی الحال یہی سمجھ میں آرہا تھا کہ وہ کسی کو ریسیو کرنے وہاں پہنچی ہے اور وہ بیرونِ ملک سے آنے والا مراد ہی ہو

سکتا ہے۔
تھوڑی دیر بعد لاؤڈ اسپیکر سے اطلاع دی جانے لگی کہ لندن جانے والے مسافر اندر جا سکتے ہیں۔ بشریٰ ماروی سے دور چادر میں منہ چھپائے بیٹھی تھی۔

اس نے حیرانی سے دیکھا۔ ماروی اندر جانے والے دروازے کی طرف جا رہی تھی۔ وہ زیرلب بڑبڑائی۔ ''یہ اس دروازے کی طرف کیوں جا رہی ہے؟''

اُدھر ماروی مسلح گارڈز کو اپنا ٹکٹ دکھا رہی تھی۔ بشریٰ شدید حیرانی سے اچھل پڑی۔ وہیں سے چیخ کر آواز دی۔ ''ماروی... !تم کہاں جا رہی ہو؟''

ماروی نے پریشان ہو کر سر گھما کر اسے دیکھا۔ وہ دور سے دوڑتی ہوئی آ رہی تھی۔ اس کے قریب آنے سے پہلے ہی وہ اندر چلی گئی۔ بشریٰ کو مجبوراً رکنا پڑا۔ اسے اندر جانے کی اجازت نہیں دی جا سکتی تھی۔

اس نے وہیں سے اسے پکارا۔ ''ماروی... !تم کہاں جا رہی ہو؟ یہاں آؤ۔''

وہ دور ہو گئی تھی۔ اگرچہ نظر آ رہی تھی لیکن بشریٰ کو نظرانداز کر رہی تھی۔ مسلح گارڈز نے اسے دروازے سے ہٹنے اور دور جانے کے لیے کہا۔ اسے دور ہونا پڑا۔ اس نے فوراً ہی فون نکال کر اس کے نمبر پنچ کیے۔ اُدھر شیشے کی دیوار سے اسے دیکھتی رہی۔

پھر رابطہ ہوتے ہی بولی۔ ''ماروی! تم اکیلی کہاں جا رہی ہو؟ مجھے آنکھوں سے دیکھ کر یقین نہیں آ رہا ہے۔ کیا واقعی تم لندن جا رہی ہو؟''

وہ بولی۔ ''بشریٰ! تم نے اور بلّے نے مجھے بہت محبتیں دی ہیں۔ میں تم دونوں کو کبھی بھلا نہیں سکوں گی۔ ابھی مجھ سے کوئی بات نہ کرو۔ میں تمہاری کسی بات کا معقول جواب نہیں دے سکوں گی۔''

ماروی نے اسے دور سے دیکھتے ہوئے فون بند کر دیا۔ بشریٰ محبت کرنے والی بہن بھی تھی اور بہت ہی پیاری سہیلی بھی تھی۔ افسوس ماروی اپنے حالات کے باعث بے مروت ہو گئی تھی۔ کچھ کہے سنے بغیر جا رہی تھی۔

اس نے فون بند کر دیا۔ بشریٰ نے فوراً بلّے کو پکارا۔ ''کہاں ہے تُو... ؟ ارے یہاں کیا سے کیا ہو رہا ہے۔ تُو یقین نہیں کرے گا' ماروی لندن جا رہی ہے۔''

اس نے بے یقینی سے پوچھا۔ ''کیا کہہ رہی ہے؟ اس کے ساتھ اور کون ہے؟''

''کوئی نہیں ہے اور اس کے ساتھ کوئی سامان بھی نہیں ہے۔ صرف ایک بیگ لٹکائے جا رہی ہے۔ میں نے فون کیا تو پہلے بڑی محبت سے ہماری تعریفیں کیں پھر کہہ دیا کہ ابھی مجھ سے کوئی بات نہیں کر سکے گی۔''

''میں موٹر سائیکل پر آ رہا ہوں۔ میرا انتظار کر۔ ماروی سے بول کہ میں آ رہا ہوں۔''

''کیسے بولوں؟ اس نے فون بند کر دیا ہے۔''

وہ بول رہا تھا۔ ''ہم اسے وہاں سے واپس آنے پر مجبور نہیں کر سکیں گے۔ لیکن ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ وہ بے سروسامان ہو کر اتنی دور تنہا جا کر کہاں رہے گی؟ کیسے رہے گی؟ اس کے پاس کتنی رقم ہوگی کہ وہ لندن میں گزارہ کر لے گی؟''

بشریٰ نے چونک کر چیختے ہوئے کہا۔ ''بلّے... ! محبوب...''

اس نے پوچھا۔ ''کیا وہاں محبوب ہے؟''

''یہاں نہیں ہے۔ لندن میں ہے۔ یہاں سمیرا اور معروف جتّی اسے تلاش کر رہے ہیں۔ بات صاف سمجھ میں آ رہی ہے۔ محبوب اور ماروی کے درمیان پہلے ہی سے معاملہ طے ہو گیا ہوگا۔ وہ اس کا استقبال کرنے کے لیے لندن میں موجود ہوگا۔''

بلّا سوچ میں پڑ گیا۔ وہ تیز رفتاری سے بائیک چلا رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ''میں آ رہا ہوں۔''

اس نے فون بند کر کے رفتار اور بڑھا دی۔ دماغ اس سے زیادہ تیز رفتار ہو کر سوچ رہا تھا۔ یہ سمجھ میں آ رہا تھا کہ ماروی مراد سے پہلی بار سچ مچ بدظن ہو کر محبوب سے راضی ہو گئی ہے۔

وہ زیرلب بڑبڑانے لگا۔ ''یہ اچھا نہیں ہوا مگر یہی ایک دن ہونا تھا۔ مراد مسلسل ماروی سے ناانصافی کرتا آ رہا ہے۔''

سرخ سگنل کے باعث گاڑیاں رکی ہوئی تھیں۔ وہ قانون کے خلاف بائیک دوڑاتا ہوا آگے نکل گیا۔ یہ خیریت ہوئی کہ اس کا تعاقب کرنے اور پکڑنے کے لیے موبائل پولیس نہیں تھی۔

وہ اپنی دھن میں سوچتا جا رہا تھا۔ 'ماروی لندن میں کیسے رہے گی۔ مراد کے تمام دشمن اسے پہچانتے ہیں اور... اور محبوب بھی خطرے کا سگنل ہے۔ وہ مراد کا ہم شکل ہے۔'

وہ آندھی طوفان کی رفتار سے سوچتا جا رہا تھا۔ 'وہ دونوں لندن میں ساتھ رہیں گے تو یہی سمجھا جائے گا کہ مراد اپنی بیوی ماروی کے ساتھ کھل کر لندن میں رہنے آیا ہے۔ محبوب تو ذہین ہے چالاک بزنس مین ہے۔ ماروی کو حاصل کرنے کے لیے اتنی بڑی غلطی کیسے کرنے والا ہے؟'

وہ انکار میں سر ہلا کر سوچنے لگا۔ 'نہیں...... محبوب نادان نہیں ہے۔ اس نے ماروی کے ساتھ چھپ کر رہنے کے لیے زبردست پلاننگ کی ہوگی۔ پھر یہ کہ اسے صرف مراد کے دشمنوں سے ہی نہیں، اپنی بیوی سمیرا سے اور پوری بزنس کمیونٹی سے بھی چھپ کر رہنا ہوگا۔ مائی گاڈ! محبوب کوئی بہت بڑا گیم کھیل رہا ہے۔'

وہ ائرپورٹ کی عمارت میں پہنچ گیا۔ بشریٰ نے تیزی سے قریب آکر کہا۔ ''وہ اندر ویٹنگ ہال میں ہوگی۔ مسافروں کے ساتھ جہاز میں جانے کا انتظار کر رہی ہوگی۔''

بلّے نے ایک جگہ بیٹھ کر فون پر اس کے نمبر پنچ کیے۔ ماروی نے فون کی ننھی سی اسکرین پر بلّے کے نمبر پڑھے۔ سوچنے لگی کیا کرے؟ وہ ان محبت کرنے والوں سے کچھ بولنا نہیں چاہتی تھی۔ اسے یہ اندیشہ نہیں تھا کہ وہ اسے جانے سے روک سکیں گے۔ لیکن یہ منصوبے کے خلاف ہو رہا تھا کہ وہ ملک چھوڑنے سے پہلے ہی بشریٰ اور بلّے کی نظروں میں آگئی تھی۔

فون چیختے چیختے خاموش ہو گیا۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ دونوں میاں بیوی بہت زیادہ تجسس میں مبتلا ہوں گے۔ اس کے یوں چھپ کر جانے کی وجوہات معلوم کرنا چاہیں گے۔

فون پھر چیخنے لگا۔ اس نے بٹن کو دبا کر اسے کان سے لگایا پھر کہا۔ ''ہاں بلّے! کیوں میرے پیچھے آئے ہو؟ کیا تم نہیں چاہتے کہ میں کہیں جا کر آزادی سے سانس لے سکوں؟ کیا یہ نہیں چاہتے کہ اس نامراد ہرجائی کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ دوں؟''

وہ بولا۔ ''ہم میاں بیوی وہی چاہیں گے، جو تم اپنی بہتری کے لیے چاہتی ہو۔ یہ اچھی طرح جانتی ہو کہ ہم کس طرح دل و جان سے تمہیں چاہتے ہیں۔''

''میں مانتی ہوں اور تم دونوں کی قدر کرتی ہوں۔''

''لیکن ہم پر اعتماد نہیں کرتی ہو۔ اگر کرتیں تو یوں ہم سے چھپ کر نہ جاتیں۔''

وہ بولی۔ ''میرا بس چلے تو میں اپنے سائے سے بھی چھپ کر رہوں۔ جس نے مجھے دودھ پلایا، ماں بن کر پرورش کی ہے، اس چاچی سے بھی چھپ کر آئی ہوں۔ اس لیے مائنڈ نہ کرو۔ تم دونوں سے کہتی ہوں۔ آج سے اسی لمحے سے مجھے بھول جاؤ۔ میرے کسی معاملے میں دلچسپی نہ لو۔ میری فکر نہ کرو۔''

''ہمیں تمہاری فکر نہیں ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ تم محبوب صاحب کی پناہ میں رہوگی۔''

اس نے چونک کر پوچھا۔ ''یہ کیا کہہ رہے ہو؟ محبوب صاحب سے میرا کوئی رابطہ نہیں ہے۔''

''ماروی! ہم نادان نہیں ہیں۔ وہ تمہاری خاطر اپنی دولت کو، کاروبار کو اور سمیرا کو چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔''

''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ کیوں محبوب صاحب سے میرا تعلق جوڑ رہے ہو؟''

''تمہارے انکار کرنے سے حقیقت نہیں بدلے گی۔ دو روز پہلے محبوب صاحب اپنا سب کچھ چھوڑ کر گئے۔ آج تم بھی ماں جیسی چاچی کو اور ہم سب کو چھوڑ کر جا رہی ہو۔ سب کے سوچنے اور سمجھنے کے لیے یہ حقیقت چھوڑ کر جا رہی ہو کہ مراد سے بدظن ہو کر محبوب صاحب سے راضی ہو گئی ہو۔''

''فضول باتیں نہ کرو۔ خدا گواہ ہے میرا ان سے ایسا کوئی معاملہ نہیں ہے۔ میں ان کی عزت کرتی ہوں۔ لیکن وہاں ان کے ساتھ نہیں رہوں گی۔''

''پھر کہاں رہو گی؟ لندن جیسے مہنگے شہر میں اکیلی کیا کرو گی؟ کیا کماؤ گی؟ کیا کھاؤ گی؟ کہاں سر چھپاؤ گی؟ دشمنوں سے کس طرح چھپ کر رہو گی؟''

''یہ سب میرے مسائل ہیں۔ تمہیں خدا کا واسطہ ہے۔ مجھ سے کوئی سوال جواب نہ کرو۔''

''میں کوئی سوال نہیں کروں گا۔ اتنا ضرور کہوں گا کہ تم چھپنے سے پہلے ہی محبوب صاحب کے ساتھ نمایاں ہو گئی ہو۔ بولو یہ سچ ہے کہ نہیں؟ آج سے لاکھ پارسائی جتانے کے باوجود ان کے ساتھ بدنام ہوتی رہو گی۔ بولو یہ سچ ہے کہ نہیں؟''

بشریٰ نے اس سے فون لے کر کہا۔ ''ماروی!.... بے شک تمہیں مراد کو چھوڑ کر کسی کے ساتھ شرعی ازدواجی زندگی گزارنا چاہیے۔ اگر محبوب صاحب کے ساتھ رہنے والی ہو تو ان کی منکوحہ ہونے کا اعلان کرو۔ میری بہن...! چھپ کر رہو گی تو پھر ایک بار ان کی داشتہ کہلانے لگو گی۔''

بلّے نے فون پر جھک کر کہا۔ ''تم اپنی نئی زندگی کی ابتدا بدنامی سے کر رہی ہو۔ ہماری باتوں پر، ہمارے مشوروں پر غور کرو۔ ہم تمہاری بہتری چاہتے ہیں۔''

بشریٰ نے کہا۔ ''جو راستہ بدنامی کی طرف جا رہا ہے، اسے چھوڑ کر ابھی آسکتی ہو۔ واپس آجاؤ ماروی یا لندن پہنچتے ہی محبوب صاحب کی شریکِ حیات بن جانے کا اعلان کرو۔''

ان کی باتیں دل کو لگ رہی تھیں۔ اس نے بڑی اپنائیت سے کہا۔ ''تم دونوں پر خدا کی رحمت ہو۔ میں تمہارے نیک مشوروں پر غور کروں گی۔ جہاز میں جا کر بیٹھنے

کو کہا جا رہا ہے۔ زندگی رہی تو ہم کبھی ملیں گے۔ اللہ حافظ۔''
ماروی نے فون بند کر دیا۔ اس وقت ایک ہی ضد دماغ میں سمائی ہوئی تھی کہ مراد سے اور اس کے دشمنوں سے چھپ کر رہنے کے لیے چہرہ بدلنا ہے اور ہمیشہ کے لیے مراد کی نظروں سے یوں گم ہو جانا ہے جیسے فنا ہو گئی ہو اور فنا ہونے کے بعد ماروی کو بدنامی کی پروا نہیں تھی۔ اس کی جگہ نئی ماروی جنم لینے والی تھی۔

☆☆☆

قاضی احمد کی حویلی میں شادی خانہ آبادی کی رونق لگی ہوئی تھی۔ اگلے تین گھنٹوں کے بعد مراد کا نکاح نوری سے پڑھایا جانے والا تھا اور وہ حالات سے سمجھوتا کر رہا تھا۔ کٹھن آزمائشوں سے گزرتے گزرتے ایک منکوحہ لازمی ہو گئی تھی۔ آزمائشوں کے دوران میڈونا منکوحہ نہ بن سکی۔ مرینہ اس کے نکاح میں نہ آسکی۔ اب یہ تقدیر کی شرارت تھی یا کچھ بھی تھا۔ وہ جھنجلا کر، خم ٹھونک کر میدان میں آگیا تھا کہ کوئی بھی آجائے۔ ایک عورت ضروری تھی۔ اس لیے وہ تین گھنٹے بعد نوری کو قبول کرنے والا تھا۔

امید نہیں تھی کہ نوری بھی نکاح قبول کر سکے گی۔ پچھلے تجربات دھمکیاں دے رہے تھے کہ وہی ہونے والا ہے جو ہوتا آرہا ہے۔ لیکن انسانی ضد تھی کہ کوشش کرتے رہنا چاہیے۔ کبھی تو کوئی کوشش رنگ لائے گی۔

ایسے وقت ماروی شدت سے یاد آرہی تھی۔ لوحِ مقدر میں لکھ دیا گیا تھا کہ وہی ایک منکوحہ رہے گی۔ وہ کبھی دوسری شادی نہیں کر سکے گا۔ ایک طرح سے کاتبِ تقدیر نے ماروی کی قدر و قیمت بڑھا دی تھی۔ صرف وہی اس کی شریکِ حیات بن کر رہنے والی تھی۔ مراد کے لیے چیلنج بن گئی تھی کہ اس کی کوئی سوکن لا کر دکھا دے۔

مرینہ نے فون پر اسے مخاطب کیا۔ ''مراد! میں بے چینی سے انتظار کر رہی ہوں۔ دعائیں مانگ رہی ہوں کہ نوری سے تمہارا نکاح ہو جائے۔ اس طرح بابا اجمیری کی پیش گوئی ختم ہو گی تو میرے لیے راستہ کھلے گا۔''

وہ بولا۔ ''ہاں اسی لیے میں نوری کو قبول کروں گا۔ جب رکاوٹیں اور نحوستیں ختم ہو جائیں گی تو تم بھی میری شریکِ حیات بن جاؤ گی۔ تم یہاں آرہی ہو نا؟ میں نے عبداللہ کو شادی کی دعوت دی ہے تم اس کی بہن بن کر آجاؤ۔ آنکھوں سے دیکھو کہ کیا ہوتا ہے؟''

''خدا کرے کامیابی ہو۔ اب تو کہیں سے رکاوٹ کے آثار نظر نہیں آرہے ہیں نا؟''

''پہلے بھی ناکامی کے آثار نظر نہیں آئے تھے پھر اچانک ہی مایوس ہونا پڑا تھا۔ یہاں ابھی تک حالات معمول پر ہیں۔ کوئی دشمن مجھے پہچاننے کے لیے نہیں آئے گا۔ پولیس اور انٹیلی جنس والے مجھے تلاش کرتے رہیں گے اور میں یہاں ایک پولیس افسر کے سائے میں نوری سے نکاح قبول کر لوں گا۔ اب فون بند کرو اور کیڈی کے ساتھ یہاں چلی آؤ۔''

وہ سر جھکائے سوچ رہا تھا۔ نوری کی ماں اور دوسری خواتین اور مرد رسمیں ادا کرنے اسے پگڑی اور سہرا پہنانے آگئے۔ اسے ایک چوکی پر بیٹھنے کو کہا گیا۔ پھر اس کی ہونے والی ساس نے اسے تھوڑا سا میٹھا کھلا کر اس کی بلائیں لیتے ہوئے کہا۔ ''میری نوری لاکھوں میں ایک ہے اور داماد بھی ماشاءاللہ ہیرا ہے۔''

عورتیں یکے بعد دیگرے نوری کی شرافت، دیانت اور دین داری کے گن گاتی ہوئی رسمیں ادا کرنے لگیں۔ اپنی چیز کی تعریف کون نہیں کرتا؟ نوری کے متعلق کہا جا رہا تھا کہ وہ بے حد شرمیلی ہے۔ وہ سیدھی سادی گھریلو لڑکی اپنے سائے سے بھی شرماتی ہے۔

مرینہ آگئی تھی۔ وہ مراد سے دور خواتین کی بھیڑ میں کھڑی شادی کی رسمیں دیکھ رہی تھی۔ مراد سے بھی نگاہوں کا اور اشاروں کا تبادلہ ہو رہا تھا۔

نو بج رہے تھے۔ ایک گھنٹے بعد نکاح پڑھایا جانے والا تھا۔ ایسے وقت فون مراد کو پکارنے لگا۔ خواتین کی بھیڑ چھٹ گئی تھی۔ ایک آدھ جاتی دکھائی دے رہی تھیں۔ مرینہ بھی قریب آکر رک گئی۔

اس نے فون کو کان سے لگا کر پوچھا۔ ''ہائے بلے۔۔۔! آج اچانک کیسے یاد کر رہے ہو؟''

وہ بولا۔ ''تمہیں یاد دلانے کے لیے فون کیا ہے کہ یہاں تمہاری ایک شریکِ حیات تھی۔ خدا اسے کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ آؤ ہم فون پر اس کے لیے دعائے مغفرت کریں۔''

وہ تڑپ کر بولا۔ ''کیا کہہ رہے ہو؟ وہ خیریت سے تو ہے نا؟ اسے کچھ ہوا تو نہیں ہے؟ تم جھوٹ بول رہے ہو نا؟''

''یہ جھوٹ بھی ہے اور سچ بھی ہے۔ کیونکہ وہ صرف تمہارے لیے مر چکی ہے۔''

''بلے! میں دماغی طور پر بہت الجھا ہوا ہوں۔ فار گاڈ سیک اور نہ الجھاؤ۔ بولو وہ خیریت سے ہے نا؟''

''میں کیا بولوں کہ وہ جہاں ہے، وہاں خیریت سے

ہے یا نہیں ہے۔ وہ ہم سے اور چاچا' چاچی سے بھی چھپ کر دور بہت دور لندن چلی گئی ہے۔''

''تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ وہ لندن چلی گئی ہے؟''

''بشریٰ نے چھپ کر اس کا تعاقب کیا تھا۔ وہ جہاز میں سوار ہونے کے لیے اندر چلی گئی تھی۔ ہم اسے روک نہ سکے۔''

وہ کان سے فون لگائے بے چینی سے پہلو بدلتا ہوا مرینہ کو دیکھ رہا تھا۔ کبڈی بھی وہاں آ گیا تھا۔ اس نے پوچھا۔ ''کیا چاچی چاچا سے بھی چھپ کر گئی ہے؟ اکیلی تو جا نہیں سکتی۔ وہ کس کے ساتھ گئی ہے؟''

''تم یقین نہیں کرو گے۔ ایک حیرانی تو یہ کہ اکیلی گئی ہے۔ دوسری حیرانی یہ ہے کہ اس کے ساتھ کوئی سامان بھی نہیں تھا۔ صرف ایک بیگ اس کے شانے سے لٹکا ہوا تھا۔''

وہ بڑی بے تابی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ انکار میں سر ہلا کر بولا۔ ''یہ نہیں ہو سکتا۔ وہ اتنی دور لندن تنہا کیسے جائے گی؟ ضرور کوئی اس کے ساتھ ہو گا۔''

بلے نے کہا۔ ''تم خوب سمجھ رہے ہو کہ اس کے پیچھے کون ہو گا؟ اور سمجھا بھی کیا جا سکتا ہے۔ دو روز پہلے محبوب' میرا کو اور اپنے تمام کاروبار کو چھوڑ کر لندن جا کر روپوش ہو گیا تھا اور آج ماروی روپوش ہونے گئی ہے، آگے کی کہانی تم خود سمجھ لو۔''

وہ یکلخت چیخ پڑا۔ ''میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔''

کبڈی نے فوراً اچھل کر بیڈ پر چڑھ کر اس کا منہ دباتے ہوئے کہا۔ ''کیا کر رہے ہو۔ یہ شادی کا پورا گھر دوڑا چلا آئے گا۔ غصے سے نہ بولو۔''

مرینہ نے بھی دھیمی آواز میں سمجھایا۔ ''یوں چیخو گے تو سب کو بتانا ہو گا کہ فون پر کس کو غصہ دکھا رہے ہو۔ جان محمد کا کسی سے غصہ دکھانے کا کوئی معاملہ نہیں ہو گا۔ پلیز کام ڈاؤن۔''

فون مراد کے کان سے لگا ہوا تھا۔ وہ دھیمی آواز میں دانت پیس کر بولا۔ ''وہ میری ہے۔ محبوب اسے مجھ سے چھین نہیں سکے گا۔ اس کی موت آ گئی ہے۔ میں کسی بھی پہلی فلائٹ سے لندن جاؤں گا۔''

بلے نے کہا۔ ''خواہ مخواہ طیش میں آ کر اچھل رہے ہو۔ میرے عقلمند دوست.....! گھر کا دروازہ کھلا چھوڑ کر جاؤ گے تو عورت ہو یا زیور' کوئی بھی اسے لے جائے گا۔ اپنا مال چور کے حوالے کر کے اپنی غلطی اور بے وقوفی کو نہیں سمجھ رہے ہو۔ بڑے سورما بن کر محبوب کو چیلنج کر رہے ہو۔ وہ رقیب ہی سچا عاشق ہے۔ ابتدا سے اب تک ماروی کی عزت آبرو کا محافظ رہا ہے۔ ہیرے کی قیمت جوہری جانتا ہے اور وہ جوہری کے پاس پہنچ گئی ہے۔''

وہ پھر غصے سے بولا۔ ''میں نے کوئی غلطی نہیں کی ہے۔ تم سب جانتے ہو۔ مجھے حالات مجبور کرتے رہے پھر بھی میں گناہوں سے دامن بچاتا رہا۔ اب اگر دوسری شادی لازمی ہو گئی ہے تو میں کیا کروں؟''

بلے نے پوچھا۔ ''تو ماروی کیا کرے؟ دین میں یہ حکم ہے کہ پہلی بیوی راضی ہو تو دوسری شادی کرو اور پہلی بیوی میں کوئی جسمانی اور ذہنی خرابی نہیں ہے۔ وہ تمہارے ساتھ ازدواجی زندگی گزارنے کے قابل ہے۔ تم اسے نظر انداز کرو گے تو وہ تم سے ضرور خلع چاہے گی۔''

وہ ہونٹوں کو سختی سے بھینچ کر سن رہا تھا۔ بلا کہہ رہا تھا۔ ''وہ تمہاری زندگی سے نکل چکی ہے۔ وہ کسی دن خلع کے کاغذات پیش کر دے گی یا ایک لمبی غیر معینہ مدت تک علیحدہ رہنے سے خود بخود طلاق ہو جائے گی۔''

وہ سخت لہجے میں بولا۔ ''میں ایسا وقت آنے سے پہلے ہی محبوب کو اوپر پہنچا دوں گا۔''

''مراد! ایک بات کہہ دوں کہ میں اپنی بشریٰ کے ساتھ جرائم سے توبہ کر رہا ہوں۔ ہم ماروی کو بہن سمجھتے ہیں۔ اس کے ساتھ ناانصافی نہیں ہونے دیں گے۔ وہ تمہارے جیسے مجرم کی زندگی سے دور ہو کر محبوب کو قبول کرے گی تو ہم اسے تحفظ فراہم کریں گے۔ تمہیں محبوب کو نقصان نہیں پہنچانے دیں گے۔ محبوب انتہائی نیک اور قابلِ قدر ہے، اسے نقصان پہنچانے کے خیال سے باز آ جاؤ۔''

''میں تم سے مشورہ لے کر اسے نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ ماروی بھی لندن گئی ہے تو سمجھ لو محبوب چند دنوں کا مہمان ہے۔ میں جلد سے جلد اس کی موت بن کر وہاں پہنچوں گا۔''

''تو پھر یہ بھی سن لو کہ میں تمہیں ماروی کی خوشیاں برباد کرنے کے لیے محبوب تک پہنچنے نہیں دوں گا۔''

مرینہ نے مراد کے فون پر جھک کر کہا۔ ''بلے! یہ کیا بکواس کر رہے ہو۔ کیا اپنے حواس میں نہیں ہو؟ تم مراد کو چیلنج کر رہے ہو...... کیا تمہاری شامت آئی ہے؟''

ادھر سے بشریٰ نے بلے کے فون پر جھک کر کہا۔ ''اے کُتیا! تو میری ماروی کی سوکن بننے کے لیے ابھی تک مراد بھائی سے چپکی ہوئی ہے۔ کیا میرے ہاتھوں حرام موت مرے گی؟''

مراد نے ڈانٹ کر کہا۔ ''بشریٰ! تمیز سے بات کرو۔ تم نے مرینہ کو گالی دی ہے۔ فوراً معافی مانگو۔''

بشریٰ نے کہا۔ ''وہ آپ کا پیچھا چھوڑ دے گی، ماروی کی

سوکن نہیں بنے گی تو میں ابھی سر جھکا کر معافی مانگ لوں گی۔"
مرینہ نے کہا۔ "میں اور مراد لازم و ملزوم ہیں۔ ہم کبھی الگ نہیں ہوں گے۔"
ادھر سے وہ بولی۔ "میں سانپ کو اس کے بل سے الگ کر کے اس کا سر کچلنا جانتی ہوں۔ یہ لکھ لے کہ تیری موت میرے ہاتھوں ہوگی۔"
مراد نے کہا۔ "بلّے! بشریٰ کو سمجھاؤ۔ اسے چپ کراؤ۔"
بلّے نے کہا۔ "مرینہ نے ہمیں چیلنج کرنے میں پہل کی ہے، اس نے بشریٰ کو بھڑکایا ہے۔ تم اسے سمجھاؤ۔"
اس نے پوچھا۔ "کیا واقعی تم محبوب کی حمایت میں میرے خلاف بھڑک رہے ہو؟ مجھے چیلنج کر رہے ہو؟"
"ماروی سے انصاف کرو۔ اسے اپنی مرضی سے محبت کے ساتھ زندگی گزارنے دو۔ ان دونوں کی طرف رخ نہ کرو۔ پھر ہم دوست ہی رہیں گے۔"
مراد نے سرد لہجے میں پوچھا۔ "ورنہ دشمن بن جاؤ گے؟ ایک آخری بات بولو۔"
"میری آخری بات یہ ہے کہ حق اور انصاف کو سمجھو۔ نہیں سمجھو گے تو پھر جو ہوگا' دیکھا جائے گا۔"
یہ کہتے ہی بلّے نے رابطہ ختم کر دیا۔ مراد گہری سنجیدگی سے سوچتا ہوا بیڈ کے سرے پر بیٹھ گیا۔ مرینہ نے کہا۔ "تم نے اس کے چیلنج کا جواب سختی سے کیوں نہیں دیا؟"
وہ بولا۔ "میری نظروں میں اس کے چیلنج کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ میں ماروی کے لیے مر رہا ہوں۔ میں اسے محبوب کے قریب رہنے نہیں دوں گا۔ میں اندر ہی اندر تڑپ رہا ہوں کہ کیسے یہاں سے نکلوں اور لندن پہنچ جاؤں۔"
کبڈی نے کہا۔ "خود کو جان محمد ماننے سے انکار کرو گے یہاں سے بھاگنا چاہو گے تو پولیس افسر جمال شاہ پورے انڈیا کی پولیس کو تمہارے پیچھے لگا دے گا۔"
مرینہ نے کہا۔ "پلیز مراد! ماروی تک پہنچنے کی جلدی کرو گے تو بڑی مصیبتوں میں پڑو گے۔ یہاں اس کمرے میں الماری کے اندر دیکھو۔ جان محمد کا پاسپورٹ، ویزا اور دوسرے اہم قانونی دستاویزات ہوں گے۔ انہیں اپنی تحویل میں رکھو۔ تم ان کے ذریعے ہی بارڈر پار جا سکو گے۔"
وہ درست کہہ رہی تھی۔ مراد سوچنے لگا۔ 'مجھے لندن جانے کی سہولت حاصل ہو سکتی ہے۔ جان محمد کے تمام قانونی کاغذات میرے کام آئیں گے۔ میں یہاں قاضی احمد کا بیٹا بن کر رشتے داری نبھاتے ہوئے' انہیں راضی خوشی رکھتے ہوئے' کسی رکاوٹ کے بغیر جا سکوں گا۔'

مرینہ نے وال کلاک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "گیارہ بجنے والے ہیں۔ نوری سے دس بجے نکاح پڑھایا جانے والا تھا۔ وقت گزر چکا ہے اور قاضی صاحب گھر میں رہتے ہوئے بھی نکاح خوانی کے لیے نہیں آ رہے ہیں۔"
انہوں نے اپنے ماحول کو توجہ سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ کمرے میں صرف وہی تینوں تھے۔ دُلہے کے پاس حویلی کا کوئی فرد نہیں آ رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا کہ سب ہی دُلہے میاں کو بھول گئے ہیں۔
فوراً ہی ہتھوڑے جیسا سوال دل پر لگا۔ ان تینوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ "کیا پھر کوئی رکاوٹ پیدا ہو گئی ہے؟"
مرینہ اور مراد شکست خوردہ سے ہو کر ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ اب وہ پہلے کی طرح حیران اور پریشان نہیں تھے۔ مرینہ نے پوچھا۔ "کیا واقعی کوئی رکاوٹ پیدا ہو گئی ہے؟"
ان تینوں نے کمرے کے باہر آ کر دیکھا۔ اوپر نیچے کی منزلوں میں تمام رشتے دار آتے جاتے دکھائی دے رہے تھے۔ ان میں سے کوئی مراد کے کمرے کی طرف نہیں آ رہا تھا۔
مراد نے ایک خاتون کو روک کر پوچھا۔ "ابّا کہاں ہیں؟"
خاتون نے کہا۔ "وہ نوری کو لے کر اسپتال گئے ہیں۔"
اس نے حیرانی سے پوچھا۔ "نوری کو کیا ہوا ہے؟"
اس خاتون نے دوسری خاتون کو دیکھا۔ پھر اس سے پوچھا۔ "بول دوں؟"
دوسری خاتون نے کہا۔ "بول دو۔ اب تو لاکھ چھپاؤ، یہ بات چھپنے والی نہیں ہے۔"
تب اس خاتون نے مسکرا کر کہا۔ "مبارک ہو۔ تم شادی سے پہلے باپ بن گئے ہو۔"
"کیا......؟" وہ حلق پھاڑ کر بولا۔ "یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟"
"جو ہو رہا ہے، وہی کہہ رہی ہوں۔ اسی لیے تو نکاح خوانی اب تک رکی ہوئی ہے۔"
دوسری خاتون نے کہا۔ "نوری کو دلہن کا جوڑا پہنایا جا رہا تھا تب ہی اس کی طبیعت بگڑ گئی۔ آثار بتانے لگے کہ کوئی گڑبڑ ہے۔ ہمارے خاندان کی دائی نے اس کا معائنہ کر کے کہہ دیا کہ نوری حاملہ ہے۔ دو مہینے کا حمل ہے۔"
دوسری خاتون نے کہا۔ "اس کا سر چکرا رہا تھا۔ اس پر بے ہوشی طاری ہو رہی تھی اس لیے اسے اسپتال لے گئے ہیں۔"
مراد نے کہا۔ "اس سے میرا نکاح پڑھایا جانے والا

تھا۔ مجھے کیوں نہیں بتایا جا رہا ہے کہ اب یہ نکاح نہیں ہو سکے گا۔''

''یہ تو قاضی انکل جانتے ہیں کہ تمہیں ابھی تک کیوں بے خبر رکھا جا رہا ہے۔''

وہ خواتین وہاں سے چلی گئیں۔ وہ تینوں کمرے میں آ گئے۔ مرینہ نے کہا۔'' آخر وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ یہاں بھی تمہارا نکاح نہیں پڑھایا جا سکے گا۔''

وہ تینوں کرسیوں پر اور بیڈ کے سرے پر بیٹھ گئے۔ مراد نے کہا۔'' خدا کا شکر ہے۔ میں یہی چاہتا تھا کہ نوری پیروں کی زنجیر نہ بنے اور میں جلد سے جلد لندن چلا جاؤں۔''

وہ بیڈ کے سرے سے اٹھ کر الماری کو کھول کر وہاں رکھے ہوئے کپڑوں کو اور دوسری چیزوں کو دیکھنے لگا۔ الماری کے ایک چھوٹے سے سیف میں جان محمد کا پاسپورٹ اور دوسرے اہم کاغذات رکھے ہوئے تھے۔

مرینہ نے کہا۔'' تمہاری تو مشکل آسان ہو گئی ہے۔ تم جب چاہو گے لندن جا سکو گے۔ بس وہ اپنے قاضی ابا اور پولیس افسر جمال شاہ کو خوش رکھنا ہو گا اور ان کا اعتماد حاصل کرنا ہو گا۔''

پھر وہ سوچتی ہوئی بولی۔'' ہم الگ نہیں ہوں گے۔ میں بھی جاؤں گی۔''

مراد نے کہا۔'' وہاں تمہاری موجودگی کا علم ہو گا، ماروی کو تم پر شبہ ہو گا تو پھر میرا بنتا ہوا کام بگڑ جائے گا۔ وہ مجھ سے راضی نہیں ہو گی۔ میں پہلے سہولت سے محبوب کو سمجھاؤں گا۔ وہ نہیں مانے گا تو مجھے دشمنی پر مجبور ہونا پڑے گا۔''

وہ بولی۔'' ہمارے چہرے بدل چکے ہیں۔ ماروی مجھے کبھی پہچان نہیں سکے گی۔ تم مجھے مسئلہ نہ بناؤ۔ میں اس کی موجودگی میں تم سے دور رہا کروں گی۔''

مراد اسے دیکھتے ہوئے سوچتے ہوئے بولا۔'' میں نکاح کے بغیر وہاں بھی تمہارے ساتھ نہیں رہوں گا۔ قدرت کا کیا عجیب تماشا ہے۔ نکاح کے صرف دو بول نہیں پڑھوا پا رہا ہوں۔''

پھر وہ ایک نئے خیال سے بولا۔'' یہ قدرتی تماشا' یہ رکاوٹیں اس لیے ہیں کہ ماروی ہی میری شریک حیات رہے گی۔ اسی لیے کوئی دوسری میری زندگی میں نہیں آ رہی ہے۔''

وہ بولی۔'' ایسی باتیں نہ کرو۔ میں تمہاری زندگی میں آ کر رہوں گی۔ یہ وعدہ کرتی ہوں کہ لندن میں بھی تمہارے ساتھ ایک چھت کے نیچے نہیں رہوں گی لیکن تمہارے آس پاس ضرور رہوں گی۔ مراد! ہمیں ایک دوسرے کی نظروں میں رہنا ہے۔ یہ بہت ضروری ہے۔''

اس نے جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے سر جھکا کر سوچنے لگا۔ ماروی سے دور ہونے کے بعد ہی اس کی اہمیت ستاتی اور پکارتی رہتی تھی۔ پھر بچپن سے یہ بات اس کے ذہن میں نقش تھی کہ وہ صرف اسی کی ملکیت ہے۔ کوئی دوسرا اسے ہاتھ نہ لگائے۔

قاضی احمد اسپتال سے آ گیا تھا۔ نوری کی بے حیائی اور بد چلنی کے باعث اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ اسقاطِ حمل کے باعث وہ اسپتال میں زیرِ علاج تھی۔ وہ زیرِ لب بڑبڑا رہا تھا۔'' پہلے بیٹے نے یہ کہہ کر ناک نیچی کر دی کہ شادی نہیں کرے گا۔ کسی عورت کے قابل نہیں ہے۔ آج بہن کی بیٹی نے، ہونے والی بہو نے سر جھکا دیا ہے۔ لعنت ہے اس جوان نسل پر، بزرگوں پر کیچڑ اچھالتے رہتے ہیں۔''

پھر اس نے مراد کے پاس آ کر کہا۔'' اے صاحبزادے! تم آزاد ہو۔ شادی کرو یا نہ کرو، میری بلا سے۔ جہاں جانا ہے جاؤ۔ جہاں رہنا ہے رہو۔''

اچانک مراد کو آزادی مل رہی تھی کہ وہ کہیں بھی کسی سے بھی شادی کر سکتا ہے۔ قاضی احمد کے جاتے ہی مرینہ نے کہا۔'' ہمارے لیے راستہ کھل گیا ہے۔ ہم شادی کر کے لندن جائیں گے۔''

'' کیسی باتیں کر رہی ہو؟ کیا ماروی سوکن کو برداشت کرے گی؟ تم اس کے دل میں اور زیادہ نفرت پیدا کرنا چاہتی ہو؟''

'' ایسی کوئی بات نہیں ہو گی۔ میں لندن میں تم سے دور رہا کروں گی۔ وہ کبھی میری ایک جھلک تک نہیں دیکھ سکے گی۔ پلیز مراد! ہم شادی کی ایک اور کوشش کریں گے۔ میری بات مان لو۔''

ہاں...... کوشش تو کرنی تھی۔ ایک عورت بہت ضروری ہو گئی تھی۔ وہ وہاں سے چپ چاپ اُٹھ کر قاضی احمد کے کمرے میں آیا۔ پھر اس کے پاس بیٹھ کر اس کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر بولا۔'' ابا...! میں شرمندہ ہوں۔ میں نے آپ کا دل دکھایا ہے۔ آپ اپنے پوتے پوتیوں کو گود میں کھلانا چاہتے ہیں۔ اگر آپ میری مرضی سے مجھے شادی کرنے کی اجازت دیں گے تو آج ہی شادی کر لوں گا۔ پھر اللہ نے چاہا تو ایک سال کے اندر آپ کی گود میں پوتی یا پوتا کھیلتا ہوا نظر آئے گا۔''

قاضی احمد نے سوچتے ہوئے کہا۔'' ہاں، یاد آیا۔ تم کسی سے شادی کرنے والے تھے۔ عبداللہ تمہارا نکاح

پڑھوانے کے لیے میرے پاس آیا تھا۔''
کبڈی دروازے پر کھڑا ہوا تھا۔ اس نے کہا۔ ''جی ہاں، وہ میری چچازاد ہے۔ میرے چچا اور چچی کا انتقال ہو گیا ہے اس لیے وہ میرے پاس رہتی ہے۔''
قاضی احمد نے کہا۔ ''میں اس سے ملنا چاہوں گا۔''
کبڈی وہاں سے مرینہ کے پاس گیا پھر اسے قاضی احمد کے سامنے پیش کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ ہے۔ اس کا نام بنت عمارہ ہے۔''
مرینہ نے فوراً ہی سر پر آنچل رکھ کر جھک کر قاضی احمد کو سلام کیا۔ وہ سلام کا جواب دیتے ہوئے اسے سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے بولا۔ ''ماشاء اللہ! بہت خوب صورت ہے۔ انگریز لڑکیوں جیسی ماڈرن لگ رہی ہے۔ تمہیں کھانا پکانا اور دیگر گھر گرہستی کے کام آتے ہیں؟''
وہ سر جھکا کر بڑے ادب سے بولی۔ ''آپ کی دعا سے سارے کام آتے ہیں۔''
اس نے مراد سے پوچھا۔ ''اچھا تو صاحبزادے! مجھے رشتے کی بات کس سے کرنی ہوگی؟''
اس نے کہا۔ ''رشتہ پہلے ہی طے ہو چکا ہے۔ یہ عبداللہ اپنی بہن کا سرپرست ہے۔ کل اسی کے گھر میں ہمارا نکاح پڑھایا جانے والا تھا۔''
قاضی احمد نے اپنے بھتیجے جمال شاہ کو بلا کر کہا۔ ''جو شادی ہونے والی تھی، وہ نہ ہو سکی۔ یہ ہوگی اور ابھی ہوگی۔''
مراد خوشی سے اچھل پڑا۔ قاضی احمد کے گلے لگ کر بولا۔ ''ابا۔۔۔! تم جیو ہزاروں سال۔ ہر سال کے ہوں دن پچاس ہزار۔ تم اپنے بیٹے کو بہت بڑا انعام دیتے رہو۔''
مرینہ بھی خوشی سے بے حال ہو رہی تھی۔ وہ دوپٹے کو بڑا سا گھونگھٹ بنا کر چھپ گئی تھی۔ یہ خبر پھیلتے ہی جان محمد کی بہنوں اور دوسری لڑکیوں نے آ کر اسے گھیر لیا تھا۔
دنیا عجیب رنگ برنگی ہے۔ پل پل رنگ بدلتی ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے حالات بدل گئے تھے۔ ایک دلہن سے شادی رک گئی تھی۔ دوسری دلہن سے ہونے کا اعلان ہو گیا تھا اور اب تو کسی طرح کی رکاوٹ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہاں تو اسی وقت نکاح خوانی کے لیے مرینہ کو خواتین کے درمیان پہنچا دیا گیا تھا۔ مراد کے اطراف مرد حضرات تھے اور نکاح نامے کی خانہ پری ہو رہی تھی۔
ان تمام لوگوں کی لاعلمی میں دولہا دلہن کے غلط نام لکھے جا رہے تھے۔ مراد کا ضمیر احتجاج کر رہا تھا۔ ضد کر رہا تھا کہ صحیح ناموں سے نکاح پڑھوایا جائے۔

اور وہ دل کو سمجھا رہا تھا۔ ضمیر کو تھپک رہا تھا کہ ناموں کے فرضی ہونے سے کچھ نہیں ہوتا۔ ان کے وجود تو وہی اصلی ہیں۔ وہ جسمانی طور پر وہی مرینہ اور مراد ہیں۔ مسلمان ہیں نیک نیتی سے اللہ کا نام لے کر ایک دوسرے سے ازدواجی رشتے میں منسلک ہو رہے ہیں اور آئندہ ان ہی موجودہ ناموں سے زندگی گزاریں گے۔
وہ دونوں شادی کو روکنے والی کسی بات کو کسی اندیشے کو نہیں مان سکتے تھے۔ ہر حال میں میاں بیوی بن جانا چاہتے تھے۔ قاضی احمد ایک وکیل اور دو گواہوں کے ساتھ آ کر مرینہ کے سامنے بیٹھ گئے۔ وہ گھونگھٹ نکالے، چپ چاپ دھڑکتے ہوئے دل کو سمجھا رہی تھی۔ ''اب ناممکن مرحلہ طے ہونے والا ہے۔ اب کسی رکاوٹ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''
انہوں نے ایک آیت کی تلاوت کرنے کے بعد مرینہ سے کہا۔ ''آمنہ بنت عمارہ۔۔۔۔۔۔!''
فون کی رنگ ٹون چیخنے لگی۔ مرینہ کا دھڑکتا ہوا دل جیسے حلق میں آ کر اٹک گیا۔ اس نے بے اختیار سانس روک لی۔
جمال شاہ نے کہا۔ ''آپ نکاح پڑھائیں۔ میں اٹینڈ کرتا ہوں۔ فون مجھے دیں۔''
قاضی احمد نے ننھی سی اسکرین کو پڑھ کر کہا۔ ''آپا اسپتال سے کال کر رہی ہیں۔''
اس نے بٹن کو دبا کر فون کو کان سے لگایا پھر کہا۔ ''جی آپا! فرمائیں، نوری کی طبیعت۔۔۔۔۔۔''
ان کی بات ادھوری رہ گئی۔ آپا روتی ہوئی بول رہی تھیں۔ ''نوری نے خودکشی کر لی ہے۔''
''کیا۔۔۔۔۔۔؟'' قاضی احمد نکاح نامہ ایک طرف پھینکتے ہوئے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ ان لمحات میں مرینہ کے جی میں آ رہا تھا کہ صدمے کی شدت سے قہقہے لگانا شروع کر دے۔ اپنا سر پیٹ لے۔ پاگل ہو جائے۔
شادی کے گھر میں پھر ماتمی افراتفری پیدا ہو گئی۔ مرد عورتیں سب ہی نوری کی باتیں کر رہے تھے۔ دلہا دلہن کو یکسر بھول گئے تھے۔ اب وہاں سے دلہن رخصت ہونے والی نہیں تھی۔ شرمندگی کے باعث خودکشی کرنے والی کی میت آنے والی تھی۔
مرینہ سر جھکائے بوجھل قدموں سے چلتی ہوئی مراد کے پاس آئی۔ وہ سر پکڑے بیٹھا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے بولا۔ ''اب یقین کر لینا چاہیے کہ تقدیر میں جو لکھا ہے وہ پتھر کی لکیر ہے۔ ہم اسے بدل نہیں سکیں گے۔''
وہ بولی۔ ''میں آج تک اپنے بدترین حالات سے

لڑتی ہوئی اور انہیں بدلتی ہوئی آئی ہوں۔ میں اب بھی یہ ماننے کو تیار نہیں ہوں کہ ہماری شادی نہیں ہو سکے گی۔''
وہ مٹھیاں بھینچ کر بولی۔ ''میں دیکھوں گی کہ ناگہانی رکاوٹیں کب تک ہمیں روکیں گی۔ ہمارا نکاح ضرور ہوگا۔''
کبڈی نے کہا۔ ''یہاں تو اب نوری کے چالیسویں کے بعد ہی ہو سکے گا۔''
پوری حویلی میں ماتمی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ کئی خواتین اور مرد حضرات قرآن مجید کا ایک ایک سیپارہ لے کر پڑھنے بیٹھ گئے تھے۔ مراد کا سر گھوم رہا تھا۔ جی میں آ رہا تھا کہ کہیں دور بھاگ جائے۔ اتنی دور چلا جائے کہ بابا اجمیری کی پیش گوئی پیچھے رہ جائے اور وہ آگے جا کر کسی بھی عورت کو اپنے نکاح میں لے آئے۔
مغرب کی نماز پڑھتے وقت ذہن بھٹک رہا تھا اور وہ بڑے ایمانی جذبے سے توجہ کو سمیٹ رہا تھا۔ تمام بھٹکنے والے خیالات کو اپنے رب کی ذات پر مرکوز کر رہا تھا۔
نتیجہ یہ ہوا کہ عبادت کے دوران میں فطری خواہش اور شیطانی ضرورت کو بھول گیا۔ بے شک اس کے اندر ایمانی قوت تھی اور وہ بڑی دل جمعی سے اور مکمل توجہ سے نمازیں پڑھنے کا عادی ہو گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ کئی بار آزمائش کی گھڑیوں میں اس کے ساتھ معجزے ہوتے رہتے تھے۔
پھر اس نمازی کو انعام کیسے نہ ملتا؟ آدھی رات کے بعد اسپتال سے خبر آئی کہ نوری کی نبض چل رہی ہے۔ ڈاکٹر اسے بچانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ پھر امید کی کرنیں پھوٹنے لگیں۔
مراد نے مرینہ کے پاس آ کر دھیمی آواز میں کہا۔ ''خدا کرے وہ بچ جائے۔ اس کی میت نہ آئے۔ اس کی سانسیں چلتی رہیں گی تو ہماری مرادیں پوری ہو جائیں گی۔''
انتظار میں صبح سے دوپہر پھر دوپہر سے شام ہو گئی۔ یہی خبر آتی رہی کہ وہ زندگی اور موت کی کشمکش میں سانسیں لے رہی ہے۔ یہ امید مستحکم ہو رہی تھی کہ نہ موت ہو گی، نہ چالیس دنوں تک انتظار کرنا ہوگا۔
پھر عشا کی نماز کے بعد انہیں یقین ہو گیا کہ وہ زندگی کی طرف لوٹ آئی ہے۔ قاضی احمد نے پھر فیصلہ سنایا کہ دوسرے دن دس بجے ان کا نکاح پڑھا دیا جائے گا۔

☆☆☆

لندن میں جہاز سے اترتے ہی فون کی رنگ ٹون ابھرنے لگی۔ ماروی نے بٹن دبا کر اسے کان سے لگایا۔ محبوب نے پوچھا۔ ''کہاں ہو؟''
وہ بولی۔ ''ابھی جہاز سے اتری ہوں۔''
اس نے کہا۔ ''تمہارے پاس سامان نہیں ہے۔ کسٹم چیکنگ میں زیادہ وقت نہیں لگے گا۔ میں باہر پارکنگ ایریا میں اپنی کار کے اندر ہوں۔ یہاں سے تمہیں گائڈ کرتا رہوں گا تو تم میری کار تک چلی آؤ گی۔''
ماروی نے پوچھا۔ ''آپ مجھے ریسیو کرنے وزیٹرز لابی میں کیوں نہیں آ جاتے؟''
''میں مراد کا ہم شکل ہوں۔ یہاں دو دنوں سے چھپ کر اہم معاملات سے نمٹ رہا ہوں۔ ابھی کار کے کلرڈ شیشوں نے مجھے چھپا رکھا ہے۔ تمہیں بھی آج شام تک پردے میں رہنا ہوگا۔ ابھی تین بجے ہمارے چہرے تبدیل ہوں گے۔''
دونوں کے کانوں سے فون لگے ہوئے تھے۔ محبوب اسے گائڈ کر رہا تھا۔ اس طرح وہ اس کی راہنمائی میں عمارت سے باہر پارکنگ ایریا میں آ گئی۔ پھر کار کے نمبر پڑھ کر قریب آئی تو محبوب نے اس کے لیے اگلی سیٹ کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ ''خوش آمدید...''
دونوں کی نظریں ملیں پھر وہ نظریں جھکا کر اس کے برابر والی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''خدا کا شکر ہے۔ میں یہاں تک پہنچ گئی۔ پہلی بار گھر سے نکل کر تنہا اتنی دور آئی ہوں۔''
وہ کار اسٹارٹ کر کے پارکنگ ایریا سے نکلتے ہوئے بولا۔ ''تم بہت حوصلے والی ہو۔ اللہ نے چاہا تو اپنے نیک ارادوں میں کامیاب ہوتی رہو گی۔ پچھلی تمام زندگی کو بھول جاؤ۔ تمہارے جتنے شناسا اور جتنے رشتے دار تھے، وہ مر چکے ہیں۔ کراچی سے جہاز پر سوار ہونے والی ماروی بھی فنا ہو گئی ہے۔ یہاں پہنچتے ہی تم نے نیا جنم لیا ہے۔ بدلتے ہوئے حالات تمہیں بدل رہے ہیں۔ ابھی دو گھنٹے بعد سرجری ہو گی۔ چہرہ تبدیل ہوگا تو آئینے کے سامنے خود کو ایک اجنبی لڑکی پاؤ گی۔''
اس کے اندر ایک نئی تحریک پیدا ہو رہی تھی۔ اس نے کہا۔ ''اوہ گاڈ! میں ابھی تبدیل ہو جاؤں گی۔ پھر تو واقعی پرانی ماروی کا اختتام ہو چکا ہے۔''
''اور میری سرجری بھی آج ہی ہو گی۔ ہمیں جلد سے جلد روپوش ہو جانا ہے۔''
اس نے ایک بڑے جنرل اسٹور کے سامنے گاڑی روکی۔ وہاں ماروی نے اپنے لیے نئے ملبوسات اور ضرورت کی تمام چیزیں خریدیں۔ پھر وہ چہرے کی سرجری کرنے والے ایک ماہر کے اسپتال میں آ گئے۔

اس نے پہلا بڑا قدم یہ اٹھایا کہ اپنا ملک اور اپنے رشتے داروں کو چھوڑ دیا۔ ایک نئے شہر میں، نئے اور انجانے لوگوں کے علاقوں میں رہنے آ گئی تھی۔ دوسرا بڑا قدم یہ اٹھا رہی تھی کہ اپنے پیدائشی چہرے کو مٹا رہی تھی۔ ہر انسان اپنی صورت سے پہچانا جاتا ہے۔ وہ اپنی پہچان ختم کر رہی تھی۔

جب آئینے کے سامنے سرجری کے ماہر نے اس کے چہرے پر پہلا لوشن لگایا تو اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ دل میں کہا۔ ''الوداع ماروی! تو نے محبتیں پائیں اور دور رقیبوں کی عداوتیں بھی دیکھتی رہی۔ اب تیرے ساتھ وہ تمام محبتیں اور عداوتیں ختم ہو رہی ہیں۔ اب ان لمحات کے بعد میں نہیں رہوں گی۔ اب میں اس اجنبی ماروی کے ساتھ زندہ رہا کروں گی۔''

جب اس نے آنکھیں کھولیں تو خود کو آئینے میں نہیں پایا۔ وہ گم ہو گئی تھی۔ چہرے پر ایک کیمیکل کی لیپ چڑھی ہوئی تھی۔ حالات پیدائشی ماروی کو چھین کر لے جا رہے تھے۔

محبوب نے اسے پہلے ہی ایک حسین و جمیل دوشیزہ کی تصویر دکھا کر کہا تھا۔ ''یہ تمہارا نیا چہرہ ہوگا۔ نیا جنم لینے سے پہلے اپنے آپ کو پہچان لو۔''

پھر اس نے ایک خوبرو شخص کی تصویر دکھا کر کہا تھا۔ ''یہ میں ہوں۔ ابھی چند گھنٹوں کے بعد تم اسے دیکھو گی۔ محبوب علی چانڈیو وفات پانے جا رہا ہے۔ اس کا نام امیر دانش علی ہے۔ میں تمہاری نئی زندگی کا ہم سفر رہوں گا۔''

محبوب ابھی اس کا کوئی نہیں تھا اور وہاں بھی فی الحال کوئی رشتہ قائم ہونے والا نہیں تھا۔ آگے نہ جانے کب تک ایسے ہم سفر بن کر رہنے والے تھے۔ جو نہر کے دو کنارے بن کر ساتھ ساتھ چلنے والے تھے، دور سے ایک دوسرے کا ہاتھ بھی پکڑنے والے نہیں تھے۔

بہر حال دن گزر گیا۔ شام ڈھل گئی۔ ان کی زندگی ان کی دنیا بدل گئی۔ وہ سہ طرفہ آئینے کے سامنے ایک دوسرے کے روبرو آئے اس نے پوچھا۔ ''مجھے پہچان رہی ہو؟ میں امیر دانش علی ہوں۔''

وہ بولی۔ ''گزرے ہوئے وقت کی دہلیز سے محبوب صاحب کی آواز اور لہجہ سنائی دے رہا ہے۔''

''مجھے بھی گمشدہ ماروی کی رس بھری آواز اور بچھڑا ہوا لہجہ سنائی دے رہا ہے۔ لیکن تم اب وہ ماروی نہیں ہو۔ میں نے جو قانونی کاغذات بنوائے ہیں اور تمہارا جو شناختی کارڈ اور پاسپورٹ بن رہا ہے، اس میں تمہارا نام امیر ماروی ہے۔''

اس نے پوچھا۔ ''یہ امیر ماروی کچھ عجیب سا نام لگتا ہے۔''
وہ بولا۔ ''نام عجیب ہے لیکن میرے لیے خوب صورت ہے۔ میں نے اپنے موجودہ نام امیر دانش علی کی نسبت سے تمہارا نام امیر ماروی رکھا ہے۔''
اس نے سر جھکا کر اعتراض کیا۔ ''آپ نے اپنا نام میرے نام سے جوڑ دیا۔ مجھ سے پوچھنا چاہیے تھا۔''
وہ بڑی اپنایت سے بولا۔ ''ایک طویل مدت سے تمہارے لیے جو دیوانگی ہے، وہ تم سے پوچھ کر نہیں ہوئی ہے۔ جذبے ہمارے اندر پوچھ کر نہیں آتے۔ یہ آپ ہی آپ پنپتے ہیں۔ میں آج تک تمہیں اپنے نام نہ کر سکا۔ تمہارا نام تو اپنے نام کے ساتھ رکھ سکتا ہوں۔''
وہ سوچتی ہوئی وہاں سے باہر آ کر کار کی اگلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ وہ محبوب کو اپنی طرف مائل ہونے سے بھی نہ روک سکی تھی۔ محبت تو میٹھا جذبہ ہے۔ ٹھنڈی چھاؤں ہے۔ یہ انسانی فطرت ہے۔ یہ سوچ کر اچھا لگتا ہے کہ کوئی ہمیں دل و جان سے چاہتا ہے۔ وہ بظاہر انکار کرتی رہے، بباطن اس کی چاہت اچھی لگتی رہی تھی۔
اس پر بڑا اعتماد تھا۔ یہ دیکھتی آئی تھی کہ وہ اخلاقی حدود میں رہتا ہے۔ اس نے کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا تھا۔ وہ ڈنر کے لیے ایک ریسٹورنٹ میں آ گئے۔ اب تو کہیں بھی ساتھ ہی آنا جانا تھا اور کھانا پینا تھا۔ وہاں کھانے کے دوران میں ماروی محتاط انداز میں گفتگو کرتی رہی اور محبوب اپنی عادت کے مطابق بڑے پیار سے بولتا رہا۔ وہ اس کی پیار بھری دیوانہ وار عادت کو خوب سمجھتی تھی۔
وہ کھانے کے بعد ایک لگژری اپارٹمنٹ میں آ گئے۔ محبوب نے کہا۔ ''یہ کرائے کا نہیں ہے۔ ہمارا ہے۔ یہاں میری کچھ جائداد اور ایک پرسنل بینک اکاؤنٹ ایسا ہے جس کے بارے میں کبیرا اور معروف صاحب نہیں جانتے۔''
وہ تھکے ہوئے انداز میں ایک صوفے پر بیٹھ کر بولی۔ ''میں نے پہلے ہی آپ سے کہہ دیا تھا کہ ہمارے درمیان فاصلہ رہے گا۔ میں ایک چھت کے نیچے نہیں رہوں گی۔''
''تم جو چاہو گی، وہی ہوگا۔ میری رہائش کی اور بھی جگہ ہے۔ اس اپارٹمنٹ کے دوسرے پورشن میں ایک کرائے دار رہتا ہے۔''
وہ پریشان ہو کر بولی۔ ''میں ڈسٹرب ہوتی رہوں گی۔''
''ڈونٹ وری۔ وہ تمہیں نظر بھی نہیں آئے گا۔''
وہ ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''یہ دونوں پورشنز کا درمیانی دروازہ ہے۔ تم اسے یہاں سے مقفل رکھو گی۔ وہ ایک فیکٹری میں کام کرتا ہے۔ اپارٹمنٹ کے پچھلے دروازے سے آتا جاتا ہے۔ تم اس کی آواز بھی نہیں سن سکو گی۔ پھر یہ کہ تمہیں یہاں مستقل نہیں رہنا ہے۔ میں کوشش کر رہا ہوں۔ تمہیں کسی مسلم گھرانے کا فیملی ممبر بناؤں گا۔ تمہاری تنہائی ختم ہو جائے گی۔ تم کسی شک و شبہے کے بغیر وہاں رہو گی۔''
وہ گھڑی دیکھتے ہوئے بولا۔ ''گیارہ بج رہے ہیں۔ تم نے ایک لمبا سفر کیا ہے۔ سرجری کے مرحلے سے گزر کر آئی ہو۔ یقیناً تھک گئی ہو۔ آرام کرو۔ میں جا رہا ہوں۔ ایک ذرا پریشان نہ ہونا۔ فون پر برابر رابطہ رہے گا۔''
وہ اس کے ساتھ باتیں کرتا ہوا باہر دروازے پر آ کر بولا۔ ''میرا خیال ہے، اب سے پہلے تم نے کبھی تنہا کہیں رات نہیں گزاری ہے؟''
''ہاں۔ پہلی بار ایک انجانے ملک میں تنہا رات گزاروں گی۔ چاچی بہت یاد آئیں گی۔ مجھے حوصلے سے رہنا ہوگا۔ میں آیتیں پڑھتے پڑھتے سو جاؤں گی۔''
''ویسے میں تم سے دور نہیں رہوں گا۔ ایک کال کرو گی تو دس پندرہ منٹ میں پہنچ جاؤں گا۔''
اس نے تسلیاں دیں۔ ماروی نے دروازے کو اندر سے بند کر لیا۔ وہ چند لمحوں تک بند دروازے کو دیکھتا رہا، پھر سیڑھیاں اتر کر اس اپارٹمنٹ کے دائیں طرف سے گزر کر پچھلے دروازے پر آ گیا۔ پھر جیب سے چابی نکال کر دروازہ کھول کر اسی اپارٹمنٹ کے دوسرے پورشن میں آ گیا۔
وہ دیارِ غیر میں ماروی کو تنہا چھوڑ کر دور نہیں جانا چاہتا تھا۔ اسی لیے قریب رہنے کی یہ تدبیر کی تھی۔ وہ دبے قدموں چلتا ہوا اس درمیانی دروازے تک آیا جس کے دوسری طرف جانِ محبوب سانسیں لے رہی تھی۔
قسمت مہربان ہو گئی ہے۔ یہ غیر معمولی خوش نصیبی تھی کہ آئندہ کوئی ماروی کو دیکھ نہ پاتا اور وہ دن رات اسے دیکھتا رہتا۔ وہ اپنے بیڈ روم میں قدِ آدم آئینے کے سامنے آ کر رک گئی تھی اور اپنے روبرو ایک اجنبی دوشیزہ کو دیکھ رہی تھی۔ وہ خود اپنے سامنے نہیں تھی۔ لاکھ آئینے بدلتی، تب بھی اپنے آپ کو دیکھ نہ پاتی۔
وہ اپنے چہرے کی قاتل تھی۔ ان لمحات میں صدمہ محسوس ہوا۔ اس نے ماروی جیسی من موہنی صورت والی کو مار ڈالا تھا اور وہ مراد کو الزام دے رہی تھی۔ اس ہرجائی نے اسے ایسی خودکشی پر مجبور کیا تھا کہ وہ ان لمحات میں مر کر بھی زندہ تھی۔

وہ بیڈ پر آ کر چاروں شانے چت ہو گئی۔ تھکن سے نڈھال ہو گئی تھی۔ بہت دور سے آئی تھی اور آگے بہت دور جانا تھا۔ اس کی آنکھ لگ گئی۔

اس نے خواب میں دیکھا۔ وہ تیز دھوپ میں ننگے پاؤں چل رہی تھی۔ آسمان پر مراد ایک جلتے ہوئے سورج کی طرح آگ برسا رہا تھا اور پاؤں میں چھالے پڑ رہے تھے۔

وہ جلتی دھوپ میں پسینا پسینا ہو رہی تھی۔ تھک ہار کر گرتی پڑتی ٹھنڈی چھاؤں میں آ گئی تھی۔ وہ گھنا درخت محبوب تھا۔ اسے سایہ دے رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔ ''سائے سے جب بھی نکلو گی، دھوپ میں جلو گی۔ لہٰذا میرے سائے میں رہو اور میرے نام ہو جاؤ۔''

وہ بولی۔ ''میں ایک سے دھوکا کھا کر دوسرے کی پناہ میں آ کر پھر دھوکا نہیں کھاؤں گی۔ میں تنہا زندگی گزار لوں گی۔''

''کوئی عورت تنہا پاک دامن رہ کر محفوظ زندگی نہیں گزار سکتی۔ گناہوں سے بچنے کے لیے میرے سائے میں منکوحہ بن کر رہنا لازم ہو گیا ہے۔''

نئی ماروی کے لیے دین داری اور دیانت داری سے پاک دامن رہنے کا یہی ایک راستہ تھا۔ ایسے وقت اس نے بابا صلاح الدین اجمیری کو دیکھا۔ اب سے پہلے بھی ایک بار خواب میں انہیں دیکھ چکی تھی۔

انہوں نے پوچھا۔ ''کیا سوچ کر گھر سے اور مراد کی زندگی سے نکلی ہو؟ میری بچی۔۔۔! محبوب کے ساتھ کتنے دنوں تک نیک نیتی سے نیک نام رہ سکو گی؟ جوان عورتوں اور مردوں کو ہمارا دین تنہا رہنے کی اجازت نہیں دیتا۔ جلد سے جلد شادی کا حکم دیتا ہے۔ تمہاری بہتری اور پاک دامنی اسی میں ہے کہ مراد سے خلع لو اور محبوب کے نکاح میں آ جاؤ۔ آگے شیطان ہے۔ گناہوں کی دلدل میں لے جائے گا۔ شیطان مردود کے خلاف اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتی رہو۔''

پٹ سے آنکھ کھل گئی۔ وہ پہلے چند لمحوں تک غائب دماغ رہی۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ کہاں ہے؟

پھر یاد آیا کہ اپنے گھر میں اپنے وطن میں نہیں ہے۔ اس وقت لندن کے ایک اپارٹمنٹ میں ہے۔ جو محرم ہے، اس سے دور ہو گئی ہے اور جو نامحرم ہے، اس کی پناہ میں آ گئی ہے۔

اسے خواب یاد آ رہا تھا۔ اور وہ تسلیم کر رہی تھی کہ آئندہ وہ محبوب کے ساتھ رہے یا نہ رہے، تنہا عورت کبھی نیک نامی سے زندگی گزار ہی نہیں سکتی۔ ایک جوان اور شاداب بدن پر ایک مجازی خدا کے نام کی تختی لگانی ہی پڑتی ہے۔

وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اپنے نئے چہرے کو چھونے لگی۔ اس نے مراد کی ماروی کو مار ڈالا تھا۔ اس لیے واپس نہیں جا سکتی تھی۔ نئی ماروی کی زندگی تقاضا کر رہی تھی کہ اسے محبوب کا ہاتھ تھامنا ہی ہوگا۔

☆☆☆

مراد حویلی کے بیڈ روم میں گہری نیند سو رہا تھا۔ دوسری صبح دس بجے مرینہ سے اس کا نکاح پڑھایا جانے والا تھا۔ عشا کی نماز کے بعد اس کا دل یقین سے بھر گیا تھا کہ نہ توقع کے مطابق اور نہ توقع کے خلاف کوئی رکاوٹ پیش نہیں آئے گی۔

وہ سو رہا تھا اور خواب نگر میں تھا۔ خود کو دیکھ رہا تھا کہ پہاڑ کی چوٹی پر پہنچنے کے لیے قدم قدم چڑھتا ہے پھر توازن کھو کر نیچے آ جاتا ہے۔ ایسا بار بار ہو رہا تھا۔

وہ تھک کر ایک بڑے سے پتھر پر بیٹھ گیا تھا۔ اس کے سامنے مرینہ، میڈونا اور توری ہاتھ باندھے کھڑی تھیں۔ پھر خواب کا منظر بدل گیا۔ اس نے دیکھا کہ وہ ایک کشتی پر سوار ہے۔ دوسری کشتی قریب آتی ہے۔ وہ دوسری پر بھی سوار ہونا چاہتا ہے۔ ایک پاؤں اس پر اور دوسرا پاؤں اس پر رکھتا ہے اور نتیجہ وہی ہوتا ہے۔ دونوں کشتیاں ایک دوسرے سے دور ہوتی ہیں، وہ پانی میں گر پڑتا ہے۔

اسے بابا اجمیری کی آواز سنائی دیتی ہے۔ ''تمہاری تقدیر میں ایک ہی ہے۔ دوسری نہیں ہے۔''

اس نے التجا کی۔ ''میں دوسری بھی چاہتا ہوں۔ میرے لیے دعا کریں۔''

وہ کہتے ہیں۔ ''ایک کشتی چھوڑو گے تو دوسری پر بیٹھ سکو گے لہٰذا دوسری چاہتے ہو تو پہلی کو چھوڑ دو۔''

''بابا صاحب! پہلی میری جان ہے۔ میری زندگی ہے۔''

''نہ وہ تمہاری جان ہے نہ زندگی ہے۔ محض ایک ضد ہے کہ وہ دوسرے کے ہاتھ نہ لگے۔ اسے اپنی ملکیت بنا کر ظلم نہ کرو۔ نمازیں پڑھتے ہو۔ خدا سے ڈرو۔ اسے آزاد کر دو۔ اس کے بعد ہی دوسری بار شادی کر سکو گے۔''

''میں اس پر ظلم نہیں کروں گا۔ اسے آزاد کر دوں گا لیکن بعد میں اس کے لیے تڑپتا رہوں گا۔''

''کیا ایسی کوئی صورت ہو سکتی ہے کہ میں پھر اسے اپنی زندگی میں واپس لا سکوں؟''

وہ کہتے ہیں۔ ''واپس لا سکو گے۔''

اس نے اطمینان کی سانس لی۔ ''خدا کا شکر ہے پھر تو میں اسے اس کی مرضی پر چھوڑ دوں گا۔ وہ جہاں رہے، جس

طرح بھی رہے، ایک دن واپس آجائے گی۔''
''جب تم واپسی کا پیغام دو گے تب وہ آئے گی۔ خود کبھی نہیں آئے گی۔ یاد رکھو۔ وہ گم رہے گی۔ تمہیں نظر نہیں آئے گی۔ تم اس کا پتا ٹھکانا معلوم نہیں کر سکو گے۔''
''یا خدا......! پھر میں واپسی کا پیغام کہاں پہنچاؤں گا؟''
''کوئی نہیں جان سکے گا کہ وہ کہاں ہے؟ تم کسی فرد کے ذریعے، ریڈیو، ٹی وی اور اخبارات کے ذریعے بھی پیغام دو گے تو ناکامی ہوگی۔''
''بابا صاحب! میری مدد فرمائیں۔ مجھے راستہ دکھائیں۔''
''تمہارا پیغام صرف ہوا کے ذریعے وہاں تک پہنچے گا اور مدتوں بعد پہنچے گا۔ اس کے آگے اور کچھ نہیں کہوں گا۔''
وہ اچانک ہی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ مراد کی آنکھیں کھل گئیں۔ وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ گہری سنجیدگی سے خواب کی ایک ایک بات یاد کرنے لگا۔ فجر کی اذان ہونے والی تھی۔ وہ اٹھ کر واش روم میں چلا گیا۔ اسے خواب میں بابا اجمیری کے ذریعے راہنمائی ملی تھی۔ وہ پہلی بیوی کو طلاق دے کر ہی دوسری کو لاسکتا تھا۔
دل نہیں چاہتا تھا کہ بچپن کی محبت سے منہ پھیر لے لیکن گناہوں سے بچنے کے لیے دوسری شادی لازمی ہو گئی تھی۔ وہ دل کو سمجھا رہا تھا کہ طلاق دینے کے بعد وہ پھر بھی اسے حاصل کر سکے گا۔ وہ ہمیشہ کے لیے اس کی زندگی سے نہیں جائے گی۔
اس نے فجر کی نماز ادا کی۔ اپنے رب سے دعائیں مانگنے لگا۔ مصلّے پر بیٹھ کر یہی سمجھ میں آرہا تھا کہ فی الحال خود کو گناہوں سے بچائے۔ مرینہ سے نکاح پڑھوائے لیکن اس سے پہلے ماروی کو طلاق دے۔
وہ لاپتا ہو گئی تھی۔ لہٰذا چاچی وغیرہ کے ذریعے طلاق کے الفاظ ماروی تک پہنچا سکتا تھا۔ وہ فون اٹھا کر نمبر پنچ کرنے لگا۔
ادھر منی چاچی کا صدمے سے برا حال تھا۔ بشریٰ اور بلے نے ائرپورٹ سے واپس آکر چاچی کو بتایا تھا کہ ماروی کس طرح رازداری سے ان سب کو چھوڑ کر گئی ہے۔
چاچی کے دل پر گھونسا لگا تھا۔ جسے دودھ پلایا تھا، بچپن سے جس کی پرورش کی تھی، وہ بے مروّت ہو کر ایک بوڑھی کی ممتا کو نظرانداز کر کے چلی گئی تھی۔
وہ اپنے تکیے کے نیچے چاچی کے نام خط چھوڑ کر گئی تھی۔ خط پڑھ کر معلوم ہوا کہ بینک کی تمام رقم وہ بیڈ کے میٹرس کے نیچے رکھ کر خالی ہاتھ گئی ہے۔ وہ فکر میں مبتلا کر گئی تھی کہ تنہا لندن تک کیسے جائے گی اور کسی سہارے کے بغیر وہاں زندگی کیسے گزارے گی؟
بشریٰ نے کہا۔ ''دو دن پہلے محبوب یہاں سے گیا ہے۔ ان دونوں نے پوری پلاننگ کے بعد ہی اس ملک کو اور اپنے رشتے داروں کو چھوڑا ہے۔''
بلے نے کہا۔ ''چاچی! آپ ماروی کی فکر نہ کریں۔ وہاں محبوب اس کے پاؤں میں کانٹا بھی چبھنے نہیں دے گا۔''
منی کو قدرے اطمینان حاصل ہوا۔ اس نے کہا۔ ''اگر وہ محبوب کے ساتھ چھپ کر رہنے گئی ہے تو میں خوش ہوں۔ وہ میری بچی کو جان سے زیادہ چاہتا ہے۔ اسے پھول کی طرح رکھے گا۔''
چاچا نے کہا۔ ''یہ ہماری بیٹی نے بڑی عقل مندی کی ہے۔ مراد کو ٹھکرا کر گئی ہے۔ اس کم بخت نے اب تک اسے دکھ اور پریشانیوں کے سوا کچھ نہیں دیا تھا۔''
بشریٰ نے کہا۔ ''چاچی! ہم بھی یہاں سے جانے والے ہیں۔ کیا آپ دونوں یہیں کراچی میں رہیں گے؟''
''بیٹی! اور کہاں جائیں گے؟ پہلے ایک بار رہنے کے لیے مراد کے بیٹے کی زمینوں پر گئے تھے۔ اب ادھر نہیں جائیں گے۔ مراد کے اس بیٹے سے بھی کوئی تعلق نہیں رکھیں گے۔''
دوسری صبح مراد نے فجر کی نماز کے بعد چاچی کے فون پر رابطہ کیا پھر کہا۔ ''چاچی! میں مراد بول رہا ہوں۔''
وہ نفرت سے بولی۔ ''میری معصوم بچی کو گھر سے بے گھر کر کے مجھے چاچی نہ بول۔ وہ تجھ پر تھوک کر چلی گئی ہے۔ آئندہ ہمیں کبھی فون نہ کرنا۔''
''نہیں کروں گا۔ غصہ نہ دکھاؤ۔ میں نے اسے طلاق دینے کے لیے فون کیا ہے۔''
''تو اسے طلاق دے کر بہت بڑا احسان کرے گا لیکن وہ یہاں نہیں ہے۔''
''جانتا ہوں۔ آخر محبوب نے اسے پھانس ہی لیا ہے۔''
''محبوب کو بُرا نہ بول۔ اپنے گریبان میں جھانک۔ تو نے اس کا دل ایسا توڑا ہے کہ وہ مجھ سے بھی چھپ کر چلی گئی ہے۔ شاید کسی وقت فون کرے گی تو تیرے طلاق کے الفاظ اسے سنا دوں گی۔ اب جا۔ دفع ہو جا۔''
چاچی نے رابطہ ختم کر دیا۔ وہ اپنے فون کو دیکھتے ہوئے سوچنے لگا۔ 'ماروی نے میری زبان سے طلاق نہیں سنی ہے۔ کیا ایسے میں طلاق ہو گئی ہے؟ اور پتا نہیں وہ چاچی کو کب کال کرے گی اور کب اسے معلوم ہوگا اور ابھی چار

گھنٹے بعد نکاح خوانی ہے۔ اس سے پہلے ہی پہلی بیوی کو میری زندگی سے نکل جانا چاہیے۔'

وہ تھوڑی دیر تک سوچتا رہا۔ پھر اس نے سمیرا کے نمبر پنچ کیے اور فون کو کان سے لگایا۔ دوسری طرف بیل جارہی تھی۔ وہ اٹینڈ نہیں کررہی تھی۔ شاید وہ سورہی تھی۔ فون تھوڑی دیر تک چیختے رہنے کے بعد چپ ہوگیا۔

اس نے سوچا۔ مرینہ کو یہ خبر سنادے کہ وہ ماروی کے لیے اپنی زبان سے تین بار طلاق کہہ چکا ہے۔ یہ محض خبر نہیں ہوگی۔ مرینہ کے لیے حیرت انگیز خوش خبری ہوگی۔

مرینہ اس حویلی میں عورتوں کے ساتھ تھی۔ فی الحال اس سے پردہ کررہی تھی۔ اس نے اس سے رابطہ کرنے کے لیے فون کو اٹھایا تو وہ کالنگ ٹون سنانے لگا۔ سمیرا کال کررہی تھی۔

اس نے بٹن دبا کر اسے کان سے لگا کر کہا۔ ''ہیلو سمیرا......؟''

وہ بولی۔ ''میں واش روم میں تھی۔ خیریت تو ہے۔ اتنی صبح کال کررہے ہو؟''

''خیریت کیا ہوگی۔ میں ماروی کو طلاق دے چکا ہوں۔''

وہ شدید حیرانی سے بولی۔ ''یہ کیا کہہ رہے ہو؟ کیوں تم نے طلاق دی ہے؟ کیوں مجھے نقصان پہنچانا چاہتے ہو؟ وہ تمہاری زندگی سے نکل کر سیدھی محبوب کے پاس جائے گی۔''

''کیا تم نہیں جانتیں؟ وہ اس کے پاس چلی گئی ہے۔ اسی لیے اسے طلاق دی ہے۔''

سمیرا کے دماغ میں ہتھوڑا سا لگا۔ وہ یکبارگی اچھل کر چیختی ہوئی بولی۔ ''کیا کہہ رہے ہو؟ کیا وہ لندن گئی ہے؟''

''جہاں محبوب ہے، وہاں گئی ہے۔ کراچی میں اب نہیں ہے۔ میرا اس سے کوئی رابطہ نہیں ہے۔ میں چاہتا ہوں' تم میرے طلاق کے الفاظ ماروی اور محبوب تک پہنچادو۔''

وہ ہذیانی انداز میں چیختی ہوئی بولی۔ ''لعنت ہے تم پر... تم نے اسے طلاق دے کر مجھ سے دشمنی کی ہے۔ اسے میری سوکن بننے کے لیے آزاد کردیا ہے۔ اسی لیے وہ ادھر بھاگی ہے۔ آئی ہیٹ یو آل۔ تم پر ہزار بار لعنت ہو۔''

وہ بولتے بولتے رو پڑی۔ غصے اور صدمے سے کانپ رہی تھی۔ فون پر معروف تجلی سے رابطہ کررہی تھی۔ تصور میں ماروی کو اپنے شوہر کی آغوش میں دیکھ رہی تھی۔ اسے گالیاں دے رہی تھی۔

معروف تجلی کی آواز سنائی دی۔ ''ہیلو سمیرا!''

وہ بدستور چیختے ہوئے بولی۔ ''میں لٹ گئی ہوں۔ برباد ہوگئی ہوں۔ میں مرجاؤں گی۔''

معروف نے گھبرا کر پوچھا۔ ''کیا ہوگیا ہے؟ تم خیریت سے نہیں ہو۔ کیوں چیخ رہی ہو؟''

وہ روتے ہوئے بولی۔ ''مراد نے ماروی کو طلاق دے دی ہے۔ وہ محبوب کے پاس لندن چلی گئی ہے۔ معروف صاحب! میں کیا کروں؟ وہ سوکن بن کر آنے والی ہے۔''

''پلیز کام ڈاؤن سمیرا......! جو ہورہا ہے، اسے تم روک نہیں سکو گی۔ محبوب پہلے ہی کہہ چکا تھا کہ کسی دن ماروی کو تمہاری سوکن بنائے گا اور تم راضی ہوگئی تھیں۔ اب کیوں غصے سے پاگل ہورہی ہو؟ پلیز شاور کے نیچے جاؤ اور دماغ کو ٹھنڈا کرو۔ یہ سمجھ لو کہ اب وہ روپوش نہیں رہے گا۔ اپنی ضد پوری کرچکا ہے۔ وہ جلد ہی ماروی کو لے کر یہاں آئے گا۔ میں ابھی آرہا ہوں۔''

اس نے فون بند کردیا۔ مراد نے گھڑی دیکھی۔ ساڑھے تین گھنٹے بعد نکاح پڑھایا جانے والا تھا۔ کسی طرح کی رکاوٹ سے بچنے کے لیے ضروری تھا کہ پہلی بیوی کو طلاق ہوجائے۔ لیکن دینی احکامات کے مطابق اسے تحریری طلاق ماروی تک پہنچانی تھی۔

چونکہ وہ لاپتا تھی اور شوہر کی اجازت کے بغیر اپنا گھر اپنا ملک چھوڑ کر ایک نامحرم کے ساتھ رہنے گئی تھی اور بدچلن ثابت ہورہی تھی۔ لہٰذا اس کی لاعلمی میں شوہر کی طرف سے طلاق ہوسکتی تھی۔

اس کے لیے بھی لازمی تھا کہ وہ طلاق کی درخواست عدالت میں داخل کرائے۔ پھر جب بھی ماروی کا پتا ٹھکانا معلوم ہوتا تو وہ عدالتی کارروائی کے نتیجے میں مطلقہ ہوجاتی۔

بڑی الجھنیں تھیں۔ وہ ایک مفرور مجرم تھا۔ مراد علی منگی کے نام سے ماروی کو طلاق دینے کی درخواست عدالت میں پہنچانے کی حماقت نہیں کرسکتا تھا اور نکاح خوانی سے پہلے یہ یقین ہوجانا چاہیے تھا کہ طلاق ہوگئی ہے۔ پہلی بیوی زندگی سے نکل گئی ہے اور وہ بابا اجمیری کی پیش گوئی کے مطابق مرینہ کو اپنی منکوحہ بنالے گا۔

وہ بے چینی سے ٹہلنے لگا۔ سوچنے لگا۔ اس پیچیدہ مسئلے نے اسے بری طرح الجھا دیا تھا۔ پھر یہ بات ذہن میں آئی کہ ماسٹر کو بو بو سے مدد لینی ہی ہوگی۔

اس نے فون پر اسے مخاطب کیا۔ اپنے موجودہ حالات بتائے پھر کہا۔ ''آپ سن سٹی میں ہمارے کسی دینی عالم سے ابھی ملاقات کریں اور ان کے ذریعے ماروی کی طلاق کی درخواست وہاں عدالت میں پہنچائیں۔ میں ابھی

فون پر میسج کے ذریعے طلاق کی درخواست بھیج رہا ہوں۔ یہ کام دو گھنٹے کے اندر ہو جائے۔ ورنہ مرینہ سے نکاح خوانی میں پھر رکاوٹ پیدا ہوگی۔''

اس نے اسی وقت تفصیل سے طلاق کی درخواست لکھ کر SEND کر دی۔ ماسٹر خوش تھا کہ مراد کے لیے پرابلم بنی رہنے والی ماروی سے نجات مل رہی تھی۔ اس نے بڑی گرم جوشی دکھا کر دو گھنٹے کے اندر طلاق نامہ وہاں کی عدالت میں داخل کرا دیا۔

نوری کی خودکشی ناکام رہی تھی۔ ڈاکٹر اسے زندگی کی طرف واپس لے آئے تھے۔ حویلی میں پھر پہلی جیسی چہل پہل دکھائی دے رہی تھی۔ مراد نے مرینہ سے فون پر کہا۔ ''ایک گھنٹے بعد تم میری منکوحہ بن جاؤ گی۔ اس بار یقین سے کہتا ہوں کہ کوئی رکاوٹ پیش نہیں آئے گی۔''

اس نے پوچھا۔ ''تم یقین سے کیسے کہہ سکتے ہو؟''

مراد نے اسے خواب سنایا۔ بابا اجمیری کا بھی ذکر کیا اور کہا۔ ''ان کی پیش گوئی یہ تھی کہ میں ایک بیوی کی موجودگی میں دوسری شادی نہیں کر سکوں گا۔ لہٰذا تمہیں اپنی منکوحہ اس طرح بنا سکتا ہوں کہ پہلی بیوی کو چھوڑ دوں۔''

وہ حیرانی سے سن رہی تھی۔ مراد کہہ رہا تھا۔ ''یہی ایک راستہ رہ گیا ہے۔ وہ میری زندگی میں نہیں رہے گی تو تم کسی رکاوٹ کے بغیر میری شریکِ حیات بن جاؤ گی۔''

''اور میں تو کیا دنیا جانتی ہے کہ تم ماروی کو نہیں چھوڑو گے۔''

''چھوڑ دیا ہے۔''

اس نے بے یقینی سے پوچھا۔ ''کیا...؟ تم کیا کہہ رہے ہو؟''

''میں نے اسے طلاق دے دی ہے۔''

وہ شدید حیرانی سے اچھل پڑی۔ ''مراد! مذاق نہ کرو۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ تم اپنے تن سے جان نکال کر پھینک دو۔''

''میں سچ کہہ رہا ہوں۔ ابھی جب نکاح خوانی کامیاب رہے گی، تب ہی تمہیں یقین ہوگا کہ ماروی میری زندگی سے نکل گئی ہے اور تب ہی تقدیر نے تمہارے آنے کے لیے دروازہ کھولا ہے۔''

''مراد! میں سن رہی ہوں اور یقین نہیں ہو رہا ہے اور فخر بھی کر رہی ہوں کہ تم نے مجھے ماروی سے زیادہ اہم بنا دیا ہے۔ جو کبھی نہیں ہو سکتا تھا، وہ میرے لیے کر رہے ہو۔ اوہ گاڈ...! یہ کتنی بڑی بات ہے کہ میرے لیے اسے چھوڑ رہے ہو۔ میں تو تمام عمر تمہارے پاؤں دھو دھو کر پیتی رہوں گی۔''

عبداللہ کبڈی شادی میں شریک ہونے آ گیا تھا۔ مراد کے پاس بیٹھا اس کی باتیں سن رہا تھا۔ اس نے بھی حیرانی سے پوچھا۔ ''کیا واقعی تم نے ماروی کو آزاد کر دیا ہے؟''

وہ بڑے دکھ سے بولا۔ ''ہاں میرے دوست! میری زندگی میں کوئی دوسری عورت نہیں آ رہی تھی۔ پیش گوئی کے مطابق میں دوسری شادی کبھی نہیں کر سکتا تھا۔ ایسا کرنے کے لیے پہلی بیوی کو چھوڑنا لازم ہو گیا تھا۔ دو ماہ کا عرصہ گزر رہا ہے۔ جوان عورتیں میری تنہائی میں آ کر میری پارسائی کو چیلنج کر رہی ہیں۔ میں گناہ سے بچنے کے لیے مجبوراً ماروی سے دستبردار ہو چکا ہوں۔''

''میں تمہارے تمام حالات کو دیکھتا اور سمجھتا آ رہا ہوں لیکن ماروی لاپتا ہے۔ تم کس طرح اس کے پاس طلاق نامہ پہنچاؤ گے؟''

''میں سن سٹی کی عدالت میں طلاق نامہ داخل کرا چکا ہوں۔ اپنی طرف سے قانونی کارروائی کر چکا ہوں۔ کل تک منی چاچی، محبوب اور سمیرا کے پوسٹل ایڈریس پر وہ طلاق نامہ پہنچ جائے گا۔ ماروی روپوشی ترک کر کے جب بھی منظر عام پر آئے گی، اسے میری دی ہوئی تحریری طلاق مل جائے گی اور ویسے بھی اسے طلاق نامہ ملے یا نہ ملے۔ شوہر کی اجازت کے بغیر گھر چھوڑنے والی اور کسی نامحرم کے ساتھ رہنے والی کی پارسائی مشکوک ہو گئی ہے۔ وہ اپنے شوہر کے لیے ناقابلِ قبول ہو چکی ہے۔''

قاضی احمد اور دوسرے کئی رشتے داروں نے مرینہ کے پاس آ کر نکاح قبول کرایا۔ بڑی بھاگ دوڑ اور ناکامیوں کے بعد خدا خدا کر کے تقدیر مہربان ہو گئی۔ اس نے نکاح قبول کیا تو کوئی رکاوٹ پیش نہیں آئی۔

یہ قدرت کے عجیب تماشے ہوتے ہیں، جو حیران کر دیتے ہیں۔ اس نے تین بار قبول ہے کہہ کر اطمینان اور خوشی کی سانس لی۔ پھر نکاح نامے پر دستخط کیے۔ اس کے بعد وہ نکاح نامہ مراد کے پاس پہنچا۔ اس نے بھی کسی روک ٹوک کے بغیر ''قبول ہے'' کہا اور نکاح کے کاغذات پر دستخط کر دیے۔

اس طرح یقین کی حد تک یہ اندازہ ہوا کہ ماروی کو طلاق ہو گئی ہے۔ وہ مراد کی زندگی سے نکل گئی ہے۔ تب ہی مرینہ شریکِ حیات بن گئی ہے۔

مرینہ کے حوالے سے سوچا جائے تو اس نے بھی مراد سے دل کی مرادیں پانے کے لیے محبت کی انتہا کر دی تھی۔

اس نے حالات کے مطابق کبھی پھول کھلائے تھے۔ کبھی بندوق کے زور پر اسے حاصل کرنا چاہا تھا اور اب تقدیر سے لڑتے رہنے کے بعد خود کو اس کے نام کر لیا تھا۔

اب ان دونوں پر کوئی شبہ نہیں کر سکتا تھا کہ وہ خطرناک فائٹر اور شوٹر، مطلوب اور مفرور مجرم ہیں۔ وہ ٹھوس ثبوت اور گواہوں کے درمیان قاضی احمد کے فیملی ممبر بن گئے تھے۔ انہوں نے دوسرے ہی دن کہہ دیا تھا کہ وہ ہنی مون کے لیے یورپ جائیں گے۔

پولیس افسر جمال شاہ نے بنت عمارہ (مرینہ) کے پاسپورٹ اور دیگر اہم کاغذات ایک ہفتے کے اندر حاصل کر لیے۔ مرینہ نے کہا۔ ”مراد! تم ہتھیار پھینک کر ایک پرامن شہری کی طرح پاکستان میں رہنا چاہتے تھے۔ اب کیا ارادہ ہے؟“

وہ بولا۔ ”ارادہ نیک ہے۔ جرائم کی دنیا میں جھوٹ اور فریب لازمی ہے اور میری نمازوں کا تقاضا ہے کہ سچائی اور دیانت داری سے زندگی گزاروں۔ ہم انشاء اللہ پاکستان میں رہیں گے لیکن پہلے لندن جائیں گے۔“

”یعنی ماروی کا پیچھا نہیں چھوڑو گے؟“

وہ خلا میں تکنے لگا۔ وہ نظر آنے لگی۔ مرینہ نے اس کی گردن میں بانہیں ڈال کر کہا۔ ”مراد......! زندگی کی کتاب سے وہ باب ختم ہو گیا ہے۔ پلیز اسے پھر سے شروع نہ کرو۔“

وہ ماروی کو دیکھ رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔ ”وہ گزرا ہوا وقت نہیں ہے۔ واپس آ جائے گی۔ وہ میری محبت بھی ہے۔ میری ضد اور انا بھی ہے۔ میں اسے پرائی ہونے نہیں دوں گا۔ وہ میری ہے۔ پھر سے اپنے نام کروں گا۔“

”تم پہلے اس کے بغیر رہنے کا عزم کرو۔ میں تمہیں پیار محبت، وفاداری اور توجہ دینے کی حد کر دوں گی۔ تمہیں کسی اور جھمیلے میں نہیں پڑنا چاہیے۔ ہم پیار بھری پرسکون زندگی گزاریں گے۔“

”زندگی ہمیشہ پرسکون نہیں رہتی۔ اکثر ہلچل پیدا ہوتی رہتی ہے۔ ہم نہ چاہیں، تب بھی کوئی بیماری لگ جاتی ہے۔ آرام اور سکون غارت ہو جاتا ہے۔ محبت ایک ایسی بیماری ہے جو قبر تک پیچھا نہیں چھوڑتی۔ میں اس کی یادوں سے اس کی طلب سے پیچھا نہیں چھڑا سکوں گا۔“

مرینہ نے دل ہی دل میں کہا۔ ”میں پیچھا چھڑاؤں گی۔ پہلے وہ مجھے تمہاری زندگی میں آنے نہیں دیتی تھی۔ اب میں اسے نہیں آنے دوں گی۔ تم مجھے مجبور کر رہے ہو۔ سو ایک ماروی کو اس دنیا سے اٹھانا ہی ہوگا۔“

مراد نے کہا۔ ''تم میری شریکِ حیات بن چکی ہو۔ تمہاری اہمیت برقرار رہے گی۔ پلیز مجھ سے تعاون کرو۔ اسے واپس لانے پر اعتراض نہ کرو اور نہ ہی اس کے کسی معاملے میں مخالفت کرو۔''

''مخالفت نہیں کروں گی لیکن میرے حقوق اسے نہ دو۔ میری تنہائی میں اسے یاد نہ کرو۔''

''رات کی تنہائی تمہارے لیے ہے۔ دن کی تنہائی میں اس کی باتیں کرو۔ اسے تلاش کرنے کے سلسلے میں میرا ساتھ دیتی رہو۔''

''اسے کہاں تلاش کرو گے؟ لندن کوئی چھوٹا شہر نہیں ہے۔ میری عقل کہتی ہے، محبوب نے تمہیں اندھا بنانے کے لیے ماروی کا چہرہ بدل دیا ہوگا اور شاید اب لندن میں بھی نہیں ہوگا۔ دنیا بہت بڑی ہے۔ اسے ڈھونڈنے کہاں کہاں جاؤ گے؟ بدلی ہوئی صورت اور شخصیت کو کیسے پہچانو گے؟''

وہ سر ہلا کر بولا۔ ''ہاں مشکلات پیش آئیں گی۔ اس کا کہیں نام و نشان نہیں ہوگا۔ پھر بھی ڈھونڈتا رہوں گا۔ میں نے خواب دیکھا تھا۔ بابا اجمیری نے بشارت دی ہے کہ وہ ملے گی۔ ایک طویل مدت کے بعد ملے گی۔''

''پھر یہ بھی بتایا ہوگا کہ کہاں ملے گی؟''

اس نے انکار میں سر ہلایا، پھر کہا۔ ''وہ عجیب سی باتیں کر رہے تھے کہ نہ میں خود پہنچ سکوں گا، نہ کوئی مجھے اس کے پاس پہنچائے گا۔ میں اخباروں، رسالوں، ریڈیو اور ٹی وی کے ذریعے بھی اسے آواز نہیں دے سکوں گا۔''

''تعجب ہے۔ پھر وہ کیسے ملے گی؟''

وہ ان کی باتیں یاد کرتے ہوئے بولا۔ ''وہ کہہ رہے تھے کہ میرے ایک تحریری پیغام کے ذریعے ملے گی۔''

مرینہ نے تعجب سے پوچھا۔ ''تمہارا تحریری پیغام اس کے پاس کیسے پہنچے گا؟ جبکہ تم نہیں جانتے کہ وہ کہاں ہے؟ اور وہ کہیں نامعلوم مدت تک روپوش رہے گی۔''

وہ سوچتے ہوئے بولا۔ ''بابا صاحب نے زیادہ بات نہیں کی۔ صرف اتنا کہا کہ وہ تحریری پیغام صرف ہوا کے ذریعے وہاں تک جائے گا۔''

''ہوا......؟'' اس نے حیرانی سے پوچھا۔ ''ریڈیو اور ٹی وی ہوا کے ذریعے ہر سو آواز یا پیغام پہنچاتے ہیں۔ لیکن بابا صاحب نے کہا ہے کہ تم ان کے ذریعے اسے بلا نہیں سکو گے۔''

''ہاں، وہ ایک پیچیدہ مسئلے میں الجھا کر چپ ہو گئے تھے۔ میرے خواب سے اوجھل ہو گئے تھے۔ صرف ریڈیو اور ٹی وی ہی ایسے ذرائع ہیں جو میرے تحریری پیغام کو پہنچا سکیں گے۔ تحریر ڈاک کے ذریعے بھی جا سکتی ہے۔ لیکن ماروی کا کوئی پتا ٹھکانا نہیں ہے۔''

''پھر تمہارا پیغام ہوا کے ذریعے کیسے جائے گا؟''

''ابھی تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔ ویسے میں ریڈیو اور ٹی وی کے ذریعے اسے پکارتا رہوں گا۔''

''وہ تم سے دور ہو جانے والی اور محبوب کی آغوش میں چھپنے والی اور زیادہ محتاط ہو جائے گی۔ وہ اور محبوب دونوں ہی گونگے بہرے ہو جائیں گے۔ بابا صاحب نے درست کہا ہے۔ تمہیں ان ذرائع سے بھی کامیابی حاصل نہیں ہوگی۔''

وہ پریشان تھا۔ مٹھیاں بھینچ کر بولا۔ ''پھر بھی ایسے تمام ذرائع کو آزماتا رہوں گا۔''

بابا اجمیری کی یہ بات دماغ میں پھنس گئی تھی کہ صرف ہوا ہی اس کا تحریری پیغام ماروی تک پہنچائے گی۔

لیکن ہوا کیسے پہنچائے گی؟ کیا پیغام ہوائی جہاز میں اُڑتا ہوا جائے گا؟ یا کبوتر خط لے جائے گا؟ پتا ٹھکانا نامعلوم ہے۔ کوئی ہوا میں اُڑتا ہوا نہیں جائے گا۔

پھر کیا ہوگا؟

ڈاکٹر ممی سن نے فون پر مرینہ کو مخاطب کیا۔ ''ہیلو مائی ہیلن! میں تمہیں فون پر بھی مرینہ نہیں کہوں گا۔ کوئی دشمن کہیں سے سن سکتا ہے۔ تم صورت اور سراپا سے میری وائف ہو اور دل کے رشتے سے میرے بیٹے مراد کی وائف اور میری بہو ہو۔ پہلے تو شادی خانہ آبادی مبارک ہو تمہیں...''

وہ مسکرا کر بولی۔ ''تھینک یو ڈیڈ! میں بھی مراد کی طرح آپ کو ڈیڈ کہا کروں گی۔''

وہ بولا۔ ''رشتہ تو یہی ڈیڈ کا رکھو۔ لیکن سامنے آ کر ڈیڈ کہو گی تو یوں لگے گا میری ہیلن رشتہ بدل رہی ہے۔ ایک وعدہ کرو۔ روبرو آ کر مجھے ممی کہا کرو گی۔ ہیلن مجھے یہی کہا کرتی تھی۔''

مرینہ نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''اچھی بات ہے۔ جب بھی سامنا ہوگا تو میں آپ کو ہیلن ہی دکھائی دوں گی۔ آل رائٹ ممی! میں تمہیں ممی کہا کروں گی۔''

وہ خوش ہو کر بولا۔ ''تم نے وعدہ کیا تھا کہ میرے ساتھ لنچ کرو گی۔''

''ضرور کروں گی لیکن اب تو میں شوہر والی ہو گئی ہوں۔ اپنے مراد کے ساتھ آؤں گی۔''

''اوہ...... میں ہیلن کے ساتھ تنہا لنچ کرنا چاہتا

ہوں۔ کہاں ہے مراد؟ اس سے بات کراؤ۔''

مراد کی آواز سنائی دی۔ ''ہائے ڈیڈ! آپ اپنی ہیلن کو جہاں چاہیں لے جائیں۔ لیکن یہاں قاضی احمد کا دینی گھریلو ماحول ہے۔ یہاں کی خواتین اپنے شوہروں کے ساتھ باہر جاتی آتی ہیں۔ عمارہ (مرینہ) میرے ساتھ اس حویلی سے نکلے گی۔ میں اسے تاج محل ہوٹل میں چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔ پھر آپ فون کریں گے تو آ کر اسے لے جاؤں گا۔''

مرینہ اور مراد اس بوڑھے ڈاکٹر کی دلی کیفیات کو سمجھ رہے تھے۔ اگر وہ مرینہ کے چہرے میں اپنی وائف کا چہرہ دیکھتے ہوئے اس کے ساتھ کچھ وقت گزارنا چاہتا تھا تو اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ اس کی ہیلن پر یعنی مرینہ پر نیت میلی ہو جائے گی۔

ڈاکٹر ٹینی سن اپنے بیٹے ایمان علی کی طرح عیاش اور ہوس پرست نہیں تھا۔ اس کی بس اتنی سی خواہش تھی کہ گمشدہ ہیلن کے ساتھ تھوڑا سا وقت گزار کر ماضی کی یادوں کو تازہ کرلے۔

ہوٹل تاج محل میں ان تینوں نے ملاقات کی۔ ڈاکٹر نے ہیلن کو بڑی چاہت سے دیکھا۔ پھر اس نے مرینہ اور مراد کو شادی کے تحائف پیش کیے۔ مراد نے کہا۔ ''ابھی لنچ کا وقت ہے۔ آپ اپنی ہیلن کو ڈنر تک ساتھ رکھ سکتے ہیں۔ میں لندن جانے کے سلسلے میں مصروف ہوں۔ آفیسر جمال شاہ میرے اور مرینہ کے تمام اہم قانونی کاغذات تیار کرا چکا ہے۔ میں ابھی اس پولیس افسر کے ساتھ رہوں گا۔''

وہ چلا گیا۔ مرینہ نے بوڑھے ڈاکٹر کے ساتھ کھانے کی میز پر آ کر مسکراتے ہوئے پوچھا۔ ''ہائے ٹینی! میرے ساتھ کیسا لگ رہا ہے؟ میں تمہاری ہیلن ہوں نا؟''

اس نے جیسے دل کی آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ہیلن کے چہرے سے نظریں ہٹنا نہیں چاہتیں۔ میں تمہیں دیکھ رہا ہوں اور مجھے خواب سا لگ رہا ہے۔''

''میں چاہتی ہوں۔ مجھے دیکھتے رہو اور ماضی میں پہنچتے رہو۔ کم آن، اپنی ہیلن کو گزری ہوئی کوئی بات یاد دلاؤ۔''

اس نے ویٹر کو کھانے کا آرڈر دیا پھر کہا۔ ''پہلی ملاقات کبھی بھلائی نہیں جاتی۔ وہ مجھے آج بھی یاد ہے۔''

وہ اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ ''ہائے میں کیسی ہیلن ہوں، کیسی محبوبہ ہوں۔ میں تو بھول گئی۔ پلیز مجھے یاد دلاؤ۔ پہلی ملاقات کہاں ہوئی تھی؟ کیسے ہوئی تھی؟''

اس نے کہا۔ ''ان دنوں میں اپنی بوڑھی والدہ اور بھائی بہنوں کے ساتھ پرانی دلی میں تھا۔ بہت ہی سیدھا سادہ سا جوان تھا۔ لڑکیوں کے سامنے میری نظریں جھک جاتی تھیں۔ کتابیں میری محبوبائیں تھیں۔ ایک روز کالج سے واپس آیا تو محلے کی عورتیں، بچے اور بوڑھے پریشان تھے۔ معلوم ہوا کہ پڑوسی کی چھت پر بکری چڑھ گئی ہے۔ اسے نیچے اتارنا مشکل ہو رہا تھا۔ ایک سیڑھی لا کر لگائی گئی تھی۔ اسے اتارنے سے پہلے وہ سیڑھی ٹوٹ گئی تھی۔ پرانی دلی میں مکانات ایک دوسرے سے جڑے ہوئے تھے۔ تنگ گلیاں تھیں۔ ان دنوں پڑوسی کے گھر مہمان آئے ہوئے تھے۔ معلوم ہوا کہ ان کی بکری چھت پر چڑھی ہے۔ مہمان خاتون چھت کی طرف دیکھتی ہوئی کہہ رہی تھی۔ ''آ جا بیٹی! نیچے آ جا۔ ماں کو پریشان نہ کر۔''

دوسری خاتون نے کہا۔ ''تم نے اسے بیٹی کہہ کر سر پر چڑھایا ہے۔ آج چھت پر چڑھ گئی ہے۔ کل آسمان پر چڑھے گی۔''

بوڑھے مہمان نے کہا۔ ''اسے بیٹی نہ کہو۔ بکری کہو۔ اسے اپنی اوقات میں رہنے دو۔ آج ناشتے میں انڈے پراٹھے نہیں ملے تو غصہ دکھانے کے لیے چھت پر جا کر بیٹھ گئی ہے۔''

میں ان کی باتیں سن کر حیران ہو رہا تھا۔ بکری انڈے اور پراٹھے کھاتی تھی۔ نہ ملنے پر ناراضی دکھانا بھی جانتی تھی۔ میں نے خاتون سے پوچھا۔ ''بکری اور کیا کھاتی ہے؟''

خاتون نے کہا۔ ''ہمارا سر کھاتی ہے۔ دیکھ تو رہے ہو۔ کیسے نخرے دکھا رہی ہے۔''

وہ کبھی محبت سے اور کبھی غصے سے اسے بلا رہے تھے۔ یہ نہیں سوچ رہے تھے کہ آخر بکری ہے۔ ان کی زبان نہیں سمجھتی ہوگی۔ میں نے ٹوٹی ہوئی سیڑھی کو اچھی طرح رسیوں سے باندھ کر کہا۔ ''میں نیچے لے آتا ہوں۔''

میں سیڑھی چڑھ کر اوپر آیا۔ وہاں ایک چھوٹے سے کمرے کی چار دیواری تھی۔ وہ دیوار کے سائے میں بیٹھی تھی۔ میں اسے دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ وہاں تم بیٹھی ہوئی تھیں۔''

مرینہ نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''اچھا تو وہاں ہیلن تھی۔''

''ہاں میں بکری کو دیکھنے گیا تھا وہاں ایسی حسین دوشیزہ کو دیکھ کر تھوڑی دیر تک دیکھتا رہ گیا۔ ہیلن نے یعنی تم نے پوچھا۔ ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟''

میں نے پوچھا۔ ''وہ... وہ بکری کہاں ہے؟''

تم نے ہاتھ نچا کر کہا۔ ''سامنے دکھائی نہیں دے رہی ہے۔''

میں نے حیرانی سے پوچھا۔ ''تم بکری ہو؟''

''ماما اور پاپا مجھے پیار سے بکری کہتے ہیں۔''
میں نے تعجب سے پوچھا۔ ''اتنی حسین دوشیزہ کو بکری کیوں کہتے ہیں؟''
تم نے کہا۔ ''میں بچپن سے میں، میں کرتی آئی ہوں۔ میں ایسی ہوں، میں ویسی ہوں۔ میں یہ کھاؤں گی، میں وہ نہیں کھاؤں گی میری جیسی کوئی نہیں ہے۔''
میں نے کانوں پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''بس بس سمجھ میں آگیا۔ تمہاری میں، میں سن کر سب ہی تمہیں بکری کہیں گے۔ بائی داوے تمہارا نام کیا ہے؟''
''ہیلن......!'' تم نے فخر سے کہا۔ ''ہیلن آف ٹرائے سے زیادہ خوب صورت ہوں۔''
''یہ ہماری پہلی ملاقات تھی۔ تم بہت مغرور تھیں لیکن مجھ سے دوستی ہوگئی۔ دوستی پھر محبت میں بدل گئی۔''
مرینہ نے مسکرا کر کہا۔ ''پھر میں محبوبہ سے بیوی بن گئی۔ ہماری پہلی ملاقات بہت ہی خوب صورت اور دلچسپ تھی۔ تم نے ماضی کی ایک جھلک دکھائی ہے۔ میں انجوائے کر رہی ہوں۔''

وہ دونوں کھا رہے تھے اور بول رہے تھے۔ ایسے وقت ایمان علی نے باپ کو فون پر مخاطب کیا۔ ''ڈیڈ! میں ممبئی سے آگیا ہوں۔ آپ یہاں نہیں ہیں۔ مجھے بھوک لگی ہے۔ میں گھر میں سامان رکھ کر لنچ کے لیے جا رہا ہوں۔''
وہ مرینہ کو دیکھتے ہوئے چہک کر بولا۔ ''بیٹے! میں بہت عرصے بعد دل کھول کر لائف انجوائے کر رہا ہوں۔ ابھی ہوٹل تاج محل میں ہوں۔ یہاں لنچ کے لیے آجاؤ۔ تمہیں بہت ہی چونکا دینے والا سرپرائز دوں گا۔''
وہ بولا۔ ''آپ کی باتوں سے اور لہجے سے پتا چل رہا ہے کہ بہت خوش ہیں۔ میں ابھی آرہا ہوں۔''
ڈاکٹر نے فون بند کر کے کہا۔ ''ہیلن! ہمارا بیٹا آرہا ہے۔ تمہیں دیکھ کر حیران رہ جائے گا۔''
وہ ہنستے ہوئے بولی۔ ''یہ اچھی تفریح ہے لیکن اسے معلوم نہ ہو کہ تم نے مجھ کو اور مراد کو نئے چہروں کے پیچھے چھپا دیا ہے۔''

''نہ میں نے اسے بتایا ہے، نہ کبھی بتاؤں گا۔ میری دعائیں تم دونوں کے ساتھ ہیں۔ تم دونوں کو جرائم سے پاک زندگی گزارتے دیکھ کر سب سے زیادہ خوشی مجھے ملتی رہے گی۔''
ایمان علی کار ڈرائیو کرتا ہوا ہوٹل کی طرف آرہا تھا۔ اس کے چہرے پر سنجیدگی تھی۔ میڈونا کی بے وفائی کے باعث اس کے اندر رفتہ رفتہ تبدیلی آرہی تھی۔

یہ بات دل اور دماغ کو لگنے لگی تھی کہ وہ بھی بے وفا اور بے مروّت ہے۔ جب کوئی محبت کا فریب دے کر ٹھکراتا ہے تو دل پر کیسی چوٹ لگتی ہے۔ یہ میڈونا نے اسے ٹھکرا کر سمجھا دیا تھا۔
وہ نہیں چاہتا تھا کہ آئندہ پھر کبھی کوئی حسینہ اس کی انسلٹ کرے۔ اس کا یہی ایک راستہ تھا کہ رنگیلا راجہ بن کر رہنے سے باز آجائے۔ کسی ایک سے وفا کرے۔ اسے صدقِ دل سے شریکِ حیات بنائے اور اپنے ڈیڈی کی خواہش کے مطابق اپنی نسل آگے بڑھاتا رہے۔
اب وہ سنجیدگی سے اس جستجو میں تھا کہ کسی شریف خاندان سے تعلق رکھنے والی کوئی شریف زادی پسند آئے تو اسے اپنی شریکِ حیات بنائے۔
وہ ہوٹل کے سامنے کار سے اتر کر اندر آیا۔ وہاں سے سیدھا ڈائننگ ہال میں پہنچا۔ دروازے پر پہنچتے ہی وہ اپنی ماں کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ بڑی حیرانی سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا۔ یقین نہیں آرہا تھا کہ اس کے بوڑھے ڈیڈی اس کی جوان مام کے ساتھ لنچ میں مصروف ہیں۔
دونوں ہنس بول رہے تھے۔ انہوں نے اسے نہیں دیکھا تھا اور وہ مردہ ماں کو زندہ دیکھ رہا تھا۔ حیرانی یہ تھی کہ ماں کو جوانی کی ابتدائی عمر میں دیکھ رہا تھا۔
اس کے ذہن میں جو سب سے پہلی بات آئی، وہ یہ تھی' کیا ڈیڈ نے کسی لڑکی پر پلاسٹک سرجری کا کمال دکھایا ہے؟ کیا اسے مام کی ہم شکل بنا کر اس سے شادی کرنا چاہتے ہیں؟
وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا ان کے قریب آکر کھڑا ہوگیا۔ ڈاکٹر نے مسکرا کر کہا۔ ''آگیا میرا بیٹا! یہ دیکھو۔ یہ ہے سرپرائز...''
اس نے مرینہ کی طرف اشارہ کیا۔ ایمان علی نے کہا۔ ''میرے لیے کوئی سرپرائز نہیں ہے۔ یہ تو میرے ڈیڈ کا بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ کسی کی بھی صورت اور شخصیت بدل دیتے ہیں۔''
باپ نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''تم کیا سمجھ رہے ہو، ان کے چہرے کو میں نے تبدیل کیا ہے؟ نہیں بیٹے! یہ پیدائشی چہرہ ہے۔ ان کا نام بنت عمارہ ہے۔ ان کے ہزبینڈ کا نام جان محمد ہے۔''
ایمان علی نے حیرانی اور بے یقینی سے مرینہ کو دیکھا۔ وہ مسکرا کر بولی۔ ''ہائے مسٹر ایمان! پہلے تو تمہارے ڈیڈ مجھے دیکھ کر حیران ہوئے تھے۔ اب تم ہو رہے ہو۔ پہلے تو مجھے بھی یقین نہیں آیا تھا کہ میں ان کی آنجہانی وائف کی ہم شکل

ہوں۔ اب تمہاری حیرانی سے یقین ہو رہا ہے۔ آؤ بیٹھو، ہمیں کمپنی دو۔''

وہ ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ وہ بولی۔ ''مسٹر ممنی سن کہہ رہے ہیں کہ ان کی البم میں تمہاری مام کی درجنوں تصویریں ہیں۔ میں کسی دن ضرور آکر دیکھوں گی۔''

وہ مرینہ کو بڑی توجہ سے دیکھ رہا تھا۔ یہ وہی تھی جس سے تل ابیب میں روبرو ملاقات کرتے ہی گولی کھا کر اسپتال پہنچ گیا تھا۔ یہ اس کے باپ کا کمال تھا کہ بیٹا اسے پہچان نہیں پا رہا تھا۔

مرینہ اس کی طرف کھانے کی ڈشیں بڑھا رہی تھی۔ وہ اس کے ہاتھوں سے لے رہا تھا۔ اسے دیکھتا جا رہا تھا اور نئی الجھنوں میں گرفتار ہو رہا تھا۔

الجھنیں یہ تھیں کہ ہیلن بہت ہی حسین اور پرکشش تھی۔ اس کی حسن پرستی کو جھنجوڑ رہی تھی۔ لیکن وہ صورت، وہ خوب صورتی اس کی ماں کی تھی۔

اس کی عاشق مزاجی نے کہا۔ ماں کی شکل ہے۔ ماں تو نہیں ہے۔ گاڈ بلیس مائی مام۔ بیس برس پہلے اس دنیا سے جا چکی ہیں۔ اب ان کی کوئی ہم شکل آئے گی تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوگا کہ میری مام واپس آگئی ہیں۔

دوسری الجھن یہ تھی کہ میں کیوں پھسل رہا ہوں۔ کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ یہ شادی شدہ ہے۔ بھوکی پیاسی ہوتی تو اپنی طرف مائل کر لیتا۔ پھر بھی کیا اس سے دوستی ہو سکتی ہے؟ ہو سکتا ہے یہ فلرٹ کرنے والی ہو۔ شوہر کے علاوہ پارٹ ٹائم عشق کرتی ہو۔

مرینہ نے مسکرا کر کہا۔ ''بہت خاموش ہو۔ کیا بہت کم بولتے ہو؟ یا میرے بارے میں خاموشی سے سوچ رہے ہو؟''

ڈاکٹر نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''عمارہ! یہ بچپن ہی سے تمہارے اس چہرے کا دیوانہ ہے۔ جب یہ پانچ یا چھ برس کا تھا۔ تب اپنی مام سے کہتا تھا، تم بہت سوئٹ ہو۔ میں تم سے شادی کروں گا اور ہم اس کی باتوں پر ہنستے تھے۔''

یہ انکشاف ہو رہا تھا کہ وہ بچپن سے اس چہرے کا دیوانہ ہے۔ لیکن ایک معصوم بچے کی دیوانگی ماں کے لیے تھی اور یہ..... یہ تو نہ ماں تھی اور نہ ہو سکتی تھی۔

ابھی ماضی کی کسی ہیلن کے لیے نہیں، حال کی عمارہ کے لیے دل میں گڑبڑ ہو رہی تھی۔ اس نے پوچھا۔ ''تم تنہا ہو؟ تمہارے ہزبینڈ کہاں ہیں؟''

وہ بولی۔ ''ہم ہنی مون کے لیے سوئٹزرلینڈ جانے والے ہیں۔ جان محمد اس سلسلے میں مصروف ہیں۔''

اس نے پوچھا۔ ''ڈیڈ! آپ انہیں کب سے جانتے ہیں؟''

''بیٹے! آج ہی ابھی اسی ہوٹل میں عمارہ کو دیکھ کر حیران ہوا تھا۔ میں نے اپنا تعارف کرانے کے بعد اسے لنچ کی دعوت دی تو اس نے قبول کر لی۔ میں عمارہ کا شکر گزار ہوں۔''

مرینہ نے کہا۔ ''جب سے تم نے ہوش سنبھالا ہے، اپنی ماں کی تصویریں دیکھتے آئے ہو۔ آج اچانک اس ماں کو اپنے قریب متحرک بولتے ہوئے دیکھ رہے ہو۔ اس وقت تمہارے احساسات اور جذبات کیا ہیں؟''

اس نے کہا۔ ''میں حیرانی سے دیکھ رہا ہوں کہ ان تصویروں میں جان پڑ گئی ہے۔ مرنے والے لوٹ کر نہیں آتے۔ لیکن مام آگئی ہیں۔ ابھی اپنے شوہر اور بیٹے کے پاس ہیں اور اب ہمیشہ رہیں گی۔ دل کہہ رہا ہے، ہمیں اب چھوڑ کے نہ جاؤ۔''

''میں تم سے بھی کم عمر ہوں۔ اٹھارہ برس کی لگتی ہوں۔ کیا مجھے مام کہو گے؟''

''نہیں۔ تمہاری صورت مام کی ہے لیکن میرا کوئی پیدائشی تعلق تم سے نہیں ہے۔ اگر تم شادی شدہ نہ ہوتیں تو میں تمہیں پرپوز کرتا۔ تمہیں اپنی شریکِ حیات بنا لیتا۔''

باپ اپنے بیٹے کی بات پر مسکرانے لگا۔ مرینہ نے کہا۔ ''ایسا ممکن نہیں ہے۔ لیکن فرض کرو، میں تمہاری شریکِ حیات بن جاتی ہوں، تب کیا ہوگا؟ کیا ایسا نہیں لگے گا کہ اپنی ماں کے ساتھ.....''

''ہرگز نہیں۔ دل اور دماغ میں یہ حقیقت نقش ہے کہ مام نابود ہو چکی ہیں۔ اگر میری شریکِ حیات بن جاؤ تو یہ رشتہ کسی پہلو سے غلط نہیں ہوگا بلکہ بہت ہی دلچسپ اور دیرپا ہوگا۔''

ڈاکٹر نے کہا۔ ''بیٹے! جو ہو نہیں سکتا، اسے نظر انداز کرو۔ میں بھی اپنی شریکِ حیات کو اپنے سامنے دیکھ رہا ہوں اور سمجھ رہا ہوں کہ سامنے سراسر فریب ہے۔ یہ ہیلن بہت ہی کمسن ہے اور میری بیٹی ہے۔''

وہ بولا۔ ''نہ آپ کی بیٹی ہے نہ میری بہن ہے۔ ایک آئیڈیل ہے۔ دل دکھانے آئی ہے۔ سوری عمارہ! میں تمہارے قریب رہوں گا تو ایکسائٹڈ ہوتا رہوں گا۔''

وہ کھانا چھوڑ کر نیپکن سے منہ پونچھ کر اٹھ گیا۔ ''مجھے جانا چاہیے۔ میں نہیں جانتا کہ مام کی ہم شکل آئندہ کتنے عرصے تک مجھے HAUNT کرتی رہے گی۔''

وہ کوئی جواب سنے بغیر وہاں سے پلٹ کر چلا گیا۔

ڈاکٹر نے کہا۔ ''میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ اپنی مام کی

ہم شکل کو دیکھ کر اس قدر جذباتی ہو جائے گا۔''
وہ مسکرا کر بولی۔ ''ہم سب جانتے ہیں کہ یہ پلے بوائے عاشق مزاج ہے۔ ابھی کوئی مجھ سے زیادہ حسین اور پُرکشش دوشیزہ فلرٹ کرنے آجائے تو مجھے بھول جائے گا۔''
وہ اس کی عاشق مزاجی اور گمراہی کی باتیں کرنے لگے اور وہ باہر آکر اپنی کار میں بیٹھ گیا تھا۔ بڑے ہی جذباتی انداز میں سوچ رہا تھا۔ 'یہ مام کی ہم شکل کہاں سے پیدا ہو گئی؟ دل اس کی طرف کھنچا جا رہا ہے۔ کیا کروں؟ یہ عمارہ فلرٹ نہیں ہے۔ اس سے لفٹ نہیں ملے گی۔ اب سے پہلے سوچا نہیں تھا کہ مام کے جیسی کوئی لڑکی ملے گی تو سنجیدگی سے دل سے اسے شریکِ حیات بناؤں گا۔ یا خدا...... ! کسی طرح یہ عمارہ میری زندگی میں آجائے۔'
تھوڑی دیر بعد مراد ہوٹل میں آ گیا تھا۔ مرینہ ڈاکٹر سے مصافحہ کر کے رخصت ہو گئی۔ مراد کے ساتھ ہوٹل سے باہر آکر کار میں بیٹھنے لگی تو ایمان علی نے اسے دیکھا۔ وہ مراد کو پہچان نہیں سکتا تھا۔ اس نے اندازہ کیا کہ وہ عمارہ کا شوہر جان محمد ہوگا۔
وہ میاں بیوی وہاں سے جا رہے تھے۔ وہ ان کے پیچھے فاصلہ رکھ کر جانے لگا۔ وہ ہاتھ آنے والی نہیں تھی۔ پھر بھی کھنچا جا رہا تھا۔ جب وہ دونوں حویلی کے سامنے پہنچ کر کار سے اتر کر اندر چلے گئے تو اسے یقین ہوا کہ عمارہ واقعی پیدائشی طور پر اس کی مام کی ہم شکل ہے۔ کسی کی شریکِ حیات ہے اور ایک بہت بڑے خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔
ذہن کے کسی گوشے میں یہ شبہ تھا کہ ڈیڈ نے ان کے چہرے پر کاریگری دکھائی ہے۔ وہ شبہ دور ہو گیا۔ لیکن کشش اور بڑھ گئی۔ اس نے سوچا' پھر کسی وقت ادھر آئے گا اور اسے دیکھے گا۔
وہ مایوس ہو کر گھر آ گیا۔ ڈاکٹر بھی ہوٹل سے آ گیا تھا۔ اس نے کہا۔ ''بیٹے! آج ہم دونوں کے دل و دماغ میں ہلچل سی ہے۔ میں عمارہ سے ملنے کے بعد اسے بھلا نہیں سکوں گا۔ یہ اچھا ہے کہ وہ اپنے شوہر کے ساتھ ہنی مون کے لیے جا رہی ہے۔ کہہ رہی تھی' وہیں لندن میں رہائش اختیار کرے گی۔''
ایمان علی نے ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''ڈیڈ! آپ کہتے ہیں، اب مجھے شادی کر لینی چاہیے۔ آپ پوتی اور پوتے چاہتے ہیں نا......؟''
''ہاں بیٹے! بوڑھے باپ کے لیے کچھ کر سکتے ہو تو جلد سے جلد ایک بہو لے آؤ۔''
''تو پھر اسے لاؤں گا' جو مام جیسی ہو گی۔''
''یہ کیا کہہ رہے ہو؟ وہ شادی شدہ ہے۔''
''میں عمارہ کی بات نہیں کر رہا ہوں لیکن جب سے عمارہ کے وجود میں مام کو چلتے پھرتے اور بولتے دیکھا ہے، تب سے حیران ہوں کہ وہ کس قدر حسین اور جاذبِ نظر تھیں۔ اب وہی صورت ملے گی تو شادی کروں گا۔''
''بیٹے! وہی صورت بار بار تو پیدا نہیں ہو گی۔ تم شادی کی بات ہمیشہ ٹال دیتے ہو۔''
''مام کی صورت آج آجائے، آج شادی کروں گا اور وہ آسکتی ہے۔''
باپ نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ اس نے کہا۔ ''آپ کمال کے کاریگر ہیں۔ مٹی کو سونا بنا دیتے ہیں۔ آپ نے مراد علی منگی کو ایمان علی بنا دیا تھا۔ جب بیٹے کا ہم شکل بنا سکتے ہیں تو اپنی وائف ہیلن کی بھی ایک ہم شکل بنا سکتے ہیں۔''
وہ فوراً ہی بیٹے کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ خوش ہو کر بولا۔ ''تمہارے دماغ میں زبردست خیال آیا ہے۔ اگر تم سے شادی کرنے والی کوئی لڑکی چہرہ بدلنے پر اعتراض نہ کرے تو ہمارے اس ویران سے گھر میں ہیلن آجائے گی۔ میں اپنے ماضی کو دیکھتا رہوں گا۔ تم اپنے حال میں خوش رہو گے۔''
''میں تلاش کروں گا اور انتظار کروں گا۔ مجھے ایسی کوئی چاہنے والی ضرور ملے گی۔''
وہ دونوں ایک دوسرے کو تکتے ہوئے دور تک سوچنے لگے۔ آئندہ ایک ہیلن باپ کی زندگی میں بیوی اور بہو بن کر اور بیٹے کی زندگی میں بیوی اور مام بن کر آنے والی تھی۔

☆☆☆

وقت گزر رہا تھا۔ گزرتا ہوا وقت کسی کو بگاڑتا اور کسی کو بنا جاتا ہے۔ بشریٰ اور بلا' مرینہ اور مراد ماروی اور محبوب سب ہی اپنی بگڑی بنانے کے لیے اپنی اپنی راہ پر چل پڑے تھے۔
تینوں کی الگ الگ راہیں تھیں لیکن منصوبے ایک جیسے تھے۔ تینوں ہی اپنوں سے، بیگانوں سے اور دوستوں سے، دشمنوں سے چھپ رہے تھے۔
تینوں ہی اپنے اپنے چہرے اور اپنی شناخت تبدیل کر چکے تھے۔ بشریٰ اور بلا نے باقی دونوں کی طرح اپنے وطن کو نہیں چھوڑا تھا۔ اسلام آباد میں پلاسٹک سرجری کا ایک ماہر ڈاکٹر چنگیزی بڑی شہرت کا حامل تھا۔ انہوں نے کراچی سے اسلام آباد جا کر ڈاکٹر چنگیزی سے ملاقات کی تھی اور

پوچھا تھا۔ ''کیا چہرے تبدیل کرنے کے بعد رازداری رہے گی؟''

ڈاکٹر چنگیزی نے کہا۔ ''میں سرجری کی فیس صرف پچاس ہزار روپے لیتا ہوں۔ لیکن رازداری کی فیس دو لاکھ روپے سے کم نہیں لیتا۔ اپنا کام دیانت داری سے کرتا ہوں۔''

اس نے کہا۔ ''یہاں پولیس اور انٹیلی جنس والے مفرور مجرموں کو تلاش کرنے آتے ہیں لیکن ان کے سائے کو بھی پہچان نہیں پاتے جنہیں میں تبدیل کر دیتا ہوں۔''

ڈاکٹر نے زیرو پوائنٹ کے قریب ایک بہت بڑا اسپتال قائم کیا تھا۔ وہاں ایک گیسٹ ہاؤس بھی تھا۔ سرجری کرانے والے وہاں دو چار روز قیام کرتے تھے تاکہ ڈاکٹر کے قریب رہا کریں۔ وہ ان کے چہروں کی اسٹڈی کرتا تھا۔ نئے چہروں کی آؤٹ لائن بناتا تھا اور ان سے ان کے ماضی، حال اور مستقبل کی باتیں بھی پوچھتا رہتا تھا۔ یوں ان کی کمزوریوں تک پہنچتا رہتا تھا۔

بشریٰ اور بلّے نے بہت کم عرصے میں جرائم کا سبق اچھی طرح پڑھ لیا تھا۔ انہوں نے سمجھ لیا تھا کہ چنگیزی ان سے کرید کرید کر سوالات کیوں کرتا ہے؟ اور ان کی پرسنل لائف کے بارے میں بہت کچھ جاننا کیوں چاہتا ہے؟ وہ سمجھ گئے تھے کہ جہاں گفتگو ہوتی ہے، وہاں کہیں خفیہ مائیک ہوتے ہیں اور ان کی باتیں ریکارڈ ہوتی رہتی ہیں۔

پھر یہ شبہ ہوا کہ خفیہ کیمرے بھی ہیں۔ ان دونوں کے موجودہ چہروں کی ویڈیو فلمیں بھی بلیک میلنگ کے لیے تیار کی جا رہی ہیں۔ بشریٰ اور بلا بھی ڈاکٹر چنگیزی کے خفیہ معاملات تک پہنچنے کی کوششیں کرنے لگے۔

بشریٰ نے چنگیزی کی ایک بیٹی سے دوستی کی تھی۔ اس کا نام بردا تھا اور وہ کچھ ایب نارمل تھی۔ چنگیزی کے اکلوتے بیٹے پر بلّے کی نظر تھی۔ وہ اس کی کمزوریاں معلوم کر رہا تھا۔

اس کے بیٹے کا نام جواد چنگیزی تھا۔ کسی کے خفیہ معاملات تک پہنچنا آسان نہیں ہوتا اور بلا کم سے کم وقت میں ان باپ بیٹے کے مجرمانہ دھندے کے ٹھوس ثبوت حاصل کر کے انہیں بلیک میل نہیں کر سکتا تھا۔

اس نے اس حد تک معلومات حاصل کی تھیں کہ وہ باپ بیٹے اپنے اسپتال کے علاوہ اور کہاں کہاں وقت گزارتے ہیں۔ لیکن ان کی کوئی بہت بڑی کمزوری معلوم نہیں ہو رہی تھی۔

پہلے دن بلّے کی سرجری ہوئی۔ چنگیزی نے کئی گھنٹوں کی محنت کے بعد اسے ایک خوبرو جوان بنا دیا۔ چنگیزی کے پاس اس خوبرو جوان کی تصویریں کئی زاویوں سے تھیں۔ اس نے سرجری سے پہلے اس کی مختصر سی ہسٹری اسے یہ بتائی تھی کہ اس کا نام سلمان تھا۔ اب سے پچیس برس پہلے جب وہ پچیس برس کا تھا' تب اس کا انتقال ہوا تھا۔

سلمان کے عزیز واقارب یورپ کے ملکوں میں تھے۔ پچیس برس کے طویل عرصے میں سب نے اسے بھلا دیا ہے۔ اگر یہ زندہ ہوتا تو پچاس برس کا بوڑھا ہوتا۔

بلّے نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''میں بھی یورپ کے کسی ملک میں جاؤں گا تو سلمان کے کسی رشتے دار سے سامنا ہو سکتا ہے۔''

چنگیزی نے کہا۔ ''کوئی بات نہیں۔ دنیا میں کتنے ہی لوگ ایک دوسرے کے ہم شکل ہوتے ہیں اور وہ پچیس برس کے بعد بھی پچیس برس کے جوان نہیں رہتے۔ کوئی تم پر سلمان ہونے کا شبہ نہیں کرے گا۔''

دوسرے دن بشریٰ کا چہرہ تبدیل ہو گیا۔ وہ آئینے میں خود کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ''ڈاکٹر! تم نے مجھے بہت ہی حسین بنا دیا ہے۔''

پھر وہ اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ ''ہائے...! اپنے پیدائشی چہرے سے جو محبت اور اپنایت ہوتی ہے، وہ اس چہرے سے کبھی نہیں ہو سکے گی۔ مائی گاڈ...! پتا نہیں کتنے عرصے تک اپنے آپ کو اجنبی سمجھتی رہوں گی۔''

ایسے وقت چنگیزی کا بیٹا جواد آ گیا۔ اس نے کہا۔ ''ڈیڈ نے میری فرمائش پر تمہاری یہ صورت بنائی ہے۔ اس کا نام رمشا تھا۔ میں اسے حاصل کرنا چاہتا تھا لیکن وہ کسی اور کو چاہتی تھی۔ میری انسلٹ کر رہی تھی۔''

بشریٰ نے کہا۔ ''اس میں انسلٹ کی کیا بات ہے۔ رمشا کا دل جس پر آیا تھا' اسے وہ چاہنے لگی تھی۔''

وہ بولا۔ ''جہنم میں جائے اس کی چاہت۔ وہ اپنے یار کو چاہتی رہتی۔ میں تو اس سے یہ کہتا تھا کہ صرف ایک رات کے لیے میرے پاس آ جائے۔''

بشریٰ نے جواد کو نفرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اپنی اس شیطانی خواہش کو بڑے فخر سے بیان کر رہے ہو اور وہ بھی اپنے باپ کے سامنے۔''

وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ''ڈیڈ صرف میرے باپ ہی نہیں' دوست بھی ہیں۔''

چنگیزی نے کہا۔ ''یہ میرا ایک ہی لاڈلا بیٹا ہے۔ میں اس کی ہر اچھی بری خواہش پوری کرتا ہوں۔ تم دوست بن جاؤ۔ رمشا کی طرح نادان دشمن نہ بنو۔''

بشریٰ نے پوچھا۔ ''رمشا کہاں ہے؟''

جواد نے آسمان کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''میں نے اسے اوپر پہنچا دیا ہے۔''

بشریٰ نے حیرانی سے پوچھا۔ ''کیا... اتنی سی بات پر...؟ تمہارے ہاتھ نہ آنے پر تم نے اسے مار ڈالا؟''

وہ بولا۔ ''اس نے مجھے غصہ دلایا تھا۔ وہ صرف انکار کرتی تو برداشت کر لیتا۔ لیکن میں نے ہاتھ پکڑا تو اس نے مجھ پر تھوک دیا تھا۔ ایسی نفرت ایسی ذلت میں بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے اسے قتل کرنے سے پہلے اس کا منہ توڑ دیا تھا۔ میں کیسے برداشت کرتا۔ اس کتیا نے مجھ پر...''

بشریٰ نے زوردار قہقہہ لگایا پھر پوچھا۔ ''اب تم اس لیے آئے ہو کہ میں بھی تم پر تھوک دوں۔''

جواد نے پوچھا۔ ''تم نے ابھی نیا چہرہ، نئی زندگی حاصل کی ہے اور ابھی مرجانا چاہو گی؟''

وہ اپنے بیگ میں ہاتھ ڈال کر سائیلنسر لگا ہوا ریوالور نکال کر اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ کر بولا۔ ''شاید تم نہیں جانتیں، یہ سائیلنسر ہے۔ گولی چلے گی تو باہر تک آواز نہیں جائے گی۔ باہر ویٹنگ روم میں تمہارا شوہر بیٹھا ہے۔ تمہارے بعد اس کی باری آئے گی۔''

وہ سوچنے لگی کہ بلے کو کیسے ہوشیار کیا جائے۔ چنگیزی نے کہا۔ ''تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ تم دونوں میاں بیوی کی پچھلی زندگی کی بہت سی باتیں آڈیو اور ویڈیو کیسٹس میں ریکارڈ ہو چکی ہیں۔ یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ تم دونوں نے کوئی بھیانک جرم کرنے کے بعد اپنے چہرے اور اپنی شناخت تبدیل کرائی ہے۔''

جواد نے کہا۔ ''تم دونوں نے قانون کے خلاف اپنے چہرے اپنی اصلیت چھپائی ہے۔ آئندہ تم دونوں ہمارے رحم و کرم پر رہو گے۔ اگر ہمارے احکامات کی تعمیل نہیں کرو گے تو ہم قانون کے محافظوں کے سامنے تمام آڈیو اور ویڈیو ریکارڈنگ سے تمہاری اصلیت ظاہر کر دیں گے۔ پھر سوچ لو کہ کیا ہوگا۔ تمام عمر آہنی سلاخوں کے پیچھے رہا کرو گے۔''

بشریٰ نے پریشانی ظاہر کرتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا ہمارے خلاف آڈیو اور ویڈیو ریکارڈنگ کی گئی ہے؟ اوہ مائی گاڈ...! مجھے یقین نہیں آرہا ہے۔''

جواد نے فاتحانہ انداز میں اکڑتے ہوئے کہا۔ ''ڈیڈ! آپ وہ آڈیو، ویڈیو لے آئیں۔ ان دونوں کو یہ ثبوت دکھائیں۔ میں اس کے ہزبینڈ کو یہاں بلا کر لاتا ہوں۔''

چنگیزی دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ جواد نے اپنی گن چھپا کر دروازے کو ذرا سا کھول کر ویٹنگ روم میں دیکھا۔ بلا وہاں بیٹھا ایک میگزین کھولے پڑھ رہا تھا۔ جواد نے کہا۔ ''ہیلو مسٹر! اپنی وائف کو آ کر پہچانو۔''

بلا وہاں سے اٹھ کر بشریٰ کے پاس آیا۔ حیرانی سے مسکرا کر بولا۔ ''مائی گاڈ! میری بیوی کہاں گئی۔ یہ تو کوئی اور حسینہ ہے۔''

بلے نے بولتے ہوئے سر گھما کر جواد کو دیکھا پھر ٹھٹک گیا۔ وہ دروازے کو اندر سے بند کر کے ریوالور ہاتھ میں لیے کھڑا تھا۔ پھر اس نے سر گھما کر بشریٰ کو دیکھا۔

وہ بولی۔ ''ہم ڈاکٹر چنگیزی پر بھروسا کر کے بری طرح پھنس گئے ہیں۔ ڈاکٹر اور اس کا یہ بیٹا ثابت کر سکتے ہیں کہ یہ ہمارے اصلی چہرے نہیں ہیں۔ ہم خطرناک مجرم اور قاتل ہیں اور ہم نے اصلی چہرے سرجری کے ذریعے چھپا لیے ہیں۔''

ڈاکٹر چنگیزی دوسرے کمرے سے آڈیو ویڈیو کیسٹس وغیرہ لے آیا۔ اس نے ٹیپ ریکارڈر کے ذریعے بشریٰ اور بلے کی وہ تمام باتیں سنائیں جو وہ پچھلے دنوں چنگیزی سے کرتے رہے تھے۔

انہوں نے چنگیزی سے کہا تھا۔ ''ہم سرجری کا منہ مانگا معاوضہ دیں گے لیکن ہم سے یہ نہ پوچھو کہ ہم چہرے بدل کر کیوں چھپ رہے ہیں۔ یہ ہمارے پرسنل معاملات ہیں۔''

اور چنگیزی نے کہا تھا۔ ''مجھے تمہارے پرسنل معاملات سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میں قانون کے خلاف تم دونوں کے چہرے اور شناخت تبدیل کروں گا۔ اپنا معاوضہ لوں گا۔ پھر تم لوگوں کے جانے کے بعد تمہیں بھول جاؤں گا۔''

ایسی ریکارڈ کی ہوئی گفتگو سے ثابت ہوتا تھا کہ بشریٰ اور بلا قابلِ گرفت مجرم ہیں۔ پھر چنگیزی نے ٹی وی اسکرین پر ویڈیو فلم دکھائی۔ انہوں نے بڑی رازداری سے سرجری کے دوران چہرے کو تبدیل کرتے وقت وہ متحرک فلم شوٹ کی تھی۔ اسکرین پر ان کے اصلی چہرے موجودہ چہروں میں تبدیل ہوتے گئے تھے۔

ان کے خلاف بہت ہی ٹھوس ثبوت تھے۔ چنگیزی نے کہا۔ ''ہر ماہ پچاس ہزار روپے ادا کرتے رہو گے تو قانونی گرفت سے محفوظ رہو گے۔ ہماری پیمنٹ روکو گے تو ہم آسانی سے تم دونوں کو آہنی سلاخوں کے پیچھے پہنچا دیں گے۔''

بشریٰ نے بلے سے کہا۔ ''جواد میرے ساتھ گناہ کا کھیل کھیلنا چاہتا ہے۔ میری موجودہ صورت والی رمشا نے اس کے منہ پر تھوکا تھا۔ اس نے بے چاری رمشا کے ساتھ

بہت بُرا سلوک کرنے کے بعد اسے مار ڈالا تھا۔''

جواد نے کہا۔''ہاں اور آج پھر رمشا میرے سامنے ہے۔ یہ پاگل کی بچی کہتی ہے کہ رمشا کی طرح مجھ پر تھوکے گی اور میں اس کے ساتھ ضرور رات کالی کروں گا۔ ابھی یہاں سے جاؤ۔ کل صبح یہ تمہیں واپس مل جائے گی۔''

بلّے نے اس کے ریوالور کو دیکھ کر سہم کر کہا۔''فار گاڈ سیک! میری شریکِ حیات کے ساتھ کوئی شرمناک حرکت نہ کرو۔ اسے میرے لیے نیک اور پاک دامن رہنے دو۔''

چنگیزی نے سخت لہجے میں کہا۔''زیادہ نہ بولو۔ جاؤ یہاں سے اور کل اسے لینے آؤ تو ماہانہ پیمنٹ کی پہلی قسط پچاس ہزار روپے ضرور لے کر آنا۔''

بشریٰ نے بلّے سے کہا۔''تم انکار نہ کرو۔ نہیں تو یہ گولی ماردیں گے۔ میں تمہاری زندگی چاہتی ہوں۔ مجھے برباد ہوجانے دو۔''

وہ بولا۔''آہ! میری گھر والی میری عزت والی! مجھے بے غیرت بن کر تیری بے عزتی برداشت کرنی ہوگی۔ میں یہاں سے جارہا ہوں۔''

وہ دونوں بانہیں پھیلا کر بولی۔''میرے بے غیرت شوہر! جانے سے پہلے ایک بار مجھے گلے لگاؤ۔ پھر یہاں سے جاؤ۔''

وہ دونوں بڑے ہی جذباتی انداز میں ایک دوسرے کے قریب آئے۔ بشریٰ دونوں بانہیں اس کی گردن میں ڈال کر لپٹ گئی۔ صرف وہ شوہر ہی جانتا تھا کہ بیوی لباس کے اندر کون سا سامان کہاں رکھتی ہے؟

اس نے اندر ہاتھ ڈال کر پستول بے بی ایگل نکال لیا۔ جواد ریوالور لیے تن کر کھڑا تھا۔ کبھی سوچ بھی نہیں سکتا کہ گلے ملنے والوں کے درمیان سے موت نکل رہی ہے۔ اچانک ہی ٹھائیں کی زوردار آواز کے ساتھ اس کے ہاتھ سے ریوالور نکل گیا۔

اس کا ہاتھ زخمی ہوا۔ ابھی وہ سنبھل سکتا تھا۔ اس سے پہلے ہی بشریٰ چھلانگ لگا کر ریوالور کے پاس گر کر اسے اٹھاتی ہوئی لڑھکتی ہوئی اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔

چنگیزی اپنی گن نکال رہا تھا۔ بلّے نے ایک گولی اس کے منہ میں ٹھونک دی۔ وہ گولی دانتوں کو توڑتی ہوئی حلق سے گزرتی ہوئی پیچھے گردن سے باہر نکل گئی۔ وہ لڑکھڑا کر ایک کرسی سے ٹکرا کر فرش پر گر پڑا۔

بشریٰ نے جواد سے پوچھا۔''اے! تو میرے بلّے کی ...'' یہ کہہ کر بشریٰ نے ناف کے نیچے اسے گولی ماردی۔

وہ تکلیف کی شدت سے چیختا ہوا اچھل کر فرش پر گر کر تڑپنے لگا۔ چنگیزی بھی بیٹے کے قریب پڑا لمبی لمبی سانسیں کھینچ رہا تھا۔ گولی حلق سے گزر گئی تھی سانسوں کی خرخراہٹ بتارہی تھی کہ وہ مشکل سے آدھی سانسیں لے پارہا ہے۔

بشریٰ نے دونوں کو نشانے پر رکھا تھا۔ بلّا آڈیو اور ویڈیو کیسٹس کو ضائع کررہا تھا۔ ان کے موجودہ چہرے کی جتنی تصویریں تھیں، انہیں جلا کر راکھ کررہا تھا۔

اس نے دوسرے کمرے میں جاکر الماریوں اور سیف میں دوسروں کو بلیک میل کرنے کے کئی خفیہ ریکارڈز اور فائلیں دیکھیں۔ انہیں بھی نذرِ آتش کردیا۔ یہ اطمینان کرلیا کہ وہ اپنے علاوہ دوسرے نامعلوم افراد کو بھی بلیک میلنگ سے نجات دلا چکا ہے۔ پھر وہ باپ بیٹے کے پاس واپس آگیا۔

جواد کو ایسی جگہ گولی لگی تھی کہ وہ بے ہوش ہوگیا تھا۔ چنگیزی اب تک آدھی سانسیں لے کر جی رہا تھا۔ اس نے نشانہ لے کر کہا۔''کیوں عذاب میں مبتلا ہے؟ دنیا سے جا آرام آجائے گا۔''

اس نے باپ اور بیٹے دونوں کو موت کی نیند سلادیا۔

پھر وہ دونوں مطمئن ہوکر باہر آکر اپنی رینٹڈ کار میں بیٹھ گئے۔ وہاں پولیس اور انٹیلی جنس والے کسی وقت بھی آسکتے تھے لیکن یہ نہیں جان سکتے تھے کہ پلاسٹک سرجری کے ماہر نے اپنی موت سے پہلے تائکوں کی صورتیں بدل دی تھیں۔ آئندہ انہیں کوئی پہچان نہیں سکے گا۔

☆☆☆

لندن میں ایسے کئی بوڑھے افراد ہیں جو اولڈ ہاؤس میں رہتے ہیں یا بڑھاپے میں بھی محنت مزدوری کرکے کسی کا احسان اٹھائے بغیر زندگی کے آخری دن گزارتے رہتے ہیں۔ محبوب نے ایسے افراد کے متعلق معلومات حاصل کیں پھر ایک بزرگ انیس عالم کے پاس پہنچ گیا۔

وہ ایک چھوٹے سے اپارٹمنٹ میں اپنی زوجہ بتول بی بی کے ساتھ رہتے تھے۔ بیٹے نے اپنی کمائی سے وہ اپارٹمنٹ خریدا تھا۔ بہو ایک پوتا دے کر اللہ کو پیاری ہوگئی تھی۔ بیٹا جائداد کے طور پر وہ اپارٹمنٹ دے کر اپنی عمر پوری کرچکا تھا۔ ان کا پوتا دس برس کا تھا۔ اس کی پرورش اور تعلیم کی ذمے داری ان بوڑھوں کے کاندھوں پر آن پڑی تھی۔

وہ پاکستان نہیں جاسکتے تھے۔ وہاں دور کے رشتے دار تھے۔ انہیں اپنا بنا کر گلے لگانے والا کوئی قریبی رشتے دار نہیں تھا۔ روزی کمانے کا مسئلہ جو لندن میں تھا' وہی پاکستان میں تھا۔

یہ مسئلہ اس طرح حل ہو رہا تھا کہ بتول بی بی وہاں مسلمان گھرانوں میں جا کر بچوں کو قرآن مجید پڑھاتی تھیں اور انیس عالم ایک ہوٹل میں پلیٹیں دھونے کا کام کرتے تھے۔ وہ کسی کی محتاجی کے بغیر اس امید پر جی رہے تھے کہ ان کا پوتا جلد ہی جوان ہو کر دادی دادا کا بوجھ اٹھانے کے قابل ہو جائے گا۔

محبوب نے ماروی کے ساتھ اپارٹمنٹ میں آکر ان میاں بیوی سے ملاقات کی اور کہا۔ ''میرا نام امیر دانش علی ہے۔ یہ میری کزن امیر ماروی ہے، ہم پاکستانی ہیں۔ اب یہاں مستقل رہائش اختیار کرنے کا ارادہ ہے۔''

بڑے میاں نے کہا۔ ''میرا نام انیس عالم ہے۔ یہاں اپنی زوجہ اور اپنے پوتے سرفراز عالم کے ساتھ رہتا ہوں۔''

محبوب نے کہا۔ ''معلوم ہوا ہے کہ آپ اپنے اپارٹمنٹ کا ایک پورشن کرائے پر دے رہے ہیں۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو ہم سے معاملات طے کریں۔''

انیس عالم کچھ کہنا چاہتا تھا۔ ایسے ہی وقت بتول بی بی گھبرائی ہوئی آئی۔ اس نے کہا۔ ''سرفراز کو پھر دورہ پڑا ہے۔ فوراً ٹیکسی کو کال کریں۔ اسے اسپتال لے جانا ہوگا۔''

ماروی نے کہا۔ ''ہمارے پاس گاڑی ہے۔ فکر نہ کریں، ہم مریض کو لے چلتے ہیں۔''

انہوں نے دوسرے کمرے میں آکر دیکھا۔ وہ دس برس کا ایک بیمار اور لاغر سا لڑکا تھا۔ تکلیف سے کراہ رہا تھا۔ محبوب نے اسے دونوں بازوؤں میں اٹھا کر اپارٹمنٹ سے باہر لاکر کار کی پچھلی سیٹ پر لٹایا پھر اسے اسپتال کی طرف لے جانے لگا۔

انیس عالم بہت پریشان تھا۔ بچے کی دادی رو رہی تھی۔ ان کا پوتا دل کا مریض تھا۔ دادی اور دادا حسبِ توفیق اس کا علاج کراتے رہتے تھے۔ اسے عارضی طور پر آرام آتا تھا پھر کچھ دنوں میں اس پر دورہ پڑتا تھا۔

ان بوڑھوں کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اپنے پوتے کا علاج کہاں کرائیں۔ معروف اور تجربہ کار ہارٹ اسپیشلسٹ بہت مہنگے تھے۔ وہ غریب ان کی چوکھٹ پر کبھی نہیں جا سکتے تھے۔

انیس عالم نے حیرانی سے دیکھا، محبوب ان کے پوتے کو لندن کے سب سے مہنگے اسپتال میں لے آیا تھا۔ کاؤنٹر پر بڑی رقم ادا کر رہا تھا۔ سرفراز کو ہاتھوں ہاتھ ماہرین تک پہنچایا گیا تھا۔

وہ پریشان ہو کر محبوب سے بولا۔ ''ہم اس اسپتال کا بل ادا نہیں کر سکیں گے۔ آپ نے ابھی کاؤنٹر پر بیس ہزار پاؤنڈز جمع کیے ہیں۔ یہ رقم ہماری اوقات سے باہر ہے۔''

ماروی نے کہا۔ ''آپ رقم کی ادائیگی کی فکر نہ کریں۔ اپنے پوتے کے لیے دعائیں مانگتے رہیں۔ اللہ نے چاہا تو اسے جلد ہی شفا حاصل ہوگی۔''

ایک گھنٹے بعد انہیں وہاں سے میڈیکل رپورٹ ملی۔ سرفراز کے دل میں سوئی کی نوک کے برابر سوراخ تھا۔ اسے مستقل توجہ اور علاج کی ضرورت تھی اور علاج مہنگے اور تجربہ کار ڈاکٹر ہی کر سکتے تھے۔

محبوب نے تسلی دینے کے لیے انیس عالم کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ ماروی نے بتول بی بی کو تھپک کر کہا۔ ''آپ آنسو پونچھ لیں۔ رونے سے بیماری نہیں جائے گی، ہم سرفراز کا علاج کرائیں گے۔''

سرفراز کو مستقل نگہداشت میں رکھنے کے لیے اسپتال میں داخل کیا گیا۔ ان بوڑھوں کو پتا چلا کہ مکمل علاج ہونے تک لاکھوں پاؤنڈز خرچ ہوں گے۔ انیس عالم نے اسپتال کے وزیٹنگ روم میں بیٹھ کر محبوب سے پوچھا۔ ''آپ کون ہیں؟ اچانک ہی رحمت کا فرشتہ بن کر آئے ہیں۔ ہم اتنا بڑا احسان اٹھانا نہیں چاہتے اور اپنے پوتے کو بیمار اور بے یار و مددگار چھوڑ بھی نہیں سکتے۔ ہم آج نہیں تو کل آپ کے لاکھوں پاؤنڈز کیسے ادا کریں گے؟''

محبوب نے کہا۔ ''ہم قرض نہیں دے رہے ہیں۔ کسی لالچ اور طلب کے بغیر بچے کا علاج کرا رہے ہیں۔ اگر آپ ہمارے کام آنا چاہتے ہیں تو میری کزن امیر ماروی کو اپنی بیٹی بنا کر اپنے ساتھ رکھ لیں۔ میں اس کے لیے نامحرم ہوں۔ اس کے ساتھ ایک چھت کے نیچے رہ نہیں سکتا۔''

ماروی نے کہا۔ ''آپ ہمارے لیے کچھ کر سکتے ہیں تو یہی کریں کہ مجھے عزت آبرو سے اپنے ساتھ رہنے دیں۔''

انیس عالم نے پوچھا۔ ''تم دونوں اپنے بارے میں کچھ بتاؤ۔ کس خاندان سے ہو؟ پاکستان میں کہاں رہتے تھے؟''

محبوب نے کہا۔ ''ہماری کچھ مجبوریاں ہیں۔ ہم اپنے بارے میں کچھ نہیں بتا سکیں گے۔ آپ ہم پر اعتماد کریں۔ ہم کسی پہلو سے کوئی غلط کام نہیں کر رہے ہیں۔''

''جو غلط کام نہیں کرتے، وہ سچ بولتے ہیں۔''

محبوب نے کہا۔ ''غلطیاں نہ کرنے والے اور سچ بولنے والے بھی بحالتِ مجبوری سچ کو چھپاتے ہیں۔ ہمارا ایمان ہے کہ ہم سچ کو چھپا کر بھی آپ کو نقصان نہیں پہنچائیں گے۔''

وہ دونوں بوڑھے فکر و پریشانی میں مبتلا ہو گئے۔ ایک دوسرے سے تنہائی میں مشورے کرنے لگے۔ کاتبِ تقدیر

نے یہ لکھ دیا تھا کہ وہ اپنے حالات سے مجبور ہو کر اپنے پوتے کو ایک جان لیوا مرض سے نجات دلانے کے لیے مجبور ہو جائیں گے لہٰذا وہ پوتے کی سلامتی کے لیے راضی ہو گئے۔

بتول بی بی نے کہا۔ "ہمارے پوتے سرفراز سے آٹھ برس پہلے ایک پوتی ہوئی تھی۔ اس کا نام نمرہ عالم رکھا تھا۔ اس کے بعد اور دو اولادیں ہوئیں لیکن دنیا میں نہ رہ سکیں۔ آٹھ برس بعد سرفراز پیدا ہوا تو بہو بھی وفات پا گئی۔"

انیس عالم نے کہا۔ "میری نسل کو آگے بڑھانے والا یہی ایک پوتا رہ گیا ہے۔ تمہاری مہربانی اور دریا دلی سے بہت مہنگا اور کامیاب علاج ہو رہا ہے۔ ہم ساری زندگی امیر ماروی کو اپنی پوتی نمرہ بنا کر رکھیں گے۔"

ان دادی دادا نے بتایا کہ نمرہ کا برتھ سرٹیفکیٹ اور اسکول کے کاغذات ان کے پاس محفوظ ہیں۔ وہ زندہ ہوتی تو اب اٹھارہ برس کی ہوتی اور ماروی اٹھارہ برس کی لگتی تھی، کوئی اسے بائیس برس کی شادی شدہ نہیں کہہ سکتا تھا۔

محبوب نے اس سے کہا۔ "میرا مشورہ ہے، ماروی کا نام مٹا دو۔ نمرہ کے پیدائشی سرٹیفکیٹ اور دیگر کاغذات کے ساتھ ان کی پوتی بن کر رہو گی تو یہاں تمہاری قانونی حیثیت ہوگی اور مراد وغیرہ کو کسی پہلو سے تم پر شبہ نہیں ہوگا۔"

ماروی کو اپنے نام سے بہت محبت تھی۔ اس نے سوچا۔ 'مجھے اپنے پیدائشی چہرے سے بھی فطری لگاؤ تھا۔ میں خود کو آئینے میں دیکھ کر خوش ہوتی تھی۔ میں نے مجبور ہو کر اس چہرے کو مٹا دیا۔ حالات کا تقاضا یہ ہے کہ نام بھی مٹا دوں۔ یہ نام میرے مقدر میں ہوگا تو پھر مجھے کبھی نہ کبھی ملے گا۔'

نام بدل گیا۔ وہ نمرہ عالم بن گئی۔ لندن میں سات دن گزر چکے تھے۔ ان سات دنوں میں محبوب اس سے دور رہنے کے باوجود قریب تھا۔ وہ اپنے بہترین رویوں سے پہلے بھی اسے متاثر کرتا آیا تھا۔ اب اور زیادہ متاثر اس لیے کر رہا تھا کہ ان کے درمیان کوئی تیسرا نہیں تھا۔

مراد اس پر سوکن لا کر اس کی محبت کی اور وفاداری کی نفی کر کے دل سے اتر گیا تھا۔ وہ دل سے اترنے والا اس کی یادوں سے بھی اس لیے خارج ہو گیا تھا کہ محبوب دن رات سامنے آکر اسے اور بھلا دیتا تھا۔

ماروی کے ساتھ مصروفیات ایسی تھیں کہ وقت بے وقت رہائش کا انتظام کرنے کے لیے ایک ساتھ رہنا ضروری ہوتا تھا۔ اب مستقل انتظام ہو گیا تھا۔

اس کے بعد محبوب نے اس کے لیے ایک گورنس کی خدمات حاصل کی تھیں۔ وہ روزانہ چھ گھنٹے ساتھ رہ کر وہاں کے ماحول کے مطابق رہنے سہنے اور بولنے کے آداب سکھاتی تھی۔ ٹیچرز آکر اسے تعلیم دیتے تھے تاکہ اونچی کلاس میں اس کا داخلہ ہو سکے۔

وہ بڑی لگن سے اور بڑی توجہ سے سیکھ رہی تھی۔ یہ قسم کھا چکی تھی کہ ایک نئی ماروی بن کر رہے گی اور وہ دیکھ رہی تھی کہ محبوب اس کے لیے کیا نہیں کر رہا ہے۔ وہ چپکے چپکے تسلیم کر رہی تھی۔ وہ دیوانہ آخر اسے جیت رہا تھا۔ مراد کی جگہ لے چکا تھا۔

☆☆☆

جرائم کی دنیا ذرا ٹھنڈی پڑ گئی تھی۔ ابھی کسی نے یہ نوٹس نہیں لیا تھا کہ مراد کہاں گم ہو گیا ہے۔ کسی ملک کے کسی علاقے سے یہ اطلاع نہیں مل رہی تھی کہ اسے کہیں دیکھا گیا ہے یا کہیں اس کی موجودگی کے آثار پائے گئے ہیں۔

دوست اور دشمن سب ہی جانتے تھے کہ وہ بری طرح زخمی ہو کر اپاہج بن کر کہیں روپوش ہو گیا ہے۔ جلد ہی اس کی کوئی خبر ملے گی۔ یہ ماسٹر جانتا تھا کہ وہ صحت یاب ہو رہا ہے۔

دوسری طرف میڈونا تھی۔ اس نے باپ کے پاس پہنچ کر بتایا تھا کہ وہ چلنے پھرنے اور دوڑنے کے قابل ہو گیا ہے۔ دہلی میں مسٹر دھرم داس کے ایک مکان میں چھپ کر رہتا ہے۔

میکی براؤن کے شوٹرز دندناتے ہوئے وہاں پہنچ گئے تھے۔ لیکن اس کا سایہ بھی انہیں نظر نہیں آیا تھا۔ میڈونا نے چہروں کے خاکے تیار کرنے والے ماہرین کو مراد کے چہرے کی تفصیل بتائی تھی اور ماہرین نے بڑی مہارت سے اس کا صحیح خاکہ تیار کیا تھا۔ وہ خاکہ انڈین انٹیلی جنس والوں تک بھی پہنچایا گیا تھا لیکن دیر ہو چکی تھی۔ مراد اب جان محمد بن چکا تھا۔

میڈونا نے اپنے باپ کے شوٹرز کو اور بھارتی سراغ رسانوں کو مرینہ کے چہرے کی تفصیل بتائی تھی۔ اس کا خاکہ بھی متعلقہ شعبوں تک پہنچایا گیا تھا۔ ابھی کوئی دشمن یہ نہیں جانتا تھا کہ مراد اور مرینہ پھر دوست بن گئے ہیں بلکہ رشتۂ ازدواج میں بھی منسلک ہو گئے ہیں۔

اب وہ دونوں کسی کے ہاتھ آنے والے نہیں تھے۔ دہلی سے پرواز کر کے لندن پہنچ گئے تھے۔ چونکہ پاسپورٹ اور دیگر اہم کاغذات کے مطابق ہندوستانی تھے اس لیے پاکستان جا کر نہیں رہ سکتے تھے۔ عمارہ اور جان محمد کی حیثیت سے اسپیشل برانچ والوں کی نظروں میں آسکتے تھے۔

فی الحال وہ کامیابی سے روپوش رہ کر دشمنوں کے شر سے محفوظ تھے۔ پرامن شہریوں کی طرح آزادی سے بہت اچھا وقت گزار رہے تھے اور یہ توقع نہیں تھی کہ وہاں ماروی

اور محبوب سے کبھی سامنا ہو گا۔ وہ سب اتنی کامیابی سے تبدیل ہو گئے تھے کہ ایک دوسرے کے سامنے آ کر بھی کسی کو نہ پہچان سکتے تھے۔ نہ کسی پر شبہ کر سکتے تھے۔

مراد ویسے ماروی کو تلاش کرنے آیا تھا۔ یہ خلش مٹ نہیں سکتی تھی کہ وہ اس کے رقیب کے ساتھ رہنے کے لیے اسی شہر میں کہیں ہے۔ اس کی ضد کہہ رہی تھی کہ اسے ڈھونڈ کر پاتال سے نکالنا ہے اور محبوب سے بھی نمٹنا ہے۔

وہ بن سٹی کی عدالت سے طلاق نامہ بھیج چکا تھا۔ ماروی کو خبر ہو یا نہ ہو، وہ اپنی طرف سے اسے چھوڑ چکا تھا اور چھوڑنے کے بعد بھی اسے پکڑ لینے کی دھن سوار تھی۔ یہ پیش گوئی ..... ذہن میں نقش تھی کہ وہ ایک مدت کے بعد پھر اس کی زندگی میں واپس آئے گی۔

مرینہ نے کہا۔ ''میں اس کی طلب سے تمہیں نہیں روکوں گی۔ یہ اچھی طرح جانتی ہوں کہ وہ تمہاری زندگی سے نکل کر اور زیادہ اہم ہو گئی ہے۔ تم اس کے لیے پاگل ہوتے رہو گے۔ لیکن پلیز میرے ساتھ تنہائی میں اس کا نام نہ لیا کرو۔''

وہ بولا۔ ''ہم دونوں دن رات تنہا رہتے ہیں۔ اب کوئی تیسرا ہمارے درمیان نہیں ہے۔ ایسا کرو' جب میں اس کا نام لیا کروں تو اٹھ کر چلی جایا کرو۔''

وہ کچن کی طرف جاتے ہوئے بولی۔ ''تمہیں تنہائی اور اس کی یادیں مبارک ہوں۔ میں کچھ پکانے جا رہی ہوں۔''

وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے بولا۔ ''خدا کا واسطہ ہے۔ چولہا نہ جلاؤ۔ اب بن لو کہ تم گھر گرہستی اور چولہا ہانڈی والی عورت بن ہی نہیں سکتیں۔ ہم کسی باورچی کو رکھ لیں گے۔ میرے اندر ایک پھانس گڑی ہے۔ پلیز! اسے نکالو۔''

مرینہ نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ وہ بولا۔ ''بابا اجمیری کی پیش گوئی درست ہوتی ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ میرا تحریری پیغام ہوا کے ذریعے ماروی تک پہنچے گا۔''

وہ بولی۔ ''اور وہ پیغام ہو گا' طلاق نامہ۔ جب تم عدالت کے ذریعے دے چکے ہو تو کیوں سوچ رہے ہو کہ تمہاری تحریر اس کے پاس پہنچے؟''

''طلاق نامہ نہ سہی، میری بات اس تک پہنچے۔ میں اس سے بہت کچھ کہنا چاہتا ہوں۔''

''تو پھر مجھ سے کیا چاہتے ہو؟''

''ذرا عقل لڑاؤ۔ کوئی تدبیر سوچو کہ میں اپنی تحریر ہوا کے ذریعے کیسے بھیجوں؟''

''یہ تو سراسر ناممکن ہے۔ جب تم اس کا پتا ٹھکانا نہیں جانتے ہو تو ہوا کیسے جانے گی؟ تمہاری تحریر کہاں پہنچائے گی؟''

وہ سر جھکا کر سوچنے لگا۔ وہ مایوس نہیں تھا۔ اس کا دل اس کا عقیدہ کہہ رہا تھا کہ جب بابا اجمیری نے کہا ہے تو ہوا کے ذریعے اس کی تحریر ماروی تک ضرور جائے گی۔

موجودہ امن و امان' سکون و راحت کے لمحات میں ماروی ہی سوچنے کے لیے تھی۔ باقی دشمنوں سے اور آئے دن کے مسائل سے نجات مل گئی تھی۔ لڑنے کے لیے کوئی نہیں تھا۔ ہوا سے لڑ رہا تھا۔ پوچھ رہا تھا کہ وہ ماروی تک کیسے پیغام پہنچائے گی؟

ماسٹر کو بوبو نے ایک ہفتے بعد اسے کال کی تو معلوم ہوا کہ رابطہ نہیں ہو سکے گا۔ اس کا فون مردہ ہو چکا ہے۔ ماسٹر نے فوراً ہی بلّے کو مخاطب کیا۔ ''ہیلو بلّے! تم کہاں ہو؟''

وہ بولا۔ ''میں کراچی میں ہوں۔''

اس وقت وہ اسلام آباد میں چنگیزی اور اس کے بیٹے جواد سے نمٹ رہا تھا۔ نئے چہرے کے پیچھے بشریٰ کے ساتھ چھپ گیا تھا۔ آئندہ ماسٹر سے بھی چھپنے والا تھا۔

ماسٹر نے کہا۔ ''مراد نے فون بند رکھا ہے۔ اسے مجھ سے تو رابطہ رکھنا چاہیے۔ پچھلے ایک ہفتے سے اس نے ہیلو تک نہیں کہا ہے۔ کسی طرح اس کی خیریت معلوم کرو۔ وہ کہاں ہے اور اس نے فون کیوں بند رکھا ہے؟''

اس نے کہا۔ ''میں دونوں سے کال کر رہا ہوں۔ پتا نہیں اس نے کیوں اپنا فون بند کر رکھا ہے۔ یہ تشویش کی بات ہے کہ آپ سے بھی رابطہ نہیں کر رہا ہے۔''

یہ ماسٹر کے لیے واقعی تشویش میں مبتلا ہونے والی بات تھی۔ وہ اپنے شوٹرز اور دیگر ماتحتوں کے ذریعے معلوم کرنے لگا۔ پھر یہ معلوم ہوا کہ میکی براؤن اور بھارتی انٹیلی جنس والے بھی اسے ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔ میڈونا کی نشاندہی کے باوجود اس کا سراغ نہیں مل رہا ہے۔

ایسے وقت دوستوں اور دشمنوں نے ماروی کی طرف رخ کیا۔ اس کے ذریعے اس کے عاشق شوہر تک پہنچا جا سکتا تھا۔ لیکن یہ چونکا دینے والا انکشاف ہوا کہ وہ اچانک گھر چھوڑ کر چلی گئی ہے یعنی وہ بھی روپوش ہو گئی ہے۔

تب سب ہی کے دماغوں میں یہ بات آئی کہ مراد نے اپنی ماروی کے ساتھ کوئی لمبی پلاننگ کی ہے۔ اس کے ساتھ روپوش ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے چہرے اور شناخت تبدیل کر چکے ہیں۔ اب مشکل سے پہچانے جائیں گے۔ شاید بڑے پاپڑ بیلنے کے بعد پکڑے جائیں گے۔

ماسٹر صبر کر رہا تھا۔ اسے امید تھی کہ مراد اسے نہیں بھلائے گا، اپنے کسی برے وقت میں ضرور یاد کرے گا۔

اسے کوئی شکایت نہیں ہے۔ ناراض نہیں ہے۔ اپنے مسائل اور الجھنوں سے نکل کر اسے ضرور کال کرے گا۔

دوست ہوں یا دشمن، کوئی یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ جس مرینہ سے جان لیوا دشمنی رہتی ہے، اسی کے ساتھ روپوش ہوکر آزادی سے زندگی گزار رہا ہے۔

اس قدر آزادی تھی کہ وہ منہ چھپائے بغیر ایک ملک سے دوسرے ملک جارہا تھا۔ دہلی سے اطلاع ملی کہ اس کے باپ یعنی جان محمد کے باپ کا انتقال ہوگیا ہے۔ اسے پہلی فلائٹ سے دہلی جانا پڑا۔ اسے باپ بیٹے کا رشتہ نبھانا تھا۔ وہ جان محمد کے بہروپ میں پوری طرح محفوظ تھا۔

ماروی لندن میں تھی۔ دل ادھر اٹکا ہوا تھا لیکن باپ نے وفات پائی تھی، وہ چالیسویں کے بعد ہی وہاں سے جاسکتا تھا۔ اس نے عبداللہ کبڈی سے کہا۔ ”میں بابا صاحب سے ملاقات کروں گا۔ ان سے پوچھوں گا کہ میرا کوئی تحریری پیغام کس طرح ہوا کے ذریعے اپنی منزل تک پہنچے گا؟“

کبڈی نے کہا۔ ”بابا صاحب سے ملاقات نہیں ہو سکے گی، وہ عمرہ کرنے گئے ہیں۔ کم از کم پندرہ دنوں کے بعد آئیں گے۔“

وہ مرینہ اور کبڈی کے ساتھ ایک چلڈرن گارڈن کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ خوب صورت اور معصوم بچے کھیل رہے تھے اور شرارتیں بھی کررہے تھے۔ چند بچوں نے گیس بھرے ہوئے غبارے تھام رکھے تھے۔ وہ تمام غبارے ایک دوسرے سے بندھے ہوئے تھے۔ ایک بچے نے ٹافی کا ایک پیکٹ ان دھاگوں کے نچلے سرے سے باندھ دیا تھا پھر ان غباروں کو فضا میں چھوڑ دیا گیا۔

مراد چلتے چلتے ٹھٹک گیا۔ مرینہ کے بازو کو تھام کر بولا۔ ”مرینہ......! آئیڈیا...“

وہ غبارے ٹافی کا پیکٹ لے کر بلندی پر پرواز کررہے تھے اور ہوا کے رخ پر جارہے تھے۔

وہ بڑے جوش اور جذبے سے بولا۔ ”کبڈی! ایسے ہی غبارے میرا پیغام لے کر ماروی کے پاس جائیں گے۔“

مرینہ اور کبڈی اس احمقانہ آئیڈیے پر ہنسنے لگے۔ وہ بولا۔ ”یہ ہنسنے کی بات نہیں ہے۔ بابا اجمیری کی پیش گوئی اب سمجھ میں آرہی ہے۔“

مرینہ نے پوچھا۔ ”اب کیا سمجھ میں آرہی ہے؟“

”یہی کہ اپنی تحریر ہوا کے حوالے کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اسے تقدیر کے حوالے کروں گا۔“

وہ مرینہ کا بازو جھنجوڑ کر بولا۔ ”اکثر روحانی باتیں اور اشارے کنائے ہماری سمجھ میں نہیں آتے۔ وہ اللہ کے برگزیدہ بندے ہیں۔ انہوں نے کچھ سوچ سمجھ کر ہی پیش گوئی کی ہے اور ہم سب جانتے ہیں کہ ان کی پیش گوئی درست ہوتی ہے۔“

مرینہ اور کبڈی سوچتے ہوئے آسمان کی طرف سر اٹھا کر دیکھنے لگے۔ وہ غبارے مغرب کی سمت بہت دور چلے گئے تھے اور اب عمارتوں کے پیچھے جاکر نظروں سے اوجھل ہورہے تھے۔

روحانیت کا اور بابا اجمیری کا حوالہ ایسا تھا کہ مرینہ اور کبڈی ہنسنا بھول گئے۔ مرینہ نے کار میں آکر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”روحانیت ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔ اچانک کوئی معجزہ یا کرشمہ ایسا ہوجاتا ہے کہ ہم حیران رہ جاتے ہیں۔“

”میں کہتا ہوں، پیش گوئی رنگ لائے گی۔ غباروں کے ذریعے پیغام بھیج کر دیکھ لینے میں نقصان کیا ہے۔ نقصان نہیں ہوگا، ایک تفریح ہوگی۔ دلچسپی رہے گی۔ انتظار رہے گا کہ دیکھیں غبارے کہاں جاتے ہیں؟ ان کا کچھ نتیجہ معلوم ہوگا یا نہیں؟“

کبڈی نے کہا۔ ”جیسا کہ ہم سمجھ سکتے ہیں یہ غبارے زیادہ دور نہیں جائیں گے۔ زیادہ سے زیادہ ایک صوبے سے دوسرے صوبے تک پہنچیں گے۔“

مراد نے کہا۔ ”بچوں نے چھ غبارے اڑائے تھے۔ میں پورے سو غباروں کے ذریعے پیغام بھیجوں گا۔“

مرینہ نے کہا۔ ”وہ سو غبارے زیادہ سے زیادہ پاکستان تک جائیں گے جبکہ ماروی لندن میں ہے۔“

وہ کار ڈرائیو کررہا تھا۔ بے چینی سے پہلو بدل کر بولا۔ ”ہاں کہیں نہ کہیں ان غباروں میں گیس ختم ہوگی، وہ نیچے آئیں گے۔“

وہ ذرا چپ ہوا پھر بولا۔ ”ایک مضبوط پلاسٹک کے لفافے میں میرا پیغام ہوگا۔ دوسرے لفافے میں یہ تحریر ہوگی کہ یہ پیغام جس کے ہاتھ لگے، وہ مزید سو غباروں کے ذریعے اسے آگے ہوا کے حوالے کردے۔ یہ نیک کام ہے۔ خدا اس کا اجر دے گا۔“

مرینہ نے کہا۔ ”کوئی ایسی نیکی نہیں کرتا جس میں نقد روپے خرچ ہوتے ہیں۔“

وہ بولا۔ ”میں اس لفافے میں ایک ہزار ڈالر رکھوں گا۔ کسی بھی نیکی کرنے والے پر بوجھ نہیں پڑے گا۔“

کبڈی نے کہا۔ ”جس کے ہاتھ میں وہ لفافہ آئے گا، اس کی عید ہوجائے گی۔ وہ ہزار ڈالرز جیب میں رکھے گا اور

پیغام کو پھینک کر چلا جائے گا۔''
مراد نے کہا۔ ''ایسا ہو سکتا ہے۔ لیکن برا ہو سکتا ہے تو بھلا بھی ہو سکتا ہے۔ اگر بابا صاحب کی پیش گوئی کو درست ہونا ہے تو میرا پیغام نیک بندوں کے ہاتھوں میں پہنچتا رہے گا اور وہ اسے آگے بڑھاتے رہیں گے۔''
وہ حویلی میں پہنچ گئے۔ وہاں بھی غباروں کے حوالے سے باتیں کرتے رہے۔ اگرچہ بابا اجمیری کی پیش گوئی پر یقین تھا۔ غباروں کے ذریعے پیغام بھیجنا گویا ہوا کے ذریعے بھیجنا تھا۔ لیکن مرینہ اور کبڈی کی عقل نہیں مان رہی تھی۔ سراسر بچکانا پن لگ رہا تھا۔
مراد نے کہا۔ ''یہ بچوں کا کھیل ہی سہی۔ میں کھیلوں گا اور اس کھیل میں کوئی نقصان ہونے والا نہیں ہے۔ تم دونوں اسے محض تفریح سمجھ کر میرا ساتھ دو۔''
مرینہ نے پوچھا۔ ''کیا وہ غبارے یہاں حویلی کی چھت سے اُڑاؤ گے؟ سب یہی پوچھیں گے کہ کیا تماشا کر رہے ہو؟''
مراد نے کبڈی سے کہا۔ ''ہم ابھی جا کر سو دو سو بڑے سائز کے غبارے خریدیں گے۔ تم غبارے اور گیس سلنڈر اپنے گھر میں رکھو گے۔ کل ہم صبح سویرے شہر سے دور جنگل میں جائیں گے۔ وہاں سے وہ غبارے فضا میں چھوڑیں گے۔''
ان دونوں نے اسی وقت تھوک مارکیٹ میں جا کر اٹھارہ درجن بڑے سائز کے مضبوط غبارے اور دو بڑے گیس سلنڈر خرید لیے۔ کبڈی انہیں اپنے گھر لے گیا۔ مراد حویلی میں آ کر بڑی بے چینی سے سوچنے لگا۔ پیغام کیا لکھے گا؟ اپنی روٹھی ہوئی ماروی کو کیسے منائے گا؟
ہوا کے پر نہیں ہوتے۔ وہ پرواز کرے گی۔ ہوا کے ہاتھ نہیں ہوتے۔ وہ ہاتھوں سے اس کے ہاتھ میں پیغام پہنچائے گی۔ کیا واقعی پہنچائے گی؟ یہ دنیا ہے۔ یہاں عجب تماشے ہوتے ہیں۔ بعض حالات میں بچوں کا کھیل بڑے کھیلتے ہیں اور انجام حیرت انگیز ہوتا ہے۔
وہ پیغام لکھنے سے پہلے بہت ہی جذباتی ہو رہا تھا۔ اس نے مرینہ سے کہا۔ ''پلیز مرینہ! مائنڈ نہ کرنا۔ آج کی رات مجھ سے دور رہو۔ نہ میرے قریب آؤ، نہ مجھ سے بولو۔ مجھے بہت ساری باتوں کو سوچنا اور سمجھنا ہے پھر لکھنا ہے۔''
وہ ہنستی ہوئی بولی۔ ''میں تمہارے پاگل پن کو سمجھتی ہوں۔ تمہارے قریب نہیں آؤں گی۔ میری فراخ دلی دیکھو۔ میں آج رات تمہیں ماروی کے حوالے کر رہی ہوں۔''

وہ بیڈ پر جا کر دوسری طرف منہ کر کے لیٹ گئی۔ مراد ایک میز پر جھک کر لکھنے لگا۔
''ماروی...! میری زندگی! میری جان! تم کہو گی طلاق کے بعد میری جان نہیں رہی ہو۔ لیکن جان ہو اور ہمیشہ رہو گی۔ تم صرف جسمانی طور پر دور ہو گئی ہو۔ محبت کا کوئی جسم نہیں ہوتا۔ وہ احساسات اور جذبات سے بھرپور روح ہوتی ہے۔ تمہاری محبت کی روح آخری سانس تک میرے اندر رہے گی۔ میں جب تک جیوں گا تم میری جان رہو گی۔ تمہیں چھوڑنا اور تم سے دور ہونا ایک بہت ہی تلخ تجربہ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تم بھی جدائی کا زہر پی رہی ہو اور مجھے بھولنے کی کوششیں کرنے کے باوجود مجھے یاد کرتی رہتی ہو۔ ماروی! میں اپنی صفائی میں بہت کچھ کہہ سکتا ہوں۔ دنیا سنے گی تو میرے حق میں فیصلہ سنائے گی کہ میں نے حالات سے مجبور ہو کر طلاق دی ہے۔ لیکن میں اپنی صفائی میں کچھ نہیں کہوں گا بلکہ اپنی غلطیوں کا اور کوتاہیوں کا اعتراف کروں گا۔ میں نے تم پر سوکن لا کر تمہیں تکلیف پہنچائی ہے۔ تم میرے بغیر نہیں رہتی تھیں لیکن میری ایک غلطی کے باعث مجھے چھوڑ کر میرے رقیب کے پاس چلی گئیں۔
''ماروی! میں اپنی غلطی پر پچھتا رہا ہوں۔ اگر کوئی اپنی غلطی تسلیم کرے تو اسے معاف کر دینا چاہیے۔ مجھے معاف کر دو۔ واپس آجاؤ۔ میں یقین کی حد تک سمجھ رہا ہوں کہ تم محبوب کی منکوحہ بن چکی ہو اور یہ بات مجھے بہت تکلیف پہنچا رہی ہے۔ میرا دل کہتا ہے کہ میری بننے کے لیے تم حلالہ کے مرحلے سے گزر رہی ہو۔ یہ اچھا ہی ہو رہا ہے۔ اپنے مراد کی خاطر اس سے طلاق لو اور میرے پاس آجاؤ۔ جس دن آؤ گی اس دن خوشی سے مر جاؤں گا۔ تمہیں خدا کا واسطہ ہے۔ اپنا پتا بتاؤ۔ ایک کال کرو۔ میں دوڑا چلا آؤں گا۔ یہ تم جانتی ہو تمہارے بغیر سکون سے جی نہیں سکوں گا۔ یہ میں جانتا ہوں کہ تمہیں دیکھے بغیر مر بھی نہیں سکوں گا۔
آجاؤ...... ماروی! آجاؤ...... فقط تمہارا مراد علی منگی۔''
اس کا قلم رُک گیا۔ اس نے جو لکھا تھا، اسے پڑھنے لگا۔ یہ اطمینان ہوا کہ اس نے مختصر سی تحریر میں دل کھول کر رکھ دیا ہے۔
وہ تحریر ماروی سے کہہ رہی تھی کہ وہ صلح کرنے نہیں آنا چاہتی۔ جزا دینے کے لیے نہیں آنا چاہتی تو سزا دینے کے لیے آجائے۔ آنکھوں میں دم رہے گا۔ اسے دیکھتے ہی نکل جائے گا۔
اس نے پلاسٹک کے ایک مضبوط لفافے میں اس

تحریر کو رکھ کر اچھی طرح بند کیا تا کہ وہ بارش میں نہ بھیگے اور طوفانی ہوا میں اس کے پرزے نہ اُڑیں۔ پھر اس نے دوسرا کاغذ لکھا۔

''یہ تحریر ان نیک بندوں کے لیے ہے جن کے ہاتھوں میں یہ دو لفافے آئے ہیں۔ ان سے گزارش ہے کہ مجھ عاشق نامراد سے نیکی کریں۔ میری ماروی کے نام جو پیغام ہے، اسے پھر ہوا کے ہاتھوں میں رکھ دیں۔ اس لفافے میں ایک ہزار ڈالرز ہیں تا کہ آپ غبارے اور گیس سلنڈر خرید سکیں اور آپ پر کسی طرح کا بوجھ نہ پڑے۔ خدا آپ کو نیکی کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔''

اس نے اس تحریر کو بھی پلاسٹک کے مضبوط لفافے میں بند کیا۔ پھر ان لفافوں کو دیکھ کر سوچنے لگا۔ کیا یہ پہنچ جائیں گے؟ ہاں پہنچ جائیں گے۔ پھول سے نکلی ہوئی خوشبو ہر سو جاتی ہے۔ میرے دل سے نکلی ہوئی پیار کی خوشبو ماروی تک پہنچے گی۔

وہ میز کے سامنے کرسی پر بیٹھا رہا۔ بیڈ پر سونے کے لیے نہیں گیا۔ وہاں مرینہ تھی اور ابھی وہ ماروی کی سمت جانے والے لفافوں کے قریب رہنا چاہتا تھا۔

وہ کرسی پر بیٹھے بیٹھے سو گیا۔ تہجد کی نماز پڑھنے کے لیے ایک نیند سے گزرنا لازمی ہے۔ ایک بجے اس کی آنکھ کھلی۔ وہ نماز ادا کر کے پھر سو گیا۔

وہ نیند میں بھی تھا۔ نماز میں بھی تھا اور ماروی کے دھیان میں بھی تھا۔ فجر کی نماز پڑھ کر مرینہ کے ساتھ حویلی سے باہر آ کر کار میں بیٹھ گیا۔ عبداللہ کبڈی اپنے گھر میں اس کا منتظر تھا۔ اس کے آتے ہی گیس سلنڈر اور غبارے لے کر کار میں آ گیا۔

پھر وہ تینوں وہاں سے چل پڑے۔ دہلی شہر سے تقریباً پچیس میل دور وہ پختہ سڑک چھوڑ کر جنگل کے کچے راستے پر آ گئے۔ ادھر سے نہ کوئی گاڑی گزر رہی تھی، نہ کوئی پیدل آتا جاتا دکھائی دے رہا تھا۔ دور تک ویرانی اور سناٹا تھا۔

اس نے ایک کھلے میدان میں گاڑی روک دی۔ وہ تینوں گیس سلنڈر اور غبارے نکال کر مصروف ہو گئے۔ غباروں میں گیس بھر کر انہیں مضبوط دھاگوں سے باندھنے لگے۔ یوں رنگ برنگے غبارے ایک ایک کر کے سو سے زیادہ ہو گئے۔ وہ سب آسمان کی طرف اٹھے ہوئے تھے اور وہ سب لانبے مضبوط دھاگوں کے ذریعے ایک دوسرے سے منسلک تھے۔

وہ تمام دھاگے نچلے سرے میں آ کر آپس میں بندھ گئے تھے۔ وہیں مراد نے ان دونوں لفافوں کو بڑی احتیاط سے باندھ دیا۔ آہنی کلپ کے ذریعے ان لفافوں کو بند رکھا۔ جب پوری طرح مطمئن ہو گیا' تب اس نے اللہ کا نام لے کر انہیں ہاتھوں سے چھوڑ دیا۔

سو سے زیادہ غباروں کی مجموعی قوت اتنی زیادہ تھی کہ وہ تیزی سے آسمان کی طرف بلند ہوتے چلے گئے۔ ہوا انہیں مغرب کی سمت لے جا رہی تھی۔ وہ تینوں کار کے پاس کھڑے ہوئے انہیں دور جاتے دیکھ رہے تھے۔ وہ دونوں لفافے سرخ اور سفید تھے۔ دور تک نیچے لٹکتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ مرینہ نے کہا۔ ''پتا نہیں' یہ کہاں جائیں گے؟ ویسے جہاں بھی جائیں، یہ ایک دلچسپ مشغلہ رہا۔ بچپن یاد آ گیا۔''

وہ رنگین غبارے دور جاتے ہوئے نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ آسمان خالی ہو گیا۔ مراد گہری سنجیدگی سے ادھر دیکھ رہا تھا۔ مرینہ نے کہا۔ ''وہ جا چکے ہیں۔ اب کیا دیکھ رہے ہو؟ کیا ماروی دکھائی دے رہی ہے؟''

اس نے خیالات سے چونک کر مرینہ کو دیکھا پھر کار کی اگلی سیٹ کی طرف جاتے ہوئے بولا۔ ''تم ڈرائیو کرو۔ میں آرام کروں گا۔''

کبڈی نے پچھلی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''یار! پہلے خیال نہیں آیا۔ مجھ بونے کو دھاگوں سے باندھ دیتے تو میں ماروی کے پاس پہنچ جاتا۔''

مرینہ نے قہقہہ لگاتے ہوئے کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھائی۔ مراد نے کہا۔ ''تم دونوں میرے جذبات کا مذاق اُڑا رہے ہو۔ کوئی بات نہیں۔ دو چار دنوں میں معلوم ہو جائے گا کہ ماروی کو میرا محبت نامہ ملا ہے یا نہیں؟''

''تمہیں کیسے معلوم ہوگا؟ کیا تم نے جواب حاصل کرنے کے لیے یہاں کا رہائشی پتا لکھا ہے؟ تم نے ایسی کوئی حماقت کی ہے؟''

''میں احمق نہیں ہوں۔ وہ خط دشمنوں کے ہاتھ بھی لگ سکتا ہے۔ میں نے پتا نہیں لکھا ہے۔ فون نمبر لکھا ہے۔''

''یہ بھی لکھنا نہیں چاہیے تھا۔ انٹیلی جنس والے فون نمبر سے بھی مطلوبہ شخص کو ٹریس کر لیتے ہیں۔''

''میں نے جو نمبر دیا ہے، وہ سم لندن میں پڑی پڑی تھی۔ اِدھر کوئی ٹریپ نہیں کر سکے گا۔''

کبڈی نے کہا۔ ''ماروی لندن میں ہے۔ کیا یہ غبارے وہاں تک جا سکیں گے؟''

''اگر غبارے بدلتے رہے تو ضرور وہاں پہنچیں گے۔'' مرینہ نے کہا۔ ''یہ سراسر بچوں کا کھیل ہے۔ انجام کار

کچھ ہونے والا نہیں ہے لیکن کھیل دلچسپ ہے۔ اب تک اچھا وقت گزر گیا۔''

مراد نے کہا۔ ''تم کہتی ہو، نتیجہ کچھ حاصل نہیں ہوگا اور میں کہتا ہوں میرا پیغام ماروی تک پہنچے گا۔ چلو شرط لگاؤ۔''

وہ بولی۔ ''کوئی بڑی شرط لگاؤ۔ اگر میں جیت جاؤں تو زبان دو کہ ماروی کو کبھی میری سوکن نہیں بناؤ گے۔''

''یہ تو بہت بڑی شرط ہے۔ میرا دل نہیں مانے گا۔ میں اسے ہر حال میں واپس لانا چاہتا ہوں۔''

''تمہارا خط وہاں نہیں پہنچے گا اور وہ محبوب کی منکوحہ بن چکی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ اس کی واپسی کا راستہ بند ہے اور بند رہے گا تو پھر کیوں اسے واپس لانا چاہو گے؟ میری شرط مان لو۔''

اس نے تھوڑی دیر تک سوچنے کے بعد کہا۔ ''ہاں اگر وہ پرائی ہو چکی ہوگی تو پھر شوہر نہیں بدلے گی۔ میری طرف واپس نہیں آئے گی۔ ٹھیک ہے۔ میں کبڈی کی موجودگی میں وعدہ کرتا ہوں۔ میرا پیغام وہاں تک نہیں جائے گا اور وہ میرے رقیب کو چھوڑ کر میری زندگی میں نہیں آنا چاہے گی تو میں جبراً اسے تمہاری سوکن نہیں بناؤں گا۔''

مرینہ نے ڈرائیو کرتے ہوئے ایک ہاتھ اس کے ہاتھ پر مارتے ہوئے کہا۔ ''پھر تو سمجھو میں جیت گئی۔ اب وہ محبوب کو چھوڑ کر نہیں آئے گی اور یہ لکھ لو کہ یہ غباروں والا بچکانا کھیل ابھی شروع ہوا ہے اور ابھی ختم ہو جائے گا۔ آسمان کی طرف دیکھو۔ غبارے گئے۔ پیغام گیا۔ کسی نصیب والے کو ایک ہزار ڈالرز ملنے والے ہیں۔''

''اور میرا ایمان اور میرا عقیدہ کہتا ہے کہ پیش گوئی درست ہوگی۔ وہ خط ماروی کے ہاتھوں میں ضرور پہنچے گا۔ وہ میری زندگی میں واپس آئے گی۔ میری شرط یہ ہے کہ میں جیت جاؤں گا تو تمہیں ہارنا ہوگا۔ یعنی مجھے ہارنا ہوگا۔ تم میری زندگی سے نکل جاؤ گی کیونکہ ماروی سوکن کو برداشت نہیں کرتی۔''

مرینہ نے اسے پریشان ہو کر دیکھا۔ وہ بول رہا تھا۔ ''تمہاری جیت ہوگی تو میں تم پر سوکن نہیں لاؤں گا۔ میری جیت ہوگی تو تمہیں اس کی سوکن بن کر رہنے نہیں دوں گا۔ یہ سن لو کہ تمہیں طلاق دے دوں گا۔''

کبڈی نے کہا۔ ''یہ تم لوگوں نے شادی اور طلاق کو کھیل سمجھ لیا ہے؟ کیا دوسری شرطیں نہیں لگا سکتے؟''

''نہیں، ہار جیت کا نتیجہ جب سامنے آئے گا تو سب سے بڑا مسئلہ یہی ہوگا کہ ماروی سوکن کو برداشت نہیں کرے گی۔ اس لیے یہ شرط بالکل مناسب ہے۔ بولو مرینہ منظور ہے۔ تم میری زندگی سے نکل جاؤ گی؟''

وہ جواب دینے سے پہلے ونڈ اسکرین کے پار دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ 'میں تو اسے واپس آنے ہی نہیں دوں گی۔ اس کی واپسی کے آثار نظر آتے ہی اسے اوپر پہنچا دوں گی۔'

دل کا فیصلہ کچھ تھا۔ زبان کا فیصلہ کچھ تھا۔ اس نے زبان سے کہا۔ ''منظور ہے۔ میں اس کی سوکن بن کر نہیں رہوں گی۔ میں تمہاری زندگی سے نکل جاؤں گی۔ تم بولو۔ یہ خط وہاں تک نہیں پہنچے گا تو تم ہار جاؤ گے۔ کبھی ماروی کی طرف رخ نہیں کرو گے۔ اسے اپنی منکوحہ بنانے کے لیے محبوب سے الگ نہیں کرو گے۔''

وہ بھی جواب دینے سے پہلے ونڈ اسکرین کے پار دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ 'میں مر جاؤں گا لیکن ماروی کی طلب سے باز نہیں آؤں گا۔ وہ محبوب کو چھوڑنے پر راضی نہیں ہوگی تو بڑی رازداری سے اپنے رقیب کو اوپر پہنچا دوں گا پھر تو وہ میرے ہی پاس آئے گی۔'

مرینہ نے پوچھا۔ ''کیا سوچ رہے ہو؟ جواب دو۔''

''مجھے منظور ہے۔ شرط ہار جانے پر اسے محبوب سے نہیں چھڑاؤں گا۔ تم پر سوکن نہیں لاؤں گا۔''

وہ خوش ہو کر بولی۔ ''کبڈی! میں کہتی ہوں کہ شرط جیت چکی ہوں۔ آئندہ وہ کبھی میری سوکن بن کر نہیں آئے گی۔ تم کیا کہتے ہو؟''

وہ بولا۔ ''میں تو دعا ہی دے سکتا ہوں کہ تم دونوں ہنسی کھیلتی ازدواجی زندگی گزارو اور کوئی تیسری ہستی تمہارے درمیان نہ آئے۔''

مراد نے کھڑکی کے باہر دور آسمان کی طرف دیکھا۔ غبارے نہیں تھے، خط نہیں تھا۔ خوشبو نہیں تھی۔ آسمان خالی تھا۔ پتا نہیں جانِ حیات کو منانے والی اور واپس لانے والی تحریر کہاں جا کر آسمان سے اتر کر مٹی میں ملنے والی تھی۔

☆☆☆

آرمی ہیڈ کوارٹر میں سپاہی اور افسران اپنی اپنی ڈیوٹی کے مطابق مصروف تھے۔ اسلحے سے لدے ہوئے ٹرک گودام کی طرف جا رہے تھے۔ میجر شمشیر سنگھ فرسٹ فلور کی بالکونی میں کھڑا تھا۔ آسمان پر رنگ برنگے غبارے دکھائی دے رہے تھے۔ اس نے پہلے کبھی سیکڑوں غباروں کو ایک ساتھ اڑتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ اس نے سپاہی کو حکم دیا۔ ''دوربین لاؤ۔''

وہ دوڑ کر دوربین لے آیا۔ میجر نے اسے آنکھوں سے لگا کر دیکھا۔ مسکرا کر زیرِ لب کہا۔ ''کیا بات ہے؟

اتنے سارے غبارے یوں لگ رہے ہیں' جیسے رنگ برنگے ملبوسات میں حسیناؤں کی برات جا رہی ہے۔ تعجب ہے اتنے بہت سے غبارے کس نے چھوڑے ہیں اور کیوں چھوڑے ہیں......''

وہ بولتے بولتے رک گیا۔ اسے کچھ نظر آرہا تھا۔ اس نے دوربین کی چکری کو گھمایا۔ وہ غبارے ذرا قریب نظر آنے لگے۔ وہ بڑبڑایا۔ ''یہ تو ریڈ اینڈ وائٹ لفافے ہیں۔''

اس نے دوربین کو آنکھوں سے ہٹا کر سوچا۔ ''ان لفافوں میں کیا ہوگا؟''

وہ تجسس میں مبتلا ہو گیا تھا۔ پھر اس نے خود ہی جواب دیا۔ ''خط ہوگا......کوئی پیغام ہوگا......''

پھر وہ ایک دم سے چیخ پڑا۔ ''اوہ مائی گاڈ...! کوئی اہم سیکرٹ انفارمیشن ہوگی۔''

وہ دوربین کو آنکھوں سے لگاتے ہوئے بولا۔ ''کوئی خفیہ پیغام ہوگا جو کہیں بھیجا جا رہا ہے۔ ان کا رخ پنجاب کی طرف ہے۔ یہ... یہ غبارے اٹاری بارڈر کراس کر سکتے ہیں۔ اوہ نو۔ کوئی سیکرٹ انفارمیشن پاکستان پہنچائی جا رہی ہے۔''

وہ غبارے بہت ہی سست رفتاری سے مغرب کی سمت جا رہے تھے۔ میجر نے فوراً ہی فون کے ذریعے آرمی انٹیلی جنس کے چیف کو مخاطب کیا۔ ''مسٹر شرما! آسمان کی طرف دیکھیں۔ کوئی گڑبڑ ہے۔ ہمارے دیس کے خلاف سازش ہو رہی ہے۔''

انٹیلی جنس کے چیف آفیسر دلیپ شرما نے سر اٹھا کر رنگین غباروں کو بلندی پر دیکھا۔ وہ بہت دور تھے۔ اس نے کہا۔ ''کیا کہہ رہے ہو؟ کیا ان غباروں پر شبہ ہو رہا ہے؟''

''ہاں۔ دوربین سے دیکھو۔ ان غباروں کے ساتھ دو لفافے بندھے ہوئے ہیں اور ان کا رخ پاکستان کی طرف ہے۔''

وہ بے یقینی سے بولا۔ ''اوہ نو۔ ایسی کھلم کھلا پیغام رسانی نہیں کی جا سکتی۔ اسے دیکھنا ہوگا۔ اسے روکنا ہوگا۔''

وہ بھی دوربین آنکھوں سے لگا کر دیکھنے لگا۔ ان کے خیال کے مطابق وہ دو لفافے خفیہ پیغام لیے پاکستان جا رہے تھے اور انہیں چیلنج کر رہے تھے کہ ہمیں روک سکتے ہو تو روک کر دکھاؤ۔

پھر تو انٹیلی جنس ڈیپارٹمنٹ اور پورے آرمی ہیڈ کوارٹر میں جیسے زلزلہ آ گیا۔ تمام متعلقہ شعبوں کے افسران درجنوں فون کے ذریعے فوری ایکشن لینے کے احکامات صادر کر رہے تھے۔ جدھر وہ غبارے بلندی پر جا رہے تھے، ادھر پستی میں فوجی گاڑیاں دوڑنے لگیں۔

ان غباروں کو زمین سے نہیں روکا جا سکتا تھا۔ ان پر گولیاں نہیں چلائی جا سکتی تھیں۔ وہ شوٹنگ رینج سے بہت اوپر تھے۔ تب ائرفورس کے ہیلی پیڈ سے ایک ہیلی کاپٹر نے پرواز کی۔

زمین پر دوڑنے والی گاڑیوں میں افسران بیٹھے دور سے دیکھ رہے تھے۔ ہیلی کاپٹر غباروں کے قریب پہنچ نہیں پا رہا تھا۔ پنکھے کی تیز گردش کے باعث غبارے دور ہو جاتے تھے۔ ویسے انہیں آگے جانے سے روک دیا گیا تھا۔ تیزی سے گردش کرتے ہوئے پنکھے نے ان کا رخ بدل دیا تھا لیکن ان میں اس قدر گیس بھری ہوئی تھی کہ وہ بلندی پر ادھر سے ادھر ہو رہے تھے۔ نیچے زمین کی طرف نہیں جا رہے تھے۔

انٹیلی جنس کے چیف نے حکم دیا۔ ''انہیں گولی مارو۔ انہیں پھوڑو گے تو وہ نیچے آئیں گے۔''

ایک گن مین نے ہیلی کاپٹر کا سلائڈنگ ڈور ہٹا کر گولیاں چلائیں۔ وہ غبارے دور تھے۔ لیکن گولیوں کی زد میں آ کر پھٹ رہے تھے۔ تب قوت پرواز کم ہونے لگی۔ وہ نیچے جانے لگے۔ نیچے والے گاڑیوں سے اتر کر ادھر دوڑ لگا رہے تھے۔ جدھر دو چار زندہ رہ جانے والے غبارے ان لفافوں کو لے جا رہے تھے۔ چیف نے گن نکال کر گولیاں چلائیں جو باقی رہ گئے تھے' وہ بھی پھٹ گئے۔ لفافے تیزی سے نیچے آ کر گھنی جھاڑیوں میں الجھ گئے۔

دو فوجی جوان دوڑتے ہوئے گئے۔ پھر دھاگوں سے بندھے ہوئے لفافوں کو کھول کر انہیں چیف کے پاس لے آئے۔

یہ نئی اور الجھانے والی بات تھی۔ پہلے کبھی غباروں کے ذریعے کسی نے کوئی لفافہ فضا میں نہیں اُڑایا تھا۔ چیف نے ایک لفافے کو دیکھا اس پر جلی حروف میں لکھا ہوا تھا۔ ''ماروی!'' اس نے اسے کھول کر پڑھا تو مایوسی ہوئی۔ وہ ایک مطلقہ عورت کے نام سابقہ شوہر کا رجوع نامہ تھا۔

یہ بھی اطمینان ہوا کہ پاکستانی جاسوس ان کے خلاف پیغام رسانی نہیں کر رہے ہیں۔ دوسرے افسران بھی ان دو لفافوں کی تحریریں پڑھنے لگے۔ دوسری تحریر التجا کر رہی تھی کہ وہ لفافے جن کے ہاتھ لگیں، وہ انہیں غباروں کے ذریعے آگے بڑھا دیں۔

آگے بڑھانے کے لیے ایک ہزار ڈالرز لفافے میں رکھے ہوئے تھے۔ چند افسران ہنسنے مسکرانے لگے۔ چند اس بات سے ناراض تھے کہ ان فضول سے لفافوں نے انہیں میلوں دور تک دوڑایا تھا۔

ایک نے غصے سے کہا۔ ''پتا نہیں، کون پاگل کا بچہ ہے۔ کسی ایڈریس کے بغیر پیغام بھیج رہا ہے اور چاہتا ہے، ہم بھی الو بن کر انہیں آگے اُڑا دیں۔''

دوسرے افسر نے کہا۔ ''خواہ مخواہ ڈالرز ضائع ہوں گے۔ اتنی رقم میں تین بلیک لیبل کی بوتلیں آجائیں گی۔''

ایک افسر نے مسکرا کر کہا۔ ''بھئی ٹھنڈا رکھو ناتھ! غصہ نہ کرو۔ اس پاگل نے ہماری شام رنگین کرنے کے لیے ہمیں یہاں تک دوڑایا ہے۔''

وہ سب اپنی گاڑیوں میں جا کر بیٹھنے لگے۔ چیف نے اپنے ایک سراغ رساں سے کہا۔ ''معلوم کرو۔ یہ کہاں سے اُڑائے گئے ہیں؟ اتنے زیادہ غبارے اڑانے والا کوئی ایک نہیں ہوگا اور کئی تماشائی ہوں گے۔''

وہ اپنی گاڑی میں بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''اسے خلافِ قانون قرار دینا چاہیے۔ اگر یوں غبارے اُڑانے کی اجازت دے دی گئی تو جاسوسی اور پیغام رسانی کی ایک نئی راہ کھل جائے گی۔''

ماتحت سراغ رساں نے اچانک ہی اچھل کر کہا۔ ''سر! یہ ہمارے دیس کا دشمن مراد علی منگی ہے۔''

''کیا......؟'' سب نے چونک کر اس ماتحت کو دیکھا۔ وہ اپنی اپنی گاڑی سے باہر آنے لگے۔ چیف نے اس کے ہاتھ سے وہ تحریر لے کر پڑھی۔ تحریر کے نیچے مراد علی منگی کا نام لکھا تھا اور وہ خطرناک مجرم اپنی ماروی کے نام سے بھی پہچانا جاتا تھا اور اس خط میں ماروی کو ہی مخاطب کیا گیا تھا۔

آرمی انٹیلی جنس والوں نے پہلے توجہ نہیں دی تھی۔ اسے ایک احمقانہ پیغام سمجھ کر پڑھا تھا۔ یہ تھوڑی دیر کے لیے بھول گئے تھے کہ پچھلے ڈیڑھ ماہ سے مراد علی منگی کو پورے دہلی شہر میں تلاش کیا جا رہا ہے اور یہ یقین سے کہا جا رہا ہے کہ وہ زخمی اور اپاہج ہے۔ اس شہر سے باہر نہیں جا سکے گا۔

وہ ہوائی پیغام ثابت کر رہا تھا کہ مفرور اور مطلوبہ مجرم اسی شہر میں ہے۔ وہ سب ہیڈ کوارٹر میں آگئے۔ وہاں ان دونوں تحریروں کی کئی فوٹو کاپیاں پرنٹ کی گئیں۔ پھر وہ کاپیاں پولیس، انٹیلی جنس، اسپیشل برانچ، سی آئی اے اور را تنظیم تک پہنچائی گئیں۔

وہ تمام ڈیپارٹمنٹس کے لوگ جانتے تھے کہ مراد علی منگی ایک طویل عرصے سے انڈیا میں ہے۔ پہلے وہ پاکستانی سرحد پار کر کے راجستھان آیا تھا۔ وہ پاکستانی سیکرٹ ایجنٹ ہے یا پھر فری لانسر وارداتیا ہے۔ اسے جرائم کی دنیا میں ماسٹر کوبوبو کی پشت پناہی حاصل ہے۔ اس کی ہسٹری جرائم سے بھرپور ہے۔ اس نے بربارڈ جیسے درندے قاتل کو قتل کیا ہے۔ ریڈ الرٹ کی براؤن فیملی کے اہم افراد کو موت کے گھاٹ اتارتا آرہا ہے۔

اگرچہ اس نے انڈیا کو کوئی سیاسی اور سماجی نقصان نہیں پہنچایا ہے لیکن اس دیس میں اس کی رہائش غیر قانونی ہے۔ وہ یہاں رہ کر انٹرنیشنل کرمنل گیمز پلے کر رہا ہے اور یقین کی حد تک شبہ ہے کہ وہ پاکستان کے مفاد میں یہاں مصروف رہتا ہے۔

ڈیڑھ ماہ پہلے یہ اطلاع ملی تھی کہ اس کی ایک رکھیل مرینہ نے اسے گولیوں سے چھلنی کر دیا ہے۔ وہ اپاہج ہو گیا ہے اور دہلی شہر میں چھپا ہوا ہے۔ لیکن تلاشِ بسیار کے باوجود اس کا سراغ نہیں مل رہا تھا۔

ڈیڑھ ماہ بعد وہ غبارے دہلی میں اس کی موجودگی ثابت کر رہے تھے۔ تمام ڈیپارٹمنٹس کے قانونی محافظ بڑی رازداری سے یہ معلوم کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ وہ غبارے شہر کے کس علاقے سے اُڑائے گئے ہیں۔ یہ بات چھپائی جا رہی تھی کہ ان غباروں کو بارڈر پار جانے سے روک دیا گیا ہے۔

وہ بڑی خاموشی سے کھوج لگا رہے تھے۔ انہوں نے مراد کو اس بات سے بے خبر رکھا تھا کہ ماروی کے سلسلے میں اس کی ایک جذباتی غلطی نے اسے قانونی پھندے کے قریب پہنچا دیا ہے۔ اس بار یقین تھا کہ وہ غبارے اُڑانے والا ضرور پکڑا جائے گا۔

تمام بھارتی سراغ رساں اور تحریر کے ماہرین ان دو تحریروں کو بار بار پڑھ کر معلوم کرنا چاہتے تھے کہ مراد نے ان تحریروں کے پیچھے کوئی خفیہ پیغام کسی کو بھیجا ہے یا وہ محض ماروی کے لیے لکھی گئی ہیں۔

ایک جاسوس نے کہا۔ ''صرف ماروی کو لکھا جاتا تو اس کا پتا ٹھکانا بھی لکھا جاتا۔''

ایک افسر نے کہا۔ ''ماروی کا کوئی پتا نہیں لکھا ہے۔ ہوا اندھی، غبارے اندھے۔ پھر یہ لفافے ماروی تک کیسے پہنچنے والے تھے؟''

ایک نے کہا۔ ''کیا مراد کا دماغ چل گیا ہے؟ اس نے پاگلوں جیسی، بچوں جیسی یہ حرکت کیوں کی ہے؟''

''وہ پاگل نہیں ہے۔ ایک طویل عرصے سے اپنی ذہانت یا مکاری ثابت کرتا آرہا ہے۔ ایسا مردِ میدان ہے کہ آج تک کسی سے زیر نہیں ہوا۔ اپنی ان تحریروں کو ہوا میں اُڑانے کے پیچھے کوئی مقصد ہوگا جو ابھی ہماری سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔''

دوسرے نے کہا۔ ”یہ لکھ لو کہ وہ ان غباروں کے پیچھے کوئی نہ سمجھ میں آنے والا گیم کھیل رہا ہے۔“

ایک ہفتہ گزر گیا۔ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ غبارے شہر کے کس علاقے سے چھوڑے گئے تھے۔ فوجیوں نے انہیں گن کر دیکھا تھا، وہ بارہ درجن یعنی ایک سو چوالیس غبارے تھے۔ اتنی تعداد میں وہ غبارے شہریوں سے چھپ نہیں سکتے تھے۔ یہ سمجھ میں آیا کہ شہر سے دور جنگل میں لے جا کر انہیں اڑایا گیا ہے۔

مرینہ اور مراد کو یہ بھنک مل گئی کہ پولیس اور ان کے مخبر غبارے اُڑانے والے کو ڈھونڈ رہے ہیں۔ وہ بولی۔ ”مراد! میں شرط جیت رہی ہوں۔ تمہارے غبارے سرحد پار بھی نہ جاسکے۔ یقیناً انہیں یہیں روک دیا گیا ہوگا۔“

وہ بولا۔ ”یہ تمہاری قیاس آرائی ہے۔ غباروں کو روکا نہیں گیا ہے۔ وہ سرحد پار جا چکے ہیں۔“

ان کی لاعلمی میں پولیس اور انٹیلی جنس والے سر جوڑ کر سوچ رہے تھے ’کیا کیا جائے؟ مراد نظروں میں نہیں آ رہا تھا۔ کیا ماروی کے ذریعے اس کی شہ رگ تک پہنچا جاسکتا تھا؟ اور ماروی تک شاید وہ غبارے، وہ لفافے انہیں پہنچا سکتے تھے۔ اب قانون کے رکھوالے بھی بچکانا انداز میں سوچ رہے تھے کہ ان غباروں کے پیچھے مراد کی کوئی حکمتِ عملی ہے۔

وہ فیصلہ کر رہے تھے کہ پھر ایک بار ان لفافوں کو غبارے کے ذریعے اُڑا کر ان کی دور تک نگرانی کرتے ہوئے دیکھنا چاہیے کہ وہ کس طرح ماروی تک پہنچیں گے؟ اور جب بھی پہنچیں گے تو سراغ رسانوں کو بھی ماروی تک پہنچا دیں گے۔ پھر ماروی کے ذریعے مراد تک پہنچنا کچھ مشکل نہ ہوگا۔

اعلیٰ افسران کی میٹنگ میں کہا گیا۔ ”اگر ہم یہاں سے ان دو لفافوں کو آگے روانہ کریں گے تو پتا نہیں وہ غبارے کتنے ملکوں سے گزریں گے۔ پتا نہیں ماروی کہاں ہوگی اور لفافے کہاں پہنچیں گے؟“

ایک افسر نے کہا۔ ”ہم ہر ملک میں ان اُڑتے ہوئے غباروں پر نظر نہیں رکھ سکیں گے۔ ہمیں اس سلسلے میں تمام ممالک کے حکمرانوں سے اور پولیس والوں سے تعاون کی درخواست کرنی ہوگی۔“

ایسا تو کرنا ہی تھا۔ ان غباروں اور لفافوں کے ذریعے ماروی تک پہنچنے کی امید تھی۔ انڈین ایمبیسی تمام ممالک کے سفارت خانوں سے رابطے کرنے لگی۔ ان کے پاس مراد کی دونوں تحریروں کی فوٹو کاپیاں بھیجی گئیں۔ ان سب کو یقین دلایا گیا کہ کسی ملک کے خلاف پیغام رسانی نہیں ہو رہی ہے۔ ایک خطرناک کرمنل کو بڑی رازداری سے گرفتار کرنا ہے۔

اس مقصد کے لیے تمام دوست ممالک سے تعاون کی درخواست کی جا رہی تھی۔ جب تک وہ غبارے ان کے ملک سے گزرتے رہیں، تب تک پولیس اور انٹیلی جنس والے ان کی نگرانی کرتے رہیں۔ اگر وہ نیچے زمین پر آئیں تو دیکھیں کہ وہ کس کے ہاتھ لگ رہے ہیں۔ اگر اسے پانے والی کوئی دوشیزہ نہ ہو تو ان لفافوں کو نئے غباروں کے ذریعے آگے اُڑا دیں۔ انٹرپول اور انٹرنیشنل سی آئی اے کی ٹیمیں ہر ملک میں موجود رہتی ہیں۔ ان سے بھی یہی گزارش کی گئی۔

ایسے بہت سے معاملات اور طریقہ کار طے ہو گئے کہ ماروی کے پاس پہنچنے تک ان لفافوں کو کس طرح ہوا میں اُڑاتے رہنا ہے۔ بابا اجمیری پیش گوئی کر چکے تھے کہ ہوا ہی وہ پیغام ماروی تک پہنچائے گی اور دنیا والے کچھ ایسے ہی انتظامات کر رہے تھے۔ بہرحال انڈین آرمی انٹیلی جنس والوں نے ان دو لفافوں کو ایک سو چوالیس غباروں سے باندھ کر انہیں دوبارہ فضا میں چھوڑ دیا۔

انہوں نے ایک اور لفافے کا اضافہ کیا۔ انگریزی زبان میں لکھا کہ یہ پیامِ محبت ہے۔ ان لفافوں میں دل کی دھڑکنیں ہیں انہیں نہ روکا جائے۔ آگے بڑھا دیا جائے۔

جب انہوں نے وہ غبارے چھوڑے تو شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔ رات کی تاریکی مسلط ہونے والی تھی۔ اس لیے انہوں نے ایک چارجر لائٹ باندھ دی۔ واہگہ بارڈر تک پہنچتے پہنچتے آدھی رات ہو چکی تھی۔ وہ غبارے تاریکی میں گم ہو گئے تھے۔ پاکستان کی آسمانی فضاؤں میں روشنی کا ایک نقطہ رینگتا ہوا مغرب کی سمت جا رہا تھا۔

ماروی اور مراد کے بچپن کا پیار پہاڑ سے زیادہ مضبوط تھا۔ وہ ایک ننھا سا نقطہ بن گیا تھا۔ اپنی پاک زمین کی کشش سے محروم ہو کر خلا میں ہوا کے رحم و کرم پر تھا۔ دونوں پیار کرنے والوں کے قدم اپنی دھرتی سے اکھڑ گئے تھے۔ دونوں ہی بے گھر بے وطن ہو گئے تھے۔ ان کے درمیان اب کچھ رہ گیا تھا تو روشنی کا وہ نقطہ تھا جو خلا میں بھٹکتا ہوا‘ گمشدہ محبت کو ڈھونڈ رہا تھا۔

حیرت انگیز واقعات، سحر انگیز لمحات اور سنسنی خیز گردشِ ایام کی دلچسپ داستان کا مزید احوال اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

راہِ مسدود

سلیم انور

مجرمانہ منصوبے بنانے والے اگرچہ ایک ایک پہلو پر غور کرتے ہیں لیکن... کہیں نہ کہیں سقم چھوڑ جاتے ہیں اور بس یہی وہ مقام ہوتا ہے جہاں کسی بھی مجرم کی گرفت آسان ہو جاتی ہے۔ وہ جسے چوری کرنے میں کمال حاصل تھا مگر اس پل انسانیت کے ناتے چھوٹی سی ایک نیکی نے اس کی راہ کو مسدود کردیا کیونکہ نیک عمل ہمیشہ بدی سے دور کرنے کا سبب بنتا ہے اور یہ چھوٹی سی بات اسے بہت دیر بعد سمجھ آئی تھی

چوروں کو پڑ گئے مور کے مصداق ایک دلچسپ واقعہ

سلکی نے ڈی وی ڈی پلیئر اور چاندی کے ظروف کا بکس اپنے دیگر سمیٹے ہوئے مال کے ساتھ کار کی ڈکی میں رکھ دیا اور ڈکی بند کردی۔ پھر گھوم کر تیزی کے ساتھ کار کے اگلے دروازے پر پہنچا اور دروازہ کھول کر ڈرائیونگ نشست پر بیٹھ گیا۔

اس نے کار اسٹارٹ کرنے سے قبل اپنی گھڑی پر نظر ڈالی۔ چھ بج کر چالیس منٹ ہو رہے تھے۔ رات کا اندھیرا پھیلنا شروع ہو رہا تھا۔ اس کے مخبر نے اسے یقین دہانی

کرادی تھی کہ پیر کی ہر شام چھ بجے سے رات آٹھ بجے تک اس مکان میں کوئی نہیں ہوتا اور واردات کے لیے یہ ایک پرفیکٹ اور بہترین ٹائم ہے۔

سلکی وقت کو اپنی کامیابی کی کنجی قرار دیتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اب تک اس کی تمام وارداتیں کامیاب رہی تھیں۔ وہ وقت بالکل بھی ضائع نہیں کرتا تھا۔ مکان میں داخل ہو کر وہ قیمتی سامان سمیٹتا اور پھر اس سے قبل کہ کوئی علاقے میں اجنبی کار کی موجودگی پر چوکنا ہوتا، وہ وہاں سے تیزی سے رفوچکر ہو جاتا تھا۔

کار اسٹارٹ کرنے کے بعد سلکی نے ہیڈ لائٹس آن نہیں کیں اور ڈرائیو وے کے آخر تک چلا گیا۔ پھر اسے اپنی کار روکنی پڑ گئی کیونکہ ایک بڑی سفید رنگ کی سیڈان اس پتلی سی سڑک پر آ رہی تھی جو ڈرائیو وے کے عین مقابل تھی۔ وہ اس سیڈان کے گزرنے کا انتظار کرنے لگا۔

لیکن سیڈان سڑک پر سے آگے نکلنے کے بجائے ڈرائیو وے پر عین اس زاویے پر آ کر رک گئی کہ اس کا آدھا حصہ ڈرائیو وے پر آ گیا اور آدھا حصہ تنگ سڑک پر ترچھا رہ گیا۔ سلکی کے لیے سڑک پر جانے کا کوئی راستہ نہیں رہا تھا۔

سیڈان کی ہیڈ لائٹس روشن تھیں اور اس کی چکاچوند براہِ راست سلکی کی نگاہوں کو خیرہ کر رہی تھی۔

''کیا مصیبت ہے......؟''

اتنے میں سفید سیڈان کی ڈرائیونگ سائڈ کا دروازہ کھلا اور ایک ننھی سی بڑھیا نے کار سے نیچے قدم رکھا۔ سلکی کی جانب دیکھتے ہوئے وہ بڑھیا مسکرا دی اور اس طرح ہاتھ لہرانے لگی جیسے وہ اس کی کوئی پرانی شناسا ہو۔

سلکی نے اندازہ لگایا کہ اس بڑھیا کی عمر ستر برس کے لگ بھگ ہوگی۔ وہ بڑھیا اپنے پیر گھسیٹتے ہوئے اس کی جانب آنے لگی۔ تب سلکی نے غور کیا کہ اس بڑھیا کا حلیہ خاصا مضحکہ خیز تھا۔ اس نے پیلے شوخ رنگ کا سویٹ سوٹ اور گلابی رنگ کا نرم تلے کا جوتا پہن رکھا تھا۔ اس نے اپنے نیلے چاندی جیسے بالوں کو سرخ اور سفید پولکا ڈاٹ والے ہیئر بینڈ سے باندھا ہوا تھا۔

''بھا۔'' سلکی کے حلق سے بے ساختہ کلمۂ حیرت نکل گیا۔

''لگتا ہے جیسے یہ بڑھیا کے مارٹے کے سل کی کوئی پناہ گزین ہو۔ لیکن یہ آخر چاہتی کیا ہے؟'' وہ خود سے بڑبڑایا۔

اتنے میں وہ بڑھیا اس کی کار کی کھڑکی کے پاس آ گئی اور اپنے سیاہ گول فریم کی موٹی عینک کے پیچھے سے اس کو جھانکنے لگی۔ سلکی نے اپنی کھڑکی کا شیشہ نیچے کھسکا دیا۔

''میں تکلیف دہی پر معذرت خواہ ہوں، ینگ مین۔'' وہ بوڑھوں کی مخصوص کپکپاتی آواز میں گنگنائی۔ ''لیکن تمہاری کار میرے پوتے کے کمرے کے لیے نہایت موزوں ہے۔''

سلکی حیرت سے اس بڑھیا کی صورت تکنے لگا۔

''آپ...... آپ کو میری کار اپنے پوتے کے کمرے کے لیے درکار ہے؟''

بڑھیا نے یہ سن کر اپنے دونوں ہاتھ منہ پر رکھ لیے اور ''کھی کھی'' کرنے لگی۔ ''اوہ، خدانہ کرے ایسی کوئی بات ہو۔ مجھے پوری کار نہیں بلکہ صرف اس کا رنگ چاہیے۔ میں اپنے پوتے لٹل ونسٹن کے کمرے کو ری ڈیکوریٹ کر رہی ہوں اور تمہاری کار کا رنگ بالکل وہی ہے جس کی مجھے تلاش ہے۔ یہ کون سا رنگ ہے؟''

سلکی نے اندازہ لگایا کہ یہ بڑھیا نہ صرف فیشن کی دلدادہ ہے بلکہ قدرے باؤلی بھی ہے۔ ''آں، یہ گرین کلر ہے، مادام۔'' سلکی نے جواب دیا۔

وہ بڑھیا دوبارہ ''کھی کھی'' کرنے لگی۔ ''اوہ، میں بھی کتنی احمق ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ یہ گرین کلر ہے۔ لیکن آج کل ہر رنگ کے کئی شیڈ آ رہے ہیں۔ میرا مطلب ہے کہ یہ گرین کا کون سا شیڈ ہے؟''

سلکی بہ مشکل تمام اپنے غصے کو ضبط کیے ہوئے تھا۔ وہ بولا۔

''آئی ایم سوری۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہ درحقیقت کون سا شیڈ ہے۔ مجھے کلر شیڈز کی پہچان نہیں ہے۔ کیا اب آپ اپنی کار سامنے سے ہٹانے کی زحمت کریں گی؟ میں ذرا عجلت میں ہوں۔''

اس بڑھیا نے سلکی کی بات پر قطعی دھیان نہیں دیا۔ سلکی سوچنے لگا کہ کہیں یہ بڑھیا بہری بھی تو نہیں۔

بڑھیا اپنی ایک انگلی اپنی ناک پر رکھتے ہوئے سلکی کی کار کا پہلو سے جائزہ لینے لگی۔ ''پہلے تو میرا خیال تھا کہ یہ فاریسٹ گرین ہے۔'' وہ بڑبڑائی۔ ''لیکن یہ اس سے ہلکا رنگ ہے۔ ہم م م...... شاید ہنٹر گرین ہے۔''

''بالکل یہی شیڈ ہے۔'' سلکی نے تیزی سے کہا۔ ''ہنٹر گرین۔ اب پلیز آپ اپنی کار آگے بڑھا دیں......''

''مجھے معلوم ہے!'' بڑھیا نے اس مرتبہ بھی اس کی بات نظر انداز کر دی۔ ''میں اپنے رنگوں کے نمونے لے کر

آتی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ ڈھیلے قدموں سے اپنی کار کی جانب چل پڑی۔

اس دوران سلکی صورت حال کا جائزہ لینے لگا۔ وہ اپنی کار بڑھیا کی کار سے بچا کر نہیں نکال سکتا تھا۔ کار کے نکلنے کی کوئی گنجائش نہیں تھی کیونکہ ڈرائیووے کے دونوں جانب گھنی جھاڑیوں کی باڑھ تھی۔ وہ پھنس کر رہ گیا تھا۔

اس کی واحد امید یہی تھی کہ بڑھیا اپنے پوتے للل ونسٹن کے کمرے کے کلر کا فیصلہ جلدی سے کر لے اور اپنی راہ پکڑلے۔ اگر ایسا نہیں ہوا تو اسے بڑھیا کو ہلکی ضرب لگانا پڑے گی تاکہ اس کی کار کو راستے سے خود ہٹا دے۔

اسے تشدد پسند نہیں تھا۔ خاص طور پر کسی کی دادی یا نانی پر تشدد! نہ ہی وہ قید خانے میں طویل مدت گزارنے کے آئیڈیے کو پسند کرتا تھا۔ اس کے علاوہ اس بڑھیا کو دیکھ کر اسے اپنی دادی یاد آگئی تھی۔ اس کی دادی اس کا آئیڈیل اس کا رول ماڈل اور اس کی ٹیچر رہی تھی۔ وہ اپنی دادی کی بخشش کی دعا مانگنے لگا۔

اتنے میں وہ بڑھیا واپس پلٹ آئی۔ اس نے مٹھی بھر مقدار میں رنگین کاغذوں کی دھجیاں دبوچی ہوئی تھیں۔

سلکی یہ دیکھ کر اپنی نشست پر ڈھیر ہو گیا۔ جب بڑھیا نے کاغذ کی ایک دھجی اس کی کار کے ہڈ پر رکھی تو سلکی کا غصہ عود کر آیا۔ بڑھیا کئی لمحوں تک اس دھجی کا بہ غور جائزہ لیتی رہی۔ پھر اس دھجی کو مروڑ کر اپنے شانوں پر سے پیچھے کی جانب اچھال دیا۔

پھر اس نے اگلی دھجی کے ساتھ بھی یہی کیا۔ پھر اگلی دھجی کے ساتھ۔ پھر اس سے اگلی دھجی کے ساتھ۔

وہ مسلسل یہی کیے جارہی تھی اور سلکی کا پیمانہ صبر لبریز ہو رہا تھا۔ بڑھیا کو ہلکی ضرب لگانے کا خیال اب شدت اختیار کرتا جارہا تھا۔ اسے اب یہاں سے نکلنے کا واحد حل یہی دکھائی دے رہا تھا۔ لیکن وہ نہ جانے کیوں ضبط کیے ہوئے تھا۔

لگ بھگ پانچ منٹ بعد بالآخر اس بڑھیا نے ایک دھجی کار کے ہڈ پر لگانے اور اس کا بغور جائزہ لینے کے بعد اوپر کی جانب اٹھا کر سلکی کی طرف لہرائی اور بلند آواز سے بولی۔ "اس کے بارے میں کیا خیال ہے؟ تم کیا کہتے ہو؟"

"پرفیکٹ!" سلکی نے .... ونڈ شیلڈ کے پیچھے سے چیختے ہوئے جواب دیا۔ "یہ بالکل پرفیکٹ ہے۔ اب آپ برائے مہربانی اپنی کار راستے سے ہٹا دیں۔"

بڑھیا نے اپنی منتخب کردہ دھجی کو آنکھوں کے قریب

لاعلاج

پیارے بچوں آج ہم ایک عجیب وغریب مخلوق کے بارے میں پڑھیں گے۔ اس جاندار کا نام ہے، بیوی......

جی ہاں......سرائیکی اور سندھی میں اسے...... ڈال۔

پنجابی میں......ووہٹی۔
بنگالی میں......بَو
اردو میں......بیگم۔
انگلش میں......وائف۔
ہندی میں......پتنی۔

لیکن یہ سارے نام ایک ہی بلا کے ہیں۔

یہ اپنے شوہر کے ساتھ پائی جاتی ہے۔ اس کی پسندیدہ غذا شوہر کا دماغ کھانا ہے۔ اس کو اکثر ناراض ہونے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے دیکھا گیا ہے۔ اس کا سب سے خطرناک ہتھیار رونا ہے اور اموشنلی بلیک میلنگ ...... بیوی رکھنے پر ٹینشن نام کی بیماری ہو جاتی ہے جو لاعلاج ہے۔ شادی شدہ لوگ فکر کریں۔ غیر شادی شدہ شکر کریں۔

مرسلہ۔ محمد جاوید، تحصیل علی پور

☆☆☆

جھوٹا

ایک آدمی جھوٹ بولنے کی وجہ سے کافی مشہور تھا۔ ایک دن وہ کسی دوسرے شہر گیا۔ ایک اسّی سالہ بوڑھی عورت کو پتا چلا تو وہ اس کے پاس پہنچی اور بولی۔

"بیٹا! تم ہی دنیا کے سب سے بڑے جھوٹے ہو نا؟"

آدمی بولا۔ "لوگوں کی باتوں کو دفع کریں۔ میں تو آپ کو دیکھ کر حیران ہوں کہ اس عمر میں بھی یہ حسن، یہ جمال، یہ رعنائی اور یہ دلکشی۔"

بوڑھی عورت شرماتے ہوئے بولی۔ "ہائے اللہ! لوگ بھی کتنے ظالم ہیں۔ اچھے بھلے سچے انسان کو جھوٹا کہتے ہیں۔"

مرسلہ۔ اطہر حسین، کراچی

لا کر چند سیکنڈ تک غور سے دیکھا اور پھر اسے دور بازو تک کے فاصلے پر لے گئی اور اس کا جائزہ لینے کے بعد اثبات میں سر ہلانے لگی۔

''آہا!'' سلکی نے سوچا۔ ''بالآخر اس نے فیصلہ کرلیا!''

لیکن سلکی کی تمام امیدیں اس وقت دم توڑ گئیں جب بڑھیا نے اپنی ناک سکیڑتے ہوئے نفی میں سر ہلایا، دھجی کو مروڑا اور اسے پیچھے اچھال دیا۔ پھر وہ اگلی دھجی کا جائزہ لینے لگی۔

اب سلکی سے یہ سب برداشت نہیں ہوا۔ اس نے فیصلہ کرلیا کہ اب اسے بڑھیا کو ضرب لگانی ہی پڑے گی۔ اس کے بغیر اس کی بات بڑھیا کی سمجھ میں نہیں آئے گی۔

سلکی اطمینان سے اپنی کار سے نیچے اتر آیا اور معمول کے انداز میں اپنی کار کے اگلے حصے کی جانب بڑھنے لگا۔ اس کا ارادہ بڑھیا کو ہلکی سی ضرب لگانے کا تھا تاکہ وہ صرف اتنی سی دیر کے لیے بے ہوش ہوجائے کہ وہ اس کی سیڈان راستے سے ہٹادے۔

بڑھیا کو ضرب لگانے سے پہلے اس نے سڑک کا جائزہ لینا ضروری سمجھا۔ اس نے بائیں طرف دیکھا۔ سڑک بالکل خالی تھی۔ لیکن جب اس نے دائیں طرف دیکھا تو دور ایک کار سڑک پر ٹرن ہوتی دکھائی دی۔ کار کی ہیڈلائٹس روشن تھیں۔

سلکی نے اطمینان کا سانس لیا۔ اب تو بڑھیا کو اپنی کار ہٹانا لازمی ہوگی کیونکہ اس کی کار کے عقبی حصے نے پتلی سڑک کے آدھے حصے کو گھیرا ہوا تھا اور آنے والی کار کے گزرنے کا راستہ بالکل بھی نہیں تھا۔

''گڈ!'' سلکی دل ہی دل میں خوش ہوگیا۔ وہ دل سے اس بڑھیا دادی کو ضرب لگانے کا خواہش مند نہیں تھا۔ اب تو بڑھیا کو ضرب لگانے کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔

''لگتا ہے کہ اب تو آپ کو اپنی کار ہٹانا ہی پڑے گی۔'' سلکی نے کہا۔ ساتھ ہی انگوٹھے سے سڑک کی جانب اشارہ کیا اور بولا۔ ''وہ یہاں سے گزر نہیں سکیں گے کیونکہ آپ کی سیڈان رکاوٹ بنی ہوئی ہے۔''

بڑھیا نے ایک اچٹتی نگاہ آتی ہوئی کار پر ڈالی اور اثبات میں سر ہلادیا۔ ''تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو۔ لیکن وہ یہاں سے گزرنا نہیں چاہیں گے۔ وہ یہاں تمہارے لیے آئے ہیں۔''

سلکی نے یہ سن کر دوبارہ آتی ہوئی کار کی جانب دیکھا۔ اس مرتبہ اس کی نگاہ پہلے کار کے پہلو میں پولیس کے امتیازی نشان پر، پھر کار کے اوپر لگی ہوئی رنگین روشنیوں پر اور آخر میں ان دو باوردی پولیس افسران پر پڑی جو کار میں بیٹھے ہوئے تھے۔ درشتی ان کے چہروں سے عیاں تھی۔

''انہیں میں نے طلب کیا ہے۔'' بڑھیا نے پُرسکون لہجے میں کہا۔ پھر گھٹنوں کے بل جھک گئی اور کاغذ کی ان رنگین دھجیوں کو سمیٹنے لگی جو کچھ دیر پہلے وہ ایک ایک کرکے اچھالتی رہی تھی۔

''میں گھر واپس آرہی تھی تو دیکھا کہ تم میرے گھر سے چیزیں سمیٹ کر نکل رہے تھے۔'' یہ کہہ کر وہ اپنے مخصوص انداز میں ''کھی کھی'' کرنے لگی۔ ''کیا سیل فونز ایک حیرت انگیز ایجاد نہیں ہیں؟ یہ تو اچھا ہوا کہ میری کراٹے کی کلاس کینسل ہوگئی ورنہ مزید ایک گھنٹے سے قبل میری گھر واپسی ممکن نہیں تھی۔''

''آپ ...... آپ کا گھر؟'' سلکی کی زبان لڑکھڑانے لگی۔

''لیکن اپنے پوتے کے کمرے کے لیے رنگوں کے انتخاب کا یہ کھڑاگ کیا تھا؟''

''اوہ یہ......'' وہ بدستور کاغذ کی ان رنگین دھجیوں کو سمیٹنے میں مگن رہی۔ ''میں نے تو اس کے کمرے کے لیے کلر آج سہ پہر ہی خرید لیا تھا۔ ڈیزرٹ پیچ کا شیڈ! للل ونسٹن کو یہ کلر بے حد پسند آئے گا۔ لیکن مجھے تمہیں یہاں مصروف رکھنا ضروری تھا اور اس کے لیے مجھے یہ کھڑاگ پھیلانا پڑا۔''

سلکی نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے اپنے سر کو جنبش دی۔

وہ سوچنے لگا کہ مضحکہ خیز حلیے اور گلابی رنگ کے نرم تلے والے جوتے پہننے والی چالاک بڑھیا دادی نے اسے شکست دے دی ہے۔ اب وہ کچھ نہیں کرسکتا تھا، سوائے اس کے کہ اپنی قسمت کے فیصلے کو بے چون وچرا تسلیم کرلے اور جو جائز پیشکش ہے وہ بھی کردے۔

''میں آپ کی چیزیں آپ کو لوٹا رہا ہوں، مادام!'' سلکی نے کہا۔ ''میری طرف سے للل ونسٹن کو پیغام دے دینا کہ مجھے امید ہے اسے اپنے کمرے کا نیا رنگ اور نیا شیڈ پسند آئے گا۔''

''تم خود ہی اسے بتادو۔'' بڑھیا نے ہلکی سی ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔ اس کی آنکھوں میں ایک شوخ چمک تھی۔ ''اس ہینڈسم نوجوان باوردی افسر کو دیکھ رہے ہو جو پولیس پٹرول کار سے نیچے اتر رہا ہے؟ وہی میرا پوتا للل ونسٹن ہے!''

قربانی

آصف ملک

ہمارے ملک کی سیاست کا حال کچھ ایسا ہی ہے جیسے حمام میں سب ایک جیسے... البتہ حمام سے باہر سب اپنی پوشاک اور معیار کے حوالے سے اپنی انفرادیت قائم رکھنے کی تگ ودو میں مصروف دکھائی دیتے ہیں۔ جس کی جتنی بساط وہ اتنی ہی اپنی چادر جوڑ لگا لگا کر بڑی کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اب اس کوشش میں کسی کو دھکا دینا پڑے... کوئی پیروں تلے کچلا جائے۔ یہ سوچنا اب کسی باشعور کے بس کی بات تو نہیں رہی۔ قربانی لینے والے قربانی لیتے جارہے ہیں اور دینے والے دینے پر مجبور ہیں۔

زندگی کے تلخ حقائق اور خطرات سے آگاہ کرتی ایک پرفکر تحریر

دربار کی بیشتر روشنیاں گل تھیں اور اس کی وجہ یقیناً بجلی کی کمی نہیں تھی کیونکہ ظلِ الٰہی کے لیے بجلی سمیت دنیا کی کسی نعمت کی کوئی کمی نہیں تھی جبکہ ملک میں بجلی سمیت تمام ہی نعمتوں کی شدید قلت تھی...... مگر صرف عوام کے لیے۔ یہاں بجلی جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ ایسی کسی صورت میں بہت سے لوگوں کی نوکری بھی بجلی کے ساتھ چلی جاتی۔ عام حالات میں دربار کی تمام روشنیاں مسلسل دن رات کی تمیز کے بغیر جلتی رہا کرتی تھیں۔ مگر گزشتہ رات ظلِ

الٰہی کے حکم سے خاص طور سے وہ روشنیاں جو براہِ راست ان کے چہرے پر پڑ کر ان کی نیند میں خلل اندازی کی مرتکب ہو رہی تھیں وہ گل کر دی گئیں۔ ملک کے حالات سے پریشان ہو کر ظلِ الٰہی نے اب اپنے کرسی نما تخت پر سونے کا فیصلہ کیا تھا۔ انہیں خوف تھا کہ کہیں وہ استراحت کے لیے خواب گاہ تشریف لے جائیں اور پیچھے کوئی اور کرسی پر براجمان ہو جائے جسے اتارنا ان کے بس سے باہر ہو۔

ویسے بھی تاریخ گواہ تھی کہ کرسی پر آنے والا جاتا نہیں جب تک اس کے جانے کا بندوبست نہ کر دیا جائے۔ اس لیے حفظِ ماتقدم ظلِ الٰہی نے رات بھر کرسی پر سونے کا فیصلہ کیا۔ کئی بے آرام راتوں کے بعد انہوں نے نیند کی کمی کا ذمے دار ان تیز روشنیوں کو قرار دیا جو عین ان کے منہ پر جلتی تھیں۔ گزشتہ رات انہیں بند کرا کے وہ یقیناً چین کی نیند سوئے تھے مگر عین فجر میں مؤذن نے نیند میں خلل ڈالا مگر پہریدار سے کھڑکی بند کروا کر ظلِ الٰہی چین کی نیند سو گئے مگر جاگنے سے قبل انہوں نے عجیب سا خواب دیکھا جس میں بکرے تھے اور قصائیوں جیسے ہاتھ چھریاں اور بغدے لہرا رہے تھے۔ بکرے نہایت شاندار اور پلے پلائے تھے۔ اگر ان کی شکل و شباہت سو فیصد بکروں جیسی نہ ہوتی تو ظلِ الٰہی انہیں سرکاری اعمال سمجھتے کیونکہ موجودہ حالات میں ایسی شاندار صحت صرف سرکاری خزانے پر پلنے والوں کی ہی ہوتی ہے۔

تشویشناک بات یہ تھی کہ ایک کنگ سائز چھری ان کی گردن کے بالکل آس پاس لہرا رہی تھی۔ مارے خوف کے ظلِ الٰہی کی آنکھ کھلی تو خواب ذہن میں بالکل تازہ تھا۔ انہوں نے آس پاس دیکھا اور انگڑائی لے کر اپنا جسم کھولا اور دل میں فیصلہ کیا کہ وہ جلد کرسی کی جگہ تخت رائج کریں گے۔ جب وہ اقتدار میں آئے تو سابق ظلِ الٰہی تخت ہی استعمال کرتے تھے۔ وہ ریڑھ کی ہڈی کے مہروں کے مریض تھے اور ڈاکٹر نے انہیں تخت پر سونے کا مشورہ دیا تھا مگر یہی تخت ان کا تختہ ثابت ہوا، اس لیے موجودہ ظلِ الٰہی نے اقتدار کی دہلیز پر قدم رنجہ فرماتے ہی تخت کو اٹھوا کر شاہی کباڑ خانے میں رکھوا دیا۔ تخت خالص سونے کا تھا اور اس میں جڑے ہیرے موتی بھی اصلی تھے۔ اس لیے پہلے تو ہیرے موتی غائب ہوئے۔ اس میں سے ستر فیصد ملکۂ عالیہ نے لے کر زیورات میں جڑوا لیے اور باقی تیس فیصد شاہی کباڑ خانے کے نگران اور متعلقہ سرکاری اعمال میں تقسیم ہو گئے۔ موجودہ ملکۂ عالیہ اکیلے کھانے کی عادی نہیں تھیں بلکہ وہ مل بانٹ کر کھانے کے فارمولے پر یقین رکھتی تھیں کیونکہ جب سب ہی کھانے والے ہوں تو پکڑنے والا کوئی باقی نہیں رہتا۔ کچھ عرصے بعد سرکاری کباڑ خانے کے آڈٹ کی تشویشناک رپورٹ جو ہمیشہ تشویشناک ہوتی تھی...... میں سونے کے تخت کی گم شدگی کا سرسری سا ذکر تھا۔ کیونکہ ذکر بھی سرسری تھا اس لیے کسی نے نوٹس نہیں لیا۔ ویسے بھی وہ کام کی چیز تو تھی نہیں جس کی فکر کی جاتی۔

اسی تخت اور تختے کے خوف سے ظلِ الٰہی نے کرسی کو ترجیح کی۔ اگرچہ یہ بھی آرام دہ تھی مگر وہ تخت کی سی بات کہاں جس میں آدمی کی کمر سیدھی رہتی ہے چاہے وہ زندہ ہو یا مردہ۔ کرسی میں صرف اقتدار کی کلیں سیدھی رہتی ہیں اور کمر کا تختہ ہو جاتا ہے۔ اگر فی الحال خواب کا مسئلہ نہ ہوتا تو وہ جاگتے ہی دربار کی مرمت اور دیکھ بھال کے محکمے کے وزیر کو طلب کر لیتے جو رشتے میں ظلِ الٰہی کے برادرِ نسبتی بھی لگتے تھے مگر خواب زیادہ اہم تھا۔ اس کی تعبیر اور پھر آگے کی کارروائی جیسے کاموں کے لیے ظلِ الٰہی نے دو رتن پال رکھے تھے۔ بے لگام میڈیا کی آزادی کے دور اور ملک کی پتلی مالی حالت کے پیشِ نظر نو میں سے باقی سات رتنوں کی اسامیاں فی الحال خالی تھیں۔

ظلِ الٰہی کیونکہ اپنی رعایا کو قطع نظرِ مذہب و ملت کے ایک سی نظر سے دیکھتے تھے اور رعایا کا تعلق صنفِ نازک سے ہو تو بہت عزیز نظر سے دیکھتے تھے۔ اس لیے انہوں نے تاریخی ظلِ الٰہی کی پیروی کرتے ہوئے برصغیر کی دونوں اقوام میں سے ایک ایک رتن چن لیا تھا کیونکہ دو پیازہ آؤٹ آف ڈیٹ ڈش ہو چکی تھی اور بیربر سے ظلِ الٰہی کو ویسے ہی بیر تھا۔ بچپن میں انہوں نے بیر منہ کے بجائے ناک میں ڈال لیا تھا اور جب اسے واپس نکالا جا رہا تھا تو وہ قیامت خیز لمحات ظلِ الٰہی کو تاعمر یاد رہے۔ وہ تو اس ڈاکٹر کو بھی نہیں بھولے تھے جس نے بیر نکالا تھا۔ تاج و تخت سنبھالتے ہی انہوں نے اس ڈاکٹر کو سرکاری اسپتال سے بلوا کر شاہی اصطبل میں گھوڑوں کی مالش پر مامور کر دیا تھا۔ بیر کی طرح ظلِ الٰہی کو بل وغیرہ سے بھی چڑ تھی۔ ظلِ الٰہی بنتے ہی انہوں نے شاہی محل کے تمام بل بند کرا دیے تھے۔ اس کے بعد انہوں نے کم سے کم ایسا کوئی بل نہیں چھوڑا جس کی ادائیگی انہیں جیبِ خاص سے کرنی پڑے۔

ظلِ الٰہی کیونکہ جدید طرز کے کھانوں کو پسند فرماتے تھے اس لیے ملا کو دو پیزا کا خطاب ملا۔ راجا نے اپنی تقرری کے دن ظلِ الٰہی کی خدمت میں ایسی پیزا پیش کی جس کے

ڈالنے لگے کہ انہیں جھوم جانے پر مجبور کر دیا اور انہوں نے اسی ترنگ میں راجا کو راجا بیئر کا خطاب دیا۔ بل کا اضافہ بیئر کے بل کی وجہ سے ہوا تھا لیکن کیونکہ اس کی ادائیگی سرکاری خزانے سے ہوئی تھی اس لیے ظلِ الٰہی نے ناک بھوں چڑھانے سے گریز کیا۔ اس کے بعد بھی راجا بیئر بل آئے دن مختلف اقسام کے بل پیش کرتا رہتا تھا۔ اس لیے بل اس کے خطاب کا ایک لازمی حصہ بن گیا۔ ملا دو پیزا اور راجا بیئر بل کے آپس میں تعلقات سوتنوں جیسے تھے مگر ظلِ الٰہی کے سامنے وہ باہمی اخوت کے عظیم الشان مظاہرے کرتے تھے اور ایک دوسرے کی ٹانگ بھی اتنے سلیقے سے کھینچتے تھے کہ ظلِ الٰہی کو پتا بھی نہیں چلتا تھا۔ وہ ٹانگ کھینچنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے۔ ہاں اگر معاملہ کمیشن کا ہوتا تو دونوں ایک ہو جاتے تھے۔

جاگنے کے بعد کرسی پر کمر سیدھی کرنے کی مشق نے اگرچہ انہیں معبودِ حقیقی کی یاد دلا دی تھی مگر ان کے منہ سے جو آواز نکلی اسے کراہ آمیز فریاد یا فریاد آمیز کراہ ہی کہا جا سکتا تھا۔ ابھی کراہ صحیح سے دربار کی فضا میں تحلیل بھی نہیں ہوئی تھی کہ دائیں بائیں سے ملا دو پیزا اور راجا بیئر بل نکل کر سامنے آئے اور آداب بجالائے۔ کچھ عرصے پہلے راجا بیئر بل نے آداب بجالانے میں ایک جدت پیدا کی اور جب وہ جھک کر سات فرشی سلام کرتا تو ہاتھ کی جنبش کے ساتھ موسیقی جیسی مدھر آواز نکلتی تھی۔ راجا بیئر بل نے اس کی توجیہہ یہ پیش کی کہ لفظ بجالانے میں آواز لازمی شامل ہوتی ہے۔ اس لیے آداب بجالانے میں بھی آواز از حد ضروری ہے۔ ملا دو پیزا نے اسے بیکار محض قرار دیا اور ساز بنانے والے سے ساز باز کر کے ساز میں عجیب سی تبدیلی کرادی۔

اگلی بار راجا بیئر بل دربار میں حاضر ہوا تو پہلے سے آداب بجالانے والے پوز میں تھا اور اسے فرشی سلام کے لیے جھکنے کی زحمت نہیں کرنا پڑی تھی۔ بتدریج راجا بیئر بل انسانوں کی طرح کھڑے ہونے کے قابل ہوا تو اس نے آداب بجالانے میں کسی بھی جدت سے نہ صرف توبہ کی بلکہ اس بارے میں ایک وصیت بھی کی کہ اس کی آئندہ نسلوں میں بھی کوئی ایسی غلطی نہ کرے۔ اس قسم کی چپقلشوں سے قطع نظر ظلِ الٰہی کے دونوں رتن نہ صرف ان کے منہ کو بلکہ ان کی ان بوتلوں کے منہ بھی لگے ہوئے تھے جن کا رنگین پانی ان کی راتوں کو زیادہ رنگین اور روشن کرتا تھا، اگرچہ اس شغلِ آب کے آخر میں ان کی آنکھوں کے آگے اندھیرا ہی آتا تھا۔ اس رنگین پانی سے استفادے کے لیے ملا دو پیزا اور راجا بیئر بل میں صبح سویرے آنے کی جنگ شروع ہوئی جو بالآخر یہاں تک پہنچی کہ دونوں نے شام کو گھر ہی جانا چھوڑ دیا اور ظلِ الٰہی کے مدہوش ہونے تک وہ ان کے آس پاس ہی رہتے۔ جب تک رنگین بوتلوں کا باقی ماندہ پانی ختم ہوتا وہ دونوں بھی مدہوش ہو کر گھر جانے کے قابل نہیں رہتے تھے۔

رنگین پانی کی حرمت کا مسئلہ ملا دو پیزا نے ایک خود ساختہ فتوے سے حل کر لیا تھا مگر اس سے دوسرے خانہ مسائل پیدا ہونے لگے جن کا حل کسی بھی فتوے سے ممکن نہیں تھا۔ ملا دو پیزا کی دوسری اور راجا بیئر بل کی تیسری بیوی نے ہمیشہ کے لیے رخصتی کی دھمکی دی تو انہیں آپس میں معاہدہ کرنا پڑا۔ اب دونوں صبح سویرے آتے تھے اور ظلِ الٰہی کے جاگنے سے پہلے ان کی بچ جانے والی بوتلوں کا صفایا کر چکے ہوتے تھے۔ اگر رنگین پانی زیادہ مقدار میں ہوتا تو وہ اسے آئندہ کے لیے محفوظ کر لیتے تھے کیونکہ بعض دفعہ ظلِ الٰہی جھونک میں آ کر حرم خاص تشریف لے جاتے تھے اور ان دونوں کی رسائی وہاں تک نہیں تھی مگر ایسا بہت کم ہوتا تھا۔ مگر چند دن سے ظلِ الٰہی دربار میں کرسی پر سو رہے تھے۔ تب سے شغلِ آب حرام کم کر دیا تھا اور ایک ہی بوتل منگواتے تھے جو عام طور سے سونے سے پہلے خالی کر چکے ہوتے تھے۔ وہ دونوں فکر مند تھے کہ اب ان کے نشے پانی کا کیا ہوگا؟ ظلِ الٰہی نے انہیں پہلی بار اتنی صبح دیکھا تھا۔ اس لیے وہ ذرا سہم گئے۔ ویسے بھی وہ بدشگون سا خواب دیکھ کر جاگے تھے۔ اس لیے دریافت فرمایا۔ ''کیا رات میں کوئی تبدیلی آگئی ہے؟''

''تبدیلی آچکی ہے مہابلی۔'' راجا بیئر بل نے آداب بجالاتے ہوئے کہا۔

ظلِ الٰہی کی فکر میں اضافہ ہو گیا۔ ''کیسی تبدیلی؟''

''یہی کہ مہابلی اب آرام دہ بستر کے بجائے عوام کی فکر میں کرسی پر سو رہے ہیں۔''

ظلِ الٰہی کی فکر دور ہوئی اور وہ مسکرانے لگے۔ ''درست کہتے ہو بیئر بل! ہم نہ صرف عوام کی فکر میں یہاں سو رہے ہیں بلکہ عوام کی فکر میں ہی ٹھیک سے نیند بھی نہیں آرہی۔''

''اور ہمیں ظلِ الٰہی کی فکر ہے۔'' ملا دو پیزا نے بات آگے بڑھائی۔ ''آپ کئی رات سے سکون سے نہیں سو رہے۔''

''ہمارا سکون حالات نے غارت کر دیا ہے۔ جب ہم سوچتے ہیں کہ ہماری رعایا، بھوکی اور بغیر بجلی کے سو رہی ہے تو یہ خدا نوالہ ہمارے حلق میں اٹک جاتا ہے۔'' ظلِ

الٰہی نے کہا اور نوالے پر انہیں یاد آیا۔ ''آج ناشتے کا مینیو کیا ہے؟''

''لاہور سے سری پائے اور کابل سے چپلی کباب آرہے ہیں۔'' ملا دو پیزا نے مینیو پیش کیا۔

''طیارہ کل رات ہی روانہ کر دیا گیا تھا۔'' راجا بیربل نے اپنی کارگزاری پیش کی۔ اتفاق سے محکمہ ہوا بازی اور اس سے متعلقہ امور اسی کے سپرد تھے۔

''جی ظلِ الٰہی اور اس طیارے کے مسافر دیارِ غیر کے ایک ائرپورٹ پر انتظار کر رہے ہیں۔'' ملا دو پیزا نے سرسری سے انداز میں کہا۔

راجا بیربل نے فوری صفائی پیش کی۔ ''ناشتے کے لیے مخصوص طیارہ انجن کی خرابی کی وجہ سے پرواز کے قابل نہیں ہے اس لیے ائرلائن کا طیارہ روانہ کرنا پڑا۔ جب تک مہابلی حوائج ضروریہ اور غیر ضروریہ سے فارغ ہوں گے ناشتا دسترخوان پر لگ چکا ہوگا۔''

ناشتے کی طرف سے اطمینان کے بعد ظلِ الٰہی کی توجہ اپنے خواب کی طرف مبذول ہوگئی اور دیارِ غیر میں طیارے کا انتظار کرتے مسافران کی توجہ کے قابل نہیں رہے تھے۔ انہوں نے اپنا ترچھا ہوجانے والا تاج سر پر درست کیا اور بولے۔ ''آج ہم نے عجیب سا خواب دیکھا۔''

ملا دو پیزا اور راجا بیربل نے بیک وقت کہا۔ ''غلام ہمہ تن گوش ہیں۔''

''آپ ہمہ تن نہیں، ہمارے دور تن ہیں۔'' ظلِ الٰہی نے خفگی سے فرمایا۔ بچپن سے ظلِ الٰہی کو تعلیم سے نفرت تھی اور انہوں نے بہت رو پیٹ کر میٹرک کیا تھا مگر اس میں ان کی ذاتی صلاحیتوں کا عمل دخل مشکل سے ایک فیصد ہی تھا۔ باقی ساری محنت ان کے اساتذہ اور پیپرز لینے والے عملے کی ہوتی تھی۔ اردو ذرا بھی گاڑھی ہوتی تو ان کی سماعت کے راستے دماغ میں نہیں اترتی تھی۔

''مطلب یہ کہ ہم سننے کے منتظر ہیں۔'' راجا بیربل نے عادت سے مجبور ہو کر وضاحت کی۔

''آپ کتنا سننا چاہتے ہیں؟'' ظلِ الٰہی نے مزید چڑ کر فرمایا۔ ''ابھی کل ہی ہم نے آپ کو کتنی سنائی تھیں۔ ہمشیرہ کی فلائٹ پورے ساڑھے سولہ منٹ کی تاخیر سے پہنچی تھی۔ انہیں وی وی آئی پی لاؤنج میں انتظار کی کتنی زحمت برداشت کرنا پڑی تھی۔''

''مہابلی! ہم شاہی خواب سننے کے منتظر ہیں۔'' راجا بیربل نے مزید وضاحت کی۔

''اوہ ہاں...... تو ہم کہہ رہے تھے کہ رات عجیب سا خواب دیکھا۔ اس میں ہر طرف پلے پلائے بکرے تھے۔''

ملا دو پیزا نے پُرفکر لہجے میں کہا۔ ''ظلِ الٰہی.... خدانا خواستہ آپ نے خواب میں سرکاری اعمال کی میٹنگ تو نہیں دیکھ لی تھی۔''

''یہ خدا اگر نظر آنے والی شکلیں بالکل بکروں کی سی نہ ہوتیں تو ہم بھی یہی سمجھتے۔'' ظلِ الٰہی نے خوش ہو کر کہا۔ ''مگر ساتھ میں چھریاں اور بغدے بھی دکھائی دیے۔''

''عید قریب ہے۔'' راجا بیربل نے سرگوشی میں ملا دو پیزا سے کہا۔ ''مہابلی نے اسی مناسبت سے خواب دیکھا ہے۔''

ملا دو پیزا نے جوابی سرگوشی کی۔ ''عید پر یاد آیا کہ بیگم نمبر ایک، دو اور چار نے عید کی شاپنگ کے لیے لسٹ تیار کر لی ہے۔ تیسری نمبر والی ایڈوانس میں شاپنگ کر چکی ہیں۔''

''اپنی بھی دیوالی اور دوالیا قریب ہے۔'' راجا بیربل نے سرد آہ بھری۔ ''یہاں بھی لسٹ تیار ہو رہی ہے مگر کمیشن کی کوئی صورت نظر نہیں آرہی۔''

ملا دو پیزا کی گول آنکھیں مزید گول ہوگئیں اور اس نے انہیں گھما کر کہا۔ ''تب سمجھ لو کہ خدا نے خواب کی صورت میں ہمیں ایک موقع دیا ہے۔''

راجا بیربل نے اعتراض کیا۔ ''وہ کیسے؟''

''یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔'' ملا دو پیزا نے کہا۔

''کمیشن طے کیے بغیر نہیں چھوڑ سکتا۔''

''ساٹھ چالیس ٹھیک رہے گا؟''

''آدھا آدھا۔''

''تجویز میری ہے۔''

''تمہاری کوئی تجویز میرے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتی۔''

''براہِ راست کمیشن میں آدھا آدھا اور جو اپنی محنت سے کمائیں گے، وہ اسی کا ہوگا۔'' ملا دو پیزا نے تجویز میں ترمیم پیش کی۔

''وہ کیسے کمائیں گے؟''

''یہ تمہارا کام ہے۔'' ملا دو پیزا نے اطمینان سے کہا۔ ''بولو منظور ہے ورنہ میں اپنی تجویز اکیلے میں پیش کر دوں گا۔''

اس دھمکی پر راجا بیربل بادل ناخواستہ راضی ہو گیا۔ ملا دو پیزا نے ظلِ الٰہی کے سامنے جھک کر کہا۔ ''ظلِ الٰہی مجھے لگ رہا ہے خدانا خواستہ، اللہ نہ کرے وغیرہ وغیرہ، حضور

پر کوئی آفت آنے والی ہے اور اس سے بچنے کے لیے خواب میں آپ کو قربانی کا اشارہ دیا گیا ہے۔''
''کیسی قربانی؟'' ظلِ الٰہی فکر مند ہو گئے۔ ''اگرچہ ولی عہد سخت ناخلف ہے مگر ہم اس کی قربانی نہیں دے سکتے۔ وہ ہمارا اکلوتا فرزند اور ولی عہد ہے۔''
''خدا نہ کرے جو ولی عہد پر آنچ بھی آئے۔ قربانی سے مراد کسی اچھے سے جانور کی قربانی ہے۔'' ملا دو پیزا نے چالاکی سے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''حضور اشارہ کریں تو ایک سے بڑھ کر ایک جانور قربانی کے لیے لیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ ملک کا سارا خزانہ بھی ظلِ الٰہی کے لیے ہے مگر اس کے لیے آئی ایم ایف سے بھی قرض لیا جا سکتا ہے۔''
''اچھا، اچھا...... جانور؟'' ظلِ الٰہی نے سکون کا سانس لیا۔ ''مگر یہ آئی ایم ایف کہاں سے درمیان میں آ گیا۔ ہم بکرا قربان کرتے جا رہے ہیں یا نیلا باغ ڈیم بنانے؟''
''مہابلی۔'' راجا بیرّبل نے ملا دو پیزا کی ہمنوائی کی۔ ''کوئی شاندار سا بکرا جو آپ کے شایانِ شان ہو۔ اس کی قیمت کسی بھی رنگ کے ڈیم سے کیا کم ہو گی۔''
ظلِ الٰہی نے کہا۔ ''تمہاری بات ہمارے دل کو لگ رہی ہے۔''
ملا دو پیزا نے فوراً کہا۔ ''تب حکم صادر فرما دیا جائے۔''
''ٹھیک ہے تب ہمارے لیے ایک بہترین اور اعلیٰ نسل کے بکرے کا انتظام کیا جائے۔'' ظلِ الٰہی نے حکم دیتے ہوئے کہا۔ ''لیکن جانور ہم خود پسند کریں گے۔''
ملا دو پیزا اور راجا بیرّبل نے باچھیں پھیلاتے ہوئے ایک دوسرے کو دیکھا اور جھک کر کورنش بجالائے۔ ''حکم کی تعمیل ہو گی۔''

☆☆☆

اب وہ دونوں سر جوڑے بیٹھے تھے۔ ملا دو پیزا سوچ رہا تھا کہ بکرا کہاں سے لایا جائے اور کیسے زیادہ سے زیادہ کمیشن حاصل کیا جائے۔ اس کے برعکس راجا بیرّبل کی فکر کچھ اور تھی۔ اس نے ملا دو پیزا سے کہا۔ ''دیکھ یار! ہمارا ڈائریکٹ کمیشن پکا ہے۔ یعنی جو بھی بکرا لائے گا اور اس سے کمائے گا، اس میں آدھا آدھا ہوگا لیکن دوسرے طریقے سے جو کمائی ہو گی، وہ پوری اس کی ہو گی جس کا بکرا مہابلی پاس فرمائیں گے۔''
''دوسرے طریقے سے کمائی؟'' ملا دو پیزا نے آنکھیں گھمائیں۔ ''یار راجا! کیا تو چونا لگانا چاہ رہا ہے؟''
راجا بیرّبل نے سر ہلایا۔ ''کوئی بھی بکرا ہمارے حوالے نہیں کرے گا کہ مہابلی کو دکھائیں۔ ملک کا بچہ بچہ ہماری کمیشن خوری سے واقف ہے۔ بکرے کے ساتھ مالک بھی چلا آئے گا۔''
ملا دو پیزا نے سر ہلایا۔ ''ہاں یہ تو ہے اور ہم خود بھی خرید نہیں سکتے۔ اگر ظلِ الٰہی نے ناپسند کر دیا تو سرمایہ ڈوب جائے گا۔''
''اس لیے ہم بیک وقت چالاکی اور جدید ٹیکنالوجی سے کام لیں گے۔''
''وہ کیسے؟'' ملا دو پیزا نے پوچھا تو راجا بیرّبل سرگوشی میں اسے کچھ بتانے لگا اور جب اس نے بات مکمل کی تو ملا نے ہاتھ اس کے شانے پر مارا۔
''راجا جی! تم نے تو کمال کر دیا۔''
''کمال تو اس وقت ہوگا جب نوٹ ہاتھ میں آئیں گے۔'' راجا بیرّبل نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

ایک فزیوتھراپسٹ ظلِ الٰہی کی کمر کا مساج کر رہا تھا۔ فزیوتھراپسٹ کا اصرار تھا کہ ظلِ الٰہی کرسی سے اتر کر مساج کرائیں مگر انہوں نے کرسی سے اترنے سے انکار کر دیا اور اب الٹے...... کرسی پر بیٹھ کر مساج کرا رہے تھے۔ ظاہر ہے یہ پوز آرام دہ نہیں تھا اس لیے وہ کچھ بے چین تھے۔ اتنے میں ملا دو پیزا اور راجا بیرّبل کورنش بجالاتے ہوئے حاضر ہوئے۔ ظلِ الٰہی نے سیدھے ہوتے ہوئے فزیوتھراپسٹ کو جانے کا اشارہ کیا اور ان دونوں پر برس پڑے۔ ''کہاں دفع ہو گئے تھے تم دونوں؟''
''ظلِ الٰہی بکرے کا بندوبست کر رہے تھے اور آپ کے لیے ایسا بکرا تلاش کیا ہے کہ......'' ملا دو پیزا نے ایک عدد ٹیب نکالا۔
''مہابلی دیکھیں گے تو اش اش کر اٹھیں گے۔'' راجا بیرّبل آگے بڑھا، اس کے ہاتھ میں ایک ٹیب تھا۔
''بکرے جائیں تم دونوں سمیت بھاڑ میں...... ابھی تک ناشتا کیوں نہیں آیا؟''
''مہابلی! کابل ائرپورٹ پر جیٹ فیول ختم ہو گیا ہے، اس کا انتظام کیا جا رہا ہے۔ جیسے ہی فیول دستیاب ہوگا ناشتا آپ کی خدمت میں حاضر کر دیا جائے گا۔''
''تب تک آپ قربانی کے لیے بکرا منتخب کر سکتے ہیں۔'' ملا دو پیزا نے موقع پا کر اپنا ٹیب آگے کیا۔ راجا نے اپنا ٹیب آگے کیا اور دونوں اپنے اپنے ٹیب آگے کرتے ہوئے ظلِ الٰہی کے منہ کے بالکل سامنے لے گئے۔ مگر اس

سے پہلے کہ وہ مزید آگے لے جاتے، ایک اور ٹیب ظلِ الٰہی کی آنکھوں کے عین سامنے آیا اور ملکۂ عالیہ کی آواز آئی۔

''کتنا پیارا سوٹ ہے، ہم آرڈر کرتے جارہے ہیں۔صرف پندرہ لاکھ کا ہے۔''

ملا دو پیزا اور راجا بیربل نے عجلت میں اپنے ٹیب پیچھے کیے۔صرف ملکۂ عالیہ کی تکریم کا خیال نہیں تھا بلکہ یہ خیال بھی تھا کہ اگر انہیں بکروں کی بھنک بھی مل گئی تو وہ بھی کمیشن میں حصے دار بن جائیں گی۔ان کا کمیشن عام طور سے ستر فیصد سے کم نہیں ہوتا تھا۔مگر ملکۂ عالیہ اپنے سوٹ میں مگن تھیں۔ظلِ الٰہی نے فرمایا۔''سوٹ تو صرف پندرہ لاکھ کا ہے مگر سرکاری خزانے سے براہِ راست ادائیگی پر معاملہ قائمہ کمیٹی تک چلا جاتا ہے۔بہتر نہیں ہوگا کہ آپ اپنے نقد خزانے سے ادائیگی کردیں؟''

''ہرگز نہیں۔''ملکۂ عالیہ نے استقامت سے کہا۔''وہ ہم نے اپنے اور آپ کے برے وقتوں کے لیے سنبھال رکھا ہے جب سوائے خدا اور نقدی کے کوئی کام نہیں آتا۔''

ظلِ الٰہی نے ملکۂ عالیہ کی دوراندیشی پر انہیں تحسین آمیز نظروں سے دیکھا اور سوٹ کی سرکاری خزانے سے ادائیگی پر اتفاق کیا۔''قائمہ کمیٹی توڑی جاسکتی ہے۔اگرچہ یہ ابھی بنی بھی ہے۔''

ملکۂ عالیہ خوش ہوکر واپس چلی گئیں۔ان کے جاتے ہی دونوں ٹیب ایک ساتھ ظلِ الٰہی کے سامنے آئے اور انہوں نے بیک وقت دونوں کو دیکھا جس میں بکرے آن لائن موجود تھے۔ملا دو پیزا کا بکرا جگالی کررہا تھا اور راجا بیربل والا بکرا اس شغل سے فارغ ہوکر کچھ اور کررہا تھا۔ظلِ الٰہی نے کسی قدر خفگی کے ساتھ فرمایا۔''یہ کیا ہے؟''

''مہابلی...... بکرے ہیں۔''راجا بیربل نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔''آج کل ہر چیز آن لائن بک رہی ہے،اس میں قربانی کے بکرے بھی شامل ہیں۔''

''ظلِ سبحانی! ذرا ملاحظہ کریں اس قاتل ادا بکرے کو۔''ملا دو پیزا نے اپنا ٹیب آگے کیا۔''اسے کوئی عام قصائی قربان بھی نہیں کرسکتا۔''

''ہاں،یہ خود قصائی کو قربان کردے گا۔''راجا بیربل نے طنزیہ انداز میں کہا۔''مہابلی! آپ اس خوش خصال بکرے کو دیکھیں،کیا پیاری صورت ہے۔''

''بس صورت ہی پیاری ہے۔''ملا دو پیزا نے جوابی کارروائی کی۔''صحت دیکھو اس کی،یہ خود پل صراط سے گزر جائے تو غنیمت ہے۔ظلِ الٰہی ہرگز اس پر نہیں سواری فرمائیں گے۔''

''اس سے خود کھڑا نہیں ہوا جاتا،ظلِ الٰہی کا وزن لے کر تو ان سمیت نرک میں جائے گا۔''

اس سے پہلے کہ بات نرک سے آگے جاتی،ظلِ الٰہی نے سیز فائر کراتے ہوئے کہا۔''ہم آن لائن خریداری کے قائل نہیں ہیں۔یہ شغل صرف ملکۂ عالیہ کو زیب دیتا ہے۔اس لیے بکرے حاضر کیے جائیں۔''

''ظلِ الٰہی کا اقبال بلند ہو۔بکرے بھی حاضر کیے جاسکتے ہیں۔لیکن ایک تو یہ بکرے دربار عالی وقار کے وقار کا خیال نہیں کریں گے اور وہی کریں گے جو راجا جی کا بکرا کررہا ہے۔بدبو اور فضول کے شور وغل سے ظلِ الٰہی کی طبع نازک پر بوجھ آئے گا۔''

کیونکہ ظلِ الٰہی کو آن لائن خریداری پر آمادہ کرنا تھا،اس لیے اپنے بکرے پر حملے کے باوجود راجا نے بادل ناخواستہ ملا کی تائید کی۔''مہابلی نے پہلے ہی جانے کتنے بوجھ اپنے شانوں پر اٹھا رکھے ہیں۔''

ظلِ الٰہی نے ایک بار پھر راجا بیربل کے بکرے کی مصروفیات کا جائزہ لیا اور فوراً اپنے دورتنوں سے اتفاق کیا کہ واقعی بکروں کے آنے سے دربار میں بکرا پیڑی جیسے حالات وقوع پذیر ہوسکتے ہیں۔اس لیے آن لائن معائنہ ہی درست ہے مگر دونوں ہی بکرے انہیں پسند نہیں آئے۔راجا بیربل کے بکرے میں نزاکت زیادہ تھی اور ملا دو پیزا کا بکرا نہ صرف صحت میں بلکہ چہرے کے تاثرات سے بھی گدھا دکھائی دے رہا تھا۔اس لیے انہوں نے دونوں بکرے مسترد کرکے دوسرے بکرے دکھانے کا حکم صادر کیا۔دونوں فوری طور پر آن لائن دوسرے بکروں کی تلاش میں لگ گئے اور ابھی یہ تلاش جاری تھی کہ ایک عجیب سی سماعت شکن آواز بلند ہوئی۔بالکل ایسا لگا کہ کسی نے کنگ سائز گھنٹی کے اندر سر کر رکھا ہو اور باہر سے کسی نے اس پر ہتھوڑی سے ضرب لگائی ہو۔

ظلِ الٰہی کے چہرے پر زلزلے کے سے تاثرات نمودار ہوئے۔سابق ظلِ الٰہی جاتے جاتے ایک بدعت رائج کرگئے اور نہ صرف اسے رائج کیا تھا بلکہ آئینی ترمیم کے ذریعے اسے آئین کا حصہ بھی بنا گئے تھے۔اس ترمیم کے تحت ظلِ الٰہی صبح آٹھ سے رات آٹھ بجے تک فریادیوں کی فریاد سننے کے پابند تھے۔اس مقصد کے لیے سابق ظلِ الٰہی نے آثار قدیمہ کے محکمے سے وہ گھنٹی منگوا کر دربار کے باہر نصب کرائی تھی جو کسی زمانے میں دادرسی کے لیے

استعمال ہوتی تھی۔ ظلِ الٰہی گھنٹی تو نہیں اتروا سکے تھے مگر انہوں نے سیکیورٹی کے نام پر ایسا بندوبست ضرور کردیا تھا کہ فریادیوں کے لیے گھنٹی تک پہنچنا ہی جوئے شیر لانے کے مترادف ہوگیا تھا۔ مگر اس کے باوجود روز کوئی نہ کوئی فریادی گھنٹی تک پہنچنے میں کامیاب ہوجاتا۔ اس کی سماعت شکن آواز اس کی کامیابی کا اعلان کرتی تھی۔ ابھی گھنٹی کی آواز کی گونج ماند نہیں پڑی تھی کہ دن کا پہلا فریادی دربار میں حاضر ہوا۔ یہ دبلا سا شخص تھا جس کی سیاہی مائل رنگت اور پھٹی ہوئی واسکٹ سے تمام پسلیاں جھانک رہی تھیں۔ نیچے اس نے مٹی لگی پہنی ہوئی تھی اور پیروں میں اس کے اپنے سول کی چپل تھی۔ یعنی خالی پاؤں تھا۔ قد لمبا نہیں تھا مگر بہت زیادہ دبلا پتلا ہونے کی وجہ سے لمبا لگ رہا تھا۔ پیٹ کمر سے یوں لگا ہوا تھا کہ وہ تھری ڈی کے بجائے ٹوڈی نظر آرہا تھا۔

''دُہائی ہے مہابلی...... دُہائی ہے۔''

ظلِ الٰہی نے پاؤں اور ناک سکیڑتے ہوئے دریافت کیا۔ ''کون ہو تم اور کیا چاہتے ہو؟''

''مہابلی! میں سقہ ہوں۔ نظام سقہ میرا لکڑ دادا تھا۔ محکمۂ مال نے سیلز ٹیکس کی عدم ادائیگی پر میرا مشکیزہ ضبط کرلیا ہے۔''

ظلِ الٰہی نے اب ناک کے ساتھ بھوں بھی چڑھائی۔ ''تو کیا تم اپنے مشکیزے کی واپسی چاہتے ہو؟''

''نہیں سرکار...... وہ تو میں رشوت دے کر واپس لے چکا ہوں۔''

ظلِ الٰہی نے سکون کا سانس لیا۔ ''تب کس بات کی دُہائی دے رہے ہو؟''

''مہابلی! رشوت دینے کے بعد میرے پاس اتنی رقم نہیں رہی ہے کہ گھر کھانے کو کچھ لے جاسکوں۔ دہائی ہے... مہابلی! دہائی ہے۔ میرے بچے دو دن سے بھوکے ہیں۔ میری مدد کی جائے۔''

''ہم خود بھوکے ہیں۔'' ظلِ الٰہی نے لہجے میں درد پیدا کر کے کہا۔ ''بہ خدا ابھی تک ناشتا نصیب نہیں ہوا ہے۔''

یہ سن کر فریادی کی آنکھوں کے آنسو خشک ہوگئے مگر اس نے کوشش جاری رکھی۔ ''مہابلی! اوپر والا آپ کو ناشتا کرائے گا، میرے بچوں پر رحم کریں۔''

''ناشتا بیچنے والوں نے روک رکھا ہے۔'' ظلِ الٰہی نے غضب ناک نظروں سے راجا بیربل کی طرف دیکھا تو اس نے جھٹ ایک کاغذ آگے کردیا۔

''یہ کیا ہے؟''

''جیٹ طیارے کے فیول کا بل۔'' راجا بیربل نے آہستہ سے کہا۔ ''ابھی فیکس سے موصول ہوا ہے۔ اس کی ادائیگی سے پہلے طیارے کو کابل سے اڑنے کی اجازت نہیں ملے گی۔''

''اچھا...... اچھا۔'' ظلِ الٰہی نے جلدی سے اس پر دستخط کیے اور مہر کے لیے ملکۂ عالیہ کے پاس جانے کو کہا کیونکہ شاہی مہر ان کے قبضے میں ہوتی تھی۔ راجا ملکۂ عالیہ سے مہر لگوانے گیا۔ اس دوران میں فریادی خاموش کھڑا ہوا تھا۔ ظلِ الٰہی اس کی طرف متوجہ ہوئے۔

''فی الحال، ہماری اپنی پوزیشن بہت ٹائٹ ہے اور ہم تمہارے لیے کچھ نہیں کرسکتے۔''

''مہابلی میرے بچے......'' فریادی چلایا مگر ظلِ الٰہی تالی بجا چکے تھے۔ فوراً ہی دو جلاد صورت سپاہی نمودار ہوئے اور فریادی کو دونوں بازوؤں سے پکڑ کر گھسیٹ کر لے گئے مگر اس کی فریادیں خاصی دیر تک ظلِ الٰہی کی سماعت میں گونجتی رہیں۔ اس فریاد سے ان کی طبیعت بدمزہ ہوچکی تھی۔ ناشتے میں الگ دیر تھی۔ اس لیے وقت بہلانے کو ظلِ الٰہی نے تالی بجا کر انارکلی کو حاضر ہونے کا حکم دیا۔ ظلِ الٰہی کے علم میں آیا تھا کہ انارکلی نے کچھ نئے انڈین گانوں پر کمال کی اعضا کی شاعری کی تھی۔ ظلِ الٰہی اس شاعری کو بذاتِ خود ملاحظہ فرمانا چاہتے تھے۔ ملکۂ عالیہ آن لائن شاپنگ میں مگن تھیں اس لیے امید تھی کہ وہ یہاں کا رخ نہیں کریں گی اور ظلِ الٰہی سکون سے انارکلی کے رقص سے محظوظ ہوسکیں گے۔ مگر کچھ دیر بعد کنیز دل آرام نے حاضر ہوکر چغلی کھانے کے انداز میں اطلاع دی کہ انارکلی شہزادہ سلیم کے لیے نئے آئٹم سونگ کی ریہرسل میں مصروف ہے۔ ساتھ ہی اس نے ڈھکے چھپے انداز میں پیشکش کی کہ وہ شیلا کی جوانی پر انارکلی سے کہیں بہتر پرفارم کرسکتی ہے مگر انارکلی کی مصروفیت کا سن کر ظلِ الٰہی کا موڈ خراب ہوگیا تھا۔ اس لیے انہوں نے دل آرام کی پیشکش مسترد کردی اور دربارِ خاص برخاست کردیا۔

☆☆☆

ظلِ الٰہی دربارِ عام کی میٹنگ اور لنچ سے فارغ ہوکر دربارِ خاص میں قیلولہ فرما رہے تھے اور نزدیک ہی پردوں کے پیچھے ملا دو پیزا اور راجا بیربل نئے بکروں کی تلاش میں مصروف تھے۔ اس بار انہوں نے کئی بکرے چھانٹ لیے تھے تاکہ ان میں سے کوئی نہ کوئی ظلِ الٰہی کو پسند آ ہی جائے اور ان کی عید اچھی گزر سکے۔ مسئلہ یہ تھا کہ وہ بکروں کے

انتخاب پر متفق نہیں ہو رہے تھے اور دونوں ہی ایک دوسرے کے جانوروں میں نقص نکال رہے تھے۔ راجا بیئر بل نے زچ ہو کر کہا۔ ''دیکھ یار ملا...... اگر ہم آپس میں اسی طرح لڑتے رہے تو یہ موقع ہاتھ سے نکل جائے گا۔ ابھی خواب کا اثر تازہ ہے۔ ہوسکتا ہے اثر ختم ہو جائے اور مہابلی قربانی کا ارادہ ترک کر دیں۔ جب سے میں رتن بنا ہوں، میں نے مہابلی کو صرف عوام سے قربانی مانگتے دیکھا ہے۔ سوچ ہم اپنی بیویوں اور بچوں کو کیا منہ دکھائیں گے۔''

''میں تو یہی منہ دکھا دوں گا۔'' ملا دو پیزا نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ ''اگر بکرا نہیں ہو سکا تو قربانی کی کھالیں تو میرے ہی پاس آئیں گی۔ عید کے بعد شاپنگ کرا دوں گا۔''

راجا بیئر بل بالکل ہی زچ ہو گیا۔ ''تو چاہتا کیا ہے؟''

''دیکھ راجا! آئیڈیا میرا ہے اور میں بکرا بھی تگڑا لینا چاہتا ہوں۔ تو نازک اندام بکرے چن رہا ہے۔ ذرا سوچ ان کی کیا قیمت بتا سکتا ہے۔ بکرے کی قیمت کروڑ بتائی جائے تو وہ دیکھنے میں بھی تو کروڑ کا لگے۔ تو لاکھ والے بکرے نکال رہا ہے۔''

راجا نے سوچا اور سر ہلایا۔ ''بات سمجھ میں آ رہی ہے مگر یار وہ بکرا بھی تو لگے...... تو گدھے کے سائز اور صورت والے بکرے چن رہا ہے۔ مہابلی نے قربانی کرنی ہے سواری نہیں۔''

ملا دو پیزا نے کھسیا کر کہا۔ ''نہیں اس بار میں نے احتیاط کی ہے اور بکرے ہی چنے ہیں۔ اس لیے اپنے ٹیب میں بھی میرا چنا ہوا بکرا پیش کر۔ کمیشن والی بات برقرار ہے اگر ظلِ الٰہی نے تیرے ٹیب سے بکرا چن لیا تو اوپر سے ملنے والا سارا مال تیرا۔''

اس بار راجا بیئر بل بالکل راضی ہو گیا۔ اس نے کہا۔ ''اس صورت میں مجھے منظور ہے۔''

ملا دو پیزا نے پردے سے جھانک کر دیکھا۔ ''مگر ظلِ الٰہی محوِ آرام ہیں۔ خلل اندازی مناسب نہ ہوگی۔''

''وقت ضائع ہوگا۔ کسی اور طریقے سے مہابلی کو چونکاتے ہیں۔'' راجا بیئر بل بولا، وہ زیادہ بے تاب تھا۔ ملا دو پیزا نے درست کہا تھا۔ وہ قربانی کی کھالوں سے بھی کام چلا سکتا تھا مگر راجا بیئر بل کے پاس سوائے ذاتی کھال کے اور کچھ نہیں تھا۔ ظلِ الٰہی نہ صرف محوِ خواب تھے بلکہ اسی خواب کو نشرِ مکرر دیکھ رہے تھے جیسا کہ ٹی وی والے اپنے ڈرامے اس وقت تک دکھاتے ہیں جب تک کہ وہ ناظرین کو حفظ نہ ہو جائیں۔ خواب میں بکرے تھے اور چاقو چھریاں تھیں۔ تشویشناک بات یہ تھی کہ ان کی گردن کے آس پاس لہرانے والی چھری نزدیک آ گئی تھی۔ اتنی نزدیک کہ اس کی باریک دھار کی چمک تک صاف جھلک رہی تھی اور چھری لہرانے کا انداز بھی زیادہ خطرناک تھا۔ ظلِ الٰہی جانتے تھے کہ وہ خواب دیکھ رہے ہیں اور بیدار ہونے کی خواہش رکھتے تھے مگر بیدار نہیں ہو پا رہے تھے۔ پھر اچانک شیشہ ٹوٹنے کی آواز آئی اور وہ ڈری ہوئی آواز کے ساتھ بیدار ہو گئے۔ آواز ایک غلام کے ہاتھ سے گر کر ٹوٹنے والے آئینے کی تھی۔ غلام کی گھگی بندھی ہوئی تھی۔ اس کے پیچھے ملا دو پیزا اور راجا بیئر بل کھڑے تھے۔ ملا دو پیزا نے قہرناک نظروں سے غلام کو دیکھا۔

''گستاخ! تو نے ظلِ الٰہی کی نیند میں خلل ڈالا ہے۔''

''سرکار...... سرکار۔'' غلام نے گھگیا کر کہنا چاہا۔

''تیری کم سے کم سزا بھی موت ہے۔'' راجا بیئر بل نے لقمہ دیا۔

''مگر مجھے تو آپ......'' غلام نے کہنا چاہا تو ملا دو پیزا اس کی بات کاٹ کر بولا۔

''ظلِ الٰہی! آپ نے ملاحظہ فرمائی اس معمولی غلام کی گستاخی...... ایک تو اس نے ظلِ الٰہی کی قیمتی نیند میں خلل ڈالا اور اب الزام ہم پر رکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔''

ظلِ الٰہی اس وقت اس خوفناک خواب کے مابعد اثرات سے سنبھل رہے تھے۔ ہال کا اے سی ان کا پسینا خشک کر رہا تھا اور ان کے دل کی بے قابو ہو جانے والی دھڑکن اعتدال پر آ رہی تھی۔ انہوں نے دریافت کیا۔ ''کیا ہم اس غلام کی وجہ سے بیدار ہوئے ہیں؟''

''جی مہابلی! اس ناہنجار نے سرِ دربار آئینہ توڑا ہے۔'' راجا بیئر بل نے فردِ جرم عائد کرتے ہوئے کہا۔ ''یہی نہیں اس نے بدشگونی بھی کی ہے۔''

''ظلِ الٰہی! کیا جلاد کو طلب کیا جائے؟'' ملا دو پیزا کی اس بات پر غلام کی گھگی پوری طرح بندھ گئی تھی۔ وہ اتنا بھی نہ کہہ سکا کہ انہوں نے اس سے آئینہ منگوایا تھا اور پھر اسے دھکا دے کر اس کے ہاتھ سے گروا دیا۔ مگر ظلِ الٰہی نے جلاد طلب کرنے کے بجائے پُرتحسین نظروں سے غلام کی طرف دیکھا اور دریافت فرمایا۔

''تمہارا نام کیا ہے؟''

''پیاز۔'' غلام نے بہ مشکل کہا اور گڑگڑانے لگا۔ ''رحم ظلِ الٰہی...... رحم۔''

"کیوں نہیں، آج سے تمہارا نام ایاز ہے۔ اگر ہم نماز پڑھتے تو ضرور صف میں تمہیں اپنے ساتھ کھڑا کرتے مگر فی الحال آج سے تم ہمارے غلاموں کے سربراہ ہو۔"

بیاز عرف ایاز کو ایسا لگا کہ وہ خواب دیکھ رہا ہے یا اس کی نظر و سماعت نے اسے دھوکا دیا ہے۔ وہ ہاتھ میں سربراہی کا حکم نامہ لے کر جیسے خواب میں چلتا ہوا گیا تھا۔ اس کے جاتے ہی ظلِ الٰہی ان دونوں کی طرف متوجہ ہوئے۔ "تم دونوں نے اب تک بکرے منتخب نہیں کیے؟ ابھی ہم نے پھر وہی خواب دیکھا ہے اور چھری ہماری گردن کے بالکل پاس آگئی تھی کہ ایاز نے ہمیں بیدار کر دیا۔"

اگرچہ ایاز کی ترقی نے ان دونوں کو بدمزہ کر دیا تھا۔ وہ سوائے خود کے کسی کو ترقی پاتے نہیں دیکھ سکتے تھے مگر اس وقت معاملہ بکروں کا تھا اور ظلِ الٰہی کے نشر مکرر خواب نے ان کا کام آسان کر دیا تھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ ظلِ الٰہی کو بکرے دکھاتے، گھنٹی نے سماعت پر ضرب لگائی اور فریادی حاضر ہو گیا۔ کسی قدر تبدیلی کے ساتھ یہ صبح والے فریادی کا ری میک لگ رہا تھا۔ جیسے اس کے سر پر بال نہیں تھے۔ پیروں میں چپل بھی مگر واسکٹ غائب تھی اور لنگی کی جگہ برمودہ شارٹ ہو جانے والا پاجامہ تھا۔ البتہ پسلیاں بالکل ویسی ہی تھیں اور فریادی کے تاثرات بھی میچ کر رہے تھے۔ اس نے بھی آتے ہی فریادیوں کا مصرعِ طرح پیش کیا۔

"دہائی ہے ظلِ الٰہی...... دہائی ہے۔"

"فریاد پیش کی جائے۔" ظلِ الٰہی نے بادل ناخواستہ کہا۔

"ظلِ الٰہی! میری بیٹی بہت بیمار ہے اور سرکاری اسپتال میں داخل ہے مگر علاج کے لیے نہ تو ڈاکٹر ہے اور نہ ہی دوائیں۔"

اتفاق سے محکمۂ صحت ملا دوپیزا کے پاس تھا۔ ظلِ الٰہی نے اس سے دریافت کیا۔ "ڈاکٹر اور دوائیں کہاں ہیں؟"

"ظلِ الٰہی! ڈاکٹر ہڑتال پر ہیں اور دواؤں کے لیے بجٹ ختم ہو گیا ہے۔"

ظلِ الٰہی اب فریادی کی طرف متوجہ ہوئے۔ "تم نے سن لیا فریادی...... ڈاکٹر ہڑتال پر ہیں اور دواؤں کے لیے مخصوص بجٹ ختم ہو چکا ہے۔ اس لیے ہم تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکتے۔"

"ظلِ الٰہی! میری بیٹی مر جائے گی۔"

"ایک دن سب نے مر جانا ہے۔" ظلِ الٰہی نے رقت آمیز لہجے میں کہا۔

"صرف دس ہزار میں میری بیٹی کی جان بچ سکتی ہے۔"

"بہ خدا ہمارے بس میں ہوتا تو اسی وقت ہم تمہارے لیے دس ہزار منظور فرما لیتے۔ مگر آئین میں کی جانے والی ترامیم نے ہمارے ہاتھ جکڑ دیے ہیں۔"

اس سے پہلے کہ فریادی مزید فریاد کرتا، ظلِ الٰہی نے تالی بجائی اور دو سپاہی نمودار ہوئے اور چیختے چلاتے فریادی کو اٹھا کر لے گئے۔ ملا دوپیزا اور راجا بیربل نے سکون کا سانس لیا اور اس سے پہلے کہ مزید کوئی مداخلت ہوتی وہ فوراً ٹیب لے کر ظلِ الٰہی کے دائیں بائیں آگئے۔ راجا بیربل نے اپنا ٹیب آگے کیا۔ "بکروں کی کمی نہیں مہابلی۔ ایک مانگیں ہزار لیں گے۔"

ملا دوپیزا کیوں پیچھے رہتا، اس نے بھی ٹیب آگے کیا۔ "ایک سے بڑھ کر ایک بکرا ظلِ الٰہی کی نظرِ کرم کا منتظر ہے۔"

ظلِ الٰہی بکرے ملاحظہ فرمانے لگے۔ اس بار انہیں

تھرماس

ایک بے وقوف شخص تھرماس لے کر دوست کے ساتھ پکنک پر گیا۔ دوست نے پوچھا۔ "یہ کیا چیز ہے؟"

وہ شخص بولا۔ "یہ تھرماس ہے۔ اس میں ٹھنڈی چیز ٹھنڈی اور گرم چیز گرم رہتی ہے۔"

دوست نے پوچھا۔ "تو اس میں کیا ہے اس وقت؟"

بے وقوف شخص بولا۔ "چار قلفیاں اور دو کپ چائے۔"

☆☆☆

ایک دوست دوسرے دوست سے بولا۔ "یار! میں جس لڑکی کو چاہتا تھا اس نے مجھ سے شادی نہیں کی۔"

دوسرا دوست۔ "تو اسے بتایا نہیں کہ تیرے ابو کروڑپتی ہیں؟"

پہلا دوست۔ "بتایا تھا۔"

دوسرا دوست۔ "تو پھر؟"

پہلا دوست۔ "اس نے ابو سے شادی کر لی......"

مرسلہ: اطہر حسین، کراچی

بکرے کچھ کچھ پسند بھی آ رہے تھے۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ کوئی بکرا منتخب کرتے کہ ملکۂ عالیہ کی تشریف آوری ہوئی اور ان کی جھلک دیکھتے ہی ملا دو پیزا اور راجا بیرَبل نے اپنے ٹیب نہایت سرعت سے لباس میں روپوش کر لیے۔ ملکۂ عالیہ پندرہ لاکھ والا لباس زیب تن کر کے ظلِ الٰہی کو دکھانے آئی تھیں۔ جب ظلِ الٰہی نے انہیں ملکۂ عالیہ کے منصب کے لیے پسند فرمایا تھا تو وہ صرف سترہ برس کی اور نہایت متناسب جسم کی مالک تھیں مگر شادی کے بیس برس بعد وہ نہایت غیر متناسب ہو چکی تھیں اور کسی بھی قسم کا لباس ان کے تناسب کو دوبارہ حد میں لانے سے قاصر تھا۔ ملکۂ عالیہ نے انارکلی اسٹائل میں گھوم کر اور بل کھا کر لباس دکھایا اور ظلِ الٰہی کے چہرے پر ویسے ہی تاثرات نمودار ہوئے جیسا کہ فریادی گھنٹی کی آواز پر ہوتے تھے۔ مگر انہوں نے کمال مہارتِ شوہرانہ سے اپنے اصل تاثرات چھپا کر ملکۂ عالیہ کو تحسین آمیز نظروں سے دیکھا۔

''آج تو آپ کمال کی لگ رہی ہیں۔''

''تبھی آپ انارکلی کے چکر میں پڑے ہیں۔'' ملکۂ عالیہ نے تیکھی نظروں اور تیور کے ساتھ کہا۔

''بہ خدا بالکل نہیں۔'' ظلِ الٰہی نے فوری تردید کی۔ ''ہم تو انارکلی بازار کا چکر بھی نہیں لگاتے کہ ہمیں یہ نام ہی پسند نہیں ہے۔''

''مگر آپ اس کے آئٹم سونگز پر ضرور مرتے ہیں۔'' ملکۂ عالیہ نے دوسرا الزام لگایا۔

''ہم صرف ٹائم پاس کے لیے کبھی کبھی اسے بلا لیتے ہیں۔''

اس پر ملکۂ عالیہ نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''آپ کا ٹائم پاس تو ہم کرائیں گے۔ صائمہ جی کو بلوایا ہے، جلد آپ کے حضور آئٹم سونگ پیش کریں گی۔''

ظلِ الٰہی خوش ہو گئے۔ ''ملکۂ عالیہ! آپ نے ہمارا دل خوش کر دیا ہے۔''

''ہمیں اوپر والے نے دنیا میں بھیجا ہی آپ کے لیے ہے۔'' ملکۂ عالیہ نے مزید معنی خیز انداز میں کہا اور پندرہ لاکھ والا لباس لہراتی ہوئی رخصت ہو گئیں۔ ملا دو پیزا نے سرگوشی میں کہا۔

''مجھے ظلِ الٰہی کی عافیت خطرے میں لگ رہی ہے۔''

''ہاں، مہارانی اور...... مہابلی کی تفریح کا بندوبست کریں، یہ کچھ انہونی سی بات ہے۔''

''خیر یہ ان کا آپس کا معاملہ ہے۔ اس سے پہلے کہ صائمہ جی آ گئیں، ہمیں اپنا کام کر لینا چاہیے۔''

انہوں نے پھر ٹیب نکالے اور آنے والے رنگین وقت کے خیالوں میں کھوئے ظلِ الٰہی کے پاس پہنچ گئے۔ ٹیب ان کے آگے کیے اور پھر لہرائے بھی۔ مگر ظلِ الٰہی کے کانوں پر جوں بھی نہیں رینگی تھی۔ مجبوراً راجا بیرَبل نے ٹیب کا اسپیکر آن کیا اور بکرا شو میں آواز کی جان پڑ گئی۔ ظلِ الٰہی چونکے اور خفگی سے بولے۔ ''یہ کیا حرکت ہے؟''

''ظلِ الٰہی! وقت کم رہ گیا ہے۔'' ملا دو پیزا نے یوں کہا کہ ظلِ الٰہی کو خواب یاد آ گیا اور وہ چھری یاد کر کے لرز گئے۔

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ دفعِ بلیات میں جتنی عجلت کی جائے اچھا ہے۔ آفت کو پاس آنے ہی کیوں دیا جائے۔''

''مگر وہ تو ہمارے آس پاس ہی رہتی ہیں۔'' ظلِ الٰہی نے بدمزگی سے کہا۔ اشارہ یقیناً ملکۂ عالیہ کی طرف تھا۔

''وہ تو بیس سال سے ہیں، خواب کسی نئی آنے والی مصیبت کے بارے میں ہے۔''

ظلِ الٰہی ملا دو پیزا کی اس بات سے قائل ہوئے اور ٹیب میں نظر آنے والے بکروں کی طرف متوجہ ہو گئے۔ یہ سارے لگژری نسل کے بکرے تھے جو ریشم و حریر پر تشریف فرما تھے یا ریڈ کارپٹ پر بکرا واک کر رہے تھے۔ وہ ڈرائی فروٹ اور اعلیٰ درجے کی خوراک پر پلے ہوئے تھے۔ ان کی صفائی ستھرائی کے خصوصی انتظامات تھے اور ہر روز انہیں بکرا بیوٹی پارلر کے ماہرین سجاتے سنوارتے تھے۔ ظلِ الٰہی حیران تھے۔ انہوں نے فرمایا۔ ''بہ خدا ہمیں علم نہیں تھا کہ ملک میں بکرا انڈسٹری اتنی ترقی کر گئی ہے ورنہ ہم اس پر ٹیکس لگا دیتے۔''

''ظلِ الٰہی! یہ سارے کا سارا بزنس حضور کے دوستوں اور ان سرپرستوں کے ہاتھ میں ہے جنہوں نے الیکشن میں حضور کو ظلِ الٰہی بنانے میں بنیادی کردار ادا کیا تھا۔''

''اوہ اچھا، ہمیں علم نہیں ہے کہ ہمارے یہ احباب بزنس میں اس حد تک گھس چکے ہیں کہ بکروں کو بھی نہیں چھوڑا ہے۔''

''مہابلی! بکرا تو خاصا بڑا اور قیمتی ہوتا ہے۔ انہوں نے تو مرغی اور انڈوں کو بھی نہیں چھوڑا ہے۔'' راجا بیرَبل نے کہا تو ظلِ الٰہی نے اسے خشمگیں نظروں سے گھورا۔

''وہ اس کے حق دار ہیں، بزنس کرنا انہیں زیب دیتا ہے۔''

''مہابلی! میں بھی تو یہی کہہ رہا ہوں کہ آپ کی دی ہوئی رعایتوں نے انہیں مالا مال کر دیا ہے۔ انہوں نے آپ

کا ساتھ دیا تو آپ نے بھی ان پر فیاضی کی انتہا کردی۔‘‘
ظلِ الٰہی خوش ہو گئے۔ ’’ہم دوستوں کو کبھی نہیں چھوڑتے اور نہ ہی دشمنوں کو چھوڑتے ہیں۔‘‘
ملا دو پیزا راجا بیربل کی اس بے وقت کی راگنی پر پیچ و تاب کھا رہا تھا جو اصل موضوع سے ہٹتا جا رہا تھا۔ اس نے کھنکار کر کہا۔ ’’ظلِ الٰہی بکرے۔‘‘
مگر ظلِ الٰہی دوستوں کے ذکر سے خوش تھے، انہوں نے فرمایا۔ ’’بکرے کہیں بھاگے نہیں جا رہے ہیں۔‘‘
’’بجا فرمایا ظلِ الٰہی نے۔‘‘ ملا دو پیزا جھک کر بولا۔ ’’مگر وقت گزرا جا رہا ہے۔ بزرگ کہتے ہیں کہ کوئی برا خواب دیکھو تو دن ڈھلنے یعنی سورج غروب ہونے سے پہلے اس کا صدقہ دے دو۔‘‘
’’جی مہابلی! اس سے پہلے کہ رات کی بلائیں آزاد ہوں، انہیں ٹال دینا ہی مناسب ہوگا۔‘‘
کیونکہ سہ پہر کا وقت گزر چکا تھا اور جلد ہی سورج ڈھل جاتا اس لیے ظلِ الٰہی ٹیبس کی طرف متوجہ ہوئے۔ انہیں بکرے چوائس کرنے میں دشواری پیش آرہی تھی کیونکہ دونوں ٹیب میں خاصی تعداد میں بکرے آن لائن موجود تھے۔ بالآخر انہوں نے ایک بکرے پر ہاتھ رکھا اور یہ ملا دو پیزا کا ٹیب تھا۔ وہ خوشی سے اچھل پڑا اور راجا بیربل کا منہ لٹک گیا۔ اس نے نظروں میں ملا دو پیزا کو یاد دلایا کہ اس کا حصہ نصف ہوگا۔ اس نے نظروں میں ہی جوابی تسلی دی اور ظلِ الٰہی سے کہا۔ ’’حضور کی نظر شناسی کی داد دیتا ہوں، کیا بکرا چنا ہے۔‘‘
’’جیسے کبھی تمہیں رتن چنا تھا۔‘‘ راجا بیربل نے جل بھن کر کہا۔
’’درست کہا راجا جی...... اس بار بھی ظلِ الٰہی نے کمال کیا تھا۔ بس تمہاری باری میں......‘‘ ملا دو پیزا نے جان بوجھ کر جملہ ادھورا چھوڑا اور ظلِ الٰہی کی طرف متوجہ ہوا۔ ’’حکم فرمائیں تو آرڈر کر دیا جائے۔‘‘
’’ضرور مگر پہلے ہمیں قیمت تو پتا چلے۔‘‘
’’حضور کو قیمت سے کیا سروکار...... ادائیگی تو سرکاری خزانے سے ہوگی۔ ایک مدِ دفعِ بلیات کی بھی ہے۔‘‘ ملا دو پیزا نے چالاکی سے کہا۔ راجا بیربل سمجھ رہا تھا کہ وہ قیمت اس سے چھپا رہا ہے تاکہ اسے اپنی مرضی سے حصہ دے سکے جو یقیناً اصل حصے سے خاصا کم ہوگا۔ اس نے ٹانگ اڑائی۔
’’مگر قیمت تو پتا چلنا چاہیے۔ مہابلی اس ملک کے مالک اور حکمران ہیں انہیں ہر بات کا علم ہونا چاہیے۔‘‘
’’بالکل مگر یہ صدقہ ہے جو ایک ہاتھ سے دیا جائے تو دوسرے ہاتھ کو علم نہ ہو۔‘‘ ملا دو پیزا نے اطمینان سے اعتراض رد کر دیا۔ ’’بلکہ ظلِ الٰہی کو ادائیگی کے بل پر بھی آنکھ بند کر کے سائن کرنے چاہئیں تاکہ صدقہ مکمل ہو اور آنے والی آفت پکی ٹل جائے۔ ہو سکتا ہے قیمت کے چکر میں پڑنے سے آفت ٹھیک سے نہ ٹلے۔‘‘
’’قیمت چھوڑو۔‘‘ ظلِ الٰہی آنے والی آفت کا سن کر گھبرا گئے۔ ’’بکرا آرڈر کرو اور اسے سورج ڈھلنے سے پہلے قربان ہو جانا چاہیے۔‘‘
’’ایسا ہی ہوگا ظلِ الٰہی۔‘‘ ملا دو پیزا نے مسرت سے بغلیں بجاتے اور راجا بیربل کو فاتحانہ انداز میں دیکھ کر کہا۔ وہ جانے لگا تو راجا بیربل اس کے پیچھے لپکا اور مناسب فاصلے پر آکر اس نے سرگوشی میں کہا۔
’’یہ معاہدے کی کھلی خلاف ورزی ہے۔‘‘
’’تم فکر مت کرو، تمہارا حصہ ضرور ملے گا۔‘‘ ملا دو پیزا نے اطمینان سے کہا۔
’’مجھے قیمت کا پتا چلنا چاہیے تاکہ میں اپنا حصہ نکال سکوں۔‘‘
’’قیمت جاننا تمہارے لیے بیکار ہے کیونکہ فروخت کرنے والے سیلز ٹیکس سے بچنے کے لیے اور خریدنے والے انکم ٹیکس سے بچنے کے لیے اصل قیمت نہیں بتاتے.... بظاہر اس بکرے کی قیمت صرف ایک لاکھ روپے ہے۔‘‘
’’لیکن تم قومی خزانے کو ایک کروڑ کا ٹیکا لگاؤ گے۔‘‘
’’یہ تم سوچتے رہو کہ ٹیکا کتنے کا ہوگا۔‘‘ ملا دو پیزا نے

سوری

میاں بیوی کی لڑائی ہوگئی۔ جب بہت بڑھی تو میاں بولا۔ ’’زبان بند کرو ورنہ تین لفظ بول دوں گا پھر روتی رہو گی۔‘‘
بیوی چپ ہوگئی۔ جب کئی بار ایسا ہوا تو بیوی بولی۔ ’’بول دو...... روز روز کی چک چک سے جان تو چھوٹے......‘‘
میاں نے کہا۔ ’’پھر سوچ لو۔‘‘
بیوی بولی۔ ’’سوچ لیا ہے۔ آج بول ہی دو۔‘‘
میاں زور سے بولا۔ ’’تو پھر سنو...... آئی ایم سوری!‘‘

مرسلہ۔ اطہر حسین، کراچی

کہا اور اپنا گاؤن لہراتا ہوا رخصت ہوگیا۔ راجا بیئربل کا غصے سے برا حال تھا۔ اس نے اپنی ہتھیلی پر مکا مارا۔

''ملا! تجھے دیکھ لوں گا۔''

راجا بیئربل دربار میں واپس آیا تو ظلِ الٰہی دوبارہ سے خوابِ خرگوش میں مگن ہو چکے تھے۔ ایسے میں انہیں چھیڑنا مناسب نہیں تھا۔ ویسے بھی آج ناشتے میں تاخیر سے ظلِ الٰہی اس سے خفا تھے اور اسے شبہ تھا کہ انہوں نے جان بوجھ کر اس کے ٹیب سے بکرا منتخب نہیں کیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ ساری بالائی ملا دو پیزا ہڑپ کر جائے گا اور اس کے حصے میں پانی جیسا دودھ آئے گا۔ وہ ابھی کچھ نہیں کرسکتا تھا مگر اسے یقین تھا کہ مستقبل میں اسے ضرور موقع ملے گا اور وہ مع سود بدلہ لے سکے گا۔ وہ بدلہ لینے کا منصوبہ بنانے لگا اور دوسری طرف ظلِ الٰہی خواب و خیال میں صائمہ جی کا آئٹم سونگ سوچ رہے تھے۔ صائمہ جی کے وہ اس وقت سے عاشق تھے جب انہوں نے شوبزنس کی دنیا میں قدم رکھا تھا اور وہ اس بات پر دل و جان سے یقین رکھنے لگی تھیں کہ جتنا زیادہ شو ہوگا، اتنا ہی زیادہ بزنس ہوگا۔ وہ ان نزاکت کی ماری شوبزنس خواتین سے قطعی مختلف تھیں جو یہاں بھی رکھ رکھاؤ کو اہمیت دیتی ہیں۔ صائمہ جی کے خیال میں رقص...... اعضا کی شاعری نہیں دھماچوکڑی کا نام تھا۔

ظلِ الٰہی نے کئی ایک بار صائمہ جی کو دربار میں بلانے کا سوچا مگر ملکۂ عالیہ کے خوف سے وہ صرف سوچ کر رہ گئے تھے اور اب وہ سوچ رہے تھے کہ ملکۂ عالیہ کو کیسے پتا چلا کہ وہ صائمہ جی پر مرتے ہیں۔ پھر انہوں نے اتنا بڑا دل کیسے کرلیا کہ وہ صائمہ جی کو دربار میں بلانے پر آمادہ ہو گئیں۔ انارکلی اور اس جیسی بے حساب کنیزیں شاہی محل میں موجود تھیں اور ان کے معاملے میں ملکۂ عالیہ بے بس تھیں مگر انہوں نے باہر سے عورتوں کی آمد پر پابندی عائد کی ہوئی تھی مگر شاید انہوں نے کبھی سوتے میں ظلِ الٰہی کے منہ سے صائمہ جی کا نام سن لیا تھا اور انہیں ان کی ناآسودہ حسرتوں پر ترس آگیا تھا۔ اسی لیے انہوں نے خود صائمہ جی کو بلانے کا فیصلہ کیا تھا۔ ظلِ الٰہی انہی سوچوں اور خیالوں میں کھوئے نہ جانے کب بیچ خوابوں کی وادی میں اتر گئے۔ کچھ دیر بعد انہیں احساس ہوا کہ وہ وہی خواب پھر سے دیکھ رہے تھے۔ ان کے چاروں طرف صحت مند بکرے تھے جو انہیں سخت معاندانہ نظروں سے دیکھ رہے تھے کیونکہ ظلِ الٰہی ہی ان کی جلد قربانی کی وجہ بننے والے تھے۔ ہوا میں معلق چھریاں اور بغدے یوں لہرا رہے تھے جیسے کچھ کاٹنے کو بے تاب ہوں۔ ظلِ الٰہی کو بجا طور پر اپنی گردن کی فکر لاحق ہوئی تھی اور انہوں نے جاگنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہوئے۔

پھر ایک چھری جس کی آب و تاب دیکھنے کے لائق تھی اور ظلِ الٰہی سے دیکھی نہیں جا رہی تھی، ان کے پاس آنے لگی اور یوں نوک کے بل سیدھی ہوگئی جیسے براہِ راست ان کی گردن میں اتر جائے گی۔ ظلِ الٰہی کی گھگی بندھ گئی۔ اب چھری نے ناچنا شروع کردیا اور یہ رقص کسی طرح رقصِ اجل سے کم نہیں تھا۔ وہ بار بار ان کی گردن کے پاس آتی اور ان کا خون خشک کر کے دور چلی جاتی۔ وہ سوچ رہے تھے کہ انہوں نے بکرا تو قربان کردیا ہے پھر انہیں یہ خواب کیوں دکھائی دے رہا ہے؟ کیا مزید قربانی طلب کی جا رہی ہے؟ چھری اب ان کی گردن کے پاس آکر یوں دائیں بائیں لہرا رہی تھی جیسے فیصلہ کر رہی ہو کہ ظلِ الٰہی کی گردن کس طرف سے کاٹے۔ عین اس وقت جب ظلِ الٰہی کا دم حلق میں آگیا اور انہیں لگ رہا تھا کہ چھری کچھ نہ بھی کرے تو ان کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر جائے گی، کسی نے انہیں ہلایا اور ان کی آنکھ کھل گئی۔ ہلانے والا راجا بیئربل تھا۔ وہ ڈرا ہوا تھا۔

''مہابلی! خیر تو ہے۔ آپ سوتے میں بار بار گردن بخشی کی بات کر رہے تھے؟''

ظلِ الٰہی پسینے میں یوں شرابور تھے جیسے لباسِ فاخرہ سمیت تالاب میں ڈبکی لگا آئے ہوں۔ سانس یوں چل رہا تھا جیسے انہوں نے میراتھن ریس میں حصہ لیا ہو۔ کوئی دو درجن گہرے سانس لینے پر ان کے حواس بحال ہوئے تو انہوں نے ملا دو پیزا کے بارے میں پوچھا۔ ''وہ کہاں ہے؟''

''وہ بکرا حلال کر رہا ہے۔'' راجا بیئربل نے بلبلا کر کہا۔

''مگر اس سے آنے والی آفت پر کوئی فرق نہیں پڑا۔ ابھی ہم نے وہی خواب زیادہ ہارر ایفیکٹس کے ساتھ ملاحظہ کیا ہے۔''

''مہابلی! یہ تو ملا دو پیزا ہی بتا سکے گا کہ آفت کیوں نہیں ٹل رہی۔''

ظلِ الٰہی نے تالی بجائی اور بولے۔ ''ملا دو پیزا کو حاضر کیا جائے۔''

چند منٹ بعد ہی ملا دو پیزا ظلِ الٰہی کے سامنے تھا اور وہ اس پر برس رہے تھے۔ راجا بیئربل کی باچھیں کھل گئیں

تھیں اور وہ منتظر تھا کہ ابھی ملا دو پیزا کو عبرتناک حالات سے گزرنا پڑے گا مگر ملا دو پیزا خاموشی سے سن رہا تھا اور جب ظلِ الٰہی خاموش ہوئے تو اس نے تفکر سے کہا۔ ''ظلِ الٰہی! اب سمجھ میں آیا کہ بلا کیوں نہیں ٹل رہی۔''

''کیا سمجھ میں آیا ہے؟'' ظلِ الٰہی نے کڑے تیوروں سے پوچھا۔

''ظلِ الٰہی! جب اس نیک خصال بکرے کو قربان کیا جا رہا تھا تو وہ اپنے جڑواں بھائی کی طرف منہ اٹھا اٹھا کر بکرا رہا تھا۔ میں سمجھا کہ اسے الوداع کر رہا ہے لیکن اب ایسا لگ رہا ہے کہ ظلِ الٰہی پر آنے والی آفت ٹالنا اکیلے بکرے کے بس کی بات نہیں اس لیے وہ اپنے مددگار کو پکار رہا تھا اور بھائی سے بہتر مددگار کون ہو سکتا ہے؟''

''تم نے ٹھیک کہا ملا دو پیزا۔'' ظلِ الٰہی آبدیدہ ہو گئے کیونکہ انہیں برادرِ محترم یاد آ گئے تھے۔ اگر وہ اچانک دنیا سے رخصت نہ ہوتے تو آج وہ ظلِ الٰہی نہ ہوتے۔ انہوں نے حکم صادر کیا۔ ''بکرے کے جڑواں بھائی کو بھی قربان کیا جائے۔''

''حکم کی تعمیل ہو گی۔'' ملا دو پیزا نے پُرمسرت سے بغلیں بجاتے ہوئے کہا۔ راجا پیزبل جو ملا دو پیزا کی اس حکمت عملی پر دنگ تھا، اس نے اعتراض کیا۔

''مگر مہابلی! آپ نے دوسرا بکرا دیکھا کہاں ہے؟''

''اس کی ضرورت نہیں ظلِ الٰہی۔'' ملا دو پیزا نے اطمینان سے کہا۔ ''وہ صورت شکل، عادات و اطوار اور کردار میں مثلِ برادر ہے۔ ایک کو دیکھا تو سمجھ لیں، دوسرے کو بھی دیکھ لیا۔''

''اسے فوری طور پر اس کے بچھڑے بھائی کے پاس بھیج دیا جائے۔'' ظلِ الٰہی نے مزید آبدیدہ ہوتے ہوئے کہا۔ اس پر انہیں اپنا برادرِ خرد یاد آ گیا جس کے ساتھ انہوں نے تقریباً یہی سلوک کیا تھا۔

''مگر ظلِ الٰہی۔'' اس بار ملا دو پیزا نے دبی زبان میں کہا۔ ''اس صورت میں بل تقریباً ایک سو بیس فیصد بڑھ جائے گا۔ آپ کو تو معلوم ہی ہو گا کہ دوسری قربانی کی صورت میں سیلز ٹیکس کی شرح بڑھ جاتی ہے۔''

''تم بل کی فکر مت کرو۔'' ظلِ الٰہی نے خفگی سے کہا۔ ''کسی بھی صورت ہم پر آنے والی یہ آفت ٹالو۔''

ملا دو پیزا خوشی سے ناچتا ہوا رخصت ہوا تھا اور راجا پیزبل غالباً دھاڑیں مار کر رونے پر غور کر رہا تھا۔ اس نے [illegible] نہیں تھا کہ ملا دو پیزا اس کی چال یوں الٹ دے گا اور سزا کے بجائے مزید جزا پائے گا۔ وہ یقیناً اس دوسرے بکرے میں سے اسے کچھ نہیں دے گا کیونکہ معاہدہ صرف ایک بکرے کی حد تک ہوا تھا اور اس میں سے بھی اسے برائے نام ملتا۔ ملا دو پیزا کے جاتے ہی ملکۂ عالیہ تشریف لے آئیں اور ظلِ الٰہی نے پُرامید نظروں سے انہیں دیکھا۔ ''بہ خدا ابھی ہم آپ کے بارے میں ہی سوچ رہے تھے اور آپ تشریف لے آئیں۔''

''کیونکہ ہم مہابلی کے دل سے زیادہ دماغ میں رہتے ہیں۔'' ملکۂ عالیہ نے اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''اس لیے اچھی طرح جانتے ہیں کہ آپ کیا سوچ رہے ہیں۔''

ظلِ الٰہی ذرا گڑبڑائے اور پھر ہمت کر کے کہا۔ ''وہ...... آپ نے صائمہ جی کے بارے میں کہا تھا۔''

''جی مہابلی! ہمیں یاد ہے۔'' ملکۂ عالیہ نے تیکھے انداز میں کہا۔ ''آپ کو بھی یاد ہو گا۔ پچھلے دنوں ہم نے اپنے برادرِ نسبتی کو کسٹم میں ڈائریکٹر لگانے کو کہا تھا اور آپ نے......''

''وہ میٹرک فیل ہے۔ کسٹم میں چپڑاسی بھی کم سے کم انٹر ہوتا ہے۔''

''اور ہمارے چچیرے بھائی جو لندن سے پڑھ کر آئے ہیں، آپ نے انہیں بھی محکمۂ تعلیم میں افسر نہیں لگایا۔''

''ملکۂ عالیہ۔'' ظلِ الٰہی نے جز بز ہوتے ہوئے کہا۔ ''وہ لندن سے جانوروں کے ڈاکٹر کی سند لے کر آئے ہیں، ہم انہیں محکمۂ تعلیم میں کیسے افسر لگا سکتے ہیں؟''

''جیسے آپ نے ایک انگوٹھا چھاپ کو اس محکمے کا وزیر بنا رکھا ہے۔''

''وزیر تو کوئی بھی بن سکتا ہے لیکن محکمے میں افسر ہر ایک نہیں بن سکتا۔''

''مگر کوئی اور صائمہ جی تو بن سکتا ہے۔'' ملکۂ عالیہ نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''کیا مطلب؟'' ظلِ الٰہی نے پوچھا۔ جواب میں ملکۂ عالیہ نے تالی بجائی اور بلند آواز سے بولیں۔

''آئٹم سونگ پیش کیا جائے۔''

اچانک دربار میں اندھیرا ہو گیا۔ پھر چھت سے ایک باریک سی روشنی نمودار ہوئی جو بتدریج پھیلتی گئی اور ہال کے موزائک فرش پر ایک دائرہ سا بن گیا۔ یہ دیکھ کر ظلِ الٰہی کی دھڑکن تیز ہو گئی کہ زرق برق لباس میں ایک نسوانی وجود یوں فرش پر بیٹھا ہوا تھا کہ اس کا چہرہ اس کی لمبی زلفوں کے

سائے میں تھا۔ پھر موسیقی کی دھیمی آواز ابھرنے لگی جو تیز ہوتے ہوتے سماعتوں کو چبھنے لگی اور جیسے ہی چھن کی آواز کے ساتھ موسیقی کا تسلسل ٹوٹا، نسوانی وجود ایک جھٹکے سے کھڑا ہوا اور ظلِ الٰہی کے آگے جھکا۔ ہال میں ایک کرخت آواز گونجی۔ ''صائمہ جی گرو، ظلِ الٰہی کے آگے آداب بجالاتی ہے اور آئٹم سونگ پیش کرنے کی اجازت چاہتی ہے۔''

''اجازت ہے۔'' ظلِ الٰہی کے بجائے ملکۂ عالیہ نے فرمایا اور اس کے ساتھ ہی صائمہ جی گرو حرکت میں آگئی یا آگیا۔ اس بارے میں ظلِ الٰہی ٹھیک سے نہیں کہہ سکتے تھے مگر انہیں لگا کہ ان کی زندگی کا سب سے بھیانک خواب شروع ہوگیا ہے۔ یہ آئٹم سونگ نہیں ملکۂ عالیہ کا آئٹم انتقام تھا جو انہوں نے ظلِ الٰہی سے لیا تھا۔ کئی مواقع پر جب صائمہ جی گرو ظلِ الٰہی کے آس پاس آکر لہراتی یا لہراتا تو انہیں خواب والی چھری یاد آجاتی اور وہ ویسا ہی خوف محسوس کرتے تھے۔ یہ خوف ناک خواب یا شو تقریباً نصف گھنٹے جاری رہا اور موسیقی و رقص کے بارے میں ظلِ الٰہی کے تمام احساسات کا قیمہ کر گیا۔ نہ جانے کب آئٹم سونگ ختم ہوا اور صائمہ جی گرو کے ساتھ ساتھ ملکۂ عالیہ بھی رخصت ہوگئیں اور وہ کسی سے پوچھ نہ سکے کہ یہ اصل میں کیا تھا۔ راجا پیزا بل اور ملا دو پیزا تک دم بہ خود سے یہ آئٹم سونگ دیکھ رہے تھے۔ اس کے ختم ہونے پر بھی وہ دم بہ خود ہی رہے۔ حتیٰ کہ ملا دو پیزا بکروں کا بل بھی پیش کرنا بھول گیا تھا۔ خاصی دیر بعد اسے خیال آیا اور اس نے جیب سے بل نکال کر ظلِ الٰہی کے سامنے پیش کیا۔

''یہ بکروں کی ادائیگی کا بل ہے۔''

ظلِ الٰہی نے بل تھاما تھا کہ اچانک فریادی گھنٹی بجی اور ایک ہانپتا کانپتا فریادی حاضر ہوا۔ وہ اتنا بوڑھا تھا کہ اس کی بھوؤں کے بال تک سفید ہوگئے تھے۔ کمر کمان بن گئی تھی اور لاٹھی کے ساتھ وہ نون غنہ بنا ہوا تھا۔ اس نے بھی لرزتی آواز میں فریادی راگ الاپا۔ ''دُہائی ہے...... ظلِ الٰہی...... دُہائی ہے۔''

اگرچہ ملکۂ عالیہ کے آئٹم انتقام نے ظلِ الٰہی کا منہ کڑوا کر دیا تھا مگر انہوں نے فریادی کو فوری دھتکارنا مناسب نہ سمجھا اور پوچھا۔ ''کیا فریاد لائے ہو؟''

''سرکار! دو جوان بیٹیاں ہیں اور انہیں عزت سے گھر بھیجنے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ اگر سرکاری خزانے سے کچھ مدد......''

''سرکاری خزانے کو کیا باپ کا مال سمجھ رکھا ہے۔'' ظلِ الٰہی نے گرج کر کہا۔ ''اگر تمہارے گھر جوان بیٹیاں بیٹھی ہیں تو یہ تمہارا قصور ہے۔ انہیں ہمارے حضور کیوں نہیں پیش کیا۔''

''سرکار......'' بوڑھے نے کہنا چاہا مگر ظلِ الٰہی تالی بجا چکے تھے۔ دو سپاہی حاضر ہوگئے۔ ظلِ الٰہی نے بوڑھے کی طرف اشارہ کرکے حکم دیا۔

''اسے اس کے گھر چھوڑ آؤ اور وہاں موجود دو جوان لڑکیوں کو عزت کے ساتھ ہمارے حضور پیش کرو۔''

''حضور......'' بوڑھا چلایا تھا کہ دربار ہال کے گھڑیال نے آٹھ کا گجر بجایا اور ظلِ الٰہی مسرت سے بولے۔

''فریاد کا وقت ختم ہوا...... لے جاؤ فریادی کو۔''

لیکن اس سے پہلے کہ سپاہی بوڑھے کو پکڑتے، اچانک دربار نیم تاریک سا ہوگیا۔ جو جہاں تھا، وہیں ساکت سا ہوگیا اور بوڑھا جو چند لمحے پہلے بہت لاغر اور کمزور لگ رہا تھا اچانک سیدھا کھڑا ہوگیا۔ اس کا قد طویل اور جسم اچانک تنومند نظر آنے لگا تھا۔ جب وہ بولا تو اس کی آواز میں کڑک اور گرج تھی۔ ''ٹھیک کہا تم نے...... وقت ختم ہوگیا۔''

ظلِ الٰہی نے اسے پہچان لیا۔ ''تم وہی ہو نا جو صبح سے دو مرتبہ فریادی بن کر حاضر ہوچکے ہو؟''

''ہاں، میں وہی ہوں۔'' اس نے گونجتی اور کڑکتی آواز میں کہا۔ ''اے حکمران! تجھے خواب میں اشارہ دیا اور تین بار موقع دیا کہ تو آنے والی آفت سے بچ سکے مگر افسوس تو نے تینوں بار یہ موقع گنوادیا۔ اب تیار ہو جا چلنے کے لیے۔''

''کہاں؟'' ظلِ الٰہی سہم گئے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ سوائے ان دونوں کے باقی سب بت بن گئے تھے۔ وہ سپاہی بھی جو فریادی کو دبوچنے آرہے تھے۔

''آگ سے بھرے اس گڑھے کی طرف جو تجھ جیسے حکمرانوں کے لیے ہی تیار کیا گیا ہے۔''

''ہم نہیں جائیں گے۔''

''کس کی مجال ہے جو انکار کر سکے۔'' اس نے حقارت سے کہا اور ہاتھ سے اشارہ کیا تو دربار کا منظر ہی بدل گیا۔ اب وہاں چاروں طرف آگ ہی آگ تھی۔ بدبو اور ایسا شور تھا جس نے لمحوں میں ظلِ الٰہی کے حواس مختل کر دیے تھے۔ انہیں خاصی دیر بعد جا کر احساس ہوا کہ وہ جس کرسی پر بیٹھے تھے، وہ اصل میں آگ کی بنی ہوئی تھی اور اس کے ساتھ ہی ان کے حلق سے فلک شگاف چیخ نکلی۔

غریب الوطن مرشد

ضیا تسنیم بلگرامی

نہ گھر اپنا، نہ زمین اپنی، نہ رستے اور نہ ہی منزل اپنے حصے میں... کچھ لوگوں کی زندگی بس اسی انداز سے بسر ہو کر اپنے انجام کو پہنچ جاتی ہے لیکن... انہی دن رات میں بعض مخصوص انسان زندگی کی حقیقت کو سمجھ کر مقصدیت کو پالیتے ہیں۔ بس ایسے ہی لوگوں کا شمار اللہ کے برگزیدہ بندوں میں ہوتا ہے۔
آپ کا بھی یہ سفر اپنی مخصوص رفتار سے جاری تھا جبکہ فیض پانے والے استفادہ کرتے جارہے تھے کہ یہی آپ کی زندگی کا مقصد تھا۔

نیک لوگوں کی خصلتوں اور مقصدِ حیات کی کرامات

ڈیرہ غازی خان کے ایک بزرگ اپنے دو بیٹوں حافظ محمود اور حامد اور ایک بیٹی کو ساتھ لے کر مکہ مکرمہ تشریف لے گئے۔ وہ حج کی سعادت حاصل کرنا چاہتے تھے۔ دورانِ سفر چند ایسے مواقع پیش آئے کہ دونوں بیٹے اپنے باپ اور بہن سے بچھڑ گئے۔ باپ اپنی بیٹی کے ساتھ جہاز پر سفر کرتا رہا اور دونوں بیٹے غلطی سے مسقط ہی میں اتر گئے۔ ان دونوں کے پاس اتنی رقم بھی نہیں تھی کہ راستے کی صعوبتوں اور دشواریوں پر مال و زر سے قابو پالیتے۔ دونوں نے فیصلہ کرلیا کہ حج کی سعادت پیادہ پا سفر ہی سے حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔ ان میں حافظ محمود چھوٹا اور حامد بڑا تھا۔ دونوں کو خوش قسمتی سے حجاج کا ایک قافلہ مل گیا۔ یہ اس میں شامل ہو گئے۔ زادِ راہ نہ ہونے کے سبب یہ دونوں مسجدوں میں قیام کرتے تھے۔ ان دنوں محمد بن عبدالوہاب نجدی کی تحریک کا بڑا زور تھا اور ان کے پیروکار اپنے عقائد اور ان کی اشاعت میں تشدد سے بھی گریز نہیں کرتے تھے۔ دونوں بھائیوں کے دلوں میں عشقِ رسول ﷺ کی شدت کا یہ حال تھا کہ وہ نجدی عقائد کی ذرا بھی پروانہ کرتے تھے۔ نجدیوں کو درود و سلام سے

گریز اور یہ دونوں اس کے عاشق اور دلدادہ۔ آخر نجدیوں نے انہیں دھمکی دی کہ اگر وہ اس سے باز نہ آئے تو وہ سختی کر کے روک دیں گے۔
حافظ محمود نے نجدیوں کو جواب دیا۔ ''بھائیو! ہمیں نہیں معلوم کہ تم درود وسلام سے ہمیں کیوں روکتے ہو مگر یہ بات ضرور جانتے ہیں کہ عشق ومحبت میں ضبط واحتیاط کا کیا کام۔ رسول ﷺ کی محبت ہماری رگ وپے میں جاری ہے اور ہم جب حالتِ بے قراری میں درود وسلام پڑھتے ہیں تو گویا یہ اضطراری فعل ہوتا ہے۔ ہوش وحواس میں رسم دنیا تو نبھ سکتی ہے مگر عالم جوشِ جنون میں اس کا کیا ذکر؟''
نجدیوں نے ان دونوں پر تلواریں کھینچ لیں اور غصے میں کہا۔ ''اے ہندی! ہم دیوانگی اور جنون کا علاج جانتے ہیں۔ اگر تم دونوں اس بدعت سے باز نہ آئے تو ہماری تلواریں تمہیں جبراً باز رکھیں گی۔''
دونوں بھائی بھی سینہ تان کر کھڑے ہو گئے۔ بولے۔ ''اگر ہوش مند تلواریں کھینچ کر دیوانوں کو اپنی مرضی پر چلانے کی ضد کر سکتے ہیں تو دیوانے اپنے مسلک سے کب باز رہ سکتے ہیں۔ عشق میں جان کیا چیز ہے، ہم اس کو قربان کر دیں گے لیکن اپنے دلوں سے عشق رسول ﷺ کو نہیں نکال سکتے۔''
اسی عالم میں ایک طرف سے گھوڑوں کے سرپٹ بھاگنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ نجدیوں کی توجہ اس طرف ہو گئی۔ ان کے سامنے گرد وغبار کا بگولا بڑھا چلا آرہا تھا۔ کچھ دیر بعد بگولا پھٹ گیا اور اس میں سے علاقے کا شیخ اپنے شمشیر بکف ساتھیوں کو لیے ہوئے نمودار ہوا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے یہ لوگ ان دونوں کے درمیان حدِ فاصل بن کر رک گئے۔
شیخ نے نجدیوں سے پوچھا۔ ''بھائیو! کیا بات ہے؟''
ایک نجدی نے جواب دیا۔ ''یہ دونوں ہندی بدعتی ہیں اور بلند آواز میں درود وسلام پڑھتے پھرتے ہیں۔''
شیخ نے ان دونوں سے پوچھا۔ ''تم کیا کہتے ہو؟''
حافظ محمود نے جواب دیا۔ ''شیخ! میں نہیں جانتا کہ بدعت کسے کہتے ہیں لیکن یہ درست ہے کہ ہم درود وسلام پڑھتے ہیں۔ ہم نے عشق رسول ﷺ میں بڑی صعوبتیں برداشت کی ہیں۔'' اس کے بعد انہوں نے اپنے پاؤں کے چھالے دکھائے اور کہا۔ ''جس عشق میں ہم نے اپنا یہ حال کر لیا ہے، وہ ان نجدیوں کی تلواروں سے کیا ڈرے گا۔ ان سے کہو کہ یہ ہمیں ہلاک کر دیں۔''
شیخ نے نجدیوں کو سمجھایا۔ ''بھائیو! یہ ہندی ہمارے مہمان ہیں اور مہمانوں پر تلواریں کھینچ لینا کہاں کی میزبانی ہے۔ تم لوگ اپنی اپنی تلوار نیام میں ڈال لو کیونکہ اب میں ان کا ضامن بن چکا ہوں اب انہیں کوئی کبھی گزند نہیں پہنچا سکتا۔''
نجدیوں میں سے ایک نے حیرت سے پوچھا۔ ''شیخ! ان بدعتیوں کی تو کیوں ضمانت لیتا ہے؟''
شیخ نے جواب دیا۔ ''اس لیے کہ مجھ کو خواب میں رسول اللہ ﷺ نے ان کی ضمانت لینے کا حکم دیا ہے۔''
نجدیوں نے محسوس کیا کہ اگر انہوں نے جبر اور زیادتی سے کام لیا تو شیخ اور اس کے ساتھی بھی اپنی اپنی تلواریں حرکت میں لے آئیں گے۔ انہوں نے دونوں بھائیوں کو نفرت سے دیکھا اور کہا۔ ''افسوس کہ شیخ کی بروقت اور بے جا مداخلت تمہارے کام آ گئی، ورنہ ہم دیکھتے کہ تم کس طرح اپنے بدعتی مسلک پر قائم رہتے۔''
حافظ محمود نے جواب دیا۔ ''بھائیو! تم سب برادر دینی ہو مگر افسوس کہ تم نے ہماری محبت اور عشق کا خواہ مخواہ مذاق اڑایا۔ ہم دونوں نہتے تھے تم لوگوں نے بزورِ شمشیر ہمیں عشق سے باز رکھنا چاہا۔ لیکن ہم بے خوف تمہارے سامنے سینہ تان کر کھڑے ہو گئے۔ ہم دونوں جان دے کر بھی اپنے جادۂ عشق سے ہٹنے کو تیار نہ تھے لیکن تم ظاہری دنیادار لوگ شیخ اور اس کے آدمیوں کی تلواروں سے خوف زدہ ہو گئے۔ اگر تم خود کو دینی عقائد اور مسلک میں حق پر سمجھتے ہو تو تمہیں شیخ کی تلواروں سے خوف نہیں کھانا چاہیے۔''
ایک نجدی نے جواب دیا۔ ''ہندی! اب زیادہ بڑبڑ نہ کر۔ خدا کا شکر ادا کر کہ تیری جان بچ گئی، اپنی راہ لے۔ زیادہ اترانے کی کوئی ضرورت نہیں۔''
شیخ نے بھی انہیں منع کیا۔ ''ہندی نوجوان! اب زیادہ بات نہ بڑھا۔ جب تک جی چاہے یہاں رہ، تجھے یہ لوگ ہماری موجودگی میں کوئی گزند نہیں پہنچا سکتے۔ تم دونوں بھائی میرے مہمان ہو۔''
دونوں بھائیوں نے شیخ کا شکریہ ادا کیا اور چند دن قیام کر کے وہ آگے روانہ ہو گئے۔
یہ دونوں منزل بہ منزل قیام کرتے ہوئے بالآخر مکہ معظمہ پہنچ گئے۔ وہاں حجاج کرام نے ایک شہر آباد کر رکھا تھا۔ اس شہر میں مزید دو کا اضافہ ہو گیا۔ ان کے پاس کوئی ساز وسامان بھی نہ تھا۔ کسی نے انہیں اپنا خیمہ پیش کر دیا۔ یہ اس میں ٹھہر گئے۔ رات کو چاندنی میں مکہ معظمہ عظمت وجلال کا گہوارہ نظر آرہا تھا۔ حافظ محمود کے دل پر اس کا کچھ زیادہ ہی اثر ہو رہا تھا۔ ان کا دل بھر آیا اور وہ بلک بلک کر رونے لگے۔ اسی عالم میں ان کو اپنے باپ اور بہن کی یاد آئی اور دل کے سوتے پھر رسنے لگے۔ یہ حرم پاک میں جا کر

نمازیں پڑھنے لگے۔ دورانِ نماز ان پر جذب کا عالم طاری ہوگیا۔ وہ یہ سب کچھ بھول گئے۔ اس نماز کی لذت اور کیف میں انہیں اپنا بھی ہوش نہ رہا۔ عشا کے وضو سے فجر کی نماز بھی ادا کی۔ طلوعِ آفتاب پر اپنے خیمے میں پہنچے۔ وہاں جس شخص نے انہیں مہمان بنایا تھا، ان کا منتظر بیٹھا تھا۔ یہ شخص بھی ہندی تھا۔ پوچھا۔ ''بھائی! کیا تم دونوں بھائی برصغیر کے ڈیرہ غازی خان سے آئے ہو؟''

حافظ محمود نے جواب دیا۔ ''ہاں، ہم وہیں سے آئے ہیں۔''

اس نے مزید سوال کیا۔ ''اور تم دونوں اپنے باپ اور بہن سے بچھڑ گئے تھے؟''

جواب دیا۔ ''ہاں، یہ بھی درست ہے۔''

میزبان نے کہا۔ ''تمہیں ان دونوں کی تلاش بھی ہے؟''

جواب دیا۔ ''ہاں، یہ بھی درست ہے۔''

میزبان نے ملحقہ خیمے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''تو اب تم دونوں خوش ہو جاؤ۔ وہ دونوں اس خیمے میں موجود ہیں اور بڑی دیر سے تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔''

دونوں بھائی دیوانہ وار اس خیمے میں داخل ہوئے اور اپنے باپ سے لپٹ گئے۔ باپ کی آنکھیں بھی ساون بھادوں بن گئیں۔ بہن بھی زار و قطار رو رہی تھی۔ باپ نے کہا۔ ''تم دونوں کی جدائی نے مجھے کہیں کا بھی نہیں رکھا۔ زندگی کا مزہ ہی جاتا رہا۔ کھانا پینا، سونا جاگنا ہر شے بے مزہ اور بے لطف ہوگئی تھی۔''

بہن نے کہا۔ ''بھائی، میں تو اتنی مایوس ہوگئی تھی کہ شاید اب اس دنیا میں ملاقات نہیں ہوسکے گی۔ میں نے مکہ معظمہ میں داخل ہوتے ہی غلافِ کعبہ پکڑلیا اور رو رو کر اپنے رب سے ملنے کی دعا کرتی رہی۔''

دونوں بھائی اپنے باپ اور بہن کے ساتھ آنسو بہاتے رہے۔ ان سب نے ایک ساتھ حج کیا۔ حافظ محمود کا دل ان سب سے زیادہ گداز تھا۔ وہ اپنے رب سے دنیا کے بجائے دین مانگ رہے تھے۔ خدا کے گھر سے فارغ ہونے کے بعد مدینہ منورہ کا رخ کیا۔ رسول اللہ ﷺ کے روضے پر حاضری دی۔ یہاں حافظ محمود کا حال قابو سے باہر تھا۔ وہ بے ہوش ہوگئے لیکن اس بے ہوشی میں بھی وہ دنیا سے متنفر اور دین کے متمنی تھے۔ عشقِ رسول ﷺ میں سب کچھ بھلا دیا تھا۔ انہیں اکثر یوں لگا گویا جذبوں کی شورش سے ان کا دل پھٹ جائے گا۔ یہ جتنے دن بھی مدینہ منورہ میں رہے، انہیں کسی بات کا ہوش ہی نہ رہا۔ وہ مدینے کے چپے چپے میں خوشبوئے رسول ﷺ محسوس کرتے رہے۔ ان کا چلنے پھرنے کے دوران فرطِ احترام میں برا حال رہتا۔ جو قدم بھی اٹھتا، اس احتیاط اور خوف کے ساتھ کہ کہیں وہ ایسی جگہ نہ ہو جہاں رسول اللہ ﷺ... کے قدم مبارک پڑ چکے ہوں اور ان کے ناپاک قدم سے اس کی بے حرمتی نہ ہو جائے۔

آخر وہ دن بھی آ گیا کہ باپ نے واپسی کا اعلان کر دیا۔ باپ کو اپنا وطن یاد آ رہا تھا۔ انہوں نے اپنی بیٹی اور دونوں بیٹوں کے ساتھ جدہ سے واپسی کا سفر شروع کیا اور بمبئی کے لیے روانہ ہوگئے۔ حافظ محمود کا دل دیارِ یار سے جدا ہونے پر آمادہ نہیں تھا لیکن باپ کی خواہش نے انہیں مجبور کر دیا۔

یہ لوگ بمبئی میں اتر گئے۔ سمندری ہواؤں نے بہن اور باپ پر برا اثر کیا اور یہ دونوں جب بمبئی کے ساحل پر اترے تو ان کے جسم متورم تھے اور بخار کی حدت میں دونوں پھنک رہے تھے۔ یہاں ان دونوں کا علاج ہوتا رہا مگر ان کی زندگی کے دن پورے ہو چکے تھے اور یکے بعد دیگرے دونوں ہی اللہ کو پیارے ہوگئے۔ اب ان دونوں بھائیوں کا مارے صدمے کے برا حال ہوگیا۔ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اب انہیں کیا کرنا چاہیے۔ دونوں اتنے سادہ لوح اور بھولے تھے کہ انہیں یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ بمبئی سے اپنے وطن کس طرح پہنچیں۔ باپ نے مال و زر اتنا چھوڑا تھا کہ سال دو سال بے فکری میں گزار سکتے تھے۔ سرزمینِ عرب سے جو جہاز بمبئی تک ان کے ہم سفر رہے تھے، ان میں ایک شخص بہت تیز و طرار تھا اور اس کی نظریں حافظ محمود کے ورثے پر جمی ہوئی تھیں۔ اس عیار نے دونوں بھائیوں کی سادہ لوحی کا پورا پورا فائدہ اٹھایا، وہ ان کے پاس پہنچا اور پوچھا۔ ''بھائیو! مجھے بڑا دکھ ہے کہ غریب الوطنی میں تمہیں اپنی بہن اور باپ کا غم سہنا پڑا۔''

حافظ محمود نے جواب دیا۔ ''خدا کی مرضی میں ہمارا کیا دخل۔ مشیتِ ایزدی یہی تھی۔ ہم اس پر شاکر ہیں۔''

اس نے پوچھا۔ ''میں تم دونوں کو کچھ زیادہ ہی پریشان محسوس کر رہا ہوں۔ کیا تم دونوں مجھے اپنا ہمراز بنانا پسند کروگے؟''

حافظ محمود نے کہا۔ ''اگر میں تمہیں اپنا ہمراز بنا بھی لوں تو اس سے مجھے کیا فائدہ پہنچے گا؟''

اس شخص نے جواب دیا۔ ''مجھے اپنا ہمراز بنا کے تم اپنے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرسکوگے۔''

حافظ محمود نے قدرے تامل کے بعد کہا۔ ''اے شخص! میں تجھ پر اعتبار کرنے کو تیار ہوں لیکن اس شرط پر کہ میں تجھ سے بھی یہ

وعدہ لوں گا کہ تو ہم سے دغا نہیں کرے گا۔''
اس شخص نے بے ساختہ قہقہہ لگایا اور جواب میں کہا۔ ''میں ہر وعدے کے لیے تیار ہوں۔ جب اور جہاں کہو گے، میں عہدو پیماں کے لیے تیار ہوں۔ میں تیری صاف گوئی سے بہت خوش ہوا۔''
حافظ محمود اور ان کے بھائی حامد نے اس شخص پر اعتبار کرلیا۔ اب وہ ان دونوں کے آس پاس منڈلانے لگا۔ یہ لوگ اس قافلے میں شامل ہو کر اجمیر کی طرف روانہ ہوگئے۔ راستے میں ایک جگہ وہ شخص ہانپتا کانپتا حافظ محمود کے پاس پہنچا اور عرض کیا۔ ''حضرت! غضب ہوگیا۔''
حافظ محمود نے پوچھا۔ ''کیا غضب ہوگیا؟''
اس نے جواب دیا۔ ''آگے قزاق ہماری راہ روکے کھڑے ہیں، آپ کے پاس کچھ ہے؟''
انہوں نے کہا۔ ''ہاں، ہے کیوں نہیں؟ قزاقوں سے بچنے کی کوئی ترکیب؟''
اس نے جواب دیا۔ ''ہاں، بس ایک ہی ترکیب ہے۔ کچھ مال وزر میرے پاس بھی ہے۔ کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ ہم دونوں میں سے کوئی ایک دونوں کے مال وزر کو لے کر قافلے کے پیچھے رہ جائے اور جب قزاق اپنا کام کر کے فرار ہوجائیں تو یہ رکا ہوا شخص تباہ حال قافلے میں شامل ہوجائے۔ اس طرح یہ مال وزر قزاقوں کی دسترس سے دور اور محفوظ رہے گا۔''
حافظ محمود کو یہ ترکیب پسند آئی۔ فرمایا۔ ''میں تیری تجویز سے متفق ہوں۔ لیکن میں دونوں کا مال وزر لے کر قافلے کے پیچھے نہیں رہ سکتا۔ یہ کام کوئی ہوشیار اور دلیر شخص ہی اچھی طرح انجام دے سکتا ہے اور میرا خیال ہے کہ وہ شخص تو خود ہی ہے۔ کوئی اور تجھ سے بہتر یہ کام نہیں کرسکتا۔''
اس شخص نے کسی قدر پس و پیش سے کہا۔ ''حضرت! ذمے داری تو بہت بڑی ہے مگر آپ فرماتے ہیں تو میں انکار بھی نہیں کرسکتا...... آپ کی بات میں ٹال بھی نہیں سکتا۔''
حافظ محمود نے اپنا مال وزر اس شخص کے حوالے کردیا اور خود ہاتھ جھاڑ کر قافلے کے ساتھ ہولیے۔ اس شخص کی پیش گوئی حرف بہ حرف سچ نکلی۔ راستے میں قزاقوں نے قافلے کو لوٹ لیا اور سب کچھ چھین چھان کر اپنی راہ لی۔ لٹا پٹا قافلہ اپنی منزل پر پہنچا تو یہیں پر وہ شخص بھی آن ملا اور یہ کہہ کر آگے بڑھ گیا ابھی ایک اور خطرہ باقی ہے۔ میں آگے جا رہا ہوں۔ وہیں ملاقات ہوجائے گی۔''
یہ قافلہ اور آگے بڑھ گیا۔ اس شخص نے ایک بار پھر کہا۔ ''حضرت! آپ کا مال وزر میرے پاس امانت ہے۔ آپ اس کی طرف سے فکر مند نہ ہوں۔ میرے پاس آپ کا جو کچھ ہے، وہ ہر حال میں آپ ہی کا رہے گا اور میں اس کا امین کہلاؤں گا۔''
آپ نے ایک بار پھر خاموشی اختیار کرلی۔ یہاں تک کہ وہ شخص آپ کو ورغلاتا بہلاتا جالندھر تک پہنچ گیا لیکن اب اس میں غیر معمولی تبدیلی آچکی تھی۔ وہ حافظ محمود سے ہیر پھیر کی باتیں نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے بڑی بے رخی سے پوچھا۔ ''جناب والا! اب آپ فرمائیں کہ آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟''
حافظ محمود نے جواب دیا۔ ''میرا مال وزر جو آپ کے پاس ہے، میرے حوالے کردیں۔''
وہ شخص ہنسنے لگا۔ بولا۔ ''کیا آپ نے مجھے احمق سمجھ رکھا ہے؟ جناب! آپ ابھی اس شخص یعنی مجھ سے پوری طرح واقف نہیں ہوئے ہیں ورنہ ایسی بات نہ کرتے۔''
انہوں نے پوچھا۔ ''میں نے ایسی کون سی بات کی ہے جس سے تجھ کو ایسی باتیں کرنا پڑ رہی ہیں؟''

اس شخص نے جواب دیا۔ ''تم مجھ سے اپنا مال وزر طلب کر رہے ہو۔''
آپ نے فرمایا۔ ''پھر کیا مطلب ہے...... نہ مانگوں؟''
اس شخص نے جواب دیا۔ ''پھر مطلب یہ کہ میرے پاس آپ کا کچھ بھی نہیں۔ آپ کس مال وزر کا مطالبہ کر رہے ہیں؟''
حافظ محمود نے کہا۔ ''اس مال وزر کا جو میرا ہے اور میں نے بطور امانت تیرے حوالے کیا تھا۔''
اس نے نظریں پھیر کر بے مروتی سے جواب دیا۔ ''آپ کا مال وزر بھی قزاق چھین کر لے گئے۔ جب پورا قافلہ لٹ گیا تو آپ کا مال کس طرح محفوظ رہ سکتا تھا۔''
حافظ محمود نے حیرت سے اس بددیانت شخص کو دیکھا۔ ''کیا تو از روئے ایمان کہہ رہا ہے؟''
اس شخص نے جواب دیا۔ ''بالکل از روئے ایمان! میرے پاس آپ کا کچھ بھی نہیں۔''
حافظ محمود نے بے بسی سے کہا۔ ''اگر تو یہ سب ایمان کے حوالے سے کہہ رہا ہے، ایمان کے واسطے سے یقین دلا رہا ہے تو میں

بھی صبر کیے لے رہا ہوں اور آئندہ اس سلسلے میں تجھ سے کوئی بات نہ ہوگی۔''
اس شخص نے ڈھٹائی سے کہا۔ ''اگر آپ مطالبہ بھی کریں تو دے گا کون۔ جب میرے پاس آپ کا ہے ہی کچھ نہیں تو کیسا مطالبہ اور کہاں کا لینا دینا۔''
حافظ محمود نے صبر کر لیا اور اس شخص نے ان سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ یہ جس جگہ رہتے تھے، وہاں ہوشیار پور کے ایک بزرگ مولوی محمد شریف آئے ہوئے تھے۔ ان کا جالندھر میں بڑا اثر تھا اور یہ شہریوں میں بہت مقبول تھے۔ انہوں نے حافظ محمود کو بڑی محبت کی نظروں سے دیکھا اور انہیں اپنی صحبت میں اٹھنے بیٹھنے اور رہنے کی اجازت دے دی۔
ایک دن مولوی شریف نے پوچھا۔ ''صاحبزادے! تم کہاں کے رہنے والے ہو؟''
حافظ محمود نے اپنی پوری پتا سنائی۔ مولوی محمد شریف نے کہا۔ ''صاحبزادے! تم کسی کے مرید بھی ہو یا نہیں؟''
انہوں نے جواب دیا۔ ''ابھی تک تو نہیں، ہاں میں اپنے والد کے پیر و مرشد کی تلاش میں ہوں تاکہ ان کی مریدی اختیار کر لوں۔''
مولوی شریف نے فرمایا۔ ''نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں تمہیں اللہ کا نام سکھاؤں گا۔ اس لیے تمہارا فرض ہے کہ میری مریدی اختیار کر لو۔ اللہ نے یہاں میرے ہی پاس تمہیں بھیجا ہے اس لیے اب کسی اور در کا خیال لانا بھی درست نہیں۔''
حافظ محمود نے سر تسلیم خم کر دیا اور مولوی شریف کی مریدی اختیار کر لی۔
لیکن کچھ ہی عرصے میں انہیں یہ بات معلوم ہو گئی کہ جالندھر کے پیرزادے مولوی شریف سے خوش نہیں ہیں۔ وہ ان کی تلقین اور تعلیم سے ناخوش رہنے لگے۔ ایک دن ان پیرزادوں نے آپ کا محاصرہ کر لیا۔ مولوی محمد شریف نے پوچھا۔ ''تم لوگ ہمارا محاصرہ کیوں کر رہے ہو...... خیریت تو ہے؟''
ایک نے جواب دیا۔ ''جناب والا! ہم آپ سے یہ جاننا چاہتے ہیں کہ آپ جالندھر میں کیا لینے آئے ہیں؟''
مولوی شریف نے فرمایا۔ ''میں تم لوگوں کو اللہ کا نام سکھاؤں گا۔''
ایک پیرزادے نے مذاق میں کہا۔ ''واہ جناب! آپ نے تو کمال کر دیا۔ ہم سب سید زادے ہیں اور پیری اور مرشدی ہمیں اپنے خاندان سے ملی ہے۔ کسی اور کا اس سے کیا تعلق؟''
مولوی محمد شریف نے انکساری سے فرمایا۔ ''بھائیو! میں نے یہ کب کہا کہ میں تمہیں مرید کرنے آیا ہوں۔ میں تو تمہیں اللہ کا نام بتاؤں گا اس لیے میری باتوں کا برا ماننا بے کار ہے۔''
سید زادوں نے انہیں دھمکی دی۔ ''مولوی صاحب! آپ اپنا پیری مریدی کا چکر یہاں جالندھر میں نہ چلائیں کیونکہ یہاں ہم سب کی موجودگی میں آپ کا یہ کاروبار نہیں چلے گا۔''
مولوی شریف نے برا سا منہ بنایا۔ ''سید زادگان! میں آپ کو کس طرح یقین دلاؤں کہ میں یہاں پر ہرگز اس لیے نہیں آیا کہ یہاں کے لوگوں کو اپنا مرید کر لوں بلکہ میں یہاں والوں کو اللہ کا نام سکھا کر واپس چلا جاؤں گا۔''
سید زادوں نے غصے میں کہا۔ ''اللہ کا نام ہمیں اچھی طرح آتا ہے اور اس بارے میں ہم کسی کے محتاج نہیں۔ اس لیے آئندہ آپ یہ بات بھی نہیں کہیں گے۔''
مولوی شریف نے بے نیازی سے کہا۔ ''بھائیو! تمہارا یہ زعم اچھا نہیں۔ اگر تمہیں اللہ کا نام آتا ہے تو میں تمہیں مجبور نہیں کروں گا...... یہاں حافظ محمود نامی ایک حاجی بھی تو ہے، میں اسی کو اللہ کا نام سکھا دوں گا۔ جو جس کی قسمت میں ہوتا ہے اسے مل جاتا ہے۔ آج سے حافظ محمود ہمارا جانشین ہوا۔ وہ مجھ سے اللہ کا نام سیکھے گا اور اس سے دوسرے ہزاروں سیکھیں گے۔''
مولوی شریف ایک باکمال بزرگ تھے۔ انہوں نے حافظ محمود کی بابت جو کچھ فرمایا تھا، اس کا اثر فوراً ہی ظاہر ہونے لگا۔ حافظ محمود میں انقلاب رونما ہونے لگا۔ اس کے بعد مولوی شریف نے کنارہ کشی اختیار کر لی اور حافظ محمود کو جالندھر میں چھوڑ دیا۔ جن سید زادوں نے مولوی شریف سے حافظ محمود کے بارے میں کلماتِ خیر سنے تھے، اب وہ حافظ محمود کے قریب رہنے لگے کہ وہ بھی مولوی شریف کے جھوٹ سچ کا مشاہدہ کر سکیں۔ جب وہ سید زادے، حافظ محمود کے روبرو بیٹھتے تو انہیں اپنے اندر ہیجانی اور اضطراری کیفیت محسوس ہوتی رہتی۔ حافظ محمود بہ ظاہر ان پر کوئی توجہ نہ دیتے مگر معلوم نہیں کیوں، پیرزادے اپنی نظر میں خود ہی ذلیل و خوار ہو رہے تھے۔
جالندھر والوں کو حافظ محمود سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ مگر جالندھر کے گرد و نواح اور دور دور سے حق کے طلب گار ان کی صحبت میں کھنچے چلے جاتے تھے۔ جالندھر کے مولوی اور پیرزادے حافظ محمود سے جلتے تھے اور حسد سے ان کی راہ میں کانٹے بچھاتے تھے۔
دوسرے شہروں کے لوگ حیرت سے کہتے۔ ''پیر و مرشد! یہ جالندھر والوں کو کیا ہو گیا ہے جو آپ کی صحبت سے نفور اور گریزاں

رہتے ہیں؟''
آپ جواب دیتے۔ ''افسوس کہ شہر جالندھر میں جو شمع روشن ہے، اس سے مشعلیں جل جل کر باہر چلی جاتی ہیں اور بیرونِ جالندھر روشنیاں پھیلتی جارہی ہیں لیکن جالندھر کے اندر تاریکی کا غلبہ ہے۔''
آپ کی یہ بات چیت جب جالندھر والوں کے کانوں میں پہنچتی تو بہت جز بز ہوتے۔
ایک دن جالندھر کے مشہور بزرگ مولوی شمس الدین نے حافظ محمود کی خدمت میں حاضری دی اور ان سے شکایتاً عرض کیا۔
''قبلہ حاجی صاحب! میں آپ سے چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ امید ہے کہ اگر دورانِ گفتگو میری باتیں ناگوار گزریں تو انہیں درگزر کردیں گے۔''
حافظ محمود نے بڑی فقیرانہ شان سے جواب دیا۔ ''مولوی شمس الدین! میں یہاں اللہ کے حکم سے بیٹھا ہوا ہوں۔ اس لیے تم مجھ سے جو باتیں بھی کرنا، اس میں رعونت اور شان نہیں ہونا چاہیے۔ اللہ کو عجز و انکسار پسند ہے، تو بھی اللہ کی پسند کا خیال رکھے گا۔''
مولوی شمس الدین کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔ بڑے تحمل سے کام لیا، کہا۔ ''حافظ محمود! آپ نے جو بات کہی ہے قابلِ غور ہے لیکن آپ کو یہ حق کس نے دے دیا کہ باہر والوں کے سامنے ہماری بے عزتی کرتے رہیں۔ کم از کم میں اس صورتِ حال کو مزید برداشت نہیں کرسکتا۔''
حافظ محمود نے جواب دیا۔ ''مولوی شمس الدین! آپ سے باہر ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں نے جالندھر والوں کی کبھی بے عزتی نہیں کی۔ یقیناً تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔''
مولوی شمس الدین نے کہا۔ ''کیا آپ نے یہ بات نہیں کہی کہ جالندھر کے باہر والوں کی قسمت میں روشنیاں ہیں مگر اہلِ جالندھر اس سے محروم ہیں اور ان کی قسمت میں تاریکیاں لکھ دی گئی ہیں۔''
آپ نے فرمایا۔ ''کیا میری بات جھوٹ پر مبنی ہے؟ شاید نہیں۔''
مولوی شمس الدین نے کہا۔ ''حضرت پیر و مرشد! آپ احتیاط سے کام لیں اور کوئی ایسی بات نہ کریں جس سے جالندھر کے لوگ اپنی اہانت محسوس کریں۔''
چند دنوں بعد مولوی شمس الدین نے ایک بار پھر حافظ محمود کی خدمت میں حاضری دی اور ان کے سامنے وہ ساری داستان رکھ دی جس سے ان کو بھی تکلیف پہنچ گئی تھی، کہا۔ ''پیر و مرشد! لوگ ایک بار پھر آپ کے خلاف باتیں بناتے پھر رہے ہیں۔ خدا کے لیے احتیاط اور خاموشی کو کام میں لایئے۔''
آپ نے جواب دیا۔ ''میں کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔ تو وہ باتیں میرے علم میں لا جن سے تجھے یہ شکایت پیدا ہوگئی۔''
مولوی شمس الدین نے کہا۔ ''بستی میں سید زادے اور مولوی زادے بھی موجود ہیں مگر میں نے آج تک ان کی دل آزادی نہیں کی۔ میں بذاتِ خود ہمیشہ اس کوشش میں رہتا ہوں کہ کسی کا دل نہ دکھاؤں۔ آپ اس سے باز نہیں آتے، آج میں اس کا کوئی نہ کوئی علاج کرکے رہوں گا۔''
آپ نے فرمایا۔ ''تو میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ میں تیرے دعوے پر لبیک کہتا ہوں اور تجھ کو قسم دلاتا ہوں کہ تو میرے خلاف جو بھی کرنا چاہے کر ڈال، ورنہ یہ موقع نکل جائے گا اور تو پچھتائے گا۔''
مولوی شمس الدین نے کہا۔ ''تو گویا آپ مجھے اجازت دے رہے ہیں کہ میں آپ کو آپ کے کیے کی سزا دوں؟''
آپ نے جواب دیا۔ ''ہاں، میں تجھے اجازت دے رہا ہوں کہ تو مجھے میرے ناکردہ گناہوں کی سزا دے۔''
مولوی شمس الدین نے کہا۔ ''تب پھر میرا فیصلہ سن لیجیے۔ آج سے آپ کا حقہ پانی بند، جالندھر کے لوگ آپ کے ساتھ نہ کھائیں پئیں گے، نہ آپ سے معاشرتی واسطہ رکھیں گے۔ آج میں اس فیصلے کا اعلان کرائے دیتا ہوں۔ جالندھر کے پیرزادے، مولویوں کے خاندان والے، جولاہے اور دوسرے لوگ آپ سے کسی بھی قسم کا واسطہ یا رابطہ نہیں رکھیں گے۔''
آپ نے مولوی شمس الدین کے اس اعلان کو صبر و تحمل سے سن کر فرمایا۔ ''تو گویا تو نے میرا حقہ پانی بند کرادیا۔ حقہ تو میں خود ہی نہیں پیتا، رہا پانی..... تو پانی انسانوں کے بس میں نہیں ہے۔ یہ خدا کی طرف سے ہے۔ اس لیے تو میرا پانی کس طرح بند کرسکتا ہے؟''
مولوی شمس الدین نے کہا۔ ''بہرحال میں نے اپنی طرف سے تو آپ کا معاشرتی مقاطعہ کردیا۔''
آپ نے سکوت اختیار کیا۔ بستی میں مولوی شمس الدین کے فیصلے کا شہرہ ہوگیا اور آپ کے مخالفین اور حاسدین نے مولوی شمس الدین کے فیصلے پر عمل درآمد شروع کردیا۔

ان دنوں خاص جالندھر میں سکھوں کی ایک پلٹن مقیم تھی۔ اس کا کمان دار سید امیر شاہ نامی ایک شخص تھا اور اس پلٹن میں قادر بخش جہاں خیلی نامی ایک دلیر شخص بھی شامل تھا۔ کمان دار سید امیر شاہ اور قادر بخش جہاں خیلی آپ کے مرید اور جاں نثار تھے۔ انہیں جو شمس الدین کے فیصلے کا علم ہوا تو بھاگے بھاگے آپ کی خدمت میں پہنچے اور ادب سے دریافت کیا۔ ”حضرت! جالندھر والوں میں مولوی شمس الدین کے کسی تکلیف دہ فیصلے کا بڑا شہرہ ہے۔ کیا آپ اس کی تصدیق فرمائیں گے؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”جیسا کہ میں مولوی شمس الدین سے بھی کہہ چکا ہوں کہ حقہ میں خود ہی نہیں پیتا۔ رہی پانی کی بات تو میں پھر کہوں گا کہ پانی خدا کی طرف سے ہے۔ کسی انسان کے بس میں یہ نہیں ہے کہ وہ اس کو بند کر دے۔ کیا شمس الدین کے معاشرتی مقاطعے کے بعد میں پانی سے محروم ہو گیا ہوں؟ نہیں، ہرگز نہیں۔“

کمان دار نے عرض کیا۔ ”پھر میں بھی آپ سے اجازت لینے آیا ہوں۔ میں مولوی شمس الدین اور اس کے ہم نواؤں کو سزا دینا چاہتا ہوں۔ میں اپنی پلٹن سے ان کو تہ و بالا کرا سکتا ہوں، انہیں تباہ و برباد کر سکتا ہوں۔ میرے سپاہی میرے ذرا سے اشارے پر آپ کے دشمنوں کو خاک میں ملا سکتے ہیں۔“

اسی وقت باہر سے شور و غل کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ لوگوں کا ہجوم چیخ رہا تھا۔ ”ہمیں شیخ کا دیدار چاہیے، خدا کے لیے ذرا سی دیر کے لیے باہر تشریف لے آئیں۔“

آپ نے اپنے مریدوں سے کہا۔ ”ذرا باہر جا کر دیکھنا تو، یہ کون لوگ ہیں اور مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟“

پلٹن کا کمان دار باہر گیا اور کچھ دیر بعد مسکراتا ہوا اندر داخل ہوا، بولا۔ ”حضرت! یہ وہ لوگ ہیں جو جالندھر کے اندر ہی آباد ہیں اور نسلاً پٹھان ہیں۔ یہ سارے ہی آپ کے معتقد اور پرستار ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم بارہ ہزار ہیں اور جالندھر کی تباہی اور بربادی کی اجازت چاہتے ہیں۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”کیا میں اس کی اجازت دے سکتا ہوں؟“

کمان دار نے کہا۔ ”میں نہیں جانتا کہ آپ اس کی اجازت دے سکتے ہیں یا نہیں، مگر یہ ضرور کہوں گا کہ آپ اس کی اجازت ضرور دے دیجیے۔“

آپ نے فرمایا۔ ”کمان دار سید امیر شاہ! تم باہر جاؤ اور پٹھانوں کے کسی بڑے آدمی کو میرے پاس لے آؤ۔“

سید امیر شاہ نے حکم کی تعمیل کی اور ذرا سی دیر میں پٹھانوں کے تین آدمیوں کے ساتھ دوبارہ اندر داخل ہوا۔ انہوں نے اندر داخل ہوتے ہی نہایت ادب سے سلام کیا اور گزارش کی۔ ”حضورِ والا! سننے میں آیا ہے کہ بستی کے لوگ آپ کے خلاف ظلم اور زیادتی پر کمربستہ ہو گئے ہیں۔ آپ ہمیں حکم دیجیے، ہم اس بستی کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”میں ایسا کوئی حکم نہیں دے سکتا، جس سے خدا کی مخلوق پریشان ہو۔ آج وہ گمراہ ہیں کل وہ راہِ راست پر آ سکتے ہیں۔ پھر میں انہیں کیوں کسی مصیبت میں ڈالوں۔“

پٹھانوں نے کہا۔ ”یا حضرت! آپ بلاوجہ نرمی سے کام لے رہے ہیں جبکہ دوسری طرف لوگ تشدد اور شرارتوں پر آمادہ نظر آتے ہیں۔“

انہوں نے جواب دیا۔ ”یہ اپنے اپنے ظرف اور حوصلے کی بات ہے۔“

پٹھانوں نے کہا۔ ”اگر آپ لڑنے کی اجازت نہیں دے رہے تو یہ اجازت ضرور دیجیے کہ ہم اپنے کچھ آدمیوں کے ساتھ آپ کے قریب ہی سو جائیں تاکہ اگر بستی کے لوگ کوئی بڑی شرارت کریں تو اس کا اسی وقت جواب دے دیا جائے۔“

سید امیر شاہ نے عرض کیا۔ ”میں آپ کے پاس اپنے چند سپاہی تعینات کیے دیتا ہوں۔ وہ آپ کی حفاظت کریں گے اور آپ کے حاسدوں اور دشمنوں کو آپ کے پاس نہیں آنے دیں گے۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”ہاں، ایسا تم لوگ کر سکتے ہو۔“

یہ ساری باتیں جالندھر کے صوبے دار کریم بخش تک پہنچ گئیں۔ وہ بھی آپ کا بڑا پرستار اور مداح تھا۔ بھاگا بھاگا آپ کے پاس پہنچا اور ادب سے عرض کیا۔ ”حضرت! کیا یہ درست ہے کہ آپ کے پرستار اور عقیدت مند جالندھر والوں پر لشکرکشی کرنے والے ہیں؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔ کیا تو اس بات پر یقین کر سکتا ہے کہ میں امن و آشتی کے بجائے خون خرابے کا حکم دوں گا؟ میں انسانوں کا خون بہا سکتا ہوں؟“

کریم بخش نے عرض کیا۔ ''میں نے اس پر یقین تو نہیں کیا۔ پھر بھی آپ کی خدمت میں حاضر ہو گیا ہوں کہ میرے لیے کوئی حکم فرمائیں۔ میں آپ کا تابعدار بلکہ جاں نثار ہوں۔''
آپ نے جواب دیا۔ ''میری تابعداری اور جاں نثاری کا مظاہرہ اس طرح کرو کہ میری طرف سے بستی والوں کو یہ یقین دلا دو کہ میں ان کے خلاف کسی قسم کی بھی کارروائی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ وہ مطمئن رہیں۔''
کریم بخش نے آپ کے اس حکم کی فوراً ہی تعمیل کر دی۔ مولوی شمس الدین کے آدمیوں نے آپ کے آس پاس جمع ہو کر شور و غل کرنا شروع کر دیا۔ وہ چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے۔ ''او پٹھانوں کے پیر! تو یہاں سے چلا جا ورنہ ہم تیرے خلاف معاشرتی مقاطعہ کے علاوہ بھی بہت کچھ کر گزریں گے۔''
سید امیر شاہ اور آپ کی صحبت میں موجود چند پٹھانوں نے باہر نکل کر مولوی شمس الدین کے آدمیوں سے پوچھا۔ ''آخر تم لوگ کیا چاہتے ہو؟''
ان لوگوں نے جواب دیا۔ ''ہم چاہتے ہیں کہ یہ پیر یہاں سے چلا جائے۔''
سید امیر شاہ نے پوچھا۔ ''لیکن یہ یہاں سے کیوں چلے جائیں؟''
مخالفین نے جواب دیا۔ ''اس لیے چلے جائیں کہ ایسا ہم سب چاہتے ہیں۔''
سید امیر شاہ نے پوچھا۔ ''اگر تمہاری یہ خواہش پوری نہ ہوئی تو تم کیا کرو گے؟''
مخالفین نے جواب دیا۔ ''پھر ہم اس نام نہاد پیر پر زندگی وبال کر دیں گے، جینا حرام کر دیں گے۔''
سید امیر شاہ کو غصہ آ گیا۔ پوچھا۔ ''کیا تم لوگ مجھ سے واقف ہو؟''
ایک نے جواب دیا۔ ''ہاں، خوب واقف ہیں۔ تو بھی اس نام نہاد پیر کا کوئی خوشامدی ہو گا۔''
سید امیر شاہ نے کہا۔ ''میں پیر و مرشد حافظ محمود کا خوشامدی نہیں پرستار ہوں اور یہاں کی سکھ رجمنٹ کا کمان دار ہوں، میں تمہاری بستی کو تہ و بالا کر سکتا ہوں۔''
اب تو بستی والوں کے کان کھڑے ہو گئے اور ان کی بولتی بند ہو گئی۔ انہوں نے صلاح و مشورہ کیا تو اس نتیجے پر پہنچے کہ فی الحال کھل کر اس پیر سے الجھنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ وہ لوگ واپس چلے گئے اور مولوی شمس الدین کے ایما پر ستانے کے دوسرے طریقے سوچنے لگے۔ جالندھر کے حاکم کریم بخش نے آپ کی حفاظت کے لیے دس سپاہی بھیج دیے۔
رات کو عشا کے بعد حافظ محمود درود و وظائف میں مشغول ہو جاتے۔ رات کے سناٹے میں آپ کو بڑا سکون اور اطمینان رہتا۔ جالندھر کے چند فسادیوں نے آپ کے حجرے کے پاس لڑنا جھگڑنا شروع کر دیا۔ پہلے تو وہ آپس میں بحث و مباحثہ کرتے رہے پھر تکرار اور تو تو، میں میں تک نوبت پہنچی۔ اس کے بعد گالی گلوچ اور ہاتھا پائی شروع ہو گئی۔ اس ہنگامے نے آپ کے سکون کو برباد کر دیا۔ آپ نے اپنے ایک مرید سے کہا۔ ''ارے بھائی! یہ کیا کر رہے ہیں، ان سے کہہ دو کہ فقیر کی کٹیا کا سکون برباد ہو رہا ہے۔ کیا یہ معاملات گھروں میں طے نہیں کر سکتے۔''
مرید نے باہر نکل کر انہیں سمجھانے کی کوشش کی تو وہ مرید پر گرم ہو گئے۔ ایک نے کہا۔ ''جا اپنے پیر سے کہہ دے کہ یہ اس کے باپ کی جگہ نہیں ہے۔ ہم تو اسی طرح لڑیں گے، جھگڑیں گے۔ اگر اس میں ہمت ہو تو ہمیں اس سے روک دے۔''
مرید نے ایک بار پھر سمجھایا۔ ''بابا درویش سے مت الجھو کیونکہ یہ الجھنا سخت نقصان کا باعث بن جائے گا۔''
جواب ملا۔ ''ہم درویش سے کب الجھ رہے ہیں بلکہ تو ہم سے بلاوجہ الجھ رہا ہے۔''
اتنے میں جالندھر کے حاکم کریم بخش کے متعینہ سپاہی بھی وہاں پہنچ گئے اور پوچھا۔ ''کیا بات ہے؟ یہ تم لوگ کس بات پر لڑ جھگڑ رہے ہو؟''
لڑنے والوں میں سے ایک نے جواب دیا۔ ''اب یہ تم لوگ بھی آ گئے بات بڑھانے؟''
ایک سپاہی نے کہا۔ ''بکواس کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں تم سے پوچھتا ہوں کہ درویش کے دروازے پر تم کیوں لڑ جھگڑ رہے ہو؟''
جواب دیا۔ ''یہ کسی کی خریدی ہوئی زمین نہیں ہے۔ ہم لڑ رہے ہیں تو تمہیں کیا۔ اپنا راستہ لو اور ہمارا دماغ خراب نہ کرو ورنہ بات بڑھ جائے گی۔''
سپاہی نے آگے بڑھ کر اس شخص کا گریبان پکڑ لیا اور اپنے ساتھیوں کو آواز دے کر بلا لیا۔ بولا۔ ''کھڑے دیکھتے کیا ہو۔ لگاؤ

ان کے جوتے۔"

سپاہیوں نے لڑنے جھگڑنے والوں کو پکڑ لیا اور ان کی مرمت شروع کر دی۔ ان کے لباس تار تار ہو گئے اور چہرے لہولہان ہو گئے۔ سپاہیوں نے انہیں بالوں سے پکڑ لیا اور گرا گرا کر مار لگائی۔ وہ چیخ چیخ کر رونے لگے۔ ان کی چیخ پکار سن کر حافظ محمود باہر نکلے اور پوچھا۔ "بھائی، یہ کیا ہو رہا ہے؟"

ایک سپاہی نے جواب دیا۔ "پیرو مرشد! ان لوگوں نے آپ کے سکون کو تباہ و برباد کرنے کے لیے آپس میں دنگا فساد شروع کر دیا تھا۔ اب ہم ان کے شر کو شر سے مارنے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

آپ نے انہیں روک دیا۔ "انہیں نہ مارو، میں ان کے لیے خیر کی دعا کرتا ہوں۔"

سپاہیوں کے ہاتھ رک گئے۔ ایک سپاہی نے کہا۔ "بابا، آپ ان کی سفارش نہ کریں۔ یہ شری لوگ ہیں، آپ کی نرمی اور خلوص کا ان پر کوئی اثر نہ ہوگا۔"

آپ نے فرمایا۔ "پھر بھی انہیں معاف کر دو۔ میں انہیں پٹتا ہوا نہیں دیکھ سکتا۔"

سپاہیوں کے ہاتھ رک گئے اور ایک نے ان سے کہا۔ "پیرو مرشد کے طفیل تم چھوڑے جا رہے ہو۔ بھاگ جاؤ، خبردار جو کبھی ادھر کا رخ کیا۔"

وہ لوگ فوراً ہی بھاگ گئے۔ آپ نے سپاہیوں کو نصیحت کی۔ "اللہ کے بندوں کو حلم و مروت سے راہِ راست پر لانے کی کوشش کرنا، سختی ان میں ضد پیدا کر دے گی۔"

ایک سپاہی نے کہا۔ "بابا! آپ کی باتیں ہماری سمجھ میں تو آتی نہیں۔ آپ نے انہی کو معاف کر دیا جو آپ کو ستانے کے نت نئے منصوبے بناتے رہتے ہیں۔"

اس تشدد آمیز واقعے نے جالندھر والوں کو خوف زدہ کر دیا اور ان کی ضد میں کچھ اور اضافہ ہو گیا۔ ان کا ایک وفد آپ کی خدمت میں پہنچا اور درخواست کی کہ ہم آپ سے باتیں کرنا چاہتے ہیں۔

آپ نے پوچھا۔ "کس قسم کی باتیں، کس موضوع پر؟"

وفد کے سربراہ نے کہا۔ "بابا! بات یہ ہے کہ بستی کے لوگ آپ سے خوش نہیں ہیں۔ اس لیے شری باتیں کرتے رہتے ہیں۔ اب جو آپ کے آدمیوں نے انہیں مارا پیٹا تو ان کی نفرتوں میں کچھ اور اضافہ ہو گیا۔ پہلے تو یہاں کے لوگ چھیڑ چھاڑ ہی پر اکتفا کر لیتے تھے لیکن تشدد آمیز حرکت نے انہیں جدال و قتال تک پر آمادہ کر دیا ہے۔ ہم معزز لوگ اپنے طور پر یہ چاہتے ہیں کہ یہ تنازعہ اب ختم ہو جانا چاہیے۔"

آپ نے فرمایا۔ "کیسا تنازعہ؟ ہمارا تو کسی سے کوئی تنازعہ نہیں۔"

وفد کے بڑے نے کہا۔ "آپ کے ذہن میں کوئی تنازعہ ہو یا نہ ہو لیکن شہریوں کے ذہن میں اس قسم کی باتیں ضرور ہیں۔"

آپ نے جواب دیا۔ "یہ یک طرفہ تنازعہ بھی عجیب سی بات ہے۔ اچھا، اب یہ بتاؤ کہ تم لوگ کیا چاہتے ہو؟"

وفد کے نمائندے نے کہا۔ "بستی کے لوگ چاہتے ہیں کہ آپ اس جگہ کو چھوڑ کر کہیں اور چلے جائیں۔"

آپ نے جواب دیا۔ "اگر تم لوگ اسی میں خوش ہو کہ میں یہاں سے چلا جاؤں تو میں تمہاری یہ بات بھی مان لوں گا لیکن اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ اس کے بعد تمہارے دلوں کی کدورت دور ہو جائے گی اور تم لوگ مجھے نہیں ستاؤ گے۔"

وفد کے نمائندے نے کہا۔ "یہ ہمارا وعدہ ہے کہ آئندہ کوئی ایسی بات نہیں ہوگی جس سے آپ کو دکھ پہنچے۔"

متعینہ سپاہیوں میں سے ایک نے مداخلت کی۔ بولا۔ "حضرت! یہ آپ کن کی باتوں پر اعتبار کر رہے ہیں؟ یہ دھوکے باز منافق لوگ اپنی فطرت کس طرح بدل دیں گے؟"

آپ نے جواب دیا۔ "میں کسی ایسے مسئلے پر خدا سے شرمندہ نہیں ہونا چاہتا جو شر اور فساد سے تعلق رکھتا ہو اور اس کا ایک فریق میں بھی ہوں۔"

ایک سپاہی نے فرطِ جذبات میں وفد سے کہا۔ "بے شرمو! ڈوب مرو چلو بھر پانی میں۔ اگر تم نے نادانی اور جہالت میں اس بزرگ ہستی کو کھو دیا تو گویا تم سب کچھ کھو دو گے۔"

آپ نے فرمایا۔ "لوگو! میں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ تمہاری اس جگہ کو چھوڑ دوں۔ اب میں شہر کا دوسرا کنارہ آباد کروں گا۔"

وفد کے بڑے نے کہا۔ "اگر آپ نے ایسا کر دیا تو گویا ہمارا آپ کا کوئی جھگڑا ہی نہ رہے گا۔"

سپاہیوں نے پوچھا۔ ''اگر آپ نے ان فسادیوں کے کہنے سے یہ جگہ چھوڑ دی تو کہاں جائیں گے؟''
آپ نے جواب دیا۔ ''شہر کے باہر اس جگہ جو آبادی سے دور ہے اور جہاں ان شہریوں سے تعلق منقطع ہو جائے گا۔''
آپ نے جو کہا تھا، اس پر عمل کیا اور وہ جگہ چھوڑ دی اور شہر کے باہر ویرانے میں سکونت اختیار کر لی۔ وہاں آپ کے مریدوں نے ایک حجرہ تعمیر کر دیا۔ آپ اس میں رہنے لگے۔ قریب ہی پانی کے لیے ایک کنواں کھود دیا گیا۔ آپ نے اس جگہ بڑے سکون اور اطمینان سے ریاضت اور عبادت شروع کر دی۔
لیکن چند ہی دنوں بعد آپ کے مریدوں نے دیکھا کہ شہر والے یہاں بھی آ جا رہے ہیں۔ انہیں تعجب ہوا اور ان سے پوچھا۔ ''بھائیو! خیریت تو ہے، یہاں آنے جانے کا کوئی خاص مقصد؟''
ان میں سے ایک نے بگڑ کر جواب دیا۔ ''کیوں؟ کیا یہاں آنے جانے پر پابندی لگا دی گئی ہے یا ہمارے یہاں آنے سے آپ لوگوں کو کسی قسم کی تکلیف ہوتی ہے؟''
مرید نے کہا۔ ''ہمیں کیا تکلیف ہوگی؟ آپ لوگ شوق سے آئیں جائیں لیکن خدا کے لیے اب کوئی شرارت نہ کرنا ورنہ بڑی بدمزگی ہوگی۔''
جواب ملا۔ ''شرارت کون کرے گا، ہمیں کیا پڑی ہے جو شرارت کریں۔ یہ بات تو تمہی لوگوں کو خوب آتی ہے کہ آ بیل مجھے مار۔''
لیکن مریدوں کو ان شہریوں پر شبہ ہو گیا تھا کہ یہ شرارتیں ضرور کریں گے۔ کئی دنوں بعد صبح فجر کی نماز سے بھی پہلے چند مریدوں نے کسی شخص کو کنوئیں میں جھانکتے ہوئے دیکھا۔ ان لوگوں نے اس کو پکڑ لیا اور گدی سے کھینچ کر سبزے پر گرا دیا۔ ایک شخص نے اس کا گریبان پکڑ کر کئی زوردار جھٹکے دیے اور پوچھا۔ ''تو یہاں کنوئیں میں کیا دیکھ رہا تھا؟''
وہ بہت گھبرایا ہوا تھا، بوکھلائے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''کچھ نہیں، میں کنوئیں کا پانی دیکھ رہا تھا۔''
ایک سپاہی نے کہا۔ ''تو جھوٹ بول رہا ہے۔ سچ سچ بتا دے ورنہ میں اس کنوئیں میں تجھ کو الٹا لٹکا دوں گا۔''
اس نے ایک بار پھر وہی بات کہی۔ ''میں کنوئیں میں پانی دیکھ رہا تھا۔ مجھ پر سختی نہ کرو۔ میں بے گناہ ہوں، میں نے کچھ بھی تو نہیں کیا۔''
ایک سپاہی نے اس کو زمین پر گرا دیا اور دوسرے کو آواز دی۔ ''رسی لے آ، یہ اس طرح نہیں بتائے گا۔ میں اس کو ابھی لٹکائے دیتا ہوں کنوئیں میں۔''
وہ شخص رونے لگا۔ ''میں نے یہ کام اپنی مرضی سے نہیں کیا۔ مجھ کو زبردستی مجبور کر دیا گیا۔ میں خدا کو حاضر ناظر جان کر یہ بتا دیتا ہوں کہ میں نے جو کچھ کیا، زبردستی اور ظلم سے مجبور ہو کر کیا۔ خدا کے لیے مجھے معاف کر دو۔ آئندہ ایسی حرکت نہیں ہوگی۔''
ایک سپاہی نے اس کے منہ پر تھپڑ رسید کر دیا۔ بولا۔ ''کچھ بتاتا ہے یا نہیں۔ بلاوجہ باتیں کیے چلا جا رہا ہے۔ یہ تو بتا کہ تو نے کون سا غلط کام کیا ہے جس پر شرمندہ ہو کر معافیاں مانگ رہا ہے۔''
اس شخص نے کہا۔ ''میری گدی اور گریبان تو چھوڑ، ابھی بتاتا ہوں۔''
سپاہیوں نے اس کی گدی بھی چھوڑ دی اور گریبان بھی، کہا۔ ''اچھا اب بتا، بات کیا ہے؟''
اس نے جواب دیا۔ ''جیسا کہ میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ میں بے گناہ ہوں، میں نے یہ کام اپنی مرضی اور خوشی سے نہیں کیا۔ آپ کے پیر و مرشد سے بستی کے لوگ جلتے ہیں۔ جب یہ ادھر چلے آئے اور بستی والوں کو انہیں ستانے کا موقع نہیں ملا تو انہوں نے اس کام کے لیے میرے جیسے کئی آدمیوں کو تمہارے پیر کو ستانے پر مامور کر دیا۔ انہوں نے مجھے حکم دیا کہ پیر کے کنوئیں میں بستی والوں کے پھٹے پرانے جوتوں کو ڈال دو تاکہ جب وہ اس کا پانی پئیں تو ان کا ایمان خراب ہو۔''
سپاہیوں اور مریدوں نے اس کی تصدیق کے لیے کنوئیں میں ایک آدمی اتار دیا۔ اس نے اندر سے پرانے جوتوں کو نکالا تو وہ پانی میں بھیگ جانے کی وجہ سے نرم ہو رہے تھے۔ اس کے بعد انہوں نے اس آدمی کی بڑی مرمت کی اور اس کو دھمکی دی۔ ''جا، اپنی بستی کے لوگوں کو بتا دے کہ اگر آئندہ ایسی حرکت ہوئی اور کوئی پکڑا گیا تو اس کو ذبح کر کے ڈال دیا جائے گا۔''
لوگوں نے کنوئیں کا پانی نکال کر صاف کیا۔ پیر حافظ محمود کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو گڑگڑا گڑگڑا کر اپنے رب سے دعا کی۔ ''انہیں راہ راست پر لے آ اور ان کے دلوں سے حسد اور کدورت دور کر دے۔''
اسی رات انہوں نے خواب میں دیکھا کہ وہ اپنے بھائی حامد کے ساتھ مدینہ منورہ میں روضۂ اقدس کے پاس کھڑے ہیں۔ روضے کا پردہ ان کے سامنے ہے۔ انہوں نے اس پردے کو اٹھا کر اپنے سر پر ڈال لیا تو رسول مقبول ﷺ کی زیارت نصیب

ہوئی۔ ان کا دل بھر آیا اور رو رو کر عرض کیا۔ ''یا رسول اللہ ﷺ! میں جالندھر والوں کے ہاتھوں بہت پریشان ہوں۔ یہ مجھے بہت ستاتے ہیں۔ میں ایک غریب الوطن محض اشاعتِ دین کی خاطر جالندھر میں رہتا ہوں مگر یہاں کے لوگ ہر وقت درپے آزار رہتے ہیں۔''

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ ''محمود! خوف نہ کر تو اپنا کام کرتا رہ، خدا بہتری کرے گا۔''

ان کی آنکھ کھل گئی۔ اب وہ ہشاش بشاش تھے اور ان کے دل سے افسوس، ملال اور شکوہ وشکایت دور ہو چکے تھے۔

جالندھر کا ایک ہندو اہلکار کسی وجہ سے اپنی ملازمت سے نکال باہر کیا گیا۔ اس نے اپنی بحالی کے لیے بڑی کوششیں کیں اور سفارشوں سے کام نکالنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ آخر اس کے جی میں آئی کہ چلو پیر حاجی محمود سے دعا کرائی جائے۔ ممکن ہے کہ خدا ان کے طفیل ہی میرا کام بنا دے۔

وہ آپ کی خدمت میں پہنچا اور رو رو کر اپنا قصہ بیان کیا۔ آپ نے فرمایا۔ ''تیری بستی کے لوگ میری جان کے درپے ہیں۔ اب انہوں نے تیری ملازمت بھی چھین لی۔''

ہندو اہلکار نے عرض کیا۔ ''حضرت! بس آپ دعا فرما دیں۔''

آپ نے آنکھیں بند کرلیں اور مراقبے میں چلے گئے۔ کچھ دیر بعد ہندو سے کہا۔ ''لکھ، جو میں بولتا ہوں۔ اس کو لکھ لے اور اس کو ایک سو ایک بار دہرا۔ اللہ نے چاہا تو تیرا کام ہو جائے گا۔''

اس نے کاغذ اور قلم دوات سنبھالا اور کہا۔ ''ارشاد میں لکھتا ہوں۔''

آپ نے اردو میں فرمایا۔ ''اے اللہ! تیرے سوا میرا کوئی مقصود نہیں ہے۔ میرا مقصود تو ہے، مجھ کو تیری ہی رضا مطلوب ہے۔''

ہندو اہلکار خوش خوش گھر گیا اور اسی رات حاجی محمود کی دعا کو ایک سو ایک بار پڑھا اور سو گیا۔ صبح وہ سو کر اٹھا بھی نہ تھا کہ جالندھر کے حاکم کا ایک آدمی اس ہندو کو بلانے آ گیا۔ بولا۔ ''صاحب نے آپ کو یاد کیا ہے۔ آپ فوراً ہی مل لیجیے چل کر۔''

ہندو خوش خوش حاکم کے پاس پہنچا تو اس نے مسکراتے ہوئے اس کا استقبال کیا۔ پوچھا۔ ''ارے بھائی تو کہاں چلا گیا تھا۔ میں کل سے تیری تلاش میں ہوں؟''

ہندو نے جواب دیا۔ ''جناب! میں کہیں بھی نہیں گیا۔ یہیں موجود تھا۔ میرے لائق کوئی خدمت؟''

حاکم نے کہا۔ ''خدمت ودمت تو کیا۔ میں نے تجھے تیری جگہ بحال کر دیا کیونکہ میں نے محسوس کیا کہ تیرے ساتھ بڑی زیادتی ہوئی ہے اور انشاء اللہ اب میں کوشش کروں گا کہ اس کی تلافی ہو جائے۔''

اہلکار خوش ہوا اور اپنی جگہ کام کرنے لگا۔ دوسرے دن حاجی محمود کی خدمت میں پہنچا اور بصد ادب عرض کیا۔ ''حضرت پیر جی! آپ کی توجہ اور عنایت کا شکریہ۔ میرا کام بن گیا۔''

آپ نے فرمایا۔ ''کام بن تو گیا ہے لیکن ذرا کچا بنا ہے۔ بگڑ بھی سکتا ہے۔''

اہلکار نے پوچھا۔ ''بگڑ کس طرح سکتا ہے بھلا؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''ہر انسان کے ساتھ ایک شیطان بھی رہتا ہے۔ اگر تو اس شیطان سے محفوظ رہا تو، تو اپنے مقصد میں تادیر قائم رہے گا۔''

اہلکار کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی، پوچھا۔ ''پیر و مرشد! آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟''

انہوں نے جواب دیا۔ ''میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ لوگ شرارتیں کر کے تیرا کام بگاڑ بھی سکتے ہیں۔''

اہلکار نے عرض کیا۔ ''حضرت! اگر آپ کی دعا شاملِ حال رہی تو میرا کوئی بھی کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔''

آپ نے فرمایا۔ ''خدا ایسا ہی کرے۔''

اہل کار اپنے گھر واپس چلا گیا اور حاجی محمود نے گویا اپنے آپ سے کہا۔ ''انسان اپنا دشمن آپ ہی ہوتا ہے اور اس کو جو نقصان بھی پہنچتا ہے، اپنی ہی ذات سے پہنچتا ہے۔''

جالندھر کے مولوی شمس الدین جو آپ کے بدترین مخالف تھے، ہندو اہلکار کا قصہ سن کر اس کے پاس پہنچے اور پوچھا۔ ''کیوں رے! کیا تو اس نقلی پیر کے پاس گیا تھا؟''

ہندو اہلکار نے جواب دیا۔ ''ہاں گیا تو تھا۔ اس سوال سے آپ کا مطلب؟''

مولوی شمس الدین نے پوچھا۔ ''کیوں گیا تھا...... کوئی خاص کام تھا؟''

اہلکار نے پوری بات بتادی اور کام بن جانے پر حاجی محمود کا شکریہ ادا کیا۔
مولوی شمس الدین نے سب کچھ سن کر ایک قہقہہ لگایا۔ کہا۔ ''تو بھی کتنا سادہ لوح اور بھولا ہے۔ ارے اس کام کے لیے ان کے پاس جانے کی کیا ضرورت تھی۔ اگر تو میرے پاس چلا آتا تو یہ کام میں خود کرا دیتا۔''
اہلکار نے جواب دیا۔ ''جناب! یہ کام اتنا آسان نہ تھا جتنا کہ آپ سمجھ رہے ہیں۔''
مولوی شمس الدین نے کہا۔ ''اچھا اٹھ اور میرے ساتھ چل۔''
ہندو اہلکار نے پوچھا۔ ''کہاں؟ میں آپ کے ساتھ کہاں چلوں؟''
مولوی نے جواب دیا۔ ''اپنے حاکم کے پاس۔ دیکھ میں تیرے منصب میں کس طرح اضافہ کرتا ہوں۔''
ہندو اہلکار کو لالچ نے ستایا، پوچھا۔ ''کیا میں ترقی پا سکتا ہوں؟''
مولوی نے جواب دیا۔ ''کیوں نہیں، میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اس کا نتیجہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گا تو۔''
ہندو اہلکار مولوی شمس الدین کے ساتھ حاکم کے پاس چلا گیا۔
مولوی نے حاکم سے کہا۔ ''جناب والا! یہ ہندو اس شہر کا لائق اور سمجھ دار شخص ہے۔''
حاکم نے حیرت سے دونوں کو دیکھا اور پوچھا۔ ''پھر میں کیا کروں؟''
''یہ آپ کا ملازم بھی ہے۔'' مولوی نے کہا۔
حاکم نے کہا۔ ''ہاں پھر...... آپ کا مطلب؟''
مولوی نے اس کی برطرفی، حاجی محمود کی دعا اور اہلکار کی دوبارہ بحالی کا مختصراً ذکر کیا اور کہا۔ ''جناب! اب جو یہ آپ کی نوازش اور مہربانی سے بحال ہو گیا ہے تو وہ نقلی پیر، مریدوں پر رعب گانٹھ رہا ہے کہ آپ نے اسے اس کی دعاؤں سے دوبارہ رکھ لیا ہے۔''
حاکم نے پوچھا۔ ''آگے چلو، پھر؟''
مولوی نے کہا۔ ''جناب والا! میں چاہتا ہوں کہ آپ کچھ ایسا کر دیجیے کہ اس جھوٹے پیر کو اپنی ذات پر ناز کرنے کا موقع نہ رہے۔''
حاکم نے پوچھا۔ ''مثلاً مجھ کو اس سلسلے میں کیا کرنا چاہیے؟''
مولوی نے جواب دیا۔ ''مثلاً یہ کہ آپ اس کو ترقی دے دیجیے تاکہ میں، یہ اہلکار اور دوسرے لوگ یہ کہہ سکیں کہ اگر بحالی اس پیر کی دعا سے ہوئی تھی تو یہ ترقی حاکم کی خوشنودی اور مہربانی سے ہوئی۔''
حاکم نے کچھ دیر سوچ کر ہندو اہلکار سے پوچھا۔ ''تیری کیا رائے ہے، تو کیا چاہتا ہے؟''
ہندو اہلکار کو صاف نظر آرہا تھا کہ مولوی کام کر گیا اور اس کی ترقی ہونے ہی والی ہے۔ بولا۔ ''جناب! میں کیا کہوں گا۔ مولوی صاحب درست کہہ رہے ہیں اگر کچھ ایسا ہی ہو جائے کہ پیر کو فخر کا مزید موقع نہ ملے تو کیا ہی اچھا ہے۔''
حاکم ناراض ہو گیا۔ بولا۔ ''پھر اگر تم دونوں یہی چاہتے ہو کہ اس پیر کو مزید فخر کا موقع نہ ملے تو میں تجھ کو ترقی دینے کے بجائے برطرف کرتا ہوں۔ تم دونوں اسی وقت چلے جاؤ یہاں سے۔''
ہندو اہلکار کا چہرہ اتر گیا۔ مولوی نے کہا۔ ''جناب! یہ کیا بات ہوئی؟''
حاکم نے کہا۔ ''مولوی صاحب! آپ اسی وقت یہاں سے چلے جائیں۔''
ہندو اہلکار نے خوشامد سے کہا۔ ''صاحب! مجھ پر رحم کیجیے۔''
حاکم نے جواب دیا۔ ''کوئی رحم وحم نہیں۔ اب تو یہاں سے چلا جا۔''
مولوی نے ایک بار پھر زور دیا۔ ''صاحب! یہ تو بڑی زیادتی ہو رہی ہے۔ آپ اپنے فیصلے پر نظرثانی کیجیے۔ کس جرم میں اس کو سزا دی جارہی ہے۔''
حاکم نے جواب دیا۔ ''میں نے جو فیصلہ کر دیا، کر دیا۔ آپ دونوں اسی وقت یہاں سے چلے جائیں ورنہ میں زبردستی نکلوا دوں گا۔''
دونوں وہاں سے باہر نکلے۔ دونوں کے منہ لٹکے ہوئے تھے۔ ہندو اہلکار نے کہا۔ ''مولوی صاحب! آپ نے مجھ کو برباد کر دیا ہے۔''
مولوی نے غصے میں کہا۔ ''اس مردود کا دماغ خراب ہے۔ میں اس کو ایسی سزا دوں گا کہ یہ بھی کیا یاد کرے گا۔''
ہندو اہلکار نے عرض کیا۔ ''مولوی صاحب! وہ تو سب ٹھیک ہے لیکن اب میرا کیا بنے گا؟''
مولوی نے جواب دیا۔ ''تو ذرا صبر کر سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔''
اہلکار رونے لگا۔ ''صاحب! میں تو برباد ہو گیا آپ کی بات مان کر۔''

مولوی نے پھر تسلی دی۔ ''میں کہہ جو رہا ہوں کہ تو فکر نہ کر۔ میں اس حاکم کو ٹھیک کرادوں گا۔''
لیکن اہلکار کی تسلی نہ ہوئی۔ وہ مولوی کو چھوڑ کر حاجی محمود کے پاس پہنچا اور رو رو کر پوری روداد سنا دی اور ان سے مدد چاہی۔
آپ نے افسوس کیا اور فرمایا۔ ''بھائی میرے! سارا کرشمہ یقین اور محبت کا ہے لیکن تو ان سے محروم ہے۔ اب میں مجبور ہوں کہ اس سلسلے میں میں تیری کوئی مدد نہیں کرسکتا۔''
ہندو اہلکار نے خوشامد کی۔ ''پیر جی! میری مدد کیجیے۔ اب میں آپ کے علاوہ کسی کی بھی بات نہیں مانوں گا۔''
انہوں نے جواب دیا۔ ''تو شک اور طمع کا مریض ہے، پہلے اس مرض سے نجات حاصل کر۔ اس کے بعد میرے پاس آ۔''

☆☆☆

جالندھر کے ایک شخص نے آپ سے درخواست کی کہ آپ میری میزبانی قبول فرمائیں، میں آپ کو چند دنوں کے لیے مہمان رکھنا چاہتا ہوں۔
آپ نے فرمایا۔ ''میں تیری میزبانی قبول کرتا ہوں لیکن میرا نفس ہچکچا رہا ہے، معلوم نہیں کیوں۔ میرا دل کراہت سی محسوس کررہا ہے۔''
اس شخص نے خوشامد کی۔ ''حضرت! میرا دل ٹوٹ جائے گا۔ خدا کے لیے انکار نہ کیجیے۔''
آپ نے اس کی دعوت منظور کرلی۔ وہ آپ کو محبت اور شوق سے لے گیا۔ آپ نے کھانا اپنے گھر ہی میں کھالیا تھا اور صاحب خانہ سے فرمایا۔ ''میں رات کا کھانا یہاں نہیں کھاؤں گا۔ صبح کی صبح دیکھی جائے گی۔''
اس شخص نے کہا۔ ''بہتر ہے، میں کھانے میں اصرار نہیں کروں گا لیکن صبح کا کھانا تو آپ کو کھانا ہی پڑے گا۔''
آپ نے جواب دیا۔ ''کہہ تو دیا کہ صبح کی صبح دیکھی جائے گی۔''
میزبان نے آپ کے لیے پلنگ بچھا دیا اور اس پر خوشنما اور ستھرا بستر لگا دیا گیا۔ آپ عبادت سے فارغ ہوکر بستر پر لیٹ گئے۔ ایک دم انہیں احساس ہوا گویا وہ کسی گندے نالے میں گر گئے ہیں۔ وہ بے چینی سے اٹھ کر بیٹھ گئے اور تیز تیز سانسیں لے کر کچھ سونگھنے لگے۔
میزبان پاس ہی کھڑا یہ منظر دیکھ رہا تھا، پوچھا۔ ''کیا ہوا حضرت! خیریت تو ہے؟''
آپ نے جواب دیا۔ ''میں اس بستر میں غلاظت کی بو محسوس کررہا ہوں۔''
میزبان نے مسکرا کر عرض کیا۔ ''اتنا صاف ستھرا بستر، اس میں غلاظت کہاں سے آئی؟''
آپ نے جواب دیا۔ ''مجھے اس بستر میں آرام کے بجائے دکھ سا محسوس ہورہا ہے۔ آخر یہ کیسا بستر ہے؟''
میزبان نے مسکرا کر کہا۔ ''آپ کو وہم ہے پیر و مرشد...... یہاں دکھ یا بدبو کا کیا گزر؟''
آپ اسی وقت بستر سے اتر کر نیچے کھڑے ہوگئے۔ فرمایا۔ ''میں اس بستر پر نہیں سوسکتا۔ سونا تو بعد کی بات ہے، اس بستر نے میرا چین اور سکون ہی لوٹ لیا۔''
میزبان نے سمجھانے کی کوشش کی لیکن آپ کی سمجھ میں کوئی بات نہ آتی تھی۔ آپ نے ذرا سکوت اختیار کیا اور مراقبے میں چلے گئے۔ آخر ذرا دیر بعد مراقبے سے نکل کر فرمایا۔ ''میں تجھ سے ایک سوال کروں گا۔ مجھے امید ہے کہ تو میرے سوالات کا صحیح صحیح جواب دے گا۔''
میزبان نے عرض کیا۔ ''میرا وعدہ، میں آپ سے جھوٹ نہیں بولوں گا۔ آپ سوال کیجیے۔''
آپ نے پوچھا۔ ''تو یہ پلنگ کہاں سے اٹھا لایا ہے؟ اس کے ساتھ ہی جو بستر ہے، وہ کہاں سے آیا؟''
میزبان کا چہرہ اس سوال سے فق ہوگیا، بولا۔ ''آپ مجھ سے یہ سوال کیوں کررہے ہیں؟''
آپ نے فرمایا۔ ''صرف اس لیے کہ مجھے اس میں بدبو محسوس ہورہی ہے۔ یہ چیزیں تو کسی سے جبراً لے آیا ہے اس لیے ان میں بدبو ہے۔''
میزبان آپ کی بات سن کر حیران رہ گیا۔ وہ نظریں نہیں ملا رہا تھا۔
آپ نے فرمایا۔ ''کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟ کیا میں جھوٹ بول رہا ہوں؟''
میزبان نے آپ کے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور آنکھوں میں آنسو بھر لایا۔ بولا۔ ''حضرت! آج میں بے حد شرمندہ ہوں، کیونکہ جیسا کہ آپ نے جو کچھ بھی فرمایا، بالکل درست ہے۔ یہ پلنگ میں نے اپنی پرجا سے زبردستی چھین لیا تھا اور یہ بستر وغیرہ، یہ بھی اسی

طرح حاصل کیے گئے ہیں۔“

آپ نے فرمایا۔ ”افسوس کہ اب میں اس بستر اور پلنگ پر نہیں سو سکتا۔“

میزبان نے ایک بار پھر خوشامد کی۔ ”حضرت! میں آپ کے لیے ہاتھ جوڑنے کو تیار ہوں۔ آپ فرمائیں تو میں آپ کے قدموں میں بھی گر سکتا ہوں۔“

آپ نے فرمایا۔ ”اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں نے تیرا مطلب پالیا۔ تم ہی میں سے کئی نے اس سے پہلے بھی میرا ایمان چھیننے کی ناکام کوشش کی تھی۔ میں اس واقعے کو بھی انہی میں شامل کیے دے رہا ہوں۔“

اس کے بعد میزبان نے بڑی کوشش کی کہ آپ رک جائیں لیکن آپ نہیں رکے اور اسی رات اپنے حجرے میں واپس چلے گئے۔

فیروز پور کے مولوی کمال الدین کو کسی پیر کامل کی تلاش تھی۔ وہ مرید ہونے کے لیے بے چین تھے۔ انہوں نے کئی پیروں سے ملاقات کی لیکن کسی کی طرف اپنی طبیعت کو راغب نہیں پایا۔ اسی جستجو میں اس عہد کے مشہور زمانہ صوفی سائیں توکل شاہ انبالوی کی خدمت میں پہنچے اور عرض کیا۔ ”حضرت! میں پیر کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہوں۔ لوگوں نے آپ کا پتا دیا۔ اب آپ دیر نہ کیجیے اور مجھے مریدی میں داخل فرمالیجیے۔“

توکل شاہ انبالوی نے مولوی کمال الدین کی طرف سرسری نظر سے دیکھا اور فرمایا۔ ”تم ٹھہرے مولوی، پڑھے لکھے آدمی ہو اور میں ظاہری علوم سے نابلد نا آشنا۔ اس لیے میں تم کو مریدی میں نہیں لے سکتا۔“

مولوی کمال الدین نے عرض کیا۔ ”لیکن میں یہاں سے کہیں اور نہیں جاؤں گا۔ چاہے کچھ ہو جائے۔“

سائیں توکل شاہ نے جواب دیا۔ ”بابا مولوی! تو جالندھر چلا جا۔ وہاں حاجی محمود رہتا ہے۔ تو اس کا حلقۂ مریدی اپنے گلے میں ڈال لے۔ اس سے زیادہ لائق اور باکمال صوفی تجھے نہیں ملے گا۔“

مولوی کمال الدین وقت ضائع کیے بغیر اسی وقت جالندھر روانہ ہو گئے۔ یہاں مولوی کمال الدین کے ایک ہم درس مولوی ولی محمد جالندھری بھی رہتے تھے۔ مولوی کمال الدین نے سوچا کہ حاجی محمود کے پاس جانے سے پہلے اپنے دوست سے مشورہ ضرور کرلینا چاہیے۔

یہ سوچ کر مولوی کمال اپنے دوست مولوی ولی محمد سے ملے اور سائیں توکل شاہ انبالوی کے حوالے سے پوری بات ان کے گوش گزار کر دی اور پوچھا۔ ”ولی محمد! تم تو جالندھر ہی میں رہتے ہو۔ یہ حاجی محمود کیسے آدمی ہیں؟ کیا میں ان کا مرید ہو جاؤں؟“

مولوی ولی محمد جالندھری نے ناک بھوں چڑھائی اور پوچھا۔ ”مولوی کمال! کیا کوئی اس سے بڑا پیر اور نہیں ہے اس ملک میں جو تیرے جیسے باکمال عالم کا پیر بنے؟“

مولوی کمال نے جواب دیا۔ ”مولوی ولی محمد! سائیں توکل شاہ نے ان کا نام لیا ہے ورنہ میں کسی اور پیر کی تلاش میں نکلتا۔“

مولوی ولی محمد نے کہا۔ ”بھائی کمال! تم عالم ہو اور حاجی محمود علوم ظاہری نہیں رکھتے۔ اس لیے میرے خیال میں ایک عالم کو عالم پیر ہی کا مرید ہونا چاہیے۔ میں حاجی محمود کے حق میں نہیں ہوں۔“

مولوی کمال نے جواب دیا۔ ”ولی محمد! ان کا نام سائیں توکل شاہ نے دیا ہے۔ میں ان کے پاس ضرور جاؤں گا۔“

مولوی ولی محمد نے کہا۔ ”اگر یہ بات ہے تو میں بھی تمہارے ساتھ ہی چلوں گا۔ تم ان کی علمیت کا امتحان لے لینا، تمہیں پتا چل جائے گا کہ وہ کیا ہیں اور ان میں کتنی گہرائی ہے؟ یہ تماشا میں بھی دیکھ لوں گا۔“

مولوی کمال نے کہا۔ ”بہتر ہے تم بھی میرے ساتھ چلو۔“

یہ دونوں حاجی محمود کے پاس روانہ ہو گئے۔ یہ دوپہر کا وقت تھا۔ ایک مرید نے اندر جا کر اطلاع دی۔ ”دو مولوی آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”ظہر کی نماز میں ملاقات ہوگی۔“

دونوں نے وضو کیا اور ظہر کی نماز کے لیے تیار ہو گئے۔ مولوی ولی محمد نے طنزاً کہا۔ ”بھائی کمال! تم دیکھتے جاؤ، ابھی تو ابتدا ہے۔ کیا اخلاق ہے کہ دو عالم ان سے ملنے آئے ہیں اور اندر سے زحمت انتظار کا جواب دے رہے ہیں۔“

مولوی کمال نے جواب دیا۔ ”ولی محمد! میں اس معمولی سی تاخیر کو زحمتِ انتظار نہیں سمجھتا۔ جب تک حاجی صاحب سے ملاقات نہ ہو جائے، میں ان کی بابت کوئی رائے زنی نہیں کروں گا۔“

ظہر کا وقت ہوا تو آپ حجرے سے نمودار ہوئے اور ان دونوں پر کوئی توجہ دیے بغیر ظہر کی نماز کے لیے کھڑے ہوگئے۔ ان دونوں نے بھی ان کی اقتدا میں نماز ادا کی۔ مولوی کمال نے نماز کے دوران ہی یہ اندازہ لگا لیا کہ ان کی نماز میں کوئی خاص بات نہیں۔ بالکل عام لوگوں کی طرح نماز پڑھائی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ ان کی بابت ولی محمد نے جو رائے دی تھی، وہ درست تھی۔

نماز کے بعد حاجی محمود نے ان دونوں کو طلب کرلیا۔ انہوں نے دونوں کا تعارف حاصل کرنے کے بعد مولوی کمال سے کہا۔ ''مولوی! لوگ مجھے عام آدمیوں کی طرح نماز پڑھتے دیکھتے ہیں تو میری بابت شک و شبہے میں پڑ جاتے ہیں۔ سوچتے ہیں مجھ میں کوئی خاص بات تو نظر آتی نہیں پھر میں کسی کو اللہ کا نام کیا سکھاؤں گا لیکن میں یہ کہتا ہوں کہ میں نے نماز اسی طرح پڑھائی ہے جس طرح یہ پڑھائی جاتی ہے۔'' پھر مولوی ولی محمد سے کہا۔ ''مولوی! آپ اسی جالندھر شہر کے رہنے والے ہیں؟''

انہوں نے جواب دیا۔ ''جی! میں یہیں کا رہنے والا ہوں۔''

حاجی محمود نے کہا۔ ''آپ لوگوں کو میری بابت معلوم نہیں کیوں شبہات رہتے ہیں۔ کچھ کا یہ خیال ہے کہ میں علوم ظاہری سے نابلد ہوں اس لیے کسی عالم کو میری مریدی میں نہیں آنا چاہیے۔ میں بھی یہی کہتا ہوں مگر آپ لوگ عالم کسے کہتے ہیں؟ یہ بھی تو معلوم ہو؟''

مولوی ولی محمد اور مولوی کمال حیرت سے ایک دوسرے کی شکل دیکھنے لگے۔

حاجی محمود نے دونوں سے سوال کیا۔ ''تم لوگوں نے کیا کیا علم پڑھا ہے؟''

مولوی کمال نے جواب دیا۔ ''میں نے فقہ، منطق، فلسفہ، الٰہیات، تفسیر، حدیث اور بھی بہت کچھ پڑھا ہے۔''

حاجی محمود نے مولوی ولی محمد سے پوچھا۔ ''اور جناب آپ نے؟''

مولوی ولی محمد نے جواب دیا۔ ''میں مولوی کمال کا ہم درس رہ چکا ہوں اور جو کچھ انہوں نے پڑھا ہے، وہی میں نے بھی پڑھا ہے۔''

حاجی محمود نے مولوی ولی محمد سے کہا۔ ''مولوی صاحب! آپ سے تو میں بات نہیں کروں گا مگر آپ کے دوست اور ہم درس مولوی کمال سے یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ کیا انہیں نماز آتی ہے؟''

مولوی کمال نے مسکرا کر جواب دیا۔ ''مجھے نماز دوسروں کے مقابلے میں کہیں زیادہ آتی ہے۔ کیا آپ کو شبہ ہے؟''

حاجی محمود نے کہا۔ ''تمہیں نماز نہیں آتی۔ مجھے شبہ ہی نہیں یقین ہے۔ ذرا بتاؤ تو سہی کہ نماز کی نیت کس طرح باندھی جاتی ہے اور اس میں کیا کیا پڑھا جاتا ہے؟''

مولوی کمال نے جواب کے لیے منہ کھولا لیکن کچھ کہہ نہ سکے۔ ساری معلومات حرفِ غلط کی طرح حافظے سے محو ہو چکی تھیں۔ آپ نے مسکرا کر فرمایا۔ ''تم تو کہتے تھے کہ میں نے فلاں فلاں علوم پڑھے ہیں اور تمہیں نماز تک نہیں آتی۔''

مولوی کمال نے جواب دیا۔ ''حضرت! اس وقت میرے حافظے کو معلوم نہیں کیا ہو گیا ہے کہ میرا ساتھ ہی نہیں دے رہا۔''

حاجی محمود نے مزید فرمایا۔ ''اچھا اگر نماز نہیں آتی تو الحمد شریف ہی سنا دو۔''

مولوی کمال نے سورۃ فاتحہ پڑھنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا تو پتا چلا کہ یہ سورۃ بھی یاد نہیں رہی۔ انہیں سخت غصہ آرہا تھا۔

حاجی محمود نے کہا۔ ''واہ بھئی واہ۔ تم نے تو کئی علوم کا ذکر کیا تھا مگر عالم یہ ہے کہ نہ تو تمہیں نماز آتی ہے اور نہ ہی کوئی سورۃ یاد ہے۔ پھر تمہیں آتا کیا ہے؟''

مولوی ولی محمد کو اپنے دوست پر غصہ آرہا تھا، بولے۔ ''مولوی کمال! یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟''

مولوی کمال نے جواب دیا۔ ''بھائی ولی محمد! اس وقت میں کورے کاغذ کی طرح ہوں۔ کچھ تم ہی پڑھ کر سنا دو۔''

مولوی ولی محمد نے کوشش کی کہ سورۃ فاتحہ پڑھ کر سنا دیں لیکن وہ بھی زچ ہو گئے۔ ان کے حافظے نے بھی جواب دے دیا تھا۔

آپ نے فرمایا۔ ''تم نے اپنے ان علوم سے فقیر کو پہچاننے کی کوشش کی تھی۔ افسوس کہ یہ نادان اتنا بھی نہیں جانتے کہ دنیا کا کاروبار اللہ والوں سے چل رہا ہے۔'' پھر فرمایا۔ ''اچھا دوستو! میرے وظیفے کا وقت ہو چکا ہے۔ اب میں اجازت چاہتا ہوں۔''

لیکن مولوی کمال نے ان کے پاؤں پکڑ لیے اور عاجزی سے عرض کیا۔ ''بابا! میں شرفِ مریدی حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ میں آپ کو نہیں جانے دوں گا۔''

آپ نے فرمایا۔ ''میرے پیر چھوڑ دے۔''

مولوی کمال نے کہا۔ ''ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں اس وقت تک آپ کے پاؤں پکڑے رہوں گا جب تک کہ آپ مجھ کو اپنا مرید

نہیں کریں گے۔"

آپ کو مولوی کمال پر رحم آ گیا اور انہیں اپنے مریدوں میں داخل کر لیا۔ مولوی ولی محمد نے ناک بھوں چڑھائی اور آہستہ سے کان میں کہا۔ "بھائی کمال! یہ کیا غلطی کر بیٹھے۔ معلوم نہیں کیوں میرا دل اس درویش کی طرف مائل نہیں ہوتا۔"

آپ نے فرمایا۔ "میں کب یہ چاہتا ہوں کہ تیرا دل میری طرف مائل ہو جائے۔ میں خود بھی تیری مریدی سے پناہ مانگتا ہوں۔ افسوس کہ جالندھر کے باہر والوں کے لیے تو روشنی ہی روشنی ہے مگر خاص جالندھر والوں کے لیے تو اس سے زیادہ ہی نفرتیں اور کدورتیں مقدر کی جا چکی ہیں۔"

مولوی ولی محمد نے اپنے دوست سے کہا۔ "بھائی کمال! میرا اب بھی یہی عقیدہ ہے کہ یہ نام نہاد درویش ہے۔ اس کو کچھ بھی نہیں آتا مگر تم خوامخواہ چلے آئے۔"

مولوی کمال نے جواب دیا۔ "جناب والا! میں نے تو اس ذات کی تلاش میں کئی سال گزار دیے لیکن کوئی درویش نہ مل سکا اور اب جو خوش قسمتی سے میں نے ولی کامل کو پا لیا ہے تو تم وسوسوں والی بات کرنے لگے ہو۔"

ولی محمد وہاں نہیں ٹھہرے اور اپنے گھر کی راہ لی۔ دونوں دوستوں کے دلوں میں بگاڑ پیدا ہو چکا تھا۔ ان کے دل صاف نہیں تھے۔

جب مولوی کمال ان سے رخصت ہونے لگے تو حاجی محمود نے اپنی ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے فرمایا۔ "مولوی! میری اس ڈاڑھی کا خیال رکھنا کیونکہ تیرے پیچھے ورغلانے والے موجود ہیں۔"

مولوی کمال نے جواب دیا۔ "پیر و مرشد! آپ فکر نہ کریں، مجھ پر کسی کا بھی اثر نہ ہوگا۔"

حاجی محمود نے تقریباً سو سال کی عمر پائی اور انہوں نے اپنی زندگی میں لوگوں کو بڑا فیض پہنچایا۔ انہوں نے جالندھر والوں کی کبھی کوئی پروا نہ کی۔

آخری دنوں میں آپ کی ایک ڈاڑھ بہت دکھا کرتی تھی۔ علاج سے کوئی فائدہ نہ پہنچا تو کسی معالج نے مشورہ دیا کہ اس کو نکلوا دیجیے۔ اس سے شاید افاقہ ہو جائے۔

آپ نے کچھ دیر کے سکوت کے بعد اپنے معالج سے کہا۔ "جب مشیتِ ایزدی یہی ہے کہ میں اپنی اس ڈاڑھ کے بہانے سفر آخرت کروں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" پھر اپنے ایک مرید سے کہا۔ "تو آج ہی انبالے چلا جا اور حضرت قبلہ توکل شاہ کو مطلع کر دے کہ حاجی محمود اپنے آخری سفر پر روانہ ہونے والا ہے، ملاقات کر لیں۔"

مرید نے آپ کے حکم کی تعمیل کی اور اسی وقت انبالے چلا گیا۔

توکل شاہ فوراً ہی چلے آئے۔ انہیں دیکھتے ہی آپ نے اپنے معالج سے کہا۔ "اچھا اب تو اپنا کام کر اور میری ڈاڑھ نکال دے۔"

معالج نے جیسے ہی آپ کی ڈاڑھ نکالی، آپ پر فالج کا حملہ ہوا اور آپ بے ہوش ہو گئے۔ بے ہوشی کئی دن طاری رہی اور بالآخر اسی عالم میں آٹھ ربیع الاول 1306 ہجری کو آپ کا وصال ہو گیا۔ اس خبر سے دور دور تک ایک کہرام برپا ہو گیا۔ جنازے میں شرکت کی خاطر دور دور سے لوگ آنے لگے۔ قبلہ توکل شاہ تو وہاں موجود ہی تھے۔ دن چڑھے آپ کا جنازہ اٹھایا گیا تو ایک بار پھر کہرام برپا ہو گیا۔ بستی شیخ کے راستے پر جو قبرستان ہے، آپ کو اس میں سپرد خاک کر دیا گیا۔

آپ اکثر فرمایا کرتے تھے۔ "اے لوگو! جن کی طرف رب ہے انہیں کیا غم۔ آنگن میں چندن کا درخت لگ گیا ہے جس کے نیچے مسافر آ کر بیٹھ جاتا ہے۔"

کسی نے پوچھا۔ "حضرت! اس کا مفہوم بھی بتا دیجیے۔"

آپ نے فرمایا۔ "آنگن سے مراد قلب سالک ہے اور چندن کے درخت سے مراد اللہ کا نام ہے جو خوشی اور مسرت سے لبریز ہے اور مسافر سے مراد واردات غیبی ہیں۔"

ایک غریب الدیار شخص جس کا خمیر ڈیرہ غازی خان سے اٹھا، وہ آج بستی شیخ کے قبرستان میں آسودہ خاک ہے۔

ماخذات

تاریخ مبارک شاہی	آثار الصنادید	تاریخ فرشتہ	عہد سلاطین دہلی	تاریخ فیروز شاہی	طبقات اکبری
یحییٰ بن احمد سرہندی	سر سید احمد خان	محمد قاسم فرشتہ	صلاح الدین ناسک	شمس سراج عفیف	نظام الدین احمد

انوکھا کھیل

تنویر ریاض

بعض اوقات انسان رشتوں کی ڈور میں کچھ یوں الجھتا ہے کہ اس سے نکلنے کے لیے اسے جگہ جگہ سے توڑنا پڑتا ہے... ایسے میں بہ ظاہر یہ دلچسپ کھیل محسوس ہوتا ہے لیکن درحقیقت یہ ٹوٹ پھوٹ رشتوں کے ساتھ ساتھ اس کی اپنی شخصیت کو بھی توڑ کر رکھ دیتی ہے۔ کچھ ایسا ہی حال ان لوگوں کا بھی تھا جو بہ ظاہر تو آنکھ مچولی کھیل رہے تھے مگر سب کچھ اوجھل ہو کر بھی سب کچھ ظاہر ہو گیا تھا۔

ہاری ہوئی بازی جیتنے والی ایک حسینہ کی بساط کا احوال

اوشین وستا، بھی ان ہزاروں موٹیلز میں سے ایک تھا جو امریکا کے طول و عرض میں ہزاروں کی تعداد میں واقع ہیں۔ مجھے اس موٹیل میں کوئی خاص بات نظر نہ آئی۔ اس میں انیس کمرے انگریزی حرف L کی شکل میں بنے ہوئے تھے اور ہر کمرے کے دروازے کے باہر لوہے کی ایک کرسی رکھی ہوئی تھی جس کا سبز رنگ جگہ جگہ سے اڑ چکا تھا اور اس کی جگہ زنگ نے لے لی تھی۔ ان کرسیوں کو لوہے کی زنجیر سے باندھ دیا گیا تھا جس کا دوسرا سرا کنکریٹ کے فرش میں نصب ایک کنڈے سے منسلک تھا۔ میں نے اپنی کرائے کی کار میں بیٹھے بیٹھے اس موٹیل پر نگاہ ڈالی اور اپنے طور پر اطمینان کرلیا کہ میں صحیح جگہ پر پہنچا ہوں اور اب مجھے اس موٹیل میں کمرا حاصل کر کے اپنے کام کا آغاز کرنا تھا۔

دفتر کے سامنے ریت کی تہ جمی ہوئی تھی اور وہاں موجود واحد پام کا درخت بھی اپنی زندگی کی آخری سانسیں لے رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر یہ جگہ فلوریڈا میں ہوتی تو اب تک اس کا نام ونشان مٹ چکا ہوتا اور اس کا بے کار سامان مثلاً فرنیچر، ٹیلی وژن اور واش بیسن وغیرہ ٹرکوں میں بھر کر کباڑ مارکیٹ میں بھیج دیے جاتے اور اس جگہ پر ایک پانچ منزلہ عمارت تعمیر کی جاتی جس کی بالائی منزل سے سمندر صاف نظر آتا۔

پہلے میرے بھائی کا بھی یہی ارادہ تھا لیکن معیشت کی بگڑتی ہوئی صورتِ حال کو دیکھ کر اس نے فیصلہ کیا کہ اس جگہ سے جلد از جلد چھٹکارا حاصل کیا جائے اور مجھے اسی لیے یہاں بھیجا گیا تھا۔ میں نے اپنے لباس پر ایک نگاہ ڈالی اور پائنچوں پر لگی گرد کو جھاڑتا ہوا دفتر میں داخل ہوگیا۔ وہاں ایک عورت کرسی پر بیٹھی اس چھوٹے سے ٹیلی وژن پر نظر جمائے ہوئے تھی جو سامنے کاؤنٹر پر رکھا ہوا تھا۔ اس کی عمر پچاس کے لگ بھگ ہوگی اور ایک نظر دیکھتے ہی اندازہ ہوجاتا تھا کہ وہ اپنے اوپر خاصی توجہ دیتی ہوگی۔ اس نے بڑی نفاست سے اپنی بھویں بنائی تھیں اور اس کا چہرہ بھی شگفتہ وتر وتازہ نظر آرہا تھا۔ وہ سگریٹ نوشی کی عادی معلوم ہوتی تھی اور اس وقت بھی اس کے ہونٹوں میں ایک سگریٹ دبا ہوا تھا۔ میں نے ایک نظر ایش ٹرے میں پڑے ہوئے ٹوٹوں پر ڈالی اور سمجھ گیا کہ یہ اس کا دوسرا پیکٹ چل رہا ہے۔

میں نے اسے اپنی جانب متوجہ کرنے کے لیے کہا۔

''تم ٹی وی سے بہت قریب بیٹھی ہو۔ یہ تمہاری آنکھوں کے لیے نقصان دہ ہوسکتا ہے۔''

اس نے تیکھی نظروں سے مجھے دیکھا اور بولی۔ ''کیا تم ڈاکٹر ہو؟''

میں اسے دیکھ کر مسکرادیا۔ سگریٹ کا دھواں ہمارے سروں پر منڈلا رہا تھا۔ کیلی فورنیا میں اس طرح سرِعام سگریٹ پینے پر پولیس کارروائی کرسکتی ہے لیکن فلوریڈا میں رہنے والوں کے لیے یہ کوئی بڑی بات نہیں تھی۔

''تمہیں کمرا چاہیے؟'' اس نے میری مسکراہٹ کو نظر انداز کرتے ہوئے خشک لہجے میں کہا اور دوبارہ ٹیلی وژن دیکھنے میں مصروف ہوگئی۔

''میں نقد ادائیگی کروں گا بشرطیکہ سب کچھ ٹھیک رہا۔''

''یہاں تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔'' اس عورت نے ٹیلی وژن پر سے نظر ہٹائے بغیر کہا۔ ''ایک رات کا کرایہ اسی ڈالرز ہوگا۔''

''مجھے تو کسی نے ستر ڈالرز بتائے تھے۔''

''یہ تو پرانی بات ہوگئی۔ تمہیں کسی اُلّو نے غلط بتایا ہے۔''

میں چند لمحے اسے دیکھتا رہا اور اپنے پرس سے اسی ڈالرز نکال کر اس کے حوالے کردیے پھر میں نے خالص کاروباری انداز میں کہا۔ ''ویسے تو میرا ارادہ دو دن قیام کرنے کا ہے لیکن اگر یہ جگہ پسند آگئی تو ہوسکتا ہے کہ مزید کچھ عرصے کے لیے رک جاؤں۔''

''میں دعا کروں گی۔'' اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔ اس دوران اس کی نظر ایک سیکنڈ کے لیے بھی ٹیلی وژن سے نہیں ہٹی پھر اس نے اپنی کرسی پیچھے کھسکائی اور دیوار پر لگے کی بورڈ سے ایک چابی اتار کر میرے حوالے کردی۔

''کمرا نمبر تیرہ؟'' میں نے چونکتے ہوئے کہا۔

''مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم اتنے توہم پرست ہو۔'' وہ بولی۔ شاید شو کے درمیان اشتہارات کا وقفہ آگیا تھا۔ اس لیے اس کی توجہ مجھ پر مرکوز ہوگئی تھی۔

''تمہیں دیکھ کر لگتا ہے کہ تم ان لوگوں میں سے ہو جو اپنے ساتھ بدقسمتی لے کر آتے ہیں۔''

''میں اسے اپنی تعریف سمجھوں گا۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ بھی ان لوگوں میں سے تھی، جو کسی کو دیکھ کر پہلی نظر میں ہی اس کے بارے میں رائے قائم کرلیتے ہیں۔

''تم چھٹیوں پر ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں، کیا تمہیں یقین نہیں آرہا؟''

اس نے کوئی جواب نہیں دیا پھر رجسٹر کھولتے ہوئے بولی۔ ''کیا میں تمہارا نام جان سکتی ہوں؟''

''ایڈورڈ...... لیکن تم مجھے ایڈی کہہ کر بلا سکتی ہو۔ میرے سب دوست مجھے اسی نام سے پکارتے ہیں۔''

''تمہیں یہاں دیکھ کر خوشی ہوئی۔ مجھے امید ہے کہ اس ہوٹل میں رہنا خوشگوار رہے گا۔'' یہ کہہ کر اس نے سگریٹ کا ایک طویل کش لیا اور دوبارہ ٹیلی وژن دیکھنے میں مصروف ہوگئی۔

''مجھے پورا یقین ہے کہ ''وستا'' کے معنی نظارے کے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن میں نہیں سمجھتا کہ یہاں سے سمندر نظر آتا ہوگا۔''

''تمہیں جو کمرا دیا گیا ہے، اس کے باتھ روم کی کھڑکی سے تم سمندر دیکھ سکتے ہو۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ''یہ مت کہنا کہ میں نے تمہارے لیے کچھ نہیں کیا۔''

میں نے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔ مجھے وہاں کوئی پورٹر نظر نہیں آیا۔ گویا مجھے اپنا سامان خود ہی لے کر آنا تھا۔ دفتر سے باہر نکلا تو سورج پوری آب وتاب سے چمک رہا تھا۔

اپنے سوٹ کیس کے ساتھ کمرا نمبر تیرہ تک جاتے ہوئے میری گردن اور پیشانی پر پسینے کے قطرے نمودار ہو چکے تھے۔ میں کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ سوٹ کیس بستر پر رکھا اور باتھ روم میں چلا گیا۔ کھڑکی کھول کر دیکھی۔ گلی کے دونوں اطراف عمارتیں تھیں اور ان کے درمیان سے دور پرے نیلے پانی کی ایک پتلی سی لکیر نظر آرہی تھی۔ میں نے کھڑکی بند کی اور واپس کمرے میں آگیا۔ میں نے اپنا سیل فون نکالا اور بھائی کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔

''چھوٹے بھائی، یہ تم نے مجھے کس مصیبت میں ڈال دیا؟ یہ بھی کوئی رہنے کی جگہ ہے؟''

''ہر جگہ کی اپنی ایک کشش ہوتی ہے۔ تمہیں بہت جلد اندازہ ہوجائے گا کہ مجھے یہ موٹیل کیوں پسند ہے۔''

''میں نے دیکھ لیا ہے کہ یہ موٹیل سمندر سے دو بلاک کے فاصلے پر ہے لیکن تم نے یہ نہیں بتایا تھا کہ یہ اتنی بری حالت میں ہے۔''

''تم نے پہلے کبھی اسے نہیں دیکھا۔'' وہ بولا۔ ''اب تو یہ مٹی کا ڈھیر بنتا جارہا ہے۔''

''استقبالیہ پر بیٹھی ہوئی عورت خوب صورت ضرور ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ لوگوں کو دھوکا دے رہی ہے۔''

''اس کی کون پروا کرتا ہے۔'' بھائی نے کہا۔ ''تم نے وہاں کوئی خاص بات نوٹ کی؟''

''نہیں۔ میں تھوڑی دیر پہلے ہی یہاں پہنچا ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔ آج جمعے کی رات ہے۔ شاید کوئی واقعہ پیش آجائے۔''

''میں ایسا نہیں سمجھتا۔ شاید اس کے لیے کافی انتظار کرنا پڑے۔''

''تم واقعی میری بہت مدد کررہے ہو۔'' اس نے تشکر آمیز انداز میں کہا۔ ''میں اس کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتا اور بونی بھی ایسا ہی سمجھتی ہے۔''

بونی اس کی نئی نویلی دوسری بیوی کا نام تھا۔ وہ بائیس سالہ پُرکشش لڑکی پیشے کے لحاظ سے یوگا انسٹرکٹر تھی اور میں یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ اسے میرے بھائی میں ایسی کیا خاص بات نظر آئی تھی کہ اس کی بیوی بننا قبول کرلیا۔

''تم اس بارے میں بالکل فکر نہ کرو۔ میں اپنے ساتھ وزن لایا ہوں اور انہیں بڑی ہوشیاری سے استعمال کروں گا۔''

''مجھے اس بارے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔''

اس نے اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے سلسلہ منقطع کردیا۔

میں نے بھائی سے کہا کہ اپنے ساتھ وزن لایا ہوں۔ اس جملے کی وضاحت ضروری ہے۔ میرا چھوٹا بھائی گاڑیوں کا کاروبار کرتا ہے اور ہمارے خاندان میں وہی ایک کماؤ پوت ہے۔ ان دنوں وہ کیلی فورنیا سے باہر بونی کے ساتھ وقت گزار رہا ہے۔ وہ دراصل میرا سوتیلا بھائی ہے۔ ہماری ماں ایک اور باپ الگ الگ ہیں۔ ہم دونوں کی پرورش مختلف ماحول اور انداز میں ہوئی۔ ہم دونوں کا موازنہ اس طرح کیا جاسکتا ہے جیسے ایک بچہ گالف کھیلتا ہوا اور اس نے کسی بزنس اسکول میں تعلیم حاصل کی ہو جبکہ دوسرا بچہ فٹ بال کھیل کر جوان ہوا ہو اور اسکول جانے کے بجائے قالینوں کی صفائی کے کام میں لگ گیا ہو۔ اس کے پاس پیسا ہے اور میرے پاس طاقت۔ ہم دونوں میں صرف ایک ہی بات مشترک ہے کہ ہم نے اپنی ماں کی ذمے داری اٹھائی ہوئی ہے، وہ اس کے مکان کی قسطیں ادا کرتا ہے اور میں بڑی باقاعدگی سے اپنی ماں کو دیکھنے جاتا ہوں اور پڑوسی کو تاکید کرتا ہوں کہ وہ اپنے ریکارڈ پلیئر کی آواز آہستہ رکھے اور اختتام ہفتہ ہونے والی پارٹیوں میں شور شرابے سے گریز کرے۔ میں جانتا ہوں کہ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے۔ لہٰذا مجھے ایک کے بعد دوسرا پھر تیسرا چکر لگانا پڑتا ہے۔ تب جاکر پڑوسی کی سمجھ میں آتا ہے کہ اس نے میری معقول گزارش پر توجہ نہ دے کر غلطی کی تھی۔ اس کے لیے مجھے بغیر آستینوں والا بنیان پہن کر اپنے بازوؤں کی نمائش کرنا پڑتی ہے تاکہ اسے اندازہ ہوجائے کہ میرا ایک گھونسا اس کے لیے کتنا مہلک ثابت ہوسکتا ہے۔

یہی میرا وزن ہے۔ اس سے مراد پاؤنڈ یا کوئی دوسری اکائی نہیں بلکہ یہ ایک ذہنی کیفیت کا نام ہے۔ یہ وہ طریقہ ہے جس سے میں دنیا کو دیکھتا ہوں۔ جب میں اپنے ذہن کی طاقت کو استعمال کرتا ہوں تو وہ میرے بازوؤں میں سرایت کرجاتی ہے اور یہی وہ طاقت ہے جس سے میں بڑے بڑے سورماؤں کو زیر کرلیتا ہوں۔

''میں جانتا ہوں کہ تم فلوریڈا جاکر اس طاقت کا استعمال کروگے۔'' بھائی نے مجھ سے عاجزانہ لہجے میں کہا تھا۔ ''تمہیں یہ معلوم کرنا ہے کہ وہاں کیا ہورہا ہے اور اس سے کس طرح نمٹا جائے۔''

دراصل اسے اس موٹیل کا ایک خریدار مل گیا تھا گو کہ اس نے توقع سے کم قیمت لگائی تھی لیکن میرا بھائی یہ نقصان

برداشت کرنے کے لیے تیار تھا۔ کم از کم اس طرح اس کی موٹیل سے جان تو چھوٹ جاتی جو آہستہ آہستہ کھنڈر میں تبدیل ہو رہا تھا۔

''خریدار کا کہنا ہے کہ اس نے موٹیل کے بارے میں کچھ باتیں سنی ہیں جس کی وجہ سے اس کا ارادہ ڈانواں ڈول ہو رہا ہے۔'' میرے بھائی نے اپنی پریشانی بیان کرتے ہوئے کہا۔ ''اس موٹیل کے کمرے میں رہائش پذیر شخص مسئلہ بن گیا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ پورا موٹیل اس کا ہے اور وہ وہاں جس طرح کا چاہے قانونی یا غیر قانونی کاروبار کرے۔ میں نہیں جانتا کہ اس کے کاروبار کی نوعیت کیا ہے اور نہ ہی جاننا چاہتا ہوں۔''

''تم پولیس کی مدد کیوں نہیں لیتے؟'' میں نے کہا۔ ''یہ ان کا کام ہے۔''

''خریدار نہیں چاہتا کہ اس معاملے میں پولیس کو ملوث کیا جائے۔ وہ اس مسئلے کو ہوش مندی سے حل کرنا چاہتا ہے۔''

''ہوش مندی سے اس کی کیا مراد ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''پتا نہیں۔'' بھائی نے کہا۔ ''دراصل میری اس سے براہِ راست بات نہیں ہوئی ہے۔ ساری باتیں ایجنٹ کے ذریعے ہو رہی ہیں۔ اس کا کہنا ہے کہ اگر میں اس برے آدمی کو وہ جگہ چھوڑنے پر آمادہ کرلوں تو گاہک کو اس میں زیادہ کشش محسوس ہوگی اور آسانی سے سودا ہو جائے گا۔''

''میرا خیال ہے کہ وہ اس موٹیل کی قیمت کم کرانے کے لیے ایسی باتیں کر رہا ہے۔ سب یہی کرتے ہیں۔ تم نے بھی اس موٹیل کو خریدتے وقت ایسے ہی نقائص نکالے ہوں گے۔''

''وہ بعد میں کسی جھگڑے میں نہیں پڑنا چاہتا۔ وہ صرف یہ چاہتا ہے کہ یہ شخص اس جگہ سے چلا جائے تاکہ وہ کسی مشکل کے بغیر اس موٹیل کا قبضہ حاصل کرسکے۔ سچ پوچھو تو اس کی یہ خواہش بے جا نہیں ہے اور میں اس کے لیے اسے کوئی الزام نہیں دوں گا۔''

اس طرح یہ کام میرے ذمے لگ گیا۔ میرا بھائی سمجھتا ہے کہ میرے لیے یہ بہت آسان ہوگا۔ بس تھوڑا سا اپنی طاقت کا مظاہرہ کرو اور ہر شخص تمہارے قدموں تلے ڈھیر ہو جائے گا۔ اسے نہیں معلوم کہ میرا طریقہ کار کیا ہے، بالکل اسی طرح جیسے میں نہیں جانتا کہ اس نے اتنی دولت کیسے کمائی جس کا کچھ حصہ وہ میری ضمانت کروانے اور اچھا وکیل کرنے پر خرچ کرتا رہتا ہے اس لیے میں اس کے کسی کام کو انکار نہیں کرسکتا۔

ایک گھنٹے بعد میں اپنے کمرے کے باہر رکھی لوہے کی کرسی پر بیٹھا موٹیل میں آنے جانے والوں کو دیکھ رہا تھا۔ پارکنگ لاٹ میں اب بھی چند کاریں نظر آ رہی تھیں لیکن میں نہیں جانتا تھا کہ کتنے کمرے بھرے ہوئے ہیں یا یہ کہ مجھے کس کمرے کا دروازہ کھلنے کے انتظار میں وہاں کتنی دیر بیٹھنا ہوگا۔ یہ دوپہر کا وقت تھا اور سورج میری آنکھوں میں گھسا آ رہا تھا۔ لوہے کی کرسی دھوپ کی حدت سے اتنی گرم ہوگئی تھی کہ اس پر بیٹھنا مشکل ہوگیا۔ میں اپنی جگہ سے اٹھا اور کرائے کی کار کی طرف چل دیا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر میں نے فین چلایا اور اپنے آپ کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے کچھ دیر وہیں بیٹھ کر گردوپیش پر نگاہ رکھنے کا فیصلہ کیا۔ اس وقت میں اپنے آپ کو ایک پرائیویٹ سراغ رساں سمجھ رہا تھا جو انتظار کرو اور دیکھو کی پالیسی پر عمل کرتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد مجھے اکتاہٹ محسوس ہونے لگی۔ اس کے علاوہ بھوک بھی لگ رہی تھی۔ میں کار سے باہر آ کر سڑک کی طرف چل دیا۔ استقبالیہ پر بیٹھی عورت اب بھی ٹیلی وژن دیکھ رہی تھی۔

موٹیل کے برابر میں ہی ایک اسٹور تھا۔ اس کے بعد دو دکانیں چھوڑ کر میری نظر ایک بار پر گئی اور میں اندر داخل ہوگیا۔ میں نے بارٹینڈر کے ہاتھ پر کچھ رقم رکھی اور بیئر کا گلاس لے کر ایک میز پر بیٹھ گیا۔ میں نے آہستہ آہستہ بیئر کے گھونٹ لینا شروع کیے اور ساتھ ہی ادھر ادھر نظریں دوڑاتا رہا لیکن مجھے وہاں کوئی غیر معمولی بات محسوس نہیں ہوئی۔ بار میں بہت کم لوگ تھے جن کے چہروں سے اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ وہ بے ضرر قسم کے لوگ ہیں۔ بیئر کا گلاس ختم ہوا تو میں بھی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ سورج غروب ہوچکا تھا لیکن موسم ابھی تک گرم تھا۔ میں ایک لمبا چکر کاٹ کر موٹیل واپس پہنچا۔ استقبالیہ کے پاس سے گزرا تو اس بار اس عورت نے مجھے دیکھ کر سر کو خفیف سی جنبش دی۔ میں اپنے کمرے میں داخل ہوا۔ جیسے ہی میں نے کمرے کا دروازہ بند کیا، میرے سیل فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ دوسری جانب سے میرا بھائی بول رہا تھا۔

''کوئی خاص بات؟'' وہ مضطرب لہجے میں بولا۔ ''تمہیں وہ شخص ملا؟''

''نہیں۔ میں نے ابھی تک اسے نہیں دیکھا۔ مجھے تو یہ بھی یقین نہیں کہ اس موٹیل میں میرے علاوہ اور بھی کوئی ٹھہرا ہوا ہے۔ ویسے پارکنگ لاٹ میں پانچ چھ کاریں کھڑی ہوئی ہیں لیکن ہوسکتا ہے کہ وہ جگہ صرف پارکنگ کے لیے استعمال کی جا رہی ہو۔''

''یہ ناممکن ہے۔ وہ شخص وہیں رہتا ہے۔ کم از کم مجھے تو یہی بتایا گیا ہے۔''

''ہوسکتا ہے وہ شہر سے باہر گیا ہوا ہو۔ یہ جگہ تو بالکل ویران ہے۔''

''باہر نظر رکھو۔ ابھی اتنا اندھیرا نہیں ہوا ہے۔ یہی وقت ہے جب بُرے لوگ باہر آتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے جیسا تم کہو گے چھوٹے بھائی۔'' یہ کہہ کر میں نے فون بند کردیا پھر میں کمرے سے باہر نکل آیا اور لوہے کی کرسی پر بیٹھ کر اس بُرے آدمی کا انتظار کرنے لگا۔

بیٹھے بیٹھے مجھے نیند آگئی اور جب میں نے آنکھیں کھولیں تو پوری طرح اندھیرا چھا گیا تھا۔ پارکنگ لاٹ کے وسط میں ایک کھمبے پر اسٹریٹ لائٹ روشن تھی۔ وہاں موجود کاروں میں سے ایک جا چکی تھی اور دو نئی کاریں آگئی تھیں۔ اس کا مطلب تھا کہ میرے سونے کے درمیان وہاں کوئی نقل وحرکت ہوئی ہوگی۔ مجھے غصے کے ساتھ ساتھ حیرت بھی تھی کہ اس انتہائی غیر آرام دہ کرسی پر مجھے نیند کیسے آگئی۔

مجھے ایک کمرے سے موسیقی کی آواز آئی۔ پھر دوسری طرف کے کمرے کا دروازہ کھلا اور اس میں سے ایک شخص باہر آیا۔ میں نے اپنی جگہ کھڑے ہوکر اسے غور سے دیکھا۔ وہ مجھ سے تیس فٹ کے فاصلے پر تھا۔ اس نے مجھے اس طرح دیکھا جیسے میں نے اس پر خنجر تان لیا ہو۔ وہ تیزی سے کار کی جانب بڑھا اور اس میں سوار ہوکر اتنی ہی تیزی سے روانہ ہوگیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے دوسرے کمروں کا جائزہ لینا شروع کیا لیکن سب کمروں کے دروازے بند تھے۔ پھر مجھے ایک اچھوتا خیال سوجھا۔ میں اپنے کمرے میں آگیا اور وہاں سے برف کی بالٹی اٹھا لایا۔ اب اگر کسی کی نظر مجھ پر جاتی تو وہ یہی سمجھتا کہ میں برف کی تلاش میں ہوں۔ پھر میں نے کمروں کی قطار کے ساتھ چلنا شروع کردیا۔ میں ہر دروازے کے پاس رک کر اندر کی آوازیں سننے کی کوشش کررہا تھا اور اگر کہیں مجھے پردوں کے درمیان خلا نظر آتا تو اس میں سے اندر جھانکنے کی کوشش بھی کرلیتا۔ میں نے ایک کمرے میں عورت کو بستر پر بیٹھے دیکھا جس کی پشت میری طرف تھی۔ دوسرے کمرے میں ایک نوجوان جوڑا ٹھہرا ہوا تھا۔ وہ دونوں بستر پر لیٹے ٹیلی وژن دیکھ رہے تھے۔ میرا دل چاہا کہ دروازے پر دستک دے کر انہیں کچھ پیسے دوں اور کہوں کہ وہ کسی بہتر جگہ پر جاکر ان پُرمسرت لمحات سے لطف اندوز ہوں لیکن میں نے دخل در معقولات کا ارادہ ترک کردیا کیونکہ اس وقت میرے نزدیک اپنے کام

شرم

دو بچے آپس میں لڑ رہے تھے۔ ایک بچے نے طعنہ دیا۔ ''تمہیں شرم آنی چاہیے تمہارا باپ درزی ہے اور تم پھٹی ہوئی شرٹ پہن کے گھوم رہے ہو۔''

دوسرے بچے نے جھٹ سے جواب دیا۔ ''شرم تو تمہیں آنی چاہیے۔ تمہارا باپ ڈینٹسٹ ہے اور تمہارا چھوٹا بھائی بغیر دانتوں کے پیدا ہوا ہے۔''

مرسلہ۔ محمد جاوید، تحصیل علی پور

کی زیادہ اہمیت تھی۔

دو دروازے چھوڑنے کے بعد مجھے آئس مشین مل گئی۔ میں نے اس کا بٹن دبایا اور بالٹی میں برف کے ٹکڑوں کے گرنے کا انتظار کرنے لگا پھر میں واپسی کے لیے مڑا اور آہستہ آہستہ قدم بڑھاتا ہوا اپنے کمرے کی جانب روانہ ہوگیا۔ اس بار مجھے پارکنگ لاٹ کے دوسری طرف سے آنے والی آواز واضح طور پر سنائی دی۔ میں تیزی سے کونے پر پہنچا۔ یہ آواز میرے کمرے سے تین دروازے چھوڑ کر آرہی تھی۔ کوئی مرد زور زور سے چلا رہا تھا اور جب میں اس دروازے کے قریب پہنچ کر سننے کی کوشش کرنے لگا تو کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک عورت باہر آئی۔ اس نے لمحہ بھر کے لیے مجھے دیکھا اور سیدھی دفتر میں چلی گئی۔ مجھے اس کے چہرے پر خوف کے آثار واضح طور پر نظر آئے۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کرنے کے بارے میں سوچتا، مرد بھی کمرے سے باہر آگیا اور اس نے زور سے دروازہ بند کردیا۔ اس کی قمیص کے بٹن کھلے ہوئے تھے اور اس کے نیچے سفید بنیان نظر آرہا تھا۔ مجھے ایسے لوگوں سے ہمیشہ نفرت رہی ہے جو بیویوں کو مارتے ہیں۔ یہ شخص بھی مجھے انہی لوگوں میں سے لگ رہا تھا۔ جب اس نے مجھے برف کی بالٹی کے ساتھ وہاں کھڑے دیکھا تو اس کی آنکھیں سکڑ گئیں اور وہ ترش لہجے میں بولا کہ میرے ساتھ کیا مسئلہ ہے؟

''مجھے تو کوئی مسئلہ نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ جو عورت اس کمرے سے باہر آئی ہے، اس کے ساتھ کوئی مسئلہ ہے۔''

''تمہیں اس سے کیا مطلب؟'' وہ اسی لہجے میں بولا۔ وہ قد میں مجھ سے چھوٹا تھا لیکن دیکھنے میں کافی مضبوط لگ رہا تھا۔

''میرا خیال ہے کہ ہمیں آپس میں گفتگو کرنے کی ضرورت ہے۔''

''اور میرا خیال ہے کہ تمہیں اپنے کام سے کام رکھنا چاہیے۔'' یہ کہہ کر اس نے میرے پاس سے گزرنے کی کوشش کی۔ میں نے بالٹی فرش پر رکھی اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ مڑا اور اپنی کھلی ہوئی قمیص کے نیچے کچھ تلاش کرنے لگا۔ وہ میری توقع سے زیادہ تیز ثابت ہوا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کرتا، اس کے ریوالور کی نال کا رخ میری جانب ہو چکا تھا۔ وہ اعشاریہ تین آٹھ کا بے آواز ریوالور تھا اور اس کی انگلی کی ایک جنبش مجھے عالم بالا میں پہنچا سکتی تھی۔ میں بے وقوف نہیں تھا لہٰذا میں نے اسے جانے دیا۔ وہ پیچھے ہٹا اور اپنی کار میں بیٹھ گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کار کا دروازہ بند کرتا، میں نے بہ آوازِ بلند کہا۔ ''ہم بعد میں بات کریں گے۔''

میں وہیں کھڑا دس تک گنتی گنتا رہا۔ پھر وہ لڑکی لیٹینا دفتر سے باہر نکلی اور سیدھی میرے پاس آئی۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

''مادام! تم ٹھیک تو ہو؟''

اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور دروازے کی طرف چلی گئی۔ اندر جانے کے بعد اس نے دروازہ بند کر دیا۔

اب وہاں مکمل خاموشی تھی البتہ دور پرے ساحل پر آنے والی گاڑیوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اسٹریٹ لائٹ کی زرد روشنی سیدھی میرے سر پر پڑ رہی تھی اور میرا دل ابھی تک زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

میں نے جیب سے سیل فون نکالا اور بھائی کا نمبر ملانے کے بعد کہا۔ ''میں نے اسے تلاش کر لیا ہے۔''

''تم ٹھیک تو ہو، تمہارے لہجے سے لگ رہا ہے...... میرا مطلب ہے سب ٹھیک ہے نا؟''

''ہاں سب ٹھیک ہے، میں تم سے بعد میں بات کروں گا۔''

میں نے فون بند کر دیا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ وہ کہاں گیا ہے اور اس کی واپسی کب تک ہوگی لیکن مجھے اس کا انتظار کرنا تھا۔

کافی دیر بعد بھی اس کی واپسی نہیں ہوئی تو میں نے اپنا ارادہ ترک کر دیا اور سونے کے لیے چلا گیا۔ اس کے انتظار میں اپنا وقت اور توانائی ضائع کرنا عقل مندی نہیں تھی۔ میں نے سوچا کہ اب اس شخص سے کل دن کی روشنی میں نمٹوں گا۔ وہ اسی موٹیل میں رہتا ہے اور اسے تلاش کرنا کچھ مشکل نہ ہوگا۔

صبح نو بجے کے قریب میرے دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے دیکھا کہ وہی رات والی عورت ایک ٹرالی کے ہمراہ کھڑی ہے۔ گویا وہ یہاں ہاؤس کیپر کے طور پر کام کرتی تھی۔ اپنی عادت کے مطابق میں نے فوراً ہی اپنے ذہن میں اس کا تصوراتی خاکہ بنانا شروع کر دیا۔ وہ میکسیکو کی رہنے والی نہیں تھی۔ ممکن ہے کہ جنوبی امریکا سے آئی ہو۔ اس کی انگریزی اچھی نہیں تھی اور ممکن ہے کہ وہ یہاں غیر قانونی طور پر رہ رہی ہو۔ اس کے پاس انتخاب کی گنجائش نہ تھی چنانچہ اس نے اسی شخص پر اکتفا کیا اور اب وہ اس سے دور نہیں جا سکتی تھی۔ یہ سارا منظر نامہ میرے دماغ میں تیس سیکنڈ کے اندر تشکیل پا گیا۔ میں نے اس سے پوچھا۔

''تم ٹھیک تو ہو؟ میں نے رات تمہیں دیکھا تھا۔ تمہیں یاد ہے؟''

اس نے اپنا سر ہلایا اور بولی۔ ''میں بالکل ٹھیک ہوں۔''

''میرا خیال ہے کہ یہ جگہ باتیں کرنے کے لیے مناسب نہیں۔ تم اندر آ جاؤ۔''

''نہیں، یہیں ٹھیک ہے۔ کیا تمہیں تولیے چاہئیں؟''

''میں واقعی تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں۔''

''شکریہ۔ مجھے جانا چاہیے۔'' یہ کہہ کر اس نے ٹرالی کا ہینڈل پکڑا اور اسے دھکیلتے ہوئے آگے بڑھ گئی۔

میں اس کے پیچھے نہیں گیا۔ مجھے ایسا کرنا بھی نہیں تھا۔ میرے ذہن میں صرف ایک ہی بات تھی کہ مجھے اس کی مدد کرنا ہے، خواہ وہ ایسا چاہے یا نہیں۔ مجھے تو ویسے ہی اپنے بھائی کی جانب سے اس شخص سے معاملہ طے کرنا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ اگر میں اس سے یہ بھی کہہ دیتا کہ آئندہ وہ اس عورت کے ساتھ بدسلوکی نہیں کرے گا تو یہ ایک اضافی بونس ہوگا۔

ہاؤس کیپر اپنے کام میں مصروف تھی۔ وہ ہر دروازے پر دستک دیتی اور اگر کمرا خالی ہوتا تو اس کی صفائی کرنے اندر چلی جاتی۔ میں نے تین دروازے چھوڑ کر اس شخص کے دروازے پر دستک دی لیکن کوئی جواب نہیں آیا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ صبح سویرے کہیں چلا گیا تھا۔ ممکن ہے کہ وہ کہیں ملازمت کرتا ہو یا غریبوں کے نام پر چندہ جمع کر رہا ہو۔ میں نے دروازے پر دوسری اور تیسری بار دستک دی لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ میں دفتر میں گیا اور استقبالیہ پر بیٹھی عورت سے پوچھا۔

''میرے کمرے کے بعد تین دروازے چھوڑ کر جو کمرا ہے، اس میں کون رہتا ہے؟''

"تم اس کے ساتھ کوئی جھگڑا نہیں کرو گے۔"
"شاید اس کی ضرورت پیش آجائے۔ ممکن ہے تم بھی جانتی ہو کہ اس کے اور تمہاری ہاؤس کیپر کے بیچ کیا چل رہا ہے۔"
وہ میرا منہ دیکھنے لگی۔
"اس کو سیدھا کرنا ضروری ہے۔" میں نے کہا۔
"اور جب میں یہاں آیا کروں تو سگریٹ بجھا دیا کرو۔"
"میں تمہیں بتا رہی ہوں کہ اس سے مت الجھنا۔ وہ اچھا آدمی نہیں ہے۔"
"کیا اس وقت وہ کمرے میں موجود ہے؟" میں نے پوچھا۔
اس نے میری بات سنی ان سنی کردی اور منہ پھیر کر دوسری جانب دیکھنے لگی، پھر بولی۔ "تم نہیں جانتے کہ کیا حماقت کررہے ہو۔"
میں نے پھر اپنا سوال دہرایا۔ "کیا اس وقت وہ اپنے کمرے میں ہے؟"
اس نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔
"مجھے چابی دو۔" میرے تصور میں وہ ریوالور آگیا جو اس نے مجھ پر تان لیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اگر وہ اپنے کمرے میں سو رہا ہوگا تو میں دراز میں سے اس کا ریوالور نکال لوں گا۔ اس پر قابو پانے کے لیے اسے نہتا کرنا ضروری تھا۔
"میں ایسا نہیں کرسکتی۔" اس عورت نے کہا۔
"مجھے چابی دو، ورنہ میں دروازہ توڑ دوں گا۔ تم کیا چاہتی ہو؟"
"میں تمہیں چابی نہیں دے سکتی۔"
"ٹھیک ہے۔" یہ کہہ کر میں وہاں سے چل دیا۔ اس وقت میری نگاہوں کے سامنے اپنے بھائی کا چہرہ گھوم رہا تھا۔ اگر اسے معلوم ہوجاتا کہ میں کیا کرنے والا ہوں تو وہ ضرور مجھے روکنے کی کوشش کرتا حالانکہ اسی نے مجھے یہاں بھیجا تھا اور وہ چاہتا تھا کہ میں اپنی طاقت کے بل بوتے پر یہ مسئلہ حل کروں اور اب وہ وقت آگیا تھا جب مجھے اس معاملے کو انجام تک پہنچانا تھا۔
میں نے دروازے پر زوردار لات ماری تو وہ ایک جھٹکے کے ساتھ کھل گیا۔ وہ شخص اٹھ کر بیٹھ گیا اور حیرت سے پلکیں جھپکانے لگا۔ پھر اس کا ہاتھ تیزی سے دراز کی طرف بڑھا لیکن میں نے اسے ریوالور نکالنے کی مہلت نہیں دی اور بڑی سرعت کے ساتھ اس کے منہ پر کاری ضرب لگائی۔ وہ لڑھکتا ہوا بستر کی دوسری جانب جاگرا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن اس کا پاؤں چادر میں الجھ گیا۔ میں نے اسے بالوں سے پکڑ کر اٹھایا اور اس کے پیٹ پر زوردار ضرب لگائی۔ وہ تکلیف کی شدت سے دہرا ہوگیا اور قالین پر گر پڑا۔ میں نے اسے دوبارہ اٹھایا اور اس کے جسم کے مختلف حصوں پر شدید ضربیں لگائیں۔ جب میرا ہاتھ رکا تو وہ بستر پر چت پڑا تھا۔
میں نے غراتے ہوئے کہا۔ "تم ایک گھنٹے کے اندر یہاں سے چلے جاؤ اور دوبارہ پلٹ کر مت آنا۔ اگر تم نے اس عورت سے کوئی رابطہ کیا تو میں تمہیں تلاش کر کے جان سے مار دوں گا۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟"

اس نے میری طرف دیکھا لیکن کچھ بولا نہیں۔ میں نے سفاکانہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ''تمہاری زبان کیوں بند ہوگئی؟ اگر بول نہیں سکتے تو سر ہی ہلا دو۔''

اس نے سر ہلا دیا پھر اس کی آنکھیں بند ہوگئیں۔ میں ایک لمحے کے لیے پریشان ہوگیا لیکن اس کا سانس بالکل ٹھیک چل رہا تھا۔ میں نے اسے اس طرح کروٹ دلائی کہ اس کا سر بستر کے کنارے لٹکا رہے۔ اگر وہ مر بھی جاتا تو کوئی بڑا نقصان نہ ہوتا لیکن یہ میرے پروگرام میں شامل نہیں تھا۔ میں نے دراز کھول کر اس کا ریوالور نکالا اور یہ سوچ کر اپنی قمیص کے نیچے چھپا لیا کہ اس سے بعد میں پیچھا چھڑا لوں گا۔

''ایک گھنٹا......'' میں نے کمرے کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ ''میں دوبارہ آؤں گا۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ تم اپنی منحوس شکل لے کر دفعان ہوئے یا نہیں۔''

میں منہ ہاتھ دھونے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ پھر میں طویل فاصلہ طے کر کے ساحل کی طرف گیا اور پبلک ٹوائلٹ میں جا کر اس ریوالور کی تمام گولیاں فلیش میں بہا دیں۔ پھر میں نے رومال سے ریوالور صاف کر کے اسے ایک چھوٹے تولیے میں لپیٹا اور کسی مناسب جگہ کی تلاش میں چلتا رہا جہاں میں اسے پھینک سکوں پھر مجھے ایک الگ تھلگ جگہ نظر آئی اور میں نے پوری قوت سے بازو گھما کر وہ ریوالور پھینک دیا جو کم از کم چالیس گز دور سمندر میں جا کر گرا۔ اس کے بعد میں سارے راستے اپنے بازو کو سہلاتا ہوا موٹیل واپس آ گیا۔

پارکنگ لاٹ میں ایک کار کم تھی۔ میں نے کمرے کا ٹوٹا ہوا دروازہ کھول کر دیکھا لیکن مجھے وہاں کوئی نظر نہیں آیا۔ اس وقت مجھے ہاؤس کیپر کا خیال آیا۔ یقیناً وہ اس شخص کے جانے کا سن کر خوش ہو رہی ہوگی۔ پھر میں نے اسے ٹرالی سمیت اسٹور روم کی طرف جاتے دیکھا۔ اس نے ٹرالی اندر رکھی اور دروازہ بند کر کے میری طرف آنے لگی۔ شاید وہ صبح کا کام نمٹا چکی تھی۔ میرے پاس سے گزرتے ہوئے مجھ سے نظریں ملائے بغیر وہ مسکرائی اور آگے بڑھ گئی۔ میں اس سے کہنا چاہ رہا تھا کہ تمہاری بہتری کی خاطر میں نے اسے بھگا دیا اور تمہاری مدد کر کے مجھے خوشی ہوئی لیکن کوشش کے باوجود نہ کہہ سکا۔

میں واپس اپنے کمرے میں گیا اور سامان باندھنے لگا۔ اس کام میں مجھے صرف پانچ منٹ لگے پھر میں نے بھائی کو فون کر کے مشن مکمل ہونے کی اطلاع دی۔ وہ یہ سن کر خوش ہو گیا۔ جب میں کمرے سے باہر نکلا تو ہاؤس کیپر کہیں نظر نہیں آئی۔ میں دفتر گیا اور استقبالیہ پر بیٹھی عورت کو بتایا کہ میں جا رہا ہوں۔

''تم نے دو راتوں کا کرایہ دیا تھا۔'' وہ بولی۔ ''ہمارے یہاں واپسی کا رواج نہیں ہے۔''

''کوئی بات نہیں۔ باقی رقم تم رکھ لو۔'' میں نے فیاضی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے۔ ہاں ایک بات اور۔'' اسے جیسے کچھ یاد آ گیا۔ اس نے ایک لفافہ دراز سے نکالتے ہوئے کہا۔ ''یہ کوئی تمہارے لیے چھوڑ گیا ہے۔''

میں دروازے سے باہر قدم رکھ چکا تھا۔ اس کی آواز سن کر واپس آیا اور اس سے وہ لفافہ لے لیا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اس اجنبی جگہ پر کون مجھے خط لکھ سکتا ہے۔ ایک لمحے کے لیے مجھے خیال آیا کہ شاید اس موٹیل کے ممکنہ خریدار نے اس خط کے ذریعے میرا شکریہ ادا کیا ہو کہ میں نے اس شخص کو باہر نکال کر سودے کی راہ میں آنے والی رکاوٹ دور کر دی ہے۔ میں نے لفافہ کھول کر پڑھا لیکن خط کا مضمون میری توقع سے مختلف تھا۔ اس خط میں مجھے ایڈی کے بجائے میرے اصلی نام سے مخاطب کیا گیا تھا اور خواہش ظاہر کی گئی تھی کہ میں کونے پر واقع بار میں اس سے ایک چھوٹی سی ملاقات کر لوں۔ آخر میں نام کی جگہ لکھا تھا۔ ''خریدار۔''

''یہ شخص کون ہے؟'' میں نے استقبالیہ پر بیٹھی عورت سے پوچھا۔ ''اور مجھ سے بار میں کیوں ملنا چاہتا ہے؟''

''تم نے یہ کیسے فرض کر لیا کہ وہ کوئی مرد ہی ہوگا؟''

میں نے ایک بار پھر خط کو غور سے دیکھا۔ شاید وہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ میرے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا تھا کہ وہ کوئی امیر آدمی ہے جو اس موٹیل کو خریدنے کا خواہش مند ہے اور اسی سلسلے میں مجھ سے ملنا چاہ رہا ہے۔ میرے بھائی نے بھی یہی سوچا ہوگا لیکن اس نے یہ بھی کہا تھا کہ اس کی خریدار سے براہِ راست بات نہیں ہوتی بلکہ اب تک ایجنٹ سے ہی بات ہوتی رہی ہے۔

''اچھا تو یہ کوئی عورت ہے۔'' میں نے کہا۔ ''مجھ سے سمجھنے میں غلطی ہوئی لیکن وہ مجھ سے کیوں ملنا چاہتی ہے؟''

''بہتر ہوگا کہ تم خود ہی اس سے مل کر معلوم کر لو۔''

''میں نہیں سمجھتا کہ اس کا کوئی فائدہ ہوگا۔ اسے جو بات کرنی ہے، وہ میرے بھائی سے کرے۔ وہی اس موٹیل کا مالک ہے۔ میں سوچ رہا ہوں کہ اس سے ملنے کے بجائے سیدھا ائرپورٹ چلا جاؤں۔''

''تم مجھے اتنے بزدل تو نہیں لگتے۔'' وہ براہِ راست میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ ''میرا اندازہ ہے کہ اگر تم نے اس کی بات نہ سنی تو یہ ایک بہت بڑی غلطی ہوگی۔''

کاؤنٹر کا عقبی دروازہ کھلا۔ ہاؤس کیپر باہر آئی اور اس عورت کے برابر آ کر کھڑی ہوگئی۔ اب وہ دونوں مجھے دیکھ رہی تھیں۔ میں نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ اس ملاقات کے لیے تھوڑا سا وقت نکال سکتا ہوں۔''

''کیا خیال ہے، ہم دونوں بھی تمہارے ساتھ چلیں؟'' استقبالیہ والی عورت نے کہا۔ ''اس بہانے ہم بھی اپنے نئے مالک سے مل لیں گے۔''

''کیا؟'' میں نے چونکتے ہوئے کہا۔ ''اگر تم دونوں چلی گئیں تو یہاں کون دیکھے گا؟''

''زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ ہم جلد ہی واپس آجائیں گے۔''

میں نے زیادہ بحث کرنا مناسب نہ سمجھا اور بار کی طرف چل دیا۔ وہ دونوں بھی میرے پیچھے آرہی تھیں۔ ان میں سے ایک اوشین وستا کے ریسپشن پر بیٹھتی تھی اور دوسری اسی موٹیل میں ہاؤس کیپر کے فرائض انجام دے رہی تھی۔ مجھے لگا کہ ان کے بارے میں جو پہلی رائے قائم کی، وہ غلط تھی۔ یہ عورتیں وہ نہیں تھیں جو نظر آرہی تھیں بلکہ ان کی حقیقت کچھ اور تھی۔ سارے راستے ان دونوں نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی اور ہم چند منٹوں کی مسافت طے کرنے کے بعد بار تک پہنچ گئے۔

جیسے ہی میں نے بار میں قدم رکھا، مجھے لگا جیسے بہت سی نظریں میرا جائزہ لے رہی ہوں۔ میں ان سب کو نظر انداز کرتا ہوا آگے بڑھا تو ایک شناسا چہرے کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ وہ میرے بھائی کی پہلی بیوی کیرل تھی اور بار کے آخری سرے پر واقع ایک بوتھ میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے مجھے دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور اپنے پاس آنے کا اشارہ کیا۔ میں اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا جبکہ میرے ساتھ آنے والی دونوں عورتیں اس کے دائیں بائیں بیٹھ گئیں۔

''تمہیں دوبارہ دیکھ کر بہت خوشی ہو رہی ہے۔'' میری سابقہ بھابی نے کہا۔ ''ہم کافی عرصے بعد مل رہے ہیں۔''

''یہ سب کیا ہو رہا ہے کیرل؟'' میں نے الجھتے ہوئے کہا۔

''تم میری دوستوں فلورنس اور میلینا سے پہلے ہی مل چکے ہو۔''

دونوں عورتیں مجھے دیکھ کر مسکرانے لگیں۔

''تم انہیں کیسے جانتی ہو؟'' میں نے کہا۔ ''اور یہاں کیوں آئی ہو؟'' میرے ذہن میں بہت سے سوال پیدا ہو رہے تھے۔

''مجھے معلوم ہے کہ اس نے تمہیں بھیجا ہے۔'' کیرل بولی۔ ''یقیناً یہ پہلا موقع نہیں کہ تم نے اس کے لیے کوئی غلط کام کیا ہے۔''

''کیا تم بتانا پسند کرو گی کہ مجھے یہاں کیوں بلایا ہے؟''

''میرا خیال ہے کہ یہ بہت واضح ہے۔'' وہ بولی۔ ''وہ خریدار میں ہوں اور فلورنس میری ایجنٹ تھی جو تمہارے بھائی سے فون پر بات کیا کرتی تھی۔''

فلورنس نے تائید میں سر ہلایا اور پیکٹ سے ایک نیا سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں دبا لیا۔

''تم یہ موٹیل کیوں خریدنا چاہ رہی ہو؟'' میں نے کہا۔ ''اب یہ اپنی قدر کھو چکا ہے اور اگر......''

''میں یہ موٹیل نہیں خریدنا چاہ رہی تھی۔'' وہ میری بات کاٹتے ہوئے بولی۔ ''کیا تمہیں اب بھی یہ اندازہ نہیں ہوا؟''

''پھر یہ سب کیا ہے؟''

''میں کچھ خرید نہیں بلکہ بیچ رہی ہوں۔''

''کیرل! کھل کر بات کرو۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا کہ تم کیا کہہ رہی ہو۔''

اس نے ایک چھوٹے سے بریف کیس میں سے تقریباً اسی سائز کا لیپ ٹاپ نکالا۔ ایک دو بٹن دبائے اور اس کی اسکرین کا رخ میرے سامنے کر دیا۔

''میلینا نے اپنے کمرے میں ویڈیو کیمرا نصب کر رکھا تھا۔ اسے اپنے شوہر کی وفاداری پر شبہ تھا اور وہ اس کی سرگرمیوں پر نظر رکھنا چاہ رہی تھی لیکن اس کے بجائے کیمرے نے جو مناظر ریکارڈ کیے، وہ اس سے بھی زیادہ دلچسپ ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ تم اس سے اتفاق کرو گے۔''

میں نے پہلے میلینا کو دیکھا اور پھر اسکرین پر نظریں جما دیں۔ میں اس کے شوہر کی پٹائی کر رہا تھا اور یہ اتنا صاف اور واضح منظر تھا کہ اسے دوبارہ دیکھنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ مجھے یقین تھا کہ اگر یہ کسی فلم کا سیٹ ہوتا تو ڈائریکٹر فوراً ہی کٹ کا نعرہ لگا دیتا اور کہتا کہ دوسری بار شاٹ لینے کی ضرورت نہیں۔

اس سے پہلے کہ میں کسی احمقانہ حرکت کے بارے میں سوچتا، بار ٹینڈر وہاں آگیا اور بولا۔

''تم لوگ کیا پینا پسند کرو گے؟''

''ابھی نہیں۔ تھوڑی دیر بعد۔'' کیرل نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے۔ جب میری ضرورت ہو تو بلا لینا۔''

اس کے جانے کے بعد کیرل بولی۔ ''تمہیں یہ سمجھانے کی ضرورت تو نہیں کہ یہ ڈیجیٹل مووی ہے اور صرف تین سیکنڈ میں اس کی کاپی پولیس کو بھیجی جاسکتی ہے۔''

''لیکن کیوں؟''

''فی الحال کسی کو اس کی گمشدگی کے بارے میں معلوم نہیں لیکن جلد یا بدیر کوئی نہ کوئی اس کی گمشدگی کا نوٹس لے گا۔ میلینا خود بھی پولیس کو اطلاع دے سکتی ہے اور جب پولیس اس بارے میں تحقیقات کرے گی تو سب سے پہلا شک تم پر ہی جائے گا کیونکہ تم نے فلورنس اور میلینا سے اس شخص کو سبق سکھانے کا کہا تھا اور اس ویڈیو کو دیکھنے کے بعد یہ کیس ایک دلچسپ رخ اختیار کرلے گا۔''

میری نظروں کے سامنے ویڈیو چل رہی تھی پھر مجھے اپنی آواز سنائی دی جو بڑی صاف اور واضح تھی۔ میں اس شخص سے کہہ رہا تھا کہ اگر اس نے کبھی ہاؤس کیپر یعنی میلینا سے ملنے کی کوشش کی تو میں اسے جان سے مار ڈالوں گا۔

''تم یہاں ایک مقصد کے تحت آئے تھے اور اس کے لیے تمہیں کوئی الزام نہیں دیا جاسکتا۔ تم اس شخص کو ڈرا دھمکا کر موٹیل چھوڑنے پر مجبور کرنا چاہ رہے تھے تاکہ موٹیل کو بیچنے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو لیکن تم حد سے آگے بڑھ گئے اور تم نے اسے مار ڈالا۔''

''میں نے اسے نہیں مارا۔''

''ٹھیک ہے، یہ منظر بھی دیکھ لو۔ اس کے بعد تم خود سوچ سکتے ہو کہ پولیس تمہاری بات پر کس حد تک یقین کرے گی۔''

وہ منظر دیکھ کر میرے پیروں تلے زمین نکل گئی۔ میں اس کی دراز سے ریوالور نکال رہا تھا۔ اس کے بعد مجھے یقین ہوگیا کہ پولیس یہ ویڈیو دیکھنے کے بعد میرے ساتھ کیا سلوک کرے گی۔ ویسے بھی میرے ماضی کا ریکارڈ کچھ زیادہ اچھا نہ تھا اور میں متعدد بار غیر قانونی سرگرمیوں میں ملوث پایا گیا تھا۔

میں اتنی آسانی سے ہار ماننے والا نہیں تھا۔ میں نے جارحانہ انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ''اس سے یہ نہیں ثابت نہیں ہوتا کہ میں نے اسے قتل کیا ہے۔''

''یہ ثابت کرنا تمہارا کام ہے۔ یہ ویڈیو اور ان دونوں عورتوں کی گواہی تمہیں مجرموں کے کٹہرے میں لانے کے لیے کافی ہے اور بڑے سے بڑا وکیل بھی تمہیں سزا سے نہیں بچا سکتا۔''

''تم کیا چاہتی ہو؟'' میں نے شکست خوردہ انداز میں کہا۔

''میں نے کہا تھا ناکہ کچھ خریدنے نہیں بلکہ بیچنے آئی ہوں۔ تمہیں مجھ سے ایک سودا کرنا ہوگا۔''

''کیسا سودا؟'' میں نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

''مجھے بیس لاکھ ڈالرز کی ضرورت ہے جو طلاق کی صورت میں مجھے ملنا چاہیے تھے لیکن تمہارا بھائی مسلسل ٹال مٹول کررہا ہے۔ اس کے علاوہ دس دس لاکھ ڈالرز ان دونوں عورتوں کو بھی دینا ہوں گے تاکہ یہ اپنی زبان بند رکھیں۔''

اس کا سارا منصوبہ میری سمجھ میں آگیا۔ کیرل کو موٹیل خریدنے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی بلکہ اس نے یہ سارا چکر میرے بھائی سے رقم اینٹھنے کے لیے چلایا تھا۔ اس مقصد کے لیے اس نے موٹیل کی استقبالیہ کلرک فلورنس اور ہاؤس کیپر میلینا کو اپنے ساتھ ملالیا پھر وہ خود خریدار بن گئی اور فلورنس کو ایجنٹ بنا کر اس کے ذریعے بھائی سے سودے بازی کرنے لگی۔ اس نے شرط عائد کی کہ پہلے اس شخص کو موٹیل سے نکالا جائے جس نے وہاں ہنگامہ بچا رکھا ہے چنانچہ بھائی نے مجھے یہ مسئلہ حل کرنے کے لیے بھیج دیا۔ وہ جانتی تھی کہ میں اس شخص کو بھگانے کے لیے طاقت کے استعمال سے گریز نہیں کروں گا چنانچہ اس نے میلینا کے ذریعے اس کمرے میں کیمرا نصب کروادیا اور اب وہ کہہ رہی تھی کہ میلینا نے اپنے شوہر کی سرگرمیوں پر نظر رکھنے کے لیے وہ کیمرا لگوایا تھا۔ کوئی شخص اتنا بے وقوف نہیں ہوتا کہ رنگ رلیاں منانے کے لیے کسی عورت کو اس جگہ لے کر آئے جہاں اس کی بیوی کام کرتی ہے۔ مجھے تو یہ بھی یقین نہیں تھا کہ وہ شخص واقعی میلینا کا شوہر تھا یا اسے بھی اس ڈرامے میں کردار ادا کرنے کے لیے کرائے پر لایا گیا تھا۔ بہرحال میں اپنی حماقت کے سبب بری طرح پھنس چکا تھا۔ میں نے مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''وہ اتنی بڑی رقم ہرگز نہیں دے گا۔''

''وہ ضرور دے گا۔'' کیرل مسکراتے ہوئے بولی۔ ''تم دونوں کی یہی بات تو قابلِ تعریف ہے کہ ہمیشہ ایک دوسرے کا خیال رکھتے ہو۔ اس کے پاس پیسے کی کوئی کمی نہیں اور وہ تمہاری جان بچانے کے لیے کچھ بھی کرسکتا ہے۔''

میں ایک دو منٹ سوچتا رہا اور صورتِ حال کا ہر زاویے سے جائزہ لینے کی کوشش کی۔ میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ میں نے اپنا سیل فون نکالا اور بھائی کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔

نمائندۂ خاص

کاشف زبیر

اگر کبھی کسان اور کمہار کے تعلق اور ہنر پر غور کیا جائے تو احساس ہوگا کہ انسان کی پیدائش سے لے کر موت اور فنا کے بعد جینے کا پورا فلسفہ جیسے اس دائرے میں مخفی کردیا گیا ہو... جس طرح کمہار کا فن اس کی تخلیق میں اور کسان کی محنت اس کی کھیتی میں ظاہر ہوتی ہے اسی طرح انسان کا ایک ایک لمحہ کسان کے مانند استعمال ہوتا ہے اور کائنات کی ایک ایک تخلیق کمہار کی سوچ کا حسن ہے۔ اسے شاید زندگی کی اتنی گہرائی میں اترنے کا سلیقہ نہیں آتا تھا مگر فقط ایک پل... ہاں صرف ایک پل کا وہ سحر اسے کائنات کے رمز سے روشناس کرا گیا۔ وہ جو زندگی سے خوشیاں کشید کرنے کی عادی تھی اسے کب ادراک تھا کہ کبھی کبھی چھوڑے ہوئے رستوں کو پیچھے پلٹ کر دیکھنا کس قدر ضروری ہو جاتا ہے... جیسے کسان بیج بو کر پھر سے واپس پلٹتا ہے تاکہ اس کا پھل کاٹ سکے۔ یہ اس کا نصیب کہ پھل میٹھا نکلے یا کیڑا لگ جائے۔ بہرحال یہی حقیقت ہے کہ جب کتاب مکمل ہوجاتی ہے تو اختتام لکھنا پڑتا ہے اور اس اختتام میں اس کتاب کا حاصل محفوظ کرنا پڑتا ہے... وہ خوش نصیب تھی کہ اس کی کتابِ زیست کا آخری صفحہ لکھنے کے لیے ایک نمائندہ خاص اس کی مدد کو آگے بڑھا اور کچھ اس طرح انجام لکھا کہ اس کی روح تک سرشار ہوگئی۔

پل پل درد میں ڈوبی...... سطر سطر زندگی کی حقیقت سے پردہ اٹھاتی ایک عبرت اثر داستان

ریحانہ شیشے کی دیوار کے پار باہر کا منظر دیکھ رہی تھی۔ وہ تقریباً پینتیس برس کی خوب صورت اور دلکش عورت تھی۔ خاص طور سے آنکھیں اور ہونٹ بہت دلکش بناوٹ رکھتے تھے۔ گلابی مائل سرخ رنگت اور اخروٹی رنگ کے بال اس کی خوب صورتی میں اضافہ کررہے تھے۔ جسم عمر کی مناسبت سے بھر گیا تھا مگر یہ بھی اچھا لگ رہا تھا۔ وہ اسپتال کے مخصوص لباس میں بھی اچھی لگ رہی تھی مگر اس وقت اس کا چہرہ کسی قدر ستا ہوا تھا آنکھوں کے نیچے حلقے بھی نمایاں ہورہے تھے۔ اس کی وجہ بھی تھی۔ اس نے گزشتہ دن اور رات کا کچھ حصہ بہت اذیت میں گزارا تھا۔ اگرچہ اب وہ تکلیف میں نہیں تھی مگر اس کے اثرات باقی تھے۔ صبح تک وہ نڈھال رہی تھی لیکن اب اس کی حالت کسی قدر بہتر ہورہی تھی۔

ریحانہ نے پہلی بار دو سال پہلے یہ اسپتال دیکھا تھا
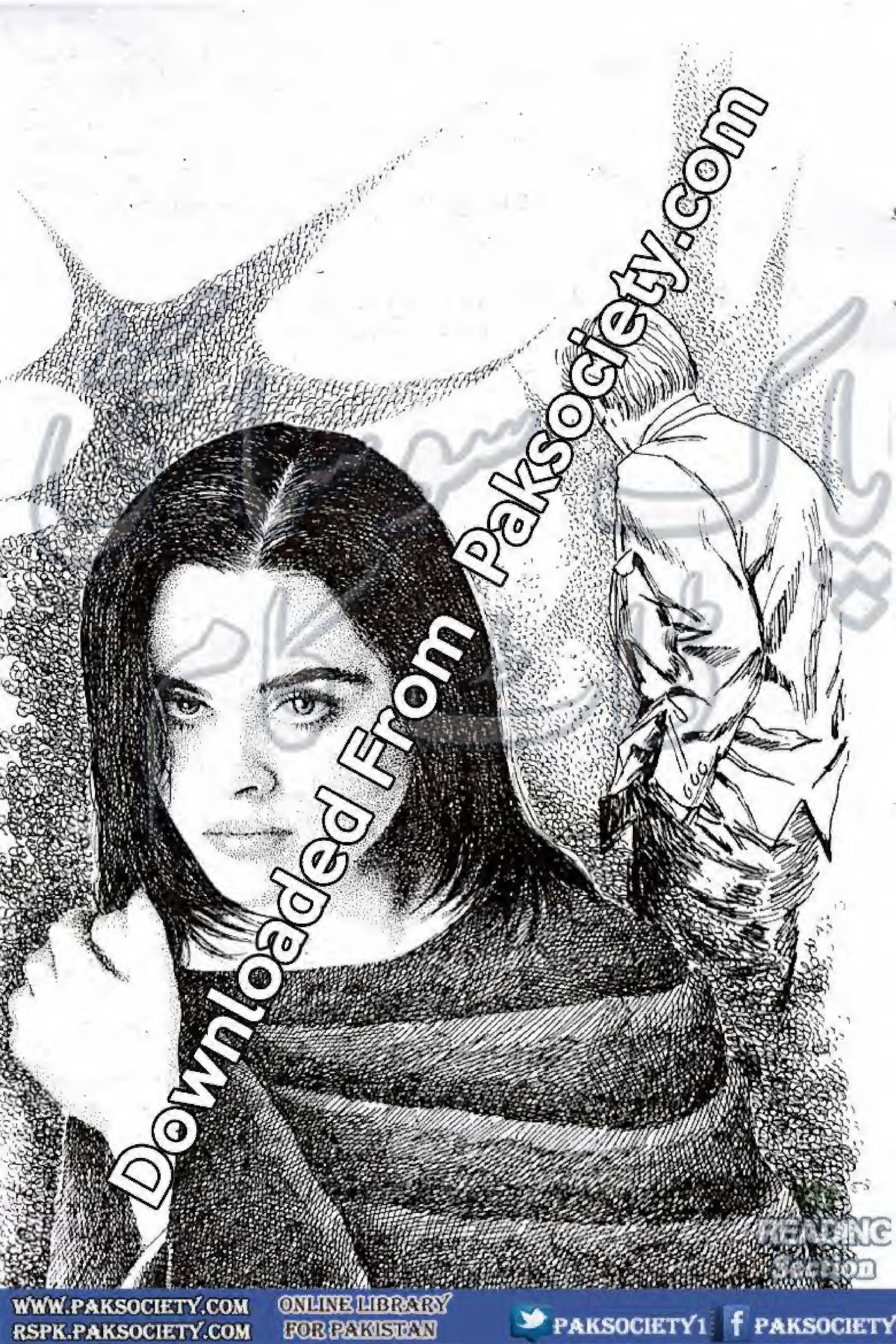
جب وہ عامر کے ساتھ اپنے چھوٹے بیٹے ایان کو یہاں ڈینٹسٹ کے پاس لائی تھی۔ یہ بہت اعلیٰ درجے کا اسپتال تھا۔ صفائی ستھرائی اور علاج معالجے میں اس کا معیار ترقی یافتہ ممالک کے اسپتالوں سے کم نہیں تھا۔ یہاں علاج کے وہ جدید ترین طریقے اور مشینیں موجود تھیں جو دنیا کے کسی اور اسپتال میں ہوسکتی ہیں۔ بہتر تربیت یافتہ اور تجربہ کار ڈاکٹرز، نرسیں اور دوسرا پیرا میڈیکل اسٹاف یہاں کام کرتا تھا۔ سیکیورٹی اور دوسرے کاموں کے لیے بھی بہترین پیشہ ور افراد منتخب کیے جاتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اس کا نظام عام نجی اسپتالوں سے بالکل مختلف تھا جو فیس کے نام پر لوگوں کی کھال تو کھینچتے ہیں مگر وہ اس معیار کا علاج اور سہولتیں فراہم نہیں کرتے۔ یہ اسپتال بھی مہنگا تھا اور یہاں صرف نہایت دولت مند طبقے کے لوگ ہی آسکتے تھے مگر یہ سہولتیں اور علاج بین الاقوامی معیار کا فراہم کرتا تھا۔

ہمارے ہاں طبقۂ امراء باہر جا کر علاج کرانا پسند کرتا ہے کیونکہ اسے اپنے ملک میں موجود نجی اسپتالوں کے معیار اور علاج پر اعتبار نہیں ہے۔ یہی وجہ تھی کہ جب دارالحکومت کے نزدیک وسیع رقبے پر یہ اسپتال بنا تو شروع میں امراء کی توجہ کا مرکز نہیں تھا۔ خاموشی یہاں اب بھی تھی مگر ویرانی ختم ہوگئی تھی۔ آنے والوں کے لیے مخصوص وسیع پارکنگ جو پہلے خالی ہوتی تھی، اب اس میں گاڑیاں نظر آنے لگی تھیں۔

رفتہ رفتہ لوگوں نے آنا شروع کیا اور جیسے جیسے ان کا اعتماد بڑھتا گیا، وہ دوسروں کو بھی لانے لگے اور چند سالوں بعد اسپتال نے اپنے مریضوں کے لیے ایک حلقہ بنا لیا۔ اسپتال میں مریضوں کے علاج کے ساتھ ان کا ریکارڈ رکھنے کے لیے جدید ترین کمپیوٹرائزڈ سسٹم موجود تھا۔ یہاں معمولی نزلے زکام سے لے کر مہلک ترین امراض کا علاج کیا جاتا تھا۔ دانت نکالنے سے لے کر نازک ترین اور پیچیدہ قسم کی سرجریاں کی جاتی تھیں۔ مگر ہر مریض کا چاہے وہ کسی بھی علاج کے لیے آیا ہو، ریکارڈ رکھا جاتا تھا اور اس کی ایک مخصوص فائل بن جاتی تھی۔ کسی بھی قسم کا ٹیسٹ یا چیک اپ ہوتا تو وہ بھی اس فائل کا حصہ بن جاتا۔ یہ تمام چیزیں مریض کے ای ریکارڈ میں شامل کردی جاتی تھیں۔ وہ مریض کسی بھی سلسلے میں اسپتال آتا اور ڈاکٹر سے ملتا تو ڈاکٹر اپنے کمپیوٹر پر اس کی فائل کے ایک مخصوص نمبر سے اوپن کر کے ایک منٹ میں اس کے بارے میں ضروری معلومات حاصل کر لیتا تھا۔

اسپتال اور اس کی عمارتیں دارالحکومت سے کچھ باہر ایک چھوٹی مگر اوپر سے مسطح پہاڑی پر شمال کی طرف جانے والی مرکزی شاہراہ سے کچھ فاصلے پر تھیں۔ آلودگی، آبادی اور ہنگاموں سے دور مگر آس پاس کا منظر نہایت خوب صورت اور ذہن کو تر و تازہ کرنے والا تھا۔ ایمرجنسی اور... او پی ڈی کے لیے داخلی راستے کے ساتھ ہی ایک بڑی کئی منزلہ عمارت تھی۔ اس کا ایک داخلی راستہ اور پارکنگ احاطے سے باہر بھی تھی لیکن وہاں صرف ایمبولینس رک سکتی تھی۔

ماہرین اندر کی ایک عمارت میں بیٹھتے تھے اور وہاں صرف وہی مریض آتے تھے جن کو وہاں بھیجا جاتا تھا۔ کوئی مریض از خود ان سے اپائنٹ منٹ نہیں لے سکتا تھا۔

پھر سرجری، مخصوص طویل دورانیے کے ٹیسٹ اور معائنے کے لیے الگ عمارت تھی۔ ایکسرے اور ریڈی ایشن تھراپی کے لیے بالکل الگ تھلگ عمارت تھی جس کے پاس سے بھی کسی کو گزرنے کی اجازت نہیں تھی۔ یہاں کا عملہ مکمل طور پر حفاظتی لباس میں ہوتا تھا اور مریض کے معاملے میں بھی ساری احتیاطی تدابیر اختیار کی جاتی تھیں۔

ایک عمارت لیب کے لیے مخصوص تھی اور یہاں تمام بنیادی اور پیچیدہ ٹیسٹ کیے جاتے تھے کیونکہ ٹیسٹ کی بنیاد پر مریض کا علاج کیا جاتا تھا اور بعض اوقات اس کی زندگی اور موت کا انحصار ٹیسٹ کی رپورٹ پر ہوتا تھا۔ اسپتال کا ٹرانسپورٹ کا اپنا شعبہ تھا۔ اس میں نصف درجن اعلیٰ درجے کی ایمبولینسیں شامل تھیں جو فوری طبی امداد کے لیے تمام اہم مشینوں اور دواؤں کے ساتھ ہوتی تھیں۔ کال کرنے پر ایمبولینس بیس میل کے دائرے میں صرف پندرہ منٹ میں پہنچ جاتی تھی۔ دارالحکومت کیونکہ اسپتال سے ذرا فاصلے پر تھا اس لیے شہر کے مرکز میں ایک الگ پوائنٹ تھا جہاں سے ایمبولینس مع عملے کے چند منٹ میں کسی بھی جگہ پہنچ سکتی تھی۔ مگر یہ سہولت صرف اسپتال کے رجسٹرڈ افراد کے لیے تھی۔

سرجری یا کسی اور وجہ سے آنے والے جن مریضوں کو صحت کی بحالی کے لیے اسپتال میں رکھا جاتا تھا، ان کے لیے احاطے کے سب سے عقبی حصے میں کمان کی طرح نیم دائرے میں پھیلی ایک عمارت مخصوص تھی۔ عمارت کا جو رخ پہاڑیوں کی طرف تھا، یہاں کمروں کی بیرونی دیوار تقریباً ساری ہی شیشے کی تھی اور صرف پردہ ہٹانے کی دیر ہوتی اور نہایت دلکش منظر سامنے آجاتا۔ اسپتال کے احاطے کو تو سبزے اور پھولوں سے سجایا گیا تھا مگر آس پاس

کا منظر بھی کم دلکش نہیں تھا۔

ریحانہ اسی عمارت کی دوسری منزل کے جس کمرے میں تھی، یہاں ایک جدید ترین اور آرام دہ بیڈ موجود تھا۔اس کے دائیں طرف ایک بٹنوں والا پینل تھا جس سے بیڈ کے سرہانے، پیروں اور درمیانے حصے کی اونچائی کو اپنی مرضی کے مطابق کیا جاسکتا تھا۔ بیڈ کے بائیں طرف وہ تمام جدید طبی مشینیں رکھی تھیں جن کی ضرورت ایمرجنسی میں کسی بھی مریض کو پڑسکتی ہے۔ یہ مشینیں ہر کمرے میں نصب تھیں۔مشینوں کے ساتھ ایک کرسی رکھی تھی جو عام طور سے وزٹ کے لیے آنے والا ڈاکٹر استعمال کرتا تھا۔دائیں طرف عقبی دیوار کے ساتھ ڈرپ اسٹینڈ اور کپڑے بدلنے کے لیے اسکرین رکھی تھی۔ دیوار پر بڑے سائز کا ایل ای ڈی ٹی وی لگا ہوا تھا اور اس کے اوپر کیمرا تھا جس سے چوبیس گھنٹے مریض کی نگرانی کی جاسکتی تھی۔

ریحانہ کو ٹی وی میں دلچسپی نہیں تھی وہ باہر دیکھ رہی تھی۔شیشے کی دیوار کے پار دور تک بلند ہوتی تہ در تہ پہاڑیوں کا سلسلہ بہت حسین لگ رہا تھا۔اس پر کہیں دھند تھی اور کہیں بادل چھا رہے تھے۔جب وہ پہلی بار یہاں آئی تھی تو اس حسین ماحول کو دیکھ کر حیران ہوئی تھی۔اس نے عامر سے کہا کہ اس نے آج تک کسی اسپتال کو اتنا خوب صورت نہیں پایا تھا۔اتفاق سے اس دن صبح سے ہلکی بارش جاری تھی اور جب وہ اسپتال پہنچے تو بارش تھم گئی تھی۔ آسمان پر بادل تھے مگر دن روشن تھا اور ہر چیز بہت صاف اور بہت نکھری ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ اسپتال کے عقب میں دو پہاڑیوں پر بادل تہ در تہ جمع ہو رہے تھے اور دور سے دھنکی ہوئی روئی جیسے دکھائی دے رہے تھے۔ڈپینٹنٹ کے پاس جاتے ہوئے ریحانہ نے عامر سے کہا۔'' آدمی ایسی جگہ مرے تو اسے شاید موت کی تکلیف بھی نہ ہو اور زندگی سے بچھڑنے کا افسوس ہی نہ ہو۔''

اس کی آنکھیں اسی منظر پر مرکوز تھیں مگر یہ منظر صرف اس کی آنکھیں دیکھ رہی تھیں، اس کا ذہن کہیں اور تھا۔وہ سوچ رہی تھی کہ بعض اوقات انسان کے منہ سے نکلنے والے الفاظ ایسے بھی حقیقت بن جاتے ہیں۔شاید اسی لیے بڑے بزرگ کہتے ہیں کہ انسان منہ سے جو بات کہے، سوچ سمجھ کر کہے کیونکہ انسان کو کچھ نہیں معلوم کب قبولیت کی گھڑی آجائے اور اس کے منہ سے نکلنے والے الفاظ سچ بن جائیں۔اس کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا۔سوچتے ہوئے اسے اپنے شوہر اور بچوں کا خیال آیا۔

اسے اپنے خوب صورت اور نہایت پرتعیش سجے سجائے گھر کا بھی خیال آیا۔اس نے کتنے چاؤ سے بنوایا اور پھر اسے سجایا تھا۔اس نے بہت محنت کی تھی۔اسے معلوم تھا کہ پیسا ہوتے ہوئے اسے زحمت کرنے کی ضرورت نہیں ہے مگر یہ اس کے لیے صرف پتھر اور مٹی سے بنا ہوا مکان نہیں تھا، یہ اس کے خوابوں کا بھی گھر تھا جہاں وہ، اس کا شوہر اور اس کے بچے رہتے تھے۔

ریحانہ کی کوٹھی دارالحکومت کے مہنگے ترین علاقے میں تھی۔دو ہزار گز پر بنی یہ کوٹھی فن تعمیر کا شاہکار تھی۔اس کے شوہر عامر نے خاص طور سے اس کی پسند سے بنائی تھی۔ پہلے وہ چھ سو گز کی چھوٹی کوٹھی میں رہتے تھے۔ اگرچہ یہ بھی ان کے لیے کافی تھی اور وہ وہاں خوش تھے۔ پھر ایک دن وہ لانگ ڈرائیو پر نکلے اور اس علاقے سے گزرے جو ابھی جنگل تھا اور اس جنگل میں کہیں کہیں بہت بڑی کوٹھیاں خاموش کھڑی تھیں۔اس علاقے کے عین اوپر پہاڑی سلسلہ تھا اور یہ منظر ریحانہ کے دل میں کھب گیا تھا۔اس نے بے اختیار عامر سے کہا۔'' کاش ہمارا گھر یہاں ہو۔''

عامر اس کا شوہر ہی نہیں محبوب بھی تھا۔وہ ریحانہ سے والہانہ محبت کرتا تھا۔اگرچہ انہوں نے ایک دوسرے کو پہلی بار شادی کی رات ہی دیکھا تھا۔ریحانہ کا تعلق ایک بہت روایتی گھرانے سے تھا جہاں پردے اور اس سے متعلق ادب و آداب کا بہت خیال رکھا جاتا تھا۔اس کے برعکس عامر ذرا ماڈرن گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔مادر پدر آزاد نہیں تھا۔البتہ تصویر دیکھنے کے بعد وہ ریحانہ کو ایک نظر دیکھنے کے لیے کسک محسوس کر کے رہ گیا تھا۔اس نے کتنے ہی حیلے بہانوں سے کوشش کی مگر وہ اس کی ایک جھلک بھی نہ دیکھ سکا۔دیکھنا تو دور کی بات تھی جب اس نے ریحانہ سے فون پر بات کرنے کی کوشش کی تو ریحانہ نے بات کرنے سے انکار کر دیا۔عامر کی خالہ زاد بہن اس کا پیغام لائی تھی اور ریحانہ نے اسی کے توسط سے جواب دیا کہ جب شادی ہو جائے تو وہ اس سے سامنے بٹھا کر جی بھر کر بات کر سکتے ہیں۔اس سے پہلے فون پر بھی بات نہیں ہو سکتی کیونکہ اس کے گھر کا ماحول اور تربیت اس بات کی اجازت نہیں دیتے۔

ماں باپ کے گھر تو وہ سب کی لاڈلی تھی کیونکہ بڑی شاہانہ آپا کے بعد پانچ بھائی ہوئے تھے اور سب سے آخر میں وہ پیدا ہوئی تھی۔وہ پانچ برس کی تھی جب شاہانہ آپا کی

شادی ہوگئی۔ اولاد میں شاہانہ سے زیادہ کسی کی اہمیت نہیں تھی۔ ماں باپ ان کا یوں احترام کرتے اور خیال رکھتے تھے جیسے وہ الگ سے کوئی ہستی ہوں اور وہ اس قابل بھی تھیں۔ ماں باپ اور بہن بھائیوں کا خیال رکھنے والی۔ تیسرے بیٹے کی پیدائش کے بعد خالدہ کی طبیعت بہت خراب ہوگئی تھی تب یہ شاہانہ آپا تھیں جنہوں نے صرف بارہ برس کی عمر میں نہ صرف پورا گھر سنبھالا بلکہ بھائیوں کی بھی ایسی دیکھ بھال کی کہ ان کی مثال دی جانے لگی۔ ماں کی بیماری کی وجہ سے نوزائیدہ حسن کو بھی انہوں نے ہی سنبھالا تھا اور وہ ان سے اتنا مانوس ہوگیا کہ جب خالدہ ٹھیک ہوگئیں، تب بھی وہ شاہانہ آپا کے پاس رہتا تھا اور اپنے سارے کام انہی سے کراتا تھا۔

آپا کی شادی کے بعد وہی سب کی توجہ کا مرکز تھی مگر اس لاڈ پیار اور توجہ نے اسے بگاڑا نہیں تھا۔ وہ پڑھنے میں بہت تیز تھی۔ وہ اسکول میں بھی ضد کرکے داخل ہوئی تھی۔ اب تک اسے گھر میں ایک لڑکی ٹیوشن پڑھانے آتی تھی اور اس نے ریحانہ کو بہت کچھ سکھا دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اسے آغاز سے ہی کلاس ون میں داخلہ ملا۔ داخلے سے پہلے اس کا ٹیسٹ لیا گیا تو اسے اتنا آتا تھا کہ ٹیچر کے مطابق اسے کلاس ٹو میں داخلہ مل سکتا تھا مگر خالدہ نے اسے ون میں داخل کرایا۔ ان کے خیال میں اگر لڑکیاں جلد پڑھ لیں تو لوگ انہیں عمر میں بڑا سمجھتے ہیں۔ ریحانہ کے والد ضمیر احمد اس لیے راضی ہوگئے کہ ان کے نزدیک تعلیم صرف ڈگری کا نام نہیں تھا۔ ان کے خیال میں تعلیم اس عرصے کا نام ہے جو آدمی کسی انسٹی ٹیوٹ میں گزارتا ہے اور وہ یہیں سے سب سیکھتا ہے۔ یہ انسان کی زندگی کا خوب صورت دور ہوتا ہے اور اس کا کوئی حصہ کم کرنا اس سے زیادتی ہوتی ہے۔

سب کی لاڈلی ہونے کے باوجود اس میں ناز نخرے نہیں تھے۔ کم عمری میں وہ باپ اور بھائیوں کے بہت سے کام کرنے لگی تھی۔ چھوٹی سی عمر سے اسے احساس ہونے لگا کہ اسے ماں باپ اور بھائیوں کی اس محبت کا جواب دینا چاہیے۔ بارہ برس کی عمر میں ملازمہ ہونے کے باوجود اس نے ماں کا ہاتھ بٹانا شروع کردیا تھا۔ رات کے کھانے کے بعد ڈائننگ ٹیبل کی صفائی اس نے اپنے ذمے لے لی تھی۔ بھائی سارا دن نشست گاہ میں آتے جاتے اور وہاں چیزیں پھیلاتے تھے۔ ریحانہ انہیں اپنی جگہ رکھتی تھی۔ جب شاہانہ آتی تو اس کا زیادہ تر وقت اپنے بھانجوں کے ساتھ گزرتا تھا۔ اسے اپنے دونوں بھانجوں سے بے تحاشا پیار تھا۔ دونوں جڑواں اور ہم شکل تھے۔ شاہانہ کو شادی کے پانچ سال بعد جڑواں بیٹے ملے تھے۔ ریحانہ میں خالہ والی محبت کچھ زیادہ ہی تھی۔ عمر اور سعد بھی اس سے ہی چمٹے رہتے تھے۔

جب اسے گھر میں ٹیوشن لگادی تو خالدہ نے ساتھ ہی اس کی دینی تعلیم کا بھی بندوبست کردیا تھا۔ فاطمہ بی بی جو مستند عالمہ تھیں، اسے پڑھانے کے لیے آنے لگیں۔ پہلے اسے قرآن ناظرہ اور روزمرہ کی دعائیں اور دین سے متعلق ادب وآداب سکھائے۔ قاعدے سے فارغ ہوتے ہوئے وہ بہت کچھ سیکھ چکی تھی۔ پھر اس نے باقاعدہ قرآن کریم پڑھا۔ فاطمہ بی بی سے کسی حد تک عربی بھی سیکھی اور تمام اہم آیات اور سورتوں کا ترجمہ وہ سمجھنے لگی تھی۔ فاطمہ بی بی نے اسے صرف دین ہی نہیں بلکہ دین کی سمجھ بھی سکھائی تھی۔ انہوں نے اسے صرف چار سال پڑھایا مگر جو پڑھایا، وہ اس کے ذہن میں نقش ہوگیا اور تمام عمر اس کے کام آیا۔ یہ تعلیم اور تربیت اہم ترین معاملات میں اس کی راہنمائی کرتی رہی تھی۔ چار سال بعد فاطمہ بی بی اچانک ہی بیمار پڑیں اور جب ریحانہ، خالدہ کے ساتھ انہیں دیکھنے گئی تو وہ بس آخری وقت میں تھیں مگر خوش تھیں کہ انہیں صرف خاتونِ جنت کا نام ہی نہیں ملا تھا بلکہ وہ تقریباً ان کی ہی عمر میں انتقال بھی کررہی تھیں۔

تمام تر مصروفیات کے باوجود ریحانہ پڑھنے پر پوری توجہ دیتی تھی۔ اسے جنون تھا کہ وہ اپنی کلاس میں کسی سے پیچھے نہ رہے۔ جیسے جیسے عمر بڑھتی رہی وہ... ازخود زیادہ ذمے داریاں لیتی رہی۔ بڑے بھائیوں کی شادیاں ہوئیں اور بھابیاں آئیں تو ان کے ساتھ کی مصروفیت الگ تھی۔ اس کے باوجود اس نے اپنے تعلیمی معیار میں کمی نہ آنے دی۔ اس نے معمول بنایا ہوا تھا کہ سارے دن کی مصروفیت کے بعد وہ رات کو سونے سے پہلے لازمی دو ڈھائی گھنٹے پڑھتی تھی۔ وہ صرف ہوم ورک ہی مکمل نہیں رکھتی تھی بلکہ آنے والے اسباق کو بھی ازخود سمجھنے کی کوشش کرتی۔ جب کلاس میں ٹیچر سبق دے رہی ہوتی تھیں تو وہ سب لڑکیوں سے پہلے ہی سمجھ جاتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ہر بار فرسٹ آتی تھی اور صرف ایک بار ایسا ہوا تھا کہ وہ کلاس میں فرسٹ نہیں آئی تھی۔ میٹرک میں اس کی دوسری پوزیشن آئی تھی۔

لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑا۔ اسے شہر کے بہترین کالج میں داخلہ ملا۔ یہ گرلز کالج تھا۔ صحیح معنوں میں اسے جوانی کا احساس کالج میں آکر ہوا۔ ایک تو انسٹی

ٹوٹ بدلا تھا اور دوسرے ماحول بدل گیا تھا۔ اس کے ساتھ آنے والی لڑکیاں وہی پندرہ سولہ اور سترہ سال کی تھیں مگر اگلی کلاسوں کی لڑکیاں نہ صرف بڑی عمر کی تھیں بلکہ بہت سی ایسی باتوں سے بھی واقف تھیں جن سے ریحانہ اور اس کے ساتھ آنے والی بہت سی لڑکیاں ناواقف تھیں۔ چند دن بعد اس کا لڑکیوں سے تعارف ہوا اور کچھ اس کے ساتھ اسکول سے بھی گئی تھیں۔ ان کی وجہ سے حلقۂ دوستی مزید وسیع ہوا تو ریحانہ کو بھی بہت کچھ معلوم ہونے لگا۔ یہ اضافی معلومات جنس کے بارے میں تھی۔ ریحانہ ان سے تقریباً ناآشنا تھی۔

لڑکیوں کی گفتگو کا موضوع لڑکے اور لڑکیوں سے ان کے تعلقات ہوتے تھے۔ وہ ان تعلقات کی نزاکتوں کو چٹخارے دار انداز میں بیان کرتی تھیں۔ شروع میں تو ریحانہ نے ان باتوں پر توجہ نہیں دی۔ جب لڑکیاں آپس میں اس قسم کی گفتگو کرتیں تو وہ اپنی کسی دوست کے ساتھ تعلیم یا کسی عمومی موضوع پر بات کرنے لگتی مگر جب آس پاس کوئی بات ہو رہی ہو تو انسان نہ چاہتے ہوئے بھی سن لیتا ہے۔ اسے الجھن ہونے لگی۔ اس کا مزاج اور ذہن ایسی باتوں کو اچھا نہیں سمجھتا تھا۔ جب الجھن بڑھی تو وہ ایسی باتیں کرنے والی لڑکیوں سے دور ہونے لگی۔ اس نے چند لڑکیوں پر مشتمل ایک گروپ بنا لیا جو سادہ مزاج تھیں اور کالج میں صرف تعلیم حاصل کرنے آتی تھیں۔ وہ مل کر اسٹڈی کرتیں۔ نوٹس تیار کرتیں۔ لائبریری جاتیں یا اگر فارغ ہوتیں تو کینٹین میں جمع ہو جاتیں۔ اس گروپ بندی کے بعد ریحانہ کا وقت کالج میں اچھا گزرا اور اس نے بہت امتیاز کے ساتھ گریجویشن پاس کیا۔

ریحانہ کا خاندان تعلیم یافتہ اور تعلیم کو اہمیت دینے والا تھا مگر خاندان کی لڑکیاں عام طور سے کالج سے آگے نہیں جاتی تھیں۔ جو دو لڑکیاں آگے گئیں وہ بھی میڈیکل کالج میں داخل ہوئیں اور یونیورسٹی کی سطح پر کسی نے تعلیم حاصل نہیں کی تھی۔ ریحانہ نے گریجویشن میں سوشیالوجی کو بہ طور مضمون لیا اور اس میں اسے اتنی دلچسپی ہوئی کہ اسے ماسٹر کرنے کا خیال آیا مگر اس سے پہلے کوئی مثال نہیں تھی کہ خاندان کی کوئی لڑکی یونیورسٹی میں پڑھنے گئی ہو کیونکہ وہاں مخلوط نظام تعلیم ہوتا ہے اور اس کے گھر میں اس کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ اس لیے ریحانہ بات کرتے ہوئے ہچکچا رہی تھی۔ پہلے اس نے سوچا کہ آپا کے توسط سے بات کرے مگر اسے مناسب نہیں لگا۔ اس کا شروع سے خیال تھا کہ دنیا میں انسان کا ماں باپ سے زیادہ مخلص اور کوئی نہیں ہوتا۔ احترام اپنی جگہ مگر انسان ماں باپ سے ہر بات کر سکتا ہے اور وہی اس کی بات سب سے بہتر سمجھتے ہیں۔ اس لیے اس نے پہلے ماں سے بات کی اور ان کے توسط سے اپنی بات باپ تک پہنچائی۔ ضمیر احمد نے اسے بلایا۔

''آپ آگے پڑھنا چاہتی ہیں؟''

''جی بابا۔''

''کوئی خاص وجہ؟''

''بابا! میرے خیال میں انسان جتنا پڑھے کم ہے۔ میں آپ کی اور امی کی شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے بہترین دینی اور دنیاوی تعلیم سے آراستہ کیا۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو مجھے ماسٹر کرنے کی اجازت دے دیں۔ میں صرف اپنے علم میں اضافہ چاہتی ہوں لیکن آپ کی مکمل رضامندی کے ساتھ۔''

ضمیر احمد خوش ہو گئے۔ ''بیٹا میری طرف سے اجازت ہے لیکن اب تم اپنی ماں سے پوچھ لو اس کی رضامندی بھی اتنی ہی ضروری ہے جتنی کہ میری رضامندی۔''

خالدہ مسکرائی۔ ''میری رضا آپ کی رضا میں ہے۔ آپ نے اجازت دے دی تو بس کافی ہے۔ سمجھیں میں نے بھی دے دی۔''

یوں وہ ماسٹر کے لیے یونیورسٹی میں آگئی۔ اس نے سوشیالوجی منتخب کی تھی۔ یہ مضمون اس کے مزاج کے مطابق تھا۔ اسے دوسروں کے کام آنا اچھا لگتا تھا۔ کالج میں اس نے فلاحی کاموں میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا بلکہ اپنی ساتھی لڑکیوں کے ساتھ مل کر ایک این جی او بھی بنائی تھی جو استعداد نہ رکھنے والے غریب بچوں کی تعلیم کا بندوبست کرتی تھی۔ ریحانہ کی پاکٹ منی کا بیشتر حصہ اسی کارِ خیر میں خرچ ہو جاتا تھا۔ یونیورسٹی میں اس نے مضمون ہی سوشیالوجی کا لیا تھا اور یہاں بھی اس نے فلاحی کاموں کو مقصد سمجھ کر جاری رکھا۔ وہ صرف ڈگری کے لیے فیلڈ ورک نہیں کر رہی تھی۔ جلد یہاں بھی اس نے چند ساتھیوں کے ساتھ مل کر اپنی این جی او کو دوبارہ آرگنائز کر لیا اور اس کے تحت بچوں کی تعلیم کے لیے کام کرنے لگی۔ کچھ عرصے تک وہ بنا کسی اسکول کے کام کرتی رہیں۔

پھر ایک ریٹائرڈ پروفیسر بھی ان کے ساتھ شامل ہو گئے تھے اور انہوں نے شہر کے نواح میں اپنی بڑی سی خاندانی حویلی اسی کام کے لیے مخصوص کر دی تھی۔ اس

علاقے میں کئی گاؤں تھے جہاں رہنے والے اکثر افراد اپنی غربت کی وجہ سے اپنے بچوں کو پڑھانے سے قاصر تھے۔ وہاں کوئی سرکاری اسکول بھی نہیں تھا۔ ایسے میں پروفیسر صاحب کا اسکول یہاں کے بچوں کی تعلیم کا واحد ذریعہ بن گیا مگر پروفیسر صاحب اکیلے یہ سب نہیں کر سکتے تھے، انہیں دوسروں کی مدد کی بھی ضرورت تھی۔ علاقے کے چند ریٹائرڈ ٹیچر رضا کارانہ بچوں کو پڑھانے لگے تھے۔ ریحانہ اور اس کے ساتھی ان بچوں کے لیے کتابیں اور دوسرا سامان مہیا کرتے تھے۔ مہینے میں دوبارہ وہ چھٹی کا ایک پورا دن اسکول میں گزارتی تھی جہاں وہ اور اس کے ساتھی بچوں کو معاشرتی تعلیم دیتے تھے۔

گریجویشن کے دوران ہی اس کے رشتے آنا شروع ہوگئے تھے مگر خالدہ اور ضمیر احمد نے سوچ لیا تھا کہ جب تک وہ پڑھ رہی ہے اس وقت تک وہ اس کے لیے کسی رشتے پر غور نہیں کریں گے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ریحانہ کے ذہن پر کسی قسم کا بوجھ آئے۔ اس لیے وہ آنے والوں کو انکار کرتے رہے۔ حالانکہ ان میں کئی بہت اچھے رشتے بھی تھے۔ ان میں ایک اس کے چچا زاد مقصود کا رشتہ بھی تھا۔ مقصود آرمی میں کیپٹن تھا۔ انکار کے بعد کچھ عرصے ضمیر احمد کے بھائی سے تعلقات کشیدہ رہے مگر انہوں نے ریحانہ کے سامنے کسی کی پروا نہیں کی۔ بھائی نے ضمیر احمد پر بہت زور ڈالا کہ وہ صرف ہاں کردے۔ کوئی رسم بھی نہ کرے مگر انہوں نے ہاں بھی نہیں کی۔ بھائی سے کہا۔ ”آپ کیا سمجھتے ہیں کہ ہاں کرنا اور کیا ہوتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ میری بیٹی اپنا حال اپنے مستقبل سے بے نیاز ہوکر گزارے۔ آپ اگر چاہیں تو اس کی تعلیم مکمل ہونے کا انتظار کرلیں۔“

بھائی نے خفا ہوکر کہا۔ ”ایسا لگتا ہے تم ریحانہ کی شادی اس کی مرضی سے کرنا چاہتے ہو۔“

”اگر ایسا ہوا تو اس میں بھی کوئی برائی نہیں ہے۔ یہ حق اسے ہمارے مذہب نے دیا ہے۔“

مگر یہ بات کہتے ہوئے ضمیر احمد کو یقین تھا کہ ریحانہ کبھی اس معاملے میں اپنی مرضی نہیں کرے گی۔ ان کے بھائی نے اتنا طویل انتظار کرنے سے انکار کردیا تھا۔

☆☆☆

شہباز سعد ریحانہ کے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھتا تھا اور بہت دلکش اور چھا جانے والی شخصیت کا مالک تھا۔ کسی قدر طویل قامت، چوڑے شانے اور ورزشی جسم کے ساتھ وجیہہ نقوش اور براؤن گھنگرالے بالوں کی وجہ سے اسے مسٹر یونیورسٹی کا لقب ملا ہوا تھا۔ اس نے پہلے اردو ادب میں ماسٹر کیا تھا اور اب انگریزی ادب میں کر رہا تھا۔ دونوں بار ادب کا انتخاب اس لیے کیا کہ ادبی ذوق رکھتا تھا۔ کمانے کی اسے فکر نہیں تھی کہ اس کا خاندان جدی پشتی جاگیردار تھا۔ دولت اتنی تھی کہ اس کے باپ نے صرف اس کی رہائش کے لیے دارالحکومت میں بہت بڑی کوٹھی لی تھی اور یہاں اس کی دیکھ بھال کے لیے چھ ملازم تھے۔ یونیورسٹی آنے جانے کے لیے وہ نئے ماڈل کی مرسڈیز گاڑی استعمال کرتا تھا۔ یونیورسٹی میں اس کے ٹھاٹ باٹ دیکھنے والے ہوتے تھے۔ خرچ کرتے ہوئے رقم کی پروا نہیں کرتا تھا۔ اس کے باوجود اس میں غرور نام کو نہیں تھا۔ سب سے یکساں انداز میں ملتا۔ اس کے دوستوں کی اکثریت متوسط طبقے سے تعلق رکھتی تھی۔ وہ ان کے ساتھ بے تکلفی سے یونیورسٹی کیفے ٹیریا میں پایا جاتا تھا۔

ریحانہ اسے اچھی طرح جانتی تھی مگر اس نے کبھی اس کے بارے میں سوچا نہیں تھا۔ اس سے بس چند ایک بار ہی ملاقات ہوئی تھی۔ وہ بھی کچھ اور معاملات میں مگر ادھر اس نے فائنل کے پیپرز دیے اور ادھر شہباز کا رشتہ اس کے لیے آگیا۔ ضمیر احمد اور خالدہ اب ریحانہ کی شادی کرنا چاہتے تھے مگر وہ یہ توقع نہیں کر رہے تھے کہ اس کا کوئی رشتہ اس یونیورسٹی سے بھی آئے گا جہاں وہ پڑھتی تھی اور قدرتی طور پر ان کے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا کہ رشتہ آنے میں ریحانہ کی بھی مرضی شامل ہوگی۔ ان کے خاندان میں آج تک ایسا ہوا نہیں تھا۔

اگرچہ دونوں ہی میاں بیوی فکر مند تھے مگر ضمیر احمد زیادہ فکر مند تھے کیونکہ ان کے بھائی سے تعلقات بڑی مشکل سے بہتر ہوئے تھے اور انہیں جب پتا چلتا کہ ریحانہ کے ساتھ پڑھنے والے لڑکے کا رشتہ اس کے لیے آیا ہے تو نہ جانے ان کا کیا ردعمل ہوتا۔ ضمیر احمد نے بیوی سے کہا کہ وہ اس بارے میں ریحانہ سے پوچھے اور خالدہ نے پہلا سوال اس سے یہی کیا۔ ”ریحانہ! کیا اس نے تیری مرضی سے رشتہ بھیجا ہے؟“

وہ حیران ہوئی۔ ”بالکل نہیں امی، میں اسے جانتی ضرور ہوں۔ چند ایک بار ہمارے درمیان بات بھی ہوئی اور بس.....“

ریحانہ کی ماں نے فوراً اس پر اعتبار کرلیا کیونکہ اس نے آج تک گھر میں جھوٹ نہیں بولا تھا۔ ان کے خاندان میں آج تک کسی لڑکی نے پسند کی شادی نہیں کی تھی۔ اس لیے اگر ریحانہ اقرار کرلیتی تو شاید مشکل ہوجاتی لیکن

ریحانہ نے انکار کر دیا تھا اس لیے اب رشتے کا تکنیکی بنیادوں پر جائزہ لیا گیا۔ شہباز میں شخصیت، تعلیم اور خاندان کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔ اس کا کردار بہت اچھا تھا۔ یونیورسٹی میں ریحانہ نے کبھی اس کا کوئی اسکینڈل نہیں سنا تھا۔ لڑکیاں ضرور اس کے پیچھے جاتی تھیں مگر وہ خود کسی لڑکی کے پیچھے جاتا ہوا نظر نہیں آیا تھا۔ اس کے کریکٹر پر کوئی دھبا نہیں تھا۔ ماں کے دوبارہ پوچھنے پر ریحانہ نے ہاں یا نہ کا اختیار ان کو دے دیا۔ پھر معاملات تیزی سے بڑھ رہے تھے کہ اچانک ہی ریحانہ نے شہباز کے رشتے سے انکار کر دیا۔ ماں حیران رہ گئی۔ ''ہمارے خیال میں تو یہ مناسب رشتہ ہے تب تو کیوں انکار کر رہی ہے؟''

اس نے رسانیت سے کہا۔ ''امی! مانا کہ میری شادی گھر والوں کی مرضی سے ہونی ہے۔ مگر میری شادی میری مرضی سے بھی ہونی ہے اور میں اس رشتے کے لیے راضی نہیں ہوں اس کے علاوہ آپ جہاں چاہیں میری شادی کر سکتے ہیں۔''

ریحانہ نے معقول بات کی تھی۔ خالدہ پھر بھی فکرمند رہی۔ ''مگر بات آگے جا چکی ہے۔''

''آپ کہہ سکتی ہیں کہ میں راضی نہیں ہوں۔''

ریحانہ کے باپ کو پتا چلا تو اس نے کہا۔ ''اگر میری بیٹی راضی نہیں ہے تو میں بھی راضی نہیں ہوں۔''

یوں یہ بات سہولت سے بنا کسی شور شرابے کے ختم ہو گئی۔ اس کے چند مہینے بعد شہباز کی شادی ہو گئی اور اس کی شادی کے صرف تین مہینے بعد ہی ریحانہ بھی بیاہ کر عامر کے گھر آ گئی۔ عامر مناسب شکل و صورت کا آدمی تھا مگر اس نے ریحانہ کو اتنی محبت اور مان دیا تھا کہ وہ اس کا محبوب بن گیا۔ جب وہ اسے دیکھتی تو اسے لگتا کہ دنیا میں اس سے خوبرو مرد کوئی نہیں ہے۔ وہ اس کی ایسی دیوانی ہوئی کہ گھر میں کئی ملازموں کے ہوتے ہوئے بھی اس کی ایک ایک چیز کا خود خیال رکھنے لگی۔ عامر ایک صنعت کار تھا۔ اس نے چھوٹے پیمانے پر کام شروع کیا تھا اور آج اس کی کئی فیکٹریاں تھیں۔ اس کے پاس دولت کی کمی نہیں تھی۔ وہ ریحانہ سے کہتا کہ وہ کیوں اتنے کام کرتی ہے۔ یہ کام تو کوئی ملازم بھی کر سکتا ہے مگر ریحانہ نہیں مانتی۔ اس نے ایک بار عامر سے کہا۔ ''آپ نے شادی کے بعد مجھے ایسی محبت دی اور سب سے بڑھ کر اپنا اعتماد دیا۔ اگر میں آپ کا ایک ایک کام اپنے ہاتھ سے کروں تب بھی شاید آپ کی محبت کا حق ادا نہ کر سکوں۔''

عامر ہنسا۔ ''اوہ مائی گاڈ! تم تو سکسٹی کی فلمی ہیروئنوں جیسی بات کر رہی ہو۔''

''آپ فلمی ہیروئنوں کا حوالہ نہ دیا کریں۔ ہمارا دین عورت کو شوہر کی اطاعت اور خدمت کرنے کا حکم دیتا ہے۔''

عامر نے جلدی سے معذرت کی۔ ''سوری اگر تمہیں یہ بات بری لگی تو۔''

''آپ سوری بھی نہ کہیں۔'' ریحانہ نے محبت سے کہا۔ ''آپ کو تو بہت زیادہ اختیار حاصل ہے۔''

شادی کے شروع دنوں کا جوش اور والہانہ پن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یوں گہری محبت میں بدلتا گیا جیسے پُرشور دریا وسیع اور پُرسکون سمندر کا روپ دھار لیتے ہیں۔ ان کا شور اور جوش تو ختم ہو جاتا ہے مگر گہرائی ناقابلِ پیمائش ہو جاتی ہے۔ ریحانہ اور عامر کے تین بچے تھے۔ بڑی بیٹی اور پھر دو بیٹے تھے۔ تمام بچے شادی کے شروع سالوں میں ہوئے تھے۔ اس لیے ریحانہ کا چھوٹا بیٹا ایان بھی اب گیارہ سال کا ہو چکا تھا اور اس وقت وہ چھٹی کلاس میں تھا۔ اس سے ایک سال بڑا نعمان ساتویں جماعت میں تھا اور اس سے ایک سال بڑی آئینہ آٹھویں میں تھی۔ اس کے تینوں بچے دارالحکومت کے اعلیٰ ترین اسکول میں پڑھتے تھے جہاں ایک بچے کی فیس اور دوسرے اخراجات ایک متوسط خاندان کے سارے مہینے کے خرچ سے زیادہ تھے۔ مگر یہاں تعلیم کا معیار بھی بلند تھا۔ اسکول کے ساتھ دینی تعلیم کے لیے بچوں کو گھر میں ایک مولانا صاحب بھی پڑھانے آتے تھے۔

ریحانہ نے عامر کے ساتھ ساتھ بچوں کی بہت سی ذمے داریاں بھی اپنے اوپر لی ہوئی تھیں جو اس کے طبقے میں عام طور سے ملازموں یا بچوں پر چھوڑ دی جاتی ہیں۔ وہ باقاعدگی سے ان کی اسکول پروگریس دیکھتی تھی۔ ان سے پوچھتی اور مناسب سمجھتی تو ان سے ٹیسٹ بھی لیتی۔ اگر اسے محسوس ہوتا کہ کوئی بچہ کسی مضمون میں کمزور ہے تو وہ اسکول انتظامیہ سے رابطہ کرتی۔ گھر میں بچے ٹیوشن نہیں پڑھتے تھے کیونکہ انہیں سب کچھ اسکول میں ہی پڑھایا جاتا تھا۔ ہوم ورک کا اس اسکول میں رواج نہیں تھا۔ اسی طرح ریحانہ بچوں کی دینی تعلیم پر بھی نظر رکھتی تھی۔ وہ بہت کچھ جانتی تھی۔ اس حوالے سے بچوں پر نظر رکھتی تھی۔ وہ سب نماز پڑھتے تھے۔ اسی طرح کھانے پینے، اٹھنے سونے اور دوسرے معاملات میں ہمارا دین ہمیں جو ادب و آداب اور دعائیں سکھاتا ہے، وہ اس پر پوری طرح عمل کرتے

تھے۔ اگر کہیں کوئی کمی ہوتی تو ریحانہ انہیں ٹوکتی اور پھر مولانا صاحب سے بات کرتی تھی۔ بچوں کی مسلسل نگرانی نے انہیں بھی الرٹ کر رکھا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ ماں ان سے سوال کرے گی۔ وہ خاص طور سے آئینہ پر توجہ دیتی تھی۔ ایک تو وہ لڑکی تھی اور دوسرے بلوغت کی عمر سے گزر رہی تھی۔

☆☆☆

شیشے کی دیوار کے پار دیکھتے ہوئے وہ سب اسے بہت یاد آرہے تھے۔ حالانکہ وہ ابھی کچھ دیر پہلے ہی اس کے پاس سے ہو کر گئے تھے مگر اسے یوں یاد آرہے تھے جیسے نہ جانے کتنے عرصے سے اس نے ان کو دیکھا بھی نہ ہو۔ شاید اس لیے کہ اب اس کے پاس زیادہ وقت نہیں تھا۔ دو مہینے پہلے اسے شدت سے چکر آنے لگے۔ اگرچہ یہ اس کے لیے نئی بات نہیں تھی۔ اس سے پہلے بھی جب شادی کے بعد اس نے ایک بہت مشکل وقت گزارا اور اس کی طبیعت خراب ہوئی تھی تو یہ چکر اس کی زندگی کا ایک حصہ بن گئے تھے۔ عامر نے اس کا علاج کرایا جس سے عارضی افاقہ بھی ہوتا مگر پھر جلد چکر دوبارہ شروع ہو جاتے۔ ڈاکٹروں کے مطابق مسلسل اعصابی کشیدگی نے دماغ کے ان حصوں کو نقصان پہنچایا تھا جو حواس برقرار رکھتے ہیں۔ جب ان حصوں پر دباؤ آتا تو اسے چکر آنے لگتے تھے۔ یہ چکر چند سیکنڈ سے زیادہ نہیں آتے تھے۔ ایسے میں ریحانہ جہاں ہوتی، وہیں بیٹھ جاتی۔ شروع میں وہ ڈرائیونگ کرتی تھی مگر چکر شروع ہونے کے بعد عامر نے اس کی ڈرائیونگ پر پابندی لگا دی تھی۔ اب وہ ڈرائیور یا عامر کے ساتھ ہی کہیں جاتی تھی۔ دو مہینے پہلے چکر زیادہ شدت سے آنے لگے اور پہلی بار ایسا ہوا کہ وہ بلیک آؤٹ کا شکار ہونے لگی۔ دماغ کی اسکرین سے سب کچھ غائب ہو جاتا اور اسے چند سیکنڈ کے لیے کچھ پتا نہیں چلتا کہ آس پاس کیا ہو رہا ہے۔ عامر کو پتا چلا تو وہ فکرمند ہو گیا۔ بلیک آؤٹ کے ساتھ ساتھ سر کے وسطی حصے میں درد کی لہریں سی اٹھتی تھیں۔ ان کا دورانیہ بھی کم ہوتا تھا مگر شدت ایسی ہوتی کہ ریحانہ چیخ اٹھتی۔ عامر اسے اسپتال لایا اور یہاں جنرل فزیشن نے اس کی کیفیت سنتے ہی اسے ڈاکٹر صفدر کو ریفر کر دیا اور ڈاکٹر صفدر نے اسے بتایا کہ اس کے دماغ میں موجود رسولی ٹرمنل کینسر میں بدل چکی ہے۔ ریحانہ اس اصطلاح کا مطلب سمجھتی تھی، اس نے حوصلے سے کہا۔

''اس کا مطلب ہے کہ اب میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے؟''

ڈاکٹر صفدر صدیق نہ صرف ملک بلکہ دنیا کے چند گنے چنے ماہر ترین نیورولوجسٹ میں شمار ہوتے تھے۔ ان کے تجربے نے انہیں بتا دیا کہ معاملہ سنگین ہے مگر ٹیسٹ لازمی تھے۔ ریحانہ کے تمام ٹیسٹ اور کینسر کی تشخیص ان کی نگرانی میں ہوئی تھی۔ غلطی کا موہوم سا امکان ختم کرنے کے لیے اس کا تھری ڈی ایم آئی آر دو بار ہوا اور دونوں بار ایک ہی نتیجہ نکلا۔ کینسر نہ صرف ناقابل سرجری حصے میں تھا بلکہ یہ اس قدر بڑھ گیا تھا کہ کیموتھراپی یا کسی اور طریقے سے بھی اس کا علاج ممکن نہیں رہا تھا۔ تمام رپورٹس آنے اور مکمل طور پر تصدیق کے بعد ڈاکٹر صفدر نے انہیں بلا کر یہ افسوسناک اطلاع دی تھی۔ ریحانہ کے سوال پر انہوں نے افسوس سے سر ہلایا۔ ''بدقسمتی سے۔''

''کتنا وقت ہے؟''

''زیادہ سے زیادہ دو مہینے۔''

اور آج اس بات کو ڈیڑھ مہینا ہونے کو آیا تھا۔ عامر یہ سن کر پاگل ہو گیا تھا۔ اس نے ڈاکٹر صفدر کی تشخیص کو ماننے سے انکار کر دیا۔ اس نے ایک اور جگہ سے ٹیسٹ کرائے مگر وہاں بھی یہی نتیجہ نکلا۔ وہ اسے باہر لے جانے کی تیاری کر رہا تھا مگر ریحانہ نے انکار کر دیا۔ اس نے عامر سے کہا۔ ''کوئی فائدہ نہیں ہے، ہمیں خدا کے اس فیصلے کو تسلیم کرنا ہوگا۔ میں اجنبی سرزمین اور اجنبی لوگوں کے بجائے اپنی سرزمین پر اور اپنے لوگوں کے سامنے مرنا چاہتی ہوں۔''

''میں تمہارے بغیر کیسے رہوں گا؟'' عامر بچوں کی طرح بلکنے لگا۔

''رہیں گے، دیکھیں ہمارے بچے ہیں۔'' ریحانہ نے توجہ دلائی۔ ''اب آپ کو ہی ان کی دیکھ بھال کرنی ہو گی۔ میرے بعد باپ کے ساتھ ساتھ ماں کا کردار بھی ادا کرنا۔''

''بہت مشکل ہے، میں نہیں کر سکوں گا۔''

''آپ کریں گے۔'' ریحانہ نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''اس دنیا میں جو آتا ہے، اسے جانا تو پڑتا ہے۔ مجھے بھی جانا ہے، آپ کو بھی اور ہمارے بچوں کو بھی۔ جب جب جس کا وقت آئے گا، اسے جانا ہوگا۔ دنیا کے کام نہ کسی کے آنے سے بڑھتے ہیں اور نہ کسی کے جانے سے کم ہوتے ہیں۔ اصل مقام تو وہی ہے۔ افسوس کہ ہم اسے یاد نہیں رکھتے۔ میرے بعد آپ یاد رکھیے گا کہ آپ کو وہیں آنا ہے۔''

ریحانہ کے لہجے اور الفاظ میں ایسی تاثیر تھی کہ عامر کا

دل ہلکا ہونے لگا۔ اس نے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔ ''ہاں، مجھے اور سب کو وہیں آنا ہے۔''

ڈاکٹر صفدر نے کہا تھا کہ بعض دواؤں اور کیموتھراپی سے شاید کچھ وقت بڑھ جائے مگر اس کے سائڈ ایفیکٹس اتنے زیادہ تھے کہ وہ مریض کو اصل مرض سے زیادہ تکلیف پہنچاتے ہیں۔ واحد فائدہ یہ تھا کہ مریض کو کچھ مہلت مل جاتی۔ عامر کرانا چاہتا تھا مگر ریحانہ نے یہاں بھی اسے منع کر دیا۔ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''میں گنجی اور بدصورت ہو کر نہیں مرنا چاہتی۔ میں تکلیف برداشت کرلوں گی۔ آپ جانتے ہیں، مجھ میں کتنی قوتِ برداشت ہے۔''

عامر کا چہرہ پھیکا پڑ گیا۔ جیسے اسے کچھ یاد آ گیا ہو۔ ''تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ تم برداشت کرلو گی مگر ریحانہ تم ہی کیوں......؟''

''یہ اوپر والے کی مرضی جو ہے۔'' اس نے حوصلے سے کہا۔ ''کس کی مجال ہے جو اس کے فیصلے کو رد کر سکے۔''

''کاش میں کسی طرح اللہ سے تمہاری زندگی مانگ سکتا۔ اپنی جان دے کر بھی......''

''اللہ نہ کرے۔'' ریحانہ نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''میں خوش قسمت ہوں جو آپ کے سامنے جا رہی ہوں۔ آپ کے بغیر میری زندگی کا کوئی تصور نہیں ہے۔ شاید اسی لیے اللہ پہلے مجھے بلا رہا ہے۔''

ریحانہ نے عامر کو تو تسلی دے دی تھی مگر وہ خود کئی بار سوچ چکی تھی کہ وہ ہی کیوں؟ اس دنیا میں اربوں عورتیں ہیں۔ اس کے ملک میں کروڑوں عورتیں ہیں۔ ان میں سے بہت سی نہایت مشکل حالات میں جی رہی ہیں۔ وہ موت سے زیادہ مشکل زندگی گزار رہی ہیں۔ مگر کینسر نے اسے ہی منتخب کیا۔ آخر وہی کیوں؟ باہر دیکھتے ہوئے اس کے ذہن میں یہ خیال پھر آیا۔ گزشتہ رات اس کی طبیعت خراب ہوئی تھی۔ درد نا قابلِ برداشت تھا اور دوا سے بھی کم نہیں ہوا تھا اس لیے عامر اسے اسپتال لے آیا۔ اس نے فوری طبی امداد کے لیے شہر میں موجود اسپتال کی ایمبولینس سروس کو کال کی اور ڈاکٹر مع ایمبولینس کے پہنچ گیا۔ اس نے ریحانہ کو فوری طور پر کچھ انجکشن دیے اور پھر اسے ایمبولینس میں ہی اسپتال منتقل کیا۔ یہاں بھی اسے کچھ دوائیں دی گئیں تو اس کی رات سکون سے گزری تھی۔ صبح تک وہ ٹھیک ہو گئی تھی مگر ڈاکٹر صفدر نے اس کے کچھ ٹیسٹ دوبارہ لیے تھے۔ ان کا نتیجہ آنے تک اس نے ریحانہ کو روک لیا۔ اس نے عامر سے کہا۔ ''رپورٹ آنے کے بعد آپ انہیں لے جا سکتے ہیں۔ امکان ہے یہ آج شام تک جا سکیں گی۔''

عامر ساری رات اس کے پاس رکا تھا۔ اس نے پلک بھی نہیں جھپکائی تھی۔ صبح بچے ڈرائیور کے ساتھ آ گئے تھے۔ ریحانہ کے منع کرنے کے باوجود عامر نے ان کی اسکول سے چھٹی کرا لی تھی۔ ڈاکٹر کے جواب دینے کے باوجود ریحانہ گھر کے معمولات میں کوئی فرق آنے نہیں دینا چاہتی تھی اس لیے بچے اسکول جا رہے تھے اور عامر دفتر جاتا تھا۔ اگرچہ وہ دوپہر یا سہ پہر تک آ جاتا تھا۔ البتہ بچے اپنے وقت پر ہی اسکول سے آتے تھے۔ آج انہوں نے باپ سے چھٹی کرنے کو کہا تو وہ مان گیا۔ اب بچے اس کے پاس تھے۔ وہ کئی گھنٹے ریحانہ کے ساتھ رہے۔ وہ جانا نہیں چاہتے تھے مگر ریحانہ نے انہیں مجبور کر کے واپس بھیج دیا تاکہ عامر آرام کر لے۔ پھر بچوں کے لیے یہاں کوئی سہولت اور آرام نہیں تھا۔ وہ صبح کا ناشتا کر کے آئے تھے اور ریحانہ چاہتی تھی کہ وہ زیادہ دیر بھوکے نہ رہیں۔ اس لیے اس نے زبردستی انہیں گھر بھیج دیا۔ بچوں سے باہر نکلنے کے بعد عامر نے اس کے ماتھے پر پیار کیا اور بولا۔

''میں پانچ بجے تک آؤں گا۔ میرا انتظار کرنا۔''

''کوشش کروں گی۔'' ریحانہ نے آہستہ سے کہا۔ ''آپ جانتے ہیں، وقت میرے ہاتھ میں نہیں ہے۔''

عامر کا چہرہ پھیکا پڑ گیا۔ وہ ریحانہ کی بات کا مفہوم سمجھ گیا تھا۔ چند لمحے وہ ریحانہ کا ہاتھ تھامے کھڑا رہا اور پھر باہر چلا گیا۔ اس وقت دوپہر کے دو بج رہے تھے اور تین گھنٹے اسے اکیلے رہنا تھا۔ پہلے اسے اکیلے رہنے کے خیال سے گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ پھر اسے خیال آیا کہ اسے اب عادی ہو جانا چاہیے کیونکہ کچھ عرصے بعد اسے ہمیشہ کے لیے اکیلے رہنا ہو گا۔ یہ خیال آتے ہی وہ پُرسکون ہو گئی۔ شیشے کی دیوار کے پار کے منظر کو دیکھتے ہوئے وہ تعجب کر رہی تھی کہ یہ کس قدر حسین جگہ ہے اور وہ بچپن سے یہاں رہتی آئی تھی مگر اس نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ خدا کی بنائی ہوئی دنیا اتنی حسین ہو سکتی ہے۔ یہ خیال اسے اب آ رہا تھا جبکہ یہ دنیا اس سے بچھڑنے والی تھی۔ لنچ اسے ایک بجے ہی دے دیا گیا تھا اور عامر نے خود اپنے ہاتھوں سے کھلایا تھا۔ اسے مزید کوئی دوا نہیں دی گئی تھی اور نہ ہی ڈرپ لگی تھی۔ وہ صرف یہاں احتیاط کے طور پر داخل کی گئی تھی۔ حالانکہ اب احتیاط بیکار تھی۔ اس کے پاس بہت ہی کم وقت رہ گیا تھا۔ مگر ڈاکٹرز اور اسپتال کا اپنا ایک طریقہ کار ہوتا ہے۔ بے شک مریض دم توڑ رہا ہو لیکن وہ طریقہ کار پر عمل کرتے ہیں۔

یہ سوچ کر اسے ہنسی آئی اور دروازہ کھلنے کی آواز پر اس نے سر گھما کر دیکھا۔ اگرچہ کسی نے آنا نہیں تھا مگر اسے خیال آیا کہ شاید نرس آئی ہو مگر جب اس نے سر گھمایا تو دروازے پر نرس کے بجائے ایک خوبصورت نوجوان ڈاکٹر کھڑا تھا۔ سادہ پتلون شرٹ پر اس نے سفید کوٹ پہنا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک کلپ بورڈ اور پین تھا۔ آنکھوں پر ریم لیس عینک، خوب صورت براؤن بال اور اس سے بھی ہلکے رنگ کی ہلکی سی ڈاڑھی تھی۔ وہ ان چند خوبرو ترین نوجوانوں میں سے تھا جو ریحانہ نے آج تک دیکھے تھے۔ قد متوسط اور جسامت چست تھی۔ جانے کیوں ریحانہ کو وہ پہلی نظر میں بہت اچھا لگا تھا۔ وہ کلپ بورڈ کی طرف دیکھ رہا تھا پھر اس نے اپنی دلکش لائٹ براؤن آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا۔ ''ریحانہ عامر؟''

''یس۔'' اس نے کہا۔

''میں آپ ہی کے پاس آیا ہوں۔'' وہ بولا اور ... بے تکلفی سے کرسی کھینچ کر اس کے بستر سے کچھ فاصلے پر بیٹھ گیا۔ ریحانہ نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''کس سلسلے میں؟''

نوجوان ڈاکٹر نے مسکرا کر پین کی نوک سے اپنا سر کھجایا۔ ''اس کی وضاحت تو ذرا مشکل ہے مگر ایک بات سمجھ لیں کہ میں آپ کا علاج کرنے نہیں آیا ہوں۔''

ریحانہ کہتے کہتے رک گئی کہ اس کا علاج اب ممکن بھی نہیں ہے۔ اس کے بجائے اس نے ملائمت سے پوچھا۔ ''تب آپ کس لیے آئے ہیں؟''

وہ آگے جھکا اور ذرا شرارت آمیز لہجے میں بولا۔ ''میں نمائندۂ خاص ہوں اور میں صرف خاص خاص لوگوں کے پاس آتا ہوں۔''

اس نے لفظ ''خاص'' کو بار بار اس طرح ادا کیا کہ ریحانہ کو یہ ذرا مزاحیہ لگا اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ ''ٹھیک ہے آپ نمائندۂ خاص ہیں لیکن مجھ میں کیا خاص بات ہے؟''

اس نے پین سے کلپ بورڈ بجایا۔ ''یہی تو ہمیں دریافت کرنی ہے۔''

''ہمیں؟'' ریحانہ کا لہجہ پھر سوالیہ ہو گیا۔

''جی ہمیں۔'' اس نے اطمینان سے کہا۔ ''میرے پاس آپ کے بارے میں کچھ معلومات ہیں۔ یقیناً آپ کے پاس اپنے بارے میں مجھ سے کہیں زیادہ معلومات ہوں گی لیکن ......''

''لیکن کیا؟''

''لیکن ...... بعض اوقات انسان بھی اپنے بارے میں بہت سی باتیں نہیں جانتا اور انہیں دریافت کرنا پڑتا ہے۔''

''وہ کیسے؟''

''کسی سے مل کر۔''

جب وہ اس کے پاس بیٹھا تو ریحانہ کا خیال تھا کہ وہ اس کی صحت کے بارے میں بات کرے گا یا اسے کچھ بتائے گا مگر اس نے تو بالکل مختلف موضوع چھیڑ دیا تھا۔ ریحانہ اس کی بات اور آمد کا مقصد سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ''آپ کا مطلب ہے کہ میں آپ سے مل کر اپنے بارے میں وہ جاننے کی کوشش کروں جو میں خود بھی نہیں جانتی ہوں۔''

''جی، یہی بات۔'' اس نے خوش ہو کر کہا۔ ''آپ کے بارے میں میرا پہلا اندازہ بالکل درست ثابت ہوا ہے۔''

''کیسا اندازہ؟''

''یہی کہ آپ بہت ذہین خاتون ہیں۔''

''تعریف کا شکریہ۔'' ریحانہ بولی۔ ''آپ نے اپنا تعارف نہیں کرایا؟''

''کرایا تو ہے۔'' اس نے تعجب سے کہا۔ ''میں نمائندۂ خاص ہوں۔''

ریحانہ نے اس کے کوٹ کے درمیان لٹکے اس کے کارڈ کو دیکھا۔ اس پر اس کی تصویر تو نمایاں تھی مگر جس جگہ نام لکھا تھا، وہ ذرا اوٹ میں آرہی تھی۔ شاید وہ نام نہیں بتانا چاہ رہا تھا۔ ریحانہ نے گہری سانس لی۔ ''او کے مسٹر نمائندۂ خاص! آپ جو بھی ہوں لیکن مجھے اپنے بارے میں جاننے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔''

''کیوں؟'' نوجوان کے لہجے میں چیلنج آگیا۔ ''کیا اس لیے کہ آپ کے خیال میں آپ اپنے بارے میں سب جانتی ہیں ...... ؟ کیا واقعی جانتی ہیں؟''

ریحانہ کے خیال میں اس کے انداز پر اسے غصہ آنا چاہیے تھا مگر اسے تعجب ہوا جب اسے غصہ نہیں آیا۔ اس کے بجائے اس نے سکون سے کہا۔ ''ہاں، میرا یہی خیال ہے۔''

''خیال۔'' نوجوان نے پُرخیال انداز میں کہا۔ ''خیال لفظ ہی بے یقینی کا ہے۔ جب آدمی کہتا ہے کہ یہ اس کا خیال ہے تو اس کا مطلب ہے کہ کسی دوسرے کا خیال اس سے مختلف ہو سکتا ہے۔''

''او کے، مجھے یقین ہے۔'' ریحانہ نے تیز لہجے میں کہا جیسے اس کا چیلنج قبول کر لیا ہو۔

وہ مسکرایا۔ ''اس دنیا میں یقین نام کی بھی کوئی چیز نہیں ہے۔ جیسے میں آپ کے سامنے ہوں۔ میں نے ڈاکٹر کا کوٹ پہنا ہوا ہے اور میرے پاس کارڈ بھی ہے لیکن کیا آپ پورے یقین سے کہہ سکتی ہیں کہ میں ڈاکٹر ہوں؟ ہوسکتا ہے میں ڈاکٹر نہ ہوں۔''

ریحانہ الجھن میں پڑ گئی۔ پھر اس نے کہا۔ ''میں آپ کے یا کسی دوسرے کے بارے میں یقین سے نہیں کہہ سکتی لیکن اپنے بارے میں یقین سے کہہ سکتی ہوں۔''

''اوہ رئیلی؟'' نوجوان نے پھر چیلنج دینے والے انداز میں کہا۔ ''تو کیا آپ اپنے بارے میں یقین سے کہہ سکتی ہیں کہ آپ شام تک زندہ رہیں گی؟''

اچانک ریحانہ خود کو زچ محسوس کرنے لگی۔ ''پلیز آپ کس قسم کی بات کر رہے ہیں۔ میں آنے والے وقت کے بارے میں کیسے جان سکتی ہوں؟''

''کیا آپ اپنے ماضی سے پوری طرح واقف ہیں؟''

''بہ ظاہر تو اس کا جواب ہاں میں ہے۔'' ریحانہ نے اپنا ماتھا سہلایا۔ ''لیکن آپ نے مجھے کنفیوژ کر دیا ہے۔ اس لیے میں اس سوال کا جواب بھی ہاں میں نہیں دے سکتی۔''

''اب آپ نے ٹھیک کہا۔ انسان اپنے ماضی کے بارے میں بھی یقین سے نہیں کہہ سکتا۔'' نوجوان کے لہجے میں اصرار تھا۔ ریحانہ نے کسی قدر زچ ہو کر کہا۔

''اوکے میں نے مان لیا کہ انسان اپنے ماضی کے بارے میں بھی پورے یقین سے نہیں کہہ سکتا ہے۔ ویسے آپ میرے بارے میں کیا جانتے ہیں؟''

نوجوان نے کلپ بورڈ کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''جانتا تو ہوں مگر مکمل طور پر نہیں۔ ہاں، جاننا چاہتا ہوں۔''

''میں کسی اجنبی سے اپنے ماضی یا حال کے کسی بھی معاملے پر بات نہیں کرنا چاہتی۔''

''میں کسی بھی معاملے میں نہیں بلکہ کچھ معاملات میں آپ سے بات کرنا چاہتا ہوں اور خاص بات یہ ہے کہ ان کا تعلق آپ کے مستقبل سے ہے۔''

''میرا مستقبل؟'' اس نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''جی آپ کا مستقبل۔'' اس نے سر ہلایا۔

ریحانہ سوچ میں پڑ گئی پھر اس نے پوچھا۔ ''اس معاملے سے آپ کا کیا تعلق ہے؟''

''تعلق ہے۔'' اس نے پھر پین سے کلپ بورڈ بجایا۔ ''یہ میرا اسائنمنٹ ہے۔''

''اسائنمنٹ...... کس کی طرف سے؟''

''جس کا میں نمائندۂ خاص ہوں۔'' نوجوان نے مسکرا کر کہا۔ اس کی مسکراہٹ میں کچھ ایسی بات تھی کہ ریحانہ کے اندر جو وسوسے ابھر رہے تھے، وہ یک دم غائب ہو گئے اور وہ خود کو پُرسکون محسوس کرنے لگی۔

''اوکے، یہ آپ کو اسائنمنٹ ملا ہے لیکن آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟''

''اگر آپ چاہیں تو میری مدد کر سکتی ہیں۔''

''میں کیا مدد کر سکتی ہوں؟''

''میرے کچھ سوالوں کا جواب دے کر۔''

''کیسے سوالات؟''

''وہ ایسے سوالات نہیں ہیں جن کا آپ جواب نہ دے سکیں۔ اس لیے سوال کرنے کے باوجود آپ جواب دینے پر مجبور نہیں ہوں گی۔''

ریحانہ مسکرانے لگی۔ ''یہ تو اچھی بات ہے۔''

نوجوان نے کلپ بورڈ سے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ ''کیا آپ تیار ہیں؟''

ریحانہ کے لیے نوجوان کی آمد اور گفتگو دونوں غیر متوقع تھیں مگر ادل اسے اس کی آمد سے الجھن نہیں ہوئی تھی، دوسرے وہ اسے اچھا لگا تھا۔ ریحانہ نے محسوس کیا کہ اس سے اسے کوئی خطرہ نہیں ہے بلکہ اس کی آمد یوں اچھی ہے کہ اب اسے اکیلے ان دو چار گھنٹوں کے لیے نہیں رہنا پڑے گا۔ اس نے سر ہلایا۔ ''اوکے، میں تیار ہوں۔''

''میرا پہلا سوال ہے کہ کیا آپ اپنی زندگی سے مطمئن ہیں؟ زندگی کو جنرل لیجیے گا۔ بچپن سے لے کر اب تک اور تمام شعبوں میں۔''

ریحانہ نے ہچکچا کر سر ہلایا۔ ''ہاں، مطمئن ہوں۔''

''پوری طرح؟''

''پوری طرح تو کوئی بھی نہیں ہوسکتا ہے۔''

''اگر میں کہوں کہ پرسنٹیج میں بیان کریں تو......؟''

''نوّے فیصد۔'' ریحانہ نے جواب دیا۔

اس نے تعریفی انداز میں سر ہلایا۔ ''بہت عرصے بعد آپ پہلی خاتون ملی ہیں جو اپنی زندگی سے اتنی مطمئن ہیں۔''

ریحانہ نے گہری سانس لے کر سوچا۔ 'زندگی اتنی اچھی اور اس کا انجام؟'

نوجوان اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ ''آپ زندگی سے غیر مطمئن بھی ہیں۔ کم سے کم دس فیصد تو ہیں؟''

''اتنا تو ہر کوئی ہوتا ہے۔''

''کبھی پچھتاوا ہوا؟''

''بہت پیار۔''

''پہلا پچھتاوا یاد ہے؟''

ریحانہ کو یاد تھا۔

☆☆☆

اس نے جس گھر میں آنکھ کھولی اس میں زندگی کی تمام سہولتیں تھیں۔ اگرچہ مالی لحاظ سے گھرانا خوشحال تھا مگر اس سے زیادہ اخلاقی لحاظ سے یہ بہت ہی خوشحال گھرانا تھا۔ میاں بیوی میں مثالی تعلقات تھے۔ ان میں محبت، اعتماد اور باہمی خلوص کا ایسا رشتہ تھا جس کا عکس ان کی اولاد پر بھی آیا تھا۔ خالدہ اور ضمیر احمد نے اپنے الفاظ سے نہیں، اپنے عمل سے اپنی اولاد کی تربیت کی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی اولاد میں بھی باہمی محبت اور خلوص تھا۔ ریحانہ نے جب ہوش سنبھالا تو اس نے خود کو ماں باپ، بہن اور بھائیوں کی محبت میں گھرے پایا۔ آپا اس کے لیے دوسری ماں جیسی تھیں۔ جب وہ شادی کر کے رخصت ہوئیں تو سب سے زیادہ وہی بے قرار رہی تھی۔ کتنے دنوں تک بہن کو یاد کر کے روتی رہی۔ ان ہی دنوں اسے اسکول میں داخل کرا دیا گیا تو اس کا ذرا دل بہلا تھا اور پھر وہ اسکول میں مگن ہوگئی۔

شاہانہ کی شادی کے فوراً بعد اس کی پانچویں سالگرہ تھی۔ اس کی ہر سالگرہ بہت دھوم دھام سے منائی جاتی تھی۔ خاندان والے اور اس کی سہیلیاں شریک ہوتی تھیں۔ اسے بے شمار تحفے ملتے تھے۔ ریحانہ تحفے اور کھلونے سنبھال کر رکھتی تھی۔ ایک پوری الماری اس کے کھلونوں سے بھری ہوئی تھی۔ لڑکی ہونے کے ناتے ریحانہ کے کھلونوں میں گڑیا اور ان سے متعلق چیزیں سرفہرست ہوا کرتی تھیں۔ اس کے پاس قسم قسم اور ہر سائز کی درجنوں گڑیا تھیں۔ اپنی سالگرہ سے چند دن پہلے اس نے ٹی وی ڈرامے میں ایک بچی کے پاس گڑیا دیکھی اور وہ اسے اتنی اچھی لگی کہ وہ مچل گئی۔ اس نے ضمیر احمد سے کہا۔ ''بابا! مجھے یہ گڑیا چاہیے۔''

''میں لا کر دوں گا اپنی بیٹی کو۔'' ضمیر احمد نے اسے چوم کر کہا۔

''میری سالگرہ پر۔'' وہ خوش ہو کر بولی۔

''ہاں آپ کی سالگرہ پر۔''

مگر ضمیر احمد ریحانہ سے کیا ہوا وعدہ پورا نہ کر سکے۔ انہوں نے گڑیا تلاش کرائی اور انہیں دکان کا پتا بھی چل گیا۔ مگر اتفاق سے ان دنوں وہ خود مصروف تھے اور دکان پر نہیں جا سکے۔ دکان شام جلد بند ہو جاتی تھی اس لیے جب وہ فارغ ہو کر وہاں پہنچے تو دکان بند ہو چکی تھی۔ یوں سالگرہ والے دن ریحانہ کا تحفہ رہ گیا اور انہوں نے گھر آ کر اس سے بہت معذرت کی اور وعدہ کیا کہ وہ اگلے دن اسے لازمی گڑیا لا کر دیں گے۔ ضمیر احمد دارالحکومت کی مین ہول سیل مارکیٹ میں ڈسٹری بیوٹر تھے اور بہت سی کمپنیوں کی ڈسٹری بیوشن شپ لی ہوئی تھی۔ کمپنیوں کا سامان ان کے توسط سے شہر کی مارکیٹوں میں جاتا تھا۔ عام طور سے وہ شام تک فارغ ہو جاتے تھے مگر جب اگلے دن چھٹی ہوتی تو شام کو رش ہو جاتا تھا اور انہیں دیر تک رکنا پڑتا تھا۔ اس دن بھی اتفاق سے ویک اینڈ تھا۔ بہرحال وہ اگلے دن جا کر گڑیا لے آئے اور انہوں نے فون پر ریحانہ کو خوش خبری سنائی کہ وہ گڑیا لے چکے ہیں اور جلد گھر آئیں گے۔

ریحانہ بہت خوش تھی۔ اس نے باپ سے بہت دل سے اپنی سالگرہ پر گڑیا کی فرمائش کی تھی مگر اتفاق سے گڑیا رہ گئی۔ ضمیر احمد نے اسے پیسے دیے تھے اور گڑیا لانے کا وعدہ بھی کیا تھا۔ مگر اسے تو گڑیا آج چاہیے تھی۔ اس کی سالگرہ کی ساری خوشی ماند پڑ گئی۔ وہ خود پر جبر کر کے خوش ہوتی رہی۔ بہرحال جب اگلے دن ضمیر احمد خوب صورت، بولنے اور آنکھیں کھولنے اور بند کرنے والی گڑیا لے کر آئے تو ریحانہ پہلے کی طرح خوش اور پرجوش ہوگئی۔ گڑیا کے سنہری بال اتنے لمبے تھے کہ پیروں سے بھی نیچے آ رہے تھے۔ اس کا لباس بہت خوب صورت تھا۔ ریحانہ اسے پا کر پاگل ہو گئی تھی۔ وہ سارا سارا دن اسے سینے سے لگائے گھومتی تھی اور رات سوتے وقت بھی یہ اس کے پاس ہوتی تھی۔ چند دن بعد اسے اسکول میں داخل کرا دیا گیا۔ اس نے چاہا گڑیا ساتھ لے کر جائے مگر خالدہ نے اسے سمجھایا کہ اسکول میں کھلونے لے جانے کی اجازت نہیں ہے۔ ریحانہ نے خود اسکول جا کر دیکھ لیا کہ کوئی بچہ جو اس کی کلاس میں تھا، کھلونے لے کر نہیں آتا تھا۔ دل پر پتھر رکھ کر اس نے ماں کی بات مان لی۔ مگر صرف اسکول جاتے ہوئے گڑیا اس سے جدا ہوتی اور وہ بہت احتیاط سے اسے اپنی الماری میں رکھ کر ماں سے لاک کروا کے جاتی تھی۔

ضمیر احمد کھاتے پیتے آدمی تھے۔ اپنا مکان تھا اگرچہ ایک کنال پر تھا مگر دیکھنے میں کوٹھی نما لگتا تھا۔ سامنے کی طرف بڑا سا لان تھا جس کی دیکھ بھال کے لیے پارٹ ٹائم مالی آتا تھا۔ اس زمانے میں حالات پرامن تھے اس لیے گارڈ کی ضرورت نہیں تھی مگر اندر کے کاموں کے لیے ایک مستقل ملازمہ اور دو جز وقتی ملازمائیں تھیں جو آتیں اور اپنا کام کر کے رخصت ہو جاتیں۔ ان میں نصیب بی بی مستقل

ملازمہ تھی۔ وہ صبح آٹھ بجے آتی اور شام چھ بجے چھٹی کر کے جاتی تھی۔ اگر کسی دن شام کی کوئی تقریب ہوتی تو خالدہ اسے روک لیتی تھیں۔ نصیب بی بی کے ذمے کچن اور گھر کے دوسرے کام تھے۔ صفائی اور لانڈری کے لیے دو الگ ملازمائیں آتی تھیں اور نصیب بی بی کے ذمے ان کی بھی نگرانی تھی۔ کھانا خالدہ خود پکاتی تھیں اور نصیب ان کی مدد کرتی تھی۔

نصیب بی بی تقریباً تیس برس کی بیوہ تھی۔ اس کا شوہر جو کسی فیکٹری میں کام کرتا تھا، وہاں لگنے والی آگ میں جل کر مارا گیا تھا۔ اس کے بعد نصیب بی بی اور اس کی بیٹی عصمت کا اس دنیا میں کوئی نہیں رہا تھا جو ان کی دیکھ بھال کرتا یا ان کے اخراجات کا ذمہ لیتا۔ اس لیے نصیب بی بی کو خود میدانِ عمل میں آنا پڑا تھا۔ خوش قسمتی سے اسے خالدہ کا گھر ملا اور اس کی کہانی سن کر خالدہ نے اسے مستقل ملازم رکھ لیا۔ نصیب بی بی نزدیک ہی ایک غریب بستی میں رہتی تھی۔ عصمت کی دیکھ بھال کے لیے اس نے گاؤں سے اپنی موسی کو بلوا لیا جسے ناخلف اولاد نے اس عمر میں گھر سے نکال دیا تھا۔ اسے سہارے کی ضرورت تھی اور نصیب بی بی کو اپنے گھر میں ایک دیکھ بھال کرنے والا درکار تھا۔ موسی کے آنے سے اس کا یہ مسئلہ حل ہو گیا۔ وہ عصمت کی طرف سے بے فکر ہو کر صبح سے شام تک ریحانہ کے گھر کام کرتی تھی۔ کبھی کبھی عصمت کو بھی ساتھ لے آتی۔

عصمت ریحانہ کی ہم عمر تھی۔ ریحانہ سرخ گلابی رنگ والی پری جیسی نظر آنے والی خوب صورت بچی تھی۔ وہ اپنی عمر سے کسی قدر زیادہ وزن کی تھی۔ اس کے مقابلے میں عصمت سرخی مائل سانولے رنگ کی اور کسی قدر کمزور سی نظر آنے والی بچی تھی۔ مگر وہ کمزور نہیں تھی۔ وہ جب ماں کے ساتھ آتی، اس کی کوشش ہوتی کہ ماں کے ساتھ کام کرائے لیکن وہ اس سے کام نہیں کراتی تھی۔ نصیب بی بی کہتی کہ اس کی بیٹی پڑھے گی اور ڈاکٹر بنے گی۔ وہ صرف اسکول کی چھٹی والے دن عصمت کو لے کر آتی تھی۔ ایک دن ریحانہ کی اسکول کی وین آ گئی تھی اور وہ عجلت میں اپنی گڑیا ڈریسنگ ٹیبل پر بھول گئی۔ جب وہ بیگ اٹھائے باہر جا رہی تھی تو نصیب بی بی عصمت کے ساتھ اندر آئی۔ اس نے عصمت کا ہاتھ پکڑا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ وہ بخار میں تھی اسی لیے نصیب بی بی نے اسکول سے چھٹی کرالی تھی اور ڈاکٹر کو دکھاتی ہوئی اپنے ساتھ لے آئی تھی۔

اسکول میں ریحانہ کو یاد آیا کہ وہ گڑیا الماری میں رکھے بغیر آ گئی ہے۔ اسے گڑیا سے اتنا لگاؤ تھا کہ اسکول میں سارا وقت ہی اس کا خیال آتا رہا اور وہ دل ہی دل میں اس سے سوری کرتی رہی کہ آج وہ اسے یوں بے پروائی سے باہر ہی چھوڑ آئی ہے۔ وہ ابھی پہلی کلاس میں تھی اور اس کی ساڑھے بارہ بجے چھٹی ہو جاتی تھی۔ اسکول وین اسے ایک بجے تک گھر پہنچا دیتی تھی۔ اس نے گھر واپسی کا ایک ایک لمحہ گن کر گزارا۔ خدا خدا کر کے چھٹی ہوئی۔ آج اسے جلدی تھی تو اس کی وین کا نمبر سب سے آخر میں آیا۔ اسکول میڈ بچوں کو خود وین میں بٹھاتی تھیں اور دیکھتی تھیں کہ تمام بچے ٹھیک سے بیٹھے ہیں۔ اسکول کی طرح اس کی وین بھی اچھی تھی اور ان میں بچوں کو سیٹ بائی سیٹ بٹھایا جاتا تھا۔ ڈرائیور کے علاوہ ایک ہیلپر بھی ہوتا تھا جو گھر آنے پر مطلوبہ بچے اور اس کا بیگ اتارتا تھا۔ وین والے کی ذمے داری تھی کہ وہ بچے کو گھر کے اندر تک پہنچائے۔

وین گیٹ کے سامنے رکی تو حسب معمول خالدہ گیٹ پر موجود تھیں۔ ریحانہ حسبِ معمول بیگ لے کر دوڑتی ہوئی ان کے پاس آئی مگر ماں سے لپٹنے کے بجائے اس نے پھولی ہوئی سانس کے ساتھ کہا۔ ''امی! میری گڑیا باہر رہ گئی تھی۔''

خالدہ ہنسی۔ ''اتنی کیا بے تابی ہے، گڑیا اپنی جگہ ہو گی۔ اس نے کہاں جانا ہے؟''

مگر وہ ماں کی بات سنے بغیر اندر بھاگی اور جب کمرے میں داخل ہوئی تو اس نے دیکھا کہ اس کی گڑیا عصمت کے پاس ہے اور وہ اس کے بال سنوار رہی ہے۔ فطری طور پر ریحانہ کو شدید غصہ آیا اور اس نے جھپٹ کر عصمت سے اپنی گڑیا لے لی اور چلا کر بولی۔ ''تم نے میری گڑیا کو ہاتھ کیسے لگایا؟''

''چھوٹی بی بی! اس کے بال خراب ہو گئے تھے، میں وہ ٹھیک کر رہی تھی۔'' عصمت سہم گئی۔ اس نے جلدی سے صفائی پیش کی۔ ''دیکھ لیں، میں نے ذرا بھی خراب نہیں کی ہے۔''

ریحانہ نے دیکھا، واقعی گڑیا بالکل ٹھیک تھی اور اس کے بال بھی اب ٹھیک تھے۔ رات سونے کے دوران ریحانہ کے ہاتھ تلے آ کر اس کے بال خراب ہو گئے تھے اور صبح اٹھ کر اس نے دیکھا تو اس کے پاس ٹھیک کرنے کا وقت نہیں تھا۔ عصمت نے بال ٹھیک کر دیے تھے۔ اس کے باوجود ریحانہ کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہوا۔ وہ اس وقت تک چلاتی رہی جب تک نصیب بی بی وہاں نہیں آ گئی اور صورتِ حال سے واقف ہو کر اس نے عصمت کو کس کس کے دو تھپڑ

مارے۔ اس کے معصوم گال سرخ ہو گئے تھے اور آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تھے۔ اس کے آنسو دیکھ کر ریحانہ کا غصہ سرد ہو گیا اور پھر اسے شرمندگی ہونے لگی۔ اس نے کبھی کسی پر اس طرح غصہ نہیں کیا تھا۔ اسے زور سے چلانا اور بات کرنا پسند نہیں تھا مگر آج اس نے یہ دونوں کام کیے تھے۔ عصمت کا قصور نہیں تھا اس کے باوجود اسے ماں سے سزا ملی اور ایسا اس کے چلانے کی وجہ سے ہوا تھا۔

وہ اتنی شرمندہ ہوئی کہ پھر کمرے سے نکلی ہی نہیں کہ اسے عصمت کا سامنا کرنا پڑتا۔ جب عصمت اور نصیب بی بی شام کو چلی گئیں تب وہ کمرے سے نکلی اور اس کے بعد عصمت کبھی ان کے گھر نہیں آئی۔ وہ اسی اسکول میں پڑھ رہی تھی جہاں ریحانہ کو پہلی کلاس میں داخل کرایا گیا تھا۔ یہ اچھا اسکول تھا جو ایک پالیسی کے تحت مخصوص تعداد میں غریب اور فیس ادا نہ کر سکنے والے بچوں کو بھی داخلہ دیتا تھا بشرطیکہ وہ اس کا ٹیسٹ پاس کر لیں۔ عصمت کا داخلہ بھی اسی پالیسی کے تحت ہوا ورنہ اس کی ماں اسے یہاں پڑھانے کے قابل نہیں تھی۔ مگر نصیب بی بی یا خود عصمت نے کبھی نہیں بتایا کہ وہ اسی اسکول میں پڑھ رہی ہے۔ اتفاق کی بات تھی کہ عصمت کا الگ سیکشن تھا اور اس کی عمارت بھی الگ تھی۔ ان کی آدھی چھٹی بھی الگ الگ اوقات میں ہوتی تھی۔ اس لیے بہت دنوں تک ریحانہ اور اس کا سامنا نہیں ہوا۔ اس واقعے کے تیسرے دن ریحانہ کی ایک کلاس ٹیچر نہیں آئی تھی اور اس کی کلاس لینے کے لیے کوئی اور ٹیچر فارغ نہیں تھی۔ اس لیے بچوں کو ایک کلاس کی چھٹی دے دی گئی اور وہ باہر نکلے۔ عصمت کے سیکشن کی آدھی چھٹی اسی وقت ہوئی تھی اور تب ریحانہ نے پہلی بار عصمت کو دیکھا۔ وہ بے ساختہ اس کی طرف بڑھی۔

''تم میرے اسکول میں پڑھتی ہو؟''

''جی ریحانہ بی بی۔'' اس نے نظریں جھکا کر کہا۔

''پہلی کلاس میں ہو؟''

اس بار عصمت نے صرف سر ہلایا۔ ریحانہ ہچکچائی۔ وہ اس سے سوری کرنا چاہتی تھی۔ اس سے دوستی کرنا چاہتی تھی مگر وہ کچھ نہ کہہ سکی۔ عصمت وہاں سے اٹھ کر چلی گئی۔ اس کے بعد بھی ان کا... کئی بار آمنا سامنا ہوا اور ہر بار ریحانہ نے اس سے بات کرنی چاہی مگر نہ کر سکی۔ یہ سلسلہ آنے والے دس سالوں تک جاری رہا جب تک انہوں نے میٹرک نہیں کر لیا۔ نو سال تک ریحانہ نے اپنی کلاس کے تمام سیکشن

علم و فن

☆ کتب خانے بھی خدا کا گھر ہیں کہ خدا حق و صداقت کا دوسرا نام ہے اور حق و صداقت تک رسائی علم کے بغیر ممکن نہیں۔

☆ اگر لکھنے والے نہ ہوتے تو آج انسانیت کے ساتھ ساتھ کتب خانوں کے نام سے بھی کوئی واقف نہ ہوتا۔

☆ علم و ادب کی سچی لگن دلوں کو ملاتی ہے، انہیں جدا نہیں کر سکتی۔

☆ ادھورا علم اس کند تلوار کے مانند ہے جو سینے میں گھونپ کر چھوڑ دی جاتی ہے۔

☆ صداقت کو چھپایا جا سکتا ہے، مٹایا نہیں جا سکتا۔

☆ صداقت کی تلاش درحقیقت خدا کی جستجو کی ہی ایک صورت ہے۔

خواہش

☆ خواہشات ہی تمام دکھوں کی بنیاد ہوتی ہیں۔ (شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ)

☆ ہماری خواہشات زندگی نامی بھاپ کو قوس قزح کا رنگ دے دیتی ہیں (ٹیگور)

☆ کوئی خواہش یہاں تشنہ تکمیل نہیں رہتی۔ (خلیل جبران)

انتخاب۔ ریاض بٹ، حسن ابدال

میں ٹاپ کیا سوائے میٹرک کے۔ اس میں اس کے نمبر اتنے کم آئے تھے کہ وہ نویں کلاس کی برتری بھی برقرار نہ رکھ سکی۔ اس کے گھر والے اور ٹیچرز سب حیران تھے کہ میٹرک میں اس کا رزلٹ اتنا اچھا کیوں نہیں آیا؟ ٹیچرز اس لیے زیادہ حیران تھے کہ اس نے ٹیسٹ اور لیب کے پریکٹیکل بہت اچھے دیے تھے اور ان میں اس کے سب سے زیادہ نمبر تھے۔ مگر بورڈ کے پیپرز اور پریکٹیکل وہ اتنے اچھے نہ دے سکی کہ پورے اسکول میں ہمیشہ کی طرح ٹاپ کرتی۔ اس کے باوجود وہ دوسرے نمبر پر ضرور آئی تھی۔

عصمت جو ہمیشہ دوسرے نمبر پر آتی تھی، اس کا شمار بھی اسکول کی بہترین طالبات میں ہوتا تھا۔ وہ بہت محنت کرتی تھی۔ اپنے سیکشن میں ہمیشہ پہلے نمبر پر آتی تھی مگر نویں کلاس تک وہ پورے اسکول میں کبھی ریحانہ سے آگے نہیں

بڑھ سکی۔ جب میٹرک کا مرحلہ آیا تو اس نے از حد محنت کی کیونکہ اسے آگے ایک اچھے کالج میں اسکالرشپ کے ساتھ داخلہ لینا تھا۔ یہ کالج شہر کی بہترین طالبات کو ایک درجن اسکالرشپ دیتا تھا اور عام طور سے اپنے اسکول میں ٹاپ کرنے والی طالبات کو ہی اسکالرشپ دی جاتی تھی۔ کالج اس معاملے میں بورڈ کی پوزیشن نہیں دیکھتا تھا۔ دوسری شرط استطاعت نہ ہونا تھی یعنی طالبہ مالی لحاظ سے کالج میں داخلہ لینے کی اہل نہ ہو۔ اسی صورت میں اسے اسکالرشپ ملتی تھی۔ اس لیے عصمت نے آخری سال میں جان لڑا دی تھی۔ اس نے اتنی محنت کی کہ جب آخری پیپر دے کر آئی تو دو دن بخار میں جلتی رہی اور نصیب بی بی اس کے ماتھے پر پٹیاں رکھتی رہی تھی۔ جس دن اس کا نتیجہ آیا اور اس نے پورے اسکول میں ٹاپ کیا، اسی شام اسے کوریئر سے ایک پارسل ملا۔ عصمت نے پارسل کھولا تو اس میں ریحانہ کی وہی گڑیا تھی۔ اس کے ساتھ ایک مختصر سی چٹ تھی جس پر ریحانہ کی ہینڈ رائٹنگ میں لکھا تھا۔

''بہت خوشی، خلوص اور معذرت کے ساتھ۔''

☆☆☆

نوجوان ڈاکٹر اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ ''تب آپ نے اس کی تلافی کی؟''

ریحانہ نے سر ہلایا۔ ''اپنے طور پر کی، اب پتا نہیں وہ تلافی بھی تھی یا نہیں۔ ممکن ہے اس نے میری معذرت قبول نہ کی ہو۔''

''عصمت کو اسکالرشپ حاصل کرنے کے لیے اسکول میں ٹاپ کرنا لازمی تھا؟''

''ہاں، اس کے بغیر اسے اس کالج میں داخلہ نہیں ملتا اور کسی عام کالج میں پڑھ کر وہ میڈیکل کالج میں داخلے کے لیے مطلوبہ مارکس حاصل نہیں کرسکتی تھی۔''

''عصمت اول کیسے آئی...... اس نے محنت بہت کی تھی یا آپ نے پیپرز ہلکے دیے تھے؟''

ریحانہ مسکرائی۔ ''شاید دونوں باتیں درست ہیں۔ میں نے سنا تھا کہ اس نے اتنی محنت کی کہ بیمار پڑ گئی تھی۔''

کہتے ہوئے ریحانہ نے یاد کیا کہ اس نے میٹرک کے پیپرز جان بوجھ کر ہلکے دیے تھے تاکہ عصمت فرسٹ آسکے۔ اس نے اتفاق سے سن لیا تھا۔ عصمت اپنی سہیلی سے کہہ رہی تھی کہ اگر وہ فرسٹ نہ آئی تو اسے کالج اسکالرشپ نہیں ملے گی اور اس کا ڈاکٹر بننے کا خواب ادھورا رہ جائے گا۔ اس نے اسی وقت فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ عصمت کو فرسٹ آنے میں مدد دے گی۔ اس نے سوچا تھا کہ اگر وہ فرسٹ نہ آئی تو اسے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ وہ مالی لحاظ سے مضبوط تھی اور کسی بھی اچھے کالج میں داخلہ لے سکتی تھی۔ اسے کسی اسکالرشپ کی ضرورت نہیں تھی اور پھر ایسا ہی ہوا تھا۔ اسے بہت اچھے کالج میں داخلہ ملا تھا۔ اس سے گفتگو کے دوران نوجوان یوں کلپ بورڈ کو دیکھ رہا تھا جیسے اس پر ریحانہ کے حوالے سے کچھ لکھا ہو اور وہ اس کی تصدیق کررہا ہو مگر ریحانہ کے خیال میں وہ صرف عادتاً کلپ بورڈ دیکھ رہا تھا جیسا کہ ڈاکٹرز دیکھتے ہیں اور انہیں عادت پڑ جاتی ہے۔ اس نے پین سے کلپ بورڈ پر جیسے رائٹ کا نشان بنایا اور پھر اس کی طرف متوجہ ہوا۔

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ کسی نے آپ کی معذرت قبول کی ہے یا نہیں۔ کیونکہ فیصلہ کرنے والی ہستی کوئی اور ہے اور اس سے انسان کی کوئی بات چھپی نہیں ہے۔''

''بس یہی ایک حقیقت مجھے اطمینان دلاتی ہے۔''

''اس کے بعد بھی آپ کو پھر کبھی پچھتاوا ہوا؟''

☆☆☆

کالج لڑکیوں کا تھا اور وہاں زیادہ تر طبقۂ امراء کی وہ لڑکیاں داخل تھیں جن کی نااہلیت کی وجہ سے انہیں بیرونِ ملک کسی تعلیمی ادارے میں داخلہ نہیں ملا تھا۔ یہ ذہنی اور جسمانی لحاظ سے اس مادر پدر آزاد کلاس کی نمائندگی کرتی تھیں جو اس ملک کی شہری ہوتے ہوئے بھی یہاں اجنبی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ ریحانہ نے صرف دوستوں کا محدود گروپ بنایا تھا۔ کچھ لڑکیوں نے کوشش کی کہ وہ ان کے ساتھ آئیں مگر ریحانہ نے انہیں منہ نہیں لگایا۔ تب وہ اس کی مخالفت پر اتر آئیں مگر ریحانہ کو ان کی پروا نہیں تھی۔ ویسے بھی اس کی تعلیمی حیثیت کی وجہ سے سب اس سے دبتی تھیں۔ لڑکیوں کو معلوم تھا کہ کسی بھی تنازعے کی صورت میں بات پرنسپل آفس گئی تو وہاں ریحانہ کی سنی جائے گی۔ اس لیے کالج کا دور بنا کسی خاص جھگڑے کے گزر گیا۔ چند ایک بار حاسد لڑکیوں نے اس کے منہ لگنے کی کوشش کی مگر اس نے انہیں منہ لگایا ہی نہیں اور ایسا جواب دیا کہ اس کے بعد انہیں جرأت نہیں ہوئی تھی۔

مگر یونیورسٹی کی زندگی بالکل مختلف تھی۔ اول تو یہاں کو ایجوکیشن سسٹم تھا۔ پھر یہاں لڑکیاں کم تھیں اور لڑکے زیادہ تھے۔ مگر جو لڑکیاں تھیں، ان میں سے بیشتر کسی نہ کسی گروپ سے وابستہ تھیں جن میں لڑکے لازمی ہوتے تھے اور ریحانہ اس بات سے چڑتی تھی۔ اس کی سوچ تھی

کہ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے کسی مخلوط گروپ میں شمولیت لازمی نہیں تھی۔ اس میں اعتماد کی کمی نہیں تھی مگر وہ اس بات کو ایک اصول کے طور پر لیتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ وقت اور حالات سے اصول بدل نہیں جاتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ پہلے سیمسٹر تک اس کی چند ایک لڑکیوں سے بس معمولی سلام دعا ہوئی تھی کیونکہ وہ اس کی مزاج کی نہیں تھیں۔ بس یہ قدر مشترک تھی کہ ریحانہ کی طرح وہ کسی گروپ سے وابستہ نہیں تھیں۔ ان میں اعتماد کی کمی تھی اور جب موقع ملا تو انہوں نے بھی کسی نہ کسی گروپ میں شمولیت اختیار کرلی۔ اتفاق کی بات تھی جو لڑکیاں اس کے مزاج کی تھیں، وہ کسی نہ کسی مخلوط گروپ میں تھیں۔ اسی لیے پہلے سیمسٹر میں اس کا سارا وقت ہی کلاس یا لائبریری میں گزرتا تھا۔

دوسرے سیمسٹر میں اس کے شعبے میں دو لڑکیاں آئیں اور پہلے دن تعارف کے بعد وہ ریحانہ سے بے تکلف بھی ہوگئیں۔ وہ بھی اس کی طرح لڑکوں سے میل ملاپ کی قائل نہیں تھیں۔ ان کا گروپ بنا تو ریحانہ ان کے ساتھ کیفے ٹیریا، لان اور دوسری جگہوں پر بھی نظر آنے لگی... سوہا شوخ مگر نرم مزاج کی تھی۔ معصوم سے نقوش اور چھریری جسامت کے ساتھ کسی قدر گھنگھرالے بالوں اور گلابی رنگت کے ساتھ وہ خاصی خوب صورت نظر آتی تھی۔ اس کی عمر چوبیس برس تھی مگر دیکھنے میں بیس سے زیادہ کی نہیں لگتی تھی۔ سوہا کا باپ سرکاری افسر تھا اور کسی وزارت میں ایڈیشنل سیکریٹری لگا ہوا تھا۔ سوہا ماں باپ کی تیسری اولاد تھی۔ اس سے بڑی دو بہنیں پڑھنے کے لیے باہر گئی تھیں مگر اس نے ملک میں تعلیم حاصل کرنے کو ترجیح دی تھی پھر اس نے باپ کی فرمائش کے برعکس سوشیالوجی کا انتخاب کیا۔ اس کا باپ چاہتا تھا کہ وہ کوئی ایسی ڈگری حاصل کرے کہ سول سروس کا امتحان دے سکے۔

غزالہ کا تعلق ملک کے وسطی حصے کے ایک جاگیردار گھرانے سے تھا۔ اس کا باپ اور چچا صوبائی اسمبلی کے ممبر رہ چکے تھے مگر گزشتہ انتخابات میں شکست کے بعد وہ لوگ زمینداری میں مصروف تھے اور اگلے الیکشن کا انتظار کر رہے تھے۔ پہلے خاندان میں لڑکیوں کی تعلیم بس اسکول تک محدود رہتی تھی مگر پھر وقت بدلا اور اب اس خاندان کی لڑکیاں اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہی تھیں۔ ملک کے اداروں کے ساتھ ساتھ بیرونِ ملک جاکر بھی پڑھ رہی تھیں۔ غزالہ نے گریجویشن صوبائی دارالحکومت کے ایک

کالج سے کیا تھا اور ماسٹر کے لیے یہاں یونیورسٹی میں آئی تھی۔ اس کی رہائش گرلز ہاسٹل میں تھی۔ وہ سنجیدہ مگر مزاج کی تیز تھی۔ وہ ان تینوں میں سب سے خوب صورت تھی۔ اگرچہ ریحانہ اور سوہا بھی کم نہیں تھیں۔ سرخ و سفید رنگت اور شاہانہ نقوش کے ساتھ بہت متناسب جسم تھا۔ اس پر ہر لباس بج جاتا تھا۔ ہلکے براؤن بال اتنے طویل تھے کہ کمر سے بھی نیچے آتے تھے اور گھنے اتنے کہ کھلے ہونے پر اس کی پوری پشت ڈھانپ لیتے تھے۔

جلد یونیورسٹی میں ان کا گروپ تھری بیوٹیز کے نام سے جانا جانے لگا۔ غزالہ بے پناہ حسین تھی مگر وہ اپنے حسن سے بے پروا تھی۔ اگر کوئی اسے سراہنے والی نظروں سے دیکھتا تو اسے غصہ آنے لگتا۔ قریب آنے والے اس کا غصہ بھگت بھی چکے تھے اس لیے لڑکے اب اسے دور دور سے دیکھتے تھے۔ قریب آنے کی جرأت صرف ناواقف اور نئے لڑکے کرتے تھے اور ان کو بھی فوراً پتا چل جاتا تھا۔ اس کے مقابلے میں ریحانہ اور سوہا دھیمے مزاج کی تھیں۔ اگر کوئی ان سے فری ہونے کی کوشش کرتا تو وہ اسے سکون سے ہینڈل کرتی تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ جب گڑ دینے سے کام چل جاتا ہے تو زہر دینے کی کیا ضرورت ہے۔ مگر غزالہ ایسی کسی کوشش پر بھڑک جاتی تھی۔ بعض اوقات تو وہ آس پاس کی پروا بھی نہیں کرتی تھی کہ دیکھنے اور سننے والے بہت سے لوگ ہوتے تھے۔ ریحانہ اسے سمجھاتی۔

''غزالہ! ذرا دھیمی رہا کر...... تیرے اندر تو جیسے آگ بھری ہوئی ہے۔''

سوہا ہنس کر کہتی۔ ''اوپر سے بھی آگ اور اندر سے بھی آگ۔''

''مجھے یہ لڑکے زہر لگتے ہیں۔'' غزالہ چڑ کر کہتی۔ ''ان کے پاس اس کے سوا اور کوئی کام نہیں ہے۔ یہ یہاں پڑھنے آتے ہیں یا لڑکیاں تاڑنے اور ان سے دوستی کرنے؟''

''تینوں کام کرنے۔'' ریحانہ نے کہا۔ ''دیکھا نہیں ہے تقریباً کسی نہ کسی لڑکی کے چکر میں ہوتے ہیں اور اکثر تو کئی کئی چکر چلاتے ہیں۔ مگر ساتھ ہی پڑھتے بھی ہیں اور پاس بھی ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد ڈگری لے کر کہیں نہ کہیں جاب کرنے لگتے ہیں اور کسی نہ کسی لڑکی سے شادی بھی ہو جاتی ہے۔''

''اور یہاں جو گند کر کے جاتے ہیں۔'' غزالہ نے زہریلے لہجے میں کہا۔

''اگر وہ گند کرتے ہیں تو اس میں ہم لڑکیاں بھی برابر کی شریک ہوتی ہیں۔'' ریحانہ رسانیت سے کہتی۔ ''تم بتاؤ تالی ایک ہاتھ سے کیسے بج سکتی ہے۔ تمہاری اور ہماری طرف کوئی لڑکا کیوں نہیں آتا کیونکہ ہم اس نیچر کے نہیں ہیں۔ ہم لڑکوں کی طرف توجہ ہی نہیں دیتے۔''

اس کی بات پر غزالہ اچانک ہی چپ ہو گئی۔ چند لمحے پہلے اس کا سرخ ہو کر تپنے کا تاثر دینے والا چہرہ اچانک ہی بجھ سا گیا اور رنگت مدھم پڑ گئی۔ ریحانہ نے بات جاری رکھی۔ ''اسی طرح یونیورسٹی میں بہت سے لڑکے بھی اس نیچر کے نہیں ہیں۔''

''مثلاً شہباز۔'' سوہا بولی۔ ''حالانکہ کیا پرسنالٹی ہے۔ اس کے باوجود بھی اسے لڑکیوں کے چکر میں نہیں دیکھا۔ لڑکیاں ہی اس کی طرف آتی ہیں مگر جو اس نیت سے آتی ہے، وہ اسے منہ نہیں لگاتا۔''

غزالہ نے پھر بحث نہیں کی مگر اس کا منہ بنا رہا۔ وہ ان سے متفق نہیں ہوئی تھی اور جب وہ ان سے کسی بات پر اتفاق نہیں کرتی تھی تو اس کا یونہی منہ بن جاتا تھا مگر اختلاف کے باوجود ان کی دوستی چند مہینے میں یونیورسٹی سے نکل کر ان کے گھروں تک پہنچ گئی تھی۔ غزالہ ہاسٹل میں رہتی تھی اور ان دونوں کے یہاں گھر تھے۔ مہینے میں ایک دو بار وہ لازمی کسی جگہ جمع ہوتی تھیں۔ عام طور سے وہ غزالہ کے ہاسٹل آتی تھیں۔ وہاں وہ مل کر گپ شپ کرتیں۔ کھانے میں اپنی پسند کی چیزیں آرڈر کر کے منگواتیں۔ اگر شہر میں کوئی نمائش یا تعلیم و ادب سے متعلق سیمینار ہوتا تو وہاں جاتیں۔ تینوں کو کتابوں کا شوق تھا۔ لائبریری کے علاوہ مہینے میں ایک چکر لازمی کسی بک اسٹور کا لگتا اور وہاں اپنی پسند کی کتابیں خریدتیں۔ ریحانہ بہت خوش تھی۔ بچپن سے اس نے بہت کم دوست بنائی تھیں۔ کالج کا دور جب لڑکیاں سب سے زیادہ دوست بناتی ہیں ایسے ہی گزر گیا تھا اور اب اسے یونیورسٹی میں آ کر دو اچھی دوست ملی تھیں جن کے ساتھ وہ تفریح کر سکتی تھی۔ اپنی باتیں شیئر کر سکتی تھی اور ان کی باتیں سن سکتی تھی۔

کیونکہ تینوں ہی مختلف فطرت کی تھیں، اس لیے کبھی کبھی کھٹ پٹ بھی ہو جاتی تھی۔ ریحانہ اور سوہا فطرت میں زیادہ ملتی تھیں۔ غزالہ ذرا الگ فطرت کی تھی۔ اس کے مزاج میں حاکمیت اور انا بہت زیادہ تھی۔ اس پر سوہا کبھی کبھی اس کا مذاق اڑاتی کہ اگر وہ مزاج نہ دکھائے تو پتا کیسے چلے گا کہ جاٹ خاندان سے ہے۔ خود سوہا کے آباؤ اجداد کشمیر سے

آئے تھے۔ البتہ ریحانہ جدی پشتی اسی علاقے کی رہنے والی تھی جو اب دارالحکومت میں شامل ہو گیا تھا۔ سوہا گھومنے پھرنے کی شوقین تھی۔ غزالہ کو باہر جانا اچھا لگتا تھا مگر اسے رش والی جگہوں سے الجھن ہوتی تھی۔ ریحانہ کو باہر جانا ایک حد تک اچھا لگتا تھا اور اسے رش والی جگہیں پسند تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ جب وہ مل کر شاپنگ کا پروگرام بناتیں تو غزالہ جانے سے منع کرتی تھی اور وہ اسے زبردستی لے کر جاتی تھیں۔ غزالہ غصہ کرتی اور پھر مان جاتی۔ شاپنگ کے دوران اور واپس آکر بھی وہ انہیں سناتی جسے وہ ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دیتی تھیں۔ دوسرے سیمسٹر میں تھیسس کی تیاری کے لیے عملی کام بھی کرنا تھا۔ ریحانہ پہلے ہی این جی او پروجیکٹ چلا رہی تھی۔ غزالہ اور سوہا بھی اس میں شامل ہو گئیں۔ ان کا کوئی خاص تھیسس نہیں تھا اس لیے انہوں نے بھی غریب بچوں کی تعلیم کا موضوع چن لیا۔ سوہا نے تو باقاعدہ ریحانہ کا شکریہ ادا کیا۔

''تیری وجہ سے ہمیں آسانی رہی، ورنہ اس میں بھی سر کھپانا پڑتا۔''

''یہ اتنا مشکل بھی نہیں ہے۔'' غزالہ نے اختلاف کیا۔

''تو پہلے ہی کوئی اور موضوع کیوں نہیں لے لیا؟'' سوہا نے فوراً پوچھا تو غزالہ نے شانے اچکائے۔

''جب تم دونوں نے لیا تو میں نے بھی یہی مناسب سمجھا۔''

''تو اب لے لو۔'' سوہا نے پھر چٹکی کاٹی۔ ''ابھی تو ہمارا پہلا سیمسٹر ہے اور تھیسس فائنل نہیں ہوا ہے۔''

غزالہ نے اسے گھورا پھر مسکرانے لگی۔ ''نہیں اب مجھے اسی میں مزہ آرہا ہے۔''

''تیرے پاس تو کھلا پیسا ہے چاہے تو کسی سے تھیسس بنوا لے۔''

''وہ تیرے پاس بھی کم نہیں ہے۔'' غزالہ نے جواب دیا۔ ''تو کیوں نہیں بنوا لیتی؟''

''کیونکہ ہم پڑھ کر اور محنت کر کے ماسٹر کرنا چاہتے ہیں۔'' ریحانہ نے سیز فائر کراتے ہوئے کہا۔ ''اس لیے اپنی کوشش سے ہی پڑھنا اور تھیسس مکمل کرنا ہے۔''

موضوع ایک ہی تھا لیکن انہوں نے کیٹگری مختلف چنی تھی۔ ریحانہ نے غریب بچوں کی تعلیم میں رکاوٹ معاشرتی عوامل کو بہ طور موضوع چنا تھا۔ جہاں تک عملی کام کا تعلق تھا تو سوہا اور غزالہ پیسے سے اور اپنی ذات سے شریک ہوتی تھیں مگر پلاننگ کا سارا کام ریحانہ کو کرنا پڑتا تھا۔ وہ جس اسکول کے بچوں کی مدد کرتی تھیں اس کے نئے تعلیمی سال کا آغاز ہونے والا تھا اور انہیں سو بچوں کے لیے یونیفارم، جوتوں اور مکمل کورس کا بندوبست کرنا تھا۔ تینوں نے اس میں برابر کا حصہ ڈالا تھا مگر عملی طور پر سارا کام ریحانہ کو کرنا پڑا تھا۔ سب سے مشکل مرحلہ یونیفارم اور جوتوں کا سائز لینا تھا۔ اس کے لیے اسے ٹیلر کے ساتھ ایک پورا دن اسکول میں گزارنا پڑا۔ وہ کام میں لگی ہوئی تھی۔ سوہا اور غزالہ اسکول کے ساتھ ہی موجود باغ میں گھوم پھر رہی تھیں اور وہاں لگی رس بھری توڑ کر کھا رہی تھیں۔ واپسی میں ریحانہ انہیں سناتی رہی اور وہ ہنستی رہیں۔

''بس بہت ہو گیا۔ اب تم دونوں کو میرے ساتھ چلنا ہوگا اور برابر کا کام کرنا ہوگا۔ کیا میں پاگل ہوں؟''

''نہیں تو۔'' سوہا نے مزے سے کہا۔ ''مگر اسی طرح کام کرتی رہیں تو جلد ہو جاؤ گی۔''

غزالہ مسکرائی۔ ''اور ہمیں پاگل ہونے کا شوق نہیں ہے۔''

''میں تم دونوں کو ابھی بتاتی ہوں۔'' ریحانہ نے تکیہ اٹھایا تو غزالہ نے فوراً ہار مان لی۔

''اوکے بابا، میں تیار ہوں۔ پلیز کوئی ہنگامہ مت کرنا۔ پچھلی بار مجھے وارڈن سے خاصی باتیں سننی پڑی تھیں۔''

''میں تیار نہیں ہوں۔'' سوہا ڈھٹائی سے بولی مگر جب ان دونوں نے آستینیں چڑھائیں تو اسے ماننا پڑا اور قسم بھی کھانی پڑی کہ وہ بعد میں مکرے گی نہیں۔ قسم کھانے کے بعد سوہا کا موڈ آف ہو گیا اور اب وہ دونوں ہنس رہی تھیں۔

''یہ بدمعاشی ہے۔'' سوہا چڑ کر بولی۔

''آج کل شرافت کا دور کہاں ہے۔''

سوہا نے تکیہ اٹھایا تو وہ مار کھاتے ہوئے بھی ہنس رہی تھیں۔ اگلے دن وہ بیگز اور کورس کا آرڈر دینے گئیں۔ ریحانہ خاصے عرصے سے اسی اسٹیشنرز سے کورس لے رہی تھی۔ وہ اچھا خاصا ڈسکاؤنٹ دیتا تھا مگر اس بار اس نے ڈسکاؤنٹ تقریباً ختم کر دیا۔ ریحانہ نے وجہ پوچھی تو اس نے جواب دیا۔ ''بی بی! ہم نے کتابوں کی قیمت کم رکھنے کے لیے کتابیں خود چھپوانا شروع کی تھیں۔''

''یہ تو ہوشیاری دکھا رہا ہے۔'' سوہا نے ریحانہ کے کان میں کہا مگر دکان والے نے سن لیا۔

''کیا کریں جی مجبوری ہے۔ اوریجنل پبلشر نے قیمت اتنی زیادہ رکھی ہوتی ہے کہ ماں باپ دے نہیں سکتے اور ہمارا کمیشن بہت کم ہوتا ہے۔ اب ماں باپ ہم سے لڑتے ہیں کہ ہم ڈسکاؤنٹ نہیں دے رہے اس لیے دو نمبری کرنی پڑتی ہے۔ پہلے اچھا ڈسکاؤنٹ اس لیے

دے سکتے تھے کہ میٹریل وارے میں آتا تھا مگر اب کاغذ بہت مہنگا ہوگیا ہے اور پرنٹنگ کا خرچ بھی بڑھ گیا ہے۔ ہمارا کمیشن بھی مشکل سے بچتا ہے تو اس میں ڈسکاؤنٹ کہاں سے دیں؟''

''کتنا بڑھ گیا ہے میٹریل اور پرنٹنگ کا خرچ؟'' ریحانہ غصے سے بولی۔ ''غضب خدا کا اس کتاب کا وزن ایک پاؤ ہے اور قیمت ساڑھے پانچ سو روپے۔ اس وزن کی بہترین کتاب بھی اس قیمت میں نہیں آتی ہے۔''

''وہ تو جو کتاب ہوتی ہے بندے کی مجبوری ہوتی ہے لے یا نہ لے۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ کورس لینا مجبوری ہے اس لیے مجبوری کا پورا فائدہ اٹھاؤ۔'' ریحانہ بولی تو دکان دار نے لہجہ بدل لیا۔

''دیکھیں بی بی، آپ نے لینا ہے تو لیں ورنہ آپ کی مرضی...... قیمت اتنی ہی ہوگی۔''

اپنی بات مکمل کر کے دکان دار نے زیرلب کچھ کہا تو ٹھنڈے مزاج والی ریحانہ کو بھی غصہ آگیا۔ ''کیا...... کیا کہا تم نے؟''

''کچھ نہیں جی، جائیں اپنا کام کریں اور مجھے اپنا کام کرنے دیں۔''

''تمہیں بات کرنے کی تمیز نہیں ہے۔''

''جی نہیں ہے۔'' وہ اس بار بدتمیزی سے بولا۔ ''میرا وقت ضائع نہ کریں۔''

ریحانہ کا غصہ بڑھ گیا تھا مگر سوہا نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔ ریحانہ کو اصل غصہ اس بات پر تھا کہ پہلے بھی دکان والا اس کے آگے بچھا جاتا تھا اور اتنے خوشامدانہ انداز میں بات کرتا تھا کہ ریحانہ کو الجھن ہونے لگتی تھی۔ اب اس نے اپنا رویہ یوں بدلا تھا جیسے گرگٹ رنگ بدلتا ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی عقب سے آواز آئی۔ ''اینی پرابلم لیڈیز؟''

انہوں نے مڑ کر دیکھا تو شہباز کھڑا ہوا تھا۔ دکان دار اسے دیکھ کر گھبرا گیا۔ وہ سمجھا کہ یہ لمبا چوڑا لڑکا ان کے ساتھ آیا ہے اور اب وہ اس سے اس کی بدتمیزی کا جواب طلب کرے گا۔ اس نے جلدی سے لہجہ بدل کر کہا۔ ''بی بی میرا مطلب......''

''چلو یہاں سے۔'' ریحانہ نے ان دونوں سے کہا اور وہ دکان سے باہر نکل آئیں۔ شہباز ان کے ساتھ تھا۔ اس نے کہا۔

''کیا اس نے آپ لوگوں سے بدتمیزی کی ہے، میں ابھی اس کا دماغ درست کرتا ہوں۔''

''نہیں، قیمت کے مسئلے پر بات ہو رہی تھی۔'' ریحانہ نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ''آپ کا شکریہ۔''

''اس میں شکریے کی کوئی بات نہیں ہے مگر یہاں تو اسکول کے بچوں کا کورس ملتا ہے۔''

''ہم وہی لینے آئے تھے۔'' سوہا نے کہا اور مختصر الفاظ میں شہباز کو بتایا کہ دکان دار نے کس طرح قیمت بڑھائی اور آنکھیں ماتھے پر رکھ لیں۔

شہباز کے ماتھے پر شکنیں آگئیں مگر اس نے دکان دار کے بارے میں کچھ کہنے کے بجائے ان سے کہا۔ ''مجھے کورس کی لسٹ دیں۔ میرے کچھ جاننے والے پبلشنگ کا کام کرتے ہیں اگر ان کے پاس یہ کتابیں پرنٹ ہوتی ہیں تو آپ کو خاصی کم قیمت میں مل جائیں گی۔''

''شکریہ......'' ریحانہ نے منع کرنا چاہا مگر سوہا اس کی بات کاٹ کر بولی۔

''کیوں نہیں، اگر ایسا ہو جائے تو زبردست رہے گا۔ ہم زیادہ سے زیادہ غریب بچوں کے لیے کورس کا بندوبست کر سکیں گے۔'' سوہا نے کہتے ہوئے اسے کورس کی لسٹ پکڑا دی۔

''میں کل یونیورسٹی میں بتاؤں گا۔'' شہباز نے کہا اور چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی ریحانہ سوہا پر برس پڑی۔

''غریب بچوں کی بچی، تجھے اندازہ نہیں ہے وہ اپنی جیب سے ملا کر ہمیں کورس تھما دے گا۔''

''تو اس میں کیا برائی ہے۔'' سوہا ہنس کر بولی۔ ''کارِ خیر ہے، اس میں وہ بھی شامل ہو جائے تو ہمارے ثواب میں کون سی کمی آجائے گی۔''

''مجھے یہ پسند نہیں ہے۔'' ریحانہ بولی۔

''مجھے بھی۔'' غزالہ نے کہا۔

''ٹھیک ہے۔'' سوہا بھنا کر بولی۔ ''میں لسٹ واپس لے آتی ہوں۔ تم لوگوں کی جو مرضی چاہے کرو۔''

سوہا جانے لگی تو ریحانہ نے اسے پکڑ لیا۔ ''اب تو دے دی ہے۔ مگر آئندہ خیال رکھنا، ہمیں لڑکوں سے بے تکلفی پسند نہیں ہے اور ایسی باتوں سے بے تکلفی آجاتی ہے۔ اگر کوئی آپ کا کام کر کے دے تو اگلی بار آپ اس سے رکھائی سے تو نہیں پیش آسکتے۔''

سوہا کا منہ پھول گیا تھا مگر اگلے روز اس نے تسلیم کیا کہ اس نے غلطی کی تھی۔ ''لڑکے واقعی اسی طرح لڑکیوں

کے قریب آتے ہیں اور پھر پھیل جاتے ہیں۔''

وہ ایک فری پیریڈ کا فائدہ اٹھا کر کیفے ٹیریا میں آئی ہوئی تھیں۔ غزالہ نے کہا۔''دیکھنا ابھی وہ آئے گا اور پہلے تو کام کا بتائے گا کہ ہوگیا ہے اور اس کے بعد ہم سے اجازت لے گا۔ ہم مروت میں اسے چائے کی آفر کریں گے اور وہ نہ نہ کرتے ہوئے......''

''نہیں مانے گا۔''شہباز کی آواز قریب سے آئی تو غزالہ کی آواز بند ہوگئی۔ شہباز نہ جانے کس وقت آیا انہیں پتا ہی نہیں چلا تھا۔ اس نے ایک کارڈ ریحانہ کے سامنے میز پر رکھا۔''یہ اس پبلشر کا کارڈ ہے جو کورس پرنٹ کرتا ہے۔ اس سے بات کرلیں اور امید ہے وہ آپ کو بہترین ڈسکاؤنٹ دے گا۔''

''شکریہ۔''ریحانہ نے نروس ہو کر کہا۔ اگرچہ غزالہ بول رہی تھی مگر وہ بھی تو ان کے ساتھ۔

''ویلکم۔''وہ بولا اور چلا گیا۔ ان میں سے کسی نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ غزالہ کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور سوہا اپنی ہنسی روکنے کی انتہائی کوشش کر رہی تھی۔ غزالہ غرائی۔

''اگر تو ہنسی تو ہماری دوستی ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گی۔''

''مجھے تو سچویشن پر ہنسی آ رہی ہے۔ تو اس کے بارے میں بول رہی تھی اور وہ پشت پر کھڑا ہوا سن رہا تھا۔''

اس بار غزالہ خفیف ہوگئی۔ اس نے جھینپ کر کہا۔''تم دونوں دیکھ نہیں سکتی تھیں؟''

''میری نظر تو ویٹر کو تلاش کر رہی تھی۔''ریحانہ بولی۔

''میں اپنا موبائل دیکھ رہی تھی۔''سوہا نے کہا۔ اس زمانے میں موبائل نیا نیا متعارف ہوا تھا یہ صرف کال کے لیے استعمال ہوتے تھے۔ ان سے ایس ایم ایس بھی نہیں کیا جاتا تھا۔ ان تینوں میں صرف سوہا کے پاس موبائل تھا۔ غزالہ کی بہن نے اسے باہر سے جدید سیٹ بھیجا تھا مگر وہ یہاں کارآمد نہیں تھا۔ یہاں جو سیٹ چلتے تھے، وہ اسے پسند نہیں تھے۔ اب غزالہ پریشان ہوگئی۔

''وہ میرے بارے میں کیا سوچ رہا ہوگا؟''

سوہا نے اسے گھورا۔''تجھے کب سے فکر ہوگئی کہ کوئی لڑکا تیرے بارے میں کیا سوچ رہا ہوگا؟''

ریحانہ کو بھی اس کے جملے پر حیرت ہوئی تھی۔ وہ تو فری ہونے والے لڑکوں کی ایسی طبیعت صاف کرتی تھی اور اس نے کبھی پلٹ کر ایک بار بھی تشویش ظاہر نہیں کی کہ وہ اس کے بارے میں کیا سوچے گا؟ مگر شہباز کے بارے میں وہ فکرمند تھی۔ اس نے کہا۔''اس بے چارے نے فری ہونے کی کوشش نہیں کی بلکہ ہمارے کام آرہا تھا۔''

''کام آگیا۔''سوہا نے اس کا دیا ہوا کارڈ اٹھایا۔''اس لیے آگے کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''یار! مجھے تو شرم آرہی ہے، وہ بلا وجہ سن کر گیا ہے اور اب ہم اس کے دیئے کانٹیکٹ سے فائدہ اٹھائیں۔''ریحانہ بولی۔

''تم لوگ فکر مت کرو، میں اس سے موقع پا کر سوری کرلوں گی۔''سوہا نے کہا۔''کانٹیکٹ سے فائدہ نہ اٹھانا اس کے خلوص کی توہین ہوگی۔ ہم ضرور فائدہ اٹھائیں گے۔''

ریحانہ نے سکون کا سانس لیا۔''یہ ٹھیک ہے ورنہ یار کتنی بدتہذیبی ہے کہ وہ ہمارے کام آیا اور ہم نے اسے بے عزت کردیا۔''

ریحانہ نے پبلشر کو کال کی اور اس نے مکمل کورس کے اتنے ریٹ دیے کہ ریحانہ کو یقین ہوگیا کہ شہباز نے اپنا ذمہ لے کر اتنی کم قیمت کرائی ہے۔ سوہا نے موقع پا کر شہباز سے اکیلے میں معذرت کرلی تھی اور اس نے معذرت قبول بھی کرلی تھی۔ ان کے پاس جتنی رقم تھی، اس سے انہوں نے زیادہ سے زیادہ کورس خرید لیا تاکہ زیادہ بچوں کو دے سکیں۔ ریحانہ بہت خوش تھی کہ اس نے جتنے کورس کا وعدہ کیا تھا، اس سے زیادہ ہی اسکول کو دیا تھا۔ وہاں پڑھنے والے بچوں کی تعداد بھی بڑھ گئی تھی اور یہ سب بہت غریب گھرانوں کے بچے تھے جہاں دو وقت کا کھانا بھی مشکل سے ملتا تھا۔ وہ بچوں کو تعلیم کہاں سے دلاتے۔ کورس کے بعد یونیفارم اور جوتوں کا مرحلہ آیا مگر یہ بھی خوش اسلوبی سے ہوگیا۔ یونیفارم وہ ایک چھوٹی گارمنٹ فیکٹری سے سلواتے تھے اور اسی طرح جوتے بھی ایک فیکٹری سے براہ راست لیتے تھے۔ دونوں چیزوں میں انہیں اچھا خاصا ڈسکاؤنٹ مل جاتا تھا۔

ان تینوں میں صرف غزالہ کے پاس کھلا پیسا تھا۔ اس کے اکاؤنٹ میں ہر مہینے لاکھ روپے سے زیادہ ہی رقم آتی تھی۔ مگر وہ فلاحی کاموں میں اتنی سرگرمی سے حصہ نہیں لیتی تھی۔ حالانکہ وہ چاہتی تو زیادہ رقم بھی اس مد میں خرچ کرسکتی تھی۔ ایسا بھی نہیں تھا کہ وہ پیسا خرچ کرنے کے معاملے میں محتاط ہو۔ خود پر وہ بہت کھل کر خرچ کرتی تھی۔ اس کا لباس ہمیشہ اعلیٰ ترین ہوتا تھا۔ وہ باہر سے آئے بیش قیمت پرفیوم استعمال کرتی تھی۔ ہوٹلنگ اور سیر وتفریح میں بے

تحاشا خرچ کرتی تھی۔

سوہا اور ریحانہ بھی اچھے کھاتے پیتے گھرانوں سے تھیں۔ مگر ان کی پاکٹ منی کی ایک لمٹ تھی اور اگر اسی طرح انہیں اوپر سے کچھ رقم درکار ہوتی تو اس کی بھی حد تھی۔ وہ کھل کر اور بنا حساب کتاب کے خرچ نہیں کرسکتی تھیں۔ انہیں فلاحی کاموں پر خرچ کرنے کے لیے اپنے ذاتی اخراجات ایک حد میں رکھنا پڑتے تھے اور بعض اوقات تو ان میں کٹوتی کرنا پڑتی تھی تب کہیں جا کر وہ دوسروں کے لیے کچھ کرسکتی تھیں۔ خاص طور سے ریحانہ جسے ویسے بھی پاکٹ منی کے بعد ماں باپ سے مانگتے ہوئے شرم آتی تھی۔ بھائیوں سے اس نے آج تک منہ سے رقم نہیں مانگی۔ ہاں چیزوں کی فرمائش ضرور کردیتی تھی۔ اس کے باوجود سارے بھائی اسے باقاعدگی سے جیب خرچ دیتے تھے اور ضمیر احمد تو مہینے کے درمیان میں بھی اس کے ہاتھ پر کچھ نہ کچھ رقم رکھتے رہتے تھے کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ وہ نہ صرف یونیورسٹی میں فلاحی کاموں میں حصہ لیتی ہے بلکہ ویسے بھی دوسروں کی مدد کرنے سے بھی نہیں ہچکچاتی۔

وہ جس این جی او کے لیے کام کرتی تھی اس کے فلاحی شوز اور پروگراموں کے لیے زیادہ وقت نکالتی تھی۔ تیسرے سیمسٹر میں گرمیوں کی چھٹیاں آئیں اور ریحانہ این جی او کی جانب سے کچھ پروگراموں میں مصروف ہوگئی۔ اس نے غزالہ اور سوہا کی طرف سے ناردرن ایریاز کے ٹور کی تجویز مسترد کردی۔ وہ دونوں یونیورسٹی کی طرف سے ایک گروپ کے ساتھ جارہی تھیں۔ اول تو ریحانہ کبھی اس قسم کے ٹورز پر نہیں گئی تھی۔ دوسرے اس کی مصروفیات زیادہ تھیں۔ اسے معلوم تھا کہ اس کے پاس یہی ایک سال ہے اور ممکن ہے ماسٹرز کے فوراً بعد اس کی شادی کردی جائے۔ اس کے بعد پتا نہیں اسے اجازت ملتی ہے یا نہیں۔ ریحانہ کے انکار کے بعد وہ دونوں ٹور پر چلی گئیں۔ واپسی کے بعد غزالہ اپنے گھر چلی گئی تھی اور سوہا آرام کرنے لگی۔ پندرہ روزہ ٹور نے اسے تھکا دیا تھا کیونکہ انہیں مسلسل سفر کرنا پڑا تھا۔ چھٹیوں کے آخری حصے میں وہ ریحانہ کا ہاتھ بٹانے آگئی۔ اس وقت ریحانہ ایک فلاحی شو کرنے جارہی تھی۔ اس شو کے لیے ایک چھوٹا سا ڈراما بھی ترتیب دیا ہوا تھا۔ اس کے خیال میں اس ڈرامے کے مرکزی کردار کے لیے غزالہ مناسب تھی مگر جب اس نے اسے کال کرکے پوچھا تو اس نے انکار کردیا۔

”مجھ سے یہ اداکاری جیسی فضول چیز نہیں ہوگی۔“

”بہت آسان ہے بھئی۔“ ریحانہ نے اسے ترغیب دی مگر وہ نہیں مانی۔ مجبوراً ریحانہ نے یہ کردار خود ادا کیا اور خوب داد سمیٹی۔ اس نے زندگی میں پہلی بار اداکاری کی تھی۔ اسے امید نہیں تھی کہ اسے اتنا سراہا جائے گا۔ آنے والے ہر فرد نے حسب توفیق غریب بچوں کی تعلیم کے لیے اپنی جیب سے کچھ نہ کچھ دیا تھا۔ ڈرامے کے بعد اسٹیج کے پیچھے سب ریحانہ کو داد دے رہے تھے تو غیر متوقع طور پر شہباز وہاں آگیا۔ اس نے بھی ریحانہ کو سراہا۔ ”آپ نے بہت اچھا کردار ادا کیا۔ دیکھنے میں آپ سادہ سی لگتی ہیں مگر اس کردار میں آپ نے رنگ بھر دیا۔“

”شکریہ۔“ اس نے جھینپ کر کہا۔ ”مجھے خود بھی امید نہیں تھی کہ میں اچھا کام کرلوں گی۔“

”صرف اچھا نہیں آپ نے بہت اچھا کام کیا ہے۔“ شہباز نے زور دے کر کہا۔ اس کے جانے کے بعد این جی او کے سیکریٹری نے ریحانہ کو بتایا کہ وہ ایک لاکھ کا چیک دے کر گیا تھا۔ یہ اتنی بڑی رقم تھی کہ باقی تمام عطیات کے مقابلے میں بڑی تھی۔ ریحانہ اور سوہا اس کی فراخ دلی پر حیران رہ گئیں۔ انہیں توقع نہیں تھی کہ شہباز اتنی بڑی رقم کا چیک دے گا۔ جب وہ ڈریسنگ روم میں آیا تو اس نے اس بارے میں ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا، صرف ریحانہ کی اداکاری کی تعریف کرکے چلا گیا تھا۔ سوہا اور ریحانہ ایک ہی گاڑی میں آئی تھیں۔ سوہا اپنے پاپا کی گاڑی لے آئی تھی۔ واپسی میں سوہا اسے چھوڑتی ہوئی جاتی۔ اس نے ریحانہ سے پوچھا۔

”تو نے شہباز کو دعوت دی تھی؟“

”نہیں، میں نے تو اپنے شعبے کے اسٹوڈنٹ انچارج فراز بھائی کو اطلاع دی تھی اور ان کی ذمے داری تھی سب کو بتانا۔ شاید شہباز کے کسی جاننے والے نے اسے بلالیا ہو۔ ویسے اوپن انٹری تھی، کوئی بھی آسکتا تھا۔“

سوہا نے اسے معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ ”ریئلی؟“

”تو کیا میں جھوٹ بول رہی ہوں؟“ اس نے تیز لہجے میں پوچھا۔

”نہیں، میرا مطلب ہے کہ شہباز سچ مچ کارِ خیر کے لیے ہی آیا تھا نا...؟“

”ظاہر ہے ورنہ ایک لاکھ کی رقم دے کر کیوں جاتا؟“

”بی بنو، مجھے تو چکر ہی کچھ اور لگ رہا ہے۔ ایک تو بن بلائے آگیا اور پھر خاص طور سے تیری تعریف کرنے ڈریسنگ روم تک آگیا اور پھر ایک لاکھ روپے ڈونیٹ بھی

کردیے۔‘‘

’’بکواس نہ کر۔‘‘ ریحانہ نے جھینپ کر کہا۔’’وہ اس قسم کا آدمی نہیں ہے اور نہ ہی میں ایسی ہوں۔‘‘

’’تیرا تو مجھے پتا ہے مگر بی بی یہ مرد ذات اوپر سے جتنی شریف نظر آتی ہے، اندر سے ہرگز ایسی نہیں ہوتی۔ ان سے ذرا بچ کر رہنا پڑتا ہے۔‘‘

’’خبردار کرنے کا شکریہ۔‘‘ ریحانہ نے مسکرا کر کہا۔ ’’میں بہت بچ بچا کر رہتی ہوں۔‘‘

’’بابا جب برا وقت آتا ہے تو کوئی بچ نہیں سکتا۔‘‘ سوہا نے کہا۔

’’تو کسی اور موضوع پر بات نہیں کرسکتی؟‘‘

’’بالکل کرسکتی ہوں۔‘‘ سوہا نے مستعدی سے کہا۔’’تیرے ڈرامے پر بات کرتے ہیں۔ تو نے کیا کردار ادا کیا کہ دوسرے ڈپارٹمنٹ سے لوگ داد دینے چلے آئے۔‘‘

’’سوہا۔‘‘ ریحانہ نے دانت پیسے۔ ’’قسم سے تو اس وقت ڈرائیو نہ کررہی ہوتی تو میرے ہاتھ سے شہید ہوجاتی۔‘‘

’’چلو ڈرائیونگ کا ایک فائدہ تو ہوا۔‘‘ سوہا ہنسی پھر سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔’’یہ اچھا ہی ہوا کہ غزالہ نے انکار کردیا۔ وہ کبھی اس معیار کی اداکاری نہیں کرسکتی تھی۔‘‘

’’میرے خیال میں تو وہ بہت اچھی اداکاری کرتی ہے۔‘‘ ریحانہ نے اس بار معنی خیز انداز میں کہا۔

’’اور وہ بھی حقیقی زندگی میں۔‘‘ سوہا نے بھی اسی انداز میں کہا۔’’مگر ظاہر نہیں ہونے دیتی۔‘‘

’’بعض لوگ ہوتے ہیں ایسے۔‘‘ ریحانہ سنجیدہ ہو گئی۔’’بہرحال خوبیاں خامیاں سب میں ہوتی ہیں اور وہ ہماری دوست ہے۔‘‘

’’مگر ہمارے ساتھ بھی اداکاری سے نہیں چوکتی۔‘‘ سوہا نے شکوہ کیا۔

’’چل چھوڑ یار، وہ خوش رہے بس اتنا کافی ہے۔‘‘

’’اسے اداکاری کا شوق ہے مگر اس نے تمہیں انکار کردیا۔‘‘

’’میں نے کہا نا چھوڑ یار...... اگر وہ میرے شو میں کام نہیں کرنا چاہتی تھی تو اس کی مرضی۔‘‘

سوہا خاموش ہوگئی۔ یہ بات ریحانہ نے بھی محسوس کی کہ غزالہ کو اداکاری سے دلچسپی تھی اور اس نے جان بوجھ کر اس کے شو میں کام کرنے سے انکار کیا تھا مگر اس نے اسے دل پر نہیں لیا۔ کچھ محسوس بھی کیا مگر بعد میں بھول گئی۔ اس کی فطرت ہی ایسی تھی کہ وہ باتوں کو دل پر نہیں لیتی تھی۔ وہ بھول چکی تھی پھر سوہا نے کہا تو اسے خیال آیا مگر اس نے پھر اسے ذہن سے جھٹک دیا۔ غزالہ نے کہا تھا کہ وہ چھٹیوں کے آخری ہفتے میں آئے گی کیونکہ اسے یہاں کچھ خریداری کرنی تھی اور یہ کام یونیورسٹی کھلنے سے پہلے کرنا تھا۔ اس نے ان دونوں سے کہہ دیا تھا کہ وہ تیار رہیں اور وہ ان کے ساتھ ہی خریداری کرے گی۔ سوہا نے اسے گھر پر اتارتے ہوئے کہا۔’’یار! سچی بات ہے مجھے بالکل فرصت نہیں ہوگی کیونکہ میرے کزن کی شادی ہے اور مجھے تیاری میں اس کا ساتھ دینا ہے۔ تم جانتی ہو شادی کی شاپنگ کتنی تھکا دینے والی اور طویل ہوتی ہے۔‘‘

’’تم فکر مت کرو، میں غزالہ کے ساتھ چلی جاؤں گی۔‘‘

’’تم تو جاؤ گی مگر وہ مجھے بعد میں چھوڑے گی نہیں۔ تم اس کی عادت جانتی ہو۔ اگر اسے کسی کی بات بری لگے تو کتنے عرصے تک اسے سناتی اور جتاتی رہتی ہے۔‘‘

ریحانہ خاموش ہوگئی۔ دیکھا جائے تو سوہا اور غزالہ اس کی پرانی سہیلیاں تھیں۔ انہوں نے ایک ہی کالج میں پڑھا تھا اور انٹر سے ان کی دوستی چلی آرہی تھی۔ سوہا غزالہ کی جن باتوں کی شکایت کررہی تھی، وہ اس میں شروع سے تھیں۔ مگر جب سے ان کی ریحانہ سے دوستی ہوئی تھی اور سوہا

دونوں کا موازنہ کرنے لگی تھی تو غزالہ سے شکایتیں بڑھ گئی تھیں۔ حالانکہ ریحانہ نے اسے بارہا سمجھایا تھا کہ ہر انسان مختلف ہوتا ہے اور اچھائیاں برائیاں سب میں ہوتی ہیں۔ دوستی اسی چیز کا نام ہے کہ آدمی کوئی بات دل پر نہ لے ورنہ دوستی زیادہ عرصے نہیں چلتی۔ سوہا مان جاتی تھی مگر کچھ عرصے بعد پھر شکایت کر رہی ہوتی تھی۔ چھٹیوں سے پہلے سوہا اور غزالہ کا خاصا زوردار جھگڑا ہوا تھا اور اگر ریحانہ ثالث بن کر بیچ بچاؤ نہ کراتی تو ان کی دوستی شاید اسی وقت ختم ہو جاتی۔ دوستی تو ختم نہیں ہوئی مگر آخری وقت تک ان کے منہ پھولے رہے تھے۔ پھر ٹور کی تفریح نے ان کا موڈ ٹھیک کیا تھا۔

غزالہ آئی تو نہ چاہتے ہوئے بھی ریحانہ اس کے ساتھ شاپنگ میں لگ گئی۔ غزالہ کی عادت تھی کہ وہ چیز بہت زیادہ دیکھ بھال کر لیتی تھی اور بعض اوقات تو ایک چیز کے لیے دس جگہوں پر جاتی تھی۔ اس کے ساتھ شاپنگ بہت تھکا دینے والا کام بن جاتا تھا۔ سوہا بھی ذرا گھوم پھر کر شاپنگ کرتی تھی مگر اتنا زیادہ بھی نہیں اور ریحانہ پن پوائنٹ شاپنگ کی قائل تھی۔ وہ گھر سے ذہن بنا کر نکلتی تھی کہ کون سی چیز کہاں سے لینی ہے اور وہ لے کر گھر واپس آ جاتی۔ وہ صبح نکلیں اور چار بجے لنچ کرنے ایک ریستوران میں آئیں جہاں لنچ کا وقت ختم ہو گیا تھا اور مجبوراً انہیں اسنیکس اور چائے پر گزارہ کرنا پڑا۔ یہاں گفتگو کے دوران ریحانہ نے غزالہ کو اپنے شو کے بارے میں بتایا۔ ظاہر ہے اس میں شہباز کا ذکر بھی آیا تو غزالہ چونک گئی۔ اس نے بے ساختہ پوچھا۔ ''شہباز...... وہ بھی آیا تھا؟''

''اس پر تو مجھے بھی حیرت ہوئی۔ میں نے تو صرف اپنے شعبے کو انوائٹ کیا تھا مگر وہ بھی چلا آیا اور یہی نہیں اس نے میری اداکاری کی تعریف بھی کی اور این جی او کے لیے ایک لاکھ ڈونیٹ کیا۔''

''یقین نہیں آ رہا۔'' غزالہ نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

''اس میں یقین نہ کرنے والی کون سی بات ہے۔'' ریحانہ کو حیرت ہوئی۔ ''یہ سب حقیقت ہے جو میں بتا رہی ہوں۔''

غزالہ گڑبڑائی۔ ''مطلب یہ کہ وہ واقعی غریب بچوں کا اتنا ہمدرد ہے؟''

ریحانہ نے شانے اچکائے۔ ''کسی کے بارے میں کیا کہہ سکتے ہیں۔ ہم کون سا شہباز کے بارے میں جانتے ہیں۔''

''ہو سکتا ہے اس نے کسی مقصد کے تحت ایک لاکھ روپے دیے ہوں۔''

''کس مقصد کے تحت؟''

''کیا کہہ سکتے ہیں۔'' غزالہ نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''ہم کون سا اسے جانتے ہیں۔''

''تب بات کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔'' ریحانہ کا موڈ آف ہو گیا۔ غزالہ اس وقت بہت عجیب سے انداز میں بات کر رہی تھی اور شاید اس نے ریحانہ کا موڈ بھانپ لیا تھا۔ اچانک وہ ہنسی اور بولی۔

''ٹھیک کہہ رہی ہو، کیا ضرورت ہے اس کے بارے میں بات کرنے کی۔'' غزالہ نے کہتے ہوئے موضوع بدل دیا اور اسے اپنے ناردرن ایریا کے ٹور کی تفصیلات بتانے لگی مگر سوہا اسے ساری تفصیلات بتا چکی تھی اس لیے وہ.... بے دلی سے سنتی رہی اور اسنیکس سے اپنی بھوک مٹاتی رہی۔ ابھی غزالہ کی کچھ شاپنگ باقی تھی مگر ریحانہ نے کہا۔

''سوری یار! میں بہت تھک گئی ہوں۔ چھٹیوں میں بھی آرام کرنے کا موقع نہیں ملا۔ سارا ہی وقت این جی او کو دے دیا۔''

''تم نے بلا وجہ خود پر اتنا بوجھ لادا ہوا ہے۔'' غزالہ نے کہا۔ ''اپنے اوپر توجہ دینے کا وقت نہیں ملتا... نہ تفریح پر جاتی ہو۔''

''یہی تو اصل زندگی ہے، کسی کے کام آنا۔'' ریحانہ بولی۔

غزالہ اتنی آسانی سے پیچھا چھوڑنے والی نہیں تھی۔ اس نے کہا۔ ''اچھا کل شام کچھ وقت نکال لینا۔ پرسوں مجھے بیوٹی پارلر سے کام ہے۔ وہ میں اکیلے نمٹا لوں گی۔''

صبح کی چھٹی مل رہی تھی اس لیے اب ریحانہ کے لیے انکار کرنا مشکل ہو گیا۔ اس نے سر ہلایا۔ ''لیکن تم جانتی ہو میرے گھر میں دیر تک لڑکیوں کو باہر رہنے کی اجازت نہیں ہے۔''

''تم فکر مت کرو ہم رات سے پہلے واپس آ جائیں گے۔''

دوستی میں ریحانہ نے ہمیشہ ان حدود کا خیال رکھا تھا جو اس کے گھر والوں نے بنائی تھیں۔ اسے خود بھی ان حدود سے باہر جانا اچھا نہیں لگتا تھا۔ یہ بات اس نے سوہا اور غزالہ پر بھی واضح کر دی تھی کہ وہ اسے کسی ایسے کام کے لیے مجبور نہیں کریں گی جس کی بنا پر اسے اپنے گھر کا کوئی اصول توڑنا پڑے۔ غزالہ اور کسی حد تک سوہا نے بھی اسے بیک ورڈ ہونے کے طعنے دیے تھے مگر ریحانہ نے یہ طعنے ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دیے تھے اور اپنی بات پر قائم رہی تھی۔ چند ایک تجربات کے بعد انہوں نے اسے مجبور کرنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ یونیورسٹی کھل گئی۔ غزالہ اور سوہا دو دن کی تاخیر سے آئی تھیں مگر ریحانہ پہلے دن ہی یونیورسٹی

میں موجود تھی۔ تعلیم کے معاملے میں وہ سہل پسندی سے کام لینے کی قائل نہیں تھی۔ یہی وجہ تھی کہ یونیورسٹی میں اس کی پوزیشن برقرار تھی۔ دونوں سمسٹر میں وہ پورے ڈپارٹمنٹ میں اول رہی تھی اور اسے امید تھی کہ وہ تیسرے سمسٹر میں بھی ٹاپ کرے گی۔

تیسرا سمسٹر سب سے مشکل ثابت ہوا۔ پڑھائی کا بوجھ تو تھا ہی، ساتھ ہی ریحانہ اپنا تھیسس بھی مکمل کر رہی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ آخری سمسٹر سے پہلے وہ اسے مکمل کر لے اور پھر فنشنگ کا کام رہ جائے۔ اس نے جو سوشل ورک کیا تھا وہ اسے تھیسس کا ایک حصہ بنا رہی تھی۔ سوہا اور غزالہ بھی بہت مصروف رہیں اور انہیں ان دنوں سر کھجانے کی فرصت بھی مشکل سے ملی۔ کہیں آنا جانا نہیں ہوا اور نہ ہی کوئی مشترکہ تفریح ہوئی۔ تیسرے سمسٹر کے پیپرز ہوئے تو انہوں نے سکون کا سانس لیا۔ اگرچہ نئے سمسٹر کی کلاسز جلد شروع ہونے والی تھیں مگر انہیں ایک ہفتے کی مہلت مل گئی تھی۔ اگلے دن وہ یونیورسٹی آئیں مگر ان کا زیادہ وقت لان پر گزرا تھا۔ آتے سرما اور جاری خزاں کا موسم اپنی خوب صورتی لیے ہوئے تھا۔ درختوں سے پتے جھڑ رہے تھے اور انہوں نے سرخ اور بھورے رنگ اپنا لیے تھے۔ ہوا میں ایک نوع کی خنکی محسوس کی جاسکتی تھی۔ ریحانہ کو یہ موسم بہت اچھا لگتا تھا۔ خاموش اور کسی قدر اداس سا۔

''پرسوں ریہا جبار پارٹی دے رہی ہے۔'' غزالہ نے کہا۔ ''اس نے ہمیں بھی بلایا ہے۔''

''میری طرف سے تو معذرت۔'' ریحانہ بولی۔ ''میں نے اس قسم کی مادر پدر آزاد پارٹیوں میں کبھی شرکت نہیں کی۔''

''تو ہم کون سا جا رہے ہیں۔'' غزالہ بولی۔ ''بے ہودگی تو مجھے بھی پسند نہیں ہے۔''

آخری سمسٹر سے پہلے تقریبات اور تفریحات کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ جس میں تقریباً سب ہی کسی نہ کسی طور شرکت کر رہے تھے۔ طلبا کی ایک آرگنائزیشن ڈس ایبل بچوں کی مدد کے لیے ایک شو کر رہی تھی۔ شہباز اس کے آرگنائزرز میں شامل تھا۔ ریحانہ نے اس کے بارے میں بتایا تو غزالہ نے حسبِ توقع انکار کر دیا۔ ''مجھے ایسے شو بور کرتے ہیں۔''

''حالانکہ ان میں زندگی ہوتی ہے۔'' ریحانہ نے کہا۔

''سنا ہے اس میں کوئی پلے بھی ہو رہا ہے۔'' سوہا بولی۔ ''شہباز آرگنائزرز میں شامل ہے۔''

غزالہ چونکی مگر اس نے کچھ کہا نہیں۔ سوہا اور ریحانہ شو کے بارے میں بات کر رہی تھیں کہ اس نے مداخلت کی۔ ''میں سوچ رہی ہوں کہ میں بھی چلوں۔''

وہ دونوں خوش ہو گئیں۔ ''ہاں، تیرے بنا مزہ نہیں آئے گا۔''

ابھی وہ بات کر رہی تھیں کہ شہباز آتا دکھائی دیا اور وہ ان ہی کی طرف آرہا تھا۔ سوہا نے خبردار کیا۔ ''مسٹر یونیورسٹی اسی طرف آرہا ہے۔ اس لیے زبان پر قابو رکھا جائے۔''

وہ نزدیک آیا اور بیٹھنے کی اجازت طلب کی۔ سوہا بولی۔ ''کیوں نہیں، آپ بیٹھیے۔''

وہ گھاس پر بیٹھ گیا۔ ''شکر ہے آپ تینوں یونیورسٹی میں ہیں۔ میں نے لائبریری اور کیفے ٹیریا میں بھی دیکھا اور پھر یہاں آیا۔''

''خیریت، ہماری تلاش کیوں تھی؟''

''آپ کے علم میں ہوگا کہ ہم یونیورسٹی آڈیٹوریم میں ڈس ایبل بچوں کے لیے ایک شو کر رہے ہیں؟''

''بالکل پتا ہے۔'' ریحانہ بولی۔ ''اتفاق سے ہم اسی کے بارے میں ڈسکس کر رہے تھے۔''

دس چیزیں دس چیزوں کو ختم کر دیتی ہیں

ظلم...... انصاف کو
تکبر...... اعمال کو
جھوٹ...... رزق کو
توبہ...... گناہوں کو
دکھ...... زندگی کو
غصہ...... عقل کو
صدقہ...... مصیبت کو
چغلی...... دوستی کو
نماز...... بے حیائی کو
نیکی...... بدی کو

مرسلہ۔ محمد حنیف گبول، نیو سینٹرل جیل ملتان

''تب تو میرا کام آسان ہونا چاہیے۔ اس کا مطلب ہے آپ کو شو میں دلچسپی ہے۔ اس شو میں ایک چھوٹا سا ڈراما بھی ہے جو انسانی ہمدردی کے بارے میں ہے۔ اس میں مرکزی کردار ایک پری کا ہے اور ہماری ڈراما کمیٹی چاہتی ہے کہ وہ کردار.....'' شہباز بولتے بولتے رکا تو ریحانہ کا دل دھڑکا اور اسے خیال آیا کہ شہباز اسے یہ کردار آفر کرے گا مگر جب شہباز نے بات شروع کی تو اس کے منہ سے غزالہ کا نام نکلا۔ ''غزالہ ادا کرے۔''

ریحانہ نے بہ مشکل اپنے تاثرات پر قابو پایا۔ ورنہ وہ چونک جاتی۔ اس نے اور سوہا نے بے اختیار غزالہ کی طرف دیکھا۔ ان کا خیال تھا کہ وہ انکار کر دے گی لیکن خلاف توقع وہ مان گئی۔ ''میں ضرور یہ کردار ادا کروں گی۔''

شہباز خوش ہو گیا۔ ''میں شکر گزار ہوں کیونکہ کمیٹی نے یہ کام میرے سپرد کیا ہے اور میں ناکام رہتا تو میری سبکی ہوتی۔''

''آپ کی سبکی نہیں ہوگی۔'' غزالہ نے ایک خاص ادا سے کہا۔

شہباز کے جانے کے بعد ریحانہ نے اس سے پوچھا۔ ''جب میں نے تجھے اپنے پروگرام میں پرفارم کرنے کو کہا تھا تو نے فوراً انکار کر دیا تھا اور یہاں مان گئی۔''

''دال میں کچھ کالا ہے۔'' سوہا نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''کوئی کالا نہیں ہے۔'' غزالہ خشک لہجے میں بولی۔ ''بس میری مرضی ہے۔''

''واہ جی، اچھی مرضی ہے۔'' ریحانہ تڑخ کر بولی۔ ''سوہا ٹھیک کہہ رہی ہے، دال میں کچھ کالا ہے۔''

دونوں اس کے پیچھے پڑ گئیں مگر وہ مان کر نہ دی کہ شہباز کی پیشکش وہ شہباز کی وجہ سے مانی ہے۔ گفتگو کے آخر میں وہ خفا ہو گئی اور اٹھتے ہوئے بولی۔ ''تمہاری جو مرضی چاہے سمجھو۔''

''غزالہ بات تو سن .....'' ریحانہ نے کہنا چاہا مگر وہ پاؤں پٹختی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ انہوں نے اسے پارکنگ کی طرف جاتے دیکھا تھا۔ یعنی وہ یونیورسٹی سے جا رہی تھی۔ ریحانہ نے حیرت سے کہا۔ ''اسے کیا ہوا ہے۔ کیا ہم نے کوئی غلط بات کی ہے؟ ہم تو اسے چھیڑ رہے تھے۔''

''لگتا ہے ہم نے زیادہ ہی سچ بول دیا۔'' سوہا نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''آدمی کو سچی بات تو لگتی ہے نا.....''

''چل یار کل منا لیں گے۔'' ریحانہ نے بھی اپنا بیگ اٹھاتے ہوئے کہا۔ ریحانہ عام طور سے پوائنٹ سے یونیورسٹی آتی تھی۔ کبھی پوائنٹ نکل جاتا تو غزالہ انہیں ان کے گھروں تک ڈراپ کر دیتی۔ اگلے دن وہ اور سوہا یونیورسٹی پہنچیں تو انہیں غزالہ کی گاڑی پارکنگ میں دکھائی نہیں دی۔ ریحانہ نے خیال ظاہر کیا۔ ''وہ آج نہیں آئی ہے۔''

''کسی فری پیریڈ میں اسے کال کر کے پوچھتے ہیں۔'' سوہا بولی۔ ''میری آج شروع کی تین کلاسز بہت اہم ہیں۔''

وہ کلاسز میں لگ گئیں۔ سوہا کا کہنا درست ثابت ہوا۔ تین کلاسز اہم تھیں جن میں آنے والے ٹیسٹ پر مشتمل لیکچرز تھے اور یہ مس ہو جاتے تو ان کے لیے ٹیسٹ دینا مسئلہ بن جاتا۔ تین گھنٹے بعد وہ کیفے ٹیریا میں ملیں تو تھک چکی تھیں۔ مسلسل نوٹس لینے سے ریحانہ کا ہاتھ دکھ رہا تھا۔ انہوں نے چائے اور سموسوں کا آرڈر دیا۔ سوہا گہرے سانس لیتے ہوئے بولی۔ ''آج تو حشر ہو گیا اور پروفیسر نذیر بولتے بھی نان اسٹاپ ہیں۔ میرا پین ایک لمحے کے لیے بھی نہیں رکا۔''

''یہی حال میرا بھی رہا۔''

''غزالہ کے مزے ہیں۔'' سوہا نے رشک سے کہا۔ ''اب مسٹر یونیورسٹی کے ساتھ وہ پری کا کردار ادا کرے گی۔''

ریحانہ چونکی۔ ''شہباز بھی اس ڈرامے میں کام کر رہا ہے؟''

سوہا نے اثبات سر ہلایا۔ ''وہ رحم دل لکڑ ہارے کا کردار ادا کر رہا ہے۔ سمجھو مین کریکٹر اسی کا ہے۔''

ریحانہ ہنسی۔ ''تب تو غزالہ واقعی لکی ہے مگر وہ آج آئی کیوں نہیں؟''

''ذرا ان سے نمٹ لیں پھر اسے کال کرتے ہیں۔'' سوہا نے سموسوں اور چائے کی طرف دیکھا جو ویٹر رکھ رہا تھا۔ ابھی وہ چائے سموسوں سے انصاف کر رہے تھے کہ شہباز آ گیا۔ اس نے کہا۔

''سوری میں ڈسٹرب کر رہا ہوں لیکن کل میں نے غلطی سے مس غزالہ کو اس کردار کی پیشکش کر دی تھی۔ یہ پیشکش اصل میں مس ریحانہ کے لیے تھی۔''

''میرے لیے؟'' ریحانہ دنگ رہ گئی۔ ''پھر آپ سے غلطی کیسے ہو گئی؟''

''غلطی یوں ہوئی کہ کردار طے کرنے والی ٹیم نے مجھے جو نام دیا، وہ میں نے آگے کر دیا۔ آج پتا چلا کہ مجھے غلط نام دیا گیا تھا۔ یہ کردار اصل میں آپ کے لیے ہے۔ میری ذاتی خواہش بھی یہی ہے کیونکہ میں آپ کو پرفارم کرتے دیکھ چکا ہوں۔''

جانے کیوں ریحانہ اندر سے خوش ہوگئی۔ جب شہباز ان کے پاس پیشکش لے کر آیا تب سے اس کی خواہش تھی کہ یہ کردار اسے ملے مگر شہباز نے غزالہ سے کہہ دیا اور وہ مایوس ہوگئی تھی۔ اب شہباز نے اسے کہا تو وہ خوش ہوگئی۔ اس نے اپنے تاثرات دباتے ہوئے کہا۔ ''لیکن اب تو آپ پیشکش کر چکے ہیں۔''

''غلطی سے۔'' اس نے تصحیح کی۔ ''میں نے صبح یونیورسٹی آتے ہی مس غزالہ سے معذرت کرلی تھی اور ویسے بھی بات آپ تینوں کے درمیان ہے اور کسی کو علم نہیں ہے۔''

یہ دوسری چونکا دینے والی خبر تھی کہ غزالہ صبح یونیورسٹی آئی تھی۔ اس کا ہاسٹل پاس تھا اور اس کے پاس گاڑی تھی اس لیے وہ جلد آجاتی تھی اور ریحانہ نے ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ سوہا نے پوچھا۔ ''جب آپ نے بتایا تو غزالہ کا ردعمل کیسا تھا؟''

''ان کا موڈ آف ہوگیا تھا۔'' شہباز نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ ''مگر مجبوری تھی، یہ ڈراما کمیٹی کا فیصلہ تھا جو مجھے پہنچانا تھا۔ بہرحال انہوں نے زیادہ برا نہیں مانا۔''

مگر ریحانہ اور سوہا جانتی تھیں کہ غزالہ نے کس قدر برا منایا ہوگا۔ ریحانہ نے ہچکچا کر کہا۔ ''میں غزالہ سے بات کرلوں پھر آپ کو جواب دیتی ہوں۔''

''آپ غزالہ سے بات کرتی رہیے گا۔ میں نے آپ کی طرف سے ہاں کردی ہے۔'' شہباز نے کہا اور اٹھ کر چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد سوہا نے تشویش سے کہا۔ ''یہ تو بڑا مسئلہ ہوجائے گا۔ تو غزالہ کی نیچر جانتی ہے۔''

''ہاں لیکن اس میں میرا تو کوئی قصور نہیں ہے۔'' ریحانہ نے اپنی صفائی پیش کی۔ سوہا نے اس کی طرف دیکھا۔

''یار! یہ معمولی سا کردار ہے جو ہماری دوستی سے بڑھ کر بہرحال نہیں ہے۔''

''تم نے درست کہا ہے۔'' ریحانہ سنجیدہ ہو گئی۔ ''امید ہے غزالہ بھی اس کا خیال رکھے گی۔''

سوہا اسے دیکھ کر رہ گئی۔ اس نے کہا۔ ''چل اسے کال کرتے ہیں۔''

کیفے ٹیریا میں ایک طرف پے فون لگا ہوا تھا۔ انہوں نے غزالہ کے ہاسٹل کال کی۔ وہ خاصی دیر بعد آئی اور اس نے بات بھی بہت اکھڑے انداز میں کی کال سوہا کر رہی تھی اور ریحانہ اس کے سر سے سر جوڑے گفتگو سن رہی تھی۔ سوہا نے انجان بن کر اس کے یونیورسٹی نہ آنے کی وجہ پوچھی مگر اس نے اصل بات نہیں بتائی اور طبیعت خرابی کا بہانہ کردیا۔ اس نے یہ بھی نہیں بتایا کہ وہ صبح یونیورسٹی آئی تھی۔ کال کرکے سوہا نے ریحانہ کی طرف دیکھا۔ ''گڑبڑ ہے جیسا کہ توقع تھی۔''

''سوال یہ ہے کہ اس میں ہمارا بلکہ میرا کیا قصور ہے؟''

''کچھ نہیں مگر تم غزالہ کو جانتی ہو۔''

ریحانہ اپنے نازک لب کاٹنے لگی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کیا اسے شہباز کو انکار کردینا چاہیے؟ ایک طرف معمولی سا کردار تھا اور دوسری طرف اس کی دوست تھی۔ ٹھیک ہے وہ اوور ری ایکٹ کررہی تھی مگر تھی تو اس کی دوست۔ اس خیال کے ساتھ ہی اس کے اندر شدت سے خواہش ابھر رہی تھی کہ وہ شہباز کے اس ڈرامے میں کام کرے۔ سوہا اسے غور سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے مشورہ دینے کے انداز میں کہا۔ ''ریحانہ جو کرنا ہے سوچ سمجھ کر کرنا ممکن ہے بعد میں تم گلٹی فیل کرو۔ تم غزالہ کو کھو دو گی۔''

اب تک وہ تذبذب میں تھی لیکن سوہا کی بات نے اس کے اندر کی رکاوٹ دور کردی۔ ''جب غزالہ یہ کردار ادا کرنے جارہی تھی تو میں نے یوں ری ایکٹ نہیں کیا۔ تب وہ کیوں ایسا کررہی ہے؟''

سوہا نے اسے حیرت سے دیکھا۔ ''تم جانتی ہو۔ آفر دے کر واپس لے لینا اس کی انسلٹ ہے۔ اگر تم اس کی جگہ یہ کردار کرو گی تو اس کی ناراضگی درست ہوگی۔''

ریحانہ یہ بات سمجھتے ہوئے بھی سمجھنے کو تیار نہیں تھی۔ اس نے کہا۔ ''کسی معاملے میں ہمارا ایک دوسرے سے رویہ ایک جیسا ہونا چاہیے۔ تمہیں یاد ہے ایک بوتیک میں ہمارے ساتھ کیا ہوا تھا اور غزالہ نے ہمارا ذرا بھی ساتھ نہیں دیا۔ وہ آج بھی اس بوتیک سے کپڑے لیتی ہے۔''

سوہا کو یاد تھا، یہ اعلیٰ درجے کا بوتیک تھا۔ سوہا اور ریحانہ ایک بار غزالہ کے ساتھ وہاں گئی تھیں۔ اتفاق سے وہاں ایک ڈیزائنر سوٹ تھا مگر یہ اصل ڈیزائنر سوٹ کی ہلکی کاپی تھا۔ ریحانہ نے بوتیک کی مالکہ سے یہ بات کہہ دی اور اس نے اتنا برا منایا کہ ان سے بدتمیزی کرنے لگی اور الٹا ان پر الزام رکھ دیا کہ انہیں اچھی چیز کی پہچان نہیں ہے۔ وہ بہت بول رہی تھی۔ سوہا اور ریحانہ شاکڈ رہ گئی تھیں۔ انہوں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ اس بوتیک کی مالکہ کا اخلاق اتنا گرا ہوا ہوگا۔ وہ دونوں باہر آگئیں مگر غزالہ جس نے اس

جھگڑے کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی تھی، اپنی شاپنگ پوری کرکے باہر آئی تھی۔ اس نے بے پروائی سے کہا۔ ''چھوڑو یار! ان لوگوں کے منہ نہیں لگنا چاہیے۔''

''ہم اس کے منہ لگے تھے یا وہ ہمارے منہ لگی تھی۔'' سوہا نے غصے سے کہا۔ ''مجھے تو تجھ پر حیرت ہے کہ وہ ہماری بے عزتی کر رہی تھی اور تو اسی کے بوتیک سے شاپنگ کر رہی تھی۔''

غزالہ کو خیال آیا اور اس نے وعدہ کیا کہ اب وہ وہاں نہیں جائے گی مگر کچھ عرصے بعد وہ پھر اسی بوتیک سے شاپنگ کرکے آئی۔ سوہا اور ریحانہ نے اس کے پاس بوتیک کے ٹیگ لگے سوٹ اور شاپر دیکھے تھے۔ ریحانہ اسی کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔ سوہا نے تسلیم کیا۔ ''تو ٹھیک کہہ رہی ہے مگر غزالہ کا مزاج دوسرا ہے اور تیرا الگ مزاج ہے۔ وہ اپنے مزاج کے مطابق چلتی ہے۔ تجھے اپنے مزاج کے مطابق چلنا چاہیے۔''

''مگر بعض اوقات انسان اپنے مزاج کے برخلاف بھی چلتا ہے۔'' ریحانہ نے سرد لہجے میں کہا۔ سوہا اسے دیکھ کر رہ گئی پھر اس نے شانے اچکائے۔

''بھئی مرضی ہے تیری۔''

''صرف میری نہیں غزالہ کی بھی۔''

ریحانہ نے شہباز سے کہا کہ وہ ڈرامے میں کام کرے گی۔ ڈراما چار دن بعد تھا اور روزانہ اسے کلاسز کے بعد دو گھنٹے ریہرسل کے لیے دینے تھے۔ ریحانہ نے گھر میں بات کرلی اور اسے اجازت مل گئی کہ وہ شام کو دیر سے آئے گی۔ کیونکہ اس وقت تک پوائنٹ چلنا بھی بند ہوجاتے تھے اس لیے شہیر احمد کی ڈیوٹی لگائی گئی کہ وہ اسے شام کے وقت یونیورسٹی سے لے کر آیا کرے۔ غزالہ اگلے دن بھی نہیں آئی تھی اور اس سے اگلے دن بھی اس کی صورت دکھائی نہیں دی۔ سوہا اسے روز ہی کال کر رہی تھی اور اس کا یہی کہنا تھا کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ اس نے سوہا سے کہا کہ وہ اس کے لیے اپنے نوٹس سے ایک کاپی تیار کردے۔ وہ ریحانہ کے بارے میں بات نہیں کرتی تھی یعنی اسے معلوم ہوگیا تھا کہ ریحانہ ڈرامے میں اس کی جگہ کام کر رہی تھی۔

شو ویک اینڈ پر تھا اور اس کا اہم ترین حصہ یہ ڈراما ہی تھا۔ ریحانہ نے ریہرسل میں بھرپور حصہ لیا۔ شو والے دن یونیورسٹی ہال ڈس ایبل بچوں، ان کے والدین، عزیز و اقارب اور ان شخصیات سے بھرا ہوا تھا جنہیں خصوصی طور پر مدعو کیا گیا تھا۔ ڈراما چھوٹا سا مگر بہت متاثر کن تھا۔ ایک

لکڑہارا جس کا چھوٹا بھائی معذور ہے اور وہ لکڑی کاٹنے جنگل جاتا ہے تو پیچھے اس کا بھائی اکیلا رہ جاتا ہے۔ لکڑہارا ہرنی کی صورت میں ایک پری کی مدد کرتا ہے جو شکاری کے تیر سے زخمی ہوجاتی ہے۔ پری اس کی مدد کے بدلے اس کے بھائی کو ٹھیک کردیتی ہے۔ ریحانہ نے پری اور شہباز نے لکڑہارے کا کردار اتنی اچھی طرح ادا کیا کہ جب شو ختم ہوا اور پردہ گرا تو ہال دیر تک تالیوں سے گونجتا رہا۔ ضمیر احمد اور خالدہ بھی آئے تھے اور وہ اپنی بیٹی کی اس پذیرائی پر خوش تھے۔ ریحانہ انہیں پہلے ہی ڈرامے کا آئیڈیا سنا چکی تھی اور اس میں ایسی کوئی بات نہیں تھی جو ان کے اصولوں کے خلاف ہوتی۔

غزالہ پورے ایک ہفتے بعد یونیورسٹی آئی۔ جب آئی تب بھی ان لوگوں سے الگ الگ رہی۔ سوہا اس کے پاس گئی تو اس نے بات کرلی مگر جب ریحانہ گئی تو اس نے نہ تو اس سے بات کی اور نہ ہی اس کی طرف دیکھا اور کچھ دیر بعد اٹھ کر وہاں سے چلی گئی۔ ریحانہ شرمندہ ہوگئی۔ اس نے سوہا سے کہا۔ ''کیا یہ صرف اس لیے مجھ سے ناراض ہے کہ میں نے اس کی جگہ ڈرامے میں کردار ادا کیا؟''

سوہا کا خیال تھا کہ ریحانہ نے واقعی اچھا نہیں کیا۔ اگر غزالہ اس سے ناراض تھی تو حق بہ جانب تھی مگر اس نے ریحانہ سے کھل کر نہیں کہا اور بولی۔ ''میں نے تمہیں پہلے ہی خبردار کردیا تھا۔''

ریحانہ بے چین ہوگئی۔ ''دوستوں میں چھوٹی موٹی کھٹ پٹ ہوجاتی ہے۔ اسے چاہیے تھا بات نظرانداز کردیتی مگر وہ اسے دل سے لگا کر بیٹھ گئی ہے۔ آخر میں بھی تو بہت سی باتیں نظرانداز کرتی ہوں۔''

''میں نے کہا نا اس کی فطرت تم سے الگ ہے۔ وہ اسی کے مطابق ری ایکٹ کر رہی ہے۔''

''اور میں......؟'' ریحانہ نے تیز لہجے میں پوچھا۔

''افسوس کہ تم نے اپنی فطرت کے مطابق نہیں کیا۔''

اس وقت ریحانہ کا خیال تھا کہ سوہا جانب داری سے کام لے رہی ہے اور غزالہ کی حمایت کر رہی ہے مگر رفتہ رفتہ اسے احساس ہوا کہ وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ اس نے اپنی فطرت کے مطابق نہیں کیا تھا۔ غزالہ اس سے دور رہی.... اگر سوہا اس کے پاس جاتی تو وہ اس سے مل لیتی تھی مگر ریحانہ ساتھ ہوتی تو وہ وہاں سے اٹھ جاتی تھی۔ اگر ریحانہ اکیلے میں نظر آتی تو رخ پھیر لیتی یا آرہی ہوتی تو سمت بدل لیتی۔ ریحانہ نے کئی بار اس سے صلح صفائی کی کوشش کی مگر غزالہ نے کوئی

ردعمل ظاہر نہیں کیا۔ مجبور ہو کر ریحانہ نے بھی کوشش ترک کر دی۔ یہ سب چلتا رہا اور فائنل پیپرز آ گئے۔ ریحانہ اس سے پہلے ہی بہت مصروف ہو گئی تھی۔ پیپرز کے بعد یونیورسٹی جانا بند ہو گیا۔ اب کبھی کبھی سوہا آ جاتی یا وہ اس کے پاس چلی جاتی۔ فون پر روز ہی بات ہو جاتی تھی۔ سوہا سے ہی غزالہ کے بارے میں پتا چلتا رہتا تھا۔ ان دونوں کا فائنل سیمسٹر اب تھا۔ سوہا کا رشتہ طے ہو گیا تھا اور فائنل پیپرز کے فوراً بعد اس کی شادی تھی جبکہ غزالہ کا ابھی شادی کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ شاید وہ ایم فل میں داخلہ لیتی۔

خالدہ اب ریحانہ کی شادی کرنا چاہتی تھیں کیونکہ وہ بائیس کی ہو چکی تھی۔ ان کے خیال میں لڑکیوں کی شادی کی یہ مناسب عمر ہوتی ہے۔ جب وہ نہ نوجوان ہوتی ہیں اور نہ ہی زیادہ عمر کی ہوتی ہیں۔ تعلیم انہیں شعور اور سمجھ دیتی ہے۔ وہ متوقع رشتوں کی چھان بین کر رہی تھیں کہ ریحانہ کے لیے شہباز کا رشتہ آ گیا اور خالدہ کے خیال میں اس میں کوئی برائی بھی نہیں تھی۔ ریحانہ کی رضامندی پا کر انہوں نے رشتہ آگے بڑھایا تھا مگر ابھی حتمی جواب نہیں دیا تھا۔ ضمیر احمد اور خالدہ دونوں کے ذہن میں تھا کہ جاگیردار گھرانے کے مرد عام طور سے عورت کو پاؤں کی جوتی سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ پھر وہ غیر اخلاقی سرگرمیوں میں بھی ملوث ہوتے ہیں۔ وہ اس حوالے سے چھان بین کر رہے تھے اور اب تقریباً مطمئن ہو گئے تھے۔ ضمیر احمد نے خالدہ سے کہا۔ ''میرا خیال ہے آنے والے اتوار کے دن ہم انہیں بلا لیتے ہیں اور ہاں کر دیتے ہیں۔''

خالدہ راضی ہو گئیں۔ ریحانہ بھی راضی تھی مگر پھر سوہا کی ایک کال آئی اور سب بدل کر رہ گیا۔ ریحانہ نے شہباز سے شادی کرنے سے انکار کر دیا اور خوش قسمتی سے اس کے گھر والوں نے اسے اپنی انا کا مسئلہ نہیں بنایا اور بیٹی کی بات مان لی مگر شہباز نے ریحانہ سے رابطہ کیا اور اس سے شادی سے انکار کی وجہ پوچھی۔ ریحانہ نے اسے وجہ بتا دی اور پھر اس کے ایک مہینے بعد شہباز کی شادی غزالہ سے ہو گئی۔ غزالہ نے اسے شادی میں نہیں بلایا ورنہ وہ ضرور جاتی مگر اس نے اسے بیسٹ وشز کا کارڈ اور ایک خوب صورت بوکے کوریئر سے ضرور بھیجا تھا۔ غزالہ نے اس کا بھی جواب نہیں دیا۔ سوہا اس کی شادی میں شریک تھی اور اس نے بتایا کہ غزالہ اپنی شادی کے موقع پر بہت خوش تھی۔ ریحانہ نے بہت دل سے اسے وش کیا تھا۔ اب بھی وہ اس کے لیے دل میں اچھی تمنا رکھتی تھی۔

شاید اللہ نے اس کی اسی نیک نیتی کا صلہ عامر کی صورت میں دیا۔ غزالہ کی شادی کے ایک ہفتے بعد اس کے لیے عامر کا رشتہ آیا۔ عامر کی ایک خالہ بیاہ کر ریحانہ کے ددھیال میں آئی تھیں اور ان ہی کے توسط سے یہ رشتہ ہوا تھا۔ رشتہ ہونے کے تین مہینے بعد وہ عامر کی زندگی میں آ گئی۔ اس نے عامر کے ساتھ تیرہ سال گزارے اور ان تیرہ سالوں میں اسے کبھی ایک لمحے کے لیے بھی خیال نہیں آیا کہ اس کی شادی عامر کے بجائے شہباز سے ہونی چاہیے تھی بلکہ وہ جب عامر کے بارے میں سوچتی تو دل سے بے اختیار اللہ کا شکر نکلتا کہ اس نے عامر کو اس کا مقدر بنایا۔

☆☆☆

''شہباز کے رشتے سے انکار کی وجہ سوہا کی کال تھی؟'' نوجوان نے پوچھا۔

''ہاں۔''

''سوہا نے کیا بتایا تھا؟''

ریحانہ نے رسانیت سے کہا۔ ''میں نے یہ بات آج تک کسی کو نہیں بتائی۔ نہ اپنے گھر والوں کو اور نہ ہی عامر کو جن سے میں کوئی بات نہیں چھپاتی۔ چھپائی تو یہ بھی نہیں ہے مگر عامر کو پس منظر کا علم نہیں ہے اس لیے نہ انہوں نے پوچھا اور نہ میں نے بتایا۔''

''مگر مجھے بتانا ہوگا۔'' نوجوان نے کچھ اس انداز سے کہا کہ ریحانہ نے بے ساختہ اس کی طرف دیکھا۔ وہ کہنا چاہتی تھی کہ وہ ہے کون اس سے یہ بات کہنے والا؟ مگر جب ریحانہ نے اس کا چہرہ اور اس پر چھائی معصومانہ سی مسکراہٹ دیکھی تو بے ساختہ ہی بول پڑی۔

''غزالہ نے خودکشی کی کوشش کی تھی۔''

''کیونکہ شہباز نے آپ کے لیے رشتہ بھیج دیا تھا؟''

''ہاں، اس نے خواب آور گولیاں کھا لی تھیں۔ مگر بروقت پتا چل گیا اور اسے اسپتال لے جایا گیا جہاں ڈاکٹروں نے اس کی جان بچالی۔''

''جان تو ڈاکٹروں نے بچالی مگر غزالہ کی شادی شہباز سے کیسے ہوئی؟''

ریحانہ مسکرانے لگی۔ ''آپ کا اس بارے میں کیا خیال ہے مسٹر نمائندۂ خاص؟''

''میرا خیال ہے کہ جب شہباز نے آپ کو کال کر کے رشتے سے انکار کی وجہ پوچھی تو آپ نے اسے غزالہ کے بارے میں بتایا اور اسے کسی طرح مجبور کیا کہ وہ اس سے شادی کر لے۔''

''بتایا تو تھا مگر مجبور نہیں کیا تھا۔ میں نے بس اتنا کہا تھا کہ اگر آپ سے کوئی محبت کرتا ہے تو آدمی کو اس کی ناقدری نہیں کرنی چاہیے۔ شاید یہی بات شہباز کے دل پر لگی اور اس نے غزالہ کے لیے رشتہ بھیج دیا۔''

نوجوان نے پین سے سر کھجایا۔ ''تو اس طرح آپ نے دوسرے پچھتاوے کی تلافی بھی کر دی۔''

''کوشش کی۔'' ریحانہ بولی۔ ''بعض اوقات انسان کے دل میں ایسی گرہ آتی ہے جو کسی صورت نہیں کھلتی۔ ہوسکتا ہے غزالہ نے مجھے آج بھی معاف نہ کیا ہو۔ کم سے کم اس کے رویے سے ایسا ہی لگتا تھا۔ اس نے میری وش کا بھی کوئی جواب نہیں دیا اور نہ ہی بعد میں رابطہ کیا۔ چند سال سوہا سے رابطہ رہا تھا پھر وہ شادی کر کے کینیڈا چلی گئی تو اس سے بھی سال میں ایک دو بار بات ہوتی ہے۔ اب تو سوہا کا غزالہ سے رابطہ نہیں رہا۔ مجھے یقین ہے کہ غزالہ کے دل میں میرے لیے اب تک گرہ موجود ہے۔''

''آپ کے دل میں کبھی کسی کے لیے ایسی کوئی گرہ آئی؟''

ریحانہ نے سر ہلایا۔ ''گرہ تو نہیں آئی مگر......''

''مگر آپ کو کسی سے تکلیف پہنچی...... بہت شدید تکلیف؟''

اس سوال پر ریحانہ کا چہرہ زرد ہو گیا۔

☆☆☆

عامر کے ساتھ زندگی ایک حسین خواب تھی مگر شادی کے کچھ عرصے بعد اسے پتا چلا کہ اس زندگی کے کچھ پہلو کسی برے خواب سے کم نہیں تھے۔ عامر اکیلا اور خودمختار تھا۔ اس کی والدہ کا انتقال کافی عرصے پہلے ہو گیا تھا۔ اس کے دو بھائی عمیر اور سمیر بیرونِ ملک سیٹل تھے۔ عامر کے والد ظہیر الدین ایک ریٹائرڈ سرکاری افسر تھے۔ وہ اپنی بیوہ بیٹی کے ساتھ الگ رہتے تھے۔ ماہا ریحانہ کی واحد نند تھی مگر شروع دن سے اس کا رویہ کچھ ایسا تھا جیسے وہ ریحانہ کو پسند نہ کرتی ہو۔ جب رشتہ ہو رہا تھا تو وہ دوبار ان کے گھر یوں آئی جیسے اسے زبردستی لایا گیا ہو۔ اس نے تمام معاملات میں نہایت سپاٹ سے انداز میں حصہ لیا۔ حالانکہ وہ عامر کی ایک ہی بہن تھی۔ تقریباً یہی رویہ ظہیر الدین کا تھا۔ وہ بس آتے اور خاموشی سے بیٹھ جاتے۔ درحقیقت عامر کے رشتے کی ساری کارروائی اس کی خالہ نے کی تھی۔ عامر کے باپ اور بہن کی شرکت ربر اسٹیمپ جیسی تھی۔ دو بار کے بعد وہ تیسری بار ریحانہ کے گھر نہیں آئے اور تاریخ لینے بھی عامر کی خالہ آئی تھیں۔

ریحانہ کے گھر والے ظہیر الدین اور ماہا کے رویے سے کھٹکے تھے مگر ایک تو سب کو عامر بہت پسند آیا تھا، دوسرے وہ باپ اور بہن سے الگ رہتا تھا۔ یعنی ریحانہ کو ان کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ اس لیے انہوں نے ہاں کر دی۔ یوں وہ عامر کی دلہن بن کر اس کی زندگی میں آئی اور شادی کی رات جیسے لمحوں میں گزری مگر اسے یوں لگا جیسے وہ ہمیشہ سے عامر کے ساتھ رہتی آئی ہو۔ اگر کبھی اسے خیال آتا کہ زندگی کے بائیس سال اس نے عامر کے بغیر گزارے تو اسے یہ سال برے لگنے لگتے تھے۔ نہ جانے کیسے ظہیر الدین اور ماہا نے شادی کے ابتدائی تین دن عامر کے گھر میں گزارے۔ ظہیر الدین تو زیادہ تر باہر ہوتے تھے مگر ماہا گھر میں ہوتی تھی اور وہ اس سے اکھڑے اکھڑے انداز میں بات کرتی تھی اور گاہے بگاہے کسی نہ کسی حوالے سے اس پر طنز کر جاتی تھی۔

ریحانہ کو یہ رویہ اچھا نہیں لگتا تھا کیونکہ وہ خود اسے پسند نہیں کرتی تھی کہ کسی پر طنز کرے۔ اسی طرح اسے خود پر طنز کیا جانا پسند نہیں تھا مگر بدمزگی سے بچنے کے لیے وہ برداشت کر جاتی تھی۔ شادی میں عامر کے دونوں بھائی شریک نہیں ہوئے تھے کیونکہ کینیڈا سے پاکستان آنا انہیں بہت مہنگا پڑتا اس لیے انہوں نے تحفے بھیج کر اپنی ذمے داری پوری کر دی تھی۔ چوتھے دن ظہیر الدین اور ماہا بھی چلے گئے تو ریحانہ نے محسوس کیا کہ وہ جیسے ہلکی پھلکی اور آزاد ہو گئی ہے۔ اسے اپنی کیفیت پر شرمندگی ہوئی تھی کہ وہ عامر کے باپ اور بہن کو خود پر بوجھ سمجھ رہی تھی۔ حالانکہ اس کی یہ فطرت نہیں تھی۔ اس وقت وہ سمجھ نہیں پائی تھی کہ یہ بوجھ کس قسم کا تھا۔ تین دن کسی کو سمجھنے کے لیے بہت کافی نہیں ہوتے۔ خاص طور سے ان لوگوں کے لیے جو مثبت سوچ رکھتے ہوں۔ البتہ اس نے یہ محسوس کر لیا کہ اس کے سسرال والے اسے پسند نہیں کرتے مگر وہ اس کی وجہ سمجھنے سے قاصر تھی۔

ظہیر الدین اعلیٰ سرکاری افسر تھے مگر انہوں نے ایمان داری سے سروس کی اور ریٹائرمنٹ کے بعد اپنے سات مرلے کے چھوٹے مکان میں رہتے تھے۔ یہ مکان انہوں نے اپنی بچت سے بنایا تھا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد ملنے والا فنڈ انہوں نے فکسڈ ڈپازٹ میں انویسٹ کر دیا تھا۔ ان کا گزارہ اس سے آنے والے منافع اور پنشن کی رقم سے ہوتا تھا۔ ماہا کی شادی انہوں نے عامر کی شادی سے ایک سال پہلے کی تھی اور جب ماہا ماں بننے والی تھی تو اس کا شوہر ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں مارا گیا۔ وہ شادی کے ایک سال

بعد ہی بیوہ ہو کر واپس آ گئی تھی۔ اس وقت وہ امید سے تھی۔ عامر کے لیے یہ مشکل دور تھا۔ اس کی بہن بیوہ ہو کر آئی تھی اور وہ اپنا گھر بسانے جا رہا تھا مگر یہ ایک فطری عمل ہوتا ہے۔ کوئی بھی حادثہ یا واقعہ زندگی کو آگے بڑھنے سے نہیں روکتا۔

عامر نے چاہا کہ بہن اس کے ساتھ رہے مگر اس نے باپ کے ساتھ رہنے کو ترجیح دی۔ عامر کا خیال تھا کہ ظہیر الدین کی آمدنی بے شک ان کے اپنے لیے کافی تھی مگر اس رقم میں بیوہ بیٹی اور اس کے ہونے والے بچے کے اخراجات پورے کرنا مشکل تھا۔ اس لیے اس نے ماہا کو ساتھ رکھنا چاہا۔ جب اس نے انکار کیا تو عامر ہر مہینے بیس ہزار روپے ماہا کو دینے لگا۔ ظہیر الدین نے کبھی اس سے ایک روپیا نہیں لیا تھا۔ انہوں نے ماہا کے لیے بھی منع کیا تھا مگر عامر نے اس معاملے میں ان کی بات سننے سے انکار کر دیا۔ اس نے باپ سے کہا۔ ''ماہا میری بہن ہے اور مجھ پر اس کا حق ہے۔''

بیس ہزار اس وقت خاصی بڑی رقم تھی مگر ریحانہ نے ماہا کے انداز میں کبھی بھائی کے لیے شکر گزاری یا محبت نہیں دیکھی۔ اس کا انداز بھائی سے لاتعلقی والا تھا جیسے ان کی آپس میں دور پرے کی رشتے داری ہو۔ یہی بات ظہیر الدین کے رویے میں تھی۔ وہ بیٹے سے یوں سرد مہری سے بات کرتے تھے جیسے وہ بیٹا نہیں ان کا کوئی ماتحت ہو۔ شادی کے فوراً بعد ریحانہ نے محسوس کیا کہ اس کے سسر اور نند دونوں عامر سے خاصا مختلف مزاج رکھتے تھے۔ عامر کے ساتھ ان کا رویہ سرد اور عجیب سا تھا۔ جب وہ شادی کر کے آئی تو اس کے ساتھ بھی ان کا یہی رویہ تھا۔ پھر اس نے غور کیا تو تقریباً تمام ہی دوسرے افراد کے ساتھ ان کا یہی رویہ تھا۔ ظہیر الدین اور ماہا دونوں ہی عامر کی خالاؤں اور ماموؤں سے کوئی تعلق نہیں رکھتے تھے۔ ظہیر الدین تو اپنے سگے بھائی سے بھی نہیں ملتے تھے جو دنیا میں ان کا ایک ہی خونی رشتے دار تھا۔ ایک بار اس نے عامر سے ان کے رویے کے بارے میں پوچھا۔

''یہ لوگ آپ سے اتنے مختلف کیوں ہیں؟''

''بس ہر انسان کی اپنی اپنی فطرت ہوتی ہے۔'' عامر نے جواب دیا۔ ''تم نے یونیورسٹی میں پڑھا ہے۔ تمہیں تو انسانوں کے مختلف رویوں کا زیادہ مشاہدہ ہونا چاہیے۔''

''فطرت الگ چیز ہوتی ہے۔ آدمی رشتوں اور دوستی پر اس کو حاوی ہونے نہیں دیتا۔'' ریحانہ نے کہا اور فوراً ہی اسے یاد آیا کہ اس نے بھی تو فطرت کو دوستی پر ترجیح دی تھی۔

وہ اندر ہی اندر شرمندہ ہو گئی۔ شادی کے ان سنہری دنوں میں عامر نے اسے اپنے گھر والوں کے بارے میں بہت ہی کم بتایا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ جان بوجھ کر ان کے بارے میں بات کرنے سے گریز کرتا ہے۔ اگر وہ کسی فرد کے بارے میں بات کرتا تو وہ اس کی ماں تھی۔ عامر کو اپنی ماں سے بے حد محبت تھی اور اسے قلق تھا کہ وہ بیماری کے دنوں میں ان کی خدمت نہیں کر سکا تھا کیونکہ وہ الگ رہتا تھا۔ وہ تقریباً روز ان کے پاس جاتا تھا مگر پھر بھی یہ دکھ آج بھی باقی تھا۔ ریحانہ اس کی باتوں کو عمومی معنوں میں لیتی تھی اور اس نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ عامر کے اس دکھ کے پیچھے اصل کہانی کیا تھی؟

ریحانہ کو اس پر بھی حیرت تھی کہ عامر کی اچھی خاصی بڑی کوٹھی تھی، اس کے باوجود اس کا باپ اور بہن ایک چھوٹے سے مکان میں رہ رہے تھے۔ اگرچہ دو افراد کے لحاظ سے مکان اتنا بھی چھوٹا نہیں تھا۔ اس میں اوپر نیچے چار بیڈ رومز تھے۔ سہولت کی ہر چیز تھی اور ظہیر الدین کے پاس کسی قدر پرانی مگر بہت اچھی حالت میں گاڑی بھی تھی مگر پھر بھی عامر کے اور ان کے طرز زندگی میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ عامر کی کوٹھی بہت مہنگے علاقے میں تھی اور عامر نے اسے اپنی حیثیت کے مطابق آراستہ کیا ہوا تھا۔ بیش قیمت فرنیچر اور دوسرا سامان تھا۔ چھ بیڈ رومز اور دو نشست گاہوں والی کوٹھی سینٹرلی اے سی تھی۔ عامر کے پاس دو لگژری گاڑیاں تھیں۔ ایک نئے ماڈل کی پراڈو تھی اور ایک چند سال پرانی مرسڈیز کار تھی۔ عامر مرسڈیز استعمال کرتا تھا۔ اس کے ساتھ ڈرائیور بھی ہوتا تھا۔ اگر ریحانہ کو کہیں جانا ہوتا تو وہ ڈرائیور کو چھوڑ جاتا تھا۔

کوٹھی میں بہت گنجائش تھی اور عامر کا باپ اور بہن بہت آرام سے یہاں رہ سکتے تھے مگر جب ریحانہ عامر سے پوچھتی کہ وہ الگ کیوں رہتے ہیں تو وہ کہتا کہ یہ ان کی اپنی مرضی ہے۔ اس نے ان سے بارہا کہا کہ وہ اس کے ساتھ آ جائیں مگر وہ نہیں مانتے تھے۔ ریحانہ حیران تھی کہ وہ کیوں نہیں مانتے تھے۔ عامر ان کا بیٹا اور بھائی تھا۔ اس کے پاس جو دولت اور سہولتیں تھیں، ان پر باپ اور بہن کا بھی پورا حق تھا۔ ریحانہ کو خیال آیا کہ شاید ماہا اور سسر کے اس کے ساتھ سرد رویے کی یہی وجہ تھی کہ وہ عامر کے ساتھ عالی شان کوٹھی میں رہ رہی تھی اور انہیں اس نے پوچھا بھی نہیں تھا۔ اس نے سوچا کہ اب اسے اپنے سسر اور نند سے کہنا چاہیے کہ وہ ان کے ساتھ رہیں۔ جب سے اس کی شادی ہوئی تھی وہ مشکل

سے دو بار ان کے گھر آئے تھے اور تین چار بار وہ عامر کے ساتھ ان کے گھر گئی تھی۔

ریحانہ نے اس بات کو بھی محسوس کیا تھا کہ عامر کے سارے خاندان نے شادی کے بعد انہیں کھانے پر مدعو کیا تھا مگر ظہیر الدین اور ماہا نے ایک بار بھی ان سے کھانے پر آنے کو نہیں کہا۔ حد یہ کہ وہ خود سے ان سے ملنے گئے تب بھی انہوں نے انہیں کھانے پر رکنے کو نہیں کہا۔ ماہا بہت مشکل سے چائے وغیرہ بنا کر لے آتی تھی اور ساتھ میں کچھ فریج میں رکھی باسی ہو جانے والی چیزیں ان کے سامنے رکھ دیتی تھی۔ ایسا نہیں تھا کہ فریج میں کچھ ہوتا نہیں تھا۔ ریحانہ نے اتفاق سے دیکھا تو فریج کھانے پینے کی بے شمار چیزوں سے بھرا ہوا تھا۔ یعنی ہوتا سب تھا مگر انہیں نہیں پوچھا جاتا تھا۔ پھر بھی ریحانہ نے اس بات کو دل سے نہیں لگایا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اپنی طرف سے کوشش کرے گی تو حالات بہتر ہو جائیں گے۔ اس نے عامر کو اپنے ارادے کے بارے میں نہیں بتایا اور ایک بار جب وہ ان سے ملنے گئے تو ریحانہ نے اچانک ہی بات چھیڑ دی۔

''ابو! آپ ہمارے ساتھ کیوں نہیں رہتے؟''

ظہیر صاحب عام طور سے کم گو اور سپاٹ تاثرات والے شخص تھے۔ ان کی پیشانی پر پڑی مستقل شکنیں اس کی زود مزاجی کی نشان دہی کرتی تھیں۔ ریحانہ کی بات پر انہوں نے عجیب طنزیہ انداز میں پوچھا۔ ''کیا تم واقعی ایسا چاہتی ہو؟''

ریحانہ کو ان کے انداز پر غصہ آیا کیونکہ اس میں طنز کی آمیزش تھی مگر اس نے تحمل سے کہا۔ ''جی ابو ورنہ میں آپ سے کیوں کہتی؟''

ظہیر صاحب نے سگار سلگا لیا۔ ''اپنے شوہر سے پوچھا ہے تم نے؟''

وہ شرمندہ ہو گئی کیونکہ اس نے عامر سے نہیں پوچھا تھا مگر اس موقع پر عامر نے اس کا ساتھ دیا۔ ''جی ابو! اس نے مجھ سے پوچھا بلکہ اجازت چاہی تھی۔''

''تو تم نے اجازت دے دی؟'' ظہیر صاحب نے اسی طنزیہ انداز میں پوچھا۔ ماہا الگ عجیب سے تاثرات کے ساتھ بیٹھی تھی۔

''جی ابو'' عامر نے بھی تحمل سے کہا۔ ''آپ جانتے تھے یہ شروع سے میری خواہش ہے۔''

''اچھا'' ظہیر صاحب نے بدستور اسی لہجے میں کہا۔ ''چلو ہمارے بیٹے اور بہو کی خواہش ہے تو اسے پورا کر دیتے ہیں۔''

''لیکن ابو.....'' ماہا نے کچھ کہنا چاہا مگر ظہیر صاحب نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

''دیکھتے ہیں کہ یہ اپنے الفاظ کا کس حد تک خیال رکھتے ہیں۔''

ریحانہ دو تین دن سے یہاں آنے کا کہہ رہی تھی اور عامر اسے ٹال رہا تھا۔ اپنے باپ کے گھر جانے کے حوالے سے اس کا یہی رویہ ہوتا تھا۔ جبکہ ریحانہ جب اپنے گھر چلنے کو کہتی تو وہ فوری تیار ہو جاتا۔ اگر مصروف ہوتا تب بھی اسی دن لے جاتا۔ ریحانہ نے محسوس کیا کہ اپنے باپ کے جواب سے عامر پریشان ہو گیا تھا۔ اس نے اس وقت تو کچھ نہیں کہا لیکن گھر آتے ہی بولا۔ ''ریحانہ! تم نے یہ کیا حماقت کی ہے؟''

وہ حیرت سے بولی۔ ''یہ حماقت ہے؟''

''ہاں۔'' عامر مضطرب انداز میں ٹہلنے لگا۔ ''تم ابو کو بالکل نہیں جانتیں۔ امی ہارٹ کی مریضہ ایسے ہی نہیں بنی تھیں اور ماہا ابو کی دوسری کاپی ہے۔ یہ لوگ بہت الگ فطرت کے اور صرف اپنے لیے جینے والے لوگ ہیں۔ ان کے ساتھ رہنا بہت مشکل کام ہے۔''

ریحانہ بھی پریشان ہو گئی کیونکہ عامر کبھی چھوٹی موٹی پریشانیوں کو خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ وہ اس وقت بہت پریشان تھا۔ ''آپ کا مطلب ہے یہ ہمیں تنگ کریں گے؟''

عامر نے گہری سانس لی۔ ''تنگ کرنا بہت چھوٹا لفظ ہے۔ کاش میں نے تمہیں ان کے بارے میں سب بتا دیا ہوتا۔''

☆☆

عامر نے ہوش سنبھالا تو اپنے گھر کا ماحول بہت عجیب پایا تھا۔ وہاں بے انتہا پابندیاں تھیں اور ان کی پابندی بھی لازمی تھی۔ ظہیر الدین گھر میں بھی سرکاری افسر بنے رہتے تھے اور ان کی ہر بات کی تعمیل لازمی ہوتی تھی۔ بیوی اور اس کے بعد بچوں کو بھی وہ ماتحت سمجھ کر پیش آتے تھے۔ سب صبح چھ بجے لازمی اٹھ جاتے۔ بچے اسکول سے آنے کے بعد دو سے چار بجے تک اپنے کمرے میں رہتے تھے اور انہیں صرف شام پانچ سے چھ بجے تک باہر جا کر کھیلنے کی اجازت ہوتی تھی۔ سات بجے تک وہ ٹی وی دیکھ سکتے تھے اور آٹھ بجے رات کے کھانے کے بعد وہ معمولات سے فارغ ہو کر نو بجے تک بستر پر چلے جاتے۔ خود ظہیر الدین دس بجے تمام لائٹس آف کر دیتے تھے۔ اس کے بعد کسی کو

کمرے سے نکلنے کی کیا، بستر سے بلا وجہ اٹھنے کی بھی اجازت نہیں ہوتی تھی۔

ظہیر الدین کا رشتے داروں سے ملنا جلنا نہایت کم تھا اور خاص طور سے وہ سسرالی رشتے داروں کا آنا پسند نہیں کرتے تھے۔ جہاں تک ان کے ہاں جانے کی بات تھی تو شادی کے شروع کے چند دنوں کے بعد انہوں نے کبھی سسرال جانے کی زحمت نہیں کی تھی۔ سوائے خوشی غمی کے۔ ان کی سخت گیر طبیعت نے اول دن سے نصرت جہاں کو سہما کر رکھا ہوا تھا اور چند ایک بار کے نہایت برے تجربات کے بعد اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ ظہیر الدین کے آگے انکار کر سکے یا کسی حکم پر اعتراض کرے۔ وہ نصرت جہاں کو لگا بندھا گھر کا خرچ دیتے تھے اور اسی میں پورا کرنے کا کہتے تھے۔ وہ جس طرح سے خرچ پورا کرتی تھی، یہ اسی کو پتا تھا اور اس کوشش میں وہ ہلکان ہو جاتی تھی۔ سال کے سال ظہیر الدین اسے اور بچوں کو کپڑے بنا کر دیتے تھے اور کوئی بھی ضروری چیز ایک ہی بار ملتی تھی۔ مخصوص مدت گزرنے کے بعد ہی وہ چیز دوبارہ ملتی تھی۔

گھر اور بیوی بچوں کے اخراجات میں ان کا رویہ کنجوسی کی حد تک پہنچا ہوا تھا مگر اپنی ذات کے لیے ان کا ہاتھ بہت کھلا ہوا تھا۔ سرکاری افسر ہونے کے ناتے وہ اپنی حیثیت سے بڑھ کر سوٹ وغیرہ سلواتے تھے اور ان کی الماری میں درجنوں سوٹ تھے۔ اسی طرح وہ اعلیٰ درجے کے جوتے پہنتے تھے اور ان کے درجن بھر جوڑے موجود تھے۔ جبکہ بچے سخت سردی میں بھی پھٹ جانے والے جوتوں میں اسکول جانے پر مجبور ہوتے تھے۔ ان کے یونیفارم اور جوتے سال میں ایک ہی بار آتے تھے۔ اسکول فیڈرل بورڈ کا تھا۔ فیس یا کورس کا جھنجٹ نہیں تھا۔ صرف یونیفارم اور جوتے لینا پڑتے تھے۔ جب بچوں کے نئے سال کا سیشن شروع ہوتا یا عید بقرہ عید کا موقع آتا تو ظہیر الدین کی جھنجلاہٹ اور غصہ عروج پر ہوتا تھا۔ ان دنوں گھر میں زبردست ہنگامہ ہوتا تھا اور نصرت جہاں کی بچوں سمیت شامت آئی ہوتی تھی۔ بچوں کو معمولی جیب خرچ ملتا تھا جبکہ ان کے گریڈ کے افسران کے بچے کھلا خرچ کرتے تھے۔

عامر کے بڑے دونوں بھائیوں میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ کسی بھی معاملے میں باپ سے احتجاج کرتے اور وہ باپ کا غصہ ماں پر اتارتے تھے۔ اس پر دباؤ ڈالتے کہ جو باپ پورا نہیں کرتا ہے، وہ پورا کرے۔ نصرت جہاں مجبور تھی۔ وہ گھر کا خرچ چلاتی یا بیٹوں کی فرمائشیں پوری کرتی۔ زیادہ مجبور ہونے پر وہ انہیں کچھ رقم دے دیتی تھی مگر یہ ان کی تسلی کے لیے کافی نہیں تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اسکول کے زمانے سے انہوں نے خود کمانے کی کوشش شروع کر دی۔ انہیں چھوٹی موٹی جابس مل گئیں جن سے وہ اپنا خرچ پورا کرنے لگے تھے مگر اس میں سے ماں کو کبھی کچھ نہیں دیا۔ رقم کے معاملے میں وہ باپ کی طرح خود غرض نکلے۔ عامر تیسرے نمبر پر تھا اور وہ یہ سب دیکھ کر کڑھتا تھا۔ کبھی کبھی وہ بھائیوں سے جھگڑ پڑتا کہ وہ ماں کو کیوں تنگ کرتے ہیں جب کہ انہیں معلوم ہے کہ وہ کتنی مشکل سے گھر چلا رہی ہے۔ مگر چھوٹے ہونے کی وجہ سے بڑے بھائی اسے کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے۔

گھر کا ماحول اس وقت ذرا بدلا جب ماہا پیدا ہوئی اور ظہیر الدین نے پہلی بار کسی اولاد کے لاڈ اٹھائے۔ ماہا بچپن سے ان کی چہیتی تھی۔ اس کے لیے وہ ایک سے بڑھ کر ایک چیز لاتے تھے اور گھر میں آتے ہی ماہا کو گود میں اٹھا لیتے تھے۔ اپنے ہوش میں عامر کو نہیں یاد کہ باپ نے بھی اسے گود میں اٹھایا ہو یا پیار کیا ہو۔ نصرت خوش تھی کہ ظہیر الدین نے کسی اولاد کو تو پیار کیا مگر انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ بیٹی سے یہ لاڈ پیار نصرت کے لیے مصیبت بن جائے گا۔ ماہا بچپن سے لاڈلی تھی۔ اس لیے خودسر اور اپنی خواہشات کی اسیر نکلی۔ اسے بھی باپ کی طرح سوائے اپنے کسی کی پروا نہیں تھی۔ جیسے ظہیر الدین کو بیوی کی پروا نہیں تھی، اسی طرح ماہا کو ماں سے کوئی غرض نہیں تھی۔ دس بارہ سال کی عمر میں جب لڑکیاں ماں کا بازو بن جاتی ہیں، وہ اٹھ کر پانی تک نہیں پیتی تھی۔ اگر نصرت اسے کچھ سکھانے یا کام پر لگانے کی کوشش کرتی تو ظہیر الدین آڑے آ جاتے۔

عامر ماہا سے سات سال بڑا تھا۔ عمیر اور سمیر پڑھنے میں خاص تیز نہیں تھے مگر دوسرے معاملات میں ان کا دماغ بہت تیز تھا۔ انہوں نے باپ کی پوسٹ سے فائدہ اٹھایا۔ پہلے عمیر کینیڈا گیا۔ وہاں اس نے بزنس کیا اور بھائی کو بھی بلوا لیا۔ اسے بھائی سے محبت نہیں تھی بلکہ اسے اپنے بزنس کے لیے ایک ایسے مددگار کی ضرورت تھی جس پر وہ اعتماد کر سکے۔ اسی لیے اس نے سمیر کو بلایا تھا۔ دونوں جب سے باہر گئے تھے صرف دو بار واپس آئے تھے۔ ایک بار انہیں کچھ ضروری کاغذات بنوانے تھے اور دوسری بار ماں کی میت پر آئے تھے۔ اس کے بعد انہوں نے باپ، بہن اور بھائی

سے رابطہ واجبی سا کرلیا تھا۔ ظہیر الدین اور ماہا کو تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑا تھا مگر عامر کو بھائیوں کا یہ رویہ بہت محسوس ہوا تھا۔

نصرت جہاں کو دل کی تکلیف پہلی بار اس وقت ہوئی جب عامر میٹرک میں تھا۔ اتفاق سے وہی گھر پر تھا اور ماں کو لے کر اسپتال بھاگا تھا۔ یہ ہارٹ اٹیک نہیں تھا مگر ڈاکٹر نے خبردار کیا کہ اگر نصرت جہاں کا بی پی قابو میں نہیں آیا تو انہیں انجائنا کا مرض ہوسکتا ہے۔ عامر جانتا تھا کہ ماں کا... بی پی قابو آ ہی نہیں سکتا تھا جبکہ بی پی ہائی ہونے کی وجہ گھر میں موجود تھی۔ وہ باپ سے بات نہیں کر سکتا تھا۔ ماہا سے بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ ماں کا خیال رکھے۔ اس لیے وہ اپنی حد تک ماں کا خیال رکھنے لگا۔ کالج میں اس نے ایف ایس سی میں داخلہ لیا۔ میٹرک میں اس کی بورڈ میں پوزیشن آئی تھی۔ اسے اچھے کالج میں داخلہ ملا اور اس نے ایف ایس سی میں بھی پوزیشن لی تھی۔ اسے اسکالر شپ کے ساتھ انجینئرنگ یونیورسٹی میں داخلہ مل گیا۔ عامر نے کیمیکل انجینئرنگ کا انتخاب کیا۔ چار سال بعد اس نے یہاں بھی اعزاز کے ساتھ کامیابی حاصل کی۔

دورانِ تعلیم اس کی دوستی ایلیٹ کلاس خاندان کے ایک لڑکے محمود سے ہوئی اور انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ نوکری کے بجائے اپنا کام کریں گے۔ ڈگری حاصل کرنے سے پہلے وہ اس کا سیٹ اپ بھی تیار کر چکے تھے۔ پیسا محمود نے لگایا اور انہوں نے بیرونِ ملک سے کیمیکل منگوا کر مقامی مارکیٹ میں سپلائی شروع کر دی۔ یہ کام ایسا چلا کہ چند سال بعد انہوں نے بیس کیمیکل کی تیاری کا پلانٹ لگا لیا اور کچھ عرصے بعد اسے ترقی دے کر فیکٹری بنا لی۔ اس موقع پر عامر کے محمود سے کچھ اختلافات ہوئے اور انہوں نے شراکت ختم کرنے کا فیصلہ کیا۔ بٹوارے میں فیکٹری عامر کے حصے میں آئی اور امپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس محمود نے لے لیا۔ اس وقت تک عامر اس قابل ہو گیا تھا کہ اپنے گھر کو سپورٹ کر سکے۔ بڑے بھائیوں کے باہر جانے اور لاتعلق ہونے کے بعد عامر نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ ماں باپ کو نہیں چھوڑ سکتا مگر ادھر اس نے اپنی فیکٹری کھولی اور ادھر ظہیر صاحب نے اسے اپنا بندوبست کرنے کو کہہ دیا۔ عامر حیران ہوا۔ اس نے کہا۔

''ابو! میں آپ کے ساتھ رہنا چاہتا ہوں، آپ کا سہارا بننا چاہتا ہوں۔''

''مجھے کسی سہارے کی ضرورت نہیں ہے۔'' ظہیر صاحب نے خشک لہجے میں کہا۔ ''میں نے تم لوگوں کو اپنے پیروں پر کھڑا کر دیا ہے بس اس سے زیادہ میں اور کچھ نہیں کر سکتا۔''

عامر نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔ ''ابو! میں آپ سے کچھ مانگ نہیں رہا ہوں۔ میں تو آپ کے لیے کچھ کرنا چاہتا ہوں۔''

مارے مروت کے وہ یہ بھی نہیں کہہ سکا کہ انہوں نے اس کی تعلیم میں بھی کوئی کردار ادا نہیں کیا تھا۔ انٹر تک اس نے سرکاری تعلیم حاصل کی اور اس کے بعد وہ اسکالر شپ پر پڑھتا رہا مگر ظہیر الدین نے اپنے پیروں پر کھڑا کرنے کی بات یوں کی تھی جیسے وہ ہی تمام اخراجات برداشت کرتے رہے ہوں۔ عامر نے انہیں سمجھانے کی ہر ممکن کوشش کی مگر انہوں نے اس کی ایک نہیں سنی۔ مجبوراً اسے گھر سے نکلنا پڑا۔ عامر کو ماں کی فکر تھی کیونکہ ڈاکٹروں کی وارننگ کے مطابق وہ انجائنا کی مریض بن چکی تھی۔ ظہیر الدین اور ماہا میں سے کوئی اس کی پروا نہیں کرتا تھا۔ طبیعت جب بہت زیادہ خراب ہو جاتی تو نصرت جہاں کو اسپتال لے جایا جاتا۔ ظہیر الدین کو میڈیکل کی سہولت حاصل تھی مگر اپنے طور پر ان کی تشخیص تھی کہ نصرت جہاں ڈراما کرتی تھی ورنہ اسے خاص بیماری نہیں تھی۔ ایک بار ڈاکٹر کے پاس لے جانے کے بعد وہ پورے ہفتے اس بات کا طعنہ دیتے تھے۔

عامر یہ سب دیکھتا رہتا اور کڑھتا تھا۔ وہ باپ کے سامنے بات نہیں کر سکتا تھا مگر ماں کی فکر تھی۔ گھر سے نکالے جانے کے بعد بھی وہ ہر روز آتا۔ چند سال بعد وہ اس قابل ہو گیا کہ کوٹھی بنا سکے۔ تب اس نے ظہیر الدین کو آمادہ کرنا چاہا کہ وہ اس کے ساتھ رہیں تب بھی وہ نہیں مانے۔ بیٹے کے گھر رہنا انہیں معیوب لگتا تھا اور بیوی کی بھی انہیں پروا نہیں تھی جو بیماری کے عالم میں بھی گھر کی ساری ذمے داریاں سنبھالتی تھی۔ ماہا کو شروع سے کوئی کام کرنے کی عادت نہیں تھی۔ بچپن سے اس کا معمول تھا پہلے اسکول اور پھر کالج کے لیے تیار ہو کر وہ ناشتے کی میز پر آتی اور نصرت جہاں اس کے سامنے ناشتا لگاتی تھی۔ ناشتے کے بعد وہ برتن ایسے ہی چھوڑ کر باپ کے ہمراہ گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہو جاتی۔

یہ اعزاز بھی اسے ہی حاصل تھا ورنہ ظہیر الدین نے آج تک کسی اولاد کو اسکول یا کالج ڈراپ نہیں کیا

تھا۔ دوپہر میں آتی تو ایک بار پھر اس کے سامنے کھانا سجایا جاتا۔ اس کی واپسی سے پہلے نصرت اس کے کمرے کی صفائی کر کے اس کی پھیلائی چیزیں سمیٹ کر رکھ چکی ہوتی تھی۔ کھانے کے بعد وہ اپنے کمرے میں چلی جاتی اور اس وقت وہاں سے نکلتی جب ظہیر الدین کی دفتر سے آمد ہوتی۔ اس کے بعد دونوں باپ بیٹی لاؤنج یا نشست گاہ میں بیٹھ کر دنیا جہاں کے بارے میں گفتگو شروع کر دیتے۔ گفتگو کا مرکز دوسروں کی برائی ہوتی تھی اور اکثر موضوعِ سخن نصرت جہاں یا عامر اور اس کے بھائی ہوتے تھے۔ نصرت جہاں سنتی اور ان باپ بیٹی کی خدمت کرتی رہتی۔ کڑھنے اور خاموش رہنے سے اس کا مرض اندر ہی اندر بڑھتا گیا۔ عامر نے کوشش کی کہ وہ ماں کو سہولت دینے کے لیے ملازمہ رکھ دے مگر ظہیر الدین اور ماہا نے یہ تجویز مسترد کر دی۔ ظہیر الدین نے یوں انکار کر دیا کہ وہ اپنے گھر میں کسی کی مداخلت قطعی پسند نہیں کرتے اور ماہا کا کہنا تھا کہ لوگ کیا کہیں گے کہ ایک لڑکی کے ہوتے ہوئے گھر میں ملازمہ رکھی ہے۔ عامر نے پہلی بار اسے کہا۔

''اسی لڑکی کے ہوتے ہوئے دل کی مریضہ ماں صبح سے شام تک کاموں میں لگی رہتی ہے۔''

''مجھے پڑھائی سے فرصت کہاں ملتی ہے۔'' ماہا ڈھٹائی سے بولی۔ ''صبح کالج اور شام کو کوچنگ۔''

ایک بار جب نصرت جہاں کی طبیعت زیادہ خراب ہوئی اور وہ دو دن اسپتال میں رہی تو عامر نے اسے راضی کر لیا کہ وہ کچھ دن چل کر اس کے ساتھ رہے۔ مگر جب عامر اسے لے جانے کے لیے آیا تو نصرت جہاں نے اس کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا اور وجہ بھی نہیں بتائی۔ البتہ اس کے تاثرات اور آنکھوں کی نمی نے عامر کو بتا دیا کہ وجہ کیا تھی۔ اسے زندگی میں پہلی بار باپ پر شدید غصہ آیا۔ نصرت جہاں اس کے تاثرات سے بھانپ گئی۔ اس نے کہا۔ ''عامر! تو کوئی بات نہیں کرے گا۔''

''امی! آپ کب تک یہ ستم برداشت کرتی رہیں گی؟'' اس نے تڑپ کر سوال کیا۔

''جب تک جان ہے۔'' نصرت جہاں نے جواب دیا۔ ''میرے بچے تم میری فکر مت کرو۔ تم نے میرا دل بہت خوش کیا ہے بلکہ ایک تم نے ہی کیا ہے۔ اس کا صلہ تمہیں اللہ دے گا۔''

''امی! میں جو کچھ بھی ہوں آپ کی دعاؤں سے ہوں۔ آپ سوچ نہیں سکتیں کہ میں اپنے پُرآسائش گھر میں کتنی تکلیف میں رہتا ہوں کیونکہ میری ماں میرے ہوتے ہوئے بھی مشکل ترین زندگی گزار رہی ہے۔''

نصرت جہاں نے گہری سانس لی۔ ''یہ میرا مقدر ہے میرے بچے۔''

اس کے بعد نصرت جہاں ایک سال اور زندہ رہی اور ایک رات سوتے میں اسے ہارٹ اٹیک ہوا اور وہ بنا کسی کو تکلیف دیے اس دنیا سے گزر گئی۔ عامر کے لیے یہ بہت بڑا سانحہ تھا اور وہ بہت دن تک ڈسٹرب رہا تھا۔ ایک دکھ والا لمحہ اس وقت آیا جب ظہیر الدین نے بیوی کے مرنے کے دو مہینے کے اندر ماہا کی شادی کر دی۔ یہ شادی اس کی پسند سے ہوئی تھی اور شاید اس کے اصرار پر جلدی شادی کی گئی تھی۔ اس کا شوہر فرحان اچھا آدمی تھا مگر ماہا نے شادی کے بعد ...... اپنے شوہر کو اتنی ٹینشن دی کہ وہ ڈپریشن کا مریض بن گیا۔ وہ درمیانے درجے کا سرکاری افسر تھا اور ماہا اس سے بڑے بڑے مطالبے کرتی تھی جو وہ پورے نہیں کر سکتا تھا۔ ڈپریشن کی وجہ سے حادثہ کر بیٹھا جو جان لیوا ثابت ہوا۔ شوہر کے مرنے سے ماہا کو کوئی خاص فرق نہیں پڑا تھا اور اس نے اعلان کر دیا کہ اب وہ شادی نہیں کرے گی کیونکہ اسے شادی کے نام سے ہی نفرت ہو گئی ہے۔ ان باپ بیٹی نے کبھی عامر کی شادی کے بارے میں سوچا بھی نہیں تھا۔ یہ تو اس کی خالہ تھی جس کی وجہ سے عامر کا گھر بس گیا تھا۔

☆☆☆

یہ سب جان کر ریحانہ بہت زیادہ فکر مند ہو گئی۔ ''اب کیا ہوگا وہ تو مان بھی گئے ہیں؟''

''جو ہوگا وہ تم بھی دیکھو اور بھگتو گی۔'' عامر نے سرد آہ بھری۔ ''میں تو پہلے ہی بھگت رہا ہوں۔''

ریحانہ نے روہانسے لہجے میں کہا۔ ''سوری، مجھے بالکل معلوم نہیں تھا کہ میں اتنی بڑی غلطی کرنے جا رہی ہوں۔''

''نہیں غلطی میری ہے۔ تمہیں اپنے گھر والوں کی فطرت کے بارے میں بتا دینا چاہیے تھا مگر میں اس سے گریز کرتا رہا۔'' عامر نے کہا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کا باپ اور بہن کس نیت سے آ رہے تھے اور ان کی پرسکون زندگی میں بھونچال آنے والا تھا۔ چند ہفتے بعد ظہیر صاحب نے اپنا مکان کرائے پر چڑھا دیا۔ جس سامان کی ضرورت نہیں تھی، اسے اوپر کے دو کمروں میں رکھ دیا اور ذاتی سامان سمیت عامر کی کوٹھی میں منتقل ہو گئے۔ اس وقت عامر نے موجودہ کوٹھی نہیں بنوائی تھی۔ ابھی اس نے صرف پلاٹ لیا تھا۔

بہرحال اس کوٹھی میں بھی بہت گنجائش تھی۔ ریحانہ نے ان کے لیے دو بیڈ رومز مکمل طور پر تیار رکھے تھے۔ اس نے ان کی نئے سرے سے سجاوٹ کی تھی اور نئے قالین کے ساتھ نئے پردے لگوائے تھے اور وہ یہ سب خود لے کر آئی تھی۔ وہ اپنے طور پر کوشش کر رہی تھی کہ آنے والوں کو زیادہ سے زیادہ خوش کر سکے اور ان کا موڈ اچھا رہے۔

مگر وہ ان لوگوں میں سے نہیں تھے جو اپنا موڈ کسی کے رویے پر چھوڑتے ہیں۔ ظہیر صاحب نے آتے ہی حکم صادر کیا کہ ان بیڈ رومز کا سامان نکال دیا جائے اور وہ سامان لگایا جائے جو وہ ساتھ لائے تھے۔ حالانکہ وہ جو فرنیچر لائے تھے، وہ خاصا پرانا تھا اور کمروں کے رنگ اور دوسری چیزوں کے لحاظ سے بالکل بھی مناسب نہیں تھا۔ ریحانہ نے ان کو بتانا چاہا کہ اس نے خود ان کے لیے خاص فرنش کیا ہے مگر انہوں نے اسے بہت خراب لہجے میں ٹوک دیا۔ ”لک، میں اپنے معاملے میں کسی کی مداخلت پسند نہیں کرتا ہوں۔ میں جیسے کہہ رہا ہوں ویسے ہی کراؤ۔“

ریحانہ نے پھر کہنا چاہا مگر عامر نے مداخلت کی۔ ”ٹھیک ہے ابو، جیسے آپ کہیں گے ویسا ہی ہو جائے گا۔“

”مجھے اپنے کسی معاملے میں مداخلت بالکل بھی قبول نہیں ہے۔“ ظہیر صاحب کا لہجہ بہت سخت تھا۔ ”یہ بات اپنی بیوی کو بھی بتانا تھی۔“

ملازموں کے سامنے ہونے والی بے عزتی پر ریحانہ کا چہرہ خفت سے زرد پڑ گیا اور ماہا یوں خوش تھی جیسے اس کی کوئی بڑی خواہش پوری ہو گئی ہو۔ عامر کچھ دیر تو خاموش ہوا پھر اس نے کہا۔ ”ابو یہ صرف میری بیوی نہیں، آپ کی بہو بھی ہے۔“

لیکن اس سے پہلے ظہیر صاحب پر بیٹے کی بات کا کچھ اثر ہوتا، ماہا بولی۔ ”چھوڑیئے ابو، باہر سے آنے والی ایک عورت کو آپ کی کیا پروا ہو سکتی ہے۔ بھابھی تو اپنی مرضی چلانا چاہیں گی کیونکہ یہ ان کا گھر ہے۔“

اسی لمحے ریحانہ نے جان لیا کہ اس کی زندگی کا مشکل ترین دور شروع ہونے والا ہے۔ مگر یہ دور اتنا مشکل ہوگا اس کا اسے اندازہ نہیں تھا۔ ان دونوں باپ بیٹی نے اس کی زندگی مشکل سے مشکل تر بنانا شروع کر دی۔ اس کی ہر بات پر اعتراض کرتے۔ اگر وہ خیال رکھتی تب بھی اعتراض ہوتا اور اگر کسی چیز میں پیچھے ہٹ جاتی تو خیال نہ رکھنے کا طعنہ دیا جاتا۔ بات کو گھمانا اور بات سے نئی بات نکالنا انہیں خوب آتا تھا۔ ان دونوں کے دماغ میں منفی سوچ کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی اور وہ کبھی غلطی سے بھی مثبت نہیں سوچ سکتے تھے۔ یہاں آنے سے پہلے ماہا بیٹی کو جنم دے چکی تھی اور وہ اس پر یوں فخر کرتی تھی جیسے اولاد پیدا کرنے کا کارنامہ اس دنیا میں صرف اسی نے انجام دیا ہے۔ وہ موقع بہ موقع ریحانہ کو جتاتی کہ وہ اب تک ماں نہیں بن سکی ہے۔ حالانکہ اس کی شادی کو ابھی چھ مہینے ہوئے تھے۔ سارا دن ان باپ بیٹی کا سامنا کرنے کے بعد جب وہ رات کو کمرے میں آتی تو عامر سے یہ سوال ضرور کرتی۔

”آپ ان لوگوں سے اتنا مختلف کیوں ہیں؟“

”شاید اس لیے کہ میں اپنی امی پر گیا ہوں اور شعوری طور پر ابو سے دور رہا ہوں۔“

”اس کے باوجود انسان میں فطرت تو آتی ہے۔“

”نہیں، اکثر اوقات انسان اپنے بڑوں سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ تم نے سنا ہے نا کہ شیطان کے گھر ولی پیدا ہوا یا ولی کے گھر شیطان پیدا ہو گیا۔“

چند مہینے میں انہوں نے ریحانہ کو اتنا عاجز کر دیا کہ اسے لگا محاورے کا دوسرا حصہ ہی درست ہے۔ اگر عامر نہ ہوتا تو شاید وہ دوسرے مہینے سے پہلے اپنے گھر جا چکی ہوتی۔ یہ عامر ہی تھا جس کی خاطر وہ انہیں برداشت کرتی رہی۔ مگر ان باپ بیٹی نے اسے نفسیاتی مریض بنا دیا۔ اسے رات کو نیند نہیں آتی تھی کہ صبح ان لوگوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس کا دل اتنا کمزور ہو گیا تھا ذرا سی آہٹ اسے چونکا دیتی تھی۔ اس کا خود پر قابو ختم ہو گیا تھا اور کبھی کبھی تو بیٹھے بیٹھے خود بہ خود اس کے آنسو بہنے لگتے۔ اس کی بھوک ختم ہو گئی تھی کیونکہ کھانے کی میز پر دونوں باپ بیٹی موجود ہوتے تھے اور ان کی زبان بنا کسی احساس کے مسلسل چلتی رہتی تھی۔ وہ اس کے سامنے اس کے بارے میں ایسی دل آزار باتیں کرتے کہ ریحانہ کا دل چاہتا کہ چیخیں مار مار کر رو دے یا اس گھر سے بھاگ جائے۔

اس نے ایسے لوگوں کا سامنا کرنا دور کی بات ہے، کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ اس کا ان سے پالا پڑے گا۔ وہ دن بہ دن کمزور ہو رہی تھی۔ اگرچہ گھر میں کئی ملازمائیں تھیں مگر اسے نگرانی تو کرنا پڑتی تھی۔ ایک دن وہ ناشتے کے بعد ملازمہ سے صفائی کرا رہی تھی کہ اسے شدید چکر آئے اور وہ بے ہوش ہو گئی۔ بدحواس ملازمہ پہلے چیخنے لگی مگر جب کوئی نہیں آیا تو وہ خود کسی نہ کسی طرح اسے اٹھا کر بیڈ روم میں لے آئی۔ وہ عامر کو کال بھی نہیں کر سکتی تھی کہ اس کے پاس نمبر نہیں تھا۔ وہ بھاگی ہوئی ماہا کے کمرے تک آئی اور

دروازہ بجاتی رہی مگر اس نے جواب نہیں دیا۔ اتنے میں برابر والے کمرے سے ظہیر الدین نکلے اور اسے ڈانٹا کہ ماہا کی طبیعت خراب ہے اسے تنگ نہ کرے۔ بدحواس ملازمہ نے ریحانہ کے بارے میں بتانا چاہا مگر وہ اسے جھاڑ کر اپنے کمرے میں جا چکے تھے۔

ملازمہ کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے کہ اتفاق سے عامر کی خود کال آگئی اور ملازمہ نے اسے بتایا تو وہ تیزی سے گھر آیا اور بے ہوش ریحانہ کو گاڑی میں ڈال کر اسپتال لے گیا۔ ریحانہ کو آئی سی یو میں لے جایا گیا کیونکہ اس کا بلڈ پریشر خطرناک حد تک گر چکا تھا۔ بروقت طبی امداد سے اس کی طبیعت سنبھل گئی مگر ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ اگر اسے لانے میں کچھ دیر اور ہوتی تو اس کی زندگی کو خطرہ لاحق ہو سکتا تھا۔ ریحانہ کی حالت بہتر ہونے کے بعد اس کے کچھ ٹیسٹ ہوئے اور جب ان کے نتیجے آئے تو ڈاکٹر نے ایک اچھی خبر سنائی جبکہ دوسری خبر بری تھی۔ اس نے عامر سے کہا۔ ''آپ کے لیے خوشخبری ہے کہ یہ امید سے ہیں۔ لیکن بری خبر یہ ہے کہ ان کے اعصاب بہت کمزور ہوگئے ہیں اور اگر علاج نہ کیا گیا تو صرف بچے کو ہی نہیں، ان کی جان کو بھی خطرہ ہو سکتا ہے۔''

عامر جانتا تھا کہ ریحانہ کے اعصاب کیوں اتنے کمزور ہوئے ہیں مگر وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ ریحانہ نے یہ مصیبت خود مول لی تھی اور اب اس سے چھٹکارا مشکل تھا۔ واپسی میں اس سے پہلے کہ عامر پوچھتا، کسی نے ریحانہ کو کیوں نہیں دیکھا، ماہا شروع ہوگئی۔ ''ہم نے تو اپنے شوہر کو کبھی ایسے ڈھکوسلے نہیں دکھائے۔ ہمارے شوہر پروا بھی کہاں کرتے تھے؟''

''یہ سب بیوی کے پیچھے دم ہلانے والے ہیں۔'' ظہیر صاحب نے بیٹی کی تائید کی۔ عامر خاموش رہ گیا۔ مگر ریحانہ کو اندر کمرے میں پہنچا کر وہ واپس آیا اور اس نے کہا۔

''آپ لوگوں کے لیے اچھی خبر ہے۔ ریحانہ امید سے ہے۔ اب آپ کے نشانے پر ایک نہیں دو جانیں ہوں گی۔''

مگر وہ سمجھنے اور شرمندہ ہونے والے لوگ نہیں تھے۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جو خود فہمی میں تکبر کی حد کو پہنچے ہوتے ہیں اور ان کے خیال میں ان کا کیا اور کہا ہی درست ہوتا ہے۔ غلطی ہمیشہ دوسروں کی ہوتی ہے۔ ایسے لوگ بہت بڑی چوٹ کھا کر بھی نہیں سنبھلتے۔ اس لیے ظہیر الدین اور ماہا کا وتیرہ برقرار رہا۔ البتہ ریحانہ کی یوں بچت ہوگئی کہ ڈاکٹر نے اسے مکمل آرام کا کہا تھا اور وہ بیشتر وقت اپنے بیڈروم میں رہتی تھی۔ یوں ان کا سامنا کرنے اور ان کی باتوں سے محفوظ تھی۔ مگر وہ کمرے میں بند ہو کر بیٹھنے والی لڑکی نہیں تھی۔ اپنے کمرے میں بھی چھوٹے موٹے کام کرتی رہتی مگر یہ بھی کتنا کرتی۔ اسے کھلی جگہ اور کھلی فضا اچھی لگتی تھی۔ کوٹھی کے سامنے چھوٹا مگر خوب صورت لان تھا۔ وہ اس کی سبز گھاس پر ننگے پاؤں چلتی تو اسے اچھا لگتا۔ مگر وہ اس خوف سے اندر بیٹھی رہ جاتی کہ باہر اب وہ دونوں تھے۔

مگر کب تک؟ اس کی طبیعت بہتر ہوئی تو اس نے باہر نکلنا شروع کیا۔ اس کے اندر کہیں توقع تھی کہ شاید اب وہ اس کے ساتھ نرم رویہ رکھ لیں۔ چلو کوئی رویہ نہ رکھیں، اس کی جان بخشی کردیں مگر وہ تو جیسے ادھار کھائے بیٹھے تھے کہ وہ سامنے آئے تو پچھلی کسر بھی نکال لیں۔ خاص طور سے ماہا کا رویہ اس بار حد سے گزرا ہوا تھا اور وہ اس سے عام سی بات بھی اتنے زہریلے لہجے میں کرتی کہ ریحانہ نہ چاہتے ہوئے بھی رو دیتی۔ وہ بار بار اس سے پوچھتی کہ آخر اس کا قصور کیا ہے اور وہ اسے کس بات کی سزا دے رہے ہیں۔ ماہا نے کبھی اس بات کا جواب نہیں دیا مگر ایک بار اس کے منہ سے حقیقت نکل گئی۔ وہ اس بات کا ماتم کرتے ہوئے کہہ رہی تھی کہ دوسری لڑکیاں بھابھی اپنی مرضی سے لاتی ہیں اور ایک وہ ہے جسے ایک بہن ہوتے ہوئے بھی بھابھی اپنی مرضی سے لانے کا موقع نہیں ملا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے ریحانہ کو ایک لمحے کو بھی قبول نہیں کیا تھا۔ تقریباً یہی خیال ظہیر الدین کا بھی تھا۔

دوسری بار اسے نروس بریک ڈاؤن ہوا اور خوش قسمتی سے عامر گھر پر تھا۔ رات کے کھانے کے بعد وہ اور عامر باہر لان میں چہل قدمی کرتے ہوئے گفتگو کر رہے تھے۔ ظاہر ہے گفتگو کا مرکز گھر کے حالات تھے۔ ریحانہ رو رہی تھی اور عامر اسے تسلی دے رہا تھا۔ ایک بار وہ چلتے ہوئے ذرا آگے نکلا اور ریحانہ سے کوئی بات کی۔ جب جواب نہیں ملا تو اس نے پلٹ کر دیکھا۔ ریحانہ گھاس پر گری ہوئی تھی اور اس کا جسم ہلکے ہلکے لرز رہا تھا۔ وہ نیم بے ہوشی کی کیفیت میں تھی۔ عامر اسے فوری اسپتال لے گیا۔ اس بار بھی ڈاکٹرز کا کہنا تھا اگر اسے لانے میں کچھ دیر ہو جاتی تو وہ مر بھی سکتی تھی۔ فوری ٹریٹمنٹ نے اسے بچا لیا تھا مگر وہ ساری رات آئی سی یو میں رہی اور اسے ذہنی ریکوری کے لیے نیند کا انجکشن دیا گیا۔ عامر ساری رات اس کے ساتھ بستر سے لگا

بیٹھا رہا۔

صبح جب ڈاکٹرز نے اسے اطمینان دلایا کہ ریحانہ کے تمام وائٹل سائن نارمل ہو چکے ہیں تو وہ گھر آیا اور پہلی بار عامر نے اپنے باپ اور بہن سے اونچی آواز میں بات کی اور اس نے انہیں ریحانہ کی حالت کا ذمے دار قرار دیا۔ اس پر ظہیر صاحب نے اس سے کہا۔ ''اصل میں تو تمہاری بیوی نے ہماری زندگی حرام کی ہوئی ہے۔''

''تب اس کی جگہ آپ کیوں نہیں آئی سی یو میں لیٹے؟'' عامر نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ''آپ یہاں ٹھیک ٹھاک ہیں اور آپ کی زندگی حرام کرنے والی ساری رات زندگی و موت کی کشمکش میں رہی۔'' عامر نے کہتے ہوئے ان کے آگے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔ ''مہربانی کریں اور ہماری جان بخشی کر دیں۔''

عامر نے کسی اور انداز میں کہا تھا کہ وہ اپنا رویہ درست کریں مگر ان دونوں کی منفی ذہنیت نے اسے کسی اور انداز میں لیا اور ماہا چیخ چیخ کر رونے لگی کہ عامر نے اپنی اصلیت دکھا دی اور ظہیر الدین بھی اس پر چلانے لگے۔ عامر پریشان ہو کر گھر سے نکل گیا۔ اس کے بعد وہ گھر سے باہر ہی رہا اور تین دن بعد جب ریحانہ گھر آ رہی تھی تو ظہیر الدین اور ماہا اپنا سامان لے کر جا رہے تھے۔ ریحانہ نے روکنا چاہا مگر عامر نے منع کر دیا۔ ''جانے دو، یہ اپنی مرضی سے جا رہے ہیں اور تم فکر مت کرو۔ یہ یہاں سے چلے بھی گئے تب بھی دور رہ کر دوسروں کو ٹینشن دینے کے ماہر ہیں۔ تمہیں ان کی خاص کمی محسوس نہیں ہوگی۔''

عامر کا کہنا درست ثابت ہوا۔ ان دونوں نے ان کا بائیکاٹ کر دیا اور رشتے داروں اور جاننے والوں میں ان کے بارے میں جھوٹی باتیں پھیلانے لگے۔ جو وہ خود کرتے رہے تھے اس کا الزام ان پر لگا رہے تھے۔ عامر اور ریحانہ تک یہ خبریں پہنچتی رہتی تھیں۔ لوگ ان سے پوچھتے تو وہ خاموش رہ جاتے کہ انہیں وضاحت کرنے کی عادت نہیں تھی۔ عامر کا کہنا تھا جو انہیں جانتے ہیں، وہ ان باتوں پر یقین نہیں کریں گے اور جو کریں گے، وہ ان سے پہلے ہی مخلص نہیں ہیں۔ اس لیے اگر وہ یقین کرتے ہیں تو وہ ان کی ذرا بھی پروا نہیں کرتا ہے مگر یہ کہنے کی بات تھی جب قریب ترین رشتوں کی طرف سے ایسی دل آزار باتیں کی جائیں تو انسان پر کچھ نہ کچھ اثر تو پڑتا ہے۔ عامر بھی ڈپریس رہنے لگا اور ایک دن فیکٹری سے واپسی پر اس کا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔

اس کی جان بچ گئی مگر چوٹیں بہت آئی تھیں۔ ساری دنیا اس کی عیادت کے لیے اسپتال آئی تھی۔ اگر نہیں آئے تو اس کا باپ اور بہن نہیں آئے تھے۔

ان دنوں ریحانہ نے اپنی ہمت سے بڑھ کر بوجھ اٹھایا۔ وہ عامر کے ساتھ گھر اور خود کو بھی دیکھ رہی تھی۔ اس کے آخری دن تھے۔ عامر چار دن اسپتال میں رہ کر آیا مگر ابھی اسے ایک مہینا بیڈ ریسٹ کرنا تھا کیونکہ اس کے گھٹنے کی ہڈی ٹوٹی تھی اور بائیں کلائی میں سمپل فریکچر تھا۔ اسی مجبوری کی وجہ سے عامر اسے اسپتال بھی نہیں لے جا سکا۔ ریحانہ نے ماں کو بلا لیا تھا اور وہی اس کی دیکھ بھال کر رہی تھی۔ اس کے ماں باپ اور بھائی و بھابیاں باقاعدگی سے اسے دیکھنے اور حال پوچھنے آتے تھے۔ وقت آنے پر خالدہ اسے اسپتال لے کر گئی جہاں ریحانہ نے نعمان کو جنم دیا۔ عامر خوش تھا۔ ریحانہ بھی خوش تھی اور اس کے گھر والے تو نہال تھے کہ ان کی بیٹی کو اتنی مشکلات کے بعد اللہ کی طرف سے بیٹے کا انعام ملا تھا۔ مگر ظہیر الدین اور ماہا کی طرف سے نہ کوئی پیغام آیا اور نہ وہ خود دیکھنے آئے۔ عامر دکھی تھا۔ صرف ریحانہ کی خاطر اس نے اپنا دکھ چھپا لیا۔

کمزوری اور طبیعت خرابی کے باوجود نعمان نارمل طریقے سے پیدا ہوا تھا اور وہ دوسرے دن گھر آ گئی تھی۔ خالدہ دو دن اس کے ساتھ رہی اور پھر چلی گئی۔ وہ ویسے بھی گھر سے بہت دن دور رہ لی تھی۔ عامر نے ریحانہ اور بچے کی دیکھ بھال کے لیے ایک نرس رکھ لی۔ ماں کے جانے کے بعد ریحانہ نے عامر سے کہا کہ بے شک ظہیر الدین پوتے کو دیکھنے نہیں آئے مگر یہ بہرحال ان کا خون ہے۔ اگر وہ چاہے تو پوتے کو لے جا کر انہیں دکھا سکتا ہے۔ عامر بھی یہی سوچ رہا تھا مگر ہچکچا رہا تھا جب ریحانہ نے احساس دلایا تو اس کی ہچکچاہٹ دور ہو گئی مگر اس سے پہلے کہ وہ نعمان کو لے کر جاتا، اطلاع آئی کہ ظہیر صاحب اور ماہا ایک ایکسیڈنٹ میں شدید زخمی ہوئے ہیں۔ عامر اپنی حالت کے باوجود بھاگا بھاگا گیا۔ وہ بہرحال اس کا باپ اور بہن تھے۔ وہ اسپتال پہنچا تو پتا چلا کہ ظہیر صاحب موقع پر ہی چل بسے اور ماہا شدید زخمی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر اس کی جان بچانے کی کوشش کر رہے تھے۔ آپریشن تھیٹر میں جانے سے پہلے ماہا نے عامر سے کہا۔

''بھائی مجھے معاف کر دینا اور میرے بعد میری بچی کا خیال رکھنا۔''

''تم اس کی فکر مت کرو اور تم کو کچھ نہیں ہوگا۔'' عامر

نے اسے تسلی دی مگر اس کا وقت بھی آ گیا تھا۔ آپریشن ٹیبل پر ماما نے بھی جان دے دی۔ عینی شاہدین کا کہنا تھا کہ حادثے کے وقت ظہیر الدین ڈرائیونگ کے دوران زور سے بول رہے تھے اور ان کی توجہ ڈرائیونگ پر نہیں تھی اسی وجہ سے یہ حادثہ پیش آیا۔ جب انسان کسی دوسرے کو ٹینشن دیتا ہے تو یہ ٹینشن پہلے اس کے اندر بسیرا کرتی ہے اور اسی ٹینشن نے ظہیر الدین کی بھی جان لے لی تھی۔ جب عامر ان دونوں کی لاشیں لے کر اپنے گھر آیا تو ریحانہ اپنے ساتھ ہونے والے سلوک کو بھول کر رو دی۔ پہلے دن سے اس نے آئینہ کو سنبھال لیا تھا جو ابھی مشکل سے پونے دو سال کی تھی۔ اسے پتا ہی نہیں تھا کہ وہ ماں سے محروم ہو گئی ہے۔ کچھ دن بعد وہ ریحانہ کو ہی ماں سمجھنے لگی اور جب وہ دس سال کی تھی تب اسے پتا چل گیا کہ وہ ریحانہ اور عامر کی بیٹی نہیں ہے لیکن اس کے ساتھ سلوک بیٹی والا ہی تھا اس لیے اس اطلاع سے اس پر کوئی خاص فرق نہیں پڑا۔

آئینہ کے آنے کے بعد ایان ہوا اور ان کا گھر مکمل ہو گیا۔ ریحانہ اور عامر کو بچ بچ آئینہ سے پیار تھا اور دوسرے وہ یہ خیال بھی کرتے تھے کہ حقیقت معلوم ہونے کے بعد آئینہ کو ان کے رویے میں کوئی کمی نہ محسوس ہو اس لیے وہ اس کا بہت زیادہ خیال رکھتے تھے مگر انہوں نے اسے لاڈ پیار میں بگاڑا نہیں تھا۔ دس سال کی عمر سے ریحانہ نے اسے چھوٹی موٹی ذمے داریاں دینا شروع کر دی تھیں۔ وہ اس کی تعلیم پر پوری توجہ دیتی تھی اور ٹیوشن کے باوجود خود بھی اسے پڑھاتی تھی۔ چند مہینے پہلے وہ بلوغت کی عمر کو پہنچ گئی تھی اور ریحانہ نے اسے تفصیل سے آنے والے وقت کی نزاکتوں کے بارے میں بتایا تھا۔ وہ اسے بار بار سمجھاتی تھی۔ آئینہ نے دوپٹا لینا شروع کر دیا تھا۔ اسے امید تھی کہ اس کے بعد بھی وہ ان باتوں کو فراموش نہیں کرے گی۔ کیونکہ اب اسے سمجھانے والی اور اس کی دیکھ بھال کرنے والی کوئی قریبی عورت نہیں تھی۔ اس لیے ریحانہ نے اپنی مستقل ملازمہ کی ذمے داری لگا دی تھی کہ وہ آئینہ کی اس حوالے سے دیکھ بھال کرے گی اور اس کی ضروریات پوری کرے گی۔

☆☆☆

نوجوان ڈاکٹر نے تعریفی انداز میں کہا۔ ''آپ نے برائی کا صلہ اچھائی سے دیا۔''

''نہیں...... دینے کی کوشش کی۔'' ریحانہ نے آہستہ سے کہا۔ ''سچ تو یہ ہے کہ آئینہ کو شروع میں سنبھالنا بہت مشکل لگا تھا۔ وہ مشکل بچی ہے مگر اصل بات یہ تھی کہ وہ میری نند کی بچی تھی اور یہ بات مجھے رہ رہ کر یاد آتی تھی۔ کوئی میرے اندر کہتا کہ میں اس معصوم بچی سے اس کی ماں کے کیے کا بدلہ لوں اور یہ بات میں نے بہت مشکل سے.... اپنے ذہن سے نکالی۔''

''اچھی فطرت والے انسان ایسا ہی کرتے ہیں۔''

ریحانہ نے اسے غور سے دیکھا۔ ''آپ کا مطلب ہے کہ میں اچھی عورت ہوں؟''

''بالکل۔'' اس نے کہا۔ ''آپ خود پر نوے فیصد یقین رکھتی ہیں لیکن میرا کلپ بورڈ آپ کو سو فیصد نمبر دے رہا ہے۔''

ریحانہ ہنسی۔ ''آپ کس قسم کے ڈاکٹر ہیں؟ دیکھنے میں تو ہاؤس جاب پر لگ رہے ہیں۔''

''میں ہمیشہ سے اس جاب پر ہوں۔'' وہ بولا اور کلپ بورڈ اپنے زانو پر رکھ لیا۔ ''ایک سوال اور ہے۔''

''وہ بھی پوچھ لیں۔'' ریحانہ نے کہتے ہوئے گھڑی کی طرف دیکھا تو ساڑھے چار بج رہے تھے۔ اسے حیرت ہوئی اس گفتگو میں اتنا وقت گزر گیا تھا اور اسے پتا ہی نہیں چلا۔ نوجوان ذرا آگے جھکا۔

''آپ کو یہ خیال آیا کہ عمر کے اس حصے میں جب آپ جوان ہیں، آپ کا گھر شوہر اور بچے ہیں، زندگی بہت پرسکون اور لطف والی ہے...... کوئی مسئلہ یا پریشانی نہیں ہے تو آپ کو یہ جان لیوا بیماری ہو گئی۔ آپ یہ سب چھوڑ کر جانے والی ہیں۔ کیا آپ نے سوچا کہ آپ ہی کیوں؟''

''کئی بار......'' ریحانہ نے اعتراف کیا۔ ''ابھی آپ کے آنے سے پہلے بھی مجھے یہ خیال آیا تھا۔''

''اس سوال کا کوئی جواب ذہن میں آیا؟''

''نہیں، بہت سوچا مگر سوائے اس کے کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ اوپر والے کی مرضی یہی ہے۔''

''آپ کا کیا خیال ہے، اوپر والا صرف اپنی مرضی کرتا ہے، اسے اپنے بندوں کی کوئی پروا نہیں ہے؟''

''میں ایسا کیسے سوچ سکتی ہوں؟'' ریحانہ کانپ گئی۔ ''یہ تو اس کے حضور گستاخی ہو گی مگر سوال تو اس سے پیغمبروں نے بھی کیے۔''

''ہاں پیغمبروں نے بھی کیے اور وہ اپنے ہر بندے کو ہر سوال کا جواب دیتا ہے۔ سزا جزا میں بھی اسے راضی کیے بغیر نہیں چھوڑتا۔''

ریحانہ نے حیرت سے اسے دیکھا اور پھر ہنس کر بولی۔ ''اب آپ ڈاکٹر کے بجائے واعظ لگ رہے ہیں۔''

''میں نے کہا نا میں نمائندۂ خاص ہوں اس لیے بہت کچھ لگ سکتا ہوں۔'' وہ بولا اور کھڑا ہو کر شیشے کی دیوار تک آیا۔ ''یہ منظر کتنا خوب صورت ہے۔''

''ہاں، میں بچپن سے دیکھتی آئی ہوں لیکن اس کی اصل خوب صورتی آج مجھ پر کھلی ہے۔ آپ کے آنے سے پہلے میں باہر ہی دیکھ رہی تھی۔ شاید کسی چیز کی اصل اہمیت اسی وقت واضح ہوتی ہے جب وہ آپ سے چھننے والی ہو۔''

''یہ بھی اس کی اصل خوب صورتی نہیں ہے۔''

نوجوان نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ ''اس کی اصل خوب صورتی دیکھنی ہے تو اس سے باہر جا کر دیکھیں۔''

''باہر جا کر......'' ریحانہ نے اس کی بات دہرائی۔ ''وہ کیسے؟...... یہاں سے بھی تو نظر آ رہا ہے سب۔''

''نہیں۔'' نوجوان کے لہجے میں اصرار تھا۔ ''باہر نکل کر آپ خود محسوس کریں گی اور ممکن ہے پھر آپ کو اس سوال کا جواب بھی مل جائے کہ آپ ہی کیوں؟''

ریحانہ کو عامر کا خیال آیا، وہ آنے والا تھا مگر نوجوان کی بات نے اسے تجسس میں مبتلا کر دیا تھا۔ باہر جانے سے اور اس کے ساتھ چلنے سے کیا مراد تھی؟ اسے نوجوان سے کسی قسم کا خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ حالانکہ آج تک کسی اجنبی آدمی سے ریحانہ نے اتنی طویل گفتگو نہیں کی تھی اور پھر اپنی زندگی کے وہ گوشے بھی اس کے سامنے بیان کر نا جن کے بارے میں اس نے عامر کو بھی نہیں بتایا تھا جو صرف اس کے اندر تھے...... اسے حیرت ہو رہی تھی کہ وہ کیسے اس سے اتنا بے تکلف ہو گئی؟ کیسے اسے سب بتاتی چلی گئی؟ اور اب نوجوان نے اس سے باہر چلنے کو کہا تو وہ اس پر بھی راضی ہو گئی تھی مگر اس نے نوجوان سے پوچھا۔ ''میں زیادہ دیر نہیں رکوں گی۔ میرا شوہر آنے والا ہے۔''

جواب میں نوجوان صرف بہت دلکش انداز میں مسکرا دیا۔ جب وہ اس انداز میں مسکراتا تو ریحانہ کی ہلکی سی مزاحمت بھی ختم ہو جاتی تھی۔ اس نے ریحانہ کی طرف ہاتھ بڑھایا جو اس نے بلا جھجک تھام لیا اور بستر سے یوں اٹھ آئی کہ اسے اٹھنے کے لیے ذرا بھی زور نہیں لگانا پڑا۔ اچانک اسے لگا جیسے کمرا بہت روشن اور خوب صورت ہو گیا ہو۔ نوجوان نے دوسرے ہاتھ سے دروازہ کھولا اور وہ باہر آ گئے۔ کمرے کے سامنے دوسری منزل کی گیلری تھی اور اس کے پار اسپتال کا لان تھا۔ ریحانہ پھر حیران ہوئی۔ لان اس کا سبزہ، اس کے پھول اور پودے، آسمان اور اس پر اڑتے بادل سب بہت ہی مختلف اور بہت ہی خوب صورت نظر آ رہے تھے۔ رنگ اتنے دلکش ہو گئے تھے کہ اس نے پہلے زندگی میں نہیں دیکھے تھے۔ آسمان کے بادل جیسے بہت قریب تھے اور وہ ہوا کی بننے والی لہریں بھی دیکھ سکتی تھی۔ اس نے خوش ہو کر کہا۔ ''واقعی یہ تو سب بہت خوب صورت لگ رہا ہے۔''

''آگے اس سے بھی خوب صورت مناظر ہیں۔'' نوجوان نے ترغیب دینے والے انداز میں کہا۔ ''آپ دیکھیں گی؟''

اس بار ریحانہ کو عامر کا خیال بھی نہیں آیا۔ اس نے بے ساختہ کہا۔ ''ہاں میں دیکھوں گی۔''

''آپ کو میرے ساتھ چلنا ہوگا۔''

''میں چلوں گی۔''

''تب میں یقین دلاتا ہوں کہ آپ کو جو افسوس تھا، وہ خوشی میں بدل جائے گا۔''

''وہ کیسے؟''

''آپ خود کو ٹٹولیں، کیا یہ منظر دیکھ کر آپ کا افسوس کم نہیں ہوا ہے؟''

ریحانہ نے سوچا اور اسے تعجب ہوا۔ واقعی یوں۔ بظاہر قبل از وقت دنیا سے جانے کا دکھ بہت ہی معمولی سا رہ گیا تھا۔ جیسے انسان کو چیونٹی کاٹ لے تو اس کی تکلیف کچھ دیر بعد ناقابلِ محسوس ہو جاتی ہے۔ اس نے سر ہلایا۔

''ہاں، بہت کم رہ گیا ہے۔''

''بس تو میری بات پر یقین کریں، آگے چل کر یہ بالکل ختم ہو جائے گا۔''

اسی لمحے ایک بھیانک چیخ گونجی اور پھر کوئی یوں چلانے لگا جیسے اس کی زندہ کھال اتاری جا رہی ہو۔ ''چھوڑ دو...... خدا کے لیے...... میں نہیں جاؤں گا...... مجھے معاف کر دو...... مجھے ایک موقع دو...... خدا کے لیے...... خدا کے لیے......'' چیخیں اور شور قریب آنے لگا۔

''یہ کیا ہے؟'' ریحانہ نے سہم کر کہا۔

''آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔'' نوجوان نے تسلی دی۔ اسی لمحے گیلری میں ذرا آگے ایک دروازہ دھماکے سے کھلا اور ایک سیاہ تومند ہیولا باہر آیا۔ اس کا جسم اتنا سیاہ تھا کہ نظر اس پر نہیں ٹک رہی تھی۔ بڑھے ہوئے کانٹے نما بال جنہوں نے اس کا پورا جسم ڈھانپ رکھا تھا۔ وہ اتنا لمبا چوڑا نہیں تھا مگر اپنے ایک ہاتھ میں دبوچے شخص کے سامنے بہت ہی تومند لگ رہا تھا۔ یہ بوڑھا آدمی تھا جس نے اسپتال کا لباس پہن رکھا تھا۔ ریحانہ اسے جانتی

تھی کیونکہ جس وقت وہ کمرے میں لائی گئی تھی تو اسی وقت یہ بوڑھا بھی وہیل چیئر پر لایا جا رہا تھا اور وہ مسلسل بول رہا تھا۔ اسپتال، اس کے عملے اور اپنے لواحقین کو سنا رہا تھا جو بیماری میں بھی اس کی پروا نہیں کر رہے تھے، اسے یہاں لاوارثوں کی طرح لا کر ڈال دیا گیا تھا۔

وہ بتا رہا تھا کہ اس نے اپنی اولاد کے لیے کیا کچھ نہیں کیا۔ ایک معمولی ٹیکس کلکٹر ہوتے ہوئے بھی انہیں شاہی زندگی دی اور جب وہ بڑے ہوئے تو اس سے بے پروا ہو گئے۔ وہ انہیں گالیاں دے رہا تھا۔ اس کا شور اس وقت تک سنائی دیتا رہا جب تک اٹینڈنٹ اسے اس کے کمرے میں نہیں لے گیا۔ سیاہ تنومند شخص نے پلٹ کر دیکھا تو ریحانہ کو اس کی آنکھوں اور منہ کی جگہ شعلے سے دکھائی دیے۔ وہ غرایا تو ایسا لگا جیسے بادل کڑکے ہوں اور پھر وہ اس بوڑھے کو... بیدردی سے کھینچ کر لے جانے لگا جواب تک واویلا کر رہا تھا اور چھوڑ دینے اور معاف کرنے کی اپیلیں کر رہا تھا مگر اسے لے جانے والا اس سے اتنا بے پرواہ تھا کہ وہ اسے دیواروں سے مار رہا تھا اور ستونوں سے ٹکرا رہا تھا۔ یہ سب دیکھ کر ریحانہ کو اپنے رونگٹے کھڑے ہوتے محسوس ہوئے۔ منظر بہت ہی ہیبت ناک تھا مگر اسے خوف اپنے لیے نہیں بلکہ اس بوڑھے کے لیے محسوس ہو رہا تھا۔

''یہ کون ہے؟''

''یہ بھی نمائندۂ خاص ہے۔'' نوجوان نے کہا۔

''یہ کیسا نمائندۂ خاص ہے؟''

''ہر شخص کے لیے الگ نمائندۂ خاص ہوتا ہے۔'' نوجوان نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ ''وہ اس بوڑھے کے لیے ہے اور میں آپ کے لیے ہوں۔''

ریحانہ نے اسے دیکھا اور دل سے اللہ کا شکر ادا کیا کہ اس نے اس کے لیے ایسا نمائندۂ خاص بھیجا۔ نوجوان مسکرا رہا تھا اور اس کی مسکراہٹ نے ریحانہ کے دل میں آنے والا عارضی خوف دور کر دیا تھا۔ اس نے کہا۔ ''چلیں؟''

''چلو۔'' ریحانہ نے قدم آگے بڑھایا۔

☆☆☆

عامر ڈاکٹر کے کمرے میں تھا جو بتا رہا تھا۔ ''جانے سے پہلے وہ کچھ عجیب سی ہو رہی تھیں۔''

''کیا مطلب؟'' عامر بولا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

''ایک منٹ، میں دکھاتا ہوں۔'' ڈاکٹر نے ریموٹ اٹھا کر سامنے لگے ایل ای ڈی ٹی وی کو آن کیا اور اسے ملٹی میڈیا موڈ پر لایا۔ یو ایس بی پہلے ہی لگی تھی جس میں سی سی ٹی وی کیمرے کی ویڈیو موجود تھیں۔ اس نے ویڈیو چلائی۔ ''یہ دیکھیں...... دو بج کر بیس منٹ پر وہ خاموش اور ساکت تھیں...... وہ باہر دیکھ رہی تھیں...... اس کے بعد انہوں نے بولنا شروع کر دیا......''

عامر دیکھ رہا تھا کہ ریحانہ جیسے کسی سے بات کر رہی ہے مگر اس کا انداز بہت نارمل تھا۔ اس نے ڈاکٹر سے کہا۔ ''آواز نہیں ہے؟''

''نہیں۔'' اس نے معذرت کی۔ ''کیمرے ہماری مجبوری ہیں ورنہ ہم پرائیویسی کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ اس لیے مائک نہیں لگائے ہیں۔'' ڈاکٹر نے مووی فاسٹ فارورڈ کی۔ ''دیکھیں اب چار بج کر تیس منٹ ہونے والے ہیں۔''

ریحانہ اب بھی بات کر رہی تھی پھر اس نے باہر کی طرف دیکھا۔ اس دوران میں اس کے ہونٹ وقفے وقفے سے مسلسل حرکت میں تھے۔ پھر چار بج کر بتیس منٹ پر اس نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد ہاتھ اٹھایا جیسے کسی کو ہاتھ تھما رہی ہو یا سہارا لے رہی ہو۔ ہاتھ چند سیکنڈ ہوا میں معلق رہا اور پھر نیچے گر گیا۔ ''دس از دی اینڈ۔'' ڈاکٹر نے آہستہ سے کہا اور ٹی وی آف کر دیا۔ ''وہ اس لمحے موت سے... ہم کنار ہو چکی تھیں۔''

عامر آنکھیں صاف کرنے لگا۔ اس نے آہستہ سے پوچھا۔ ''اس کیفیت کو کیا کہا جائے گا؟''

''شاید موت سے پہلے دماغ نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا اور وہ خیالی چیزیں دیکھ رہی تھیں، کسی سے بات کر رہی تھیں لیکن ایک بات یقینی ہے، وہ بہت مطمئن اور خوش تھیں۔''

''یہی اصل بات ہے کہ وہ آخری لحات میں خوش تھی۔'' عامر نے کہا اور کھڑا ہو گیا۔ اس نے ڈاکٹر کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ''تھینک یو ڈاکٹر۔''

''مجھے افسوس ہے۔'' ڈاکٹر نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ''آپ کا نقصان بہت زیادہ ہے۔ لفظ اس کی تلافی نہیں کر سکتے۔ ڈیڈ باڈی تیار ہے، آپ جب چاہیں لے جا سکتے ہیں یا اسپتال کی انتظامیہ اسے پہنچا دے گی۔''

''میں اسے ساتھ لے کر جاؤں گا۔ میرا اور اس کا ساتھ اب زیادہ دیر کا نہیں رہا ہے۔ اس مختصر وقت کا ایک ایک لمحہ اب میں اس کے ساتھ گزارنا چاہتا ہوں۔'' عامر نے کہا اور ڈاکٹر کے کمرے سے نکل گیا۔